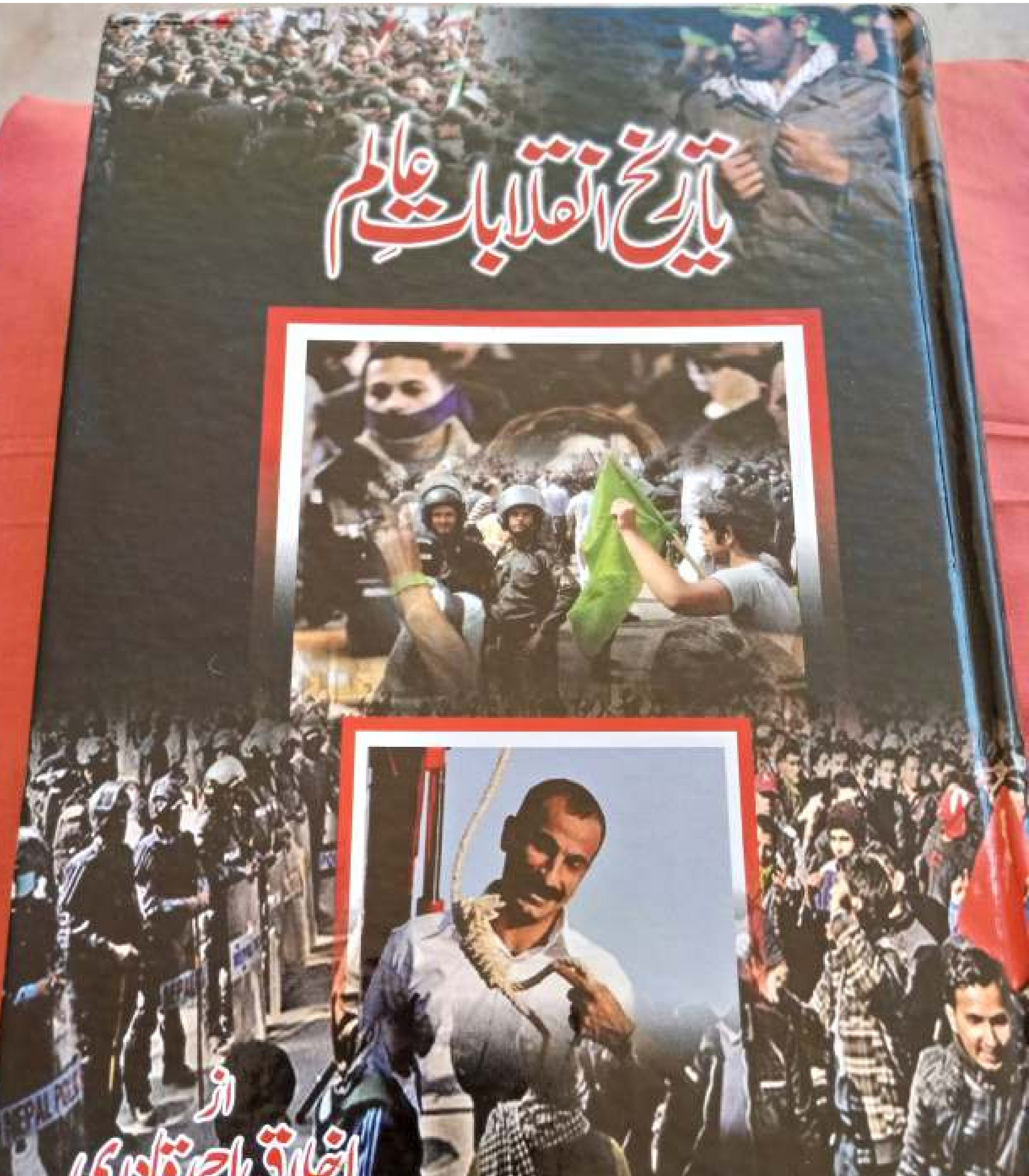
تاریخ انقلابات عالم
از
اخلاق احمد قادری

تاریخ انقلاباتِ عالم

تاریخ عالم کے وہ عظیم انقلابات جنہوں نے تاریخ انسانی کا دھارا موڑ دیا۔ تاریخ انقلابات عالم ابتدائے آفرینش سے اکیسویں صدی تک تاریخِ عالم میں رونما ہونے والے اہم تغیرات و انقلاب

از

اخلاق احمد قادری

مشتاق بک کارنر

الکریم مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور

ہماری کتابیں · معیاری کتابیں
خوبصورت اور کم قیمت کتابیں

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر: مشتاق احمد
اہتمام: سلمان منیر

نام کتاب	—	تاریخ انقلابات عالم
مصنف	—	اخلاق احمد قادری
کمپوزنگ	—	گُل گرافکس
مطبع	—	اسد نیئر پرنٹرز لاہور
ڈیزائن	—	عاطف بٹ
سن اشاعت	—	2010ء
قیمت	—	روپے

کتاب ہذا میں اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما کر شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کریں تا کہ اگلے ایڈیشن میں درستگی کی جا سکے۔ شکریہ

انتساب

تاریخ انقلابات کے ان قائدوں
اوران عظیم ہستیوں کے نام
کہ جنہوں نے اپنی الوالعزمی اور
حوصلے اور جدو جہد سے انقلاب پیدا کیے

فہرست

☆ پیش لفظ ---------- 9
☆ 40860ق م قابیلیت کا فسوں۔ام الفساد ---------- 11
☆ 3338 پہلا انقلاب قدرت، حضرت نوحؑ کا انقلاب ---------- 13
☆ 1900ق م انقلاب ابراھیمؑ ---------- 16
☆ 1275ق م انقلاب موسیٰ ---------- 19
☆ 600ق م ایران میں زرتشتی انقلاب ---------- 22
☆ 528ق م طبقاتی تقسیم کے خلاف پہلا انقلاب ---------- 25
☆ 560ق م لائی کرگس کا فوجی انقلاب ---------- 28
☆ 555ق م برہمنی تصور حیات کے خلات انقلاب ---------- 31
☆ 501ق م کنفیوشس کا عملی نفاذ، معاشرتی انقلاب ---------- 32
☆ 510ق م انقلاب یونان ---------- 34
☆ 399 ق م سچائی کا ارفع واعلیٰ انقلاب سقراط ---------- 36
☆ 509ق م رومہ میں قیام جمہوریت ---------- 38
☆ 499ق م آئیونیا میں شہنشاہیت کے خلاف انقلاب ---------- 40
☆ 26ء انقلاب مسیحؑ ---------- 42
☆ 610ء دنیا کا پہلا ہمہ گیر انقلاب اسلام ---------- 46
☆ انقلاب اسلام کے نتائج ---------- 50
☆ 750ء عباسی انقلاب ---------- 52
☆ 1571 تحریک اصلاح مذہب یورپ ---------- 56
☆ 1649ء انگلستان دور انقلاب میں ---------- 62
1453ء یورپ کی نشاۃ ثانیہ۔ایک علمی انقلاب ---------- 67
☆ 1789ء انقلاب فرانس۔ایک زلزلہ ---------- 73
☆ 1750ء صنعتی انقلاب اور قومیت کا تصور ---------- 81

تاریخ انقلاباتِ عالم ---- 83

☆ 1750ء، صنعتی انقلاب اور بین الاقوامی مسابقت ---- 86

☆ 1789ء، مزرعی انقلاب ---- 88

☆ 1715ء، تجارتی انقلاب ---- 91

☆ 1848ء، اشتراکیت و اشتمالیت ---- 96

☆ 1776ء، امریکہ کا انقلاب آزادی ---- 101

☆ 1800ء، انیسویں صدی کی انقلابی جدوجہد ---- 103

☆ انقلاب کا عہد ---- 103

☆ 1830ء کے انقلاب ---- 104

☆ 1848ء کے انقلاب ---- 106

☆ 1825ء، لاطینی امریکہ کا انقلاب ---- 111

☆ 1857ء، جنگ آزادی ہند، ایک ناکام انقلاب ---- 114

☆ 1859ء، ذہنی انقلاب ---- 119

☆ 1870 قومیت اور قوم پرستی کے نام پر ---- 126

☆ 1885ء، غلامی کی تنسیخ ایک انقلابی قدم ---- 134

☆ 1860ء، تحریک بیداری نسواں ---- 138

☆ 1880ء، انیسویں صدی کا سامراج ---- 143

☆ 1905ء کا روسی انقلاب ---- 147

☆ 1910ء، انقلاب میکسیکو ---- 150

☆ 1911ء، انقلاب چین ---- 160

☆ 1914ء، جنگ عظیم اول ---- 171

☆ 1916ء، ترکوں کے خلاف بغاوت یا انقلاب عرب ---- 181

☆ 1917ء، بالشویک انقلاب روس ---- 197

☆ 1917ء، اعلان بالفور، فلسطین اور شرق اردن ---- 207

☆ 1923ء، ترکی اور منصب خلافت کا خاتمہ ---- 227

☆ 1921ء، آئرلینڈ کی انقلابی جدوجہد آزادی ---- 231

☆ 1921ء، قاچاری عہد آخر کا ایران ---- 328

☆ 1922ء، فسطائیت کا ناگہانی انقلاب ---- 244

☆ 1932ء، انقلاب سیام ---- 247

☆ 1933 جرمنی پر نازیت کا رنگ چڑھتا ہے ----

☆ 1936ء چین میں انقلاب ساز خانہ جنگی
☆ 1941ء شام۔ نئی گرفتاری اور نئی بیداری ... 259
☆ 1945ء ویت نام کا انقلاب اگست ... 266
☆ 1945ء دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد محوری ممالک کا فیصلہ ... 275
☆ 1947ء برصغیر پاک و ہند کی تقسیم ایک خونیں انقلاب ... 279
☆ 1949ء خانہ جنگی اور چین میں کمیونسٹ انقلاب ... 290
☆ 1952ء مصر، برطانوی دور سے فوجی انقلاب تک ... 296
☆ 1952ء ایران میں ڈاکٹر مصدق کا تختہ الٹ دیا گیا ... 302
☆ 1958ء عراق انقلابات کی زد میں ... 312
☆ 1956ء ہنگری میں کمیونزم کے خلاف بغاوت یا انقلاب ... 316
☆ 1958ء پاکستان مارشل لاء سے مارشل لا تک ... 327
☆ 1959ء کیوبا میں انقلاب ... 331
☆ 1962ء الجزائر کی آزادی اور فوجی انقلاب ... 339
☆ 1960ء ترکی میں فوجی انقلاب اور اس کے بعد ... 349
☆ 1962ء برما میں پرامن فوجی انقلاب ... 357
☆ 1964ء انقلاب زنجبار ... 363
☆ 1967ء انقلاب یونان ... 367
☆ 1969ء لیبیا میں بادشاہت کا خاتمہ ... 369
☆ 1966ء نائجیریا میں فوجی انقلاب ... 372
☆ 1966ء چین میں ثقافتی انقلاب ... 379
☆ 1969ء سوڈان میں فوجی انقلاب ... 385
☆ 1971ء مشرقی پاکستان کی راکھ سے بنگلہ دیش ... 388
☆ 1971ء یوگنڈا میں صدر ابوتے کا تختہ الٹ دیا گیا ... 393
☆ 1973ء افغانستان۔ انقلابات قطار اندر قطار ... 399
☆ 1973ء چلی میں مارکسٹ حکومت کے خلاف انقلاب ... 404
☆ 1974ء شہنشاہ ہیل سلاسی کی معزولی ... 420
☆ 1979ء اسلامی انقلاب ایران ... 424
☆ 1979ء نکاراگوا کا جمہوری انقلاب ... 430
☆ 1986ء فلپائن میں آمریت کا خاتمہ ... 439
443

☆ 1989ء پولینڈ جمہوریت کی راہ پر ---------- 446
☆ 1989ء اور چین میں جمہوریت کی آواز دبادی گئی ---------- 451
☆ 1989ء رومانیہ میں انقلاب ---------- 456
☆ 1989ء بالٹک ریاستوں کی آزادی ---------- 461
☆ 1990ء جرمنی کا متحد ہوجانا ---------- 467
☆ 1990ء صومالیہ کے ڈکٹیٹر کا فرار ---------- 471
☆ 1991ء سوویت یونین کا خاتمہ ---------- 475
☆ 1991ء وسطی ایشائی ریاستوں کی صبح آزادی ---------- 479
☆ 1991ء ازبکستان کا اعلان آزادی ---------- 483
☆ 1991ء آذربائجان۔اعلان آزادی ---------- 483
☆ 1991ء تاجکستان اعلان آزادی ---------- 483
☆ 1991ء ترکمانستان اعلان آزادی ---------- 484
☆ 1991ء قازقستان ---------- 484
☆ 1991ء کرغیزستان ---------- 484
☆ 1991ء چینی ترکمانستان ---------- 485
☆ 1991ء یوگوسلاویہ میں انتشار ---------- 487
☆ 1993ء چیکوسلاویہ کا دولخت ہونا ---------- 491
☆ 1998ء انڈونیشیا کا انقلاب ---------- 494
☆ 1999ء چیچنیا اور داغستان کا جہاد آزادی ---------- 498
☆ 2000ء نائن الیون کا حادثہ ---------- 501
☆ 2001ء انقلاب بلڈوزر ---------- 504
☆ 2001ء انقلاب ایڈریسیا ---------- 505
☆ 2003ء جارجیا کا انقلاب گلاب ---------- 507
☆ 2004ء یوکرائن کا انقلاب اورنج ---------- 509
☆ 2005ء کرغیزستان کا انقلاب گل لالہ ---------- 511
☆ 2005ء لبنان کا انقلاب صنوبر ---------- 513
☆ 2010ء انقلاب گل لالہ دوم ---------- 515
☆ کتابیات ---------- 518

☆

پیش لفظ

انقلاب، REVOLUTION اچانک بڑی تبدیلی ،محوری گردش یا باری سے کام کرنا کے معنی میں مستعمل ہے۔
اگرچہ یہ اصطلاح آج کل تاریخ میں حکومت میں اچانک بڑی تبدیلی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ مگر اس اصطلاح کو مشہور
یورپی فلکیات دان کوپرنیکس نے اپنے ایک رسالے میں اجرام فلکی کی گردش کے بارے میں استعمال کیا تھا۔ لیکن 17 ویں
صدی میں جب فلکیات کے علم میں انقلاب آیا تو تو یہ اصطلاح سیاست اور معاشرتی تبدیلیوں کے لئے بھی ''انقلاب'' کے
معنوں میں استعمال ہونے لگی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کسی بھی بنیادی تبدیلی یا پیداوار کے طریقوں میں مکمل تبدیلی کو بھی
انقلاب سے تعبیر کیا جانے لگا۔ تاریخ وسیاست میں تو انقلاب فرانس اور پھر انقلاب روس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ چنانچہ
اس کی تقلید میں سماجی زندگی اور علم کے بعض شعبوں میں نئی نئی تبدیلیوں کو بھی ''انقلاب'' قرار دیا جانے لگا۔ سائنسی انقلاب،
عظیم پرولتاری انقلاب اور چین کا ثقافتی انقلاب بھی اسی اصطلاح کی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن سیاست، سماجی اور اقتصادی
ڈھانچوں میں اچانک اور بڑی بڑی تبدیلیاں بھی ''انقلاب'' کا موضوع بنتی جارہی ہیں۔ اس سے بعض انقلابی نظریات
وجود میں آئے۔ وہ انقلابات جو تاریخ عالم میں سیاسی نوعیت کے تھے، محض حکمرانوں کی تبدیلی (محلاتی انقلاب) نہیں تھے،
بلکہ بعض اوقات تو یہ حکمران طبقے میں تبدیلی، طریق حکومت میں تبدیلی اور معاشرے کے اداروں میں تبدیلی ثابت ہوئے
۔ یہ انقلابی تبدیلیاں بڑے جذبہ بلکہ انقلابی جذبہ سے برپا کی گئیں اور ان کے نتائج بھی اتنے ہی انقلابی نوعیت کے نکلے۔
ہم اس کتاب میں کوشش کریں گے کہ ابتدائے آفرینش سے عالم انسانیت میں آنے والے ہمہ قسم کے انقلابات کا احاطہ
کریں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ انقلاب کے لغوی معنی۔ تغیر، الٹ پلٹ، کے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں حکومت کی فوری
تبدیلی جو طاقت کے زور پر عمل میں لائی گئی ہو۔ انقلاب کے لئے انگریزی زبان میں REVOLUTION کے علاوہ ''
کودے تا'' COUPD,ETAT بھی مستعمل ہے کودیتا اور رویولیوشن میں فرق صرف یہ ہے کہ ریولیوشن عام لوگ برپا
کرتے ہیں اور ''کودے تا'' حکومت کے ارکان یا فوج کی طرف سے آتے ہیں۔ ہم ان دونوں کا احاطہ کریں گے۔
کبھی کسی ریاست کا حکمران سیاسی تبدیلی عمل میں لانے کی غرض سے خود بھی انقلاب کا سہارا لیتا ہے۔ مثال کے طور
پر اٹلی کے بیسویں صدی کے بادشاہ وکٹر نے 1943ء میں مشہور زمانہ آمر مسولینی کو حکومت سے ہٹانے کے لئے ایک ایسی
ہی چال چلی تھی۔ قدیم زمانے میں دارالسلطنت پر قبضہ یا حکومت کی عمارتوں کو اپنی تحویل میں لے لینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ مگر

آج کل کامیاب ''کودیتا'' یا سیاسی انقلاب وہ ہے، جس میں انقلاب کے لئے ملک کے ابلاغ عامہ، یعنی ریڈیو اسٹیشنوں، ٹی وی اسٹیشنوں یا الیکٹرانک میڈیا، حساس مقامات اور صنعتی مراکز پر بھی قبضہ اور ان پر تصرف قائم کر لینا بھی جذبہ انقلاب کے لوازمات میں شامل ہو گیا ہے۔ دنیا میں آنے والے جدید انقلابات عالم کا آغاز ٹھیک اس وقت سے ہو گیا تھا جب انسان نے یا یوں کہیے انسانیت نے ذرا ہوش سنبھالا تھا اور اس کی خودی نے یا ''میں'' نے ہر معاملے میں یوں نہیں بلکہ ''یوں'' کی صدا بلند کرنا شروع کر دی تھی۔

آج سے ہزاروں سال پہلے انقلاب کی جو پہلی آواز اٹھی تھی۔ اس کے تسلسل کی کڑیاں آج بھی دیکھنے میں آ رہی ہیں جو آج تک برابر ایک دوسرے کے ساتھ لپٹی ہوئیں تاریخ کے عمل میں شامل ہوتی جا رہی ہیں.................... اس لئے آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ہم اسے پچھلے انقلابات عالم کی لہروں سے جدا نہیں کر سکتے۔ جو ہزاروں سال پہلے کے انسان کے ہاتھوں پہلی بار نمودار ہوئیں، گو زمانے کے لحاظ سے آج کا انسان، اپنے ہزاروں سال پہلے کے بھائی بندوں سے بہت الگ اور دور آ چکا ہے۔ مگر انسانی تاریخ میں تسلسل کے لحاظ سے جو کچھ آج ہو رہا ہے، اور جو کچھ ماضی قریب اور ماضی بعید میں ہو چکا ہے، سب اسی کا ملا جلا ہوا ایک سلسلہ ہے۔ اسے خواہ ہم اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں، مگر ان انقلابات عالم کی ایک جھلک پیش کرنے کی حقیری کوشش ضرور کر رہے ہیں۔

اخلاق احمد قادری

21 مارچ 2009، زکریا ٹاؤن ملتان

40860 ق م؟ قابیلیت کا فسوں ۔ ام الفساد

قابیل جسے بائبل میں قائن CANE کہا گیا ہے ۔ آدم وحوا کا پہلا فرزند تھا ۔ قابیل کا پیشہ زراعت تھا اور اس سے چھوٹے فرزند کا نام ہابیل تھا اور پیشہ چوپانی تھا ۔ دونوں نے خدا کی بارگاہ میں نذر پیش کی ۔ ہابیل کی نذر قبول ہوئی اور قابیل کی نہ ہوئی ۔ اس پر قابیل غضبناک ہوگیا ۔ اس نے ہابیل سے باتیں کیں اور آخر ایک کھیت میں اس کے خلاف بھڑک اٹھا اور اس نے ہابیل کو مار ڈالا ۔ یہ روئے زمین پر دنیا کا پہلا قتل اور خون ناحق تھا (توریت ، پیدائش باب 4)

قرآن مجید کی سورہ مائدہ میں بھی یہی کیفیت بیان ہوئی ہے اس اضافے کے ساتھ کہ ہابیل نے کہا کہ میں تجھ پر ہاتھ نہیں چلاؤں گا کیونکہ میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں ۔ (سورہ المائدہ ، القرآن)

اگر چہ پہلا انقلاب عالم تو یہ تھا کہ آدم زمین پر اترے مگر وہ اور انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہونے پائے تھے کہ قابیل نے ہابیل کی زندگی کا چراغ گل کر دیا اور کائنات بے گناہی کے خون سے تاریکی میں ڈوب گئی ۔ انسانیت کی روح اس فعل مذموم پر بہت چیخی ، مگر ابلیسیت کا شور وغوغا اور قابلیت کے فسوں نے اس کی آواز کو دبا دیا اور آج تک دبایا جا رہا ہے اور قابیلیت کا یہ فسوں بڑھتا ہی جا رہا ہے ۔ آج دہشت گردی کے نام پر سینکڑوں قتل روزانہ ہو رہے ہیں ۔

انقلابات عالم کی تاریخ کا آغاز ہابیل اور قابیل کے اس واقعے سے ہوتا ہے کہ اسکی تصدیق دنیا کی مقدس ترین الہامی کتابوں نے کی ہے ۔ انسانی معاشرت میں باہمی رقابت کا یہ ایک انقلاب تھا جو پہلی بار رونما ہوا ۔ قابیل اور ہابیل اولین اولاد آدم تھے جن میں کسی بھی بات پر اختلاف ہوگیا اور نوبت قتل وخون تک پہنچی ۔ قرآن کریم اور توراۃ دونوں خاموش ہیں کہ یہ انقلاب کس بات پر رونما ہوا ، البتہ قدیم مفسرین قرآن نے اس زمانے کے علماء سے سن کر یہ لکھا کہ یہ اختلاف وجود زن پر تھا کہ اس عہد کے مطابق حوا کی جس بیٹی کی شادی ہابیل ہونی چاہیے تھی اس پر قابیل اپنی طاقت کے بل بوتے پر قابض ہونا چاہتا تھا ۔ لیکن جب ابوالانسانیت آدم نے ہابیل کی حمایت کا اعلان کیا تھا قابیل نے اپنی ناکامی پر جھنجھلا کر اپنے بھائی ہابیل کو مار ڈالا (توریت باب 4 ، قرآن سورہ مائدہ رکوع 5) (مفسرین توریت نے لڑکی کا نام "یوندا" بتایا ہے) الہامی کتب کی تصدیق کے باوجود بعض لوگ اس واقعہ کی تاریخی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن ہابیل اور قابیل کے وجود یا اس واقعے کی تاریخی حیثیت کو ماننے یا نہ ماننے کے باوجود قابیلیت اور ہابیلیت کی اس انسانی کشمکش کے وجود کو ماننے سے کون انکار کر سکتا ہے جو ہماری سیاست ومعیشت ومعاشرت وتہذیب کے تمام انقلابات کی بنیاد ہے ۔ یہی قابیلیت کا

فسوں اور سحری تو ہے، جس نے انسانی زندگی کے آغاز سے لے کر آج تک ایک شور محشر بپا کر رکھا ہے، اور یہ اسکے نتائج ہی تو ہیں کہ امریکہ بہادر ویت نام، عراق، افغانستان کے نہتے عوام پر چڑھ دوڑا ہے اور دہشت گردی کے نام پر خود عالمی دہشت گردی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ یہ قابیلیت کا فسوں تو تھا جس نے جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم میں کروڑہا افراد کو موت کے منہ میں دھکیل دیا اور خود امریکہ بہادر نے کہ جو انسانیت کے علمبردار ہونے کا دعوی دار ہے مگر اس علمبردار انسانیت نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے نہتے عوام پر دنیا کے پہلے ایٹم بم برسا کر انہیں ابدی نیند سو جانے پر مجبور کر دیا تھا، اور اس نے سرزمین جاپان پر دنیا کا سب سے بڑا اور مکروہ جنگی جرم کیا تھا۔ یہ قابیلیت کی انتہاء تھی کیونکہ قابیل نے صرف ایک انسان کو قتل کیا تھا یہاں تو لاکھوں بے گناہ قتل ہو گئے تھے۔ مگر افسوس آج امریکہ بہادر کو کوئی قاتل نہیں کہتا۔

انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ انسان خود الجھنیں پیدا کرتا ہے اور پھر خود ہی بے چین ہو جاتا ہے۔ جب یہ بے چینی بڑھتی ہے تو انقلاب بپا کر دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو آخر کار کسی نئی انسانی جنگ کا باعث بنتا ہے۔ نوع انسانی کے آغاز سے اب تک جتنی جنگیں رونما ہوئی ہیں، وہ سب اسی جذبہ انقلاب کا نتیجہ تھیں، لیکن ابھی تک اس جذبہ کی تکمیل پوری طرح نہیں ہو سکی اور نہ ہی یہ پیشین گوئی کی جا سکتی کہ کب تک ہو گی؟

انقلابات عالم دراصل انسانی امنگوں اور تمناؤں سے پیدا ہوتے ہیں۔ زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ ان تمناؤں اور امنگوں کی تکمیل کے لئے جو جو وسائل پہلے بروئے کار لائے جاتے تھے، وہ ضرور بدل گئے ہیں۔ آج تلوار اور تفنگ کی جگہ ایٹم بم اور جدید میزائلوں نے لے لی ہے۔ مگر انسان کی تمنا اور امنگ اپنی جگہ پر بدستور باقی ہے اور اسکے نمونے آج ہمیں امریکہ بہادر اور دیگر انسانیت کے یورپی علمبرداروں کی کاروائیوں میں نظر آتے ہیں، اور ماضی میں تیمور اور چنگیز خان کی فتوحات میں مضمر تھے۔ انسانی زندگی دراصل اپنے آغاز سے لے کر آج تک ایک مسلسل کڑی کی مانند ہے۔ اس کڑی میں رنگ وروغن کا امتیاز نظر آتا ہے، ظاہری بناوٹ میں بھی کہیں کہیں فرق دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اندرونی طور پر اس کڑی کے ہر حلقے کی زندگی کی دوسرے حلقے سے وابستگی ہے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ بعض ظاہری حالات کے چکر میں کھو کر ایک حلقہ دوسرے حلقے کے وجود کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہیں سے بے چینی کا آغاز ہوتا ہے، جو بڑھ کر جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور آخر کسی نہ کسی قسم کے انقلاب اور تبدیلی پر ختم ہوتی ہے۔ اسی تبدیلی کی تفصیل انقلابات عالم کی تاریخ ہے۔ جو ہم آئندہ ابواب میں پیش کریں گے۔

☆

3338 ق م - پہلا انقلاب قدرت - انسانی معاشرے کے ظالمانہ دستور آئین کے خلاف

قابیل اور ہابیل کے دور کے بعد دنیا میں انسانی آبادی بڑھنی شروع ہوگئی، اس نئی ملی جلی مدنی زندگی نے انسانی معاشرے میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا کیں۔ قرآن اور توراۃ کی روایات ہمیں بتاتی ہیں کہ انسانی معاشرت کا دوسرا دور حضرت نوح کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دنیا کا پہلا معاشرتی انقلاب تھا جو انسانی زندگی میں پیدا ہوا۔ قابیلی دور کی سیاست رفتہ رفتہ پیچیدہ ہوتی چلی گئی اور نئے نئے مسائل پیدا ہونے لگے۔ ابتدا میں باہمی سمجھوتے سے ان نئے انسانی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی اور افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کیا گیا۔ مگر جب قابیلی ذہنیت نے زیادہ زور پکڑا تو ہابیلیت کا خون سر چڑھ کر بولنے لگا، اور پھر طوفان بن کر ہر طرف پھیل گیا۔ طوفان نوح کی مذہبی تاویل خواہ کچھ بھی ہو لیکن انقلابات عالم میں اس کی یہی تاویل ہے کہ انسانی معاشرے کے ظالمانہ دستور و آئین کے خلاف یہ پہلی بغاوت تھی جو روئے زمین پر ظاہر ہوئی اور بغاوت ہی انقلاب کی بنیاد بنتی ہے۔ طوفان کی نوح کی جو وجہ توراۃ میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "نافرمان انسانوں نے زمین کو ظلم و تشدد سے بھر دیا" (توریت، پیدائش باب 6 آیت 13)۔

حضرت نوحؑ قرآن کریم کے مطابق حضرت آدمؑ کے بعد پہلے صاحب شریعت پیغمبر تھے اور آپ ان پانچ الوالعزم پیغمبروں میں شامل ہیں جن سے خصوصی عہد و میثاق ہوئے تھے (33 الاحزاب 7) آپ نے ایک ہزار سال عمر پائی جن میں 950 سال انسانی ظلموں کے خلاف جہاد و تبلیغ میں صرف کئے، لیکن اتنی طویل تبلیغ کے باوجود اپنی قوم کے معدودے چند افراد کو راہ حق پر گامزن کر سکے، انکے وعظ اور نصیحت کا قوم نے الٹ اثر لیا اور اور انکے خلاف ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ان کو مجنون اور دیوانہ کہہ کر پکارنے لگی اور انہیں اور ان کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیف پہنچانے پر کمر بستہ ہوگئی ۔ اپنی قوم کے اس رویے سے بے زار ہو کر حضرت نوحؑ نے دعا مانگی کہ اے پروردگار "کسی کافر کو روئے زمین پر زندہ نہ رہنے دے" یعنی آپ نے ایک ایسے انقلاب کی تمنا کی جو خود قدرت بپا کرے اور جس کے نتیجے میں روئے زمین پر کوئی بھی کافر روئے زمین پر موجود نہ رہ سکے۔ حکم خداوندی ہوا کہ اس دعا کی قبولیت کے بعد کوئی کافر بھی عذاب خداوندی سے نہ بچ سکے گا۔

پھر جب حضرت نوح مومنین کو بچانے کا انتظام مکمل کر چکے تو اچانک تنور سے پانی ابلنے لگا اور آسمان سے موسلا دھار

بارشیں شروع ہو گئیں۔ توریت کے مطابق 40 روز و شب مسلسل بارش ہوتی رہی اور پانی سطح زمین سے الگ پہاڑوں سے سترہ ہاتھ بلند ہو گیا۔ اور سفینہ نوح پانی کی سطح پر تیرنے لگا طوفان تھم جانے کے بعد یہ سفینہ مفسرین کے مطابق کوہ جودی پر موجودہ نام کوہ ارارات کی چوٹی پر لنگر انداز ہوا اور یوں زمین پر پھیلنے والا انسانی ظلم قدرت نے ایک انقلاب کے ذریعے ختم کر دیا۔

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوحؑ کو دنیا میں پہلا رسول ہونیکا شرف حاصل ہے۔ محققین کے نزدیک نبی اور رسول میں فرق یہ ہے کہ نبی ہر اس پیغمبر کو کہتے ہیں جس پر وحی نازل ہو جبکہ رسول کے لئے صاحب وحی ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب شریعت ہونا بھی ضروری تھا۔

اگرچہ بعض محققین نے حضرت نوحؑ کا وطن میسوپوٹیمیا یا قدیم عراق ٹھہرایا ہے مگر مورخین اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ حضرت نوح کا وطن نامعلوم تھا۔ بائبل کی کتاب پیدائش میں آپ کی عمر 950 سال درج ہے۔ جبکہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ طوفان نوح کی آمد کے وقت آپ کی عمر 950 سال ہو چکی تھی۔ حضرت نوح کے چار بیٹے تھے، سام، حام، یافث اور چوتھا بیٹا کنعان تھا جو آپ پر ایمان نہیں لایا تھا اور طوفان میں ہلاک ہوا۔ طوفان نوح کا واقعہ بائبل اور قرآن دونوں میں تفصیل سے ملتا ہے جب حضرت نوحؑ کی قوم نے اپنی طویل عرصہ کی تبلیغ کے بعد بھی آپ پر ایمان لانے سے انکار کیا تو حضرت نوحؑ کے ہاتھ بددعا کے لئے اٹھ گئے اور آپ نے التجا کی کہ اے پروردگار اب روئے زمین پر کوئی کافر نہ زندہ بچے۔ آپ کی دعا کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے طوفان کی وعید دی۔ اور آپ کو حکم دیا کہ ایمان والوں کے ساتھ اپنے بنائے ہوئے سفینہ میں بیٹھ جائیں۔ پھر قدرت کی طاقتیں سیلاب کی شکل میں انسانی مظالم کے خلاف انقلاب لے آئیں اور زمین پر کوئی کافر نہ بچا۔

اس کے بعد جب امن و امان قائم ہوا تو حضرت نوح نے سب سے زیادہ زور قتل انسانی ہی کے خلاف صرف کیا۔ یہ آئین خداوندی نافذ کیا کہ جو کوئی انسانی خون گرائے گا اس کے بدلے میں اس کا خون بہایا جائے گا۔ (توریت: پیدائش آیت 6) یعنی اب انسانی خون ارزاں نہ رہا۔ یہودی مذہبی روایات کے مطابق طوفان نوحؑ کے زمانے کا جو تعین کیا جاتا ہے وہ تو بہت زیادہ ہے۔ لیکن طبقات الارض کے علم کی رو سے ماہرین نے زمین کی کھدائی سے نکلے ہوئے بعض آثار سے اس طوفان کا جو قرین قیاس زمانہ متعین کیا ہے وہ لینگ ڈاؤن LANGDON کے مطابق تین ہزار دو سو اور چار ہزار قبل از مسیح کے درمیان ہو سکتا ہے، یعنی 3338 ق م۔

مورخین نے طوفان نوحؑ اور حضرت آدمؑ کی وفات میں 2242 سال کا فرق بتایا ہے۔ امریکی محقق ہیری آسٹر فیلڈ کے مطابق طوفان نوح تخلیق آدم سے 2256 سال بعد آیا تھا اس میں حضرت آدم کی عمر یعنی 960 سال نکال لئے جائیں تو صرف 1296 سال کا فرق بچتا ہے۔ ایک اور محقق نے وفات آدمؑ اور طوفان نوح کے درمیان 2256 سال کا فرق بتایا ہے۔ بہر حال یہ ایک بحث ہے جو ابھی چل رہی ہے شاید آئندہ کوئی محقق تمام مکتب فکر کو ایک ہی سوچ پر مرکوز کر سکے۔ بہر حال طوفان نوح کے آثار مشرق وسطی میں اکثر مقامات پر ملتے ہیں، اس میں سوس (ایران) ٹپ موسیاں (عراق) المنید (عراق) ابوشرائن (عراق) اور بداری (زیریں مصر) ان مقامات کی کھدائی سے سب سے نچلی تہ کے اوپر مٹی کی ایک تہ جمی ہوئی ملی ہے جو پانی کے کھڑے رہنے کو ظاہر کرتی ہے یعنی ان مقامات کے زیر آب رہنے کی تصدیق ہوئی ہے۔ اسکے علاوہ بابل کے کھنڈرات سے ملنے والی مٹی کی لوحوں یا تختیوں پر ایسی عبارتیں ملی ہیں جن پر اس طوفان یا طغیانی آب کی کہانی نہایت موثر پیرائے میں لکھی ہوئی ملی۔ اگرچہ اس بات پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ طوفان عالمگیر تھا یا علاقائی۔ اس طرح ہندوستان اور ایران کی قدیم مذہبی کتب میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ہندوؤں کی کتاب ''سناپت برہمن'' اور زرتشت دھند یدار میں اس کا ذکر ملا ہے۔

☆

1900ء ق م انقلاب ابراھیمیؑ

تاریخ مذاہب عالم میں حضرت نوحؑ کے بعد دوسرا اہم انقلاب حضرت ابراھیمؑ کے نام سے وابستہ ہے، جو بابل کی قدیم تہذیب کے عروج کے زمانے میں رونما ہوا۔ ابوالانبیا حضرت ابراھیمؑ کی جائے پیدائش بابل قدیم کے ایک شہر اُر UR میں ہوئی۔ اثریاتی ماہرین کے مطابق آپ بابل کے شاہ حمورابی کے ہم عصر تھے جو تقریباً 2000 ق م میں ہوگزرا ہے۔ یعنی مورخین نے حضرت ابراھیمؑ کا سال پیدائش 2160 ق م دیا ہے۔

اسلامی روایات کی رو سے حضرت ابراھیمؑ کے زمانے میں بابل پر جو بادشاہ حکمران تھا اس کا نام نمرود تھا لیکن توراۃ میں یہ نام نہیں ملتا۔ تاہم بیرس نمرود BIRS-I-NIMROD کے نام سے ایک مقام آج بھی عراق میں موجود ہے، جس کے بعد نمرود کی تاریخی شخصیت کے وجود میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ حضرت ابراھیمؑ کے زمانے میں آئین وقانون کا تصور نسبتاً زیادہ صاف ہوکر سامنے آ گیا تھا اور انسانی حقوق کا ایک معیار قائم کرنے کی کوشش جاری تھی۔ حضرت ابراھیمؑ کے زمانے میں انسانی معاشرت چھوٹے چھوٹے قبائل میں بٹی ہوئی تھی مگر بعدازاں رفتہ رفتہ شاہی کی بنیاد پڑی اور آخر نمرود کے زمانے میں اس شاہی نظام حکومت کی پہلی محسوس شکل دنیا کو نظر آئی۔ تاہم اس وقت یہ نظریہ دنیا کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مختلف رنگ، نسل کے لوگ کسی ایک شخص کی اطاعت کا دم بھرنے لگیں۔ نمرود کے سامنے اس مقصد کے حاصل کرنے کے دو ہی طریقے تھے، ایک یہ کہ تشدد اور سخت گیری سے کام لیا جائے جیسا بعد کے زمانوں میں مطلق العنان بادشاہ اور آمر لیتے تھے۔ یا پھر دوسرے طریقہ کو کام میں لا کر عوام میں اس نظریہ کی اشاعت کی جائے کہ بادشاہ ہی دراصل خدا ہوتا ہے اس لئے جو لوگ اس کی اطاعت نہ کریں گے وہ خدا کے عذاب کا شکار ہوں گے۔ نمرود کے یہ دونوں حربے کامیاب رہے اور انسانوں نے خدائی کے اس نئے تصور کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، جس سے انسانی معاشرے میں مطلق العنان بادشاہت کی بنیادیں مضبوط ہونے لگیں۔ یہی وقت تھا جب حضرت ابراھیمؑ نے شرک، کواکب پرستی اور بت سازی و بت گری کے خلاف اپنی قوم میں انقلاب کا جھنڈا بلند کیا اور آگے بڑھ کر ساری قابیلی بساط کو الٹ دیا اور انسانی معاشرے میں اعلان توحید کیا۔ آپؑ نے جو نمرود کے خلاف بغاوت کی اس نے دنیا کی سیاسی و معیشی رفتار کا رخ بدل دیا۔ جو کہ ایک مرتبہ انقلاب تھا۔

حضرت ابراھیمؑ کو بچپن ہی سے "رشد" (21 الانبیاء 51) عطا کیا گیا تھا اور آپؑ کو قلب سلیم (37 الصفت:84) بھی عنایت کیا گیا۔ بت پرستی کے خلاف حضرت ابراھیمؑ کے جہاد یا اعلان کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ آپؑ کی اپنے

والد آزر سے بحث اس باب میں سورہ مریم میں دی گئی ہے۔ بالآخر آپ نے ان سے سلام متارکہ کیا اور تمام مشرکین سے الگ ہو گئے۔ حضرت ابراهیمؑ کا انقلابی سوال یہ تھا کہ یہ تماثیل (بت) جن پر تم اللہ سے بڑے ہو کیا ہیں؟ انہیں جواب دیا گیا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو بتوں کی پوجا کرتے ہوئے پایا ہے۔ اس پر حضرت ابراهیمؑ نے فرمایا تم اور تمہارے بزرگ صریح گمراہی میں رہے۔ آپ کی تبلیغ کا کم از کم اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ متردد ہو گئے۔ انہوں نے حضرت ابراهیمؑ سے پوچھا تو کیا آپ ہمارے پاس سچی بات لائے ہیں یا محض دل لگی تھی۔ اس پر حضرت ابراهیمؑ نے عملی طور پر بتوں کی بے چارگی قوم کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی اور فرمایا کہ تم اللہ کے سوا ایسے معبودوں کی پرستش کرتے ہو جو تمہیں فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ جب ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو بعض نے کہا " ابراهیم کو قتل کر ڈالو۔ دوسروں نے کہا کہ انہیں آگ میں جلا دو۔ پھر اسی کو عمل کی شکل دی گئی اور دنیا میں توحیدی انقلاب لانے والے داعی کو آگ میں پھینک دیا گیا، مگر آپؑ اس آگ سے صحیح و سالم نکل آئے اور آگ حضرت ابراهیمؑ پر بحکمِ ربی ٹھنڈی پڑ گئی۔

ابو الانبیاء حضرت ابراهیمؑ

حضرت ابراهیمؑ کا لقب ابو الانبیا ہے کیونکہ آپ کے بعد آنے والے تمام انبیاء کرام آپ کی صلبی اولاد میں سے تھے۔ آپ میسوپوٹیمیا کے ایک قدیم شہر اُر UR کے رہنے والے تھے، آپؑ کے شہر کے لوگ ستارہ پرست تھے۔ ابتدا میں حضرت ابراهیمؑ نے بھی اپنی قوم کی طرح اجرام فلکی کو رب جانا مگر جیسے ہی وہ غروب ہوئے آپ جان گئے کہ وہ رب نہیں ہو سکتے۔ آپؑ نے ان معبودوں سے اپنی بے زاری اور برات کا اعلان کیا اور معبود برحق اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اللہ کی طرف آپؑ کی توجہ آپؑ کے والد اور آپؑ کے درمیان اختلاف کا باعث بن گئی۔ یاد رہے آپؑ کے والد اس قوم کے سب سے بڑے پجاری تھے جسے توریت نے طارح اور قرآن نے آذر کا نام دیا۔ حضرت ابرهیمؑ نے جب تبلیغ اعلانیہ شروع کی تو ایک تہوار کے موقع پر جب قوم کہیں باہر گئی ہوئی تھی تو آپؑ نے ایک عظیم انقلابی کی طرح بتوں کو پاش پاش کر دیا اور الزام کے طور پر کلہاڑا بڑے بت کے کاندھے پر رکھ دیا مگر بادشاہ نے اس عظیم انقلابی پیغمبر کو اس بت شکنی کی پاداش میں بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈلوا دیا، مگر حکم رب سے وہ آگ گلزار میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد آپؑ نے اُر سے کنعان کی طرف ہجرت کی۔

اسی دور میں حضرت ابراهیمؑ سے ایک کافر نمرود بن کنعان نے مناظرہ کیا جس میں حضرت ابراهیمؑ نے اسے یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کہ پروردگار اللہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے آپ اسے مغرب سے نکال کر دکھائیں۔ اس پر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔ یوں بابل کے معاشرے میں آپ کا لایا ہوا انقلاب مکمل ہو گیا جس پر آپ ترک وطن کر کے شام و فلسطین کی طرف ہجرت کر گئے۔

قرآن کریم اور تورات میں حضرت ابراهیمؑ کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ

ہے کہ قرآن کریم میں دی گئی آپؑ کے بارے میں اطلاعات نہ صرف توریت کے بعد کی ہیں بلکہ یہ درست ہیں۔
توریت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا نام ابتداء میں ابرام رکھا گیا جبکہ آپ کی تاریخ پیدائش 1996 ق م بتائی گئی۔ بعض
مورخین کے مطابق حضرت ابراہیم ایک تخیلی ہوتی تھے، لیکن ان خیالات کے مقابلے میں ایسے محققین کی تعداد زیادہ ہے جو
حضرت ابراہیم کو ایک تاریخی شخصیت تسلیم کرتے ہیں۔ اور بت پرستی کے خلاف ان کی انقلاب آفریں کوششوں کو الہامی
کتب کے مطابق دنیا کا پہلا مذہبی انقلاب قرار دیتے ہیں۔

......☆......

1275 ق م۔ انقلاب موسوی

مصر کو انسانی تہذیب کی نشو و نما کے اولین گہواروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ مصری تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مطلق العنانی اور شہنشاہیت کو نئے آب و رنگ میں جلوہ گر کیا گیا، اب تک دنیا کی ہیت اجتماعیہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم تھی، ہر گروہ کا ایک سردار ہوتا تھا۔ نمرود کے زمانے کے عراق میں بھی شہنشاہیت کے خد و خال تیار ہو گئے تھے مگر انقلاب ابراہیمی نے اس نقشے کو درھم برھم کر دیا۔ تاہم قابیلی قوتیں مایوس نہ ہوئیں اب انہوں نے ایک دوسرے انسانی معاشرے میں راہ پالی جس کے نتیجے میں مصر میں ایک مکمل اور مضبوط قسم کی شہنشاہیت قائم ہو گئی تھی ۔ فرعون کے نام سے یہاں کے حکمران اس زمانے کے سب سے بڑے فرمانروا قرار پائے۔ انہوں نے بھی دعویٰ خدائی سے عوام کو خاموش کر دیا۔ نمرود کے مقابلے میں مصر کے شاہی خاندان فراعنہ مصر بڑی حد تک کامیاب رہے۔ دنیا کی آخری الہامی کتاب قرآن کریم نے اس دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

فرعون نے روئے زمین پر غلبہ پالیا اور اپنے غلبہ کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے انسانی آبادیوں میں پھوٹ ڈال کر انہیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹ دیا تاکہ ایک ٹولی کو دوسری سے ٹکرا کر سب کو کمزور رکھا جا سکے، اس نے مظلوم رعایا کے (محکوم اسرائیلیوں کو جو حضرت یوسف کے زمانے سے مصر میں آباد تھے) نوجوانوں کو قتل کرنے اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑنے اور غلام بنانے کی پالیسی اختیار کی۔ غرض (اس نے) ہر طرف فساد ہی فساد پھیلا دیا۔ لیکن جب حالات نے حد سے تجاوز کیا تو قدرت نے کمزوروں کی مدد (ایک انقلاب کے ذریعے) انہیں حکومت اور سرداری کے مسند پر بٹھا دیا (قرآن کریم: القصص رکوع، 4)

فرعونی نظام حکومت کے ان مظالم کے خلاف نفرت و انتقام کی جو چنگاریاں عوام کے دل میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں، رفتہ رفتہ انھوں نے شعلوں کی شکل اختیار کر لی اور آخر رعمسس دوم فرعون مصر یا بعض محققین کے نزدیک فرعون منفتاح کے عہد میں دنیا کی مظلوم قوم بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی رہبری و راہنمائی میں فرعونی ہیت اجتماعیہ کے خلاف علم بغاوت پوری قوت کے ساتھ بلند کر دیا اور انقلاب کے لئے راہ استوار کی۔ دنیا کا یہ انقلاب اپنے نتائج مابعد کے لحاظ سے بے حد اہمیت رکھتا ہے اس انقلاب کے بعد دنیا کی پوری ہیت اجتماعی نے ایک نئی شکل اختیار کی اور قانون و آئین کے نام پر وہ چیز دنیا کے سامنے آئی جس کا پہلے کوئی واضح تصور موجود نہ تھا، اسی بنا پر حضرت موسیٰ کو دنیا کا پہلا واضع قانون کہا جاتا

ہے اور حقیقت یہ ہے کہ احکامِ عشرہ THE TEN COMANDMENTS کے نام سے آپ نے قانون، اخلاق کے جو دس اصول اس وقت کی دنیا کو عطا کئے تھے۔ بعد کے انسانی معاشروں میں معاشرت اور سیاست کے سارے قوانین کی بنیاد انہیں پر رکھی گئی۔ ان احکامات میں چوری، زنا، قتل وغیرہ، افعال کو اخلاقی، انسانی، روحانی اور معاشرتی ہر لحاظ سے جرم قرار دیا گیا اور ان پر کڑی سزائیں رکھی گئیں (توریت، اخراج) بادشاہت کے تصور کو خدا سے ملا دینے کی جو کوشش شاہی نظام کو مضبوط بنانے کے لئے مسلسل کی جاری تھی اس داعی انقلاب نے اس کی شدید کوشش کی کہ کسی انسان اور رقانی شخصیت کو خدائی سمجھا جائے اور پکار پکار کر اعلان کیا کہ اس قسم کے بتوں کو توڑ ڈالو اور خدائے مطلق کے سوا کسی اور کے آگے گردن نہ جھکاؤ۔ مصر کے نظام معاشرت کو تہہ و بالا کر دینے والا یہ نظام انقلاب موسوی، دنیا کا کامیاب ترین انقلاب تھا مگر تاریکی طاقتیں اب بھی کارفرما تھیں۔ بادشاہ کو خدا سمجھنے کا تصور حضرت موسیٰ نے مٹا دیا تھا اس لئے اب کوشش کی گئی کہ بادشاہ کو خدا کے بعد سب سے بڑی طاقت قرار دے دیا جائے۔ دراصل موسوی انقلاب شاہی نظام میں اصلاح کرنا چاہتی تھی لیکن اس نظام کو درہم برہم کر کے اس کی جگہ کوئی دوسرا انتظام شامل کرنے کی سعی نہیں کی گئی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت موسیٰ کے بعد بادشاہ کو خدا تو نہیں البتہ ماورائے انسانیت یا مافوق الفطرت قسم کی ہستی سمجھا جانے لگا اور بادشاہت کا معیار حضرت سلیمان جیسی شخصیت کو قرار دیا گیا، جو سب سے زیادہ عقلمند تھے۔ درختوں، مچھلیوں، چرند اور پرند کی زبان سمجھ سکتے تھے۔ تین ہزار اقوال حکمت اپنے حافظے میں محفوظ رکھ سکتے تھے۔ ساری دنیا میں ان کی عقل و فراست کی دھوم تھی اور موسوی احکام و قوانین کی پیروی کرتے تھے۔ ان ملکوتی صفات کے بعد دنیاوی عیش و عشرت کے تمام ساز و سامان سے بادشاہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ توریت کی روایت کے مطابق شان و شوکت و راحت و آسائش کی بے شمار چیزوں کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کی 900 بیویاں تھیں اور تین سو لونڈیاں بھی خدمت پر معمور تھیں۔ مزید برآں پست و بلند کا معیار بھی ایک حد تک قائم رکھا گیا تھا، حتیٰ کہ توریت میں واضح طور پر مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نوکر یا غلام کو جان سے مار ڈالے تو اسکے بدلے میں آقا کو قتل نہیں کیا جائے گا، کیونکہ غلام اس کا مال ہے (توریت، اخراج 21) علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی آقا نوکر کو اتنا مارے کہ اس کا دانت ٹوٹ جائے یا آنکھ پھوٹ جائے، تو اس کی سزا آقا کو صرف اتنی دی جائے گی کہ وہ غلام کو آزاد کر دے۔

غرض انقلاب موسوی نے انسانی مساوات کو صرف ایک حد تک تو تسلیم کیا، لیکن پوری طرح تسلیم نہیں کیا۔ شاہی نسل کی بے روک مطلق العنانی پر بندش ضرور لگائی گئی اور اسے عدل و انصاف کا پابند ضرور کیا گیا مگر اس کے باوجود شاہی خاندان کی عظمت و تقدیس کو عام انسانوں سے بلند سمجھا اور یہ حکم لگایا کہ "عدل و انصاف کے نام پر شہزادوں کی بے حرمتی کرنا ٹھیک نہیں" (توریت، امثال۔ باب 17 آیت 26) اس کامیاب انقلاب کے بعد ایک بہت مہلک قسم کی غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی کہ بنی اسرائیل کی نسل حضرت موسیٰ" کو صرف اپنا نسلی ہیرو سمجھنے لگی اور موسیٰ نے قبطی نسل کی حاکمیت کے خلاف جو آواز بلند کی تھی، اس نے رفتہ رفتہ بنی اسرائیل کی حاکمیت کی شکل اختیار کر لی، نتیجتاً موسوی دعوت انقلاب میں غلط عناصر نے جگہ پیدا کرنی شروع کر دی بنی اسرائیل نے موسیٰ" کو پوری دنیا کا ہادی سمجھنے کی بجائے، صرف اپنا قومی ہادی قرار دے لیا اور ان کا نعرہ یہ ہو گیا "یہودا اسرائیل کا خدا ہے اور اسرائیل یہودا کی قوم ہے" اس طرح بنی اسرائیل کی نسل نے خود کو دنیا کی ایسی برگزیدہ ترین نسل انسانی قرار دے لیا، جس پر خدا کافی طور پر مہربان ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ" کی مشعل انقلاب نے روشنی کی جو

کر ئیں دنیا میں بکھیری تھیں، وہ اپنا اثر دکھا کے رہیں اور انہوں نے یونان اور روما جیسے دور دراز کے علاقوں میں انسان کے لئے غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیں، اور فرعون کی مطلق العنان بادشاہت سے کہیں بہتر بادشاہتیں روم و یونان میں قائم ہوئیں۔ ان میں بالائی طبقے کے مخصوص افراد کی رائے کو حکومت میں کافی دخل حاصل تھا۔ اس چیز نے نسلی اور وطنی امتیاز کے علاوہ پست و بلند کا امتیاز بھی پوری شدت سے پیدا کر دیا۔

دوسری طرف حضرت موسیٰؑ کے مقلدین، یہودیوں نے بھی نسلی برتری کا ایک طوفان کھڑا کر دیا، اور خدا کے نام پر چند افراد کے عیش و آرام کے لئے کمزور عوام کی زندگیاں قربان کی جانے لگیں۔ اگر چہ اس سے موسوی انقلاب کی دعوت محدود ہو کر رہ گئی مگر انقلاب موسوی کے پیام نے دنیا کی عوام میں ہر جگہ ایک نئی حرارت اور نیا جوش پیدا کر دیا جو آئندہ کے انقلابوں کے لئے خوش آئند تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام، نہایت جلالی اور انقلابی مزاج رکھنے والے عظیم المرتبت اور اولوالعزم پیغمبر تھے آپ کا ذکر خیر قرآن اور توریت میں سب پیغمبروں سے زیادہ کیا گیا ہے۔ محققین کے درمیان آپ کے زمانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بہت سے محققین تیرھویں صدی قبل از مسیح کو آپ کا زمانہ مانتے ہیں جبکہ بعض آپ کا عہد 1571 ق م۔ 1451 ق م بتاتے ہیں۔ قرآن کریم کی چالیس سورتوں میں آپ کو تذکرہ موجود ہے۔ موسیٰ عربی زبان کا لفظ ہے جبکہ اس کا عبرانی مترادف موشی ہے، جس کے معنی نجات دہندہ کے ہیں یہ مغربی زبانوں میں MOSES بن گیا ہے۔

موسیٰ کی والدہ جس کا نام تورایت میں یوکبد JOCHEBED آیا ہے دنیا کی ان تین عظیم المرتبت خواتین میں سے ایک تھیں جن پر وحی نازل ہوئی، یعنی والدہ حضرت اسماعیلؑ، حضرت حاجرہ، والدہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی والدہ مریم۔ حضرت موسیٰ کی پیدائش کے بعد فرعون مصر رعمسیس نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کروایا کہ ان تک یہ پیشین گوئی پہنچی تھی کہ ایک اسرائیلی نوجوان کے ہاتھوں مصر کی تباہی مقدر ہے یہ بات اور کہ حضرت موسیٰ کو فرعون کی ملکہ ہی نے پالا۔ آپؑ شاہی محل میں پل کر بڑے ہوئے تو قومی جذبہ آپ کے دل و ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ آپ نے ایک قبطی کے مقابلے میں ایک اسرائیلی کو کمزور پایا تو آپ نے قبطی کو قتل کر دیا جس پر آپ کو بھاگ کر مدائن جانا پڑا پھر جب آپ کو پیغمبری عطا ہوئی تو آپ کو عصا اور ید بیضا بھی عطا ہوئے اس عصا سے آپ نے دربار فرعون کے بڑے بڑے جادوگروں کو عاجز کر دیا۔ بعد ازاں آپ بنی اسرائیل کو مصر سے آزاد کرا کر فلسطین کے لئے روانہ ہوئے تو دریائے نیل نے آپ کو رستہ دے دیا۔

☆

زرتشتی انقلاب

600 ق م ایران اور زرتشتی انقلاب

انقلاب آفرینی کے لحاظ سے ایران کے زرتشت اور ہندوستان کے مہاتما بدھ کی شخصی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے
زرتشت کے زمانے کا تعین محققین صحیح طور پر نہیں کر سکے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سکندر اعظم کے حملہ ایران کے دوران ایران کا
بڑا علمی ذخیرہ جل کر راکھ ہو گیا تھا، جس سے ایران کی قدیم تاریخ پر روشنی پڑ سکتی تھی۔ تاہم مختلف روایات کے مطابق محققین
نے چھٹی صدی ق م کو زرتشت کا زمانہ قرار دیا ہے۔

ژند اور اوستا کے نام سے دو مقدس کتابیں زرتشت کی طرف منسوب کی ہیں لیکن ان میں کوئی بھی آج صحیح و سالم حالت
میں موجود نہیں۔ یہ بھی غالباً چوتھی صدی میں حملہ سکندر کے دوران مختلف ہو گئیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بہت ضخیم کتابیں تھیں
اور ان میں احکام زرتشت بڑی تفصیل سے درج تھے تاہم ان کتابوں کے جو متفرق و نامکمل ابواب آج موجود ہیں وہ ایک
مورخ کے لئے ایک قیمتی سرمایہ سے کم نہیں۔ ان کے مطالعے سے زرتشت سیاسی، فوجی اور مذہبی طور پر ایک بہت عظیم الشان
اور فعال راہنما کے طور پر نظر آتا ہے، جو ایک مقدس ''زرعی ریاست'' کی بنیادیں استوار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ زرتشت کی اس
جدوجہد کا زمانہ ایران کی سیاست میں فرعون کے زمانے سے کم نہ تھا۔ شہنشاہ جمشید اگرچہ بہت پہلے ہو گذرا تھا، مگر اس کو خدا
سمجھ کر پوجنے والے آج بھی کم نہ تھے۔ جمشید شاہ ایران نے بھی اپنے اقتدار شاہی کا سکہ عوام کے دلوں پر جمانے کے لئے
وہی حربہ اختیار کیا تھا جو بابل میں نمرود نے اور مصر میں فراعنہ کر چکے تھے۔ اس لئے ایران میں بھی اس قسم کے حالات پیدا ہو
رہے تھے، جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ ایران کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ خانہ بدوش قبائل ہر طرف لوٹ مار مچاتے
پھرتے تھے اور امن وامان مفقود ہو چکا تھا۔ زراعت کے پیشے کو حقیر سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کی بجائے قزاقی، ڈاکہ زنی کو
بہادری اور جوانمردی کا نام دیا جاتا تھا۔ زرتشت نے ایک طرف تو عوام کی اس ذہنیت میں انقلاب بپا کیا اور دوسری طرف
لاتعداد خداؤں کو ایک خدائے واحد مطلق میں بدل کر بادشاہ کی ذات میں خدا سمجھنے کے تصورات کو ختم کر دیا۔

زرتشت کی یہ انقلابی آواز شروع شروع میں عوام اور خواص سب کو سخت ناگوار گذری لیکن ایک سچے داعی انقلاب کی
طرح وہ ان مشکلات......

زرتشت۔ایک انقلابی مذہبی پیشوا

قدیم ایران کے ایک عظیم مذہبی پیشوا کی پیدائش بھی کہتے ہیں کہ بن باپ کے خرق عادت سے ہوئی تھی۔اس کا عہد محققین نے 660ق م تا593ق م بتایا ہے۔یہ آذر بائیجان کے مقام گنج میں پیدا ہوا۔جوانی گوشہ نشینی،غور وفکر اور مطالعے میں گذاری۔زرتشتوں کے بقول اسے سات بار بشارت ہوئی۔

تیس برس کی عمر میں اس نے اہورمزدا یعنی خدا واحد کے وجود کا اعلان کیا،لیکن وطن میں اس مجوسیت کے پیغمبر کی کسی نے بات نہیں سنی۔تب اس نے مشرقی ایران کا رخ کیا۔خراسان میں کشماد کے مقام پر شاہ گستاسپ کے دربار میں حاضر ہوا۔پہلے ملکہ اور شاہی وزیر کے دو بیٹے اس پر ایمان لے آئے،پھر شہنشاہ نے خود بھی اس کا مذہب قبول کرلیا۔کہتے ہیں کہ یہ مذہبی پیشوا تورانیوں کے دوسرے حملے کے دوران بلخ کے مقام پر ایک تورانی سپاہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ایرانی شہنشاہ کوروش اعظم اور دارائے اعظم نے اس کی تعلیمات کو پورے ایران میں علماً رائج کیا۔آج کل برصغیر پاک وہند میں جو لوگ پارسی کہلاتے ہیں اسی کے پیروکار ہیں۔

زرتشت ثنویت کا قائل تھا۔اس کا دعویٰ تھا کہ کائنات میں دو طاقتیں (یا دو خدا) کار فرما ہیں،ایک اہورمزدا(یزداں) جو خالق اعلیٰ اور روح حق وصداقت اور خیر کا خدا ہے۔دوسرا''اہرمن''جو بدی،جھوٹ اور تباہی اور شر کی طاقت ہے۔ان دونوں طاقتوں یعنی خیر وشر میں ازل سے کشمکش چلی آرہی ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔جب اہورمزدا کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے تو دنیا امن وسکون اور خوشحالی کا گہوارہ بن جاتی ہے اور جب اہرمن غالب آتا ہے تو دنیا فسق وفجور میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

.... کے گرداب میں مرعوب ہونے کی بجائے بہادری سے اس دور ابتلا سے گذرا اور ہمت و جرات سے مخالفت کے طوفان کا مقابلہ کرتا رہا آخر عوام وخواص دونوں اس کے آگے مغلوب ہو گئے۔زرتشت نے اپنے افکار وتعلیمات کی اشاعت میں ان تھک کوششیں کیں،آخر کیانی خاندان کے بادشاہ گشتاشپ نے زرتشت کو اپنا ہادی وپیشوا مان کر اسکی تعلیمات کو نافذ کرنے کا عمل شروع کر دیا۔لیکن حاسدین نے بادشاہ کے کان بھرے کہ زرتشت ایک جادوگر ہے، بادشاہ زرتشت کے متعلق بے یقینی کا شکار ہو گیا اور اس نے اچھائی کے انقلاب کے اس داعی کو قید کر دیا۔

انہیں دنوں بادشاہ کا ایک محبوب گھوڑا بیمار ہو گیا جب معالجین نے اس کا علاج کرنے سے انکار کیا تو بادشاہ نے زرتشت سے رجوع کیا اس نے اس شرط پر گھوڑے کے علاج کرنے کی رضامندی ظاہر کی کہ اگر بادشاہ دوبارہ زرتشت کے انقلابی مذہب پر لوٹ آئے۔بادشاہ اپنے گھوڑے کے تندرست ہونے کے بعد زرتشتی مذہب پر لوٹ آیا۔اس موڑ سے زرتشت کی انقلابی تعلیمات کی اشاعت کو دور دراز تک پھیلانے کا آغاز ہوا۔

قرآن کریم میں ''مجوس'' یا آتش پرست کا لفظ ایک بار آیا ہے۔وہ سورہ حج کی آیت نمبر 17 میں ''اہل ایمان، یہودی،

صابئین، نصاریٰ، مجوسی اور مشرکین کے تنازعات کا فیصلہ، اللہ قیامت کے دن کرے گا''۔ قرآن کریم میں مجوست کا ذکر آنے سے محققین نے زرتشت کو اللہ کا مبعوث کیا ہوا نبی اور کچھ نے محض ایک متقی اور پرہیزگار شخص قرار دیا ہے۔ بہر حال وہ بھی ایک انقلاب آفرین شخص ضرور تھا، جس نے دنیا میں ایک نیا مذہب متعارف کرایا اور ایک منصف خدا پر لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دی، جسے اہور مزدا کا نام دیا اور ساتھ اس نے بدی کے خالق اینگرومینوں کا تصور بھی پیش کیا۔ اس کے انقلابی خیالات کے مطابق ساری دنیا کی تمام مفید اور کارآمد چیزیں اہور مزدا نے پیدا کی ہیں، جبکہ تمام مضر اور اور تکلیف دہ اشیاء کی تخلیق اور شرانگیز ومینوں (اہرمن) سے منسوب کیا۔ اس طرح اس کی تعلیمات ثنویت کا شکار ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے وہ پیغمبروں کی توحیدی تعلیمات کی بجائے شیطانی شرکیہ تعلیمات کا داعی معلوم ہوتا ہے۔

......☆......

528ق م طبقاتی تقسیم کے خلاف پہلا انقلاب

جس زمانے میں ایران میں زرتشت سیاسی واخلاقی انقلاب لانے کی کوشش کر رہا تھاٹھیک اسی زمانے میں ہندوستان میں ایک اور داعی انقلاب مہاتما گوتم بدھ اسی قسم کی تحریک چلا رہے تھے۔ لیکن گوتم بدھ کو بہت سنگلاخ زمین ہموار کرنا تھا۔ ایرانی معاشرے کے مقابلے میں ہندوستانی معاشرے میں بہت زیادہ ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں ذات پات کے نظام نے انسان کو حد بندیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان حد بندیوں کو ہٹانا کوئی آسان کام نہ تھا اس سلسلے میں گوتم بدھ کو زرتشت کے مقابلے میں زیادہ مشکلات اور موانع کا سامنا تھا۔

تقریباً دو ہزار سال قبل از مسیح میں وسط ایشاء سے آریائی اقوام کی آمد اور آریا سماج کی تشکیل کے بعد سے آریاؤں نے قدیم ہندوستانی باشندوں کو اپنا محکوم بنالیا تھا اور یہاں ذات پات کا نظام رائج کر دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان میں انسانیت کو اونچ نیچ کا شکار بنا دیا تھا۔ برہمن، کھشتری، ویش، شودر چار طبقات میں پورا ہندو معاشرہ تقسیم ہو گیا تھا۔ جہاں برہمنوں کو معاشرے میں اعلیٰ ترین مقام حاصل تھا وہیں شودر کو سور اور کتے سے ذلیل تر تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح شودر کے نام پر ہندوستان کی عوام کی حالت مصر کے بنی اسرائیل سے بھی حد درجہ خراب تھی۔

اشاکیہ منی، گوتم بدھ کی تحریک انقلاب اس طبقاتی تقسیم پر پہلا اور بلواسطہ حملہ تھا جو برہمنی راج کے خلاف تھا جس نے اپنا اقتدار جمانے کے لئے انسانوں کو چار طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بدھ نے سب سے پہلے محل اور تعیش کی زندگی کو ٹھکرایا اور نروان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بالآخر 528ق م میں گیا کے مقام پر جو ہندوستان کے صوبہ بہار میں واقع ہے ایک بڑ کے درخت کے نیچے بدھ نے نروان کی منزل کو پالیا اور بدھ تحریک کا آغاز کر دیا۔ بدھ نے نروان حاصل کرنے کے بعد صدائے احتجاج یہ بلند کی کہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے کسی پنڈت اور برہمن کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص اپنا پنڈت اور پیشوا آپ ہے۔ ذات پات کے خلاف اس نے صاف طور پر کچھ نہیں کہا، کیونکہ ڈر تھا کہ طبقہ اعلیٰ کے ہندو بدھ تحریک کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، لیکن اس نے اپنی تعلیمات میں شودروں کو شامل کر کے عملاً طبقاتی نظام کی نفی کر دی اور امتیازات کو مٹا دیا۔ گوتم بدھ کے اس انقلابی اقدام سے تمام پست و زبوں حال طبقے اس کے گرد جمع ہونے لگے اور آخر ایک وقت آیا..........

بدھ نے بہترین انسان اس شخص کو قرار دیا جو

نہ بنائے اور صرف ایک وقت کھانا کھائے

شروع ہوگئی اور اس طرح بدھ مت عملی زندگ

مہاتما بدھ

مہاتما بدھ 563 ق م ۔ 483 ق م بدھ مت کا بانی اور مشرق کا عظیم مذہبی پیشوا تھا۔ ساکیا قبیلے سے تعلق کی بنا پر اسے ''ساکیا منی'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات حیرت انگیز ہے کہ مہاتما بدھ کے بچپن اور جوانی کے متعلق جو روایات ملتی ہیں وہی کم و بیش جین مت کے بانی مہاویر کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں۔ مہاتما بدھ کا اصل نام سدھارتھ گوتم تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اس کی شادی راج کماری یشودھرا سے ہوئی۔ مہاتما بدھ کے والد راجہ شدھودن کی تمنا تھی کہ اس کا بیٹا فنون حرب میں طاق ہو جائے مگر تقدیر میں کچھ اور لکھا تھا۔

جوانی کے دنوں میں جب ایک دن وہ شاہی محل سے نکلا تو اس کی نظر مصائب انسانی پر پڑی جس سے بدھ کی آتما کو بڑا دکھ پہنچا اور وہ غور و فکر میں رہنے لگا۔ پھر ایک رات اس نے اس دنیا اور شاہی محل کو خیر باد کہا اور وہ نروان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس واقعہ کو مہاتما بدھ کی زندگی میں ''مہاتیاگ'' کہتے ہیں۔ کئی سالوں تک جنگلوں کی خاک چھاننے کے بعد 528 ق م میں صوبہ بہار میں گیا کے مقام پر ایک بڑے درخت کے نیچے نروان حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد مہاتما نے بنارس کے نزدیک اپنا پہلا خطبہ دیا۔

......کہ چندر گپت نامی ایک شودر کے سر پر ہندوستانی شہنشاہیت کا تاج رکھا گیا اور اس کا عظیم پوتا اشوک بدھ مت کا عظیم مربی و محسن ثابت ہوا۔ یہ طبقاتی نظام کے خلاف بدھ انقلاب کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ مہاتما نے تبلیغ و تعلیم کو عام کر دیا اور کسی شودر کے لئے یہ قدغن نہ رہی کہ اگر وہ وید کے اشلوک سن لے تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے جو صریحاً انسانیت کی تذلیل تھی۔ اب وعظ و تبلیغ کی محفلوں میں ہر شخص کو بلا امتیاز رنگ و نسل شرکت کی اجازت تھی۔ مہاتما اب انسانوں کو یکساں مخاطب کرتا اور سب کو بھائی بھائی کے رشتہ میں پرونے کا خواہش مند تھا۔ اس کے نزدیک انسانی نجات کا دارومدار برہمنی اصول کے مطابق نسل اور نسب کی بجائے عمل پر تھا۔ بدھ مذہب کی دعوت انقلاب کے نتیجے میں ملک میں تعلیم عام ہوگئی۔ شودر اور غیر شودر کے امتیازات مٹنے لگے اور انسانی اخوت بڑھنے لگے۔ نسل و نسب کی بجائے کردار و عمل کو معیار شرافت سمجھا جانے لگا اور انسانی مساوات و برادری کا تصور پہلی بار ہندوستان میں عام ہوا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بدھ نے سب سے پہلے ویدوں پر ضرب لگائی اور ان کو الہامی ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر کے مسترد کر دیا۔ اب راجہ اور برہمن صرف انسان تھے جنہیں عمل کے معیار پر پرکھا جانے لگا، دوسرے لفظوں میں مہاتما بدھ نے انسانی مساوات و اخوت کا انقلاب برپا کر کے اونچ نیچ کا نظام ختم کر دیا۔

گوتم کی ان انقلابی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ برہمنوں کا بنایا ہوا نظام زندگی درہم برہم ہونے لگا اور آخر چندر گپت سوریا اور اشوک نے 300 ق م میں بدھ کے لائے ہوئے انقلاب حیات کو پورے ہندوستان میں عام کر دیا۔ تمام اچھائیوں کے باوجود بدھ مت کا کمزور پہلو یہ تھا کہ اس میں رہبانیت اور ترک دنیا کی زندگی کو سب سے زیادہ بلند معیار قرار دیا گیا۔ چنانچہ

بدھ نے بہترین انسان اس شخص کو قرار دیا جو تارک الدنیا ہو کر جنگلوں میں رہے۔ یہاں تک کہ بود و باش کے جھونپڑی تک نہ بنائے اور صرف ایک وقت کھانا کھائے اس تعلیم کے نتیجے میں بدھ مت کے اچھے پیروؤں کی توجہ کاروبارِ زندگی سے ہٹنا شروع ہو گئی اور اس طرح بدھ مت عملی زندگی میں ناکامی کا شکار ہوتا چلا گیا۔

......☆......

لائی کرگس کا فوجی انقلاب

560 ق م

پرانے زمانے سے جزیرہ نما بلقان کا سب سے جنوبی علاقہ اسپارٹا کہلاتا تھا۔ یہ خالص زرعی خطہ تھا وہاں ڈورین DORIAN قوم آباد تھی۔ جن کا بنیادی پیشہ زراعت تھا۔ اسپارٹا کے شمال میں ایتھنز کا علاقہ تھا جہاں آیونین IONIAN لوگ آباد تھے اس مناسبت سے بعد میں اس پورے ملک کا نام یونان پڑا اور باشندے یونانی کہلائے۔ ایتھنز کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ تھے اور ڈورین قوم کے حریف۔ بعد کے زمانے میں سپارٹا اور ایتھنز میں طویل جنگیں رونما ہوتی رہیں۔ سپارٹا کی سماجی حالات اور اصلاحات کا ذکر بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب ''تواریخ'' میں کیا ہے۔ ہیروڈوٹس کے مطابق قدیم دور میں سب زیادہ خراب حکومت اگر یونان کے کسی خطے میں تھی تو وہ اسپارٹا تھا وہ وحشیوں سے کسی قسم کا سروکار نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اب ان کی حکومت بہت عمدہ ہے اس کے بعد سپارٹا کے نظام میں اس انقلابی تبدیلی کا سبب بیان کرتا ہے اسپارٹا کا ایک ممتاز شہری جس کا نام لائی کرگس LYKURGUS تھا ایک بار ڈیلفی کے مندر میں گیا وہاں کی خاتون پروہت نے اس پر نظام حکومت کے راز منکشف کئے جو اسپارٹا میں آج تک رائج ہیں۔ لیکن اسپارٹہ والے کہتے تھے کہ انہوں نے یہ نظام حکومت کریٹ سے حاصل کیا تھا۔ بہر حال لائی کرگس نے ہی اسپارٹا کے قوانین میں انقلابی تبدیلیاں کیں اور اس کا بھی پورا بندوبست کیا کہ آئندہ کوئی یہ قوانین یا اصلاحات منسوخ نہ کرنے پائے ۔پھر اس نے فوج کی از سر نو تنظیم کی اور ملک میں مشترکہ لنگر خانوں کو رواج دیا۔ لائی کرگس کو اگرچہ مورخین نے ایک نیم تاریخی اور نیم افسانوی شخصیت قرار دیا ہے۔ البتہ سپارٹا میں جو مخصوص سماجی نظام قائم ہوا تھا جس کو محققین نے فوجی کمیونزم کا نام دیا ہے اس کا تمام تر سہرا لائی کرگس کے سر جاتا ہے۔

لائی کرگس اسپارٹا کے کم سن بادشاہ ولیوس کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا جو رشتے میں اسکا بھتیجا بھی تھا۔ اس وقت سپارٹا کی تمام زمین صرف چند خاندانوں کی ملکیت تھیں۔ بقیہ عوام اس ملک میں صرف مزارعوں یا ہاریوں کی طرح کام کرتے تھے اور زمین پر ان کا کوئی حق نہیں تھا۔ لائی کرگس نے ملک کی اراضی کے 39 ٹکڑے کیے اور ان ٹکڑوں کو کاشت کاروں میں مساوی طور پر بانٹ دیا۔ لائی کرگس نے امراء کی غیر منقولہ جائداد سونا، چاندی، زیورات وغیرہ کو بھی زمین کی طرح عوام میں مساوی طور پر تقسیم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ اس نے ایک نیا حربہ استعمال کیا، اس نے چاندی سونے کو بہ حیثیت زر استعمال کرنے کی ممانعت کر دی۔ یعنی کوئی شخص سونے اور چاندی کے بدلے کوئی چیز خرید یا بیچ نہیں

سکتا۔ ان قیمتی دھاتوں کی جگہ اس نے لوہا رائج کیا اور اس کی قدر بھی بہت گرا دی۔ چنانچہ 500 روپے کی مالیت کا لوہا رکھنے کے لئے ایک پورا کمرا درکار تھا۔ اتنا وزنی سامان چور بھی اٹھا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ لوہے کو زر مبادلہ قرار دیے جانے سے معاشرے میں قیمتی دھاتوں کی اہمیت ختم ہوگئی اور سونا چاندی اپنی وقعت کھو بیٹھے۔ یہ لامحالہ ایک انقلاب عظیم تھا کہ سونے کے مقابلے میں لوہے کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔

لائی کرگس کے انقلاب آفریں آئین کے مطابق اسپارٹا کے شہریوں کے لیے لنگر خانے میں ایک ساتھ بیٹھ کر یکساں غذا کھانا بھی لازم تھا۔ کھانے میں فقط روٹی، پنیر، شراب، انجیر، سبزیاں اور گوشت ملتا تھا۔ ہر شہری کو اناج اور دوسری اشیا مقرر مقدار اور مقرر وقت پر لنگر خانے کو فراہم کرنا لازم تھیں ورنہ اس کی شہریت منسوخ کر دی جاتی تھی۔ یہ تھا دنیا کا پہلا کمیونزم کا نظام جو سپارٹا میں رائج ہوا۔ سپارٹا کی سیاسی تنظیم بھی یونان کی دوسری شہری ریاستوں سے مختلف تھی لائی کرگس کے انقلابی آئین کے مطابق وہاں ایک کے بجائے دو بادشاہ ہوتے تھے اور دونوں کے اختیارات قریب قریب برابر تھے۔ ایک مجلس شوریٰ تھی جس کے دونوں بادشاہ سمیت تیس ارکان تھے۔ مجلس شوریٰ کے رکن کے لئے ساٹھ سال سے زائد عمر لازم تھی۔ گویا یہ مجلس بزرگانہ تھی۔ اس کے علاوہ ایک شہری اسمبلی تھی۔ جس کی رکنیت کے لئے تیس سال کی عمر بنیاد تھی۔ اس کا اجلاس ایک مہینے میں ایک بار ضرور ہوتا تھا۔ یہ مجلس مجسٹریٹ مقرر کرتے تھے۔ یاد رہے اسپارٹا کے مجسٹریٹ بادشاہ کو بھی عدالت میں طلب کرنے کے مجاز تھے اور امن و قانون کا تحفظ ان کی ذمہ داری تھی۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ اسپارٹا کے ہر باشندے کو شہریت حاصل نہیں تھی بلکہ یہ رتبہ فقط ان چند ہزار لوگوں کو حاصل تھا جو ڈورین قوم سے تعلق رکھتے تھے آبادی کی اکثریت ہیلات HELOTES کہلاتی اور شہریت کے حقوق سے محروم تھی۔ یہ دراصل اسپارٹا کے قدیم باشندے تھے یا پھر غلام۔ اسپارٹا کی ایک عجیب روایت غلاموں کا سال بہ سال قتل عام تھا۔ اس موقع پر غلاموں کی بستیوں پر باقاعدہ طور پر دھاوے ہوتے تھے اور مخبروں کی رپورٹ پر باغی غلام چن چن کر قتل کیے جاتے تھے۔ اسپارٹا میں دراصل مسلح اشرافیہ یا فوج حکومت کرتی تھی چنانچہ لائی کرگس نے تمام زور اچھے سپاہی پیدا کرنے پر دیا تھا۔ اشرافیہ نے اس وجہ سے پورے ملک کو فوجی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا تھا اور ہر شخص پر لازم تھا کہ وہ ملک کی فوجی ضرورتوں کا خیال رکھے لڑکوں کو سات سال کی عمر میں ہی گھر والوں سے الگ کر لیا جاتا اور ان کی تعلیم و تربیت ریاست کی نگرانی میں ہوتی۔ تیس سال کی عمر تک ان کو بارکوں میں رکھا جاتا اور انہیں سختیاں برداشت کرنے کا عادی بنایا جاتا۔ اس مقصد کے لئے ہر سال آرمیتس دیوتا کے معبد میں ایک فوجی تہوار کے موقع پر انہیں کوڑے لگائے جاتے یہاں تک کہ زمین ان کے خون سے سرخ ہو جاتی۔

اسی طرح اسپارٹا میں لڑکیوں کی صحت کا بھی پورا پورا خیال رکھا جاتا اور ان کا ورزش کرنا، کھیلوں میں حصہ لینا اور دوڑنا لازم قرار دیا گیا تھا۔ تہواروں کے موقع پر وہ لڑکوں کی حریف بن کر کھیلوں میں شریک ہوتیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایتھنز کی شریف خواتین کی طرح نرم و نازک نہیں ہوتی تھیں۔ سپارٹا کے معاشرے میں عورت کا اپنے شوہر کے علاوہ دیگر مردوں سے جنسی رشتہ قائم کرنا معیوب نہیں تھا۔ بشرطیکہ مقصد صحت مند اولاد پیدا کرنا ہو۔ اسپارٹا میں نومولود بچہ بھی ریاست کی ملکیت تصور ہوتا تھا۔ چنانچہ کوئی بچہ اگر بیمار لاغر یا عیبی پیدا ہوتا تو اسے پہاڑی کی چوٹی سے پھینک کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔

لائی کرگس کے انقلابی ذہن نے سپارٹا کوایسا نظام حکومت دیا کہ اسپارٹا کے اقتدار کا پرچم تقریباً دوسو برس تک لہراتا رہا (560ق م 380ق م) اس اثنا میں اس نے اپنے سب سے بڑے حریف ایتھنز کو بار بار زک دی اوران گنت جنگوں میں اپنی فوجی طاقت کالوہا منوایا۔ لیکن کوئی انسانی معاشرہ جس کا بنیادی مقصد جنگ وجدل ہواور جوملک کی اکثریت کوغلام بنا کر ان کی محنت سے اپنی قوت اور امارت کے ایوان تعمیر کرے پائیدار نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ جنگی فتوحات میں جو مال غنیمت ہاتھ آیا اس کے باعث خود شہریوں میں طبقاتی امتیاز فروغ پا گیا۔ زمینیں جو لائی کرگس کے انقلاب کے مطابق شہریوں میں تقسیم ہوتا تھیں، اسپارٹا کے سوگھرانوں میں سمٹ آئیں اور اسپارٹا کا معاشرہ بھی یونان کے دیگر معاشروں کی مانند ہوگیا۔ لائی کرگس کے انقلابی اقدام کو اسکے بعد تیسری صدی قبل از مسیح کے ایک نوجوان آرگس نے زندہ کرنا چاہا مگر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ سپارٹا کے معاشرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے آج کی ہالی وڈ کی تیار کردہ فلم Meet the Spartan دیکھیے۔ یہ فلم سپارٹا کے معاشرے پر ایک طنزیہ علم ہے مگر اس میں سپارٹا کے لوگوں کے رہن سہن، معاشرتی زندگی اور اطوار کو قریب سے دکھایا گیا ہے۔

☆

555ق م برہمنی تصور حیات کے خلاف ایک اور آواز

گوتم بدھ کے زمانے کے لگ بھگ ایک ہندو بھکشو مہاویر نے بھی برہمنی تصور حیات کے خلاف آواز اٹھائی اس نے بھی ویدوں کی الہامی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ البتہ اس نے ذات پات کی تمیز کو برقرار رکھا مگر بت پرستی کے ہندو انہ نظام کے خلاف بھی آواز اٹھائی دوسرے لفظوں میں جین ازم ہندو مذہب کے خلاف ایک انقلاب اور اس کے برعکس تھا مگر بت پرستی کے خلاف بھی اس نے سارے بتوں کو شامل نہ کیا بلکہ بہت سے ہندو بتوں کو باقی رکھا۔

روایات کے مطابق مہاویر 599 ق م میں پیدا ہوا اور 527 ق م تک زندہ رہا۔ تاہم اس کی پیدائش اور وفات کے سنین میں مورخین کا اختلاف بھی ہے اسے جین ازم کا چوبیسواں اور آخری تیرتھن کار یا نبی تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض مورخین اس کی پیدائش کا سن 540 ق م اور وفات 477 ق م بتاتے ہیں۔ مہاویر کے معنی عظیم ہیرو کے ہیں اس کا اصل نام وردھامن تھا۔ مہاویر بدھ کی طرح اس نے بھی شمالی ہندوستان ہی میں عرفان حاصل کیا۔ مہاویر بھی پیدائشی طور پر صوبہ بہار کے شمالی نامی شہر کا شہزادہ تھا۔ اس نے بھی شاہانہ زندگی کو ترک کر کے یوگ کا رستہ اختیار کیا تھا، اور تیاگ کے کٹھن مراحل طے کیے تھے۔ ریاضت اور ترک دنیا کے معاملے میں اس نے مہاتما بدھ کی مکمل ہمنوائی کی۔ حد یہ ہے کہ کپڑے پہننے تک کو دنیا طلبی قرار دیا اور بہترین انسان بننے کے لئے ہدایت کی کہ وہ ننگا رہے یا اگر کپڑے پہنے تو صرف سفید لباس پہنے۔ مہاویر کی تعلیمات چونکہ ذات پات کے نظام اور مورتی کی پوجا کو باقی رکھتیں تھیں، اس وجہ سے برہمنی نظام نے نہ صرف یہ کہ ان کی نفی کی بلکہ نہ ان کو مٹانے پر زیادہ زور صرف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں بدھ کے ماننے والے تو بالکل نیست و نابود ہو گئے۔ مگر جین ازم کو ماننے والے ابھی تک ہندوستان میں موجود ہیں جین مت سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد 2000ء تک ہندوستان میں 50 لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

دراصل جین مت کوئی نیا مذہب نہ تھا بلکہ ہندو مذہب کی ایک اصلاحی شکل تھی۔ اس کا وجود بھی ذات پات کی تفریق اور مخصوص طبقے کی برتری کی نفی کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ اس وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ جین ازم ہندومت کی انقلابی شکل ہے۔

......☆.......

501ء کنفیوشش ازم کا پہلا عملی نفاذ

چین کا موجودہ صوبہ شینڈونگ زمانہ قدیم کی ریاست LU تھا اسی ریاست میں شرق بعید کا عظیم مصلح کنفیوشش پیدا ہوا تھا جس نے مشرق بعید کے تیسرے بڑے مذہب کنفیوشش ازم کی بنیاد رکھی جو دیگر مذاہب عالم کی طرح ایک انقلابی مذہب تھا۔ دنیا کی عظیم انقلابی شخصیات میں حضرت موسیٰ، زرتشت اور مہاتما بدھ کے ساتھ ساتھ کنفیوشش کا نام بھی آتا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور یونان کے مقابلے میں ہندوستان اور چین میں زندگی کا دھارا بہت کم تبدیلیوں سے دوچار رہا تھا۔ یہاں زندگی کا دھارا بہت آہستہ آہستہ بہا اور بلاد عرب جیسے انقلابی طوفان یہاں بہت کم آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بلاد عرب اور ایران اور یونان کے داعیان انقلاب کی مساعی شامل حال نہ ہوتی تو شاید دنیا ان انقلابی تبدیلیوں سے بہرہ مند نہ ہو سکتی جن سے آج ہے۔

چین میں بھی فن تعمیر، علم وادب میں انسان نے بہت ترقی کی اور فطرت کے بہت سے اسرار سے پردہ اٹھایا۔ مگر بابل ومصر کی قدیم تہذیبوں کی طرح یہاں بھی ان ترقیوں کا فائدہ مخصوص اور محدود طبقے کو پہنچا۔ اس طبقے کے علاوہ خدا کی باقی مخلوق پستی رہی اور زبوں حالی کا شکار رہی۔ چین میں بادشاہ کو خدا کی نسل سے سمجھا جاتا تھا اور حکومت کرنا اس کا قدرتی حق قرار پایا تھا وہ جو چاہے وہ کرسکتا تھا، اس پر گرفت کا کوئی اختیار عوام کو نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری صدی ق م کے اوائل میں جس خاندان کو شہنشاہ بننے کا شرف حاصل ہوا وہ اگلے اڑھائی ہزار سال تک یا 1911 تک مسلسل حکومت کرتا رہا بمشکل جا کر بیسویں صدی کے آغاز میں اس کا خاتمہ ہوا۔

چین کا قانون ساز ڈیوک آف چاؤ DUKE OF CHAU کو قرار دیا جاتا جس کا سن وفات 1105 ق م ہے، لیکن اخلاقی معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے کنفیوشش کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ 479ء میں فوت ہوا تھا۔ کنفیوشش بھی ایک داعی انقلاب تھا مگر اس کی تعلیمات کو موسیٰ اور زرتشت کی تعلیمات سے کوئی نسبت نہیں کیونکہ وہ ان کی طرح کسی منظم تحریک انقلاب کا بانی نہیں تھا صرف ایک معلم اخلاق تھا اور سیاست ومعیشت میں ڈیوک چاؤ کا ہی پیروکار تھا ۔ یہی وجہ ہے چین کے باشندوں پر کنفیوشش کی بجائے گوتم بدھ کی تعلیمات کا زیادہ اثر ہوا اور وہاں بدھ مت کے پیروکاروں کی اکثریت ہوگئی۔ چونکہ چین ہندوستانی ذات پات کے نظام کی قیود سے پاک تھا اور شہنشاہیت کی حیثیت پر بدھ مت حملہ نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے چین میں بدھ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ کنفیوشش نے زخمی انسانیت کو مطمئن کرنے کی کوشش اس

وقت کی جب 501 ق م مین وہ ژونگ ڈو نامی شہر کا قاضی مقرر کیا گیا۔ اس تقرر سے کنفیوشش کو اپنی انقلابی اصلاحات کے عملی نفاذ کا پہلا موقع حاصل ہوا۔

کنفیوشش کے انقلابی اصلاحات کے باعث یہ شہر جلد ہی اس کی ہمسائی ریاستوں میں زیادہ خوشحال ہو گیا۔ اردگرد کی ریاستیں اس کی یہ خوشحالی نہ برداشت کر سکیں اور انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے کنفیوشش کو قاضی شہر کا عہدہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ مگر اس کی انقلابی اصلاحات نے چینی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا اور اس کے نظریات کو عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس وجہ سے آج بھی فلسفے کی دنیا میں کنفیوشش کا نام سرفہرست ہے۔

اس کے بعد کنفیوشش نے کئی سال تک چین کے طول و عرض کی سیاحت کی اس سفر میں اس کے بہت سے شاگرد بھی اس کے ساتھ تھے اس کی اس سیاحت کا مقصد دراصل کسی ایسی ریاست کا حصول تھا جہاں اس کی تجویز کردہ انقلابی اصلاحات کو نافذ کیا جائے اور حکومتی کاروبار کو بہتر طریقے پر چلایا جائے اس تلاش میں وہ تیرہ برس سے زائد عرصہ تک مارا مارا پھرا اور دوران سفر اس نے بہت سے مصائب جھیلے، مگر اسے افلاطون کی طرح ایسی کوئی مثالی ریاست نہ مل سکی جہاں وہ اپنی انقلابی اصلاحات کے تحت حکومت قائم کر سکتا۔ اپنی اس ناکامی سے کنفیوشش بددل ہو گیا اور اس نے سیاسیات سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی اور وہ عوام الناس کی تعلیم اخلاق پر کمر بستہ ہو گیا۔ مگر اس کی وفات کے بعد کنفیوشش ازم چین کا سرکاری مذہب قرار پایا۔

☆

510 ق م۔ انقلاب یونان

چھٹی صدی قبل از مسیح تک یونان کی مختلف شہری ریاستوں میں آمرانہ طرز کی مطلق العنان بادشاہتیں قائم تھیں لیکن اس صدی کے ربع الآخر میں وہاں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا اور یونانیوں نے اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو ہٹا کر جمہوری طرز کی حکومتیں قائم کیں۔ یہ دنیا کی اولین جمہوریتیں تھیں۔ دنیا کے بیشتر محققین اس پر متفق ہیں۔

یہ یونانی انقلاب انسانی ذہن اور روح کی دنیا میں ایک عظیم اور ہمہ گیر قوت کی شکل میں ظاہر ہوا اور اس نے اپنے تہذیبی اور تمدنی برکات کے ثمرات سے تاریخ عالم کے دامن کو ایسے گلہائے گراں مایہ سے بھر دیا جن کی خوشبو سے انسانی روح اب تک جھوم رہی ہے۔ یونان میں دنیائے تہذیب وتمدن میں پہلی بار آزاد جمہوریت کا تجربہ ہوا اور آزادی اور آزاد جمہوری اداروں کے قیام واستحکام کا باعث ہوئی۔ انہوں نے آزادی کے تمام امکانات اور اس کی ساری قوتوں کو بروئے کار لا کر انسانی ذہن کو ایک ایسے عظیم نصب العین سے آشنا کیا جو آج بھی دنیا کے گوشے گوشے میں انسانیت کی محبوب ترین متاع شمار کی جاتی ہے اور جس کے حصول کے لئے آج بھی لاتعداد اقوام عالم وافراد مصروف جدوجہد ہیں اور جمہوریت کی پر افروز روشنی ہی وہ تنہا شعاع نور ہے جو ان اقوام عالم کے ظلمت کدوں کو کبھی کبھی یوں جگمگا دیتی ہے کہ ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر سے بندھ جاتی ہیں اور ان کی ڈوبتی ہوئی نبضیں از سرنو ابھر جاتی ہیں اور وہ ایک نئے جوش وخروش سے ایک نئے عزم استقامت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ آزادی اہل یونان کے نزدیک جمہوریت اور قانونی حکومت کا دوسرا نام تھا آزادی کا یہ تصور ان کو دو طاقتوں کے ساتھ ایک طویل انتہائی جان گسل اور جان بخش آویزش کے بعد حاصل ہوا تھا۔ ایک داخلی طاقت تھی اور دوسری خارجی۔ داخلی طاقت ان بادشاہوں اور آمرانہ مزاج رکھنے والوں جرنیلوں سیاست دانوں اور امیروں پر مشتمل تھی جو ہمہ وقت اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ کب جمہوری طاقتیں کمزور ہوں اور کب وہ ملک کو آمریت کے پنجہ استبداد میں جکڑ لیں۔ جبکہ خارجی طاقت جو یونان کی آزادی اور جمہوریت کے درپے تھی وہ ایران اور مقدونیہ کی جابرانہ اور قاہرانہ بادشاہتیں تھیں۔ ان دونوں طاقتوں کی مسلسل اور متواتر ریشہ دوانیوں نے اور محاذ آرائیوں نے یونان کے حریت پسندوں اور جمہوریت پسندوں کی آزاد منشی اور حق کوشی کی خصوصیات کو اتنا پختہ کر دیا کہ وہ شمع آزادی اور جمہوریت کی لو کو اونچا رکھنے کے لئے ہر وقت مستعد اور آتش زیر پا رہتے ہیں۔ دنیا کی یہ سب سے پہلی جمہوریت یونانی شہری مملکت ایتھنز میں قائم ہوئی۔ چھٹی صدی ق م کے آخری عشرہ تک یہاں ہپاس نامی ایک مطلق العنان حکمران

فرمانروا تھا۔ کلیس تھینز نامی ایک جمہوریت پسند نے اس کے خلاف انقلاب کا پرچم بلند کیا عوامی جدوجہد سے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا اور ہپیاس جو آرخن (حکمران) کہلاتا تھا اپنی بساط اقتدار لپیٹ کر بھاگنا پڑا۔ امرائے ایتھنز میں کلیس تھینز کا تعلق ایک ممتاز خاندان سے تھا اگرچہ اس انقلاب کی مخالفت کچھ امراء نے کی مگر کلیس تھینز ان امراء کے مقابلے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی اس کامیابی ہی نے دنیا کی سب سے پہلی جمہوریہ کو جنم دیا۔ اور دنیا میں یہ پہلا جمہوری انقلاب کامیاب ہوا۔

کلیس تھینز ہی نے نئی اصلاحات اور نئی حکومت کا نظام تیار کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ سب سے پہلے اس نے طبقہ امراء کا سیاسی اقتدار توڑ کر ان کے حقوق و مراعات کو ختم کیا۔ اور پھر پرانے قبائل کو توڑ کر نیا قبائلی نظام قائم کیا پوری ریاست دس حلقوں میں تقسیم کر دی گئی یہی حلقے یونانی زبان میں ''ڈیمی'' کہلاتے تھے۔ اسی لفظ نے ڈیموکریسی کی شکل اختیار کی جو جمہوریت کا مترادف ہے۔

ایسے دس دس حلقے ملا کر ایک علاقہ بنایا اور ہر علاقے کے تمام باشندوں کو ایک قبیلہ قرار دیا یہی قبائل جدید سیاسی اکائیاں قرار دیئے گئے۔ کلیس تھینز نے مجلس نمائندگان کی تعداد 400 سے بڑھا کر 500 کر دی اور ہر قبیلہ کو اپنے پچاس نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا۔ عام رائے دہی کا طریقہ نافذ کیا اور سینٹ کے لئے امراء کا انتخاب بھی یہ قبائل ہی کرنے لگے۔ آئندہ آمریت کے خطرات سے بچنے کے لئے ایسے بااقتدار اشخاص کو جن کا آئندہ آمر بن جانے کا خطرہ ہو دس سال کے لئے جلاوطن کر دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اسکے علاوہ عوام کو تختیاں دی جاتیں جن پر وہ اس شخص کا نام لکھ دیتے جس کو جلاوطن کرنا مقصود ہوتا۔ پھر یہ تختیاں جمع کر لی جاتیں، اگر ان کی تعداد چھ ہزار ہو جاتی تو اس شخص کو جلاوطن کر دیا جاتا۔ کلیس تھینز نے جو نئے قوانین متعارف کرائے ان سے نظام حکومت مزید آسان اور قدرے عوامی نوعیت کا جمہوری ہو گیا۔ یہ اتفاق ہے کہ 510 ق م میں روم بھی جمہوریہ قرار پایا تھا۔ اور وہاں بھی ایک جابر و ظالم شہنشاہ کو حکومت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔

.......☆.......

399 ق م۔ سچائی کا ارفع و اعلیٰ انقلاب اور قربانی سقراط

جیل کا داروغہ زہر کا پیالہ تھامے جیل کے اندر داخل ہوا۔ سقراط نے زہر کے پیالے کی طرف دیکھتے ہوئے داروغہ جیل سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اس سے ہلاکت کس طرح جلد سے جلد واقع ہو سکتی ہے۔ بتاؤ کہ کس طرح میں اسے استعمال میں لاؤں۔ اس پر داروغہ جیل نے کہا کہ آپ اسے پی لیجئے اور اس وقت تک ٹہلتے رہیے جب تک آپ کی ٹانگیں بوجھل نہ ہو جائیں پیکر صداقت و سچائی، سقراط نے بلاخوف و جھجک زہر کا پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ نہ اس کا ہاتھ موت کے خوف سے کانپا نہ اس کے چہرے کی رنگت بدلی نہ ہی چہرے پر ایسے آثار ہویدا ہوئے جن سے خوف جھلکتا ہو۔ سقراط نے جام بردار پر حسب عادت گہری نظر ڈالتے ہوئے اجازت طلب کی ''کیا میں اس مشروب کے چند قطرے دیوتاؤں کے نام پر گرا سکتا ہوں؟ ساقی نے جواب دیا کہ اس مشروب کی اتنی ہی مقدار تیار کی جاتی ہے جتنی ایک انسان کو درکار ہو۔ سقراط نے یہ جواب سن کر کہا پھر دیوتاؤں سے دعا تو مانگی جا سکتی ہے۔ اس دنیا سے دوسری دنیا کا سفر اختیار کرتے ہوئے خوش قسمتی کی دعا ''میری دعا یہ ہے کہ خدا میرے اس سفر کو مبارک بنا دے'' ان الفاظ کے ساتھ ہی سقراط نے پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور بڑے سکون اور اطمینان سے غٹاغٹ پی گیا۔ اس وقت تک جیل میں کھڑے ہوئے اس کے ساتھیوں نے اپنے آنسو روک رکھے تھے مگر جب اسے زہر پیتے دیکھا تو ضبط کا یارانہ رہا۔ اور آنسوؤں کے دھارے آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہہ نکلے۔ سقراط نے انہیں اس حالت میں دیکھا تو بولا ''بھئی یہ کیا تماشا ہے؟ مجھے تم پر حیرت ہے میں نے تو خواتین کو پہلے اس وجہ سے گھر واپس بھیج دیا تھا کہ نالہ و شیون نہ کریں میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ آدمی کو خاموشی اور شائستگی سے جان دینی چاہیے لہٰذا اب صبر کیجئے اور چپ رہیے کہ میں کسی گھٹیا اخلاقی جرم کی پاداش میں یہ سزا نہیں پا رہا ہوں۔

سقراط کی یہ نصیحت سن کر سب لوگ بہت شرمندہ ہوئے اور اپنے آنسوؤں کو پی گئے۔ سقراط ٹہلتا رہا پھر اس نے کہا میرے پاؤں بھاری لگ رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ پیٹھ کے بل لیٹ گیا بالکل زہر دینے والے کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے۔ اس پر زہر دینے والے نے سقراط کے بدن کو چھوا جو ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ اس نے سقراط کے جسم کو چھوتے ہوئے کہا جب زہر دل تک پہنچے گا تو وہ ختم ہو جائے گا۔ پھر سقراط کے آخری الفاظ اس کے ہونٹوں پر تھرتھرائے ''کریٹین میں نے صحت کے

دیوتا ایس کلپیس کے نام پر ایک مرغ نذر کرنا تھا میرے بعد یہ تم کر دینا۔ کریٹن نے کہا کوئی اور حکم، ایسا ہی ہوگا۔ سقراط نے کوئی جواب نہ دیا تو دربان نے اس کے منہ سے کپڑا ہٹا دیا............ اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں اس کے ایک ساتھی نے بڑھ کر اس کا منہ اور پپوٹے بند کر دیے........... سقراط جا چکا تھا۔ مگر آج 2400 سال گزرنے کے بعد بھی وہ سچائی کی تاریخ میں زندہ ہے۔

سقراط نے جان دے کر ان ارفع و اعلیٰ اقدار و عقائد کو زندہ کر دیا جو انسانیت کی جان اور عظمت کی بنیاد تھیں اس نے سچائی کے لئے اس خاموش انقلاب کے ذریعے سنجیدہ اور فہمیدہ لوگوں کا ایمان و ایقان زندگی کی عظیم قدروں پر از سر نو زندہ کر دیا۔ خود مر گیا لیکن اپنے ملک و قوم بلکہ پوری انسانیت کو سچائی کی عظمت کا سبق دے گیا۔ اس کی موت حق و انصاف کی موت نہ تھی بلکہ حق و انصاف کی تجدید اور تکمیل کے لئے انقلاب تھی۔

سقراط کی حق پرستی اور آزاد منشی اس نسل کی ترجمان تھی جس نے اپنے بادشاہوں اور آمروں سے بغاوت و انقلاب کے ذریعے جمہوریت حاصل کی تھی اور جس نے جمہوریت کی خاطر ایشیائی شہنشاہیت سے فاتحانہ جنگ کی تھی۔ یہ یونان کی عظمت کا زمانہ تھا۔ اس وقت یونانی قوم جمہوری طرز حیات، جمہوری انداز نظر کو حق پرستی اور راستی کی دلدادہ تھی۔ سقراط نے خاموش انقلاب کے ذریعے اُسے راستی کی طرف بلایا تھا تا کہ اسے حق نگری اور حق کوشی سے مملو اور مزین کر دے اس وقت سقراط اور اس کے شاگرد گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں حق شناسی اور حق پرستی کا خاموش انقلاب سچائی کی تلقین اور تبلیغ کے ذریعے پیدا کر رہے تھے۔ زندگی کی بنیادی قدروں پر بحث و تمحیث جاری تھی اور سارے نظریات و موضوعات کو عقل اور علم کے میزان پر تولا جا رہا تھا حق کی روشنی میں افراد اور اداروں کے کردار اور ان کے مقاصد و معنی پر تنقید و تبصرہ ہو رہا تھا اور انہیں حق سے ہم آہنگ کرنے کی جہد و سعی کی جا رہی تھی۔ یونانی جانتے تھے کہ اقتدار اور اختیار آنی جانی شے ہے جبکہ مملکت اور انسان ازلی و ابدی ہیں لہذا ان کے لئے ایک ایسا نظام ہونا چاہیے جو قوم کی ہمہ جہتی، تعمیر و ترقی میں ممد و معاون ہو۔ سقراط نے اپنے ارد گرد دیکھا تھا کہ اقتدار کا نشہ خواص اور عوام دونوں کو بدمست کر دیتا ہے، اس نشے میں اگر خواص آمریت اور ملوکیت کی راہ پر چلتے ہیں تو عوام بد نظمی اور لاقانونیت کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں۔ اس نے جمہوریت کو حق و انصاف کے ساتھ پابند کرنے کی تلقین کی۔ سقراط نے حکومت کا یہ نظریہ پیش کیا کہ حکومت غریبوں، کمزوروں اور مظلوموں کے مفاد کی نگرانی اور تحفظ کے لئے وقف ہوتی ہے اس نے سامانی ڈیلس SIMONIDES کے نظریے کی تردید کی تھی کہ حکومت صرف طاقت وروں اور جابروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے وقف ہوتی ہے۔ اسی طرح سقراط نے بتایا تھا کی حکومت کی طاقت حکمرانوں کی ذاتی دشمنیوں رقابتوں اور عداوتوں کو چکانے کا آلہ کار نہیں ہوتی۔ نہ ہی حکومت ظلم و تشدد کو اپنانے کا حربہ ہوتی ہے۔ کیونکہ ظلم و تشدد سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے مگر یہ اخلاقی سبق سقراط کو مہنگے پڑے اور دشمنوں نے الٹا اسے نوجوانوں کا اخلاق تباہ کرنے کے الزام میں سزائے موت دے دی۔

......☆......

509ق م ۔روم میں قیام جمہوریہ۔ایک انقلاب

جہاں تک نظریاتی عزم ومقاصد کا تعلق ہے روم بھی انہیں ارفع واعلیٰ عقائد کا دم بھرتا تھا جو یونان کی عظمت وشوکت کا باعث بنے تھے۔یہ درست ہے کہ رومہ نے دانش وبینش، فلسفہ وحکمت وعلوم فنون کے میدان میں کوئی نئی دریافتیں نہ کیں اور نہ کوئی نئی راہیں نکالیں بلکہ وہ یونان کی خوشہ چینی کرتا رہا تھا۔ابتدا میں روم بھی عرصہ تک بادشاہوں اور امراء کے زیرنگین رہا لیکن 509ق م میں رومیوں نے اپنے ظالم وجابر بادشاہ طارقین TARQUIN کو اس کے شرم ناک کارناموں پر مار مار کر نکال دیا اور جمہوری نظام حکومت قائم کیا تب سے اس کا نام جمہوریہ رومہ پڑ گیا اس عوامی انقلاب کا فوری سبب مورخین نے رومہ کے سنٹروں سے بادشاہ کا اختلاف تھا جس کی وجہ سے بادشاہ بغیر کسی وجہ سے سینٹروں کو قتل کروادیتا تھا اور ایک رومی امیر کی بیوی لوکریشیا LUCRITIA سے تارکین کے بیٹے سیکٹس SEXTUS کا زنا بالجبر بتایا ہے۔اس واقعہ کے بعد عوام ظالم بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے مظالم کی وجہ سے رومن قوم کو لفظ بادشاہ سے اتنی شدید نفرت ہوئی کہ اگلے پانچ سو برس تک قوم کے حکمران بادشاہ کا لقب اختیار نہیں کرتے تھے پہلی صدی عیسوی میں اگرچہ دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی مگر شہنشاہ آگسٹس خود کو بادشاہ کے لقب سے پکارنا نہیں پسند کرتا تھا۔

رومن مملکت میں اگرچہ بادشاہ منتخب ہوتا تھا۔لیکن اختیارات میں عوام کا حصہ نہیں تھا بلکہ تمام اقتدار اعیان کو حاصل تھا۔ روم میں قدیم ترین زمانے سے آزاد شہریوں کے دو طبقے قائم تھے، اعیان اور عوام۔اعیان ان قبائل کے افراد تھے جنہوں نے رومن مملکت کے ابتدائی دور میں ہی شہریت حاصل کرلی تھی اور اراضیات پر قابض ہو گئے تھے۔باثر خاندان کے افراد ہونے کی وجہ سے انہوں نے وسیع اختیارات حاصل کرلیے تھے۔یہی لوگ تمام سیاسی حقوق کے حامل تھے، یہ طبقہ زیادہ تر معمولی درجہ کے شہریوں، آزاد کردہ غلاموں، دوسرے ملکوں اور شہروں سے آئے ہوئے غیر ملکی باشندوں اور اعیان کے وابستگان پر مشتمل تھا۔جمہوریہ قائم ہونے کے بعد بھی سیاسی اقتدار اعیان تک ہی محدود رہا اور عوام سیاسی حقوق ا مراعات سے محروم شہری تصور کیے جاتے تھے۔لیکن عوام کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔پھر رومی فتوحات کے دور میں زیادہ سپاہیوں کی ضرورت پڑی اور عوام کی بہت بڑی تعداد فوج میں بھرتی ہونے لگی۔رفتہ رفتہ فوجی اور دولت مند عوام میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مملکت کے لیے ان کی اہمیت تو بہت ہے۔لیکن سیاسی حقوق اور اقتدار میں ان کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ وہ متحد ہو کر سیاسی حقوق کا مطالبہ کرنے لگے، اور اس طرح اعیان اور عوام میں شدید کشمکش شروع ہوگئی جو صدیوں

جاری رہی۔ آخر کار عوام کو کامیابی ہوئی۔ یہ کشمکش جمہوریت کے ارتقا میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔

جمہوری دور میں عوام کو فوج میں بھرتی کیا جانے لگا، وہیں وہ مختلف حلقوں کی نمائندہ مجلس میں جو مجلس صدہ کہلاتی تھی، اپنے نمائندے بھیجنے اور سیاسی اقتدار میں حصہ پانے کے قابل ہو گئے تھے۔ بادشاہی دور میں عوام خانگی حقوق شہریت سے محروم تھے، لیکن جمہوری دور میں ان کو یہ حقوق مل گئے اور صرف یہ پابندی برقرار رہی کہ وہ اعیان میں رشتہ نہیں کر سکتے۔ جب فوجی خدمات اور شہری حصہ داریوں میں ان کو اعیان کا ہم پلہ قرار دیا گیا تو ان کو اسمبلی میں رائے دینے کا حق بھی مل گیا، لیکن عوام اس سے مطمئن نہ تھے۔ مجلس صدہ پر ان کا اثر برائے نام تھا اس لئے انہوں نے 494 ق م میں اپنی ایک الگ تنظیم قائم کی جو مجلس عوام کہلائی۔ وہ ہر سال اس تنظیم کے عہددار منتخب کرنے لگے جو عوامی ٹریبون کہلاتے تھے 471 ق م میں عوامی ٹریبون والیرو کا قانون منظور ہوا اور عوامی ٹریبون کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ نیز یہ بھی طے پا گیا کہ عوامی مجسٹریٹوں کا انتخاب بھی مجلس صدہ کی بجائے مجلس عوام میں ہوا کرے۔

اب تک روم میں کوئی رومن تحریر شدہ قانون یا آئین نہیں تھا جو اعیان رومن قانون سے واقف تھے وہ اس کی من مانی تاویلیں کر کے فیصلہ کرتے تھے۔ اس لئے عوام نے جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ رومن قانون کو تحریری شکل دی جائے۔ آخر کار دس آدمیوں کا ایک بورڈ بنایا گیا جس نے 450 ق م میں ''بارہ الواح'' مرتب کیں۔ یہ قانون رومن قوانین میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے مطابق کچھ حقوق عوام کو مل گئے، لیکن عوامی تحریک بدستور جاری رہی۔ چنانچہ 449 ق م میں مجلس صدہ میں قانون ہوریشس منظور کیا جس کے مطابق عوامی ٹریبون کا احترام قانونی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ یہ طے پایا کہ مجلس عوام جو فیصلہ کرے وہ مجلس صدہ یا سینٹ میں منظوری کے لئے پیش کیے جائیں اور اس کی توثیق کے بعد ہی وہ قانون کی شکل اختیار کریں۔ 445 ق م میں عوامی ٹریبون کنولس کی تحریک پر اعیان و عوام کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی قانونی اجازت دے دی گئی۔ کینولس ہی نے تحریک پیش کی کہ عوام کو اعلیٰ ترین عہدوں پر بھی فائز کیا جائے اس طرح جمہوریت ایک عملی شکل اختیار کر گئی۔ اس کے بعد اگرچہ روما، پر صدیوں شہنشائیت قائم رہی مگر اس کا نام شہنشاہی جمہوریہ روما ہی رہا۔

......☆......

499ق م آئیونیا میں ایرانی شہنشاہیت کے خلاف انقلاب

آئیونیا TONIA ایشائے کوچک میں ان یونانی نوآبادیوں کو کہتے ہیں جو یونانیوں نے بحیرہ روم کے کنارے آٹھویں صدی قبل از مسیح سے لے کر چھٹی صدی قبل از مسیح کے وسط تک قائم کیں تھیں۔ ایرانی شہنشاہ کورش اعظم نے ان یونانی راستوں کو فتح کر کے یہاں ایرانی گورنر مقرر کر دیئے تھے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ غیر ملکی گورنروں کی سختیوں سے یونانیوں کی ثروت و دولت میں کمی ہو جائے گی۔ اس وجہ سے اس نے طے کیا کہ ہر عہد شہر (آئیونیا) میں اپنا ایک قائم مقام رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کی جگہ اس نے ملک کے باشندوں پر اعتبار کر کے انہیں میں سے خودسر حکمران مقرر کر دیے۔ چونکہ ان حکمرانوں کا دارومدار سلطنت ایران ہی پر تھا اس لیے ان کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ ایرانی شہنشاہ کے احکام کی تعمیل کریں۔ واقعات نے بعض ازاں دوسرا رخ اختیار کیا اور ان یونانی شہری ریاستوں کے یہ خودسر حکمران اس وقت تک ایران کے وفادار رہے جب تک پچاس سال بعد چند نئے حالات نے انہیں بغاوت پر آمادہ نہیں کر دیا اس عرصہ میں ایرانی تمام تر ایشائے کوچک کے مالک بنے رہے۔ ہیرڈوٹس نے لکھا ہے کہ ایرانیوں نے لیڈیا والوں کو بہادرانہ پیشوں سے ممانعت کر کے انہیں عیش و عشرت کے سامان بہم پہنچانے اور رفتہ رفتہ انہیں اس کا عادی بنا دیا جس کی وجہ سے ان کی قوت اور اقتدار بالکل ختم ہو گیا۔ اس کا موجد بھی لیڈیا کا حکمران کریسوس ہی تھا۔ جس نے اس کی اختراع اپنے ہم قوموں کو غلامی کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لئے کی تھی۔ ایران کے شہنشاہ داریوش نے جب پانچویں صدی کے آخری عشروں میں اسکیٹ قوم کے خلاف عسکری کارروائی کی تو اس نے دریائے ڈینیوب کو عبور کرنے کے بعد آئیونیا کے خودسر حکمرانوں کو اپنے تعمیر کردہ پل کی کشتیوں کی نگہبانی پر مامور کیا، لیکن اسکیٹ قوم کے چند شرپسندوں نے آئیونیا کے حکمرانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اگر پل پر قبضہ کر کے شہنشاہ کا رستہ مسدود کر دیں تو ایرانیوں سے یونانی آزاد ہو جائیں گے۔ ملتیاڈیز کی رائے تھی کہ اس تحریک پر عمل کیا جائے، لیکن کئی آئیونی حکمران اس انقلابی رائے کے خلاف تھے، مگر پھر بھی انہوں نے پل کے کچھ حصوں کو علیحدہ کر دیا۔ اسکیٹ قبائل سے جنگ کے بعد جب شہنشاہ کی افواج واپس ہوئیں تو ان یونانی حکمرانوں نے جو پل توڑنے کے خلاف تھے پل کی مرمت کر دی لیکن آئیونی ریاستوں نے داریوش اول کے گورنر کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف بغاوت کر دی

۔پھر یونانیوں کی مدد سے آئیونی لوگوں نے داریوش کے گورنروں کو اپنی ریاستوں سے نکال باہر کیا۔اس بغاوت یا انقلاب کا سربراہ ارسطاغورس نامی ایک یونانی تھا جو پہلے ایران کی طرف سے ایک آئیونی ریاست کا گورنر تھا۔لیکن بعد ازاں اس نے خود سری یا گورنری سے استعفیٰ دے کر اپنی رعایا کی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔اب چونکہ آئیونیا کے لوگ تنہا ایران کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے ارسطاغورس نے سرزمین یونان کی ریاستوں سے مدد مانگی اسپارٹا والوں نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔اسپارٹا میں ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد ارسطاغورس نے ایتھنز کا رخ کیا۔ایتھنز والوں نے اپنے اہم قوم کو مدد دینے کا وعدہ کیا اور میلانتھوس کی سرکردگی میں پچیس بحری جہاز روانہ کیے۔مگر ایرانیوں کی طاقت کے سامنے یہ سب کم رہے اور ایتھنزیوں کو شکست ہوئی اور داریوش کی فوجوں نے آئیونیا کے انقلاب یا بغاوت کو کچل دیا۔

اس بغات میں دراصل ایرانیوں اور یونانیوں کے درمیان جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔شہنشاہ داریوش کو آئیونیا کی بغاوت میں ایتھنز کی شرکت ناگوار گزری اور اس نے ایتھنز کو سزا دینے کے لئے ایتھنز پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ان ایرانی جنگوں کو مورخین نے پرشین وار کا نام دیا ہے۔جنگوں کا یہ طویل سلسلہ پانچویں صدی قبل از مسیح تک جاری رہا،حتیٰ کے یونانیوں نے پلاٹیا کے مقام پر ایرانیوں کو فیصلہ کن شکست سے دوچار کیا۔ایرانی اور یونانی جنگوں کے سلسلے میں سب سے پہلے جنگ میراتھن لڑی گی تھی۔..........

دیوجانسن کلبی

دیوجانسن قلبی جو فلسفہ کا بہت بڑا ترجمان سمجھا جاتا ہے،اسکی زندگی کا یہ عالم تھا کہ اس کی زندگی ایک ناند میں شب و روز بسر کرتے ہوئے گذری۔وہ شہر میں اس ناند کو لڑھکائے لڑھکائے پھرتے تھے۔گرمی میں شدید گرم ریت پر لوٹتے اور سردیوں میں برف سے ڈھکے ہوئے پتھر کے بتوں سے ہم آغوش ہوتے۔سکندر اعظم کو ان کی جب ان اداؤں کا علم ہوا تو وہ ایک دن اس عجائب دنیا کو دیکھنے کے لئے بنفس نفیس حاضر ہوا اور قریب آکر بولا

''میں سکندر اعظم ہوں''

دیوجانسن قلبی نے سر اٹھا کر دیکھا اور حسب دستور اپنے معمول کے کھرے پن سے جواب دیا'' اور میں دیو جانسن قلبی ہوں'' سکندر اعظم نے یہ سن کر کہا'' کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں'' دیوجانسن نے ارشاد فرمایا''تم دھوپ رو کے کھڑے ہو ذرا دھوپ چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ''۔سکندر اعظم اس درویش صفت کا جواب سن کر بے حیران ہوا اور چلا گیا۔

......☆......

26۔ انقلاب مسیحیت

دنیا میں شہنشاہیت کے ایوان مضبوط ہو جانے کے ساتھ ساتھ ظلم و تشدد کی پالیسیاں عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ غلامی کا رواج پورے زوروں پر تھا، جس نے انسان کی یہ حالت کردی تھی کہ ابھی ابھی ایک انسان آزاد ہوا اور ابھی کسی قزاق کے چنگل میں پھنس کر پھر غلاموں کی طرح بیچ ڈالا گیا۔ چنانچہ دیو جانس قلبی جیسا شخص بھی محض اس چکر میں آکر مرتے دم تک غلاموں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور رہا۔ اس کے علاوہ بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں خود مختاری و مطلق العنانی کا وہ طوطی بولتا تھا کہ بات بات پر انسانوں کی زبانیں کاٹ دی جاتیں تھیں اور ذرا سی لغزش پر سر تن سے جدا کر دیے جاتے تھے۔ ہر طاقت ور اپنے سے کمزور کو دبا رہا تھا۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی کو نگل رہی تھی۔ کئی دوسرے پیغمبران کرام، مہاتما بدھ اور کنفیوشس جیسے معلم اخلاق زخمی انسانیت کو تسلی دے چکے تھے۔ مگر ابھی تک ان جیسے حضرات عالی کے پیغاموں نے مصائب کا مقابلہ کرنے کی بجائے مصائب سے الگ ہٹ کر جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ ڈھونڈنے اور ترک دنیا کرنے کا درس دیا تھا۔ اسی طرح یونان اور روما کے عظیم فلاسفہ نے کچھ خشک منطقی تاویلیں اور فلسفیانہ بحثیں کر کے مصیبت زدہ انسانیت کو مطمئن کرنے کی ناکام سعی کی لیکن ان تمام تحریکوں میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ مظلوم انسانیت کو اپنا کوئی مستقل نظر نہیں آتا تھا۔ گوتم بدھ کی نجات ابدی (نروان) ایک منفی سی چیز تھی جس کا کوئی مثبت پہلو نہ تھا۔ اس کے نزدیک انسان کی آخری معراج یہ تھی کہ "نروان" کے نام پر وہ "کچھ نہیں" ہو کر رہ جاتا تھا۔ یہی حال زینو کے فلسفہ اسٹوئیسزم اور دیو جانس کلبی کا تھا۔ یہ سب لوگ اجتماعی زندگی میں انسان کی کوئی مدد نہیں کرتے تھے بلکہ جو اندھیر نگری مچی ہوئی تھی اس سے دامن بچا کر گذر جانا سکھاتے تھے۔ لیکن انسانیت کی روح ان حالات میں سڑ اپا کر ایک ناسور بن چکی تھی اور رفتہ رفتہ یہ ناسور اتنا پک چکا تھا کہ بس کسی مرد کامل کے ذرا چھیڑنے کی دیر تھی

کہ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

آخر انسانیت کی پکار رنگ لائی اور عیسیٰ روح اللہ کی شکل میں انسانیت کو ایک محسن کامل شخصیت میسر آئی، جو اس رستے ہوئے ناسور پر نشتر لگانے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ جب حضرت عیسیٰ نے اس انقلاب کی صدا بلند کی، تو ساری پست حال مخلوق ان کے گرد جمع ہوگئی۔ اس داعی انقلاب کی آواز پوری انسانیت کے مصائب پر حاوی تھی۔ لیکن چونکہ آپ کا مستقر فلسطین تھا، اس لئے آپ کو سب سے پہلا براہ راست سابقہ تو یہودیت سے پڑا اور اس کے بعد روما کے جابرانہ اقتدار سے

روما کا یہ اقتدار یہودیوں سے بیزار تھا اور یہودی اس سے بیزار تھے۔ لیکن جب مسیح کی دعوت انقلاب کی آواز بلند ہوئی تو دونوں کو اپنا وجود خطرے میں پڑتا ہوا نظر آیا۔ اسلئے اس مشترک خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ دونوں طاقتیں باہم اختلافات بھول کر ہم آہنگ ہو گئیں۔ اور انہوں نے اس داعی انقلاب انسانیت کی آواز کو دبانے کے لئے اسے واصل بحق کر دیا۔ لیکن داعی کے نہ ہونے کے باوجود دعوت اپنی جگہ قائم رہی بلکہ چہار دانگ عالم میں بڑی سرعت سے پھیلی اور آخر دجلہ وفرات کے کناروں سے لے کر یونان وروما کے محلات تک اس انقلاب انسانیت کی صدائے گونج اٹھے۔

جیسا کہ پہلے انقلابات حضرت مسیح کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ذکر آیا تھا کہ تشدد اور تاریکی اس عہد میں اتنی بڑھ چکی تھی کہ انسانیت اپنی بے چارگی ومرعوبیت کی وجہ سے ظلم واستبداد کے خلاف بغاوت کرنے کا تصور کرتے ہوئے لرزاتی تھی۔ ان حالات میں یہ صرف پیغمبر خدا حضرت عیسیٰ ؑ کا کام تھا کہ وہ ظلم واستبداد کے خلاف مقابلہ کرنے کی روح انسانیت میں پھونک دیں۔ اسلحہ اور دولت کے بغیر دنیا کے ظالموں کا مقابلہ کرنا بھی آسان نہ تھا۔ مگر ان دنیاوی لوازمات کو چھوڑ کر حضرت مسیح نے قربانی اور ایثار کے ہتھیار انسانیت کو عطا کئے اور پکار کر اعلان کیا کہ اگر تشدد کو تشدد سے دبانے کی سکت نہیں ہے تو پریشان نہ ہو جاؤ بلکہ روح اور اخلاق کی طاقت سے ظلم وتشدد کا مقابلہ کرو۔ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ رسید کرے تو تم مرعوب اور خوف زدہ ہونے کی بجائے ظالم کو کہو کہ یہ دوسرا گال بھی حاضر ہے، اسے بھی اپنے تھپڑ کا تختہ مشق بنائے، لیکن میرا دل تیرے جیسے ظالم کے آگے گردن جھکانے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اس زمانے میں روم میں جو کہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی، آگسٹس حکمران تھا۔ اس نے جمہوریت کے نام پر تمام اختیارات اپنی ذات میں سمو کر مطلق العنانی کی بنیا درکھی اور دور ونزدیک کے علاقوں میں اپنی شہنشاہیت کا لوہا منوایا تھا۔ اس طرح آگسٹس کی شہنشاہیت کے جھنڈے تلے اس وقت کی دنیا کے جابر، غاصب وظالم افراد کی ایک انجمن سی بن گئی تھی جس میں فلسطین کا رومی گورنر ہیروڈ شامل تھا وہ اپنے رومی آقا سے ظلم وستم میں بہت آگے تھا۔ اس جیسا ظالم تاریخ کے اوراق میں بہت کم نظر آتا ہے۔ وہ معمولی سی خفگی پر بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں اور بیوی کو قتل کرنے سے دریغ نہ کیا تھا۔ چنانچہ جب حضرت مسیح ؑ کی دعوت انقلاب کی آواز ہیروڈ کے کانوں تک پہنچی تو وہ اور اس کے تمام ساتھی سخت پریشان ہوئے، یاد رہے کہ ہیروڈ نے حضرت مسیح کی پیدائش کے وقت ایک نجومی کے کہنے پر معصوم اور شیر خوار بچوں کو محض اس لئے قتل کروایا تھا کہ بقول نجومی حضرت مسیح یہودیوں کے بادشاہ بننے والے تھے، اس لئے اس نے اس بوٹے کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہا مگر ناکام رہا۔ لیکن اب جبکہ یہ داعی انقلاب اپنے فرض کی بجا آوری میں مصروف تھا ہیروڈ یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ داہنے گال پر تھپڑ کھا کر بائیں گال کو ظالم کو پیش کرنے کا فلسفہ حضرت عیسیٰ ؑ نے ظلم وتشدد کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ایسے نادر حربے کے طور پر دیا کہ عوام کے مردہ دلوں میں زندگی کا نیا خون دوڑنے لگا اور مظلومیت یہ سمجھنے لگی کہ ظالم کے دانتوں کو کند کرنے کا ایک موثر طریقہ یہ بھی ہے کہ مظلومیت اپنی بے چارگی کے باوجود ظلم کے آگے گھٹنے نہ ٹیکے بلکہ ہر مصیبت کو خاموشی اور حوصلے سے برداشت کرے۔ اس طرح حضرت مسیح نے گوتم بدھ اور صلحا کے مقابلے میں ظلم سے بچ کر بھاگنے کی بجائے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا، مگر اس کے لئے صبر وضبط اور ایثار وقربانی بطور ہتھیار تجویز کئے۔ یہ بھی ایک انقلابی انداز تھا جو دنیا کے مظلوموں کے لئے ڈھارس کا درجہ رکھتا تھا۔

حضرت عیسیٰ کی دعوت انقلاب نے انسانی زندگی کے معاشی و سیاسی قوتوں میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ لیکن اس پیام میں ایک کمی یہ بھی کہ سیاسی اقتدار اعلیٰ کو کوئی واضح شکل دینے کی کوشش نہیں کی گئی جس سے شرپسندی بے بس ہو جائے۔ آپ نے دائمی انقلاب انسانیت کی حیثیت سے امن و مصالحت کے اصول بتائے۔ مگر اقتدار اعلیٰ شرپسندوں سے چھین لینے اور طاغوتی طاقتوں کو بے بس کر دینے کی کوئی جامع اور ہمہ گیر تجویز پیش نہیں کی۔ جوانوں کو معاشی ضرورتوں سے بے نیاز کرکے آپ کے بتائے ہوئے روحانی اور اخروی راستے کی طرف راغب کرتی۔ آپ کی تعلیمات کی تمام تر توجہ روحانیت پر مرکوز رہی اور مادی اور معاشی مسائل نظر انداز کر دیے گئے۔ مزید روحانی اصلاح کے لئے عیسائیت نے رہبانیت اختیار کرلی اور حکومت کا حق قیصر روم کو دے دیا اور دنیاوی زندگی سے بے تعلق ہو گئی۔ اس طرز عمل کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیت کے علمبرداروں نے انسانوں کے معاشرتی نظام کی خرابیاں ......

ہیرودا اعظم کی مطلق العنان شاہی

فلسطین کے حکمران ہیرودا اعظم کے کان میں کہیں سے یہ خبر پڑ گئی تھی کہ یہودیوں کا بادشاہ جنم لے چکا ہے۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ یہودیوں کا بادشاہ کوئی دوسرا کیسے ہو سکتا تھا، جبکہ وہ خود کو اس قانونی خطاب کا بلاشرکت غیرے مالک سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے اس پر عمل درآمد کا آغاز کیا، جسے تاریخ میں معصوم بچوں کا قتل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کے ہر بچے کے قتل کا حکم صادر کر دیا جس کی عمر دو برس سے کم ہو۔ ایک اندازے کے مطابق دس ہزار سے پانچ ہزار بچے قتل کر دیے گئے۔ ان بچوں کی تعداد جو بھی تھی مگر یہ ہیرود کو لوگوں کی نفرت کا شکار بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ اس واقعے سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اپنا اقتدار بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اور لوگوں کے معصوم بچوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والے اس ظالم حکمران کے ہاتھ خود اپنے بیٹوں کے خون سے بھی آلودہ تھے۔

74 ق م میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام اینٹی پیٹر تھا 37 ق م میں یہ اینٹنی کی مدد سے یروشلم کا حکمران بنا۔ تعمیرات کا شوق رکھنے کی وجہ سے اس نے ہیکل سلیمانی کو نیا تعمیر کرایا۔ اس کی حکومت کا آخری دور ظلم و تشدد کا دور تھا۔ اس کی موت کے بعد روما نے یروشلم پر چڑھائی کر دی اور یہودیہ کو رومی صوبہ قرار دے دیا۔

...... دور کرنے کی کوشش نہیں کی اور اپنے عہد کے اہم ترین معاشرتی مسائل کو بھی محض روحانی نقطہ نظر سے دیکھنے لگے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کے حواری پطرس کو اگرچہ غلامی قانون فطرت کے خلاف نظر آئی تھی مگر غلامی کے شر میں بھی اس کو خیر کا پہلو نظر آتا تھا۔ اور ان کا خیال تھا کہ نظام غلامی برائیوں کو روکنے کا ایک موثر ترین عملی ذریعہ ہے اور پطرس کے نزدیک غلامی کو جاری رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ کیونکہ جو کوئی شخص نیک اعمال کے ذریعے اپنی روح کو آزاد کرے اگر اس کا جسم غلام بھی رہے تو وہ آزاد ہی ہے۔

حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے بعد یا رفع الاسماء کے بعد مسیحیت شدید ترین مظالم کا شکار ہوتی رہی اور تقریباً

چار سو سال تک کوئی منظم صورت اختیار نہ کر سکی۔ کیونکہ اسے ان صدیوں میں اقتدار اعلیٰ حاصل نہ ہوا تھا۔ پھر جب وہ مشرقی رومن سلطنت کا سرکاری مذہب قرار پائی تو اس نے بہت قوت حاصل کر لی اور کلیسا کے اقتدار سے فوائد حاصل ہونے لگے لیکن انسانی زندگی کی دین و دنیا میں تقسیم معاشرے میں ہم آہنگی پیدا نہ کر سکتی تھی اور یہی سبب تھا کہ عیسائیت نے جب پاپائیت کی شکل اختیار کر لی تو کلیسائی نظام حکومتی نظام سے متصادم ہوا اور حصول اقتدار کی کشمکش نے یورپ کے دور مظلم کو تاریک تر بنا دیا۔

پہاڑی کا وعظ

حضرت عیسیٰؑ جن سے عیسائیت منسوب ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک اہم خاندان سے تھے آپؑ 8 ق م یا 4 ق م میں پیدا ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش بطور خرق عادت بغیر باپ کے ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ قوم بنی اسرائیل کی اصلاح کا انقلاب بپا کرنے اور آئندہ آنے والے پیغمبر کی بشارت پر مامور کیے گئے تھے۔ یہودی علمائے وقت سے آپ کے دعویٔ نبوت کے بعد بہت جلد مجادلات کی نوبت آ گئی تھی۔ روایت کے مطابق آپؑ کے مخالفین نے رومی حکام کو یہ باور کرایا تھا کہ آپؑ ''مسیح'' یعنی یہودیوں کے آسمانی بادشاہ ہونے کے دعوے دار اور انقلابی ہیں۔ اسی خطرہ بغاوت میں آپ کو مصلوب کیا گیا تھا۔ از روئے قرآن سولی کسی دوسرے شخص کو دی گئی تھی۔ آپؑ کی تعلیمات اور زندگی میں پہاڑی کے وعظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس وعظ میں آپ نے امن و آشتی کا منشور پیش کیا تھا جو کچھ یوں تھا۔

''یہ نہ سمجھو کہ میں اگلے پیغمبروں یا ان کے بنائے ہوئے قانون کو توڑنے آیا ہوں۔ میں تو ان کے اصلی عقائد اور مشن کو پورا کرنے آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے قوانین کے ایک ایک حرف اور ایک ایک شق پر عمل ہو۔ خدا کی رحمت ہو اس پر جو تحمل و بردباری سے کام لیتے ہیں۔ وہی خدا کے رحم کے مستحق ہیں۔ خدا کی رحمت ہو ان پر جو امن و صلح کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا کی رحمت ہو ان پر جو ظلم و ستم سہتے ہیں، وہی خدائی حکومت کے اصلی حق دار ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے مظلوم انسانیت کو جو پیغام حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے دیا تھا وہ بہت موثر تھا لیکن سیاسی اقتدار کے موجود نہ ہونے سے رفتہ رفتہ اس پیغام نے ترک دنیا کے گوشوں میں پناہ ڈھونڈ لی تھی اور دنیا میں شر کی طاقتوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا ان حالات میں انسانیت کو ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کو ضرورت تھی جو اس پورے طلسم خیالات کو توڑ کر پھینک دے اور مخلوق کو خالق سے ہم کنار کرنے کے لئے اقتدار اعلیٰ کے سرچشمے کو شر کی طاقتوں سے چھین کر یہ آواز بلند کرتا کہ۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو

یہ تھا اس نظام حیات کے آنے کا پس منظر جو شر کی طاقتوں سے اقتدار چھیننے اور امن و سلامتی کا پیغام انسانیت کے نام لے کر 610ء میں اسلام کے نام سے دنیا میں آیا۔

610ء دنیا کا پہلا بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب ۔ اسلام

ساتویں صدی کے اوائل میں دنیا میں ایک ایسے ہمہ گیر اور بنیادی انقلاب کا جھنڈا عرب کے شہر مکہ میں لہرایا کہ جس نے انسانیت کو بالکل نیا آب و رنگ عطا کر دیا۔ ابتدا میں حسب دستور اس انقلاب کی آواز کا بھی مضحکہ اڑایا گیا، لیکن جب تمسخر اڑانے کے باوجود اس کی طاقت بڑھتی چلی گئی تو پھر اسے تلوار سے دبانے کی کوشش کی گئی اس کے داعیٔ انقلاب کو قتل کر کے انقلاب کو ختم کرنے کی سازش کی گئی۔ یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ البتہ اب جہد انقلاب کا مرکز مکہ سے مدینہ میں منتقل ہو گیا۔ مدینہ میں دس سال تک شری طاقتیں اس انقلاب کی آواز کو دبانے کی انتہائی کوششوں میں مصروف رہیں مگر یہ سب کوششیں رائگاں گئیں۔ آخر کار دس سال کے بعد اس ہمہ گیر انقلاب کا داعی ایک فاتح اور منصور کی حیثیت سے مکہ میں دوبارہ داخل ہوا جس کے نتیجے میں بڑی بڑی شر پسند طاغوتی طاقتوں نے اس کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا۔ دنیائے مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک، چہار دانگ عالم میں اس انقلاب کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھی۔ قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا، زرتشتی آتش کدے ٹھنڈے پڑ گئے۔ شام و عراق کے سلاطین کے قلعوں کی بنیادیں ہل گئیں اور محلوں کے کنگرے گر پڑے۔ مصر و روما کے محلوں کے چراغ گل ہو گئے اور چین و ہندوستان کے خاقان اور مہاراج خواب غفلت سے چونک اٹھے۔ دنیا کے غریب و مظلوم عوام کی تاریک رات کی سحر نمودار ہوئی۔ بابلی جم غفیر نے اپنی کھوئی ہوئی نعمتیں دوبارہ پالینے کا مژدہ سنا۔ اعلان کیا گیا کہ سب انسان برابر ہیں اور برتری اور سربلندی سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں۔ خدا کے سوا کسی کے آگے گردن نہ جھکاؤ اور عبادت کا طریقہ بتایا اور اطاعت کے حقدار صرف محمدؐ ہیں۔ داعیٔ انقلاب کی آواز کے سوا اور کسی کی آواز نہ سنو۔ کوئی اطاعت و عبادت کا مستحق نہیں سوائے اللہ کے اور محمدؐ اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔

اسلام ایک عالمگیر انقلاب کا داعی تھا۔ لیکن اس کا پہلا اور براہ راست مقابلہ قیصر روم اور کسریٰ ایران سے تھا ان کی شہنشاہیوں سے تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ اس عہد میں ظلم و بد اعمالی کی تمام طاقتوں نے روم و ایران کی شہنشاہیوں کے دامن میں پناہ لے رکھی تھی، اسلئے اسلام کا سب سے پہلا مقابلہ

دنیا کا سب سے عظیم دائمی انقلاب

محمد ﷺ پیغمبر اعظم و آخر ۔20 اپریل 571ء کو بمطابق 9 ربیع الاول 40 قبل از نبوت کو مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا عبد المطلب نے آپ کے لئے محمد ﷺ نام پسند کیا جس کے معنی "بہت سراہا گیا" کے بنتے ہیں آپ تاریخ عالم کی وہ عظیم شخصیت ہیں جو واقعی ہی بہت سراہی گئی۔ سرکار دو عالم خاتم المرتبت ﷺ اپنے شجرہ نسب کے اعتبار سے حضرت آدمؑ سے 82 ویں پشت میں پیدا ہوئے آپ ابوالانبیا حضرت ابراہیمؑ کی ترسیٹھ ویں پشت سے ہیں 21 ویں پشت سے معد بن عدنان کے بعد آپ کا سلسلہ نسب صاف ہے کہ اس پر اعتراض کرنے کی آج تک کسی کو جرات نہیں ہوئی۔

جب آپ کا سن مبارک چالیس سال کا ہوا تو پختگی شعور کے اس عہد میں آپ پر وحی نازل ہوئی، اسی کے کچھ عرصہ بعد آپؐ نے دنیا کے سب سے ہمہ گیر انقلاب یعنی اسلام کا اعلان کیا۔ معدودے چند لوگوں نے اس اعلان پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا بقیہ تمام معاشرے آپ بپا ہوئے کئے ہوئے اس انقلاب پر یقین نہ کرتے ہوئے آپؐ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مقاطعہ شعیب ابی طالب سے آپؐ کو شہید کرنے کے منصوبے تک دور ابتلا دنیا کی پیغمبرانہ تاریخ کا سب سے عظیم دور ابتلا تھا جس میں سے آپؐ نے گذر کر اپنے انقلاب کو سچائی کی بنیادیں فراہم کر دیں۔ اسی ثابت قدمی کے نتیجے میں آپ کو مدینہ جیسا عظیم مستقر نصیب ہوا جہاں آپؐ نے اپنے انقلاب کو عملی طور پر نافذ کیا۔

............بھی انہیں سے تھا تا کہ اس ٹھکانے کو تباہ و برباد کر دیا جائے جہاں فتنہ و فساد کے یہ جراثیم پل رہے تھے۔ اسلام نے قابیلی فلسفہ کا زور توڑنے کے لیے جو انقلاب بپا کیا اور دنیا کو جو مکمل نظام معاشرت و سیاست دیا اس پر یہاں تفصیل سے لکھا جانا تو ممکن نہیں البتہ یہاں صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ اسلام نے زندگی اور معیشت کے کیا اصول مقرر کیے تھے۔

توحید:

خدا صرف ایک ہے اور وہ کوئی ایسی شکل وصورت نہیں رکھتا جسے انسانی آنکھ سے دیکھا جا سکے۔ وہ ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو ساری کائنات پر محیط ہے۔ ایسی قدرت کاملہ ہے جو نظام کائنات کی تخلیق کی ذمہ دار ہے اور وہی تمام سچائیوں اور صداقتوں کا سرچشمہ ہے۔ تمام تعریفیں اسی کے لئے ہیں۔ تمام قسم کی عبادتوں اور اطاعتوں کا حقدار صرف وہی ہے۔

مساوات:

تمام انسان برابر ہیں، نسل و نسب کا امتیاز کوئی چیز نہیں، خاندان و دودمان کوئی چیز نہیں، تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی

...خدا کے نزدیک شرافت و بزرگی ہر اس شخص کو حاصل ہے جو برائیوں سے بچے اور نیکیوں کی طرف...

...گئے تھے۔ ... جو مدتوں سے چلا آ رہا تھا اسے ختم کر دیا گیا۔ غلامی کے مقابلے میں ...

...

غلامی کا خاتمہ:

آزادی کو غلام بنا کر بیچنے کا جو جاہلی نظام مدتوں سے چلا آ رہا تھا ... زیادہ موثر تھی۔ یعنی غلامی منسوخ کرنے ... جنگ کی ضربوں سے ... کو ختم کیا ... پیدا کر دیا گیا۔ یعنی پھوڑے کو کاٹ کر پھینکنے کی بجائے ... غلامی کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا گیا ... اسلام میں غلام کا اطلاق صرف جنگی قیدیوں تک محدود کر دیا گیا۔ اہل مغرب کی طرح ... کیونکہ اسلام ... نہیں ہے۔

رہبانیت کی نفی:

اسلام رہبانیت کا قائل نہیں۔ نہ اسلام کا راستہ یہ نہیں کہ دنیا سے منہ موڑ کر انسان کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھ جائے۔ بلکہ زندگی کی دوڑ میں اسے سب کے ساتھ مل کر مقابلہ کرنا چاہیے اور اپنی قوت بازو سے اپنے لئے روزی حاصل کرنا چاہیے۔ اسلام کا قول ہے کہ جائز طریقے سے روزی کمانا عین عبادت ہے۔

ظلم کا مقابلہ:

اگر زندگی کی اس جدوجہد میں ظلم و بے انصافی تمہارا راستہ روکے تو پوری پامردی کے ساتھ آگے بڑھ کر ان مشکلات کا مقابلہ کرو۔ ظالم تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی اسکے آگے پیش کرنے کی بجائے تم ہو سکے تو اسے ظلم کا مزہ اس کو چکھا دو اور جوابی طور پر اس کے منہ پر بھی تھپڑ جما دو۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان۔ ہر محاذ پر ڈٹ کر برائی کا مقابلہ کیا جائے۔

حصول اقتدار:

طاقت کے سرچشمہ پر قبضہ کرو اور ایسا نہ ہونے دو کہ تمہاری غفلت یا سستی سے طاقت و قوت پر ابلیست قابض ہو جائے۔ اپنے جسم کو طاقتور بناؤ۔ ایسی ریاضت نہ کرو جو تمہیں نیم جان کر دے۔ حق و انصاف پر قائم رکھنے کے لئے زمین کی سرداری قابیلی گروہ سے چھین لو۔ ان سے لڑو ان پر جہاد کرو اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ اسلام کے یہی اصول اسلام کو تمام ادیان رہبانیت سے الگ کرتے ہیں۔ اور حکومت کے حصول کے بعد اللہ کے دین کو شریعت محمدی کو نافذ کرو۔

دین و دنیا:

قابیلی گروہ کا سب سے کامیاب حربہ یہ تھا کہ اس نے زندگی کو دو حصوں میں بانٹ کر رکھا تھا ایک دنیا اور دوسرا دین۔ خوشحالی اور فارغ البالی، سربلندی اور سرسبزی کے تمام لوازمات دنیوی زندگی میں داخل تھے اور بدحالی و کمزوری، بے چارگی کو دین سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ زندگی کی تمام لذتیں، زمین کی ساری پیداوار اور حسن فطرت کی تمام رنگینیاں صرف دنیا کا حصہ بن جاتیں اور دیندار کو ان سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ دنیا و دین کی اس تقسیم کو اسلام نے جائز قرار نہیں دیا بلکہ دنیا کو...

لذتوں سے جائز فائدہ اٹھانے کو مباح قرار دیا۔ کیونکہ اسلام ہی دینِ فطرت ہے۔

ان تمام خصوصیات کی بنا پر اسلام دوسرے مذاہب عالم کی طرح محض عبادات یا رسوم و توہمات کا مجموعہ نہیں ٹھہراتا بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ اسلامی نظام حیات کسی خاص ملک، قوم، نسل یا طبقے کے لئے مختص نہیں بلکہ عالم گیر ہے اور اس کا مقصد تمام نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ اسلام کے اصول عالمگیر اور فطرت انسانی کے مطابق ہیں۔ اس لیے وہ تمام انسانوں کے لئے قابل قبول اور قابل عمل ہیں۔ اور چونکہ اسلام انسان کی دینی اور دنیاوی زندگی میں تفریق کی بجائے ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے اور دونوں کی فلاح و اصلاح اس کے پیش نظر ہے۔ اس لیے نہ صرف مذہبی بلکہ دنیاوی زندگی کا ہر شعبہ بھی احکام الٰہی کا تابع ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے نہ صرف عبد و معبود اور خالق و مخلوق کا تصور بدل دیا بلکہ معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، تمدنی غرض کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ایک شعبے میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کی تعلیم دی اور ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جو تمام سابقہ انسانی معاشروں سے مختلف ہے اس نئے یا اسلامی معاشرے کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی وحدت و اقتدار کا تصور ہے اور اسلامی نظام قوم، وطن کی اساس کی بجائے دین کے اصولوں پر قائم کیا گیا ہے۔

10 اگست 610ء کو جبرائیل امین پیغمبرِ اسلام کے پاس آئے اور آپ کو پڑھنے کی تلقین کی جیسا کہ آپؐ امی (ان پڑھ) تھے۔ حضرت جبرائیل نے آپؐ کو اقراء باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ والی آیات پڑھائی، یہ نزول وحی کا آغاز تھا اور یہی آغاز اسلام یا انقلاب اسلام کی ابتدا۔ یعنی انقلاب اسلام کا آغاز اقراء کے حکم سے ہوا۔ اس پیغام کی آمد کے بعد شروع شروع میں آنحضرت نے خفیہ طور پر تبلیغ کا آغاز کیا، لیکن تین سال کے بعد آپؐ نے اعلانیہ تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ ابتدا میں مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، خواتین میں حضرت خدیجہؓ بچوں میں حضرت علیؓ اور غلاموں میں حضرت بلالؓ حضرت زید بن حارث نے اس انقلابی پیغام کو قبول کیا۔

اعلانیہ تبلیغ کے آغاز کے دن آنحضرتؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر فرمایا کہ بتاؤ اگر میں تم سے کہوں کہ وادی مکہ سے سواروں کا ایک لشکر تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم یقین کرو گے، سب نے کہا ہاں کیوں نہیں، ہم نے آپؐ کو صرف سچ بولتے دیکھا ہے۔ آنحضرت نے اس پر اسلام کی دعوت دی جس سے مشرکین مکہ کو سخت تکلیف پہنچی اور سرداران مکہ حضرت ابو طالب، آنحضرتؐ کے چچا کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے بتوں کو برا کہتا ہے اور ہمارے آباؤاجداد کو برا بتاتا ہے اور ہمیں احمق ٹھہراتا ہے، اسے اس کام سے منع کر دیا پھر تم درمیان سے ہٹ جاؤ کہ ہم خود اسے سمجھا لیں گے۔ حضرت ابو طالب نے الٹا انہیں سمجھا کر چلتا کیا مگر آنحضرت کی انقلابی کوششوں پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ سرداران مکہ ایک بار پھر آنحضرتؐ کے چچا کے پاس شکایت کناں ہوئے اس مرتبہ جب حضرت ابو طالب نے آنحضرتؐ کو سرداران مکہ کی آمد کا سبب بتایا تو بڑا انقلابی جواب دیا کہ اے چچا اگر یہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج رکھ دیں اور بائیں ہاتھ چاند رکھ دیں تو پھر بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ اللہ مجھے غالب کر دے یا پھر میں اس کام میں ہلاک ہو جاؤں۔ حضرت ابو طالب نے جب آنحضرتؐ کا عزم صمیم دیکھا تو آپ کی حمایت میں ڈٹ گئے۔ اس کے بعد دور ابتلا شروع ہوا جو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت تک جاری رہا۔ آنحضرتؐ کی زندگی اور انقلاب اسلام کی تاریخ میں ہجرت ہی وہ موڑ ہے جب مرکز

کی تبدیلی سے کامیابی نے آپ کے قدم چومے اور عرب معاشرے میں جس انقلاب کے خواہاں تھے وہ مدنی معاشرے کی صورت میں پوری دنیا کے لئے ایک مثال کے طور پر ابھرا۔ اگلے دس سال آنحضرت نے شمع انقلاب اسلام کی روشنی کو پورے عالم عرب میں پھیلانے میں گذارے ادھر طاغوتی طاقتوں نے اس شمع انقلاب کو کئی بار بجھانے کے لئے مدینہ پر حملہ کیا مگر مدنی کمائی اور انقلاب اسلام کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

انقلاب اسلام کے نتائج

انقلاب جس انداز سے داعی انقلاب اور آپؐ کے خلفائے راشدین کے زمانے میں جس رانگی سے آگے بڑھ رہا تھا اگرچہ صرف پچاس برس بعد ہی اسے یزید بن معاویہ کی بغاوت نے تھوڑا بہت صحیح رنگ میں جلوہ گر ہونے سے روکا لیکن اس رکاوٹ کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسلام نے انسانی ذہنیت، انسانی معاشرت و معیشت اور انسانی نظام سیاست کی جو انقلابی تعبیری تھی وہ سب کالعدم ہو گئی۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام جس شان سے اٹھا اور انسانیت کی اصلاح کے لئے جو اصول اس نے مرتب کئے تھے وہ سب بروئے عمل نہ آسکے، مگر پھر بھی انقلاب کی کامیابیاں کسی طرح کم نہیں ہوئیں ان کامیابیوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے، تاہم اسلام دنیا کے جس خطے، جس علاقے جس قوم اور جس ملک میں بھی پہنچا اور وہاں اس نے انسانی فکر و عمل میں جو نیا رنگ پیدا کیا اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔

۱۔ اسلام کی سب سے پہلی اور بڑی کامیابی عقیدہ توحید کی عام اشاعت و مقبولیت ہے۔ انسانی جبیں نیاز کے جیسیوں خداؤں کے جو آستانے بنے ہوئے تھے وہ سب ختم ہوئے۔ اپنے اوہام و خیالات سے ڈرنا، مظاہر فطرت کو خدا سمجھنا اور ہر چیز میں دیوتاؤں کو مجسم دیکھنا ختم ہوا جس کے ساتھ ذہنی غلامی اور ذہنی مرعوبیت کا دور بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور اس کی بجائے آسمان و زمین کے مناظر اور قدرت کے مظاہر پر غور و خوض کا دور شروع ہوا۔ سائنس و فلسفہ کو اوہام کے قید خانے سے نکلنے کا موقع ملا۔

۲۔ خدا شناسی اور خدا رسی کسی خاص طبقے کا استثنائی حق نہیں رہا۔ خدا اور بندے کے درمیان جو حجابات حائل تھے وہ سب ختم ہو گئے اور ہر شخص کو علم سیکھنے کے یکساں مواقع اور حق حاصل ہوا خدا سب کا مربی ہے اور اس کی رحمت کا دروازہ ہر شخص پر ایک ہی طرح کھلا ہوا ہے۔ اس لئے اس تک پہنچنے کی کسی پجاری اور برہمن کی ضرورت نہ تھی۔

۳۔ خدا کی عبادات اور روزمرہ معاشرت دونوں میں سینکڑوں پیچیدہ رسوم جو مذہب کے نام پر مذہب کے اجارہ داروں نے اپنے مفاد و اغراض کے لئے رائج کر رکھی تھیں وہ سب ختم کی گئیں۔ اور ان کی جگہ نہ صرف عبادات بلکہ پیدائش سے موت تک کی ہر معاشرتی رسم میں بھی فطرت کی سادگی کو پیش نظر رکھا گیا جن کی بجا آوری کے لئے کسی پروہت اور پجاری کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

۴۔ ایمان اور عقیدے کی پختگی کے لئے محیر العقول کرشموں اور معجزات پر یا اندھی تقلید و تائید پر زور دینے کی بجائے، کائنات فطرت کے مظاہر و مناظر پر غور کرنے کی تعلیم دی گئی اسی بنا پر امام رازی، صاحب تفسیر الکبیر کا قول ہے کہ جو شخص اسلامی عقائد پر غور و خوض کرکے عقل و فراست کے ساتھ ان پر یقین نہیں رکھتا اس کا ایمان و یقین ناقص رہتا

ہے۔

۵۔ دین و دنیا دو متضاد چیزیں نہ رہیں بلکہ ایک دوسرے کی ممد و معاون بن گئیں۔ رہبانیت اور ترک دنیا کے نام پر قوائے عمل کو مفلوج کر دینا، تسلیم و رضا کے نام پر ذلت و مظلومیت پر قناعت کرنا اور اخلاق و انکساری کے نام پر غلامی و بندگی پر فخر کرنا ختم ہوا۔

۶۔ دوسرے مذاہب کے ساتھ محض ظاہرداری یا مجبوری کی بنا پر نہیں بلکہ اصلی دلی اور گہری رواداری کا دور شروع ہوا دنیا کے ہر ہادی و مصلح کو برحق قرار دیا گیا اور دوسرے مذاہب سے عناد رکھنے یا علیحدگی اور کنارہ کشی اختیار کرنے کی بجائے ہر الہامی کتاب رکھنے والی ملت کے ساتھ مل جل کر رہنے اور یہاں تک کہ معاشرتی بلکہ ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی ہمت افزائی کی گئی۔

۷۔ انسانوں میں کوئی اونچ نیچ نہیں، کوئی چھوت چھات نہیں دولت و ثروت یا نسل و نسب کوئی معیار شرافت نہیں نہ صرف مسلمان بلکہ ہر الہامی کتاب رکھنے والے کے ساتھ شادی (صرف مرد حضرات) کرنے، ساتھ کھانے اور ساتھ رہنے میں کوئی برائی نہیں۔ قبیلے اور قومیں صرف اسی لیے بنے ہیں کہ باہم ایک دوسے کی پہچان ہو سکے ان میں کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں فضیلت صرف اچھے اعمال کی بنا پر ہے۔

۸۔ بادشاہ بالکل خدائے مطلق نہ رہا بلکہ احکام الٰہی کی اطاعت کا ثبوت دینا اس کے لئے لازم قرار پایا اور احکام الٰہی کی تفسیر کا حق علماء کو دیا گیا اور عالم بننے کا حق ہر انسان کو۔ اس لئے بادشاہ کی غیر مسئول خود اختیاری پر ایک حد تک قدغن ضرور قائم ہوگئی۔ پھر دنیا کو یہ بتایا گیا کہ ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے سر ہتھیلی پر رکھ کر کلمات حق ادا کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔

۹۔ نسلی، وطنی، قومی امتیاز ختم ہوا۔ نہ کوئی قوم بلند نہ کوئی نسل بلند۔ ہر جگہ مسلمان کو مسلمان کا بھائی قرار دیا گیا۔ اور ہر انسان میں اولی الامر حتی کہ خلیفۃ المسلمین بننے کی صلاحیت تسلیم کی گئی۔

۱۰۔ جماعت بندی اطاعت (ڈسپلن) اور امارت پر زور دیا گیا۔

۱۱۔ عورتیں جائداد نہ رہیں۔ انسانیت کی اس نصف آبادی کو مردوں کے برابر حقوق دیے گئے

۱۲۔ اسلام کے بنیادی اصول و عقائد کو انسانی فلاح کا آخری پیغام قرار دیا گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اصولی حقیقتیں ہمیشہ کے لئے عوام کے سامنے روشن ہو کر آ گئیں اور دانش فروشوں کے لئے عوام کو فریب دینے کے مواقع نہ رہے۔

......☆......

750ء عباسی انقلاب

حضرت امام حسنؓ کی حضرت امیر معاویہ سے صلح کے نتیجے میں خلافت راشدہ خلافت بنو امیہ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بنو امیہ نے تقریباً 90 سال حکومت کی جس میں سے 666ء سے 683ء تک امیر معاویہ کا خاندان برسرِ اقتدار رہا اور 683ء سے 750ء تک بنو امیہ کی سربراہی مروان کے خاندان کے حصے میں آئی۔

داعیٔ اسلام کی وفات کے بعد انقلاب اسلام کی عمر صرف 24 سال تھی کہ سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور خلافت کو بادشاہت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد ان کے بیٹے یزید نے اس بغاوت کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اس بغاوت کے بعد سے اسلام کی انقلابی سیاست و معاشرت بدلنا شروع ہوئی اور قبائلی سیاست معاشرت آہستہ آہستہ پھر قبضہ جمانے لگی۔ اسلام کے احکام پر بظاہر عمل اب بھی ہوتا تھا اور اسلام کے پیروؤں کی تعداد بھی کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن اب صرف لفاظی رہ گئی تھی اور روحِ عمل بڑی حد تک مفقود ہونے لگی تھی۔ ڈسپلن کی انقلابی روح دھیرے دھیرے غائب ہو رہی تھی۔ امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں نے شاہان مطلق العنان کی طرح اپنا دربار سجایا تو انہیں روکنے کی طاقت عوام میں نہ تھی اور جو طاقت تھی اس کے صحیح استعمال کا وہ طریقہ نہیں جانتے تھے۔ اس لیے دنیا پھر پرانے رواجوں اور رسموں میں جکڑی گئی اور اسلام کے اصولوں کی بجا آوری بھی بادشاہ کے رحم و کرم پر منحصر رہ گئی۔ عوام کے ہاتھ میں احتساب و نگرانی کی طاقت در مشین نہ ہونے کی وجہ سے خلیفۃ المسلمین بھی علی الاطلاق بادشاہ بن گیا۔ انصاف کرے تو اس کی مرضی نہ کرے تو ہماری قسمت اور اس پر لعنت۔ عوام صرف بغاوت کر سکتے تھے۔ لیکن اگر تحریر و تقریر کی آزادی کو چھین لیا جائے یا سیاسی جماعتوں کے قیام کو روک دیا جائے اور تعلیمی اداروں کا حکومت کے قبضے میں کر لیا جائے تو پھر بغاوت بھی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ امیر معاویہ کے بعد یہ ہوا کہ جو کوئی ان کی مرضی کے خلاف زبان و قلم کو حرکت دیتا تھا اسے کامل بے رحمی کے ساتھ دبا دیا جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں اپنی مرضی و خواہش کے مطابق اسلام کے اصول و احکام کی تعبیر کرنے والے عالموں، قاضیوں اور مفتیوں کا حلقہ پیدا کیا جاتا۔ مسلم اکثریت کے فیصلے اب بھی ہر معاملے میں اسلام کی حقیقی روح کے مطابق ہوتے تھے، مگر اب ان فیصلوں کو بروئے عمل لانے والی طاقت عوام کے ہاتھ میں نہ تھی۔ اب اس پر قبائلی گروہ قبضہ تھا اور یہ گروہ اپنے دستور کے مطابق جس طرح چاہتا تھا اسلام کے مسائل کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا تھا اور اپنے چند دانش مند یا دانش فروش حواریوں کی مدد سے جس رائے کو چاہتا تھا عام مسلمانوں کی رائے بنا دیتا تھا۔ گویا اجماعِ امت کی بات

ان چند علماء کے ہاتھ میں تھی جن کو شاہی خاندان نے اپنے گرد اکٹھا کر رکھا تھا۔

ع دور میں اس کی مست آنکھوں کے محتسب بھی شراب خوار ہوا

اسلام کی روح کو زندہ کرنے کے لئے کربلا کے میدان سے عباسی تحریک تک بہت سے سرفروشوں نے اپنی جان دے کر یہ شاہان بنوامیہ کے خلاف تحریک چلائی مگر ناکام رہی۔ اسی زمانے میں یہ بحث اٹھی کہ خلافت کس کا حق ہے؟ کچھ لوگوں نے خلافت کو صرف خاندان رسول تک محدود کرنا چاہا تھا مگر یہ چل نہ سکی پھر یہ سوال دوبارہ اٹھا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ خلافت صرف قبیلہ قریش کا حق ہے۔ کچھ نے کہا کہ عرب کا حق ہے۔ گویا اسلام اس لیے آیا تھا کہ وہ روئے زمین پر خاندان رسولؐ یا قبیلہ قریش یا اہل عرب کی ایک ابدی شہنشاہیت اور امپریل ازم قائم کردے؟ اجماع امت کا فیصلہ اس کے خلاف تھا۔ جو اسلام نسل ونسب اور ملک وملت کی دیواریں گرانے آیا تھا کیا وہ نئی دیواریں کھڑی کرنے کے حق میں تھا؟ جو اسلام نسبی ونسلی شرافت کے نام اختیارات کو مٹا کر صرف عمل صالح کی شرافت قائم کرنے آیا تھا کیا وہ شریفوں اور سرداروں کا کوئی نیا طبقہ پیدا کرے۔ یہاں یہ مثال بھی عجیب ہے کہ اٹھارویں صدی کے انگلستان کے ایک مفکر خطیب ایڈمنڈ برک نے عیسائی ہونے کے باوجود پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ ''اگر کوئی شخص قرآن کی ایک آیت بھی ایسی بتادے جس میں بادشاہ کو مطلق العنان اختیارات دئے گئے ہوں تو مجھے اعتراف کرلینے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ میں نہ تو قرآن کے بارے میں کچھ جانتا ہوں اور ایشیاء کے بارے میں''۔ لیکن قرآن کی کھلی ہوئی ہدایتوں اور داعئ اسلام اور ان کے جانشینوں (خلافت راشدہ) کے کھلے عمل کے باوجود امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں نے مطلق العنان حکومتیں قائم کی تھیں، جن کے خلاف ردعمل کے طور پر عباسی تحریک ابھری۔

عباسی تحریک:۔ نبی کریم ﷺ کے حقیقی چچا حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے محمد بن علی بڑے سمجھدار اور دور اندیش انسان تھے۔ انہیں کے گھر میں 716ء میں ابوہاشم علوی جو ہاشمیہ نامی انقلابی جماعت کا سربراہ تھا لاولد فوت ہوا جس کے بعد امامت بذریعہ وصیت محمد بن علی عبداللہ بن عباس کو منتقل ہوگئی۔ یہ جماعت ہاشمیہ کہلاتی تھی اور اسے روانڈیہ بھی کہتے تھے۔ محمد بن علی نے ابوہاشم کے دعویٰ اختیار کرلیے اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہاشمیہ فرقے اور اس کی تبلیغی جماعت اور انقلابی تنظیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جو بالآخر عباسی تحریک کے کام آئی۔

اس انقلابی جماعت کی سرگرمیاں 718ء سے شروع ہوتی ہیں ہاشمیوں نے کوفہ کو اپنا صدر مقام قرار دے کر خراسان ایلچی بھیجے، جن میں خداش کو کامیابی حاصل ہوئی مگر اس کا راز قبل از وقت فاش ہوگیا جس کی پاداش 736ء/118ھ میں وہ قتل کردیا گیا۔ شیعان علی کا اعتدال پسند طبقہ جس کی حمایت محمد بن علی ابھی تک حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا، خداش کے انتہا پسندانہ عقائد نشر کرنے کی بنا پر اس سے برگشتہ ہوگیا۔ چنانچہ اس کی موت پر محمد بن علی نے یہ سمجھا کہ اس سے بے تعلقی ظاہر کردے اور خراسان میں اپنے ارادے کو سلیمان بن کثیر کی نگرانی میں دے دے۔ جو شیعان علی کا بڑا مبلغ تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تعطل رہا جس کے دوران 743ء میں محمد بن علی کی وفات ہوگئی ان کا بیٹا ابراہیم ان کی جگہ امامت کا مدعی ہوا اور خراسانی پیروؤں نے، جن میں سلیمان بن کثیر بھی شامل تھا، اس کے دعوے کو تسلیم کرلیا۔ ابراہیم کے زمانے میں عملی سرگرمی کی ایک نئی شکل ظہور میں آئی یعنی 128ھ/745ء میں ابراہیم نے اپنے مولیٰ ابومسلم کو اپنا ذاتی نمائندہ بنا کر خراسان بھیجا۔

ابو مسلم جو خراسانی کہلایا ابراہیم کا ایرانی آزاد کردہ غلام تھا بعض ماخذ کے مطابق ابو مسلم کا دعویٰ تھا کہ وہ خاندان عباسیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی بنا پر خاندان سے منسلک کر لیا گیا جو اس زمانے کے رواج کے عین مطابق تھا۔ خراسان میں ابو مسلم کی دعوت نے لوگوں اور فوری کامیابی حاصل کی اور عباسی انقلاب کے لئے زمین ہموار کر دی۔ سیاہ رنگ جو بعد میں عباسیہ کا نشان بنا بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بنو امیہ کے باغی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عراق جو سابق میں امویوں کے خلاف تحریک کا بڑا مرکز تھا اپنی قوت کھو چکا تھا۔ علاوہ ازیں اس پر اموی حکومتیں بڑی کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اسی وجہ سے عباسیوں نے خراسان کو ایک نئی سرزمین انقلاب کے طور پر اپنایا تھا۔ ابو مسلم نے بہت جلد مرو پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد اپنے سپہ سالار قحطبہ الطائی کی مدد سے پورے خراسان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ خراسان سے باغی یا انقلابی عباسی فوج رے کی طرف بڑھی اور کرمان سے آنے والی ایک فوج کو شکست دے کر نہاوند پر قابض ہو گئی۔ اب عباسی انقلاب کا راستہ عراق تک صاف ہو گیا۔ 749ء میں عباسی فوج نے دریائے فرات کو شہر کوفہ کے شمال سے عبور کیا اور ایک اموی فوج کو شکست دی۔ سپہ سالار قحطبہ میدان میں کام آیا مگر اس کے بیٹے نے کوفہ پر قبضہ کر لیا۔ 748ء میں امام ابراہیم کو اموی خلیفہ مروان نے گرفتار کر لیا اور کچھ عرصہ کے بعد قید ہی میں امام کا انتقال ہو گیا۔ گرفتاری سے پہلے امام ابراہیم نے اپنے بھائی ابو العباس کو اپنا وصی مقرر کیا تھا۔ باغی عباسی افواج نے 749ء میں ابو العباس السفاح کو تخت خلافت پر متمکن کر دیا۔ اسی دوران ایک عباسی فوج ابو عون کی قیادت میں نہاوند کی طرف سے الجزیرۃ کی طرف بڑھی۔ 749ء میں شہر زور کے قریب دریائے زاب اعلیٰ کے مشرق میں ایک اموی فوج کو جو خلیفہ مروان کے بیٹے عبداللہ کی قیادت میں تھی شکست دی۔ اس پر مروان خود میدان جنگ میں کود پڑا اور دریائے دجلہ کو عبور کر کے زاب اعلیٰ کی طرف بڑھا۔ زاب اعلیٰ کے مقام پر عباسیوں سے جنگ ہوئی۔ 750ء/132ھ جس میں اموی خلافت کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ مروان شکست کھا کر شام کی طرف بھاگا جہاں اس نے مزید مزاحمت کی ناکام کوشش کی۔ مگر فتح یاب عباسی فوجوں نے دمشق پر قبضہ کر لیا، پھر مروان کا تعاقب کرتی ہوئی مصر تک پہنچ گئیں۔ یہاں مروان قتل کر دیا گیا اس کا سر کوفے میں السفاح کے دربار میں بھیجا گیا۔ اسکے ساتھ ہی عباسی خلیفہ کا اقتدار پورے مشرق وسطیٰ پر قائم ہو گیا۔ اور عباسی انقلاب مکمل ہو گیا۔

عباسی انقلاب کی تاریخی اہمیت کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مروان کے قتل کے بعد عباسیوں نے چن چن کر امویوں کو قتل کیا یہاں تک کہ مردوں کو قبر سے اکھاڑ کر ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ صرف ایک اموی شہزادہ عبدالرحمن الداخل اس انقلاب سے بچ کر اندلس پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

عباسی انقلاب محض ایک شاہی حکمران خاندان کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ محققین نے لکھا ہے کہ یہ ایران کی آریہ نسل کی عرب کی سامی النسل کے خلاف جنگ تھی جو عربوں پر ایرانیوں کی فتح پر منتج ہوئی۔ اسلئے امویوں کی وہ سلطنت جسے مورخین نے عرب سلطنت کہا ہے ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایک ایرانی سلطنت ایرانیت آمیز اسلام کا لبادہ اوڑھ کر قائم ہو گئی۔ مورخین نے اس بات کی تائید بہت سی باتوں سے کی ہے۔ مثلاً ایرانیوں نے عباسی انقلاب میں بلاشبہ نمایاں حصہ لیا نیز نئی سلطنت میں امراء اور وزراء بھی بڑی تعداد میں ایرانی ہی تھے اور عباسی حکومت و ثقافت میں بھی ایرانی رنگ نمایاں تھا۔ اسی وجہ سے مورخین یہ کہنے میں بجا ہیں کہ یہ انقلاب دراصل عربیت پر ایرانیت کی فتح تھی۔ اس انقلاب کی ایک اور داخ

بڑی تبدیلی یہ تھی کہ مرکز حکومت شام سے عراق منتقل کر دیا گیا۔ یہ وہی عراق تھا جو قدیم زمانے میں مشرق وسطیٰ کی بڑی عالمی سلطنتوں کا مرکز رہ چکا تھا اور اس تہذیب کا محور تھا جسے مشہور برطانوی مورخ ٹائن بی نے شامی تہذیب کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پہلے خلیفہ السفاح نے دارالحکومت ایک چھوٹے قصبے ہاشمیہ میں قائم کیا جو کوفہ کے قریب دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر آباد تھے۔ پھر دارالخلافہ تخت الانبار منتقل کیا گیا مگر آخر میں بغداد اس کا مرکز تجویز ہوا۔ جو اگلی پانچ صدیوں تک کے لیے عباسی خلافت کا دارالخلافہ بن گیا۔

......☆......

1571ء تحریک اصلاح مذہب
انقلاب
یا نظام پاپائیت کے خلاف انقلاب

مذہبی سرداری کی حیثیت سے پاپا یا پوپ کا وجود یوں تو بہت پہلے سے ہو گیا تھا، لیکن اس کی زبردست طاقت اور اقتدار دورِ ثانی صدی عیسوی میں اس وقت شروع ہوا تھا جب رومۃ الکبریٰ کی "مقدس سلطنت کے پہلے شہنشاہ شارلیمان کو روم میں پوپ نے مذہبی رسوم کے ساتھ اپنے ہاتھ سے تاج پہنایا تھا اسی تاج پوشی کے بعد سے روم کی سلطنت "مقدس رومن سلطنت" HOLY ROMAN EMPIRE کہلائی اور اس کے بعد پاپائے روم یورپ کا معنوی فرمانروا بن گیا۔ اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ کے بادشاہوں کا تخت و تاج پوپ کے ادنیٰ اشارے پر تھا۔ وہ جس کو چاہتا تخت پر بٹھا دیتا اور جسے چاہتا تخت سے اتار دیتا۔ دوسرے لفظوں میں یورپ کا سیاسی اقتدار اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس کی حیثیت ایک بادشاہ گر کی ہو گئی تھی۔

پاپائے روم کے ماتحت "مقدس رومن سلطنت" کا قیام دراصل مذہب و سیاست کو یکجا کرنے کی اس جدوجہد کا نتیجہ تھا جس کی آواز دنیائے مذہب میں سب سے پہلے داعیٔ اسلام نے اٹھائی تھی۔ اسلام سے پہلے تک دین کو دنیا سے الگ رکھنے کا رجحان تھا، لیکن اسلام نے دنیا کو بتایا کہ صحیح قسم کی روحانی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک صحیح قسم کا سیاسی اور معیشی ماحول میسر نہ آ جائے چنانچہ سیاسی اور معاشرتی و معیشی اداروں پر قابو پا کر ان کی اصلاح کرنا عین دین قرار پایا۔

پاپائے اعظم نے روما میں جو اقتدار قائم کیا اس کی بنیاد یہی تھی کہ صحیح ہیئت سیاسیہ پیدا کرنے کے لئے سیاست اور معیشت پر اقتدار رکھنا ضروری ہے مگر شومیٔ قسمت سے پوپ نے داعیٔ اسلام کے پیام پر ادھورا عمل کیا۔ وہ بادشاہت کے ادارے کو نہ ختم کر سکا اور نہ پاپائیت میں ضم کر سکا بلکہ بادشاہ کے ساتھ اس نے ایک قسم کا سمجھوتا کر لینے پر اکتفا کیا۔ گویا پاپائیت نے بادشاہ کا علیحدہ وجود تو تسلیم کر لیا مگر اس پر اپنا تسلط قائم رکھنا ضروری سمجھا۔ اس دو رخی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ برابر کی طاقت کے دو سیاسی ادارے وجود میں آ گئے جو حصول اقتدار کے لئے باہم متصادم رہنے لگے۔ جب جس وقت جس کا پلہ بھاری پڑ جاتا وہی دوسرے پر چھا جاتا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی سترہویں صدی تک یورپ کی تاریخ پاپائیت اور بادشاہیت کے تصادم کی مسلسل داستان ہے اس تصادم میں پاپائیت نے اپنی طاقت کو مضبوط

بنانے کے لئے ہندوستان کی برہمنیت کے تصور سے فائدہ اٹھانا ضروری سمجھا یعنی مذہبی تعلیم اور مقدس کتابوں کی توضیح و تشریح کرنے کا حق عوام کی بجائے صرف ایک مخصوص محدود طبقہ کے سپرد کر دیا گیا۔ برہمنیت کا یہ دینی تعلیم کو محدود مخصوص کر دینے والا یہ تصور انقلاب اسلام کے لئے صریحاً خلاف تھا۔ اسلام نے خدا اور انسان کے درمیان برہمن و پروہیت قسم کو ہر وسطی خلیج کو مٹا دیا تھا۔ کیونکہ پاپائیت کو اپنا قابلِ اقتدار قائم رکھنے کے لئے برہمنیت کی ضرورت تھی اس لیے "کلرجی" یا "پادری" کے نام سے اسے ایک نئی شکل میں جلوہ گر کیا گیا۔ تاہم یہاں بھی انقلاب اسلام کے اثرات رنگ لائے اور کلرجی برہموں کی طرح نسلی و نسبی طریقہ نہ اپنایا گیا۔ شروع شروع میں پادری طبقہ اپنی اہمیت قائم رکھنے کے لئے کردار و عمل میں بہت محتاط تھا۔ لیکن جب اس کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا تو رفتہ رفتہ عیش پسندی کا میلان بڑھنے لگا اور ایک وقت آیا جب پاپائے اعظم اور بادشاہ میں کوئی فرق نہ رہا۔ اب پوپ اور بادشاہ دونوں کے درمیان عوام کو لوٹنے کی ایک سازش کارفرما تھی۔ پھر چونکہ پوپ خود کو روحانی فرمانروا کہتا تھا اور بادشاہ کی تمام باتوں کا ذمہ دار اسی کو قرار دیا جاتا تھا اس لئے بدعملیوں کے نتیجے میں سب سے پہلا جذبہ بغاوت و منافرت پوپ کے خلاف ہی پیدا ہوا نہ کہ بادشاہ کے۔

بغاوت و منافرت کے یہ جذبات آہستہ آہستہ بڑھتے رہے آخر پندرھویں صدی عیسوی کے آخر اور سولھویں صدی کے اوائل میں مارٹن لوتھر کی عظیم مصلح شخصیت کی قیادت میں ریفارمیشن یا اصلاح مذہب کی اس زبردست تحریک نے جنم لیا جس نے پاپائیت کے تار و پود بکھیر دیئے اور انقلاب اسلام کا جو پیام پادریوں کے روکنے کی وجہ سے براہ راست نہ پہنچ سکا تھا اس کے اثرات یورپ تک پہنچے۔ مارٹن لوتھر کی تحریک مورخین کے مطابق بالکل اس پیام کا عکس تھی جو بانی اسلام نے انسانیت کے نام دیا تھا کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی وسطی کڑی کی ضرورت یا احتیاج نہیں ہے۔ لوتھر نے پاپائیت کے نظام کو انسان کی اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دے کر بالکل ہٹا دینا چاہا۔ اگرچہ اسکے الفاظ اور ان کی ترکیب مختلف تھی مگر محققین نے لکھا ہے کہ اس کی روح بعینہٖ وہی تھی جو انقلاب اسلام کے پیام میں مرکوز تھی یہ وہ زمانہ تھا جب پاپائی نظام دولت و اقتدار کے نشے میں سرشار تھا۔ عیش و عشرت کے دروازے ہر طرح کھلے ہوئے تھے۔ اخلاق و خداترسی کی دنیا دور کھڑی ماتم کناں تھی۔ یورپ کا دربار کسی عظیم الشان بلکہ بدترین ظالم بادشاہ کے دربار سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ چنانچہ ایک پادری کا قول ہے کہ، عیسائی مذہب ہمارے لئے عیش و عشرت کا بہترین سرچشمہ ثابت ہوا ہے۔ شہنشاہ فرانس فلپس اگسٹس بیت المقدس کی جنگ میں سلطان صلاح الدین کے دبدبہ اور شان کو دیکھ کر بول اٹھا تھا کہ مبارک ہے صلاح الدین جس کی گردن پر کسی پاپائے روم کا جوا نہیں ہے۔ لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ پوپ جو اتنے طویل عریض محل، رفیع الشان میں رہتا ہے اور جس کی جاگیر کا رقبہ ستر ہزار مربع میل ہے اور جس کے حاشیہ برداروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اور ایمان و دیانت کا سرچشمہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ دنیاوی لوازمات اس کے پاس کسی دیانت داری کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ یورپ کے مصلحین میں مارٹن لوتھر۔ زوانگلی اور کیلون جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب PRACHING OF ISLAM میں لکھا ہے کہ اگرچہ یہ مصلحین رومن کیتھولک عقائد سے بالکل مختلف عقائد رکھتے تھے لیکن ان میں بہت سے ایسے مسائل فقہ بھی تھے جو بہ نسبت رومن کیتھولک کلیسا کے اسلامی عقائد سے زیادہ موافقت رکھتے تھے۔

سات مذہبی رسوم:

پاپائیت کے خلاف اس بغاوت یا انقلاب کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ خدا اور بندے کے درمیان پروہیت قسم کی چیز کا کوئی واسطہ نہ ہو چنانچہ سب سے بڑا حملہ ان سات کیتھولک مذہبی رسومات کے خلاف ہوا جن کی ادائیگی صرف کلیسا کے واسطہ سے یا پادری کر سکتے تھے کلیسا کا عقیدہ یہ تھا کہ جو شخص بھی ان رسوم کی ادائیگی میں غفلت برتے گا وہ آخرت میں نجات سے محروم ہو جائے گا اور دنیا میں قید سخت یا موت کی سزا پائے گا۔

۱۔ ان رسوم میں اولین یہ تھی کہ انسان کی پیدائش کے بعد بپتسمہ یا اصطباغ ضروری ہے۔
۲۔ بچوں کے سن شعور پر پہنچنے پر ان کو مذہبی تعلیم دینے کے آغاز کی رسم
۳۔ شادی کی رسم جس کو پادری ہی ادا کر سکتا تھا
۴۔ پادری کے سامنے اپنے پچھلے گناہوں کو کھول کر بیان کرنا لازم تھا اس رسم میں توبہ، اعتراف گناہ، عقوبت نفس وغیرہ کے نام سے کئی مدارج تھے
۵۔ مذہبی پیشوا، پادری بنانے کی رسم
۶۔ حضرت عیسیٰ کی مصلوبیت کی یادگار رسم یا مقدس عشائے ربانی، یہ رسم حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کی یاد میں ہر سال دسمبر میں ادا کی جاتی ہے اس میں شراب میں بھیگی ہوئی روٹی حاضرین مجلس کو تقسیم کی جاتی ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ یہ روٹی اور شراب پادری کی دعا کی برکت سے حضرت عیسیٰ کے گوشت اور خون میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے بعد آپ اپنے جسم خاکی کے ساتھ بنفس نفیس اس محفل میں موجود اور جلوہ نما ہو جاتے ہیں، اسلئے اس کا نام حقیقی موجودگی بھی ہے
۷۔ حالت نزاع میں مرنے والے کے سر پر پادری کے ہاتھ سے مقدس تیل ملنے کی رسم ان سات رسوم میں صرف ایک

پانچویں رسم کے سوا باقی تمام رسوم دنیائے مسیحیت کے لئے لازمی ہے البتہ پانچویں رسم صرف پادریوں تک محدود ہے۔ اگرچہ اس قسم کی رسوم اسلام میں بھی ہیں مگر نہ تو اسلام نے ان کی بجا آوری کو فرض قرار دیا اور نہ ہی ان کی ادائیگی کی پادری کے ہاتھوں ضروری سمجھی۔ مثلاً اسلام میں بچے کا عقیقہ کیا جائے یا نہ کیا جائے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن پاپائی نظام میں مذکورہ بالا رسوم سے روگردانی کرنے والا سخت سزا کا مستوجب تھا۔ پادریوں نے نہ صرف ان رسوم کی ادائیگی لازم اور اپنے ہاتھوں سے ضروری قرار دے رکھی تھی بلکہ اس کے ساتھ عدالت تفتیش قائم کی گئی اور دستاویز مغفرت تک فروخت کی جاتی تھیں۔

عدالت تفتیش یا احتساب:

یورپ کے ہاتھ میں ایک طرف تو یورپ کے بادشاہوں کے تاج تھے اور دوسری طرف عوام کے دل و دماغ کی باگ دوڑ تھی۔ اگر بادشاہ اس کے حکم سے سرتابی کرتا تو اس کا تاج چھین لیا جاتا اور اگر عوام میں کسی کے سر میں سرکشی کا سودا سماتا تو اسے الحاد و کفر کے الزامات لگا کر عدالت تفتیش کے سامنے پیش کر دیا جاتا جو پوپ نے اس قسم کے لوگوں کے لئے خصوصی طور پر قائم کر رکھی تھی۔ یہ عدالت پوپ انوسینٹ INNOCENT نے INQUISITION کے نام سے استیصال الحاد کے لئے قائم کی تھی (1248) اس کی شاخیں سارے یورپ میں قائم کی گئی تھیں پندرھویں اور سولہویں صدی

میں یہ عدالتیں اپنے شباب پر تھیں، ہر وہ شخص جس کے خلاف بے چون وچرا اطاعت سے سرتابی کرنے کا شبہ ہوتا اسے گرفتار کر لیا جاتا اور عدالت کے روبرو پیش کر دیا جاتا مگر ملزم کو نہ تو الزام لگانے والے کا نام بتایا جاتا تھا اور نہ صفائی پیش کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا تھا اور نہ ہی مقدمے کی کارائی اعلانیہ ہوتی تھی۔ ایک بند کمرے میں عدالت کا خفیہ اجلاس ہوتا تھا، فیصلہ دو ٹوک تھا اقرار کر و یا انکار اگر اقرار کر دیا جاتا تو جرم کی سزا موت تھی مگر کیسی موت؟ آگ کے شعلوں یا کھولتے تیل میں مجرم کو غسل کرا دیا جاتا تھا اگر ملزم اقرار نہ کرتا تو سمجھا جاتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اس لیے سچ اگلوانے کے لئے اس پر عقوبت خانے میں ایسی ایسی سختیاں کی جاتیں کہ جن کو دیکھ کر انسان کے ہوش اڑ جاتے ان سختیوں کے نتیجہ میں ملزم اقبال جرم کر لیتا۔ اس اقبال جرم کے بعد بھی اس کی سزا موت تھی یعنی عدالت میں لائے جانے والے کا مقدر ہر صورت میں موت تھا، انکار کی صورت میں اسے اضافی سختیاں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ پادری ججوں کو کسی پر رحم آجائے اسے معاف کر دیں یہ ناممکن بات تھی۔ موت کی سزا عموماً آگ جلا کر دی جاتی اس طرح جتنے آدمی زندہ جلائے گئے ان کی تعداد یورپ کے مورخین نے کئی لاکھ بتائی ہے۔ فرانس کا مشہور مورخ للا رینٹ LLORENT لکھتا ہے کہ صرف سولہ سال کے عرصے میں 9000 انسانوں کو آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔ اس عدالت احتساب کا تختۂ ستم سب سے زیادہ ہسپانیہ کے مسلمان بنے کیونکہ ان پر الزام تھا وہ عیسائی ہونے کے باوجود اندرونی طور پر مسلمان ہی ہیں۔

دستاویز مغفرت:

پوپ کے متعلق یہ طے تھا کہ اس کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا، اس لئے اس کے کسی حکم پر بحث وتمحیص کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی، وہ براہ راست خدا کا نائب تھا اور حضرت مسیح ؑ کا قائم مقام۔ وہ گناہ گاروں کے گناہ معاف کرنے کا حق رکھتا تھا اور خدا کی رحمت وبخشش کے دروازے انسانوں پر کھول سکتا تھا۔ چنانچہ سولھویں صدی میں جب پوپ کو روم میں سینٹ پیٹر کے نام کا گرجا بنانے اور اپنے محل کی رونق بڑھانے کے ضرورت پیش آئی، یاد رہے پوپ کا محل ویٹیکن اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے۔ اس محل سے بڑی عمارت آج تک دنیا میں قائم نہیں کی گئی۔ یہ محل 1151 فٹ لمبا اور 776 فٹ چوڑا ہے اس کے کمروں کی تعداد دس بیس نہیں بلکہ چار ہزار ہے۔ محل کی کئی منزلیں ہیں جن پر جانے کے لئے بے شمار زینے ہیں۔ مگر آٹھ زینے تو اتنے عظیم الشان ہے کہ انہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اس کی غلام گردش کا طول 1-1/5 میل ہے۔ جس طرح نئے بادشاہ اپنے محل کو اپنے پیش روؤں سے زیادہ آراستہ کرتے تھے اسی طرح پوپ بھی اس محل کی آرائش وزیبائش بڑھانے میں اپنے پیشرو پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسے ہی مسئلے پر جب پوپ کو روپئے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے ''دستاویز مغفرت'' INDULGENCES فروخت کرنے کا حکم دیا صلائے عام تھی جو گناہ گار اپنے گناہ اپنی زندگی میں معاف کرانا چاہتا ہے، وہ اپنے گناہوں کی مقدار کے مطابق ان دستاویزوں کی کیٹا گری میں سے کوئی دستاویز خرید لے۔ ہر گناہ کی بخشش کی ایک قیمت مقرر تھی اور ہر قیمت کی دستاویز تیار کی گئی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ خدا کی رحمت کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہو سکتا اور پوپ کے ہاتھ میں اس خزانے کی چابی ہے اس لیے وہ جسے چاہیے رحمت وبخشش سے مالا مال کر سکتا ہے۔ ان حالات میں پوپ اور اس کے کلیسائی نظام کے خلاف بغاوت ہونا یا انقلاب آنا لازمی تھا اگر چہ اس قسم کی کوششیں تیرہویں صدی یا چودھویں صدی عیسوی سے جاری تھیں۔ مگر مارٹن لوتھر کی ''بغاوت''

یورپ کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس بغاوت یا انقلاب کے بعد یورپ میں ایک بالکل نئے معاشی و معاشرتی اور سیاسی نظام کا آغاز ہوا اور پاپائیت کا اثر و اقتدار رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔ یہ تھے انقلاب اصلاح مذہب کے اثرات۔

مارٹن لوتھر:

مارٹن لوتھر جرمنی کے ایک گاؤں آئسل بین EISLEBEN میں 10 نومبر 1482ء کو پیدا ہوا اس کے والدین نہایت غریب تھے اور اس نے ایک جھونپڑی میں آنکھ کھولی، لیکن باوجود غربت والدین نے مارٹن کی تعلیم پر بڑی توجہ سے کام لیا۔ چند سال میں اسے مسیحیت کی اچھی خاصی تعلیم دلوائی اور بالآخر پادری بنا دیا لیکن غیر معمولی ذہین ہونے کی وجہ سے وہ صرف پچیس سال کی عمر میں وٹن برگ کی مذہبی یونیورسٹی میں معلم کے عہدے پر فائز ہو گیا جہاں جلد ہی اس کی خطابت و تقریر و علمیت کی دھاک بیٹھ گئی اسی زمانے میں لوتھر کے ذہن میں پاپائیت کی ناانصافیوں کے خلاف خیالات پیدا ہونے شروع ہو گئے بالآخر چند سالوں میں اس نے پوپ کے بنائے ہوئے نجات اخروی کے اصول رد کر کے اپنے نئے اصول تشکیل دیے مگر ابھی اس نے اپنے ان اصولوں کی اشاعت عام نہ کی تھی کہ پوپ نے دستاویز مغفرت جاری کر دیں جو انتہائی غلط تھیں اس پر مارٹن لوتھر کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ اس وقت پوپ کی یہ دستاویز مغفرت یورپ کے قریے قریے میں عام فروخت ہونے لگی تھیں۔ مارٹن لوتھر کے شہر میں ایک پادری جان ٹنٹ زیل TETZEL ان دستاویز کا تھوک کا بیوپاری تھا مارٹن لوتھر نے اس پادری صاحب کو کہا کہ دستاویز مغفرت بیچنے کا فعل مسیحیت کے خلاف ہے اگر تم پسند کرو تو میں مناظرہ کرنے کے لئے تیار ہوں اس دعوت مناظرہ کے بعد لوتھر نے اس مناظرہ کے لئے پچانوے نکات تیار کیے اور ان کو کاغذ پر نہایت خوش خطی سے لکھ کر 21 اکتوبر 1517ء کو مقامی گرجا گھر کے صدر دروازے پر چسپاں کر دیا یہ گویا پاپائیت کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ تھا جو مشتہر کر دیا گیا تھا۔ جب جرمن عوام کو اس کا علم ہوا تو ان میں ایک زبردست حرکت پیدا ہو گئی ہر شخص دستاویز مغفرت کے خلاف بھرا بیٹھا تھا مگر زبان پر حرف اعتراض لانے کی ہمت نہ تھی لوتھر نے آگے بڑھ کر لوگوں میں جرات پیدا کر دی اور جگہ جگہ سے اس کی حمایت میں آوازیں بلند ہونے لگیں شروع شروع میں تو پوپ نے اس گستاخی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ مقامی پادریوں کو ڈانٹا دھمکاتا رہا مگر جب بغاوت کا یہ سیلاب قابو سے باہر ہونے لگا تو پوپ صاحب گھبراہٹ کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ مارٹن لوتھر کے اعلان بغاوت کے تین سال بعد 1520ء میں پوپ نے ایک فرمان جاری کیا جس میں مارٹن لوتھر کے نظریات جدیدہ پر لعنت و نفرین کی گئی اور ان کے ماننے والوں کو مردود قرار دیا گیا مگر جب یہ فرمان لوتھر کی قیام گاہ وٹن برگ پہنچا تو اس نے اعلانیہ طور پر سب کے سامنے کھڑے ہو کر اسے شعلوں کی نذر کر دیا۔ لوتھر کے اس عمل کی اطلاع جب پوپ کو ملی تو اسے غصے سے زیادہ حیرت ہوئی کہ ایک ماتحت پادری کی یہ گستاخی اور اس پوپ کے ساتھ جس کی نسبت سے وہ یہ طے کر چکا تھا کہ پوپ کا فیصلہ غلط نہیں ہوتا اور جس کے ہر فیصلے میں خدا بولتا ہے۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد پوپ نے پادریوں کا اجلاس طلب کیا اور اس میں لوتھر کو بھی بلایا۔ لوتھر اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس اجلاس میں شریک ہوا اور وہاں پہنچ کر اس نے علی الاعلان اپنے نظریات کے صحیح ہونے کا اعلان کیا اس کا مطلب تھا کہ پوپ کے نظریات غلط ہیں۔ اس قسم کے کفر و الحاد کے لئے پاپائیت نے عدالت احتساب قائم کر رکھی تھی اس لئے بظاہر سب کو یقین تھا کہ اب لوتھر کی قسمت میں آگ کے شعلوں کا غسل لکھا جا چکا ہے مگر اب زمانے کی روش بدل رہی تھی، اور عوام کی ایک بڑی تعداد لوتھر کے

ساتھ تھی چنانچہ لوتھر کو پاپائیت کے جوش انتقام سے بچانے کے لئے ایک نہایت مستحکم قلعے میں پہنچا دیا گیا، جہاں وہ تقریباً ایک سال روپوش رہا۔

پروٹسٹنٹ:

اب عوام میں سوجھ بوجھ پیدا ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں عوام میں ہزاروں لوتھر پیدا ہو گئے کیونکہ لوتھر کا ایک ایک لفظ عوام کے جذبات کا ترجمان تھا۔ پاپائیت نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر اب اس کا زوال شروع ہو چکا تھا اور کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی تھی۔ لوتھر کی تحریک اصلاح (ریفارمیشن) روز بروز طاقت پکڑتی گئی۔ اس وقت یہ تحریک دراصل پاپائیت کی غلط روش کے خلاف ایک احتجاج تھا ایک انقلاب تھا جسے انگریزی زبان میں پروٹسٹ (PROTEST) کہتے ہیں، اس لیے اس تحریک کے حامی پرٹسٹنٹ یا احتجاجی کہلائے۔ رفتہ رفتہ وہ تمام مسیحی فرقے جو پاپائے روم کے کلیسائی نظام سے علیحدہ ہو گئے تھے پروٹسٹنٹ کہلانے لگے اور یہ لفظ پاپائی کلیسا یا رومن کیتھولک فرقے سے اختلاف رکھنے والے تمام فرقوں پر حاوی ہو گیا۔ اس طرح یورپ ایک مکمل مذہبی اور معاشرتی انقلاب سے دوچار ہوا اور اس نے پرانی روش چھوڑ کر آزادانہ روش اختیار کر لی۔

......☆......

انگلستان دورِ انقلاب میں 1649ء

سترھویں صدی کا انگلستان انقلابات کا شکار ہوا۔ مورخین کو فرانس کے برعکس اس صدی میں انگلستان میں تشدد و تبدل کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ صدی کے اندر اندر انگریزوں نے اپنے ایک بادشاہ کا سر کاٹا اور دوسرے کو جلاوطنی پر مجبور کر دیا۔ آج انگریز قوم سب سے بڑھ کر منظم اور ڈسپلن کی شیدا نظر آتی ہے اور یقین ہی نہیں آتا کہ ایک زمانے میں یہ قوم سیاسی اعتبار سے مفسد تھی اور اس پر حکومت ایک مشکل کام تھا۔

نمائندہ پارلیمانی حکومت:

سترھویں صدی میں انگریز قوم نے خاص ہنگامہ آرائی کے بعد ملک داری کا نیا ترمیم شدہ نمونہ پیدا کیا، یہی نمونہ یورپ بھر میں انیسویں صدی کے آخر تک کم و بیش رائج ہو گیا۔ حکومت کے اس نمونے میں جو ترمیم ہوئی اسے مورخین سترھویں صدی میں جمہوریت کا نام نہیں دیتے اور اسے نمائندہ پارلیمانی حکومت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

شاہ چارلس اول اور پارلیمنٹ:

27 مارچ 1625ء کو جیمز اول کا بیٹا چارلس اول تخت نشین ہوا اسے پارلیمنٹ کے ساتھ الجھاؤ اپنے باپ سے ورثے میں ملا۔ اس کے باپ شاہ جیمز اول نے اپنے عہد کی پارلیمنٹ 1606ء میں بلائی تھی، جو 1610ء تک قائم رہی۔ دوسری پارلیمنٹ 1614ء میں بلائی گئی اس میں بعض نئے اراکین آئے جنہوں نے آگے چل عوامی حقوق کی حفاظت کے لئے بڑا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ بادشاہ نے جو نئے ٹیکس عائد کر رکھے تھے، پارلیمنٹ کا پورا اجلاس انہیں پر بحث کرتے گزر گیا یہاں تک کہ بادشاہ نے اس پارلیمنٹ کو منسوخ کر دیا۔ اسے عام طور پر تاریخ انگلستان میں بے نتیجہ پارلیمنٹ کہتے ہیں۔ تیسری پارلیمنٹ 1621ء میں بلائی گئی۔ اس نے بھی کوئی خاص کام سرانجام نہیں دیا۔

احتجاج نامہ کبیر:

18 دسمبر 1621ء کو تیسری پارلیمنٹ نے ایک احتجاج نامہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جو THE GREAT PROTESTATION کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ پارلیمنٹ کو آزادی، حق رائے دہی، حقوق اور اختیارات کے متعلق جو پہلے سے حاصل ہیں وہ انگلستان کی عوام کا پیدائشی حق ہے اور بادشاہ یا حکومت کو تمام ضروری

معاملات پارلیمنٹ میں زیر بحث لانے چاہئیں۔ لیکن فروری 1622ء میں بادشاہ نے اس پارلیمنٹ کو بھی توڑ دیا 1624ء میں شاہ جیمز اول نے چوتھی پارلیمنٹ بھی بلائی لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد 27 مارچ 1625ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ اور شاہ چارلس اول تخت نشین ہوا۔

چارلس اول کی مشکلات:

چارلس اول کے عہد میں اس کے باپ کے زمانے کی مشکلات بڑی تیزی سے نازک صورت حال اختیار کر گئیں۔ جیمز اول اور چارلس اول دونوں یہ چاہتے تھے کہ انگلستان کے دستوری نشوو ارتقاء کا رخ بدل دیں اور ٹیوڈر بادشاہوں کے زمانے کی روش کو ختم کر دیں۔ اور سلطنت کے نظام کو یورپ میں رائج خداداد بادشاہی کے مسلک پر لے آئیں اس کے برعکس پارلیمنٹ کے ارکان یہ چاہتے تھے کہ انگلستان میں بادشاہی کے نام پر ایک بالکل نئی چیز پیدا کریں، یعنی ایک قانون ساز مجلس قائم کر دیں جسے قانون سازی اور پالیسی تجویز کرنے کے سلسلے میں آخری اختیار حاصل ہو اور وہی اس پالیسی کو چلائے۔ یہی کشمکش اب نئی اور نازک صورت حال اختیار کر گئی۔ پارلیمنٹ یورپ میں جنگ لڑنے کے خلاف تھی۔ تاہم انگلستان ہسپانیہ کے خلاف جنگ میں شامل ہو گیا، جنگ پر روپیہ صرف ہوتا ہے ایسے میں چارلس پر واضح ہوا کہ پارلیمنٹ روپیہ دینے کی منظوری دینے پر راضی نہیں۔ پھر یکا یک چارلس فرانس کے ساتھ جنگ میں الجھ گیا۔ اس سلسلے میں اس نے امراء سے جبراً قرض لیا اور پھر حکم دیا کہ فوج عوام کے گھروں میں مقیم رہے اور عوام اس کا خرچ ادا کریں۔

پارلیمنٹ کی معطلی:

ان حالات میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک عرضداشت پیش کی جسے عرضداشت حقوق PETITION OF RIGHT کہتے ہیں۔ اس میں پہلی مرتبہ جدید زمانے کی دستوری حکومت کے حد درجہ بنیادی حقوق واضح کیے گئے۔ یعنی پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا۔ فوج عوام کے گھروں میں نہیں رہ سکتی، زمانہ امن میں مارشل لا نافذ نہیں کیا جاسکتا (یہی مارشل لا کے سلسلے کی بے اصول ہمارے ہاں رائج ہے) کسی کو خاص الزام عاید کئے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا اور الزام کا فیصلہ باقاعدہ قانونی کاروائی کے مطابق ہونا چاہیے۔ چارلس نے روپیہ کے حصول کے لئے یہ عرضداشت منظور کر لی۔ لیکن اس میں وہ ٹیکس بھی شامل کر لیے جن کی منظوری پارلیمنٹ نے نہیں دی تھی۔ جب بادشاہ کی اس بے اصولی کے خلاف پارلیمنٹ نے صدائے احتجاج بلند کی تو بادشاہ نے مفاہمت سے کام لینے کے بجائے سختی اختیار کرتے ہوئے 1629ء میں پارلیمنٹ توڑ دی اور عرضداشت پیش کرنے والوں کو گرفتار کر لیا، گرفتار ہونے والے ارکان میں سے سر جان ایلیٹ نے لندن ٹاور میں بحالت اسیری وفات پائی۔ یہ پارلیمنٹ کی طرف سے پہلا شہید انقلاب تھا۔

خانہ جنگی کا آغاز:

آئندہ گیارہ سال تک شاہ چارلس بغیر پارلیمنٹ کے حکومت کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ حالات بگڑتے گئے۔ اور بادشاہ اور عوام میں دوری بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ عوام نے بادشاہ کے خلاف ایک فوج منظم کر کے حکومت کے خلاف جنگ

شروع کر دی۔ اولیور کرامویل OLIVER CROMWELL بادشاہ کے خلاف لڑنے والے فریق کا سردار تھا۔

انگلستان کا انقلاب دراصل سکاٹ لینڈ میں شروع ہوا۔ سکاٹ لینڈ میں انگلستان کے بانی چرچ کی مذہبی رسوم اور تنظیمات جبری جاری کی گئیں جس سے وہ سکاٹ لینڈ کے پریسبیٹیرزم سے تصادم ہو گیا۔ یہ فرقہ سکاٹ لینڈ میں تین صدیوں سے قائم تھا۔ جب چارلس نے اہل سکاٹ لینڈ کے خلاف اس سلسلے میں فوج کارروائی کی تو خزانے پر بار پڑ گیا اور پہلے سے مالی مشکلات کے شکار شاہ چارلس کو 1640ء میں پارلیمنٹ بلانا پڑی۔ یہ پارلیمنٹ انگلستان کی تاریخ میں مختصر پارلیمنٹ کہلاتی ہے۔ مگر اس پارلیمنٹ نے بادشاہ کو صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک پارلیمانی شکایات دور نہیں کی جائیں گی رقم کی منظوری بھی نہیں دی جائے گی۔ اس پر چارلس نے یہ پارلیمنٹ توڑ دی۔ ادھر اہل سکاٹ لینڈ سے باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ چارلس نے شکست کھائی اور دب کر 850 پونڈ روزانہ کی ادائیگی پر صلح کر لی۔ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کا شاہی خزانہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا پھر پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کیا یہ دور انقلاب کی مشہور ''طویل پارلیمنٹ'' ہے۔

طویل پارلیمنٹ نے بادشاہ کی کمزوریوں اور صورت حال کا فائدہ اٹھا کر اصلاحات کا ایک بڑا سلسلہ شروع کر دیا جس سے شاہی اقتدار پر ضرب پڑتی تھی۔ اسی اثنا میں آئرلینڈ میں بھی ایک بغاوت اٹھی جس میں ہزاروں پروٹسٹنٹ مارے گئے۔ ادھر طویل پارلیمنٹ نے فوج کو شاہ چارلس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا جس سے بغاوت روکی جا سکتی تھی۔ 1641ء میں پارلیمنٹ نے شکایت کا ایک مرقع ترتیب دیا جو ''احتجاج عظیم'' کہلاتا ہے۔

اب چارلس نے پھر وہی تدابیر اختیار کیں جو 1629ء میں کامیاب ہوئیں تھیں مگر اس مرتبہ اس کے حکم پر اس کے پانچ مخالف اراکین گرفتار نہ ہو سکے اور چارلس نے 1642ء میں ناٹنگھم میں فوج جمع کر لی۔ ادھر پارلیمنٹ نے لندن میں مرکزی حکومت کا کاروبار سنبھال لیا اور دونوں فریقین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

بادشاہ کی گرفتاری:

میدان جنگ میں ابتدائی کشمکش غیر فیصلہ کن تھی۔ پھر 1644ء میں کرامویل نے مارسٹن مور کے مقام پر کامیابی حاصل کی۔ 1645ء میں نیزبی کے مقام پر جنگ ہوئی۔ اس میں پارلیمنٹ کی فوج نے بادشاہ کی فوج پر کامل فتح حاصل کر لی۔ چارلس نے فرار ہو کر سکاٹ لینڈ کی فوج میں پناہ لی۔ مگر اس فوج نے بادشاہ کو پارلیمنٹ کے حوالے کر دیا اور معاوضے میں چار لاکھ پونڈ لے لئے۔ جن انقلاب پسندوں نے انقلاب انگلستان کی ابتدا کی تھی اور جنہیں طویل پارلیمنٹ پر بدستور اقتدار حاصل تھا، انہیں اب انتہا پسندوں کے گروہ سے پالا پڑا۔ جو بدستور بادشاہ کے بھی خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انگلستان میں جمہوری حکومت قائم کر دی جائے۔ ادھر فوج چاہتی تھی کہ چارلس کو معزول کر دیا جائے، جس کے نتیجے میں دارالعوام سے چھیانوے ارکان کو زبردستی نکال دیا گیا، کیونکہ پارلیمنٹ بادشاہ کو معزول کرنے پر تیار نہیں تھی۔

بادشاہ کو سزائے موت:

اب باقیماندہ پارلیمنٹ نے جو رمپ پارلیمنٹ RUMP PARLEMENT کہلاتی تھی۔ شاہ چارلس پر ایک خاص عدالت میں مقدمہ چلایا جو معتمد علیہ انتہا پسندوں پر مشتمل تھا۔ اس خصوصی عدالت نے شاہ چارلس کو سزائے موت دی جس پر عمل درآمد کرتے ہوئے 30 جنوری 1649ء کو چارلس اول کا سر قلم کر دیا گیا۔

دولت مشترکہ کا قیام:

اب اس انقلاب کے بعد انگلستان میں جو جمہوریت قائم ہوئی اسے دولت مشترکہ کہتے ہیں۔ مگر جمہوری حکومت ہونے کے باوجود، اس حکومت کے کرتا دھرتا انتہا پسندوں کو یہ جرات نہ تھی کہ آزادانہ انتخابات منعقد کروائیں، کیونکہ نتیجہ لازماً ان کے خلاف نکلتا۔ اس طرح ابتدا ہی سے دولت مشترکہ پر ایک انتہا پسند اقلیت کی آمریت قائم ہوگئی۔ اس نئی حکومت میں مقتدر ترین حیثیت کرامویل کو حاصل تھی۔ اگرچہ وہ ڈکٹیٹری پر رضامند نہ تھا مگر اسے یہ حیثیت قبول کرنا پڑی۔ کرامویل کے زمانے کا انگلستان ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ جن میں اکثریت شاہ پسندوں کی تھی۔ لیکن قوم گذشتہ دس سال کی لڑائیوں بے ضابطگیاں اور لامتناہی تبدیلیوں سے تنگ آ گئی تھی۔ کرامویل کو اس عہد میں دشمنوں سے جو کبھی لڑنا پڑی سکاٹ لینڈ دشمن تھا، آئر لینڈ عداوت میں اسے بھی بڑھ گیا تھا۔ بہر حال 1654ء تک کرامویل رمپ پارلیمنٹ پر قابو نہ پا سکا اس نے جتنی تجویزیں پیش کیں یہ تمام تجویزیں پارلیمنٹ نے ایک طرف پھینک دیں۔ اپریل 1653ء میں وہ خود سپاہیوں کی ایک جماعت لے کر پارلیمنٹ میں پہنچا اور اسے توڑ دیا۔ 1653ء ہی میں اس نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا اور انگلستان، سکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ کا لارڈ پروٹیکٹر یا محافظ بن گیا۔

انقلاب انگلستان پر نظر ثانی:

بلاشبہ انگلستان میں سترھویں صدی کے نصف اول میں یہ ایک بڑا انقلاب آیا تھا جس میں انقلاب فرانس ہی کی طرح دور دہشت بھی تھا مگر جتنا بھی خون بہا وہ باقاعدہ جنگوں میں بہا اور عدالتی قتلوں تک نوبت نہ آئی، البتہ چارلس اول ضرور اس طرح قتل کیا گیا، سٹرافورڈ اور اسقف لارڈ کو بھی سزائے موت دی گئی۔ اس دور میں انگلستان میں مذہبی جنونیت بھی انتہا پر تھی۔ یہ پیوریٹن ازم کا دور عروج تھا۔ زاہدانہ طور طریقوں کی انتہا یہ تھی کہ ریچھ کو پھندے میں پکڑنے اور لوگوں کو سبزے پر ناچنے کی بھی ممانعت تھی۔

بہت سے انگریز اس بڑے انقلاب انگلستان پر آج بھی اس قدر شرمندہ ہیں کہ وہ اسے خانہ جنگی یا بڑی بغاوت سے تشبیہ دیتے ہیں اور انقلاب کہنا پسند نہیں کرتے۔ مگر آپ ہی بتلائے کہ ہم اسے کیا کہیں، لہٰذا ہم نے بھی دیگر مورخین کی تقلید کرتے ہوئے اسے انگلستان کا دور انقلاب ہی کہنے پر اکتفا کیا۔ شاندار انقلاب کا نام انگریزوں نے اس مہذب حرکت کے لئے مخصوص کر رکھا تھا جو 1688ء میں سرزد ہوئی۔

شاندار انقلاب:

1660ء میں بادشاہت بحال ہوئی تو پارلیمنٹ کی برتری مسلم تھی، شاندار انقلاب ایک ناگہانی قدم تھا، جس کے ذمہ دار پارلیمنٹ کے ارکان میں سے شاہ جیمز کے مخالفین تھے۔ وہ اپنے آپ کو وِھگ WHIG کہتے تھے طویل پارلیمنٹ میں جن لوگوں کو اعتدال پسند کہا جاتا تھا۔ وِگ براہ راست ان کے جانشین ہی تھے۔ یہ لوگ امراء اور خوشحال طبقے کی نمائندگی کرتے تھے۔ شاہ جیمز دوم نے دو شادیاں کی تھیں۔ شاہ جیمز دوم، یاد رہے کہ شاہ چارلس دوم کا بھائی تھا اور اس کی وفات پر 1685ء میں بادشاہ بنا تھا۔ شاہ جیمز دوم کی پہلی شادی سے دو بیٹیاں ہوئیں جو پروٹسنٹ تھیں۔ جبکہ دوسری شادی سے ہونے

اور بیٹا کیتھولک تھا۔ ظاہر ہے کہ یہی تاج و تخت کا وارث تھا۔ جس سے پتہ چلا کہ آئندہ انگلستان کے تخت پر ایک کیتھولک بادشاہ بیٹھے گا۔ اس لیے وِگ اس کے خلاف پروپیگنڈہ میں یہاں تک آگئے کہ انہوں نے افواہ پھیلائی کی یہ لڑکا بادشاہ کا اپنا نہیں بلکہ لے پالک ہے، تاکہ کیتھولک جانشین کا انتظام ہو جائے۔ لہٰذا 1688ء میں پارلیمنٹ نے تاج رسمی طور پر...... (ولیم سے گفت و شنید کے بعد انگلستان آنے کی دعوت دی گئی، جب وہ نومبر 1688ء میں انگلستان پہنچا تو جیمز دوم ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔)...... جیمز دوم کی بیٹی کے خاوند ولیم کو پیش کیا۔ اور جو شرطیں باہم طے پائیں ان میں برطانوی دستور کو پارلیمانی جمہوریت کی شکل دینے کے لئے تین ضروری اقدام کیے گئے۔ جن کے بعد بادشاہت محض وظائف کا ایک نشان باقی رہ گئی، جو محبان وطن کے لئے وفاداری کا نشان تھی۔

کابینہ:

ان اقدام میں پہلا اقدام یہ تھا کہ تمام تنفیذی اختیارات پارلیمانی اکثریت کی ایک کمیٹی کے حوالے کر دیئے گئے، یعنی کابینہ تشکیل دی گئی، جس کا رئیس وزیر اعظم ہوتا ہے یہ کام جا کر کہیں اٹھارہویں صدی میں پورا ہوا۔

حق رائے دہی بالغان:-

دوسرا اقدام یہ تھا کہ بالغوں کو حق رائے دہی عطا کر دیا گیا۔ دارالعوام کے ارکان کے لئے مشاہرے مقرر ہوئے یہ کام انیسویں صدی میں شروع ہوا اور بیسویں صدی میں انجام پایا۔

حق تنسیخ کی منسوخی:

تیسرا اقدام یہ تھا کہ دارالامراء کو دارالعوام کے منظور شدہ قوانین کی تنسیخ یا ویٹو کر دینے کا حق حاصل تھا۔ یہ حق منسوخ کر دیا گیا۔ یہ کام بیسویں صدی کے اوائل میں پورا ہوا۔ ظاہر یہ ہے کہ 1688ء میں مکمل جمہوریت ابھی خاصی دور تھی۔ اس کے علاوہ ولیم سوم اور ملکہ میری یہ نہیں سمجھتے تھے کہ انہیں محض آرائشی حکمران بنایا گیا ہے۔ جنہیں حکومتی پالیسی پر کوئی اختیار نہیں۔ شاید انقلاب کے ذریعے سے ایک دوسرا ضروری مسئلہ طے نہ ہو سکا، وہ آئر لینڈ کا مسئلہ تھا۔ مگر اس کے باوجود انگلستان کے ان انقلابات نے سیاسی فکر میں تبدیلی اور جوش پیدا کر دیا۔ اس جوش کے دو بڑے نتیجے انگریزی مفکرین ٹامس ہابز اور جان لاک کی تصانیف تھیں جو سیاست میں شعور پیدا کرتی ہیں۔

1453ء یورپ کی نشاۃ ثانیہ
ایک علمی انقلاب

احیائے علوم:

1453ء میں سلطان محمد فاتح نے یورپ کے مرکز علوم واقتدار، قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے مسیحی دنیا سے الگ کر لیا۔ سلطان محمد ثانی کی اس فتح کے بعد مفتوح قوم کو ان تمام تباہیوں اور تاراجیوں کا شکار ہونا پڑا جو اس قسم کے موقعوں پر مفتوحین کو پیش آتے تھے۔ قسطنطنیہ کا شہر دنیا کی اس عظیم الشان سلطنت بازنطینہ کا پایہ تخت تھا جس نے ایک ہزار سال سے اپنی عظمت وجبروت کا سکہ دنیا پر بٹھا دیا تھا۔ یہ شہر چونکہ مشرق مغرب کے سنگم پر واقع تھا اس لیے اس کے باشندے صرف یونانی علوم وفنون کے ہی ماہر نہ تھے بلکہ عرب وعجم کی ترقیوں سے بھی آشنا تھے۔ مگر جب سلطان محمد فاتح کا لشکر فاتحانہ انداز کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو وہاں کے امراء اور رؤسا کے ساتھ ساتھ وہاں کے اہل علم وفضل بھی شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ چونکہ دنیا میں رسل ورسائل کے ذرائع بہت تیز نہ تھے۔ اس لیے گزشتہ ایک ہزار سال سے قسطنطنیہ کے اہل علم اپنے سرمایہ علم کو قسطنطنیہ کی فصیلوں کے اندر محصور کیے بیٹھے تھے اور ان کی روشنی علم صرف یونان کے ساحلوں تک محدود تھی۔ مگر اب جب اس شہر پر ترکوں قبضہ ہوا تو یہ لوگ عیسائیت کے دوسرے بڑے مرکز اٹلی کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح یورپ نے جو اس وقت تک جہالت کی آماجگاہ تھا ان نو وارد مہمانوں کی شکل میں اپنی علمی ترقی کی توقعات کو پنہاں پایا، گویا قسطنطنیہ کی ترک فتح نے یورپ کے لئے بہت سے معلم علم وحکمت فراہم کر دیے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ ان اہل علم کے گرد طالب علموں کا جمگھٹا اکھٹا ہو گیا، اور آہستہ آہستہ یورپ ان علمی خزانوں سے مالا مال ہونے لگا، جو اب تک صرف یونان سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ بقراط، سقراط، افلاطون، ارسطو سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی تک دنیا نے جو علمی وادبی ترقی کی اس کے دروازے اب یورپ پر کھلنے لگے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پندرھویں صدی کے آخر سے لے کر سولھویں صدی تک ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں یورپ میں علمی انقلاب برپا ہو گیا، جس کی وجہ سے سارے یورپ کی کایا پلٹ گئی۔ اس لئے اس زمانے کو یورپ کی تاریخ میں احیائے علوم وفنون RANAISSANCE کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ہم اسے انقلاب علم وحکمت کا زمانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس دور میں یورپ کا دماغ پاپائیت کی خودساختہ مذہبی پابندیوں اور افسانہ طرازیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ غور فکر کی

آزادی کسی کو حاصل نہ تھی، لیکن احیائے علوم کی اس تحریک نے پر گرفتیں ڈھیلی کر دیں اور یورپ کے لوگ واقعات کو [illegible] میں دیکھنے کے قائل ہو گئے۔ یورپ پر اسلامی تعلیمات کا اثر اس زمانے کے بعد بہت نمایاں ہوا، کیونکہ پاپائیت نے اسلام کے متعلق جو جھوٹی روایات اور افسانے عام کر رکھے تھے۔ ان کا طلسم اس علمی تحریک نے توڑ دیا۔

چھاپہ خانہ:

اسی زمانے میں ایک اہم ایجاد منظر عام پر آئی۔ 1438ء میں جرمنی کے ایک شخص جان گٹن برگ JOHN GUTEN BERG نے چھاپہ خانے کی ایک مشین ایجاد کی جس کی وجہ سے چھاپہ خانہ کی اشاعت میں بہت آسانی پیدا ہو گئی اور اہل علم کی تعلیمات یورپ کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے لگیں۔ احیائے علوم کے اس خوش آئند زمانے اور چھاپہ خانے کی اس مفید ترین ایجاد دونوں نے مل کر لوتھر کی تحریک اصلاح مذہب کو چار چاند لگا دیے ایک طرف تو علم و فضل کے حاملین اہل یورپ کو ذہنی مرعوبیت سے نکال کر۔ کائنات کے وسیع اکتشافی میدان میں لے آئے اور دوسری طرف چھاپہ خانے کی مدد سے علم و فن کی ترویج و اشاعت دور دور تک ممکن ہو گئی اس طرح اب یورپ کا ہر ہر گوشہ علم کی روشنی سے منور ہونے لگا۔ اور اہل یورپ اکتشافات عالم کی طرف رجوع ہوئے۔

قومیت:

ان سب باتوں کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ پاپائیت کے مرکزی اقتدار پر زوال آنے لگا۔ سب سے پہلے ہنری ہشتم نے انگلستان کو پوپ کی اطاعت گذاری سے علیحدہ کیا، اور اسکے بعد دوسرے یورپی ممالک نے پوپ کے اقتدار کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا اور ہر ملک میں اس کے اپنے بادشاہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔ پاپائیت کے مرکزی اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی یورپ میں ہر ملک اور نسل کے لوگوں میں خود مختاری کا تصور ابھرا۔ اب تک یورپ رنگ و نسل کے استثناء کے ساتھ پوپ کے روحانی اقتدار کے تحت ون یونٹ بنا ہوا تھا اور مقدس رومی سلطنت یورپ کے ایک بڑے علاقے پر قابض تھی۔ یہ حکمرانی چند مخصوص افراد کے مفاد کے لئے بہت سے افراد کو قربان کرنے کے پرانے رائج اصولوں پر قائم تھی، جو انسانوں کے طبقے اور گروہ اس ظلم کی چکی میں پسے رہتے وہ بادل نخواستہ صرف اس لئے اسے قبول کرتے کہ پوپ کے مرکزی اقتدار سے جو اس نے مسلمانوں کی خلافت مرکزی کی طرز پر قائم کر رکھا تھا سرتابی کرنے کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اصلاح مذہب اور احیائے علوم کی تحریکوں نے انسانوں کو پیدائشی آزادی کا حق یاد دلایا تو پوپ کے اقتدار کے خلاف بغاوت کر کے ہر ملک و نسل کے لوگوں میں خود مختار ہو کر زندہ رہنے کا جذبہ بڑی شدت سے ابھرا اسی خود مختاری سے قوم یا نیشن کا لفظ پہلی بار بڑی گرم جوشی کے ساتھ مستعمل ہوا اور قومیت یا نیشنل ازم کا وہ تصور پیدا ہوا جس سے دنیا اس وقت تک نا آشنا تھی۔ اگرچہ دنیا میں قدیم زمانے سے قومیں آباد تھیں لیکن قومیت کا جذبہ اور قومی تحفظ و آزادی کی زندگی کا سب سے مقدس فرض سمجھنے کی فکر پندرھویں صدی کے بعد ہی یورپ میں پیدا ہوئی۔ دنیا کی تقسیم زیادہ تر مذہب کی بنیاد پر تھی مگر اب نسل و ملک کی بنیاد پر ہونے لگی۔ انگلستان کے باشندے اگر عیسائی ہیں تو ہوا کریں وہ چونکہ تہذیب و معاشرت اور نسل و نسب کے اعتبار سے فرانس سے مختلف ہیں اس لئے فرانس، ان کی حکومت تو در کنار ان کے اثرات بھی قبول کرنا پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح جرمنی بھی صرف مذہبی یا مسلک کی بنیاد پر فرانس کا ماتحت بننا قبول نہیں کرے گا اس کا عملی مظاہرہ ماضی کی جنگوں اور بیسویں

صدی میں لڑی جانے والی دو عظیم جنگوں میں ہوا۔

جان گوٹن برگ

جرمن پرنٹر جو متحول ٹائپ کے چھاپے خانے کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ میز میں پیدا ہوا۔ سٹراسن برگ میں طباعت کی پہلی مشین ایجاد کی (1437ء) 1448ء میں میز واپس آ کر چھاپہ خانہ قائم کیا اور اپنے رفیق کار پیٹر شوئفر کے تعاون سے بائبل کا ایک نہایت دلآویز نسخہ طبع کیا جو گوٹن برگ کی بائبل کے نام سے مشہور ہوا۔ ابھی یہ بائبل بازار میں نہیں آئی تھی کہ گٹن برگ قرض کے ایک مقدمے میں ماخوذ ہو گیا جس کی بنا پر اس کے چھاپے خانے پر اس کے ایک حصہ دار نے قبضہ کر لیا میز میں مورخین کے مطابق گٹن برگ نے کچھ اور کتابیں بھی چھاپیں جن میں لاطینی لغت اور ایک انسائیکلوپیڈیا بنام JOHANES BABBUS CATHOLICON OF شامل تھے بہر حال یورپ کی نشاۃ ثانیہ کو مطبع کتب فراہم کرنے والا گٹن برگ ہی تسلیم کیا جاتا ہے اس کی زندگی کے آخری ایام کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ میز کے آرچ بشپ نے اسے جنوری 1456ء میں اپنے عملے کا رکن مقرر کیا تھا اور اسلئے اس کی سماجی حیثیت بہت بلند ہو چکی تھی اس کا انتقال 1468ء میں ہوا۔

قومی آزادی و خود اختیاری کا یہ جذبہ آہستہ آہستہ یورپ میں نشو نما پا رہا تھا، لیکن چونکہ اب اقتدار مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا اس لئے وہ قومی جذبہ کو صرف اسی حد تک پھیلنے دیتے تھے جس حد تک ان کی شاہی اغراض اس کی اجازت دیتیں جو بادشاہ اب بھی مقدس رومی سلطنت یا کسی دوسری بڑی سلطنت کے نام پر کئی قوموں اور ملکوں پر حکمران تھے وہ اس قومی جذبہ کو ترقی دے کر کیسے اپنی حدود سلطنت کم کر دینا پسند کر سکتے تھے؟

اس لئے اب پاپائیت کی طرف سے عوام کی توجہ ہٹ کر بادشاہ کی خود مختاری اور مطلق العنانی کی طرف ہو گئی۔ عوام نے دیکھا کہ پوپ کا جوا تو گردنوں سے اتر گیا مگر ان کی بدحالی کا عالم تو اب بھی وہی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جن جن ملکوں نے پوپ سے علیحدگی کا اعلان کیا، وہاں پوپ کا روحانی اقتدار بھی بادشاہ کو مل گیا اس لئے بادشاہ بے پناہ تسلط و اقتدار کے مالک بن گئے۔ اب تک تو پوپ کی قدغن ان کے اختیارات پر قائم تھی مگر اب یہ خود پوپ بن گئے اور خود ہی اپنی نگرانی کرنے لگے۔

میگنا کارٹا:

بادشاہ کی زبان ہر زمانے میں قانون رہی ہے، لیکن جب لوگوں میں شعور و احساس پیدا ہونے لگتا ہے تو وہ بادشاہوں کو شتر بے مہار بننے سے روکنے لگتے ہیں۔ اس قسم کی سب سے طاقتور روک مذہبی احکام پیدا کرتے ہیں۔ مگر یورپ میں چونکہ مذہبی راہنما ہی بادشاہ کو تخت و تاج دیتا تھا اور خود بھی بادشاہ کی طرح شاہی کروفر سے رہتا تھا اس لئے مطلق العنانی پر

مذہبی اقدار میں بہت کمزور پڑ چکی تھی۔ ایسی صورت میں قدرتی طور پر عوام کے دل میں قانون و اصول کے نام پر بادشاہ کو احتساب قائم کرنے کا خیال پیدا ہونا لازم تھا۔ اس تصور نے سب سے پہلا عملی جامہ دور احیائے علوم سے بھی پہلے 1215ء میں انگلستان میں پہنا جب انگلستان کے بادشاہ جان کو امراء و روساء نے مجبور کر کے اس اعلان پر دستخط کرائے جو میگنا کارٹا یعنی منشور اعظم یا منشور آزادی کے نام سے مشہور ہے۔ اس منشور کی خاص اہم دفعات کا منشا یہ تھا کہ کسی آزاد شخص کو بلا وجہ نہ قید کیا جائے گا نہ ہی اس پر کوئی مقدمہ چلایا جائے گا صرف اس صورت میں یہ سب کچھ کیا جائے گا جب ملکی قوانین اس کی اجازت دیں اور اسے باقاعدہ طور پر ججوں کے سامنے پیش کر کے اس پر جرم ثابت کیا جائے۔ ملک کے طول و عرض میں ناپ طول کے پیمانے یکساں ہوں گے۔ غیر ملکی تاجروں کو آزادی تجارت حاصل ہوگی۔ زمانہ قدیم سے جو آزادیاں عوام کو حاصل ہیں انہیں برقرار رکھا جائے گا اور کسی قسم کا کوئی محصول اس وقت تک نافذ العمل نہیں کیا جائے گا جب تک کونسل سے اس کی منظوری نہ لے لی جائے۔ اگرچہ اس وقت کونسل کے ارکان صرف امراء اور روساء تھے مگر پھر بھی اس پابندی سے بادشاہ کی شخصی مطلق العنانی کی نفی ہو جاتی تھی۔

جب اس منشور اعظم پر دستخط کیے گئے تو اس کی بہت سی نقلیں بھی تیار کی گئیں تاکہ وہ ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔ ان نقلوں میں سے دو نقلیں آج بھی برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہیں۔ شاہ جان کے بعد میگنا کارٹا کی توثیق و تصدیق تیس سے زائد بار دیگر بادشاہوں کے عہد میں مسلسل کرائی جاتی رہی تاکہ کوئی بادشاہ اسے نظر انداز نہ کر دے۔

شاہی اختیارات پر پابندیاں:

لیکن بادشاہ کے مطلق العنان اختیارات پر قدغن لگانے کا خیال دراصل تحریک اصلاح مذہب اور احیائے علوم کے بعد بڑی شدت کے ساتھ شعوری طور پر پیدا ہوا۔ چنانچہ سترھویں صدی کے آخر میں صرف انگلستان میں بار بار ایسے قوانین پاس کیے گئے جن سے بادشاہ کے عمل پر احتساب و نگرانی کا پہرہ بیٹھ جاتا تھا۔ ان قوانین میں سب سے پہلا اور اہم قانون وہ ہے جسے لغوی معنی میں "تم جسم کو طلب کر سکتے ہو" کہتے ہیں۔ اس قانون کا منشا یہ تھا کہ کسی شخص کو باقاعدہ عدالت مجاز کے سامنے لائے بغیر جیل میں نہ رکھا جائے۔ اصل بات یہ تھی کہ بادشاہوں کے زمانے میں یہ چیز بہت عام تھی کہ جس شخص سے بادشاہ ناراض ہوا اسے غیر معینہ مدت کے لئے قید خانہ میں ٹھونس دیا گیا۔ میگنا کارٹا بھی بادشاہوں کے اسی عمل پر قدغن لگانے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی بادشاہوں کا یہ عمل کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔ سترھویں صدی میں قانون کی رو سے یہ حق عدالت کو دیا گیا کہ وہ ہر اس شخص کو اپنے سامنے طلب کر سکتی جو عدالتی حکم کے بغیر محبوس کر دیا گیا ہو۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اسے خلاف قانون قید کیا گیا ہے تو پھر عدالت کو اختیار تھا کہ وہ اسے آزاد کر دے یہ قانون 1679ء میں پاس کیا گیا۔

اس کے بعد 1688ء میں "اعلان حقوق" کے نام سے ایک دستاویز تیار کی گئی۔ اسکی رو سے وہ شرائط طے کی گئیں جو انگلستان کے بادشاہ ہونے کے لئے ضروری تھیں۔ ان شرائط میں سب اہم اور بڑی شرط یہ تھی کہ کوئی رومن کیتھولک عقیدے کے ساتھ اب تخت شاہی پر نہ بیٹھ سکے گا۔ گویا اس قانون کے پاس ہو جانے کے بعد انگلستان کا تخت صرف پروٹسٹنٹ مذہب کے لئے مخصوص ہو گیا اور پوپ تو کیا اس کے مسلک سے ہی مرکزی انقطاع کا اعلان کر دیا گیا۔ اس شرط کے بعد باقی شرائط میگنا کارٹا کی ہی دہرائی گئیں، مگر چونکہ ابھی تک فرماں روائی پر عوام کو کوئی اختیار نہ تھا اس لیے جو بادشاہ

زیادہ حوصلہ مند اور جری ہوتا وہ ان شرائط کو نظر انداز کر کے اپنی من مانی کاروائیاں کرنے لگتا۔ اس لئے بادشاہ کو حدود کے اندر رکھنے کے لئے ایک کامیاب کوشش یہی ہو سکتی تھی کہ اس کے فرائض اور عوام کے حقوق کو بار بار دہرایا جائے۔ چنانچہ 1688ء کے اس اعلان حقوق میں بھی ایک بار پھر واضح کیا گیا کہ پارلیمنٹ، جو اس زمانے میں مجلس امراء کا دوسرا نام تھا، کی منظوری کے بغیر بادشاہ مجاز نہ ہوگا کہ عوام پر محصول وغیرہ عائد کر کے روپیہ حاصل کرے، بادشاہ کو یہ اختیار نہیں کہ وہ قانونی دفعات کو معطل و بے عمل کر سکے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد 1694ء میں پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کیا کہ بادشاہ پابند ہے کہ کم از کم تین سالہ مدت میں ایک بار ضرور پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کرے۔ اس قانون کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ چارلس اول اور چارلس دوم جیسے بادشاہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ پارلیمنٹ کا اجلاس برسوں طلب ہی نہ کرتے تاکہ کسی کو بادشاہ پر اعتراض کرنے اور اس کو عملی طور پر قانونی حدود کے اندر رکھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس کے سات سال بعد 1701ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس میں غیر ممالک سے جارحانہ جنگ کرنے کا اختیار بادشاہ سے لے کر پارلیمنٹ کو دیا گیا، نیز یہ طے پایا کہ جب تک جج اپنے فرائض منصبی صحیح طور پر انجام دے سکیں انہیں ان کے عہدے سے علیحدہ نہ کیا جائے۔

مطلق العنان بادشاہوں کے دلچسپ مشاغل میں عیش پرستی و محفل آرائی کے ساتھ ساتھ جنگجوئی اور بنرد آزمائی بھی شامل تھی، جو بادشاہ اولوالعزم اور حوصلہ مند ہوتے وہ ملک گیری اور کشور کشائی یا دولت اور جائیداد کے حصول کے لئے جنگ کے حربے سے فائدہ اٹھاتے، لیکن چونکہ لڑنے والے عوام ہوتے ہیں اس لئے فتح و شکست دونوں صورتوں میں عوام کی تباہی اور بربادی یقینی ہوتی تھی۔ اس نئے قانون کے ذریعے جنگ چھیڑنے کا اختیار بادشاہ سے پارلیمنٹ کو منتقل ہو گیا۔ اگرچہ یہ ایک عوامی کامیابی تھی مگر چونکہ پارلیمنٹ صرف امراء اور روساء کی کونسل تھی، اس لئے اسے مکمل کامیابی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

پاپائیت کے بعد شہنشاہیت

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق پاپائے روم کے بعد بادشاہوں نے یورپ میں مطلق العنانی اور جبروت اختیار کر لی۔ بادشاہوں کے مطلق العنان اختیارات پر اس قسم کی بندشیں عائد کرنے کے تحریکیں انگلستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی جاری ہوئیں اور وہاں بھی مطلق العنانی کے خلاف اسی قسم کے متعدد قوانین بنائے گئے، مگر چونکہ طاقت کا سر چشمہ یا اقتدار صرف بادشاہ کے ہاتھ میں تھا اس لیے عوام کے ہاتھ میں احتساب اور نگرانی کا کوئی موثر ذریعہ نہیں آ سکا۔ اسلئے یہ نئے قوانین بھی زیادہ سودمند ثابت نہ ہوئے تھے۔ کمزور یا رحمدل بادشاہ تو ان پر عمل کرتے مگر طاقت ور اور جابر بادشاہ ان کو دفتر بے معنی سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ اٹھارویں صدی تک یورپ پاپائی اقتدار سے تو مکمل آزاد ہو چکا تھا مگر شہنشاہیت سے نجات ابھی دور تھی۔ شہنشاہیت کے نام پر ایک پاپائیت یورپ کی عوام کے سر پر سوار ہو چکی تھی۔ پاپائیت سے معرکہ آرا ہونے میں عوام نے بادشاہوں کی حمایت کی تھی، مگر کسی بادشاہ کو یہ گوارہ ہی نہیں تھا کہ عوام ان سے شاہانہ اختیارات چھین لیں۔ بادشاہ پاپائیت سے اقتدار چھین کر اس پر قابض ہو گئے۔ اب یورپ کے عوام کی حالت وہی ہو گئی جو حضرت امیر معاویہ کی خلافت کے بعد مسلمانوں کی ہو گئی تھی یعنی مسلمان بھی خلافت راشدہ کے ہر اصول سے واقف تھے مگر خلیفۃ المسلمین کے نام پر جو شخص اس پر فرمانروائی کرتا تھا اس کا شہنشاہی جوا، ان کی گردنوں سے نہیں اتر سکتا تھا۔ اس لیے انقلاب اسلام کے وہی اصول کارفرما ہو سکتے جو خلیفہ چاہتا تھا۔ اگر کوئی شخص اس حد سے تجاوز کرتا تو جلاد کی تلوار اس کا مقدر

تک جا پہنچی۔ اسی طرح اب یورپ کے بادشاہ بھی پادریوں اور مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے تھے۔
سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی تھی جو مسیحیت کی اصلاح کے لیے موجزن تھے۔ اسی طرح
سترہویں صدی میں ایک یورپی مفکر روسو نے بادشاہوں کی مطلق العنانی سے آزاد ہونے کی سکیم پیش کی جس کے لیے عوام
ترتیب دیے تھے۔ عوام حکومت یا جمہوریت کے تصورات کو اگرچہ افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے دنیا میں موجود تھے اور
یونان اور روما میں جمہوریت کی عملی شکل کا نقشہ بھی دنیا دیکھ چکی تھی، مگر یہ جمہوریتیں عوام کی حکومتیں نہ تھیں۔ بلکہ اشرافیہ
خواص کے طبقے کو ان میں زیادہ دخل تھا۔ یونان و روما کی جمہوریتوں میں عوام کو حکمرانی سے زیادہ تر بے تعلق اسی طرح رکھا
گیا تھا جس طرح بعد ازاں شہنشاہی میں امراء اور رؤساء کے سوا باقی انسانوں کو رکھا جاتا تھا۔

روسو اور والٹیر نقیب انقلاب فرانس:

روسو نے یورپ میں دنیا کو پہلی بار بتایا کہ ہر انسان کے حقوق برابر ہوتے ہیں اور حکومت پر عوام ہی کو اختیار ہونا
چاہیے۔ روسو کے یہ خیالات سترہویں صدی میں "معاہدہ عمرانی" کے نام سے ایک مختصر رسالے میں شائع ہوئے تھے۔ اس
رسالے میں انسانی مساوات و حریت پر محض فلسفیانہ بحث نہیں کی گئی بلکہ حکومت کے اصول اور حکومت چلانے طریقے بھی
بتائے گئے۔ یہ رسالہ اس جملے سے شروع ہوتا ہے۔ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے، مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے"۔ اس کے بعد
ساری کتاب میں دراصل اسی جملے کی تشریح پیش کی گئی ہے۔

روسو کے اصول سیاست کا ماحاصل یہ تھا کہ انسانی معاشرت کا تصور اس لیے پیدا ہوا کہ باہمی مفاد اور تحفظ کے لیے
اپنے ارادے اور مرضی سے انسان اکٹھے ہوئے اور کچھ مشترک قوانین اور رسوم رواج بنائے گئے اس لیے بادشاہ یا حکمران کا
موروثی یا خدا داد ہونا بعد کی غیر فطری ایجاد ہے۔ جب روسو اور روسو جیسے دیگر مفکرین مثلاً والٹیئر کی کتابیں یورپ میں پھیلیں
تو لوگوں کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ روسو نے عوام کو بتایا کہ ہر انسان کے حقوق کیا ہیں اور یہ کہ صرف وہی حکومت ریاست
منشائے قدرت کے مطابق ہو سکتی ہے جس میں عوام کی رائے سے کام ہو اور اقتدار اعلیٰ صرف عوام کو حاصل ہو۔ ان معاشرتی
مصلحین کے ان خیالات کی اشاعت کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ پادریوں اور رئیسوں نے مل کر انسانوں کے درمیان
جو زبردست امتیازی حدود قائم کر رکھی ہیں اور مساوات و برابری کے جو حقوق انسانوں سے چھین کر خدا کی ان گنت مخلوق کو
ذلت و فاقہ کشی کی مصیبت سے دوچار کر رکھا ہے، وہ نہ تو مذہبی اعتبار سے صحیح ہے اور نہ اخلاقی لحاظ سے حق بجانب ہے۔ لیکن
اس فیصلے تک آتے آتے تحریک احیائے علوم کو دو سو سال لگ گئے۔

حکمرانوں کے اقتدار کو محدود اور قانون کا پابند رکھنے اور حکومت کو دستوری بنانے کا خیال بہت مقبول تو ہوا لیکن اس کے
لیے ایک ایسے ادارے کی ضرورت پیش آئی جو حکمرانوں کو آئین اور دستور کا پابند رکھ سکے، یہ ادارہ تھا پارلیمنٹ، مگر ازمنۂ وسطیٰ
میں سیاسی بیداری تو پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی جس سے پارلیمنٹ کا نظام ترقی کر کے طاقت حاصل کرتا، لیکن یورپ کے
مختلف ممالک میں مختلف حالات کے تحت ایسے نمائندہ اداروں کی ابتدا ہو گئی جو آگے چل کر بڑی جمہوری قوت بن گئے۔
انگلستان میں مجلس شاہی نے پارلیمنٹ کی شکل اختیار کی۔ فرانس میں بادشاہوں کو مشورہ دینے کے لیے جو کونسل قائم تھی آگے
چل کر وہ اسٹیٹس جنرل کہلائی۔ جس کے تین ایوان تھے۔ سپین میں بھی نمائندہ اسمبلیاں قائم کی گئیں تھیں جو کورٹز کہلاتی تھیں۔

1789ء انقلاب فرانس۔۔۔ایک زلزلہ

14 جولائی 1789ء کو فرانس کے دل پیرس میں ایک مشتعل ہجوم، مشہور زمانہ قلعہ بیسٹل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ قلعہ پیرس میں حصار لندن کی طرح کا ایک قلعہ ہے جو قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور جہاں حکومت سیاسی قیدیوں کو رکھتی تھی۔ عوام بادشاہ لوئی کے اس اقدام سے مشتعل ہوئی تھی کہ وہ دستور ساز پارلیمنٹ یا قومی اسمبلی کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہتا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ مکمل طور پر ایک مطلق العنان بادشاہ رہنا چاہتا تھا اس لئے 11 جولائی کو اس نے وزیر اعظم نیکر NECKER کو برخاست کر دیا، جس کے نتیجے میں عوام میں اشتعال پھیل گیا اور مدتوں سے دبی ہوئی انقلابی چنگاریوں نے ایک شعلے کا روپ دھار لیا۔ اس اشتعال کے نتیجے میں انہوں نے بیسٹل کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ باستیل کی حفاظت کے لیے فوج متعین تھی مگر عوام کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ فوج مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود قلعے کے محافظوں نے جنگی نقارے بجائے اور عوام پر گولے برسانے شروع کر دیے۔

محافظوں کی اس کارروائی کے بعد عوام اور فوج میں لڑائی خونخوار اور جان سوز شکل اختیار کر گئی۔ بعد دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان فرنچ گارڈ اور شہری اپنی اپنی توپیں بھی میدان میں لے آئے اور قلعہ کے حفاظتی انتظامات پر حملہ کر دیا گیا۔ شہری رضا کاروں نے راہنمائی کی اور ان سوکھی گھاس کے چھکڑوں کو کھینچا جس سے قلعہ کے محافظ دھوئیں کا پردہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے بڑی ہمت اور جرات کا مظاہر کرتے ہوئے عوام نے بیرونی اٹھاؤ پل کی زنجیروں کو اڑا دیا۔ حملہ آوروں نے جلد ہی اندرونی راستوں پر بھی قبضہ کر لیا جس سے بڑے اٹھاؤ پل اور قلعے کے پھاٹک پر حملہ کی ابتداء ممکن ہو سکی۔ اس مقابلے اور تصادم میں شہری حملہ آوروں نے نمایاں بہادری دکھائی، جس کا ان کے پیشہ ور محافظوں اور فوجیوں نے بھی اعتراف کیا اور ان کا بھاری نقصان ہوا۔ عوامی حملہ آوروں میں 83 شہید اور 88 زخمی ہوئے جس میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے پندرہ بعد میں فوت ہو گئے۔

دو گھنٹے کی گولہ باری کے بعد قلعے کے میناروں میں سے ایک پر سے سفید رومال لہرایا گیا اور قلعے کے پھاٹک کی دراڑ میں سے ایک کاغذ ٹکڑا باہر پھینکا گیا۔ حملہ آوروں نے خندق پر ایک تختہ پھینکا مگر جو پہلا شخص اس کو پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ خندق میں گر کر مر گیا۔ دوسرا شخص خندق عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اس شخص کو بعد ازاں تاریخ میں سٹانس لاس میلر کہا گیا۔ جو کاغذ پھینکا گیا تھا اس پر لکھا گیا تھا کہ اگر باعزت شرطوں پر قلعے کے ہتھیار ڈالنے کو نامنظور کیا گیا تو قلعہ کو بارود سے

اڑا دیا جائے گا۔ عوام کا ہجوم اب ہر قیمت پر قلعہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا عوام کی توپوں نے پھر پل اور پھاٹک پر گولے داغنے شروع کر دیے۔ ادھر گورنر کے قلعہ کو اڑانے والی دھمکی سے عمل پیرا ہونے سے اس کے اپنے آدمیوں نے روک دیا اور اسے ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا۔ آخر قلعے میں داخلہ کا پیدل پل نیچے کیا گیا پھر خصوصی اٹھاؤ پل کو بھی نیچے کر دیا گیا اور ہجوم اس کے پرے قلعے میں داخل ہو گیا اور اس نے بیسٹائل پر قبضہ کر لیا۔

عوام نے اپنی فتح کے حق کی رو سے قلعہ کو تباہ کرنے کا فیصلہ کیا، مگر باز رہے قلعے کے کاغذات کھڑکیوں سے پھینک دیے گئے۔ قید خانے کی کوٹھڑیاں کھول دی گئی اور ان میں جتنے قیدی تھے رہا کر دیے گئے۔ 1775ء میں مالے شربیس کی آ دلانا آمد کے بعد سے قلعے کے قید خانے میں صرف سات قیدی ہی بقایا رہ گئے تھے انہیں بھی آزاد کر دیا گیا

بیسٹائل کی عوامی فتح کسی معجزہ سے کم نہیں تھی۔ خاص کر ایک ایسے عہد اور شہر میں جہاں کہ معجزوں پر لعنت بھیجی جاتی ہو۔ عہد قدیم کا قدیم قلعہ جسے توپوں اور قلعہ بند فوجیوں سے اور مضبوط کر دیا گیا تھا۔ مگر چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد ایک شہری ہجوم کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ اس سچائی نے ہر پیشہ ور فوجی دماغ کو حیران بلکہ ماؤف کر دیا۔ نہ تو اس قلعے میں خوراک اور بارود کی کوئی قلت تھی اور نہ ہی نوبت فاقوں تک آئی تھی۔ قلعہ کے اندر مقیم لوگوں اور خود محاصرین کو بھی اس بات کا علم تھا کہ اگر معاملے نے کچھ دن اور طول پکڑا تو لازماً باہر سے اور فوج آ جائے گی۔ مانا کہ شہریوں کے پاس کچھ توپیں بھی ضرور تھیں مگر وہ ان چند توپوں سے قلعہ کی چٹان کی مانند مضبوط عمارت کا کیا بگاڑ سکتے تھے؟

جو سفارت کار چودہ جولائی کو انگلستان سے فرانس آ رہے تھے انہوں نے جب توپوں کی گڑگڑاہٹ سنی تو وہ سمجھے کہ قلعہ کے محافظوں نے فائرنگ کر کے عوام کو بھگا دیا ہے مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یہ انقلاب فرانس جیسے عظیم واقعہ کی شروعات تھیں جو جلد ہی جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئیں۔ انقلاب فرانس تاریخ عالم کا کوئی چھوٹا موٹا واقعہ نہیں تھا بلکہ تاریخ کا ایک ایسا عظیم موڑ تھا جس نے دور نزدیک کی سبھی اقوام عالم کی سیاسی، معاشی تہذیبی اور سماجی زندگی کی کایا پلٹ ڈالی۔

اٹھارہویں صدی کے آخر تک اصلاح مذہب اور احیائے علوم کی تحریکوں کی بدولت جب یورپ کو پاپائیت کے ذہنی استبداد سے نجات ملی تو زندگی کے ہر گوشے میں امید کی نئی کرنیں پھوٹتی نظر آئیں۔ پاپائیت کے اقتدار کو ہٹانے کے لئے یورپ کے تمام مطلق العنان بادشاہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر عوام کا ساتھ دیا، لیکن ایک جبر کے خاتمہ کے بعد عوام میں ہر جبر و استبداد اور مطلق العنانی کے خلاف جذبات پیدا ہونے لگے۔ آخر جذبات و احساسات کی ایک نئی دنیا انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور 12 جولائی 1789ء کو جب آفتاب سحر طلوع ہوا تو دنیا کی تاریخ کا رخ بالکل دوسری طرف مڑا ہوا نظر آنے لگا۔ محققین نے لکھا ہے کہ انقلاب اسلام کے بعد تاریخ عالم کا یہ دوسرا انقلاب تھا جو انسانیت نے اپنے حقوق کے حصول کے لئے برپا کیا۔ یہ انقلاب قرون وسطیٰ کی تین بڑی استحصالی قوتوں، ملوکیت، جاگیرداری اور کلیسائیت کے ستون گرا دینے کے لئے آیا تھا۔ اس انقلاب کے پرچم پر آزادی مساوات اور اخوت کے زریں الفاظ رقم تھے۔

بادشاہی اور جاگیرداری نظام معاشرت میں عوام کی حیثیت ہمیشہ غلام اور خدمت گاروں کی سی رہی ہے۔ جن کی ضرورت صرف دولت پیدا کرنا یا میدان جنگ میں کام آنے کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے اگرچہ امراء و رؤساء کے

طبقے نے ہمیشہ عوام کو حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھا، مگر اپنی ان اغراض کی وجہ سے وہ عوام سے بالکل بے تعلق بھی نہیں ہو سکتے تھے، البتہ عوام کو اپنے اغراض و مقاصد کے مطابق استعمال کرنے کے لئے مختلف مقامات پر مختلف حکمت عملیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ انہیں حکمت عملیوں میں سے ایک حکمت عملی شہنشاہ دربار عام کے نام سے منعقد کرتے تھے، جس میں کبھی کبھی کسی جگہ عوام کے نام پر کچھ لوگوں کو اکٹھا کر کے اپنے مقصد کے مطابق کچھ باتیں منوالی جاتی تھیں۔ بس یہی یورپ کے تاریک زمانے کی پارلیمنٹ تھی۔ فرانس میں ایک ایسا دربار 1302ء میں منعقد کیا گیا تھا۔ جس کا نام جمعیت طبقات رکھا گیا تھا۔ اس کے تین طبقات تھے، کہ امراء و روساء ایک طبقہ تھا دوسرا طبقہ پادریوں اور تیسرا عوام کا، جو اس بات کو غنیمت جانتے تھے کہ انہیں امراء اور روساء کے ساتھ بیٹھنے کا موقع تو دیا گیا۔ 1302ء کے بعد یہ جماعت یا عوامی پارلیمنٹ متعدد بار طلب کی گئی مگر ہمیشہ ایسے ہی مواقع پر جب روپیہ یا آدمیوں کی ضرورت بادشاہ کو پیش آتی۔ لیکن 1614ء کے بعد سے چونکہ اس قسم کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی اس لیے اسکے بعد پونے دوسو سال تک عوامی نمائندوں یا پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس طلب نہیں کیا گیا۔ مگر جب اصلاح مذہب یا احیائے علوم کی تحریکوں سے عوام میں بیداری کی لہر دوڑی اور قومیت کا جذبہ پیدا ہوا تو عوام کا خیال قدرتاً اس طرف بھی مبذول ہوا اور انہوں نے کوشش کر کے پورے 175 سال کے بعد 5 مئی 1789ء کو ورسائی کے محل میں اس کا اجلاس طلب کرایا اس اجلاس میں امراء اور روساء کے نمائندوں کی تعداد 285 تھی پادریوں کی 308 اور عوامی نمائندوں کی 621۔ لیکن اگرچہ عوام کے نمائندوں کی تعداد دوسرے طبقات سے زیادہ تھی مگر پھر بھی اس اسمبلی میں اس کی رائے کو کوئی فوقیت حاصل نہیں تھی۔ کیونکہ فیصلہ افراد کی اکثریت کی بجائے طبقات کی اکثریت پر رکھا گیا تھا، یعنی جس فیصلے کو کوئی دو طبقے قبول کرلیں وہی فیصلہ قابل قبول سمجھا جائے گا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام اکثریت میں ہونے باوجود اقلیت میں تھے کیونکہ پادری ان کا ساتھ دینے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ سب سے پہلا جھگڑا اسی بات پر ہوا۔ اور بالآخر عوام اور نے پادریوں اور امراء کے خلاف جبر اور طاقت سے اپنا فیصلہ منوالیا اور یہیں سے انقلاب کا آغاز ہو گیا جس کے بعد جمعیت طبقات STATESGENERAL کی بجائے قومی اسمبلی کے نام سے نمائندوں کا اجلاس طلب کیا گیا۔

پہلا آئین جمہوریت:

اس عوامی قومی اسمبلی نے حکومت کا ایک نیا آئین مرتب کیا، جس کی رو سے 1792ء میں بادشاہی کو ختم کر کے عوام کی حکومت یا جمہوریت قائم کی گئی اور لوئی شانزدھم شاہ فرانس پر باقاعدہ طور پر مقدمہ چلایا گیا اور اسے سزائے موت دی گئی اس لئے 1789ء سے 1793ء تک درمیانی سالوں میں امراء و روساء کی طرف سے، عوام کو شکست دینے کے لئے جوان تھک کوششیں کی گیں تھیں اور جن کی وجہ سے عوام کی ہمسائیہ حکومتیں پروشیا اور جرمنی نے فرانس کی عوام پر دھاوا بول دیا تھا، ان سب کا الزام بادشاہ پر رکھا گیا۔ فرانس کے اس نئے آئین کی رو سے امیروں رئیسوں پادریوں سب کے وہ حقوق منسوخ کر دیئے گئے جو انہیں عام انسان کے مقابلے میں امتیازی حیثیت دیتے تھے۔ ہر شخص کو کامل آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کو تحریر و تقریر کے ذریعے ظاہر کرنے کا حق دیا گیا۔ جلسے کر کے یا انجمنیں بنا کر مسائل پر بحث و تمحیث کی آزادی پر جتنی پابندیاں عائد تھیں ان سب کو یک قلم منسوخ کر دیا گیا اور تمام معاہدے جو غیر ممالک سے شاہی حکومت نے کر رکھے تھے،

ان سب نے مل کر یہ اعلان کیا گیا کہ وہ رستے میں پہلے والی بادشاہت سے نجات دلانے کے لئے فرانس یورپ کے تمام ممالک کی عوام کی مدد کرے گی۔ اگرچہ بادشاہ فرانس نے اس قومی اسمبلی کے اجلاس منعقدہ 1789ء میں ہونے والے فیصلے جس کے تحت ارکان اسمبلی نے حلف اٹھایا تھا کہ آئین کو تشکیل دیئے بغیر اسمبلی کا اجلاس برخاست نہ ہوگا اور اس کے پاس کردہ آئین کے مطالبات بھی بادشاہ کو تسلیم کرنا پڑے، مگر اس نے نیکر NECKER نامی وزیر مالیات کو برطرف کر دیا۔

بیسٹیل BASTTLLE: جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، پیرس کے مشتعل ہجوم نے بیسٹیل کے قلعہ پر دھاوا بول دیا (14 جولائی) بادشاہ لوئی شانزدہم نے فوج بلانے سے پہلے جب عادت ایک بار پھر ڈیوک ڈی لا ایئن ہارٹ کے ڈرانے سے کہ بادشاہ کو بغاوت کی بجائے ایک انقلاب کا سامنا ہے اور اس سے بچنے کا صرف یہی راستہ ہے کہ بادشاہ قومی اسمبلی سے تعاون کرے۔ بادشاہ نے نیکر کو بحال کر دیا اور پیرس کے انتظامی حلقے کی پنچایت THE COMMUNE نے پیرس کی شہری حکومت کی حیثیت اختیار کر لی۔ علاوہ ازیں نیشنل گارڈ کی تنظیم کی گئی۔ 14 اگست 1789ء کو اسمبلی نے جاگیرداروں کی تمام مراعات موقوف کر دیں۔ جوابی انقلاب برپا کرنے کے لئے انتہا پسند عوامی نمائندوں نے درباری سازشوں کے متعلق افواہ پھیلا کر پورا فائدہ اٹھایا۔ 5 اکتوبر کو ایک ہجوم ورسائی کی طرف بڑھا......

دہشت وخوف کا دور دورہ: یہ ہجوم شاہی خاندان اور اسمبلی کو زبردستی پیرس لے آیا۔ MIRABEAU میرابو نے اس غیر منظم انقلاب کی آمد کا اندازہ کرتے ہوئے جو بادشاہ کی کمزوری کے باعث برپا ہونے کو تھا، انتظامیہ کی قوت بحال کرنے کی کوشش کی مگر مجلس آئین ساز THE CONSTITUENT ASSEMABLY (قومی اسمبلی کا نیا نام) نے ایسا آئین وضع کیا جس نے انتظامیہ کو بالکل بے دست و پا کر دیا (1791ء)۔ مشہور "اعلان حقوق انسانی" THE DECLARATION OF THE RIGHTS OF MAN اسی آئین کا مقدمہ تھا۔ اہل کلیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی طاقت کے خلاف جو قوانین بنائے گئے وہ اس وقت اپنی انتہا تک پہنچ گئے جب پادریوں کو جنہیں اس سے پہلے بڑا سیاسی غلبہ حاصل تھا، شہری حکام کے سامنے حلف وفاداری اٹھانے پر مجبور کر دیا گیا۔ ادھر بادشاہ نے سوچا کہ وہ خود بھی ان امراء سے جا ملے جو انقلابی ہنگاموں کے شروع ہونے پر ملک سے باہر چلے گئے تھے، لیکن اس کا یہ ارادہ کامیاب نہ ہو سکا اور اسے فرار ہوتے ہوئے وارینیز VARENNES میں گرفتار کر لیا گیا اور پیرس واپس پہنچا دیا گیا (20-21 جولائی 1791ء) اب لوئی نے نیا آئین قبول کر لیا۔ مجلس قانون ساز میں جمہوریت پسندوں، جرانڈیوں GERONDISTS ۔ انتہا پسندوں جیکوبیوں JACOBITES اور کورڈلیرز CODELIERS کو بالادستی حاصل ہوگئی۔ آزادی، مساوات اور اخوت کے الفاظ سب لوگوں کا خاص نعرہ بن گیا۔ اس دوران جو امراء فرانس سے باہر چلے گئے تھے وہ یورپ کی دیگر سلطنتوں کو فرانس کے معاملات میں مداخلت پر آمادہ کرنے لگے۔ پلنٹز PILLINTZ کے اعلان سے جمہوریت پسندوں کو بہت مدد ملی، کیونکہ اس طرح ان کو یہ امید ہوگئی تھی کہ بیرونی جنگ قوم کو جمہوری مقاصد کے لئے متحد کر دے گی۔ 20 اپریل 1792ء کو آسٹریا

کے خلاف اعلان جنگ کے بعد فرانسیسی انقلابی جنگوں کا آغاز ہوگیا، ابتدا میں فرانس کو مسلسل ناکامی ہوئی تو یہ افواہ پھیل گئی کہ بادشاہ لوئی پندرہ اور ملکہ میری انٹونٹ MARY ANTONETTE غدار ہیں، اس پر لوگوں کے ایک بڑے ہجوم نے شاہی محلات تویلری TUILERIES کا محاصرہ کرلیا اور شاہی خاندان کے سوستانی محافظوں SWISS GAURDS کو قتل کر دیا گیا (10 اگست 1792ء) پیرس کی مقامی حکومت نے جس میں دانتوں DONTON اور مارا MARAT کو فوقیت حاصل تھی، تمام انتظامی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اسمبلی نے بادشاہ کے اختیارات سلب کر لئے اور ایک نئی جماعت ''نیشنل کنونشن'' کے لئے انتخابات کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ کے حامیوں کو سینکڑوں کی تعداد میں عوام کے گروہوں نے موت کی گھاٹ اتار دیا۔ یہ ستمبر کا قتل عام SEPTEMBER MASSACRES کہلاتا ہے 21 ستمبر 1792ء کو نیشنل کنونشن نے بادشاہی کو منسوخ کر دیا اور'' پہلی ری پبلک'' قائم کی اس کے ساتھ ہی بادشاہ پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا۔ جنوری 1793ء میں بادشاہ کو سزائے موت دی گئی مگر اس پر شاہ پسندوں کی بغاوتیں شروع ہوگئیں بالخصوص وانڈے VANDEE کے علاقے میں جہاں کے مذہب پسند عوام نے مقامی جاگیرداروں کے ساتھ مل کر بادشاہ کے قتل کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انقلاب پسندوں کے خلاف بغاوت کا بیڑہ اٹھایا اس کے بعد..........

دہشت ناک حکومت REIGN OF TERROR :

دہشت ناک دور یا حکومت کا آغاز ہوا جس میں رابیس پیئر ROBESPIERRS اور اس کے ساتھی مقابلتاً اعتدال پسند جرانڈیوں پر غالب آگئے اور اس کے ساتھ ہی رابیس پیئر نے اپنے حریفوں، دانتوں اور ایبر HEBERT پر بھی غلبہ حاصل کرلیا جمہوری آئین کو کسی وقت بھی بروئے کار آنے کا موقع نہ مل سکا۔ تحفظ عامہ کی کمیٹی اور انقلابی ٹربیونل ہی بالادست رہے۔ رابیس پیئر کی مابعد دراز دستیوں نے کنونشن کو 27 جولائی 1794ء کو ناگہانی انقلابی کاروائی پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اس کاروائی کے نتیجے میں رابیس پیئر قتل ہوا اور انقلاب کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ 1795ء میں نئے آئین کے مطابق دریکتوار DIRECOTOIRE قائم ہوئی۔ یہ ڈائرکٹروں کی اس حاکم جماعت کا نام ہے جس کو دونوں قانون ساز مجلسوں نے منتخب کیا تھا۔ اس جماعت کو 1795ء سے 1799ء تک اقتدار حاصل رہا، اس کی حکومت بدنظمی، سازش، افراط زر اور دیوالیے پن کے لئے مشہور ہے۔ اسے 1799ء میں نپولین بوناپارٹ کی ناگہانی انقلابی کاروائی نے ختم کیا تھا۔ اس کے بعد 1804ء میں نپولین بوناپارٹ کے اعلان شہنشاہیت سے جدید متمول طبقوں کی کامیابی یقینی ہوگئی۔

انقلاب فرانس اور انقلاب اسلام کا تقابلی جائزہ

فرانس کے ان انقلابی فیصلوں اور واقعات کا سن کر تمام یورپ کے بادشاہوں، امراء، اور روساپر دہشت طاری ہوگئی اس لیے ان سب نے مل کر اس انقلاب کو دبانے کی کوشش کی، مگر فرانس کی عوام میں جو جوش اور بیداری پیدا ہو چکی تھی وہ سب پر غالب آگئی، جمہوریہ فرانس کی فوجوں کو ہر محاذ پر کامیابیاں حاصل ہوئیں، لیکن کامیاب ترین انقلاب کی تیرہ بختی تھی کہ اسے کوئی ایسا قائد یا راہنما نہ مل سکا جو غصے، نفرت، اور انتقام کے جذبات سے بلند ہو کر صرف انسانی فلاح و بہبود کے مقصد کو پیش نظر رکھتا۔ عوام میں جوش تھا، ان کے سامنے مقصد بھی تھا اور مقصد تک پہنچنے کی راہ بھی متعین ہوگئی تھی، مگر پیغمبرانہ

گروہوں کی اس انقلاب کے دوران ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ نتیجتاً منزل پر پہنچنے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں ان کو بھی قبل سے دور کر لیا گیا تھا کہ عوام کو جوش و جذبہ حد سے تجاوز کر گیا۔ امراء، روساء، ارباب کلیسا، انسانیت کی عمومی ترقی کے خلاف تھے لیکن ان کا مطلب یہ نہ تھا کہ جبر و ظلم، قتل و غارت گری کے ہتھیاروں کو ان پر آزمایا جاتا۔ لیکن چونکہ کوئی صحیح راہنما نہ تھا پھر یہ انقلاب نے خونی روش اختیار کر لی۔ روسو جو اس انقلاب کا نقیب بتایا جاتا ہے اس کی ذاتی زندگی اخلاقی پستی کا شکار تھی۔ اس لیے وہ بھی انقلابی روش کے علاوہ اخلاقی روش کی بنیاد فراہم نہ کر سکا۔ انقلاب کی اندرونی مخالفت کو دبانے کے لیے "تحفظ عامہ" کے نام سے ایک کمیٹی بنائی گئی اس کمیٹی نے ملک میں دہشت و ہراس کا ایک سناٹا طاری کر دیا۔ ہزاروں بے گناہ لوگ قتل کر دیے جاتے ہر طرف غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے اور شاہی خاندان کے افراد امراء، روساء اور ارباب کلیسا بلا امتیاز ان شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ پھر یہ انقلابی شعلے اتنے بڑھے کہ انقلابی راہنما بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے جیسے ہی کسی راہنما پر شبہ ہوا ان شعلوں نے لپک کر اس کا دامن بھی پکڑ لیا۔ دانتوں DANTON اس انقلاب کا سب سے بڑا راہنما تھا۔ پہلے ہر طرف سے دانتوں زندہ باد کی صدائیں آتی تھیں مگر وقت گیا دیکھتے ہیں کہ ایک دن لوگ اسی انقلابی راہنما کو بھی سوئے مقتل لے جا رہے ہیں اور رابیس پیئر کے حکم پر اسے عدالت کی خلاف ورزی کرنے کے الزام میں قتل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس واقعہ کو ابھی چند ہی دن گذرے تھے کہ شور اٹھا کہ آج رابیس پیئر کی گردن زنی ہے ابھی دانتوں کے خون کے دھبے مٹے نہیں تھے کہ زمین رابیس پیئر کے خون سے لالہ زار ہو گئی۔ اگر انقلاب فرانس کو بھی کوئی ہستی "پیغمبرانہ" دل و دماغ کی مالک راہنمائی کے لیے میسر آ جاتی تو بلاشبہ "انقلاب اسلام" کی طرح اس انقلاب کی تاریخ بھی دہشت انگیزی و انتقام پروری کے ہر داغ سے سراسر معرا ہوتی۔ جیسے انقلاب اسلام کی تاریخ ہے کہ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوتے ہوئے جان کے دشمنوں کو بھی انتقام کا نشانہ نہ بنایا گیا۔ انقلاب اسلام کا ہر اقدام ذاتیات سے مبرا تھا۔ جبکہ انقلاب فرانس ہر قسم کی دشمنیوں اور قتل و خون سے عبارت ہے۔

انقلاب فرانس کے اثرات:

اب جمہوریت تمام مخالفتوں سے گذر چکی تھی اور عوام کی حکومت کے تمام نکات کو اس عرصہ میں خوب سمجھ لیا گیا۔ انقلاب کی ہلچل میں دنیا نے سیاست اور حکومت کا جو نیا رنگ دیکھا وہ آہستہ آہستہ دنیا میں مقبول ہونے لگا اور غیر مسئول شاہی پر ہر جگہ زوال آنا شروع ہوا جنہوں نے 1832ء میں انتخابات کا ایک اصلاحی قانون بنایا جس کی رو سے عوام کو بہت بڑی حد تک کاروبار حکومت میں حصہ مل گیا، پھر وقتاً فوقتاً اس قانون میں مزید ترامیم ہوئیں یہاں تک کہ 1911ء میں تمام اختیارات عوام کے سپرد کر دیے گئے اور طبقہ امراء عام ارکان کے مقابلے میں بالکل بے عمل کر دیا گیا۔ ایوان عام کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ دیوان خاص اس کے بغیر کوئی قانون پاس نہیں کر سکتا اسی طرح یورپ کے دیگر ملکوں میں بھی انقلاب فرانس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تمام اختیارات کو آئین و دستور کا پابند بنا دیا گیا گویا جہاں جمہوریت قائم نہ ہوئی وہاں بادشاہی کو آئینی بنا دیا گیا اور دستوری حکومت ضرور قائم ہو گئی۔ جمہوریہ امریکہ کے صدر لنکن نے کہا کہ اس اصول سیاست کی صدا اب ساری دنیا میں گونج رہی ہے کہ حکومت عوام کی ہو عوام کے ذریعے سے ہو اور عوام کے مفاد میں ہو۔ حکومت کا یہ اصول انقلاب فرانس کی تجربہ گاہ سے گذر کر آج دنیا کے سیاسی مسلمات میں داخل ہو چکا ہے۔

نپولین بوناپارٹ تعارف

انقلاب کا جوش دھیما پڑ جانے کے بعد 1795ء میں پانچ آدمیوں کی ایک ڈائریکٹری یا جماعت عاملہ کے سپرد ملک کے انتظامی اختیارات کر دیے گئے۔ اب چونکہ انقلاب کے تقریباً تمام مخالف راستے ہٹائے جا چکے تھے، اس لیے عوام میں خوف و ہراس بھی کم ہو گیا۔ اس زمانے میں نپولین بوناپارٹ نامی ایک سپاہی نے اپنی سپہ گری کے جوہر دکھائے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کامیابیاں حاصل کیں کہ سارے فرانس کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے جرمنی، اٹلی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ کو فرانس کے زیرنگیں نہ بنایا بلکہ یورپ کی حدود سے آگے بڑھ کر اور بحیرہ روم کو عبور کر کے مصر پہنچا اور یہاں بھی فرانس کی فتح کے جھنڈے گاڑ دیے۔ نپولین کی ان کامیابیوں نے اسے فرانس کی عوام کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ ہر طرف اس کے نام کی مالا جپی جانے لگی۔ اپنی اس ہر دلعزیزی سے فائدہ اٹھا کر اس نے ڈائرکٹری کو معطل کر دیا اور 8 نومبر 1799ء کو فرانس کا واحد کونسل (حاکم) بن گیا۔ عوام نے اس کے اس عمل کو ناپسند نہ کیا بلکہ بڑی خوشی سے اسے تمام اختیارات سونپ دیے۔ فرانس کی عوام مسلسل بدامنی سے تنگ آ گئی تھی اور امن وامان کی زندگی گذارنا چاہتے تھے، مگر نپولین کے حوصلے اور امنگوں کی کوئی حد نہ تھی، وہ ساری دنیا پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتا تھا یا دوسرے لفظوں میں فاتح عالم بننا چاہتا تھا۔ جگہ جگہ فوج کشی کرنے اور مسلسل 16 سال کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اسے 1815ء میں واٹرلو کے مقام پر شکست ہوگئی اور اسے سینٹ لیلنا کے جزیرے میں محبوس کر دیا گیا، جہاں چھ سال قید رہنے کے بعد اس نے وفات پائی۔ نپولین کی اس خودمختاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں پھر شاہی عود آئی، اگرچہ اب یہ شاہی محض برائے نام تھی 1846ء تک یہ سلسلہ جاری رہا اس سال عوام نے پھر بادشاہ کو معزول کر کے دوبارہ جمہوریت قائم کر دی۔ اس جمہوریت کا صدر نپولین بوناپارٹ اول کے بھتیجے نپولین ثالث کو بنایا گیا۔ نپولین ثالث تک تو قومی اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کے مطابق حکومت کرتا رہا پھر کچھ طاقت پا کر اور کچھ حیلے پیدا کر کے اس نے آئین معطل کر دیا اور خودمختار حاکم بن گیا مگر 1870ء میں جرمنی سے جنگ کے بعد جس میں اسے بری طرح شکست ہوئی تھی، عوام کو بدلہ لینے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ یہ ڈر کر انگلستان بھاگ گیا۔ اس کے بعد فرانس میں اس شکست کے دوسرے سال 1871 میں تیسری بار پھر جمہوریت قائم کر دی گئی۔

انسدادِ غلامی:

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں جب فرانس میں انقلاب کا سمندر عوام کے سینوں میں جذبات کا طلاطم بپا کیے ہوئے تھا۔ نئی دنیا پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ 1776ء میں شمالی امریکی وسطی علاقہ جو انگلستان کے ماتحت تھا اس نے اعلان آزادی کر دیا۔ 1778ء میں وہاں جمہوری آئین نافذ العمل کر دیا گیا اور پہلا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس اعتبار

سے امریکی جمہوریت عمر میں فرانس سے بھی چند سال بڑی ہے، لیکن فرانس کی جمہوریت اور انقلاب ایک ایسا زلزلہ آفریں جھونکا یا جھٹکا تھا جس نے نہ صرف فرانس بلکہ پوری دنیا کو نیند سے چونکا دیا۔ اگرچہ اس جھونکے کے بعد مخالفوں سے جو کچھ ہوسکا انہوں نے کیا، مگر اب انسانیت کروٹ بدل چکی تھی، یہاں تک کہ غلامی کے انسداد کا علم دنیا میں بلند ہونا انقلاب فرانس کے اثرات کے نتیجے میں تھا کہ انقلابِ فرانس کی تعلیمات انسان کو مساوات کا سبق دیتی ہیں۔

......☆......

1750ء۔ صنعتی انقلاب اور قومیت کا تصور

عوامی حقوق:

انقلاب فرانس کا اصل کارنامہ یہ نہیں کہ اس نے عوام کو حکمران بنانے کا اصول وضع کیا یا یہ اصول دنیا کو بتایا کہ حقوق کے لحاظ سے سب انسان برابر ہیں، یہ سب اصول تو انقلاب اسلام نے دنیا کو بہت پہلے عطا کر دیئے تھے۔ مگر اب مسئلہ ان پر عمل درآمد کرنے کے طریقوں کی دریافت تھا۔ انقلاب فرانس کے بعد ہی انسان ان طریقوں سے آشنا ہو سکا ہے۔ اس انقلاب کے بعد یہ طے ہوا کہ حکومت کا ایک دستور و آئین مرتب ہونا چاہیے جس سے انحراف کی کسی کو اجازت نہ ہو، خواہ وہ بادشاہ ہو یا عوام کا منتخب صدر۔ پھر اس آئین بنانے اور اس پر عمل پیرا رکھنے کی طاقت عوام کے ہاتھ میں ہو۔ یہ حقیقت تو اسلام نے بتا دی تھی کہ اجماع امت کو ہر مسئلہ میں آخر فیصلہ دینے کا حق ہے لیکن سوال یہ تھا کہ اجماع امت کو معلوم کیسے کیا جائے؟ انقلاب فرانس کے بعد اسے معلوم کرنے کے لئے رائے دہی یا ووٹ دینے کا مبسوط اور مفصل اصول بنائے گئے اور یہ طے ہوا کہ ایک تو بلا تمیز ہر بالغ انسان کو ووٹ کا حق دیا جائے، دوسرے بیرونی اثرات سے بچانے کے لئے ووٹ خفیہ لیے جائیں۔ ان ووٹوں کے ذریعے عوام جن افراد کو منتخب کریں وہی حکومت کی مسند پر متمکن ہوں عوام کے ہاتھ میں حکمرانی کی طاقت محفوظ کرنے اور حکومت کے منتخب افراد کو بے راہ روی سے روکنے کے لئے بہت سے اصول وضع ہوئے مثلاً عاملانہ اور اختیارات کی علیحدگی، سیاسی اختیارات کی تقسیم، میونسپل، لوکل بورڈ اور صوبوں وغیرہ میں لکھا ہوا آئین جس میں رد و بدل نہ کیا جا سکے، اس آئین میں ترمیم و تنسیخ کا حق تا کہ اسے عوام کی رائے اور مرضی کے ماتحت رکھا جائے، دو منتخب ایوانوں کا قیام تا کہ قوانین اور احکام پر کافی غور خوض ہو سکے، ہر بالغ کو ووٹ کا حق، مجلس قانون ساز کے علاوہ براہ راست بھی ووٹروں کا اختیار INITIATIVE کسی خاص اور اہم مسئلے میں مجلس قانون ساز کا کل ووٹروں سے براہ راست فیصلہ چاہنا جو ریفرنڈم کہلاتا ہے۔ پھر عوام کے حقوق کی تفصیل بھی طے کر دی گئی اور حکومت کو ان کا ذمہ دار ٹھہر دیا گیا، تا کہ اگر وہ اس ذمہ داری کی کما حقہ بجا آوری میں غفلت برتے تو اسے مسند اختیار سے ہٹایا جا سکے۔ عوام کے ان حقوق کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی کہ ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں اور کم عمر بچوں کے سوا ہر شخص کو خود مختار سمجھا جائے اور کسی ایک شخص کو بھی کسی دوسرے انسان کا غلام بننے کی اجازت نہ دی جائے۔

چنانچہ اس اصول کی بنا پر نہ صرف عوام کے جان و مال کی تحفظ اور امن واطمینان کے ساتھ نقل وحرکت کرنے کی آزادی کا تحفظ ہی حکومت کے فرائض میں داخل کیا گیا بلکہ حکومت کا فرض یہ بھی قرار دیا گیا کہ.........

1- بلا استثناء ہر ایک کو اتنی تعلیم ضرور دی جائے کہ وہ با آسانی لکھ پڑھ سکے اور معمولی اخبارات ورسائل کا مطالعہ کر سکے

2- ہر شخص کی گزر اوقات کا کم از کم اتنا انتظام کر دیا جائے کہ وہ با آسانی معمولی طور پر زندگی بسر کر سکے۔

3- تحریر وتقریر پر کسی قسم کی کوئی روک نہ ہو اور نہ جماعت بنانے پر کسی قسم کی قدغن ہو۔ ہر عقیدے اور خیال کے انسان کو آزادی کے ساتھ اپنے عقائد وخیالات کی اشاعت کی اجازت ہو بجز اس صورت کے کہ وہ کھلے طور پر فحش اور مخرب الاخلاق نہ ہوں۔

تحریر تقریر کی آزادی اور سیاسی جماعتوں کے بحث ومباحثے چونکہ رائے عامہ کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں، اس لیے عوام کے اس حق کی حفاظت کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی حتی کہ فرانس اور بیلجیم کے آئین میں اسے اساسی جز بنا دیا گیا۔

4 عوام کی صحت وسلامتی کی حفاظت نہ صرف بیرونی حملہ آوروں یا اندرونی قانون شکنوں سے کی جائے بلکہ امراض کے حملے سے بچانے کے لئے حفظان صحت کے تمام لوازمات کو بھی ہر انسانی بستی میں فراہم کیا جائے۔

قومیت یا نیشنلزم کی پیدائش:

نپولین بوناپارٹ کی شکست کے بعد 1875ء میں آسٹریلیا کے دارالحکومت ویانا میں یورپ کی اقوام کی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں پہلی بار اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا کہ ہر انسانی بستی جو نسل، مذہب تہذیب اور زبان کے لحاظ سے ایک ہو، وہ ایک قوم ہے اور ہر قوم کو سیاسی اعتبار سے آزاد وخود مختار ہونے کا حق ہے اور کسی دوسری قوم کو حق نہیں کہ وہ اپنے علاوہ کسی دوسری قوم پر حکمرانی کرے، لیکن اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے باوجود ہر قوم کو سیاسی خود اختیاری سے بہرہ مند کرنا اس وقت عملاً ممکن نہیں تھا۔ اول تو یورپ کی تمام قومیں اتنی منظم اور طاقت ور نہ تھیں کہ اپنے اس حق کو منوا سکیں اور دوسرے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آسٹریا، ہنگری، جرمنی، روس، ترکی اور اٹلی وغیرہ کی شہنشاہیتیں اس کے لئے تیار نہ تھیں کہ ان کی حفاظت کی حدود میں جو دوسری اقوام آباد تھیں، ان کو آزاد کر کے اپنے مفادات کو نقصان پہنچائیں، تاکہ انقلاب فرانس کے بعد یورپ میں قومی خود اختیاری کا جذبہ شدت سے پیدا ہو گیا تھا اس کو جس حد تک ممکن تھا مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی، مگر چونکہ اس میں مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس لئے غیر مطمئن قوموں نے طاقت کے بل بوتے پر اپنے حق کو منوانے کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ اس کانگریس کے بعد یورپ میں جتنی جنگیں ہوئیں ان سب کا بنیادی نقطہ یہ ہی تھا کہ ہر قوم اپنے جذبات آزادی وسروری کو آسودہ کرنا چاہتی تھی۔

1750ء صنعتی انقلاب اور بین الاقوامی مسابقت

صنعتی انقلاب INDUSTRIAL REVOLUTION کی اصطلاح کا اطلاق خصوصیت سے تاریخ انگلستان میں 1750-1850ء کے زمانے پر ہوتا ہے جب معاشی ڈھانچے میں زرعی انحصار کے نظام سے جدید صنعتی نظام کی طرف بڑھنے کا انقلاب نمودار ہوا۔ اس زمانے میں یورپ میں بھاپ کی طاقت کا علم لوگوں کو ہوا، جس کی مدد سے بڑی بڑی مشینیں اور بڑے بڑے کارخانے وجود میں آئے۔ اب تک صنعت وحرفت کا تمام کام گھروں پر ہاتھ سے کیا جاتا تھا، مگر اب بھاپ کے انجن اور مشینوں کی ایجاد نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور جو چیز انسانی ہاتھ سے دن بھر میں تیار ہوتی تھی اسے مشین نے منٹوں میں تیار کر دیا۔ مشینوں اور انجنوں کی اس طاقت نے صنعت وحرفت کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ بڑے بڑے سرمائے سے کارخانے تیار ہونے لگے اور ان میں پہلے سے کہیں زیادہ سامان تیار ہونے لگا۔ مگر مشینوں سے تیار ہونے والے سامان کی زیادتی سے دو نئے سوال اٹھ کھڑے ہوئے، ایک یہ کہ اتنا سامان بیچا کہاں جائے اور دوسرا یہ اتنا بہت سا سامان تیار کرنے کے لئے ابتدائی مواد RAW MATERIAL کہاں سے لایا جائے۔ مثلاً کل تک یورپ میں بھی جو کپڑا تیار (ہاتھ سے) ہوتا تھا وہ مشکل سے یورپ کی ضروریات پورا کرتا تھا۔ اب اس فالتو سامان کو بیچنے کے لئے دنیا میں دوسری منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ اس احتیاج سے مجبور ہو کر یورپ نے جگہ جگہ اپنی تجارت کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ یورپ کے سوا ابھی باقی دنیا مشینوں سے بے خبر تھی اس لیے مغربی تاجروں کی آمد اسے ناگوار نہ گزری، بلکہ بڑی خوشی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ ادھر اسے اپنے کچے مواد کے لئے ایک مال دار گاہک ہاتھ آیا اور اس کے معاوضے میں اسے ایسا سامان ملنا شروع ہوا جسے وہ خود تیار نہیں کر سکتی تھی چنانچہ آہستہ آہستہ نئی اور پرانی دنیا کے بازاروں میں یورپ کے تاجروں کی اہمیت بڑھنے لگی مگر اب خود یورپ کی مختلف قوموں میں مسابقت شروع ہوئی اس مسابقت میں ہر قوم نے اپنے بازاروں کو اپنے لئے محفوظ کرنے کی غرض سے ان پر سیاسی تسلط جمانا شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آخر تک افریقہ کے ایک کروڑ پندرہ لاکھ مربع میل رقبہ میں سے لائبیریا اور مصر کی برائے نام آزادی کے علاوہ پورا خطہ براہ راست یورپ کے سیاسی اقتدار میں آ گیا۔ نئی دنیا میں امریکہ اور آسٹریلیا میں چونکہ یورپ کے مہاجرین بڑی تعداد میں بس گئے تھے اس لئے انہوں نے یورپ کے جواء اقتدار سے تو آزادی حاصل کر لی تھی مگر وہاں کے اصلی باشندوں کی محنت اور وہاں کی زمینوں کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے میں انہوں نے ابھی اپنے یورپی بھائیوں سے ساز باز کر لی۔ ایشیاء میں ہندوستان تو انگریزی

اقتدار میں آ ہی گیا لیکن اس کے علاوہ بھی مشرقی ومغربی ایشیاء، کو جو علاقہ بظاہر آزاد تھا اسے بھی تجارتی معاہدوں کی وساطت میں یورپ نے جکڑ لیا۔ گویا دنیا میں ہر طرف یورپ کی سامراجیت چھا گئی۔

الغرض اٹھارویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی تک ساری دنیا کے بازار یورپ کے قبضے میں آ چکے تھے۔ یہاں کارخانے دار کچا مال خریدتے تھے اور تیار شدہ مال بیچتے تھے اس تجارت میں نفع زیادہ تر یورپ کو ہی تھا اس لیے کہ اول تو سیاسی اقتدار کی وجہ سے کچا سامان یورپ کو معمولی قیمت پر حاصل ہو جاتا تھا اور دوسرے مشینوں کی مدد سے اس سامان کی شکل وصورت بدل کر اصل قیمت سے کہیں زیادہ میں دوبارہ بیچ دیتا تھا۔ اس تجارت نے دولت اقوام عالم کا رخ یورپ کی طرف کر دیا اور ساری دنیا یورپ کے معاشی چنگل میں پھنس کر رہ گئی۔

اقوام کا حسد ورقابت:

مگر اس تجارت میں قدرتی طور پر یورپ کی بعض اقوام زیادہ فائدہ میں تھیں اور بعض کم فائدے میں جن اقوام نے ذرا پہلے سے توجہ کر کے بڑے بڑے بازاروں پر قبضہ کر لیا تھا ان کے مقابلے میں دوسری قومیں خسارے میں رہتی تھیں اس لیے اس برادری یورپ کی قوموں میں باہمی حسد ورقابت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور باہمی بداعتمادی کی فضا شدت سے پھیلنے لگی۔ سیاسی خود مختاری فضول ہے اگر معاشی حالت اچھی نہ ہو اس باہمی بداعتمادی کی فضا میں یورپ کہ ہر قوم میں سیاسی طور پر آزاد ہونے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس کا اولین تقاضا یہ تھا کہ معاشی اعتبار سے بھی وہ قوم مالدار ہو، لیکن معاشی اعتبار سے ہر قوم مالدار کیسے ہو سکتی ہے۔ دنیا کے بازاروں یا منڈیوں پر اقوام نے جس طرح تسلط جما رکھا تھا اس کا تقاضا ہی یہ تھا کہ کچھ اقوام فائدے میں تھیں اور کچھ نقصان میں۔ جنوبی افریقہ میں سونا بہت پیدا ہوتا تھا مگر چونکہ جنوبی افریقہ ایک خاص قوم کے ہاتھ میں تھا اس لیے سونے پر بھی اس قوم کے سرمایہ داروں کے سوا دوسرے لوگوں کا گذر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح دوسرے ملکوں کا حال تھا۔ پھر درآمدات برآمدات کا محصول تھا جس کی مدد سے دوسروں کی خرید وفروخت کو روکا جا سکتا تھا مثلاً ہالینڈ نہیں چاہتا تھا کہ جاوا میں انگلینڈ کا مال بکے، وہ یہاں صرف اپنا مال بیچنا چاہتا تھا اس لیے انگلینڈ کا جو مال جاوا جاتا تھا اس پر بھاری محصول عائد کر دیا گیا۔ قدرتاً انگلینڈ کو اپنے مال کی قیمت بڑھانا پڑی جس سے اس کا مال ہالینڈ کے مال سے مہنگا ہو گیا پھر جب بازار میں سستا مال موجود ہے تو گاہک مہنگا مال کیوں خریدے گا، نتیجتاً جاوا کی منڈی انگلینڈ کے مال پر حاوی ہوگئی۔ یہ صورت کچے مال کی خریداری میں پیدا کی گئی اگر انگلینڈ جاوا کی کپاس خرید کر باہر لے جانا چاہتا ہے تو اسے سرحد پر برآمد کا محصول ادا کرنا ہوگا جس سے کپاس کی قیمت اسے اصل سے ڈیڑھ گنا پڑے گی۔ لیکن ہالینڈ کا جاوا پر قبضہ ہے اس نے خود اپنے لیے خریدی کپاس پر کوئی محصول عائد تو نہیں کیا اس لیے اسے یہ کپاس مہنگی نہیں پڑی۔

پھر بحری راستوں کا سوال تھا مثلاً جاوا تک پہنچنے کے لیے سب سے نزدیک جو بحری راستہ پڑتا ہے اس پر الف کا قبضہ ہے اس لیے ب لمبے راستے سے گذر کر نقصان میں رہتا ہے، یا پھر خطرہ ہے کہ الف جب چاہے یہ راستہ بند کر سکتا ہے۔ راستوں پر قبضہ کرنے کی صورتیں دو ہیں ایک تو یہی کہ جس سمندری زمین سے راستہ جاتا ہے اس پر قبضہ کر لیا گیا ہو یا پھر راستے کے خاص خاص اڈوں یا ناکوں پر قبضہ کر لیا، خصوصاً سمندری راستوں پر قبضہ رکھنے کی صورت یہ ہے مثلاً نہر سویز جس کے قبضہ میں ہے وہ بحر روم سے بحر ہند تک جانے کے راستے پر قابض ہے۔ اسی طرح نہر پانامہ جس کے قبضے میں ہے وہ بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک پہنچنے کے آسان راستے پر قابض ہے۔ درہ دانیال اور باسفورس پر قابض بحر مارمورا پر اور

بحروم کی درمیانی شاہراہ پر تسلط رکھتا ہے۔
غرض اسی تجارتی مسابقت نے اقوام یورپ کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا ہر قوم سیاسی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ معاشی اعتبار سے بھی دوسری قوم کے ہم پلہ ہو کر جینا چاہتی تھی مگر حالات اس قسم کے بنا دیئے گئے تھے کہ یہ ممکن نہ رہا اس لئے وہ اقوام جو سیاسی طور پر آزاد تھیں معاشی طور پر دوسروں کی دست نگر تھیں اور وہ جو سیاسی اور معاشی طور پر ہر طرح محکوم تھیں دونوں میں جبر وطاقت کی مدد سے فوقیت وبرتری حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور اس جذبے نے رفتہ رفتہ نسل وقومیت کے سوال میں جاہلانہ رنگ پیدا کر دیا ہر قوم میں اپنے عوام کو ایک درس دینا شروع کر دیا کہ دنیا میں ان کی نسل جسمانی وروحانی اور تہذیب وتمدنی طور پر ساری دنیا سے بہتر ہے اس لئے دنیا کی سرداری کا حق صرف ان ہی کو پہنچتا ہے نسلی برتری کے درس سے عوام کے دل میں مقابلہ ومقاومت کے جذبات مشتعل کئے جاتے تھے تاکہ وہ جبر وطاقت کی مدد سے معاشی وسیاسی برتر حاصل کر سکیں اس سے قبل عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر بادشاہ اپنی مقصد براری کیا کرتے تھے مگر اب مذہب کا سوال نہ رہا تھا اس لئے کہ سارا یورپ عیسائی تھا اور عقیدتاً ہر یورپی قوم ایک دوسری سے بہت کم اختلاف رکھتی تھیں اس بنا پر اب اپنے حریف کے خلاف جذبات کو انگیختہ کرنے کا صرف یہی ذریعہ رہ جاتا تھا کہ قومی اور نسلی تفاخر سے کام لیا جائے اس لئے آہستہ آہستہ قومیت کے نام پر جذبات نے مذہب جیسی کیفیت اختیار کر لی اگرچہ اب یورپ مذہب سے دور ہو رہا تھا مگر قومیت کا جنون شدت اختیار کر گیا۔ پاپائیت کے زوال اور انقلابات سے پہلے افراد میں جذبہ اقتدار اور دولت کے حصول کے لئے جور قابتیں اور چشمکیں تھیں اور جن کی وجہ سے شہنشاہیاں بنتی بگڑتی تھیں اب یہی جذبات قوموں میں منتقل ہو گئے تھے اب قوموں میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہوا اور ہر قوم نے خود کو ساری دنیا سے ارفع ثابت کرنا شروع کر دیا۔
کیم مئی 1851ء کو ملکہ وکٹوریہ نے لندن میں بین الاقوامی آثار صنعت کی ایک بڑی نمائش کا افتتاح کیا یہ اس قسم کی صنعتی نمائشوں میں پہلی تھی جس میں میکانکی عجائبات ایک ایسی نمائش گاہ میں اکٹھے کئے گئے تھے جو بجائے خود انجینئرنگ کا کمال تھی یعنی کاخ بلور لوہے اور شیشے کی ایک عظیم الشان عمارت جو ہائیڈ پارک کے اندر ایک تہائی میل سے زیادہ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ جو لوگ اس شیشے کے عظیم محل کی سیر کو آئے ان پر آشکار ہو گیا کہ برطانیہ دنیا بھر کی کارگاہ ہے اور صنعتی انقلاب یہاں منزل بلوغ پر پہنچ چکا ہے۔
اسی طرح انیسویں صدی میں اقوام عالم میں برطانیہ کو صنعتی قیادت کا درجہ حاصل رہا۔ مالیات کے متعلق قانون سازی اس کا محض ایک جزو تھی برطانیہ کے پاس کوئلے اور لوہے کے بڑے بڑے ذخیرے موجود تھے اور ان سے بآسانی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا نیز برطانوی جزائر جغرافیائی لحاظ سے متحد تھے اس لئے کان سے دھات پگھلانے کے مقام تک اور کارخانے سے بندرگاہ کے فاصلے مقابلتاً کم تھے اور خرچ بھی کم آتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں برطانیہ کے اندر دنیا بھر کے لوہے کا نصف حصہ تیار ہوتا تھا۔ پارچہ بافی کی کیفیت کو پیش نظر رکھا جائے تو برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے بعد سے 80 لاکھ تکلے کام کر رہے تھے جو دخانی قوت سے چلتے تھے اس کے مقابلے میں امریکہ میں 55 ہزار تکلے اور فرانس میں صرف 40 ہزار تکلے تھے۔ یہی دو ملک برطانیہ کے مقابلے میں پیش پیش تھے۔ تاہم برطانیہ قیادت کی عروج کمال پر بھی پہنچ کر فن ایجاد کا اجارہ دار نہ تھا۔ فرانس، جرمنی، بیلجئیم اور امریکہ بھی اس میدان میں پیش پیش تھے۔ اور صنعتی انقلاب میں اس کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔

1789ء کا زرعی انقلاب

صنعت کی ترقی سے زراعت میں بھی اصلاح ہوئی، اسی طرح زرعی انقلاب کی رفتار بھی تیز تر ہوگئی جو اٹھارویں صدی میں شروع ہوا تھا۔ کارخانوں کیلئے زرعی آلات مثلاً فصل کاٹنے کی مشین یا فولادی ہل سے شمالی امریکہ کے میدانوں میں کاشت کاری کا انتظام ہوگیا اور نہایت ارزاں سامان سے تیار ہونے والے نلوں کی بدولت بے کار و دلدلی زمینیں زرخیز کھیتوں میں تبدیل ہوگئیں اس طرح مکھن الگ کرنے کی مشین تیار ہوئی جس نے ڈیری فارم کی دنیا میں انقلاب لا دیا۔ ریل کی پٹڑیوں اور بحری جہازوں سے زرعی پیداوار تیزی سے منڈیوں میں پہنچنے لگی اسی طرح مختلف زرعی یا سبزی اور فروٹوں کو ڈبوں میں بند کرنے یا درجہ انجماد پر رکھنے کا انتظام ہوا جو بہت سی زرعی اجناس کو تقریباً لامحدود مدت تک رکھنا ممکن ہو گیا۔

1789ء سے پہلے زرعی انقلاب کی ترقی بڑی غیر متوازن تھی، صرف وہی کسان اس کے حامی بن سکے جو زیادہ منچلے تھے اور صرف چند ملکوں میں اسے قدم جمانے کا موقع مل سکا۔ براعظم یورپ میں پروشیا یا جرمنی نے اس سلسلے میں سبقت کی شاہ فریڈرک اعظم نے اپنی رعایا کو ہدایت دی کہ مویشی کی پرورش نئے اصولوں پر کریں چارہ پیدا کرنے پر خاص توجہ دیں فصلیں بدل بدل کر کاشت کریں اور تمام امور میں انگلستان کے ترقی یافتہ طریقوں پر عمل کریں۔ زراعت کے نئے طریقے برطانیہ کے صرف ان لوگوں نے قبول کئے تھے جن کے پاس وسیع جاگیریں تھیں جارج سوم کو ان میں علمبردار کا درجہ حاصل تھا اسی وجہ سے اسے کسان جارج کا لقب ملا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں ہر حلقہ جزواً خود کفیل تھا۔ دور حاضر میں یہ ضرورت پیش آگئی تھی کہ سرمایہ دارانہ طریقہ پر خاص فصلیں فروخت کے لئے پیدا کی جائیں اس ارتقاء میں زرعی انقلاب کو ایک اہم مرحلے کی حیثیت حاصل تھی۔ اٹھارویں صدی میں اصلاح دوست مالکان اراضی نے جن طریقوں کی طرف توجہ دی ان کی حیثیت سرمایہ دارانہ تھی کیونکہ ان میں بڑی بڑی رقمیں لگائے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ بڑے بڑے روایتی کھیت حلقہ جاتی معمولات سے فارغ ہو جائیں، مثلاً ہر کسان کے لئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کا سلسلہ جاری ندے مگر اکثر انگریزی دیہات کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے اردگرد کسانوں کے کھیت تھے جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر ان کے حوالے کر دیے گئے تھے، لہٰذا اصلاح دوست مالکان اراضی نے مطالبہ کیا کہ ان مشترک کھیتوں کے اردگرد ڈھکے لگا دیے جائیں اور نجی مالکان کی زمین الگ ہو جائے۔ اس طرح پہلے سائنٹفک زراعت میں برطانیہ کو عملداری حاصل

تھی پھر جرمنی کے حکمران فریڈرک کی توجہ سے جرمنی اس میدان میں اسکا شریک کار بن گیا۔ جرمن تجربہ کاروں نے 1800ء سے کچھ مدت بعد شیریں چقندر سے شکر اتنی مقدار میں حاصل کر لی کہ وہ ایک تجارتی جنس بن گئی اور یورپ جزائر غرب الہند کے گنے کی شکر کا محتاج نہ رہا۔ انیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں ایک جرمن کیمیائی ماہر لائی بگ LIEBEG نے نامیاتی کیمیا سے زراعت میں کام لینے کے متعلق موثر کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ وہ کہتا تھا کہ پودوں کی نشوونما تین بنیادی عناصر پر موقوف ہے۔ اول نائٹروجن دوم پوٹاشیم سوم فاسفورس۔ فصلیں اور چارے کی پیداوار زمین سے یہ عناصر کھینچ لیتے ہیں، اگر یہ عناصر دوبارہ زمین کے لئے مہیا نہ کیے جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جو زمین پہلے زرخیز تھی اس کی حالت وہی ہو جائے گی جس کا تجربہ ورجینیا کے زرخیز خطے میں ہو چکا تھا اب کے مختلف حصوں میں پہلے کی طرح گندم، تمباکو جیسی چیزیں پیدا نہیں ہوتی تھیں۔

انیسویں صدی میں زراعت نے ایسی ترقی کی، اتنی پھیلی اور اس قدر نفع بخش ہوئی کہ پہلے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، لیکن اس زرعی انقلاب نے بڑی گراں قیمت وصول کی۔ چقندر سے بنی ہوئی شکر بازار میں آئی تو جزائر غرب الہند میں طویل کساد بازاری شروع ہوگئی جس پر قابو نہیں پایا جاسکا۔ اعلیٰ درجے کے صنعتی ممالک میں بھی زراعت کی عمرانی اور سیاسی حیثیت گھٹ گئی انیسویں صدی میں انگریزوں کے لئے کھیتی باڑی سب سے بڑا پیشہ نہ تھی اور صرف زمین ہی ثروت یا سیاسی قوت کا ہمہ گیر معیار نہ رہی تھی برطانیہ کے صنعت کاروں اور تاجروں نے قوانین غلہ کی تنسیخ کی مہم میں مالکان اراضی پر فتح حاصل کر لی یعنی گندم اور دوسری اشیاء خوردنی کی درآمد پر جو محاصل عائد تھے انگریز ان سب کو غلے سے تعبیر کرتے تھے۔ قوانین غلہ کے خلاف ایک طاقتور لیگ منظم کی اور احتجاج کیا کہ ان محاصل کی وجہ سے اشیائے خوردنی کی قیمتیں بڑھ گئیں ہیں۔ 1840ء میں قوانین غلہ منسوخ ہوئے تو آزاد تجارت شروع ہوگئی۔ فیصلہ کن عامل وہ بیماری تھی جس کی وجہ سے آئرلینڈ میں آلوؤں کی فصل متواتر دو سال تک برباد ہوتی رہی اور ارزاں قیمت پر غلہ کی درآمد ناگزیر ہوگئی اسکے بغیر آئرلینڈ کو قحط سے نہ بچایا جاسکتا تھا۔

☆

1715ء تجارتی انقلاب

دنیائے مغرب کے تین بڑے اقتصادی تغیرات۔ تجارت میں، زراعت میں اور صنعت وحرفت میں آئے جنہوں نے دنیا کے نظامِ قدیم کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں اور دنیا کی کایا پلٹ دینے میں بڑی مدد ملی۔ یہ دراصل اقتصادی انقلاب عالم تھے جو آہستہ آہستہ رونما ہوئے اور ان میں سیاسی انقلابات جیسی ڈرامائی شان تو نہ تھی مگر انجام کار تاریخ انسانیت پر ان کا اثر اعتبار سے انقلابی تھا۔ یہ تینوں اٹھارویں صدی کے اختتام کے بعد بھی جاری تھے اور انیسویں صدی کے حالات پر غور کرتے ہوئے ان کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ 1715ء اور 1789ء کے درمیان تجارتی انقلاب سب سے بڑھ کر پختگی سے قائم رہا۔ یہ تقریباً ہر یورپی ملک میں پہنچا اور اس نے جنگ سیاسیات اور معاشرے پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کے برعکس زرعی اور صنعتی انقلاب بالکل ابتدائی حالت میں تھے۔ لیکن وہ بڑے صحت مند تھے اور ان کی وجہ سے مزارعوں اور دوکانوں میں نئے طور طریقے جاری ہوئے۔ برطانیہ، فرانس اور جرمنی کو ان انقلابات سے نئی قوت ملی۔

تجارتی انقلاب کے بنیادی ادارے 1715ء سے پہلے نشوونما پا چکے تھے۔ بینک اور بیمے کے مرکز دورِ احیائے علوم بلکہ اس سے بھی پہلے شروع ہو چکے تھے۔ سند یافتہ تجارتی کمپنیاں سولھویں صدی میں بننے لگی تھیں۔ تجارتی نظریہ زر اور تجارت کے متعلق حکومت کے مسلک اور مشرب کا بنیادی فلسفہ فلپ دوم کے ہسپانیہ اور لوئی چہاردھم نیز کولبرٹ کے فرانس میں عہد پختگی کو پہنچ چکا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں تجارت نے رفتہ رفتہ ترقی کی تو تجارتی انقلاب کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی کاروبار اور وسائل حمل ونقل کو پہلے سے جو اعانت مل رہی تھی اس کے طریقے میں بھی اصلاح ہوگئی اور دائرہ بھی پھیل گیا۔ نیز اعانت کے لئے وسائل مکمل کر لیے گئے۔

تجارت کی مقدار و حجم میں غیر معمولی اضافہ ہوا تو جہازوں اور ان کے سامان کے لئے بیمے کی طلب میں بھی اضافہ ہو گیا اٹھارہویں صدی کے لندن میں جو لوگ بیمے کے ایجنٹ تھے وہ بھی بہت سے تھے۔ جیسا کہ اس صدی بحری جہاز اور دیگر بیرہ طلب اشیاء بڑھ گئیں تھیں۔

دوسرے کاروباری:

تھا۔ لائڈ 1713ء میں فوت ہو، تاہم بیمے کے ماہرین اسی قہوہ خانہ میں رہتے ہوئے اکٹھے ہوتے تھے۔ یوں لندن کے مشہور ایوان لائڈ کی ابتدا ہوئی۔ یہ نام قائم رہا، اگرچہ لائڈ کی فرم قہوہ خانے سے اٹھ کر تجارت میں رائل ایکسچینج میں پہنچ گئی جو

...معروف مقام تھا۔ لائڈز ہی نے بحری بیمے کے لئے پالیسی کی ایک معیاری فہرست شائع کی جس کا نام لائڈ لسٹ (LLOYE.S LIST) تھا جہازوں کی تباہی اور جہازوں کے متعلق یہ پہلا صحیح اور مفصل اطلاع نامہ تھا اس فرم نے ایک حد تک تو اثر شہرت بھی حاصل کی، کیونکہ جب کوئی جہاز تباہ ہوتا اور اس کی تباہی کی اطلاع ملتی تو لائڈز کی طرف سے جہاز کی گھنٹی بجادی جاتی تھی۔

قہوہ خانے کی بے تکلف فضا نے لندن میں ایک اور ادارے کو نشوونما دی، یعنی سٹاک ایکسچینج کا ادارہ۔ مشترکہ کمپنیوں میں حصص کی خرید و فروخت جاری تھی اور تاجر جو تھمین کے قہوہ خانے میں جمع ہوتے تھے، 1774ء میں انہوں نے جو تھمین کے قہوہ خانے کا نام تبدیل کر کے سٹاک ایکسچینج رکھ دیا یا "سٹاک ایکسچینج کا قہوہ خانہ" تیس سال بعد قہوہ خانہ کا لفظ اس نام سے حذف کر لیے گئے اور صرف کاروباری نام سٹاک ایکسچینج باقی رہ گیا۔

اس اثناء میں تجارت کی مدد دینے والی دوسری چیزیں جو رونما ہو رہی تھیں، نقشوں کی اصلاح، روشنی کے میناروں کی بابت اور تیرتے ہوئے پیپوں کی ایجاد سے جہازرانی زیادہ محفوظ ہوگئی۔ سمندر میں جہازوں کے کپتان دو نئے آلات کے ذریعے سے اپنے مقام اور محل کا اندازہ کرنے لگے ان میں ایک وہ آلہ تھا جسے زاویہ پیما کہتے تھے دوسرے کا نام جہازی گھڑی یا وقت پیما تھا۔ زاویہ پیما دوربین ہی سے تیار کیا گیا تھا اس سے دوپہر کے وقت سورج کے ارتفاع کا اندازہ ہو جاتا تھا اور اس طرح جہاز کے عرض بلد کا پتا چل جاتا تھا۔ جہاز کی رفتار کے باعث عام گھڑیاں غلط ہو جاتی تھیں لیکن جہازی گھڑی (وقت پیما) ہر حال میں صحیح وقت بتاتی تھی اسے گرینچ کے وقت کے مطابق رکھا گیا تھا ان دو نئے آلات کی مدد سے جہاز کے طول البلاد کا بھی اندازہ ہو جاتا جو گرینچ کے وقت اور جہاز کے مقامی وقت کے درمیان فرق واضح کر دیتا ہے۔

خشکی پر آمد رفت اور حمل و نقل کے وسائل میں اصلاح کی رفتار بہت سست تھی۔ سمندر میں یہ اصلاحات جلد جاری ہو گئیں۔ اگر فرانس کی اچھی شاہراہوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو یورپ کی سڑکیں محض پگڈنڈیاں رہ جاتی تھیں یا ایسے رستے جن پر گاڑیاں چلنے کے نشانات موجود رہ جاتے تھے۔ اس وجہ سے خشکی پر سامان کی نقل و حمل کا سلسلہ 1750ء کے بعد تک بھی بہت سست رہا۔ یہ غیر محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ گراں خرچ بھی تھا یہاں تک کہ جابجا روک تھام کے لئے پھاٹک بن گئے اور نہریں جاری ہوئیں۔ ان سے حالات کچھ بہتر ہوئے۔ انگلستان میں سب سے پہلی نہر وہ تھی جو برج واٹر کے ڈیوک نے 1759ء اور 1761ء کے درمیان نکالی تھی اس نہر کے راستے ان کانوں سے جو ڈیوک کی جاگیر تھیں کوئلہ کارخانوں کے نئے شہر مانچسٹر پہنچنے لگا جس سے اس کا خرچ آدھا رہ گیا۔ پھر ڈیوک نے اس نہر کو مانچسٹر سے لورپول کی بندرگاہ تک پہنچا دیا اور دوسری نہریں بھی کھودی جانے لگیں۔ وسائل حمل و نقل میں انقلاب کی یہ ابتدا تھی یہاں تک کہ 1800ء تک بڑی بڑی شاہراہیں اور ریل کی پٹریاں بچھائی جانے لگیں تجارت کے راستے میں اس وقت کئی رکاوٹیں تھیں۔ مثلاً گلڈ کے قواعد و ضوابط میں کئی پابندیاں تھیں۔ پھر مقامی باٹوں اور پیمانوں کی کثرت، سکوں کے اختلاف اور جابجا محصول عائد تھے جو پریشان کن تھے مثلاً ایک تاجر نے دریائے ایلبا کے راستے ڈریسڈن جرمنی سے ہیمبرگ تک لکڑی لے جانے کا ٹھیکہ لیا۔ اسی راستے پر اسے قصبوں اور ریاستوں کے اتنے محصول ادا کرنے پڑے کہ ساٹھ شہتیروں میں سے جو ڈریسڈن سے روانہ کئے گئے تھے محصول کی ادائیگی کے بعد صرف چھ ہیمبرگ پہنچ سکے۔ اتنے فاصلے کا سفر کشتی میں ایک ہفتہ لیتا تھا، لیکن مختلف

مقامات پر ٹھہر ٹھہر کر محصول ادا کرنے کے باعث ایک ماہ صرف ہو جاتا تھا۔ فرانس میں تجارت میں سفری اور محاصلی رکاوٹیں اسی نوعیت کی موجود تھیں۔ ایک ماہر مالیات فرانسیسی کا کہنا ہے کہ ایک پشت کے انسانوں میں شاید ایک دو ایسے انسان ہوں جنہیں محاصل کے متعلق پورا علم ہو۔

اس زمانے میں حکومت کی طرف سے تجربہ گاہوں کا انتظام نہ تھا۔ کاروباری یا تجارتی فوائد کے لئے کاوباری گروہوں کے دباؤ سے حکومت کی طرف سے کسی اہم ایجاد یا مقابلے میں انعامات کا اعلان کیا جاتا تھا، تاکہ تجارت کو بڑھایا جائے۔ ایک ایسا ہی اعلان انگلستان کی پارلیمنٹ نے کیا کہ اس شخص یا گروہ کو بیس ہزار پونڈ کا انعام دیا جائے گا جو بحر اوقیانوس سے مشرق بعید تک شمالی ومغربی راستہ دریافت کرے گا۔ اسی طرح بیس ہزار پونڈ کا انعام اس شخص کو دینے کا اعلان کیا گیا جو صحیح بحری گھڑی ایجاد کرے۔ جس شخص نے یہ گھڑی ایجاد کی اسے اپنا انعام وصول کرنے میں 25 سال صرف ہو گئے۔

اس زمانے میں نجی منچلاپن اور سرکاری تغافل کا فرق بہتر طریق پر سٹے بازی کے ان دو منصوبوں سے نمایاں ہوتا ہے جو اٹھارہویں صدی کے اوائل میں جاری ہوئے، ایک مسس پی کا بے سروپا منصوبہ جس کا تعلق فرانس سے تھا دوسرا ساؤتھ سی یا جنوبی سمندر کا بے سروپا منصوبہ جس کا تعلق انگلستان سے تھا۔ یہ دونوں دراصل بینکاری کے منصوبے تھے جو ناکام رہے مگر ان کی وجہ سے دونوں ملکوں میں کاغذ کے سکے یا کرنسی نوٹ جاری ہو گئے۔

......☆......

1848ء اشتراکیت واشتمالیت

اشتراکیت Communism، سیاسی لغت کے ان کلیدی الفاظ میں سے ایک ہے جنہیں اخلاقی تعبیرات سے اس درجہ گرانبار کر دیا گیا ہے کہ ان کے متعلق بحث وتنازع سے مفر نہیں۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے اشتراکیت ہر اس سیاسی یا اقتصادی فلسفے کا اظہار ہے، جس کا مقصد ہو کہ وسائل پیداوار نجی افراد کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ معاشرے کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں اس کا عام مطلب یہ ہوا کہ حکومت قوم کی امین اور متولی کی حیثیت سے تمام کارہائے معاشرت کی مالک بن جائے اشتراکیت اپنی انتہائی شکل میں چاہتی ہے کہ پیدوار کے تقریباً تمام تر وسائل زمین کی معدنی دولت تک عوام کی ملکیت ہوں یا دوسرے لفظوں میں ریاست کا اثاثہ ہوں۔

انقلاب فرانس کے بعد:

انقلاب فرانس ایک بورژوا انقلاب تھا جس سے محنت کشوں کی توقعات تو پوری نہ ہوئیں البتہ اس کے نتائج بڑے دوررس نکلے اور سیاسی انقلاب سے قطع نظر زندگی کے ہر شعبے میں اہم تبدیلیاں اور تغیر رونما ہوئے چنانچہ انیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سالوں کو اہم اگر انقلابوں کا عہد کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اس اثناء میں خود فرانس دو مرتبہ انقلاب سے دوچار ہوا اور مسلح بغاوتیں ہوئیں، حتیٰ کہ انقلاب کی لہریں رود بار انگلستان عبور کر کے برطانوی ساحل سے جا ٹکرائیں۔ انقلاب کا یہ جوش زندگی کے کسی ایک حلقے تک محدود نہ تھا بلکہ تمام عملی اور ادبی حلقوں میں انقلابی سرگرمیوں کا اثر قبول کیا گیا۔

صنعتی انقلاب کے نتیجے میں محنت اور سرمائے کی ایک نئی کشمکش کا آغاز ہوا۔ مشینوں کی ایجاد نے پیداوار کو تو یقیناً بہت زیادہ بڑھا دیا لیکن اس کے ساتھ ہی انسانی محنت کی قیمت گرا دی۔ کل تک کپڑے کے دس ہزار تھان تیار کرنے کے لئے جہاں دس ہزار آدمیوں کی محنت درکار تھی اور محنت کرنے والا جس قیمت میں چاہے اپنی محنت کے نتیجے کو فروخت کرنے کا اختیار رکھتا تھا مگر اب دور بدلا اور مشینوں کی بدولت دس ہزار تھانوں کی تیاری کے لئے صرف چند آدمیوں کی محنت کافی ثابت ہونے لگی نتیجتاً بقیہ آدمی بے کار ہو گئے پھر جو آدمی کام پر لگ گئے وہ بھی خود مختار نہ تھے بلکہ کارخانے دار کے نوکر تھے، ان کا کام صرف مشینوں کو آپریٹ کرنا تھا، انہیں صرف اپنی اجرت سے سروکار تھا نہ منافع پر ان کو کوئی حق تھا نہ وہ اجرت بڑھانے کے لئے کارخانہ دار سے جھگڑا کر سکتے تھے۔ ادھر بے کار افراد کے بڑھ جانے سے کارخانے دار نے بہت معمولی اجرت پر مزدوروں سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس چیز نے مفلس اور نادار مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔

مشینوں سے پہلے اشیا تیار کرنے کے لیے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت نہ تھی، مگر مشین خریدنے اور کارخانہ کھولنے کے لیے بہت سا سرمایہ صرف ہوتا تھا۔ اس لیے سرمایے کی لاگت سے کارخانہ دار کے پاس تو دولت کے انبار سمٹ کر پہنچنے لگے جبکہ مزدور اور محنت کش بے کار ہونے کی وجہ سے معمولی اجرتوں پر کام کرنے پر مجبور ہو گئے اور کارخانہ دار کے دست نگر ہو گئے۔ جو ایک قسم کا زمانہ انقلاب تھا۔ اینجلز نے لکھا ہے کہ کارخانہ داری کے اس نظام نے مزدوروں کے طبقے کو کارخانہ دار یا مل مالک کا غلام بنا کر رکھ دیا اور کاریگروں کی تمام آزادی قانونی اور حقیقی دونوں طرح ختم ہو گئی۔ اگر کوئی مزدور صرف دس منٹ تاخیر سے کام پر پہنچتا تو اس کی اجرت ماری جاتی بلکہ اسے کارخانہ دار کی سینکڑوں باتیں سننا پڑتیں۔ ان حالات کے نتیجے میں ایک طرف تو بڑے بڑے سرمایہ دار وجود میں آئے، دوسری طرف بے شمار افلاس زدہ مزدور نما انسان۔ اسی بنا پر بہت سے انسان جن میں کاریگر بھی شامل تھے مشینوں کو لعنت سمجھتے تھے۔

سوشلزم:

اس عہد میں انارکزم ANARCISM یا مزاج کی سوچ حکومت اور معاشرے کی پابندیوں کے خلاف پیدا ہوئی جس کے مطابق اگر انسان آزاد پیدا ہوا ہے تو اسے آزاد ہی رہنا چاہیے اور اس پر کسی قسم کی حکومت کی یا اخلاق کی گرفت نہ ہو۔ اس کا محرک دراصل حد سے بڑھی ہوئی سرمایہ داری کی وجہ سے حد سے بڑھی ہوئی غربت وہ بے روزگاری تھی۔ مقصد یہ کہ سرمایہ دار کو حکومت و قانون کی جو امداد حاصل ہوتی ہے اس سے وہ غریبوں اور محنت کشوں کی محنت سے من مانا فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے بدلے میں محنت کو کچھ نہیں دیتا۔ مگر انارکزم کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کمزور والی و وارث کوئی نہیں رہتا تھا کیونکہ اگر حکومت اور قانون کو مٹا دیا جائے تو پھر دنیا میں صرف طاقتور ہی فائدے میں رہے گا اور کوئی کمزور انسان آزاد نہیں رہ سکے گا۔ بہر حال انارکزم کا تو زیادہ مقبول نہ ہوا البتہ سوشلزم یا اشتراکیت نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ سوشلزم نے مزدوروں اور محنت کشوں کی فریاد کو سنا، مگر حکومت سے بے نیاز ہونے کی بجائے انہیں یہ بتایا کہ حکومت دراصل مزدوروں اور محنت کشوں کا حق ہے۔ سوشلزم کے اصول کے مطابق پیداوار کے مالک صرف محنت کش افراد ہیں اس لیے جو محنت نہیں کرتا اسے پیداوار سے حصہ لینے کا بھی مطلق حق نہیں پیداوار کو صرف محنت کرنے والے افراد میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔

کارل مارکس:

سوشلزم یا اشتراکیت کا کھوج یوں تو افلاطون کے فلسفے میں صدیوں پہلے ملتا ہے سینٹ سائمن ST.SIMON، فوریر FOURIER، لوئی بلانک LOUIS BLANC اور رابرٹ اوون ROBERT OWEN وغیرہ جیسے مفکرین کو اس کا مقدم کہا جاتا ہے لیکن سوشلزم یا اشتراکیت کو جدید اور منظم شکل دینے والا کارل مارکس ہے جسے سوشلزم کا "پیغمبر" کہا جاتا ہے۔ 5 مئی 1818ء کو جرمنی میں پیدا ہونے والا یہ ایک یہودی باپ کا بیٹا تھا مگر بعد میں اس نے مسیحیت قبول کر لی تھی۔ برلن یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ اس زمانے میں مشینوں سے پیدا ہوئی بے کاری اور بے روزگاری کا چرچا عام تھا، اور محنت کش اور مزدور طبقے میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات نے مارکس کے دل و ذہن پر بڑا اثر کیا اور اس نے مزدوروں کی حمایت میں اور سرمایہ داری کی مخالفت میں ایک اخبار نکالا۔ مگر چونکہ اس وقت تک اس نئی صورت کا کوئی معقول علاج دنیا کے

سمجھ میں نہ آیا تھا اور اس مشکل کا کوئی جامع و مانع حل تجویز نہیں ہو سکا تھا اس لیے مارکس کے خیالات کو منافرانہ اور احمقانہ قرار دیا گیا اور ان خیالات کی پاداش میں اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ جرمنی سے نکل کر وہ پیرس آ گیا جو انقلابیوں کی آماجگاہ تھی یہاں سے وہ اپنے اشتراکیت پسندانہ خیالات کی اشاعت کرنے لگا، مگر بہت جلد یہاں سے بھی اس کے اخراج کا حکم صادر ہو گیا۔ اتفاق سے 1848ء سے جرمنی میں حکومت وقت کے خلاف ایک بغاوت کے آثار رونما ہوئے۔ مارکس نے سمجھا کہ شاید ان حالات سے کچھ فائدہ پہنچ جائے اس لئے وہ بھاگ کر جرمنی آ گیا۔ مگر جب بغاوت بار آور نہ ہو گئی تو وہ لندن چلا گیا اور اپنی موت تک وہیں مقیم رہا۔ 1853ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ لندن میں کارل مارکس نے اپنے ایک گہرے دوست فریڈرک اینگلز FREDRICH ENGLES کے ہاں مقیم رہا۔ اسی کی دوستانہ مہمان نوازی نے اسے غربت کی جلاوطنی کی مصیبتوں سے نجات دلائی اس لئے کہ کارل مارکس غریب الدیار ہی نہیں بلکہ مفلس اور تنگ دست بھی تھا، جبکہ اینگلز ایک کارخانہ دار کا بیٹا تھا اور ابن امیر تھا، لیکن اپنی امارت کے باوجود محنت و سرمایے کے مسئلے میں اپنے دوست کارل مارکس کا ہمنوا اور ہم خیال تھا۔

کیمونسٹ مینی فسٹو:

برسلز کی بڑی اشتراکی کانفرنس 1848ء میں منعقد ہوئی۔ مارکس اور انگلز دونوں نے مل کر ایک اشتراکی کیمونسٹ مینفسٹو (اعلان حقوق) جاری کیا جس میں دنیا کا نیا معاشی نظام وضع کیا گیا اس منشور کو اشتراکی دنیا میں وہی مقام حاصل ہے جو مذاہب عالم میں الہامی کتب کو حاصل ہے اس منشور کی اشاعت کے بعد مارکسی اشتراکیت کا نام سوشلزم کی بجائے کیموزم (اشتمالیت) پڑ گیا اس لیے اگرچہ سوشلزم بھی دولت کی مساوی تقسیم اور یکساں معاشی حالت پر زور دیتا ہے مگر اس سے بہت سے فرقے اور گروہ پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے اس کی مختلف تعبیریں رواج پا گئیں تھیں۔ اس سبب سے سوشلزم کی انتہا پسندانہ شکل کو کیموزم کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ کیمونسٹ مینفسٹو کے بعد اشتراکیت کا مفصل و مدلل فلسفہ مارکس کی مشہور کتاب "سرمایہ" (داس کیپٹل) کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کی تین جلدیں ہیں جن کی اشاعت 1867ء میں ہوئی۔ یہ تین جلدیں اشتراکیوں کا "قرآن" سمجھی جاتی تھیں۔ ان میں جو اصول پیش کئے گے ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

تمام دولت مزدور پیدا کرتے ہیں، مگر سرمایہ دار مفت کھاتے ہیں اس لئے سب کے سب دولت مزدوروں کو ملنی چاہیے۔ پھر چونکہ سرمایہ دار لازماً اپنی حفاظت کریں گے اس لئے ان کو مٹا کر ایک ایسی معاشرت قائم کی جائے جس میں معاشی لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہو اور امیر غریب اور متوسط حال کے نام سے جو تین انسانی طبقات قائم ہیں ان سب کو گڈمڈ کر کے ایک کر دیا جائے۔ اس مقصد کی کے حصول کے لئے حکومت عوام کی منتخب کردہ محنت مزدوری کا تعلق براہ راست حکومت سے ہو نہ کہ سرمایہ دار سے۔ ہر بوڑھے اور بیمار آدمی کی کفالت حکومت کرے مفاد عامہ کے تمام اداروں کی مالک حکومت ہو دولت کی پیداوار اور اسکی فروخت اور کھپت سب حکومت کے ہاتھ میں ہو تا کہ سب کی معاشی ضروریات کی پوری پوری تکمیل ہو سکے۔ تجارت میں باہمی مقابلے کا جو رواج ہے اور جس کی وجہ سے چھوٹی پونجی والوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے اسے حکومت کی مداخلت سے ختم کیا جائے اس کی جگہ باہمی اشتراک و تعاون کے عمل کو رائج کیا جائے تا کہ زندگی کے

بہترین مواقع اور محنت کے زریں منافع کو سب میں برابر تقسیم کیا جا سکے۔ قومیت کا وطنیت کا اصول انسانیت کے معاشی اور
سیاسی مفاد کے سخت خلاف ہے اس لئے قومیت کو ختم کر کے بین الاقوامیت کو اس کا قائم مقام بنایا جانا چاہیے۔
خدا یا خدا کا قانون کوئی چیز نہیں۔ مادہ ہی سب کچھ ہے اس لئے مذہب وکلیسا جو سرمایہ داری کے حامی ہیں انہیں بھی
مٹادینے کی ضرورت ہے۔ مذہب ایک قسم کی افیون ہے جو غریبوں کو ذلت اور مسکنت پر قانع رہنا سکھاتا ہے، دنیا کا نظام
کسی روحانی یا خدائی طاقت کے ماتحت نہیں چلتا بلکہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صرف مادی ذرات کے تصادم وتخالف اور
معاشی طبقات کی کشاکش باہمی کا۔ مارکس کا دہریانہ فلسفہ دراصل مندرجہ ذیل انسانی مشکلات کا ردعمل تھا۔

1۔ حد سے بڑھی ہوئی جارحانہ قوم پرستی جس کی وجہ سے ہر قوم دنیا کے وسائل دولت کو خود ہی استعمال کرنا چاہتی ہے،
ردوسروں کو اس سے محروم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے اس قسم کی حد بندی ممکن نہیں
ہے اس لیے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

2۔ انفرادیت:۔ یعنی ہر شخص کا یہ تصور ہو کہ جہاں تک ہو اسے ''چھیڑومت'' خصوصاً دولت وسرمائے کے معاملے میں
حکومت کی نگرانی کسی پر نہ ہو۔ جو شخص جتنا سرمایہ چاہے جمع کرے اور جس طرح چاہے اپنا کاروبار چلائے مزدوری کی
اجرت وغیرہ یا مال کی خرید وفروخت کے کے معاملے میں صرف سرمایہ داری کی انفرادیت کو مختار کل ہونا چاہیے۔
حکومت کو اس کے اختیار میں کس قسم کی کوئی مداخلت ہرگز نہ کرنی چاہیے۔

3۔ انارکزم یا مزاج، یعنی تمام اخلاقی، قانونی اور سیاسی بندھنوں کو توڑ کر آزاد مطلق ہونے کی خواہش

4 ۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے محنت مزدوری کو جو نقصان پہنچا اور جس کی وجہ سے ایک طرف تو حد سے بڑھی سرمایہ داری
وجود میں آئی اور دوسری طرف حد سے بڑھی ہوئی غربت وفاقہ کشی کا ظہور ہوا۔

یہ تمام خوبیاں اتنی مصائب انگیز تھیں کہ دنیا کی غریب اور بدحال آبادی نے جب مارکس کے نظریات کو سنا تو بڑی گرم
جوشی کے ساتھ ان کی طرف لپک پڑی اور دنیا کے غریبوں میں اشتراکیت کا سحر انگیز نظریہ بڑی سرعت سے پھیلنے لگا۔ مگر
سوویت یونین میں 70 سال اس کے عملی نفاذ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس نظام میں بہت سی خامیاں ہیں جو اسکے ناکام ہو
جانے کا باعث بنیں اور 1917ء میں مقتدر ٹھہرنے والا یہ نظام 1991ء میں منہدم ہو گیا۔

اشتراکیت یا سوشلزم چونکہ قومیت کے خلاف ہے اس لیے اس کی تبلیغ واشاعت کے لئے جتنی جماعتیں بھی بنیں وہ
سب بین الاقوامی تھیں۔ اس لیے اس سلسلے کی سب سے پہلی جماعت کو پہلی بین الاقوامی یا ''فرسٹ انٹرنیشنل'' کہا جاتا ہے۔
یہ 1864ء میں بنی تھی چند سال کچھ تو باہمی اختلافات کچھ ناکامیوں کی وجہ سے یہ ٹوٹ گئی اس کے بعد دوسری انٹرنیشنل
1889ء میں قائم ہوئی۔ لیکن 1914ء کی جنگ عظیم میں اس کے بہت سے ارکان نے بین الاقوامی نصب العین کے خلاف
اپنی اپنی قوموں کی طرف سے جنگ میں حصہ لیا اس بے راہ روی کی وجہ سے یہ بھی ٹوٹ گئی۔ اور تیسری انٹرنیشنل انقلاب
روس کے بعد 1919ء میں بنی، لیکن بہت سے اشتراکیوں کو اعتراض ہوا کہ اس طرح اس میں بھی اہل روس کی قوم پرستی
شامل ہو گئی ہے اس لیے غیر روسی دنیا نے اس کے مقابلے میں اپنی الگ انٹرنیشنل بنالی، لیکن دعویٰ دونوں کا یہ رہا کہ ان کی
کوششوں کا نتیجہ ساری دنیا سے ہے اور اسی لئے دونوں نے اپنی اپنی شاخیں ساری دنیا میں قائم کیں۔

ان بین الاقوامی (انٹرنیشنل) جماعتوں کے علاوہ انگلستان میں ٹریڈیونین کے نام سے اور فرانس وغیرہ میں لیبر سنڈیکیٹ (مزدوروں کی اشتراکی تنظیم) کی قسم کی بھی مزدوروں کی جماعتیں قائم کی گئیں۔ انگلستان کے علمی حلقوں نے سوشلزم کے اصول بتدریج رائج کرنے کی غرض سے فیبین سوسائٹی FABIAN SOCIETY کے نام سے ایک جماعت قائم کی تھی جس کے ارکان میں مشہور ڈرامہ نگار برنارڈ شاہ اور ایچ جی ویلز جیسی ذی علم ہستیاں بھی شامل تھیں۔ یہ لوگ رسالوں کتابوں اور علمی مضمونوں کے ذریعے اشتراکی خیالات کو عام کرنے کے قائل تھے اور سرمایہ داروں کے مقابلے میں مزدوروں کی حمایت کرتے تھے۔

امریکہ اور دنیا کے تمام غیر کیمونسٹ ممالک میں کیمونسٹ پارٹی کی شاخیں بھی قائم رہی ہیں۔ امریکہ میں اس کا قیام 1919ء میں ہوا تھا۔ ان تنظیموں کا بنیادی مقصد سرمایہ دارانہ حکومتوں کا خاتمہ اور مزدور راج کا قیام تھا۔ 1920ء میں ہونے والی ہڑتالوں میں انہیں کا ہاتھ تھا انہوں نے امریکی جمہوریت کی مذمت بھی کی تھی۔ 1935ء میں کمنٹرن حکمت عملی کے بموجب چولا بدل کر حریت پسندوں کی حمایت شروع کی گئی۔ اندرونی طور پر کئی اداروں اور مزدور انجمنوں پر قبضہ کیا گیا۔ 1941ء میں روس پر نازی حملے کے بعد انہوں نے پوزیشن بدلی اور جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر جنگ کی حمایت کی جنگ کے بعد سرمایہ دارانہ نظام سے ہمدردیاں ختم کر دی گئیں۔ 1991ء میں سویت یونین، چیکوسلواکیا اور یوگوسلاویہ جیسے اشتراکی ممالک کے ٹوٹنے سے اشتراکیت اور اشتمالیت کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں ہیں اور یہ نظام اب دنیا کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

کیمونسٹ مینیفسٹو کے مندرجات:

کارل مارکس اور اینگلز کا یہ منشور تاریخ عالم کو طبقاتی کشمکش کا نتیجہ قرار دیتا ہے، جس کے متحارب فریق بورژاویت یعنی سرمادار اور پرولتاری یعنی محنت کش ہیں۔ آخر کار فتح و کامیابی کا سہرا پرولتاری کے سر رہے گا۔ اس منشور کے مطابق بورژا طبقہ اپنے گورکن پیدا کرنے کا خود ذمہ دار ہے۔ اس طبقہ کی ہلاکت یقینی اور پرولتاری طبقے کی کامیابی ناگزیر ہے۔ منشور میں کہا گیا کہ پرولتاری کامیابی کے بعد اپنے آپ کو کسی نئے حکمران طبقے میں منتقل نہیں کر سکتے، کیونکہ پرولتاری تحریک کا منتہا مقصود سماج کی کثیر آبادی کو جو محکومی اور غربت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس عذاب جان کاہ سے نجات دلانا اور آزادی اور اقتصادی آسائش سے ہمکنار کرنا ہے۔

......☆......

امریکہ کا انقلابِ آزادی

1776ء

انقلاب فرانس سے تقریباً بارہ سال پہلے شمالی امریکہ کی برطانوی نوآبادیات میں ایک زبردست جمہوری انقلاب برپا ہوا۔ امریکی نوآبادیوں نے اپنے جمہوری حقوق کی حفاظت کے لئے کامیاب جنگ لڑ کر آزادی حاصل کر لی۔ امریکہ کا یہ انقلاب تحریک آزادی اور انقلاب فرانس دونوں تاریخ جمہوریت میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں دونوں واقعات سے دنیا جدید میں جمہوریت کا آغاز ہوا تھا۔ جہاں انقلاب فرانس نے حکمرانی سے مطلق العنانی کے اس دور کا خاتمہ کیا جو یورپ پر تاریک دور بن کر مسلط تھا وہیں انقلاب امریکہ نے شمالی امریکہ بلکہ پوری دنیا سے نوآبادیاتی نظام کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں اور محکوم قوموں کو آزادی کی راہ دکھائی۔ دنیا کی انقلابی تاریخ میں یہ دور اس لیے بہت اہم تسلیم کیا جاتا ہے کہ امریکہ اور فرانس کے عظیم انقلابوں سے مطلق العنانی اور شہنشاہیت کے نظام کی شب تاریک دور ہو گئی اور نئے جمہوری دور کا آفتاب طلوع ہوا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دوسرے صدر جان ایڈمز نے اعلان کیا تھا کہ امریکی انقلاب کی تحریک کا آغاز 1620ء میں ہوا تھا جب لندن کمپنی نے ورجینیا اور میساچوسٹس کی دو نوآبادیاں قائم کیں تھیں اور جدید ورجینیا میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی تھی۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو انگلستان اور امریکہ کے راستے 1763ء میں جدا ہوتے نظر آتے ہیں، جب جیمز ٹاؤن، ورجینیا میں پہلی نوآبادی کی بنیاد رکھے 150 سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور برطانیہ نے نئے ٹیکس نافذ کئے تھے۔

جنگ آزادی یا انقلاب:

نوآبادیات میں برطانیہ فرانس کے درمیان اٹھارہویں صدی کی طویل جنگوں نے برطانیہ کی مالی پر بہت برا اثر ڈالا۔ دوسری طرف نوآبادیوں کی دولت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا چنانچہ 1763ء میں برطانوی حکومت نے غیر نوآبادیاتی مقاصد کے لئے نوآبادیات پر ٹیکس عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا پہلا تجربہ اخبارات اور تجارتی دستاویزات پر اسٹامپ ڈیوٹی کے نفاذ کی شکل میں کیا گیا۔ امریکیوں نے اس ٹیکس کو اپنے حقوق پر حملہ اور آئندہ غیر آئینی مداخلت کی ابتدا قرار دیا۔ چنانچہ ہر طرف اس کی مخالفت ہونے لگی۔ اسمبلیوں، اخباروں اور جلسوں میں اس کی مذمت کی گئی۔ آخرکار برطانوی حکومت یہ ٹیکس منسوخ کرنے پر مجبور ہوگئی، لیکن برطانیہ عظمیٰ کا وقار قائم رکھنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا قانونی شکل دے کر یہ اعلان کیا گیا کہ

آبادیاں ہر طرح برطانیہ کے تابع ہیں اور برطانوی پارلیمنٹ کو نو آبادیوں میں ٹیکس لگانے کا اختیار ہے۔ اپنے اس اختیار کا عملی مظاہرہ کرنے کے لئے پارلیمنٹ نے شیشہ، کاغذ اور چائے پر ٹیکس عائد کر دیا۔ نو آبادیوں میں ان ٹیکسوں کی بھی شدید مذمت کی گئی۔ اب برطانیہ نے دوسری تمام اشیاء پر عائد ٹیکس تو منسوخ کر دیئے مگر چائے پر ٹیکس برقرار رکھا گیا، کیونکہ شاہ برطانیہ جارج سوم نے کہا تھا ''اپنا حق ثابت کرنے کے لئے کم سے کم ایک ٹیکس ضرور وصول کرنا چاہیے'' اس ٹیکس کی وصولی بھی سختی سے کی جانے لگی۔ نو آبادیوں نے اس قوانین کی بھی خلاف ورزی کی۔ سموئیل ایڈمز کی قیادت میں محب وطن امریکیوں نے 16 دسمبر 1773ء کی رات کو ریڈ انڈین مزدوروں کا بھیس بدل کر بوسٹن کی بندرگاہ میں لنگر انداز 3 برطانوی بحری جہازوں سے چائے اتارنے کے بہانے جہازوں پر لائی ہوئی چائے کو سمندر میں پھینک دیا، یہ چائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت تھی۔ اس واقعہ سے برطانیہ کو ایک بڑے بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر چائے کے ضیاع کو نظر انداز کر دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کو نو آبادیوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ سرکاری طور پر برطانیہ نے اس واقعہ کی مذمت کی اور تادیبی طور پر بوسٹن کی بندگاہ بند کر دی صوبوں کا مرتبہ بدل دیا۔ ججوں اور جیوری کے ارکان پر برطانوی حکومت کا اقتدار قائم کر دیا گیا۔ نو آبادیوں کو ڈرانے کے لئے بڑی تعداد میں فوج امریکہ بھیج دی گئی۔ ان حکومتی سختیوں کے جواب میں امریکی آباد کاروں نے یہ طے کیا کہ برطانوی مال درآمد نہ کیا جائے.........

قائد انقلاب آزادی امریکہ

جارج واشنگٹن (1732-1799ء) ویسٹ مورلینڈ ورجینیا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک زمیندار تھا۔ والد کے بے وقت انتقال کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم نہ پا سکا۔ سٹیٹ ملیشیا یا رضا کار فوج میں ایڈ جوائنٹ جنرل مقرر ہوا۔ 1754ء میں فرانسیسیوں کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا جو اوہایو کے علاقے میں داخل ہو رہے تھے، لیکن ناکام واپس آ گیا۔ کچھ عرصہ بعد لیفٹیننٹ جنرل کی حیثیت سے فرانسیسیوں سے لڑا اور انہیں شکست دی۔ 1755ء میں ریاست ورجینیا کی فوج کا کمانڈ انچیف مقرر کیا گیا۔ 1755ء۔ 1758ء تک فرانسیسیوں سے جنگ جاری رہی آخر میں انہیں شکست فاش دی اور خود بھی فوج سے سبکدوش ہو گیا۔

واشنگٹن امریکہ پر برطانوی راج کا سخت مخالف تھا۔ اس جذبے سے وہ سیاست میں داخل ہوا اور جب ملک میں تحریک آزادی چلی تو وہ پہلی اور دوسری کانگرس کا رکن منتخب ہوا۔ 1775ء میں امریکیوں نے برطانیہ کے خلاف بغاوت کی تو واشنگٹن کو امریکی افواج کو کمانڈر بنایا گیا اس نے انگریزوں سے بوسٹن اور نیویارک خالی کروا لیے۔ 1782ء میں سیاست سے کنارہ کش ہو گیا 1787ء میں مجلس آئین ساز میں صدارت کے لئے اسے بلایا گیا۔ اسی اجلاس میں امریکہ کا آئین منظور ہوا، اور واشنگٹن کو متفقہ طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس نے 30 اپریل 1789ء کو اپنے عہدے کا حلف لیا۔ 1793ء میں دوبارہ بلا مقابلہ منتخب ہوا مگر تیسری مرتبہ اس نے انکار کر دیا۔

...... اپنی فوجی طاقت کو بڑھانے کے لئے اسلحہ سازی کی جائے۔ کشیدگی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ 1775ء میں خونریزی شروع ہوگئی اور لیکسنگٹن کی لڑائی ہوئی۔ جنرل واشنگٹن کو نوآبادیات کی جنگ آزادی کا سپہ سالار مقرر کیا گیا، برطانیہ کا اقتدار ختم ہونے لگا۔ 10 مئی 1775ء کو فلاڈیلفیا میں دوسری براعظمی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کا صدر بوسٹن کا ایک امیر تاجر جان ہینکوک تھا۔ تھامس جیفرسن بھی وہاں موجود تھا۔ آخر کار نیو ہمپشائر، میساچوسٹس، رہوڈ آئلینڈ، کنکٹی کٹ، نیویارک، نیوجرسی، پنسلوانیہ، ڈیلاویر، میری لینڈ، ورجینیا، نارتھ کیرولینا اور جارجیا 13 برطانوی نوآبادیوں نے 4 جولائی 1776ء کو اعلان آزادی کر دیا اور متحد ہو کر زبردست جمہوری قوت بن گئیں۔

اعلان آزادی:

ہمارے نزدیک سچائیاں منہ بولتی حقیقت ہیں کہ تمام انسان ایک جیسے پیدا ہوئے ہیں کہ وہ اپنے خالق کی طرف سے بعض ناقابل تنسیخ حقوق سے نوازے گئے ہیں اور یہ کہ یہ حقوق میں زندگی آزادی اور مسرتوں کے حصول میں شامل ہے۔

اعلان آزادی 4 جولائی 1776ء:

امریکہ کے اس اعلان آزادی میں نہ صرف ایک نئی قوم کے جداگانہ تشخص کا اعلان کیا گیا بلکہ اس میں انسانی آزادی کے فلسفے کا تصور بھی پیش کیا گیا جو اس دن کے بعد پوری مغربی دنیا کے لئے قوت محرکہ ہوگا۔ اس کی بنیاد کسی تحریری یا شکایت پر نہیں بلکہ انفرادی آزادی کے وسیع تر تصور پر ہوگی۔

1776ء میں دستور پنسلوانیہ، دستور ورجینیا اور اعلان آزادی تین اہم آئینی جمہوری اور انقلابی دستاویز مرتب ہوئیں جن میں جمہوری انقلاب کے علمبرداروں کے تصورات پوری طرح کارفرما تھے ہر ایک دستاویز میں اس بات پر زور دیا گیا کہ حکومت کے قیام کا مقصد کیا ہے اور کن حالات میں عوام کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ موجودہ حکومت کا تختہ الٹ کر ایک نئی حکومت قائم کریں چنانچہ دستور پنسلوانیہ میں یہ واضح کیا گیا کہ ہر ایک حکومت کے قیام کا بنیادی مقصد یہ ہوتا کہ معاشرہ کی اس طرح تنظیم و حفاظت کی جائے کہ اس معاشرہ کو تشکیل دینے والے افراد ان تمام حقوق اور نعمتوں سے جو انسان کو خالق کائنات نے عطا کی ہیں پوری طرح مستفید ہوں۔ چنانچہ جو حکومت یہ اعلیٰ اور بنیادی مقاصد پورے نہ کر سکے، وہاں عوام کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ رضامندی عامہ سے حکومت کو بدل دے۔ چونکہ شاہ انگلستان اور اس کی حکومت نے قیام حکومت کے بنیادی مقصد پورا نہ کیا اور عوام پر ظلم و استبداد کے تمام حربے اختیار کئے تھے اس لئے عوام کو یہ بنیادی حق حاصل ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے خود ایک ایسی حکومت تشکیل دیں اور ایسے منصفانہ قوانین بنوائیں جو فلاح و بہبود عامہ کو پوری طرح ملحوظ رکھیں۔

1776ء میں اعلان آزادی کے بعد تیرہ برطانوی نوآبادیاں باہم متحد ہوگئیں اور انہوں نے ایک آزاد مملکت کی شکل اختیار کر لی۔ 1782ء میں امریکی ریاستوں کی جنگ آزادی ختم اور مکمل ہوگئی امریکی نوآبادیاں اس جنگ آزادی میں کامیاب ہوئیں اور برطانوی تسلط سے پوری طرح آزاد ہوگئیں۔ آزادی اور امن عامہ کی بحالی کے بعد متحدہ ریاستوں کے لئے ایک موزوں دستور کی ضرورت پیش آئی، فلاڈیلفیا میں مختلف ریاستوں کے نمائندوں نے 10 ستمبر 1787ء کو نیا قومی آئین منظور کیا اور 29 جولائی 1790ء کو تمام ریاستوں نے اس کی قطعی توثیق کر دی۔

انقلاب کے اثرات:

1775ء میں امریکی انقلاب کا آغاز ہوا اور حریت پسندوں نے پورے براعظم کو آزاد کرانے کے لئے کینیڈا پر بھی حملہ کر دیا ان کی توقع یہ تھی کہ فرانسیسی آبادی جو انگریزوں کی حکومت سے غیر مطمئن تھی ان کا ساتھ دے گی، حریت پسندوں نے مونٹریال پر قبضہ کر کے کیوبک کا محاصرہ کر لیا لیکن قبضہ نہ کر سکے 1776ء میں یہ انقلابی واپس چلے گئے اگر چہ یہ انقلابی کینیڈا پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے تاہم جب صلح نامہ ہوا تو بڑی جھیلوں اور دریائے اوہیو کے درمیان کا علاقہ ان کو مل گیا جو قانون کیوبک کی رو سے کینیڈا میں شامل تھا۔ اگر چہ امریکی انقلابی فوجیں کینیڈا سے واپس ہو گئیں لیکن امریکی انقلاب کے اثرات نے اس ملک پر بڑا اثر ڈالا جمہوی حقوق و جمہوری حکومت کا مطالبہ زور پکڑ گیا امریکی انقلاب کے بعد ان ریاستوں سے بادشاہ پسند ہزاروں کی تعداد میں بھاگنے لگے اور چالیس ہزار سے زائد اشخاص نوا اسکوٹیا میں آباد ہوئے ادھر برطانیہ کے بدلے ہوئے حالات سے بھی لوگ ترک وطن کر کے کینیڈا آ گئے اور انگریزوں کی کافی بڑی تعداد اس صوبہ میں آباد ہو گئی قانون کیوبک کی رو سے فرانسیسیوں کو جو حقوق ملے تھے ان سے وہ مطمئن نہ ہوئے تھے اب امریکی ریاستوں اور برطانیہ سے کثیر تعداد میں آباد کاروں کی آمد کے بعد انہیں مزید شکایات پیدا ہو گئیں اور ان کی کشمکش شدید تر ہونے لگی آخر کار 1791ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے دستور حکومت کے نام سے ایک قانون منظور کیا جس کے مطابق کینیڈا بالائی اور زیریں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور دریائے اوٹاوا ان کے درمیان حد فاصل مقرر کیا گیا۔ بالائی صوبے میں انگریز اور زیریں میں فرانسیسی آباد تھے دونوں صوبوں میں علیحدہ گورنر مقرر ہوئے اور جداگانہ کونسلیں اور اسمبلیاں قائم کی گئیں۔ اسمبلیوں کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ خود اختیاری کے مطالبہ کی ایک حد تک تکمیل کر دی جائے لیکن عوام اس سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔

بغاوتیں:

1812ء میں برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو دو سال جاری رہی۔ تو ریاستوں نے کوشش کی کہ وہ کینیڈا پر بھی قبضہ کر کے اسے بھی ریاستوں میں شامل کر لے لیکن ان کی یہ کوشش بھی ناکام رہی اس جنگ نے کینیڈا کی عوام میں بے چینی بڑھا دی جمہوری حقوق کا مطالبہ شدید تر ہو گیا لیکن ان پر انگریزوں نے توجہ نہ کی جوزف پاپینو جو کینیڈا کے فرانسیسیوں کا راہنما تھا جب اس نے دیکھا کہ حکومت خود اختیاری کے لئے آئینی جدوجہد کامیاب نہ ہوئی تو 1837ء میں اس نے ایک فرانسیسی جمہوریہ قائم کرنے کے لئے بغاوت کر دی خود اختیاری کے مطالبہ پر دونوں صوبے متفق تھے چنانچہ انگریز آباد کاروں کے راہنما ولیم مکنزی نے بھی پاپینو کا ساتھ دیا اور شمالی کینیڈا میں خود اختیاری اور اصلاحات کے نفاذ کے لئے بغاوت کر دی یہ دونوں بغاوتیں فرد کر دی گئیں اور دونوں باغی راہنما بھاگ کر کینیڈا سے باہر چلے گئے مگر کچھ عرصہ بعد واپس آ گئے اور جمہوری تحریک پھر شروع ہو گئی۔

تجاویز ڈرہم:

اگر چہ بغاوتیں دبا دی گئیں تھیں مگر برطانوی حکومت ان حالات سے پریشان تھی اس لئے اس نے لارڈ ڈرہم

کو کینیڈا کا گورنر جنرل بنا دیا اور حالات کا بغور جائزہ لے کر تجاویز پیش کرنے کا حکم دیا۔ لارڈ ڈرہم نے جمہوری حقوق اور اصلاحات کے لئے تمام تحریکوں کا بغور جائزہ لیا اور ان حالات سے عہدہ براہونے لئے اپنی حکمت عملی مرتب کی لیکن برطانوی حکومت نے اس حکمت عملی سے اتفاق نہ کیا لارڈ رہم نے دونوں صوبوں کو ایک کر کے ان متحد علاقوں کی ایک منتخب پارلیمنٹ قائم کرنے کے تجویز پیش کی تھی جس کے تحت وزارت اور کابینہ بھی قائم جانی تھی مگر رپورٹ کو نا قابل توجہ سمجھا گیا مگر کچھ عرصہ بعد ان سفارشات پر عمل کیا گیا، مگر فرانسیسیوں نے اس الحاق کو پسند نہ کیا اور مزید جمہوری اختیارات کا مطالبہ کرنے لگے۔ ان کی یہ تحریک زور پکڑتی گئی اور 1849ء میں منظور کر لی گئی اور اس طرح کینیڈا خود مختار ہونے لگا یکم جولائی 1867ء کو کینیڈا کی خود مختاری تسلیم کر لی گئی۔ امریکہ میں ہسپانیہ کے مقبوضات بہت وسیع تھے اور شمالی وسطی امریکہ اور جنوبی امریکی نو آبادیوں پر بھی امریکی انقلاب کے آثرات مرتب ہوئے اور یہ ممالک تین سو سالہ غلامی کے بعد سپین سے آزاد ہوئے۔ سپین سے یہ آزادی امریکہ کے انقلاب آزادی کے صرف پچاس سال بعد حاصل کی گئی۔

......☆......

1800ء انیسویں صدی کی انقلابی جدوجہد اور انقلابات

انقلاب فرانس نے مطلق العنانی پر ضرب کاری تو لگائی مگر اس سے جو بحرانی کیفیت پیدا ہوئی اس کا فوری نتیجہ تعمیر کی بجائے تخریب کی شکل میں نکلا جس سے خود انقلاب اور جمہوریت کے کے مقاصد کو نقصان پہنچا۔ انقلاب کے بعد فرانس میں ظلم و تشدد، بدامنی، خون ریزی اور غارت گری اور دہشت گردی و بربریت کا جو دور شروع ہوا اس نے برطانیہ جیسے جمہوریت پسند ملک میں بھی ایڈمنڈ برک جیسے جمہوریت کے بڑے حامیوں تک کو انقلاب کا مخالف بنا دیا۔ نپولین کے برسر اقتدار آنے کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور مختلف ممالک میں فرانس کی فوجی قیادت و طاقت اور نپولین کی فاتحانہ عظمت کی اساس پر جمہوری انقلاب کی عمارت تعمیر کی جانے کی کوشش ہونے لگی۔ اس کا ردعمل بھی مخالف قوتوں کی شکل میں نکلا۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سوا جس کے راہنما انقلاب کے ساتھ ہی جمہوری ترقی و استحکام کے لئے کوشاں تھے، جمہوری انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرنے والے دوسرے ممالک میں جمہوریت اور مطلق العنانی کی کشمکش پھر عود کر آئی انقلاب فرانس کے پیش کردہ جمہوری تصورت کو روبہ عمل لانے کے لئے جمہوریت کے حامیوں کو طویل جدوجہد کرنا پڑی اور وہ اپنے مقاصد انیسویں صدی میں پورے کر سکے۔

قدامت پسندوں کا عروج:

جنگ واٹرلو میں نپولین کی شکست نے انقلاب فرانس کے پیدا کردہ اس سیلاب کو روک دیا جو سارے یورپ کو بہا لے گیا تھا۔ جمہوری جدوجہد میں عارضی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں اور قدامت پسندوں حکمرانوں اور راہنماؤں کے اقتدار کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ قدامت پسندوں کا قائد میٹرنخ تھا جس نے ویانا کانگرس میں پرانے نظام کی تجدید کروائی تھی اور اس طرح قدامت پسند طبقہ 1815ء سے لے کر 1848ء کے انقلاب تک با اقتدار رہا میٹرنخ یہ چاہتا تھا کہ یورپ میں ایک بار پھر مطلق العنانی کا دور دورہ ہو اور قانون ساز اداروں جمہوری حقوق، آزاد خیالی اور انقلابی رجحانات کو بالکل کچل دیا جائے۔ آسٹریا میں اس نے آزادی فکر پر پابندیاں عائد کر دیں اور جمہوری نظریات کی حامل مطبوعات کو ممنوع قرار دے دیا۔ تعلیمی اداروں کے لئے ایسی درسی کتب تیار کی گئیں جو قدامت پسندی پیدا کریں سیاسی اور مذہبی امور پر اظہار رائے کی

مزاحمت کر دی گئی اور سارے ملک میں جاسوس پھیلا دیے گئے جو آزاد خیالوں پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ جرمنی میں بھی آزاد خیالی اور انقلابی رجحان کو روکنے کی منظم کوشش کی جانے لگی۔ جرمن طلباء میں آزادی قومی اتحاد اور روشن خیالی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور اس مقصد کے لئے انہوں نے خفیہ انجمنیں قائم کیں تھیں۔ قدامت پسند طلباء کے ان رجحانات کو خطرے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ 1817ء میں لوتھر کی برسی کے موقع پر آزاد خیال مقرروں کی تقریریں سن کر طلباء اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے قدامت پسندوں کی لکھی ہوئی کتابیں جلا ڈالیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میٹرنخ نے جرمن عہدیکی پارلیمنٹ 1819ء کو ایک قانون پاس کرنے کی ترغیب دی جس کے مطابق آسٹریا کی طرح جرمنی میں بھی تعلیم اور آزادی تحریر پابندی عائد کر دی گئی۔

میٹرنخ کا خیال تھا کہ قدامت پسندوں کا اقتدار اس وقت تک قائم رہے گا جب تک حالات پر امن رہیں گے اور جنگ ان کے اقتدار کو ختم کر دے گی۔ اپنے اس خیال کے تحت میٹرنخ نے جنگ کی مخالفت اور بین الاقوامی تعاون کی حمایت شروع کر دی اور یہ تجویز پیش کی کہ یورپ کی اقوام کے راہنما وقتاً فوقتاً کانفرنس منعقد کیا کریں، جن میں سے ایسے بین الاقوامی تنازعات کا تذکرہ کیا جائے جن سے جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کی دوسری تجویز یہ تھی کہ اگر کسی ملک میں شورش بپا ہو تو بڑی اقوام کے راہنماؤں کی کانفرنس منعقد کی جائے اور یہ راہنما شورش اور انقلاب ختم کرانے کے لئے مناسب تجاویز پیش کریں پھر شر پسندوں کی سرکوبی کے لئے متحدہ کاروائی کی جائے اس مقصد کے لئے میٹرنخ نے آسٹریا، روس، پروشیا اور برطانیہ پر مشتمل اتحاد کمیٹی قائم کی اور آگے چل کر فرانس بھی اس میں شامل ہو گیا۔ میٹرنخ کی یہ تدبیریں کارگر ثابت ہوئیں 1820ء میں سپین اور نیپلز اور 1821ء میں شمالی اٹلی میں مطلق العنانی کے خلاف جو بغاوت رونما ہوئی تو میٹرنخ نے کانفرس طلب کر کے ان بغاوتوں کو کچلنے کا فیصلہ کا چنانچہ آسٹریا نے نیپلز اور شمالی اٹلی میں اور فرانس نے سپین میں مطلق العنانی کو بحال کر دیا 1835ء میں روسی آزاد خیالوں 1830ء میں پولینڈ کے حریت پسندوں اور 1831ء میں اٹلی اور جرمنی میں آزاد خیالوں کی تحریکوں اور بغاوتوں کو کچل دیا گیا۔ اور ان تمام انقلابوں کو ناکام بنا دیا گیا۔

آزاد خیالوں کی تحریک:

میٹرنخ کی ان کوششوں سے یورپ میں قدامت پسندوں کے اقتدار کو بہت تقویت ملی، لیکن جمہوری قوتوں یا انقلابی تحریکوں کو کچلنا ممکن نہ تھا۔ انقلاب فرانس نے آزادی مساوات اور اخوت کے خیالات یورپ کے کونے کونے میں پہنچا دیئے تھے۔ واٹرلو میں نپولین کو فوجی شکست تو ہوئی۔ لیکن یورپ میں ان نظریات کا پرچار بھی ہو گیا۔ انقلابی اصولوں کے علمبرداروں نے جو آزاد خیال کے نام سے مشہور ہوئے سیاسی واقتصادی اور معاشرتی اصلاح کے لئے ایک نئی تحریک شروع کر دی۔ 1830ء کے انقلاب اس کا نتیجہ تھے۔ 1848ء میں جو انقلابات آئے ان میں اس تحریک کو اپنی زبردست قوت کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا جس سے قدامت پسندوں کا غلبہ روک دیا گیا اور ایسی کشمکش پیدا ہوئی جس نے جمہوری تحریکوں کو آگے بڑھایا۔

یہ آزاد خیال یا لبرل، حریت، مساوات اور اخوت کے انقلابی تصورات کی اساس پر ایک نیا معاشرتی نظام تعمیر کرنے کے خواہاں تھے انہوں نے اپنے ان انقلابات کی تحریر وتقریر کے ذریعے بڑی وسیع اشاعت کی۔ آزاد خیالوں کے ان انقلابی

اور جمہوری تصورات کے علاوہ اس عہد کے جرمن مفکرین نے بھی اس زمانے کے سیاسی افکار ونظریات پر اپنے فلسفے سے گہرا اثر ڈالا ان میں کانٹ ،نطشے ،ہیگل ،ہمبولٹ شامل تھے۔

انقلابات کا عہد:

قدامت پسندوں کو غلبہ اور تسلط حاصل ہو جانے کے باوجود اس دور میں آزاد خیالوں نے جمہوری اور انقلابی تحریک کو جاری رکھا۔اس سے یورپ کے تمام ممالک متاثر ہوئے ۔1820ء میں مطلق العنان حکومت کے خلاف اسپین اور نیپلز میں اور 1821ء میں شمالی اٹلی میں بغاوتیں ہوئیں ۔اسی زمانے میں امریکہ میں حریت پسندوں کی تحریکیں کامیاب ہوئیں اور جنوبی امریکہ کے ممالک اسپین اور پرتگال کی غلامی سے آزاد ہو گئے۔

1821ء میں یونان نے بغاوت کی ۔ترکوں نے باغیوں کی شکست دی لیکن برطانیہ ،روس اور فرانس یونانیوں کی مدد کو آ گئے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آزاد خیالوں نے بھی ان کی بڑی مدد کی۔ آخر کار 1829ء میں یونان آزاد ہو گیا۔

1830ء کا انقلاب فرانس:

1830ء میں آزاد خیالوں کی بغاوتوں نے یورپ کے مختلف ممالک میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی اس کی ابتداء بھی فرانس ہی سے ہوئی ۔ چارلس دہم مطلق العنانی کا حامی تھا اور اس نے 1814ء میں بننے والے منشور کی عائد کردہ دستوری پابندیاں توڑ کر انقلاب سے پہلے کی مطلق العنانی بادشاہت اور طبقہ امراء کے اقتدار و مراعات کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

جولائی 1830ء میں اس نے تین فرمان جاری کیے جن کے ذریعے پریس پر سخت نگرانی قائم کر دی ،ایوان نمائندگان کو توڑ دیا اور رائے دہندگان کی تعداد پورے ملک میں صرف پچیس ہزار کر دی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ ان رائے دہندوں کے ذریعے ایسے نمائندے منتخب کرائے جو اسکی مطلق العنانی کو قانونی شکل دے دیں۔ مطلق العنانی کے مخالفوں نے چارلس کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کو انگلستان میں پناہ لینی پڑی۔ انقلابیوں نے اس کامیابی سے فائدہ اٹھا کر جمہوریہ قائم کرنے کی بجائے لوئی فلپ کو بادشاہ بنا دیا جس سے پھر آئندہ مشکلات پیش آئیں۔

فرانس میں اس کامیاب بغاوت یا انقلاب کے بعد بلجئیم کے حریت پسندوں کے حوصلے اتنے بڑھے کہ 1830ء میں انہوں نے بھی بغاوت کر دی بلجئیمی وطن پرستوں نے ولندیزی فوجیں نکال دیں اور بیلجئم کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ 1831ء میں برطانیہ ،روس، پرشیا اور آسٹریا نے بیلجئم کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ برطانیہ میں بھی آزاد خیالوں کی تحریک نے بڑی قوت حاصل کر لی اور 1832ء میں پارلیمنٹ میں قانون اصلاح منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس سے عوام کی حق رائے دہی میں توسیع ہو گئی۔ اور برطانیہ کا حکومتی نظام میں بہت سی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ امریکہ میں آزاد خیال مختلف ریاستوں میں اصلاحات نافذ کرانے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے عام حق رائے دہی حاصل کر لیا۔

1848ء کے انقلابات

1830ء کے انقلابات کے بعد قدامت پسند سپین، اٹلی، فرانس، جرمنی اور روس میں اپنا اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آزاد خیالوں کی تحریکیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن یہ کامیاب اور ناکامی فیصلہ کن نہ تھی اور دونوں طبقات میں کشمکش بدستور جاری تھی۔ آزاد خیالوں کی انقلابی جدوجہد تیز تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ 1848ء میں یورپی ممالک کو پھر انقلابات سے دوچار ہونا پڑا۔ گذشتہ انقلابات کی طرح 1848ء کے انقلابات کا سلسلہ بھی فرانس ہی سے شروع ہوا اور یورپ کے بیشتر ممالک اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ فرانس میں لوئی فلپ ابتدا میں تو آئین و دستور کی پابندی کرتا رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس پر مطلق العنانی کا رنگ غالب آنے لگا۔ اس کا وزیر گیزو سخت قدامت پسند تھا اور رائے دہی کو محدود کر کے سیاسی حقوق میں کمی کر دینے کا خواہاں تھا۔ دوسری طرف صنعتی انقلاب نے صنعتی مزدوروں کارخانوں اور نئے شہروں کے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ اصلاحات کا نفاذ ناگزیر ہو چکا تھا۔ لیکن گیزو اصلاحات کی مخالفت کر رہا تھا اور اصلاحات کے لئے آزاد خیالوں کی کوششوں کو کچلنے تشدد کا راستہ اختیار کرنے لگا تھا۔ اس سے تمام طرف بے چینی پھیل گئی اور آخر کار فروری 1848ء میں مزدوروں نے بغاوت کر کے پیرس پر قبضہ کر لیا۔ لوئی فلپ تخت سے دست بردار ہو گیا اور انقلابیوں نے جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ نپولین اول کا بھتیجا لوئی نپولین صدر جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا، نپولین اول کا بھتیجا لوئی نپولین نے صدر جمہوریہ کو پھر شہنشاہیت میں بدل دیا۔ اسی طرح انقلابیوں کی کامیابی پھر ناکامی میں تبدیل ہو گئی۔ نہ صرف فرانس بلکہ یورپ کے تقریباً تمام ممالک میں عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور انقلاب برپا کرنے کے لئے حالات بڑے ساز گار تھے۔ فرانس میں رونما ہونے والے 1848ء کے انقلاب نے جلتی پر تیل کا کام کیا اسے ہر ملک انقلاب کی گرفت میں آ گیا۔ مارچ 1848ء میں آسٹریا میں خونریز فسادات شروع ہو گئے اور میٹرنخ جیسے انقلاب دشمن کو لندن میں پناہ لینی پڑی۔ ہنگری میں تحریک انقلاب کے رہنما لوئی کوسٹ نے خود اختیار مملکت قائم کر لی۔ بوہیمیا بھی اس طرح خود اختیار مملکت بن گیا۔ پروشیا میں انقلابیوں کو مطمئن کرنے کے لئے بادشاہ کو دستوری حکومت اور عوامی حقوق کا اعلان کرنا پڑا۔ دوسری جرمن ریاستوں میں انقلابی تحریک زور پکڑ گئی۔ ڈنمارک ار نیدر لینڈ انقلاب کی زد میں آ گئے۔ اٹلی کی تمام ریاستیں انقلابی تحریک کا نشانہ بن گئیں۔ میلان اور وینس کے باشندوں نے بغاوت کر کے آسٹرین فوجوں کو نکال باہر کیا۔ سارڈینیا کے بادشاہ البرٹ نے جمہوری دستور عطا کر کے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اٹلی سے آسٹریا کی فوجیں نکالنے میں مدد

دی جرمنی کے آزاد خیالوں نے جرمن پارلیمنٹ کو ایک قومی اسمبلی قائم کرنے کی ترغیب دی تاکہ وہ پورے جرمنی کے لئے ایک وفاقی دستور تیار کرے۔ چنانچہ 1848ء میں ہی یہ اسمبلی فرینکفرٹ میں طلب کر لی گئی۔

آزاد خیالوں کی ان کامیابیوں سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ قدامت پسندوں کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اور ایک نئے جمہوری دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ لیکن ان تمام انقلابی کامیابیوں کے باوجود اکثر ممالک میں آزاد خیالوں کا اقتدار مستحکم نہ ہو سکا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو انقلابی راہنماؤں کو ادنیٰ طبقات کی مستقل حمایت نہ مل سکی دوسرے نظریاتی اختلافات نے ان میں پھوٹ ڈال دی۔ انقلابیوں کی ان کمزوریوں سے قدامت پسندوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی فوجی طاقت سے انقلابی تحریکوں کو کچلنے لگے۔ آسٹریا نے بوہمیا میں امن و امان قائم کر دیا پر سارڈینیا کے بادشاہ کو شکست دے کر اٹلی کی ریاستوں میں قدامت پسندوں کا اقتدار بحال کر دیا۔ خود آسٹریا میں حکومت نے سخت گیری اور جمہوریت پسندوں کا انقلابیوں کو کچل دیا۔ ہنگری میں روسی فوج کی مدد سے انقلابی تحریک دبا دی گئی۔ پرشیا کے بادشاہ نے حسب وعدہ جو دستور عطا کیا اس میں حقوق صرف دولت مند طبقے کو دیئے گئے۔ دوسری جرمن ریاستوں نے بھی آسٹریا کی مدد سے انقلابی تحریکوں کو دبا دیا۔ فرینکفرٹ کی اسمبلی نے شاہ پروشیا کو جرمن شہنشاہ قرار دے کر جرمن ریاستوں کو متحد کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی اگرچہ 1848ء کا سیلاب انقلاب تمام یورپ کو اپنی رو میں بہا کر لے گیا تھا، لیکن اس کے رو کے گذر جانے کے بعد قدامت پسندوں نے پھر سر اٹھا لیا اور ان کے اقتدار کی عمارت کو انقلاب نے ہلا تو ڈالا مگر منہدم نہ کر سکا۔ چنانچہ جمہوریت و خودسری کی کشمکش بدستور جاری رہی اور جمہوریت پسند انقلابی اثرات سے فائدہ اٹھا کر اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنے لگے۔

......☆......

لاطینی امریکہ۔ 1809ء۔ 1825ء
کے انقلابات آزادی

براعظم امریکہ کے دونوں حصوں اور وسطی امریکہ میں سپین کی نوآبادیاں پورے براعظم کو گھیرے ہوئے تھیں۔ سپین کے اقتدار کی ابتداء امریکہ میں جزائر پر تسلط سے ہوئی تھی پھر کورٹیز اور پیزارو نے وسیع شہنشاہیت بنانی شروع کر دی۔ کورٹیز کیوبا سے روانہ ہو کر میکسیکو پہنچا اور وہاں کے سرخ ہندی بادشاہ کو سپین کی اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کر دیا۔ 1531 میں پیزارو پانامہ سے روانہ ہوا اور پیرو میں داخل ہوا اور وہاں کے بادشاہ کو کیتھولک مذہب قبول کرنے کی شرط پیش کی۔ جس کو اس بادشاہ نے قبول نہ کیا۔ پیزارو نے خونریز جنگ کے بعد پیرو پر قبضہ کر لیا۔ میکسیکو اور پیرو کے بعد کولمبیا، چلی، وینی زویلا اور ارجنٹائن پر بھی قبضہ کر لیا میکسکو اور پیرو کے بعد کولمبیا، چلی وینی زویلا اور ارجنٹائن پر بھی ہسپانویوں قبضہ ہوگیا۔ ہسپانوی آبادکاروں اور مسیحی مبلغین کی آمد کے بعد سپین اپنی اس وسیع شہنشاہیت سے دولت لوٹنے لگا۔ فتوحات کے بعد مقامی سرخ ہندی لوگوں کو غلام بنا لیا گیا اور ان پر انسانیت سوز مظالم کیے گئے۔ ہسپانوی حکومت اور آبادکاروں دونوں کا مقصد لوٹ کھسوٹ تھا۔ مفتوحہ علاقوں میں نظم و نسق قائم کرنے کے لئے جو قوانین بنائے گئے ان میں بھی اسی مقصد کو پیش نظر رکھا گیا۔

1529ء میں سپین کے بادشاہ نے ایک وائسرائے میکسیکو روانہ کیا تاکہ وہ تاج ہسپانیہ کی نمائندگی کر سکے۔ اس طرح دوسرا وائسرائے 1542ء میں لیما میں مقرر کیا گیا اور وینی زویلا کے سوا تمام جنوبی امریکی مقبوضات اس کے ماتحت کر دیئے گئے۔ وینی زویلا میکسیکو کے وائسرائے کے ماتحت رہا۔ 1717ء میں ایک تیسرا وائسرائے بوگوٹا میں مقرر کیا گیا اور جنوبی امریکہ کے تمام شمالی علاقے بشمول وینی زویلا اس کے تحت کر دیئے گئے۔ 1676ء میں پلاٹا کے علاقے کو لیما سے علیحدہ کر کے اسے چوتھے وائسرائے کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس طرح سپین کی امریکی شہنشاہیت بڑے علاقوں میں منقسم اور منظم ہوگئی اس کا آئندہ حالات پر بڑا اثر پڑا۔ یہ علاقے صوبوں میں منقسم تھے۔ جہاں گورنر مقرر کیے گئے تھے، صوبے اضلاع میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ ان نوآبادیات کے حکام کو شاہی مرضی کے مطابق مرکزی حکومت ہی مقرر کرتی تھی۔ آبادکاروں کو نہ تو تقرر کا کوئی اختیار تھا نہ ان کو حکومت میں حصہ لینے کا موقع فراہم کیا جاتا تھا اور نہ ایسے جمہوری ادارے قائم کیے

گئے جن کے سامنے حکومتی عہدے دار جوابدہ ہوتے اس لئے انگریزی نوآبادیوں کے برعکس ہسپانوی نوآبادیوں میں خود اختیاری اور جمہوریت کو فروغ حاصل نہ ہوسکا اور یہ سلسلہ تقریباً 300 سال قائم رہا۔

آزادی کے محرکات:

حکومت میں حصہ نہ ملنے کے باوجود آبادکاروں کو کچھ حقوق حاصل تھے۔ لیکن مقامی باشندوں پر بڑا ظلم کیا جاتا تھا۔ یہ سب غلام بنا دیے گئے تھے۔ امن و تحفظ جیسے بنیادی حقوق سے بھی محروم تھے محنت کی اجرت نہ پاتے تھے۔ آقا کو پورا اختیار تھا اور غلام حق املاک اور دوسرے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیے گئے تھے۔ دوسری طرف ہسپانوی آبادکار بھی خوش اور مطمئن نہ تھے نوآبادیات سے تجارت کی اجارہ داری سپین کو حاصل تھی۔ وہیں کے باشندے تجارت کر سکتے تھے۔ نوآبادیوں میں کوئی ایسی چیز نہ بنائی جا سکتی تھی جو اسپین میں بنتی ہو۔ انگور اور زیتون کی کاشت ممنوع قرار دی گئی تھی۔ نوآبادیاں باہمی تجارت بھی نہ کر سکتی تھیں۔ کیتھولک مذہب کی کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب منگوانا ممنوع تھا، چھاپنا تو درکنار۔ جہالت کو ترقی دینے کی کوشش عموماً کی جاتی تھی اور کلیسا کا یہ فرض تھا کہ عوام کو جہالت اور توہمات کا شکار بنا کر تمام مظالم صبر و شکر سے برداشت کرے اور حکومت کے ہر عمل کو جائز سمجھنے کی تلقین کرے۔ بیرونی دنیا کے اثرات کو روکنے کے لئے سفر کرنا دوسرے ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور نئے علوم کی تعلیم کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ہسپانوی نوآبادیوں میں تقریباً تین سو سال تک مظالم کا یہ سلسلہ جاری رہا اور لوگ ان کو برداشت کرتے رہے۔ لیکن آخرکار ایسے انقلابی اسباب پیدا ہو گئے کہ 1800ء سے 1825ء کے درمیان صرف پچیس سال کے عرصے میں لاطینی امریکہ میں اسپین کا اقتدار و ظلم مسلسل انقلابات کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ یہ انقلابی اسباب مختلف قسم کے تھے۔ سپین کے ظلم و تشدد نے جو سیاسی اور معاشی بے چینی پیدا کر دی تھی۔ اس نے شدید کشمکش کی صورت اختیار کر لی۔ اسپین کی کوششوں کے باوجود آزادی کی تحریک اثر انداز ہونے لگی۔ تعلیم یافتہ لوگوں نے یورپ اور امریکہ کے انقلاب پسند مصنفین کی کتابیں پڑھ کر شعور حاصل کیا۔ امریکی نوآبادیوں کی جنگ آزادی کے گہرے اثرات پڑے۔ انقلاب فرانس نے نہ صرف ذہنی انقلاب پیدا کر دیا بلکہ نپولین کی فتوحات نے حکومتوں اور سلطنتوں کے یورپ بھر میں تختے الٹ دیے۔ 1808ء میں فرڈیننڈ کی بجائے نپولین کا بھائی لوئی نپولین بونا پارٹ سپین کا حکمران بن گیا۔ نوآبادیوں کے عہدہ داروں نے تو اپنی وفاداریاں فرانسیسی حکمران کو پیش کر دیں۔ لیکن ہسپانوی آبادکار فرانس کے اقتدار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مرکزی حکومت کی گرفت نوآبادیوں سے کمزور پڑنے لگی۔ اسپین کے محبان وطن نے حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تو ہسپانوی آبادکار بھی ان کی حمایت و اعانت پر اتر آئے۔ لیکن یہ کوششیں ناکارہ ثابت ہوئیں اور آبادکاروں کو بہت مایوسی ہوئی۔ مرکزی حکومت کی کمزوری اور اقتدار کے لئے کشمکش نے نوآبادیوں میں آزادی حاصل کرنے کی انقلابی فکر پیدا کر دی جس سے انقلابی اور اصلاحی تحریکوں کا آغاز ہو گیا۔

جمہوری انقلابات:

اس دور کے ہسپانوی امریکہ میں انقلابات آزادی کے ممتاز ترین راہنما فرانسسکو ڈی مرانڈہ، سائمن بولیوار اور سان مارٹن تھے۔ مرانڈہ وینی زوئیلا کا باشندہ تھا اسے لاطینی امریکہ میں تحریک آزادی کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ریاست ہائے

متحدہ امریکہ کی تحریک آزادی سے براہ راست متاثر ہوا تھا اس نے 1783ء میں لاطینی امریکہ کو آزاد کرنے کی تحریک شروع کی تھی۔ مرانڈہ نے بین الاقوامی طور پر کوششیں کیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس ہسپانوی نو آبادیات کو آزاد کرنے میں مدد کریں، لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا آخر کار اس نے سپین کے خلاف وینزویلا میں بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت ناکام رہی لیکن ناکامی کے باوجود مرانڈہ کا پیدا کردہ جذبہ آزادی و انقلاب فنا نہ ہو سکا اور آگے چل کر یہی جذبہ ہسپانوی امریکہ میں ہمہ گیر تحریک آزادی کا سبب اور محرک بنا۔ سائمن بولیور شمالی علاقوں کا انقلاب پسند راہنما تھا یہ وینزویلا کا باشندہ تھا اس نے 1804ء میں اپنے ملک کو آزاد کرانے کی قسم کھائی تھی۔ اپنے اس عہد کو پورا کرنے کے لیے جلد ہی اس نے عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ بولیور مرانڈہ کی تحریک میں شامل ہو گیا اور 1811ء میں اس نے کیراکس کی بغاوت میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن باغیوں کو شکست ہوئی اور سائمن بولیمو کولمبیا چلا گیا۔ جہاں اس نے ایک فوج تیار کی اور 1813ء میں وینزویلا پر حملہ کر دیا 8 سالہ مسلسل جنگ کے بعد وہ وینزویلا اور کولمبیا کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ سان مارٹن نے 1814ء میں اپنی تحریک شروع کی اور ایک بڑی فوج اکٹھی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے وہ چلی میں تحریک آزادی کے راہنماؤں کی مدد سے چلی پر اسپین کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا پھر پیرو کے حریت پسندوں کی امداد کو پہنچا اور اس نے لیما پر قبضہ کر لیا۔ 1822ء میں اس کی ملاقات سائمن بولیور سے ہوئی۔ دونوں راہنماؤں نے لاطینی امریکہ کو مکمل طور پر ہسپانوی اقتدار کو ختم کرنے کی تجاویز پر غور کیا۔ بولیور اور مارٹن دونوں اس بات پر متفق تھے کہ لاطینی امریکہ سے ہسپانوی اقتدار ختم ہونا چاہیے مگر اس بات پر دونوں میں اختلاف پایا جاتا تھا کہ آزادی کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کا نظام حکومت قائم کیا جائے۔ بولیور چاہتا تھا کہ ہر ملک میں صدارتی جمہوری نظام قائم کیا جائے اور پھر ان جمہوریاؤں کا ایک وفاق قائم کر دیا جائے لیکن مارٹن کا خیال تھا کہ آزادی کے بعد ان ملکوں میں دستوری بادشاہیت قائم کی جائے اور یہ سب الگ الگ رہیں ایک وفاق کی شکل اختیار نہ کریں اس اختلاف رائے کو دور کرنے کے لئے دونوں راہنماؤں میں گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں 1824ء میں مارٹن نے یورپ جانے کا فیصلہ کیا اور اپنی فوج کو بولیور کی فوج میں شامل کر دیا اس مشترکہ فوج نے بولیور کی قیادت میں جنوبی پیرو اور بولیویا کو آزاد کرایا۔ تحریک آزادی کے ان علمبرداروں کی کامیاب انقلابی جدوجہد سے جنوبی امریکہ میں جمہوری دور کا آغاز ہوا۔

جنگ آزادی:

جوزف بوناپارٹ کے عہد میں لاطینی امریکہ کے آبادکاروں نے یہ کوشش کی کہ مقامی حکومتیں آبادکاروں کی شکایات دور کر دیں جن کی وجہ سے سپین کے اقتدار کو ناپسند کرتے تھے اور ان کے مطالبات کے پیش نظر اصلاحات بھی کی گئیں۔ 1814ء میں ویانا کی کانگرس نے فرڈیننڈ کو پھر ہسپانیہ کا بادشاہ بنایا اور اس نے ان اصلاحات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو آبادکاروں کے مطالبات پر کی گئیں تھیں۔ نتیجتاً سپین کے اقتدار سے آزاد ہونے کے لیے ہر طرف بغاوتیں رونما ہونے لگیں اور آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پھیلنے لگا۔

ہسپانوی امریکہ میں تحریک آزادی شروع ہوتے ہی آزاد حکومتیں قائم کی جانے لگیں چنانچہ 1809ء میں کیرکیس، لاپاز وغیرہ میں اور 1810ء میں سانتا فے، بوئنس آئرس اور سانتیاگو میں آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں اسی سال میکسیکو میں

بغاوت رونما ہوئی۔ سپین نے بڑی طویل اور خونریز لڑائیوں کے بعد ان بغاوتوں کو کچل دیا لیکن ارجنٹائین اور کولمبیا میں آزاد حکومتوں کی تحریک نہ کچلی جا سکی۔ بونس آئرس کی آزاد حکومت سات سال تک ہسپانوی فوجوں سے جنگ لڑتی رہی اور 1817ء میں فتح مند ہوئی۔ ارجنٹائن کے بعد پیرو میں جنگ آزادی شروع ہوگئی 1824ء تک لاطینی امریکہ میں سپین کو مکمل شکست ہوئی اور پیرو آزاد ہو گیا۔ دوسری طرف نیو گرینڈا اور وینزویلا میں بھی آزادی کی جنگ لڑی گئی اور 1809ء سے 1823ء تک جاری رہی۔ خون ریز جنگوں کے بعد ہسپانوی اس علاقے سے بھی نکال دیئے گئے۔ میکسیکو میں جنگ آزادی 1810ء میں شروع ہوئی لیکن 1815ء میں حریت پسندوں کو شکست ہوگئی۔ تاہم ان کے حوصلے پست نہ ہوئے اور انہوں نے گوریلا جنگ شروع کر دی۔ چھ سال تک حریت پسند یہ گوریلا جنگ لڑتے رہے 1820ء میں جب سپین میں دستوری حکومت قائم ہوئی تو حالات بہتر ہو جانے کی توقع پیدا ہوئی لیکن نئی ہسپانوی حکومت نے بھی میکسیکو میں مطلق العنانیت قائم رکھنا چاہی جس کے نتیجے میں حریت پسندوں نے 1821ء میں میکسیکو کو آزاد کرایا۔ 1823ء تک یہ علاقہ بھی گوانٹے مالا سمیت مکمل آزاد ہو گیا۔ لاطینی امریکہ کے جنوب میں چلی کے حریت پسندوں نے سپین کو فیصلہ کن شکست دی اور 1818ء میں چلی بھی آزاد ہو گیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے 1822ء میں میکسیکو، کولمبیا، پیرو، چلی اور ارجنٹینا کی آزادی کو تسلیم کیا اس کے بعد پیراگوئے کی آزادی بھی تسلیم کر لی گئی۔ 1825ء میں برطانیہ اور 1830ء میں فرانس نے بھی ان ممالک کو تسلیم کر لیا

برازیل:

سپین کے علاوہ جنوبی امریکہ میں پرتگال کی نو آبادیاں بھی قائم تھیں جن میں برازیل سب سے اہم اور بڑی تھی۔ پرتگال نے لاطینی امریکہ میں 1533ء سے نو آبادیاں قائم کرنا شروع کیں تھیں۔ 1545ء میں اس نے تمام نو آبادیوں کو ایک متحدہ شکل دے دی اور سرخ ہندی، باشندوں کو غلام بنا کر ایک کیپٹن جنرل کے تحت ہسپانوی نظام سے ملتا جلتا نو آبادیاتی نظام قائم کیا تھا۔ پرتگال کا مقصد بھی صرف لوٹ کھسوٹ کرنا تھا اور دولت اکٹھی کرنا تھا۔ 1560ء میں برازیل میں سونے کی کانیں دریافت ہوئیں تو آبادی تیزی سے بڑھنے لگی اور برازیل کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

1807ء میں جب نپولین نے پرتگال پر قبضہ کیا تو وہاں کا بادشاہ برازیل آ گیا اور برزیل میں شاہی قائم ہوگئی۔ بادشاہ کے آنے کے بعد یہاں کے نظم ونسق کی اصلاح ہوئی اور آباد کاروں پر مظالم کم ہونے لگے اور انہیں حقوق ملنے لگے -1815ء میں تاج پرتگال کے تحت برازیل کی جداگانہ بادشاہت کا اعلان ہوا اور آزاد نظم ونسق اور قانون سازی کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ ہسپانوی نو آبادیوں میں مسلسل جنگوں سے برازیل بھی متاثر ہوا اور جمہوری حقوق کے لئے مطالبہ کیا جانے لگا۔ 1817ء میں اصلاحات کے لئے بغاوت شروع ہوگئی جو فرد کر دی گئی۔ 1820ء میں پرتگال میں جب دستوری حکومت قائم ہوئی تو اہل برازیل کو مطمئن کرنے کے لئے یہ اعلان کیا گیا کہ پرتگال کا دستور برازیل میں نافذ کیا جائے گا لیکن 1821ء میں بادشاہ جان پرتگال واپس چلا گیا اور 1822ء میں حکومت پرتگال نے کوشش کی کہ برازیل کو واپس نو آبادی کے درجہ پر لایا جائے۔ محبان وطن نے اس اقدام کی سخت مخالفت کی اور برازیل کی مکمل آزادی کے لئے تحریک کا آغاز ہو گیا۔ شاہ جان کے بیٹے پیڈرو سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ خود مختار بادشاہ بن کر آزاد مقننہ قائم کرے۔ پیڈرو نے یہ مطالبہ منظور کر لیا اور 1822

میں برازیل کی آزادی اور دستوری ملوکیت کا اعلان کیا گیا اور بالآخر 1837ء میں پرتگال نے بھی برازیل کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ نئے دستور کے مطابق برازیل میں نمائندہ حکومت قائم کی گئی۔ یہ بادشاہت 1889 تک قائم رہی اس کے بعد برازیل کو جمہوری قرار دے دیا گیا۔

لاطینی امریکہ میں آزادی کی تحریک اور انقلابوں کا سلسلہ حیرت انگیز طور پر کامیاب رہا اور صرف ربع صدی کے مختصر عرصے میں کرہ ارض کا یہ وسیع حصہ غلام مملکتوں سے آزاد ممالک میں بدل گیا ان ممالک میں حصول جنگ آزادی کی تحریک اور ترغیب شمالی امریکہ کی برطانوی نوآبادیوں کی انقلابی تحریک کی کامیابی کی وجہ سے شروع ہوئی اور عملی جدوجہد اور مقصد برآری میں کامیابی کی راہ انقلاب فرانس اور نپولین اعظم کی فتوحات نے ہموار کر دی۔.................

تین انقلابی راہنما۔ ڈی مرانڈہ، سائمن بولیور، سان مرٹن

سائمن بولیو SIMON BOLIVAR (1784ء ۔ 1830ء) جنوبی امریکہ کا ایک انقلابی محب وطن جسے جنوبی امریکہ کا نجات دہندہ بھی کہا جاتا ہے۔ وینزویلا کے شہر کراکس میں پیدا ہوا میڈرڈ میں تعلیم پائی یورپ اور امریکہ کی سیاحت کی۔ 1808ء میں واپس وینزویلا آ گیا اور ہسپانوی نوآبادیات کے خلاف وینزویلا کی تحریک آزادی کی قیادت کی۔ 1811ء میں وینزویلا نے خود مختاری کا اعلان کر دیا، جس سے ہسپانیہ سے جنگ چھڑ گئی جو آٹھ سال جاری رہی۔ اسی دوران پانچ بار بولیور کو وطن چھوڑنا پڑا، لیکن وہ جب بھی وطن واپس آیا اس نے بڑھ چڑھ کر جنگ آزادی میں حصہ لیا۔

1819ء میں وینزویلا اور گرینڈا نے مل کر ایک جمہوریہ بنائی جس کا صدر نام کولمبیا رکھا اور اس کا صدر بولیور منتخب ہوا۔ 1821ء میں اس نے وینزویلا کی آزادی کا اعلان کیا۔ 1822ء میں بولیور نے اپنی انقلابی کوششوں سے ہسپانوی راج کو ایکواڈور سے بھی نکال دیا۔ وہ جنوبی امریکہ کی تمام جمہوریتوں کو متحد کرنا چاہتا تھا، مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ 1824ء میں اس نے پیرو کو آزاد کرانے کی مہم کا آغاز کیا۔ 1830ء میں اس نے بددل ہو کر استعفیٰ دے دیا۔ سان مارٹن جیسا کہ پہلے ذکر آیا اس کا قریبی ساتھی تھا وہ جنوبی امریکہ کی تحریک آزادی کا ایک اور بڑا راہنما تھا۔ مگر بعد میں یورپ چلا گیا۔ اسی طرح فرانسسکو ڈی مرانڈا نے بھی جنوبی امریکہ کی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔

1857ء کی جنگ آزادی ہند۔ایک نامکمل انقلاب

ہندوستان میں برطانوی سامراج کی حکومت کی داغ بیل تو پہلے ہی پڑ چکی تھی، لیکن اس کا استحکام لارڈ ولزلی کے عہد میں ہوا۔وہ 1798ء سے 1805ء تک گورنر جنرل ہندوستان رہا۔اسی کے عہد حکومت میں شہید میسور ٹیپو سلطان سے آخری جنگ ہوئی، جس میں سلطان ٹیپو نے شہادت پائی اور اسکی سلطنت کے ایک حصے میں ہندو ریاست قائم کردی گئی، باقی حصے کو اتحادیوں یعنی انگریزوں نظام اور مرہٹوں میں آپس میں تقسیم کردیا گیا۔اسی دوران مرہٹوں سے بھی جنگ ہوئی۔پھر کارنوالس اور منٹو یکے بعد دیگرے گورنر جنرل بنے۔درمیان میں سر جارج بارلو بھی کچھ عرصہ حکومت کرتا رہا۔منٹو نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ سے معاہدہ کرکے دریائے ستلج کو درمیانی سرحد بنالیا۔(1809ء) ہیسٹنگز نے انگریزی حکومت کی سرحدیں برما تک بڑھادیں۔1835ء میں شہنشاہ دہلی کا نام سکوں سے خارج کردیا گیا۔گویا مغل شہنشاہیت کا جو سلسلہ برائے نام جاری تھا، وہ بھی ختم ہوگیا اس طرح انگریزی حکومت کی بنیادیں ہندوستان میں پختہ ہوگئیں اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرلیا گیا۔

1857ء میں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی غیر قانونی اور جابرانہ سامراجی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کیلئے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں نے ایک زوردار انقلاب برپا کردینے کی کوشش کی جسے انگریز غدر کا نام دیتے ہیں۔یہ انقلاب زیادہ تر عدم تنظیم اور مقامی غداروں کی وطن دشمنی کی وجہ سے ناکام رہا اور اس طرح برصغیر پاک وہند کو مزید 90 سال کے لئے انگریزوں کی غلامی کا جوا پہننا پڑا۔ہندوستانی مسلمان علی الخصوص اور آزادی خواہ اور خوددار ہندو اور بہت سے والیان ریاست، نیز مسلمان اور ہندو اکابرین بالعموم "کمپنی بہادر" کی بے انصافیوں، ظلم وجبر اور مذہبی تعصب سے یکساں متنفر ہوگئے تھے جس کے نتیجے میں یہ انقلاب برپا ہوا۔کمپنی بہادر کے انگریز گورنر جنرل ڈلہوزی نے الحاق کے غیر منصفانہ قوانین نافذ کرکے طرح طرح کے بہانوں سے ریاستوں اور جاگیروں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔متعدد لاولد والیان ریاست کو اپنا متبنّی تک بنانے کی اجازت نہیں تھی، ایسے لاولد ریاست کی موت کے بعد کمپنی بہادر کو ریاست کا وارث قرار دیا جاتا تھا۔نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ آخر مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو متنبہ کردیا گیا تھا کہ اس کے بعد شاہی خاندان لال قلعے میں مقیم نہیں رہے گا اور نہ اس کا وارث یا جانشیں بادشاہ کہلائے گا۔وہ سوداگر جو مغلیہ دربار میں سر جھکا کر کھڑے ہوتے تھے آج خود بادشاہ کو سر جھکانے پر مجبور کیے ہوئے تھے۔انگریز پادری "کمپنی بہادر" کے ہندوستانی ملازمین کو اس قسم کے خطبا

مطبوعات اور رقبے کھینچے گئے تھے کہ اب حکومت ایک، ریل ایک، ڈاک ایک، تار، غرض سب رستے ایک ہو چکے تھے…
اب مذہب بھی ایک ہو جانا چاہیے، یعنی عیسائیت۔ ایک قانون یہ بھی بنایا گیا کہ کوئی شخص مذہب بدلنے کی وجہ سے…
ورثے سے محروم نہیں کیا جا سکے گا۔ مقصد یہ تھا کہ عیسائیت قبول کرنے کی وجہ سے کسی شخص کو اس کی جائیداد یا وراثت سے
محروم نہیں کیا جا سکے گا تا آنکہ مذہب بدلنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مذکورہ بالا ناانصافیوں اور اس قسم کے دوسرے مظالم نے
''کمپنی بہادر'' کے خلاف آتش فشاں قسم کا انقلاب خواہ مواد جمع کر دیا تھا جو بالآخر فوج کو ایک کارتوس کی فراہمی پر پھٹ…
جس میں ہندو اور مسلمانوں کے نقطہ نظر سے نجس اور قابل اعتراض جانوروں سور اور گائے کی چربی جو ہندوؤں میں مقدس
مقام رکھتی ہے استعمال ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ کا آغاز انگریز کے باغی انہیں سپاہیوں کی طرف سے ہوا مگر
پورا ملک انقلاب کے لئے تیار تھا اس لئے انقلاب کی آگ ایک دم مختلف شہروں میں بھڑک اٹھی۔

انقلاب جنگ آزادی ہند کا آغاز بنگال میں ڈمڈم اور بارک پور کے مقام پر ہوا جہاں دیسی سپاہیوں نے ان
کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا جسے انگریزوں نے بغاوت قرار دیتے ہوئے ان سپاہیوں کو غیر مسلح کر کے فوجی
ملازمت سے برخاست کر دیا لکھنؤ میں بھی ایسے ہی واقعات پیش آ گئے جس کے بعد برخاست شدہ دیسی فوجی سپاہی ملک
میں پھیل گئے اور فوجیوں کو انگریز افسروں کے خلاف ابھارنے لگے۔

9 مئی 1857ء، میرٹھ میں ایک رجمنٹ کے سپاہیوں نے مندرجہ بالا کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا ان…
دس سال قید بامشقت کی سزا دی تھی۔ جس طریقے سے ان سپاہیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا وہ انتہائی اہانت آمیز اور تہذیب
سے گرا ہوا تھا۔ اس پر دیسی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسروں کو ہلاک کر کے ان قیدیوں کو آزاد کرایا اور میرٹھ سے دہلی کی
طرف بڑھے۔ میرٹھ کے سپاہیوں کی دہلی میں آمد کے بعد دہلی کی فوجیں بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں اور دہلی
کے مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا اس اعلان کے ساتھ ہی انقلاب آزادی کی آگ دور دور تک پھیل
گئی۔ جنرل نکلسن نے انگریز اور سکھ فوجوں کی مدد سے تقریباً چار ماہ تک دہلی کا محاصرہ کیے رکھا۔ 14 ستمبر کو کشمیری دروازہ
توڑ کر انگریز فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں۔ جنرل نکلسن خود اس لڑائی میں مارا گیا۔ مگر دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔
آخر مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس کے بیٹوں سمیت گرفتار کر لیا گیا اور اس جنگ آزادی یا انقلاب کی پاداش میں اس پر
مقدمہ چلا کر اسے رنگون بھیج دیا گیا۔ اس کے دو بیٹوں اور پوتوں کو گولی سے اڑا دیا گیا اور ان کے سر ایک خوان میں رکھ کر
بادشاہ کو پیش کئے گئے۔ دہلی پر قبضہ ہونے کے بعد ہر جگہ انقلاب آزادی کی رفتار مدھم پڑ گئی مارچ 1858ء میں لکھنؤ پر بھی
دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

انقلاب کی ناکامی کے بعد کمپنی نے ہندوستانیوں پر پہلے سے بڑھ کر ظلم و ستم ڈھائے۔ دہلی کی فتح کے بعد انگریزی
فوجوں نے شہری آبادی سے خوفناک انتقام لیا، لوگوں کو بے دریغ قتل کیا گیا، سینکڑوں افراد کو جرم بے گناہی کی پاداش میں
پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور ہزاروں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا، ان میں تلوار کے گھاٹ اتارے جانے والے ہندو اور مسلمان
الگ تھے۔ جلد ہی انگریز فوج کے سکھ سپاہیوں نے اس انتقام کی آگ کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا اور مسلمانوں کو چن چن کر
قتل کرنے لگے بہت سے مقتدر اور متمول مسلمانوں کی جائیدادیں تباہ ہو گئیں اور انقلاب زمانہ سے وہ کوڑی کوڑی کے محتاج

ہو گئے۔ بوڑھا بادشاہ بہادر شاہ ظفر رنگون کے ایک خستہ حال مکان میں نظر بند ہوا۔ ہندوستانیوں کے اس انقلابی ردِعمل کے بعد انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ نے کمپنی بہادر سے حکومت کے اختیارات واپس لے لئے اور ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کو براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت کر دینے کا فیصلہ کیا۔

انقلاب جنگ آزادی کا سلوگن "انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دو" تھا اس لئے اس انقلاب میں تمام ایسے عناصر شامل ہو گئے جنہیں انگریزوں نے نقصان پہنچایا تھا، متضاد عناصر ایک مشترکہ دشمن کے خلاف یکجا تو ہو گئے تھے لیکن وہ قوم پرستی کے تصور سے صحیح معنوں میں ناآشنا تھے۔ بہادر شاہ ظفر جس کی حکومت کا اعلان انقلابیوں نے کیا تھا نہ خود بادشاہت کی صلاحیت رکھتا تھا نہ باغیوں کی مخالفت کرنے کا یارا اس وجہ سے وہ ان انقلابیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا اور صحیح طور پر نظم و نسق بحال کرنے میں ناکام رہا۔ مزید براں باغیوں نے دلی میں لوٹ مار کا بازار گرم کر کے عام لوگوں کی ہمدردیاں کھو دیں چنانچہ یہ جنگ آزادی یا انقلاب آزادی نامکمل رہ گیا۔ اس ناکام کوشش کے بعد انگریزی حکومت نے خود پختہ طور پر اس برصغیر میں قدم جمانے کے لئے بہت سے قوانین وضع کئے۔ فوج میں برطانوی سپاہیوں کا تناسب بڑھایا گیا۔ انگریزوں کا حکمرانہ رعب و دبدبہ بڑھانے کے لئے انہیں ہدایات ملیں کہ وہ عام ہندوستانیوں سے میل جول نہ رکھیں اور ربط و ضبط نہ بڑھائیں۔ ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت میں انگریزی ادب اور انگریزی آداب کو اس طرح داخل کر دیا گیا کہ ان میں سے اکثر پڑھے لکھے اپنی اصلیت کو بھول گئے۔ تعلیمی حکمت عملی یہ وضع کی گئی کہ پڑھے لکھے ہندوستانی اپنے عادات و اطوار اور تہذیب و تمدن میں اتنے انگریز بن جائیں کہ اگر کبھی انگریزوں کو برصغیر چھوڑنا پڑے تو وہ اپنے پیچھے ان جدید انگریزوں کی پوری فوج چھوڑ جائیں۔

......☆......

1859ء ذہنی انقلاب

1859ء میں لندن میں تاریخ طبعی پر ایک جلد شائع ہوئی جس کا آغاز ایک حقیقی سائنسدان کے محتاط انداز کے مطابق کچھ یوں ہوا تھا۔

جب میں طبعی سائنسدان کی حیثیت سے ملک معظم کے جہاز بیگل HEAGLE پر سوار تھا تو میں بعض حقائق سے بہت متاثر ہوا جو جنوبی امریکہ کے نامی اجسام کی تقسیم اور اس براعظم کے موجودہ گذشتہ نامی اجسام کے ارضیاتی رابطے میں پائے گئے۔ ان حقائق سے اصل انواع پر کچھ روشنی پڑتی ہے جسے ہمارے سب سے بڑے فلاسفہ نے سرالاسرار قرار دیا ہے۔ میں وطن لوٹا تو 1837ء میں مجھے خیال آیا کہ اگر وہ تمام حقائق صابرانہ سعی و کوشش سے فراہم کردیے جائیں اور ان پر غور کیا جائے جن کا اثر حقیقت پر پڑتا ہے تو ممکن ہے حل کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔ پانچ سال تک اس موضوع پر کام کرنے کے بعد 1842ء میں میں نے ان حقائق کو پھیلا کر نتائج کی شکل میں مرتب کرلیا جو مجھے اغلب معلوم ہوتے تھے اس وقت سے اب تک میں برابر اس موضوع پر غور و تحقیق میں مصروف رہا.........

یہ ہے چارلس ڈارون کی کتاب ''اصل انواع'' کے پیش لفظ سے اقتباس ڈارون نے اصل انواع اور انتخاب طبعی میں اس طرح انکسار و احتیاط کے ساتھ ایک ایسی کتاب عوام کے سامنے آئی جس نے تاریخ فکر و نظر میں ایک انقلاب برپا کردیا بعض دوسرے انقلابات کی طرح ڈارونیت بجلی کا کوندا نہیں تھی جو آسمان سے اچانک گرا ہو۔ ڈارون کی اس کتاب کے سلسلے میں تیاری کی ایک لمبی مدت گذر چکی تھی جس میں صرف ڈارون ہی نہیں بلکہ اسکے پیروؤں اور سائنٹفک غور و تحقیق کے سلسلے میں اس کے رفیقوں نے بھی بہت بڑا کام انجام دیا۔ اس چھان بین کو پہلے تاریخ طبعی کا نام دیا جاتا تھا، آج کل حیاتیات کہا جاتا ہے۔ ڈارون نے جو کام انجام دیا اس کے نتائج وہ نکلے جن کی اہمیت حیاتیات کے دائرے سے بدرجہا وسیع تھی۔ غالباً انقلاب کی اصطلاح اگرچہ مختلف اعتبارات سے درست ہے مگر یہ ڈارون کے کام کو پیش کرنے کا غالباً بہترین طریقہ نہیں۔ زیادہ اچھا یہ ہے کہ اسے ایک انقلابی محدب عدسہ قرار دیا جائے جس میں کرنوں کا ایک روشن اور دراز سلسلہ جمع ہو گیا تھا۔

ڈارون خود ماہر حیاتیات تھا وہ اپنے تمام کام کو چھان بین اور غور تحقیق سمجھتا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ معلوم کیا جائے کہ مختلف نامی جسم کیوں کر اس منزل پر پہنچے جس پر وہ اب موجود ہیں۔ زندگی ہی میں اس کے افکار کو سیاسیات، اقتصادیات،

مذہب اور انسانی سرگرمیوں کے پورے پر پیچ نظام پر پھیلا یا گیا، مطابق بنا گیا اور اکثر ان میں مبالغے سے بھی کام لیا گیا۔ کائنات کے متعلق پوری انسانی روش کے سلسلے میں اسے اپنے سائنٹفک کام کے مضمرات کا احساس تھا۔ لیکن وہ آخر تک اپنے خاص موضوع یعنی حیاتیات پر قائم رہا اور ڈارونیت کو زندوں کے لیے ایک عقیدہ اور ازم بنانے کا کام ٹی ایچ ہکسلے اور ہربرٹ سپنسر جیسے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ کارل مارکس نے ایک مرتبہ کہا تھا "میں مارکسی نہیں ہوں" اس طرح ڈارون بھی کہہ سکتا تھا "میں ڈارونی نہیں ہوں"۔

ہمیں غور و فکر کی ابتدا حیاتیات میں ڈارون کے اپنے افکار سے کرنی چاہیے وہ بڑا محتاط اور بااصول مبصر تھا۔ اسکے سامنے حقائق کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا، مگر وہ کسی ایسے قانون اور ایسے نظریے کی تلاش میں رہا، جو ان تمام حقائق میں ارتباط پیدا کر سکے اس کے سامنے جو حقائق تھے وہ روئے زمین پہ نامی زندگی کے ہزار ہا سال کا طویل ریکارڈ تھے۔ سر چارلس لائل جیسے ماہرین ارضیات اور معدومیات کے دوسرے ماہرین نے اس ریکارڈ کی بنا پر پودوں اور جانوروں یا انواع کی ہزاروں مختلف شکلوں کے ظہور، نشو و ارتقاء اور بعض اوقات معدومیت کے حقائق ثابت کر دیے تھے۔ نامی زندگی کے ماضی کے متعلق اہل مغرب کے عام مسلمہ نظریات کے اہم حصے کی تردید کر دی تھی۔ بائبل کی کتاب پیدائش میں بیان کیا گیا ہے کہ زندگی کی تقریباً تمام شکلیں تقریباً چھ ہزار سال پیشتر خالق نے ایک ہفتے کے اندر اندر پیدا کر دیں اور اس مذہبی تصریح میں واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا کہ تمام موجودہ انسان اور حیوان ہر نوع کے ایک جوڑے سے پیدا ہوئے، جنھیں حضرت نوح نے ایک عالمگیر طوفان کے دوران میں اپنی کشتی کے اندر محفوظ کر لیا تھا۔ اور یہ طوفان تخلیق عالم سے کچھ مدت بعد آیا تھا۔ ڈارون ہرگز پہلا شخص نہ تھا جس نے تاریخی اور سائنٹفک ریکارڈ نیز بائبل کی مسلمہ توضیح کے درمیان نقص معلوم کیا۔ دورِ تنویر کے اور اہل علم بھی ان حقائق کی بنا پر بائبل کی توضیح ترک کر دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں اسے بعض اس حد تک آگے نکل گئے تھے انہوں نے سمجھ لیا تھا، یہاں عمل ارتقاء کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا جس میں (نعوذ باللہ) کسی خدا یا شخصی مسیحی خدا کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، بلکہ صرف قوائے فطری یا مناسب فطرت کے پردوں کے مطابق "گھڑی ساز خدا کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا۔ لیکن وہ کوئی تسلی بخش تشریح نہ کر سکے کہ فطرت یا گھڑی ساز خدا نے یہ کام کیونکر انجام دیا ان کے پیش نظر کوئی نظریہ نہ تھا جس سے پتہ چل سکتا کہ نامی جسم کیونکر ارتقاء پذیر ہوئے۔ ڈارون نے دنیا کو اس کے متعلق ایک نظریہ دیا تھا۔ جو آج بھی دنیائے سائنس میں نظریہ ارتقاء کہلاتا ہے۔

ڈارون کے نظریات:

ڈارون کو ایک سراغ ملتھس کی کتاب میں ملا۔ آبادی پر ملتھس نے جو مقالہ لکھا تھا اس میں بتایا تھا کہ نامی جسم، جن میں انسان بھی شامل ہے بڑھتے اور ترقی کرتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا مقام آجاتا تھا جس میں سب کے لئے ضرورت کے مطابق غذا مہیا نہیں ہو سکتی تھی۔ غذا کے لیے مقابلہ شروع ہو جاتا تو بعض کو پوری غذا نہ ملتی اور وہ مر جاتے۔ بس یہ نقطہ تھا جسے ڈارون نے جہد بقاء سے تعبیر کیا۔ پھر اس کے سامنے سوال آیا کہ کس بنا پر بعض کے باقی رہنے اور بعض کے ختم ہو جانے کا معاملہ فیصلہ ہوتا ہے۔ بہ ظاہر زندہ رہنے والے غذا کی زیادہ مقدار زیادہ اچھی پناہ گاہ اور رہنے سہنے کے زیادہ اچھے معاملات، حالات سے مستفید ہوتے ہیں۔ اگر یہ سب لوگ یکساں حالات میں تھے (اور زندہ رہے)۔

مادرا الفطرت ہستی کی کارفرمائی سے الگ رہتے ہوئے صرف ایک توجیہہ پیش کی جاسکتی ہے کہ یہ محض اتفاق واقعہ تھا مختلف نامی جسموں کے اختلافات پیدائش کے وقت بھی نمایاں رہتے ہیں۔ مثلاً سورنی کے ایک جھول میں مضبوط و توانا بچے بھی ہوسکتے ہیں اور کمزور بھی، اگر کوئی رحمدل اس کمزور کی حفاظت کرنا چاہیے تو ماں کا دودھ پینے کے دوران میں زیادہ توانا بھائی اسے دھوکہ دے کر ایک طرف کر سکتے ہیں۔ جب ایسے حالات وحشیانہ حالت میں پیش آئیں جہاں آزاد مقابلہ ہو رہا ہو، وہاں کمزور کا مرجانا یقینی ہے۔ گویا جب جہد بقا میں کمزور نا اہل ثابت ہوتا ہے تو موت اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ ڈارون کا دوسرا کلیدی نقطہ یہ ہے، جسے اس نے بقائے اصلح سے تعبیر کیا۔ جو جسم نامی غذا اور پناہ گاہ حاصل کر لینے کے بعد زیادہ اوصاف سے بہرمند ہے وہ یقیناً ایسے بچے پیدا کرے گا جو ان تمام سازگار حالات کے وارث ہوں گے۔ کچھ نہ کچھ اختلاف بھی ہوتا رہتا ہے، جو ابتداً اسے معمولی ہوتا ہے لیکن نسلاً بعد نسل جمع ہوتے ہوتے خاصا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ طویل مدت گذر جانے کے بعد ایک ایسا نامی جسم وجود میں آجاتا ہے جو دور افتادہ مورث اعلیٰ سے اتنا مختلف ہوتا ہے کہ ہم اسے ایک نئی نوع قرار دے سکتے ہیں۔ نئی انواع ارتقاء پاتی رہتی ہیں اور اس ارتقاء میں انتخاب طبعی NATURAL SELECTION کا عمل جاری رہتا ہے انسان نے پودے اور جانوروں کی پروش میں اس عمل سے سوچ سمجھ کر ساتھ فائدہ اٹھایا ہے اور مصنوعی رفتار سے وہ اس عمل کی سمت و جہت کو تقویت پہنچاتا رہا ہے، اس طرح اس نے بہترین جنسیں پیدا کر لیں، لیکن انسان کا یہ عمل تو صرف ان پودوں اور جانوروں تک محدود ہے جو اس کے نزدیک پالتو ہیں اور انسان کا یہ دور ارضیاتی وقت کا ایک نہایت مختصر حصہ ہے۔ پھر انسان نے نسبتاً صرف چند انواع کی پرورش کی۔ انتخاب طبعی تو روز ازل سے ایک کارفرما قوت چلا آتا ہے اور انسان کے لئے بھی جسم نامی کی حیثیت میں انتخاب طبعی ہی کارفرما رہا۔ خود انسان کے لئے بھی ابھی اپنی نوع کو اس طریق پر تربیت دینا ہے، جس طریق پر وہ پالتو جانوروں اور پودوں کو تقویت دیتا ہے۔.............

چالس ڈارون

چالس رابرٹ ڈارون CHARLES ROBERT DARWIN 1809-1882 ایک انگریز ماہر حیاتیات جو نظریہ ارتقاء کا بانی کہلاتا ہے 1831ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر ماہر حیوانات کے طور پر جیسا کہ پہلے ذکر آیا بیگل نامی بحری جہاز میں جنوبی امریکہ کے جزائر کے سفر پر روانہ ہوا۔ پانچ سال تک جنوبی امریکہ اور مغربی بحر الکاہل کے بہت سے جزیروں کا چکر لگایا اور ان علاقوں میں بے شمار زندہ اور متحجر جاندراوں کا مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ بقائے اصلح کا اصول صحیح ہے۔ یعنی صرف وہی انواع زندہ رہتی ہیں جو قدرتی ماحول کی تغیر پذیری سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ 1859ء میں یہ تحقیقات اس کی کتاب میں شائع ہوئیں تو مذہبی حلقوں میں اس کی ان دریافتوں سے بڑا ہنگامہ و انقلاب بپا ہو گیا۔ اس کی دوسری کتاب ہبوط آدم DESCENT OF MAN 1871ء میں شائع ہوئی، جس میں اس نے انسان کے آباواجداد کا پتہ چلانے کے لئے اپنے مشہور زمانہ نظریہ ارتقاء کو استعمال کیا اور آدمی کا شجرہ نسب بندر سے جاملایا۔ اس سے پہلے اس نے بتایا تھا کہ جانوروں اور پودوں میں ازدواجی زندگی سے کیا کیا نوعی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہی ہیں۔

..........ڈارون کہتا ہے، ایک نوع کے افراد میں پیدائش کے وقت جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں، وہ اتفاقی ہیں اور عموماً وراثت کے ذریعے سے منتقل ہوتے ہیں۔ اس کا عقیدہ یہ نہ تھا۔ اور یہ نکتہ بے حد اہم ہے۔ کہ انفرادی جسم نامیہ کے تغیرات اس کی زندگی میں بچوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ گویا ڈارونیت خصائص اکتسابی میں وراثت تسلیم نہیں کرتی، یعنی جس انسان کی ٹانگ کاٹ دی گئی ہے، اسکے بچے بھی ایک ٹانگ والے پیدا نہ ہوں گے۔ تجربہ کرنے والوں نے تجربہ گاہ میں چوہوں کی دم کاٹ دی لیکن اب بھی ان کے بچے لمبی دم والے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

''اصل انواع'' کی اشاعت کو تقریباً ڈیڑھ صدی بیت چکی ہے لیکن آج بھی ماہر حیاتیات کی حیثیت میں ڈارون کے اصول مستحکم ہیں۔ بعد میں جو غور تحقیق ہوئی اس سے واضح ہوا کہ عمل ارتقاء میں جو اہم تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ بہت چھوٹے نہیں جن پر ڈارون زور دیتا رہا، بلکہ بہت بڑے اور شاذ ہوتے ہیں، جنہیں محولات فجائی کہتے ہیں۔ ڈارون کا عقیدہ تھا کہ جس چیز کو ہم انتخاب جنسی کہتے ہیں۔ یعنی کسی اصلح فرد کا اپنی زوجیت کے لئے جنس مخالف کی اصلح فرد کو اپنی طرف راغب کر لینا اور اصلح بچے پیدا کر لینا۔ انتخاب طبعی میں ایک عامل ہے۔ اگرچہ آج کل کے ماہرین جنسیات انتخاب جنسی کو بالکل نظر انداز نہیں کر بیٹھے، تاہم ان میں سے اکثر ڈارون کی تعبیر قبول نہیں کرتے۔ میراث کے حقیقی نظام کو ڈارون سے کہیں بہتر جانتے ہیں۔ یہ آسٹریا کے گریگور منڈل نامی سائنسدان کی محنت کا نتیجہ ہے جو اس نے انیسویں صدی کے اواخر میں کی تھی۔

ڈارون نے جو کام کیا اور خاص حیاتیات کے دائرے سے باہر اس کے دبستان نے جو اثر ڈالا اس پر متوجہ ہونے سے پیشتر ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ سادہ ماہر حیاتیات ہونے کی حیثیت میں بھی ڈارون کے کام میں اہم چیزیں موجود ہیں جن سے لفظ ارتقاء میں مقصدیت پیدا ہوتی ہے یا کم از کم اس کی قدر و قیمت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ ڈارون اور اس کے پیروؤں نے ارتقاء کے طویل عمل پر نظر رکھتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ ارضیاتی وقت میں بھی نتیجے سے اوپر کی طرف لے جانے کا رجحان غالب رہا ہے، یعنی سادہ اور یک خلیے والے اجسام پر پیچ اور متعدد خلیوں کے اجسام بن گئے۔ مثلاً دودھ پلانے والے جاندار، ممالیہ۔ یہی سلسلہ ترقی کرتے ہوئے انسان تک پہنچ گیا جو اب تک سلسلہ ارتقاء کا سدرۃ المنتہیٰ معلوم ہوتا ہے۔ انہیں یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ بہت سے اجسام زیادہ پر تکلف شکلیں اختیار کر گئے، جو ماحول کے لئے غیر موزوں تھیں چنانچہ ان انواع کو ناکامی سے سابقہ پڑا اور وہ معدوم ہو گئیں، مثلاً ڈائنوسار DINOSAURS اور ڈوڈو DODO نامی ایک پرندہ جو ماریشس کا ایک بہت بڑا پرندہ تھا۔ انہیں یہ بھی علم ہے کہ ارتقاء کوئی سادہ علم نہیں رہا اس میں ترقی اور انحطاط دونوں کے مرحلے پیش آتے رہے۔ سائنسدان ہونے کی حیثیت سے انہوں نے مقصدیت یا غائیت TOLEOLOGY کے ہر تصور کو بے اعتمادی کی نظروں سے دیکھنے کی تربیت پائی لیکن جن ان کے نظریات کا اطلاق حیاتیات کے دائرے سے باہر ہوتا ہے تو وہ کائنات کے بالکل مختلف نظریہ ہائے غائیت میں ایک عنصر بن جاتے ہیں۔ ان میں اصلح محض اس لئے سب سے بہتر ہوتا ہے کہ وہ زندہ رہا۔

مذہب پر اثرات:

ڈارون کی کتاب ''اصل انواع'' کا پہلا ایڈیشن اگرچہ صرف چند ہزار کی تعداد میں چھپا تھا، لیکن اس کے تمام نسخے

صرف ایک دن میں ہی فروخت ہوگئے۔ جس کتاب کے لئے خود ڈارون کی پیش گوئی تھی کہ یہ صرف تاریخ طبعی کے عالموں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوسکتی ہے وہ سب سے زیادہ بکنے والی انقلابی کتاب ثابت ہوئی۔ دنیا بھر کے اخبارات ورسائل میں اس پر تبصرے لکھے گئے اس پر توجہ کی یقینی وجہ یہ تھی کہ اس کتاب میں آرتھوڈکس مسیحی علماء کے لئے ایک کھلا چیلنج موجود تھا۔ جس شے کو کارنیل CORNELL یونیورسٹی کے صدر اینڈریو ڈی وہائٹ ANDREW D. WHITE نے الہیات سے کھلی جنگ قرار دیا، ڈارونیت کا صرف ایک پہلو تھی۔ لیکن ڈارون کی کتاب کے بائبل کی کتاب پیدائش کے بیان تخلیق کی صحت سے انکار کا کوئی نیا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا کہ زمین صرف چھ ہزار سال پرانی ہے۔ ہر نوع کی تخلیق خاص خدا کی طرف سے ہونے کا انکار ڈارون سے پہلے بھی ہوچکا تھا، مگر ڈارون کی کتاب نے اپنی ہردلعزیزی کی بنا پر ان لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی، جو انجیل میں بیان کردہ چیزوں کی صحت کے معتقد تھے۔

ڈارون اس وجہ سے بھی توجہ کا مرکز بن گیا کہ اس نے عام دنیاداروں کے سامنے ایک عمل (ارتقاء) اور ایک علت انتخاب طبعی کو عریاں کردیا تھا۔ اس سے پیشتر محض مبہم مادہ پرستانہ تصورات رائج تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈارون نے اس دلیل پر کاری ضرب لگائی تھی جو وکٹوریہ کے زمانے میں بہت عام اور ہردلعزیز تھی، یعنی کہ دنیا میں جتنے وجود ہیں وہ سب خدا کی کارسازی کے ناقابل تردید شہادتیں پیش کرتے ہیں، مثلاً علمائے الہیات کہتے ہیں انسانی آنکھ کی باریکیوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، جب تک مان نہ لیا جائے کہ یہ خدا کی خاص تخلیق ہے۔ ڈارون نے ثابت کردیا کہ یہ انتخاب طبعی کے لاکھوں سالہ تسلسل کے عمل کا نتیجہ ہے۔ جس کی بنا پر بعض لوگوں کے مختلف سرے ''اتفاقیہ'' دوسروں کے مقابلے میں روشنی کے لئے زیادہ حساس بن گئے۔

بایں ہمہ ''اصل انواع'' کی بنا پر ایک نہایت پرجوش دینی بحث شروع ہوگئی۔ انجیل میں بیان کردہ حقائق کو ماننے والے پرٹسٹنٹ اور کیتھولک کتاب پیدائش کے بیان پر قائم رہے انہوں نے ڈارون اور ان کی تصنیفات کو ملعون قرار دیا۔ مگر آگے چل کر کیتھولک کلیسا اور یہودی پرٹسٹنٹ جماعتوں نے ڈارونیت کے متعلق غیر جانبدارانہ روش اختیار کرلی، انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ ایک محض حیاتیاتی نظریہ ہے جو ضروری نہیں درست ہو اور ضروری نہیں کہ نادرست ہو۔ بہت سے مسیحی علماء نے اس کا فیصلہ یوں کیا کہ خدا نے جو علت العلل ہے اپنی مشیعت کے مطابق اس دنیا میں نامی اجسام کے ارتقاء کا بندوبست کیا۔ سوچ سمجھنے والے لوگوں پر یہ واضح ہوچکا ہے کہ ڈارون اور کوئی دوسرا سائنسدان کچھ بھی پیش کردے، وہ وجود باری تعالیٰ جیسے مسائل کے متعلق کوئی قطعی اور حتمی جواب نہیں ہوگا۔ ان پر یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ آج یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کل اس کا رد بھی آجائے گا اور ایسا ہی ہوا۔

☆

1870-7 قومیت اور قوم پرستی کے نام پر انقلابات وادغام

انقلاب فرانس نے یورپ میں قومیت کا احساس وشعور پیدا کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی قومی مملکت کا تصور مقبول ہونے لگا تھا۔ آزاد خیالوں نے اخوت کے انقلابی اصول کو قومیت کی اساس قرار دیا، اور ہر قوم کے لئے ایک قومی مملکت کا نظریہ پیش کیا۔ یورپ کی بعض اقوام چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی تھیں جو کسی بڑی مملکت کا جزو بن گئی تھیں اور اپنا جدا گانہ تشخص کھو بیٹھی تھیں۔ قومیت کے احساس کے ساتھ ہی قومی مملکت کے تصور کو بھی ترقی ملنے لگی اور محبان وطن نے یہ جدو جہد شروع کر دی کہ ان کی تمام قوم پر مشتمل قومی مملکت قائم ہو جائے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض محکوم قومیں آزاد ہو گئیں اور بعض منتشر قومیں متحد ہو گئیں۔ قومیت اور قومی مملکت کے نام پر اس انقلابی جدوجہد کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔

اٹلی:

اٹلی ایک ایسا ملک تھا جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ اس کی کوئی مرکزی حکومت نہ تھی یہ انتشار قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ ویانا کی کانگرس نے اطالوی ریاستوں کے ان تمام حکمرانوں کو بحال کر دیا تھا جن کو نپولین نے نکال دیا تھا۔ چارلس البرٹ سارڈینیا کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ وسطی علاقوں کے نوابوں نے پھر حکومتیں قائم کر لیں پوپ کی ریاست اس کو واپس کر دی گئی۔ لمبارڈی اور وینیشیا کے صوبے آسٹریا کو دیے گئے اور سسلی اور جنوبی اٹلی میں بوربونوں کی دو سلطنتیں قائم کر دی گئیں۔ اطالوی محبان وطن اس تقسیم سے ناراض تھے۔ انقلاب فرانس نے قومی اتحاد کا جو تصور پیش کیا تھا اس پر عمل کرتے ہوئے نپولین نے اٹلی کی متحدہ سلطنت قائم کر کے ایک عملی نمونہ پیش کر دیا تھا اور محبان وطن یہ چاہتے تھے کہ فرانس کے اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد اطالوی قوم کو منتشر اور منقسم کرنے کی بجائے ان کی ایک متحدہ قومی مملکت قائم ہو جائے۔ اس نظریے کا سب سے بڑا حامی اطالوی راہنما میزینی MAZZINI تھا اطالوی ریاستوں میں آزاد خیال جمہوریت پسندوں اور انقلاب کے حامیوں پر بڑی سختی کی جاتی تھی، اس لئے انہوں نے اپنے مقاصد کے حصول و اشاعت کے لئے خفیہ انجمنیں بنائی تھیں۔ ان میں ایک انجمن کاربوناری CARBONARI تھی جس نے 1820ء میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن قدامت پسند میٹرنخ نے اسے کچل دیا تھا۔ 1831ء میں اٹلی کے آزاد خیال محب

وطن میزینی نے ایک نئی انجمن قائم کی جس میں 60 ہزار آزاد خیال نوجوان شامل ہو گئے اور انہوں نے اٹلی کی آزادی اور اتحاد کے لئے وسیع جدوجہد شروع کر دی۔ نوجوان آزاد خیال اطالوی یہ چاہتے تھے کہ اٹلی کی تمام ریاستوں کو ختم کر کے ایک متحد ملک پر مشتمل جمہوریہ قائم کی جائے۔ میزینی شدت سے جمہوری نظام حکومت کا حامی تھا، لیکن دوسری آزاد خیال جماعتیں اس کے نظریات کی مخالف تھیں اور طرز حکومت پر نا اتفاقی کی وجہ سے ملک کی آزادی اور اتحاد کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔

1848ء کے انقلاب سے آزاد خیالوں کو توقع یہ تھی کہ اٹلی کو متحد کرنے میں کامیابی ہوگی۔ شاہ سارڈینیا نے دستوری حکومت کا قیام منظور کرنے کے علاوہ اٹلی پر آسٹریا کا تسلط ختم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیا، لیکن انقلاب کے بعد آسٹریا نے اس کو شکست دی اور وہ اپنے لڑکے عمانویل وکٹر دوم کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ وکٹر آزاد خیال اور محب وطن تھا 1849ء میں میزینی نے روم میں ایک جمہوریہ کے قیام کا اعلان کیا تو فرانس نے اسے تھوڑے ہی عرصہ میں ختم کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوپ جمہوری تحریک کا شدید مخالف ہو گیا اور جمہوریت پسندوں کو روم چھوڑ کر سارڈینیا میں پناہ لینی پڑی۔ وکٹر کا وزیر اعظم کیور بھی ایک آزاد خیال محب وطن تھا۔ اس طرح سارڈینیا کی سلطنت تحریک اتحاد کا مرکز بن گئی۔ کیور نے 1856ء میں پیرس کی کانگرس میں اٹلی کے اتحاد کی بڑی کوششیں کیں اور ان کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ برطانیہ اور فرانس اس کے حامی بن گئے اور لوئی نپولین نے کیور سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر آسٹریا حملہ کرے گا تو فرانس سارڈینیا کی مدد کرے گا کیور کی اس کامیابی سے آزاد خیال انقلابیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وسطی اٹلی میں انقلابی جدوجہد شروع ہو گئی نوابوں کو نکال کر رائے عامہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ سب علاقے سارڈینیا میں شامل ہو جائیں۔

آزادی کے لئے جنگ:

1848ء میں آزادی کے جنگ شروع ہو گئی تھی جس کا ایک مرکز میلان تھا وہاں شہر کے اندر بڑی خونریز جنگ لڑی گئی۔ وینس جو ان دنوں آسٹریا کے تحت تھا اس نے آسٹریا سے آزادی کا اعلان کر دیا اور عارضی حکومت بنالی جیسا کہ پہلے ذکر آیا سارڈینیا کی پیڈماؤنٹ حکومت نے آسٹریا سے اطالوی آزادی کے لئے جنگ چھیڑ لی۔ پوپ کی فوجوں نے بھی اس جنگ میں پیڈماؤنٹ کا ساتھ دیا۔ نیپلز میں یہ تحریک ناکام ہو گئی، البتہ پیڈماؤنٹ نے جنگ جاری رکھی۔ عمانویل دوم کے والد نے بالآخر فرانس اور برطانیہ کی ثالثی قبول کر لی، لیکن اسے صلح سے جو علاقے ملنے کی امید تھی ان کی کوئی صورت نہ بنی۔ آخر اس نے تخت شاہی اپنے بیٹے عمانویل کے حوالے کر دیا اور خود الگ ہو گیا۔ عمانویل نے اپنی شکست کے بدلے ساڑھے چھ کروڑ کا تاوان قبول کیا اور 9 اگست 1849ء میں صلح پر دستخط ہو گئے۔

یہ ہی وہ زمانہ تھا جب پوپ کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر روم میں اعلان جمہوریہ ہوا اور تین راہنماؤں نے انتظام سنبھال لیا۔ جن میں ایک میزینی تھا۔ ادھر فرانس اور آسٹریا پوپ کی بحالی کے لئے مداخلت کی تجویز پر غور کر رہے تھے حکومت فرانس نے آسٹریا سے پہلے وہاں کارروائی کر کے کیتھولک دنیا کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہیں اور روم پر حملہ کر دیا۔ اٹلی کے دوسرے راہنما جوزف گیری بالڈی (1882-1807) کی فوجوں نے اسے شکست دی۔ فرانس کی طرف سے ڈی لیپس کو سفیر بنا کر بھیجا گیا جو نہر سویز کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اسی زمانے میں پیڈماؤنٹ میں

کیور CAVOUR وزیر اعظم رہا۔ کیور بھی ایک آزاد خیال اور جدت پسند راہنما تھا، وہ اپنی جاگیروں میں کاشت کاری کے سائنٹفک طریقے رائج کر چکا تھا۔

کیور اور لوئی نپولین:

14 جنوری 1858ء کو ایک اطالوی نے لوئی نپولین پر قاتلانہ حملہ کیا۔ قید خانے سے قاتل نے لوئی نپولین کو اپیل کی تھی کہ اٹلی کو آزادی دلائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوئی نپولین نے کیور سے خفیہ ملاقات کی جس میں قرار پایا کہ فرانس آسٹریا کے خلاف جنگ میں پیڈ ماؤنٹ کو ہر ممکن مدد دے گا، بشرطیکہ جنگ ایسے طریقے پر جو فرانس اور اہل یورپ کے نزدیک حق بجانب ہو۔ فرانس کی اعانت دلانے پر آسٹریا اور سارڈینیا میں جنگ چھڑ گئی۔

مئی 1858ء میں ٹسکنی، موڈینا اور پاما میں پر امن انقلاب برپا ہوا اور تینوں نواب ریاستیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پیڈ ماؤنٹ کی فوجوں نے ایک لڑائی میں فتح حاصل کی اور فرانس اور پیڈ ماؤنٹ کی افواج متحدہ لمبارڈی میں داخل ہو گئیں۔ کچھ دن بعد پاپائی علاقوں میں بھی بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے، جو علاقہ اپنے حکمرون سے بغاوت کرتا وہ پیڈ ماؤنٹ سلطنت کے ساتھ اتحاد کا اعلان کر دیتا۔

اسی دور میں گیری بالڈی نے بڑا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ 1860ء میں گیری بالڈی نے سسلی اور جنوبی اٹلی کی متحدہ فوج کو شکست دے کر نیپلز پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح اگرچہ وہ خود ایک بڑی سلطنت کا مالک بن گیا تھا، مگر اس کے نزدیک بھی اٹلی کا متحد ہونا سب سے اہم تھا اس لیے اس نے اپنا مفتوحہ علاقہ پیڈ ماؤنٹ کے حوالے کر دیا اور اٹلی کے متحد ہونے کے خواب کو تعبیر دی۔ اس طرح نیپلز اور سسلی بھی اس اتحاد میں شامل ہو گئے۔ مارچ 1861ء میں اٹلی کی متحدہ بادشاہیت کا اعلان ہو گیا اور وکٹر عمانوئیل پہلا بادشاہ بنا۔ اس کامیابی کے تین ماہ بعد وزیر اعظم کیور نے وفات پائی۔ جو علاقے رہ گئے تھے ان میں بھی تحریکیں جاری تھیں۔ 1870ء میں فرانس کی افواج اٹلی سے واپس چلی گئیں تو اطالوی حکومت نے روم پر بھی قبضہ کر لیا۔

اٹلی کی متحدہ بادشاہت:

1871ء میں بالآخر پوپ سے بھی معاہدہ ہو گیا کہ پوپ کی ذات ہر قسم کی قانونی باز پرس سے بالاتر ہو گی اسے بادشاہوں کے برابر حقوق دے دیئے گئے یہ بھی اقرار کر لیا گیا کہ کیتھولک دنیا میں وہ مذہبی مجالس منعقد کرنے کا مجاز ہو گا اور ساڑھے بتیس لاکھ لیرا کی رقم اسے اٹلی کے خزانے سے سالانہ ملتی رہے گی۔ جنوری 1871ء میں وکٹر عمانوئیل فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا ہمبرٹ بادشاہ بنا۔ اس کے عہد میں اٹلی نے اریٹیریا پر قبضہ جمایا اور پھر حبشہ سے کشمکش شروع ہو گئی۔

جرمنی:

یورپ کا ایک اور بڑا ملک اس زمانے میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا 1618ء میں جرمن ریاستوں کی تعداد تین سو سے زائد تھی اور تمام کو متحدہ کرنے کی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ جرمن ریاستوں میں سے آسٹریا اور پروشیا نے بے حد ترقی کی تھی اور دونوں طاقتور سلطنتیں بن گئیں تھیں، لیکن جرمن ہونے کے باوجود دونوں میں رقابت اور مخالفت کا

جذبہ کارفرما تھا۔ آسٹریا جرمن ریاستوں کے اتحاد اور جرمن قوم کے استحکام کو اپنی سالمیت اور مفاد کے خلاف تصور کرتا تھا۔اس کی یہ کوشش رہی کہ جرمن قوم اور جرمن مملکت کبھی متحد اور مستحکم نہ ہو پائے۔ انقلاب فرانس اور نپولین کی فتوحات نے جرمن ریاستوں بھی کو بہت متاثر کیا اور کئی جرمن محب وطن متحدہ جرمنی کے خواب دیکھنے لگے اور قومی مملکت کے قیام کا جذبہ پیدا ہوا۔ نپولین کے بعد ویانا کانگرس میں آسٹریا کی سرپرستی میں اڑتیس جرمن ریاستوں کا وجود تسلیم کر لیا گیا۔

1848ء کے انقلاب کے دوران آزاد خیال جرمنوں نے جرمنی کو متحد کرنے کی جدوجہد کی اور ایک مجلس فرینکفرٹ میں قائم ہوئی اور انقلابیوں نے سازش کی کہ فرینکفرٹ پر قبضہ کر کے جرمنی کی تمام ریاستوں کو متحد کر کے زیادہ آزادی کے اصول پر منظم کیا جائے تاہم یہ کوشش ناکام ہوئی اور آزاد خیال راہنماؤں کو امریکہ میں پناہ لینی پڑی۔ اگرچہ آزاد خیال ناکام رہے مگر قومیت کے نام پر اتحاد کی کوششیں جاری رہیں اور اب قدامت پسند بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔

بسمارک:

1862ء میں بسمارک نامی ایک عظیم محب وطن پروشیا کا وزیر اعظم بنا۔ اس کا نصب العین پروشیا کی قیادت میں جرمنی کو متحد کرنا تھا اس مقصد کے حصول کے لئے بسمارک نے بڑی سختی اور خودسری سے کام لیا، کیونکہ اس کا نظریہ تھا کہ ایسے اہم مسائل جمہوری طریقوں سے نہیں بلکہ تیغ و تفنگ سے حل کیے جاتے ہیں۔ ولیم اول شاہ پروشیا خود بھی پروشیا کے اس نظریہ کا حامی تھا اور وزیر جنگ اور جرمنی کی افواج کا سربراہ بھی بسمارک کے اس مقصد کے حصول کے لئے اس کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ آزاد خیالوں نے جرمنی میں جو قومی جذبہ بیدار کیا تھا بسمارک نے بڑی ہوشیاری سے اس سے فائدہ اٹھایا اور پروشیا کی قیادت میں جرمن ریاستیں متحد کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اتحاد کے اس راستے میں تین بڑی رکاوٹیں درپیش تھیں۔

1۔ آسٹریا، جرمنی اتحاد کا سب سے بڑا مخالف

2۔ چھوٹی ریاستیں پروشیا کی طاقت سے خوف زدہ تھیں

3۔ جرمنی کیتھولک ریاستیں پروشیا کے پرٹسٹنٹ حکمرانوں کے زیر اقتدار رہنا پسند نہ کرتی تھیں۔ ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے زیرک بسمارک نے آسٹریا کو جرمن ریاستوں کے خارج کر دیا اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو پروشیا میں شامل کرنے کے لئے شمالی جرمنی کی فیڈریشن تشکیل دی۔

شمالی جرمنی کی فیڈریشن:۔

شمالی جرمنی کی کنفیڈریشن کے لئے جو آئین تیار کیا گیا وہ خود بسمارک نے بنایا تھا۔ اس دستور کے مطابق تمام ریاستیں یکجا ہو گئیں لیکن ان سب کی داخلی حکومتیں بحال رہیں البتہ عسکری اور خارجی امور فیڈرل حکومت کے حوالے کر دیئے گئے اور شاہ پروشیا کو تمام فوجوں کا سپہ سالار اعظم بنا دیا گیا۔ اس کنفیڈریشن کی صدارت بھی شاہ پروشیا کو حاصل تھی اور اس کی جانب سے چانسلر تمام خدمات انجام دیتا تھا۔ قانون سازی میں فیڈرل کونسل کے حقوق برابر تھے۔ یوں بسمارک نے پہلی کامیابی ان ریاستوں پر اقتدار حاصل کر کے حاصل کی۔

آسٹریا اور پروشیا کی جنگ:

بسمارک نے اپنے تدبر سے کچھ تزکیبیں ایسی کیں کہ 1866ء میں آسٹریا نے پروشیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اس معاملے میں کئی جرمنی ریاستوں نے آسٹریا کا ساتھ دیا مگر آسٹریا کو پروشیا نے شکست دی۔ بسمارک نے اس معاملے سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف تو آسٹریا کی طاقت کو توڑ دیا دوسری طرف شمالی ریاستوں کی فیڈریشن کی وجہ سے اپنی سرحدیں روس اور فرانس تک وسیع کر لیں۔

اسپین کی تخت نشینی کا معاملہ:

1870ء میں اسپین میں تخت نشینی کا معاملہ پیش آیا۔ اس سلسلہ میں بسمارک نے ایسی حکمت عملی سے کام لیا کہ فرانس کے بادشاہ لوئی نپولین نے پروشیا پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں بھی پروشیا کامیاب رہا۔ اس کا اقتدار اتنا بڑھا کہ جنوب کی جرمن ریاستوں نے اس کے ساتھ فیڈریشن میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کر دی۔ 1871ء میں بسمارک نے لوئی چہاردہم کے محل ورسائی میں جرمنی شہنشاہیت کے قیام اور شاہ پروشیا کے جرمن شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح جرمنی ریاستیں متحد ہو کر ایک قومی مملکت کے قیام کی جدوجہد میں کامیاب ہو گئیں (18 جنوری 1871ء) جرمنی شہنشاہیت کا نظام حکومت شہنشاہ کے اقتدار پر مبنی رہا۔ قیصر جرمنی چانسلر کی وساطت سے حکومت کرتا رہا، چانسلر کے تقرر کا اختیار بھی قیصر ہی کو تھا۔ بنڈس رات ریاستی حکمرانوں کا نمائندہ ایوان تھا جس کو قانون سازی کے لئے اختیارات حاصل تھے۔ دوسرا ایوان رائشتاغ کہلاتا تھا اور عوام کے منتخب نمائندوں کا ایوان تھا۔

آسٹریا اور ہنگری:

آسٹرین شہنشاہیت کی کیفیت اٹلی اور جرمنی کے برعکس تھی۔ اس وسیع شہنشاہیت میں آسٹرین جرمن جو حکمران تھے ،اقلیت میں تھے اور اکثریت غیر جرمن اقوام کی تھی اس اکثریت میں پول، چیک، سرب، کروٹ، سلاو سلواک اور لاطینی وغیر شامل تھے۔ قومی بیدار کے بعد محکوم اقوام کی آزادی ایک اہم مسئلہ بن گئی تھی اور آسٹریا کو بھی اس مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ 1848ء کے انقلاب میں ہنگری اور بوہیمیا نے بغاوت کر کے اپنی خود اختیاری سلطنتیں قائم کر لیں تھیں۔ اس زمانے میں فرانسس جوزف آسٹریا کا شہنشاہ تھا، اس نے خلاف توقع بڑی صلاحیت اور دانشمندی کا ثبوت دیا۔ اٹلی سے لڑائیوں اور اطالوی مملکت کے قیام سے اٹلی میں آسٹریا کا اقتدار ختم ہو گیا اور اسکے محکوم اطالوی صوبے اطالوی مملکت کا حصہ بن گئے۔ ہنگری اور بوہیمیا کی خود اختیاری کے خلاف بھی اقدامات کیے گئے اور بوہیمیا کی سلطنت کو ختم کر کے پھر آسٹریا میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی جو کامیاب ہوئی جبکہ ہنگری کی سلطنت مضبوط تھی جس پر قابو پانا ممکن نہ تھا اس لئے جوزف نے اس سے مصالحت کرنے میں بہتری سمجھی۔ آخر کار 1867ء میں دونوں مملکتوں میں ایک سمجھوتا ہو گیا جس کی رو سے طے پایا کہ آسٹریا کی شہنشاہیت آسٹریا ہنگری کی دوہری ملوکیت میں تبدیل کر دی جائے اس مشترکہ مملکت کے اختیارات بھی آسٹریا اور ہنگری میں تقسیم کر دیئے جائیں اس طرح ہنگری کو ایک نیم آزاد ریاست کے طور پر آسٹریا نے اپنے ساتھ شامل کر لیا، لیکن اس سے قومی جدوجہد ماند پڑ گئی اور دوسری قومی اقلیتوں کے معاملہ پر آگے چل کر بہت نازک حالات کا سامنا

کرنا پڑا۔

بلقان:

ترکوں کی عثمانی شہنشاہیت ایران سے مراکش تک پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف یہ بلقان سے بحیرہ عرب تک کے علاقے پر پھیلی تھی جس میں تمام عرب ممالک کے علاوہ جزیرہ نمائے بلقان کے تمام ممالک بھی شامل تھے۔ عثمانی سلطنت کا یہ بیت اب صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ بلقان میں اتنی قومیں آباد تھیں اور مذہبی اختلاف اور سیاسی اغراض کے تحت اتنی طاقتیں کام کر رہی تھیں کہ ترکی کے لئے اس علاقے میں اپنی شہنشاہیت اب قائم رکھنا دشوار تھا۔ یورپ کی بڑی سلطنتوں کے مفاد اور طاقتیں جنگ اور سازش دونوں کا سہارا لے رہی تھیں۔ ان سب یورپی طاقتوں نے بلقانی قوموں میں بیداری اور قومی آزادی کی تحریکیں اور بغاوتیں شروع کرا دیں اور قومی آزادی اور جمہوریت کے نام پر ترکوں سے جنگ کی۔ ترکوں کے یورپی مقبوضہ جات میں سے 1699ء میں سب سے پہلے ہنگری نے آسٹریا کی امداد سے آزادی حاصل کی تھی۔ انیسویں صدی میں بلقان کے محکوم ممالک کی خودمختاری کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ 1829ء میں برطانیہ، روس اور فرانس کی مدد سے یونان میں انقلاب آزادی بپا ہوا۔ 1876ء میں مانٹی نیگرو اور سربیا نے بغاوت کی اور روس کی حمایت پر ترکوں کے خلاف ہو گئیں۔ 1878ء میں برلن کی کانگرس میں یورپ کی بڑی طاقتیں ترکی کے خلاف متحد ہو گئیں اور مانٹی نیگرو، سربیا اور رومانیہ کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ بوسنیا اور ہرزیگوینا کو ترکی سے الگ کر کے آسٹریا کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ بلغاریہ کی علیحدہ سلطنت بنا دی گئی اور آگے چل کر البانیہ کی جداگانہ مملکت بھی قائم ہو گئی۔ اس طرح بلقان میں قومیت کی بیداری سے کئی جداگانہ مملکتیں وجود میں آ گئیں لیکن ان سب میں قومی اقلیتیں بھی موجود تھیں جن کی وجہ سے ان کے قومی ارتقاء میں رکاوٹیں پیدا ہو گئیں اور یہ کمزور اقوام کی سلطنتیں بن کر رہ گئیں ان نئی مملکتوں میں دستوری بادشاہتیں اور پارلیمنٹیں بھی قائم ہو گئیں۔ یہ بلقانی ممالک قومی بیداری سے زیادہ یورپ کی سامراجی سازشوں کی آماجگاہ اور آگے چل کر یہ سازشیں بڑی تباہ کن ثابت ہوئیں یا دوسری لفظوں میں پہلی جنگ عظیم کا باعث بنیں۔

ترکی:

عثمانی خلافت درحقیقت ایک مطلق العنان بادشاہت تھی یورپ بھر میں آنے والے انقلابات اور دستوری حکومتوں کی ہمہ گیر تحریک ترکی پر بھی اثر انداز ہوئی۔ سلطان عبدالمجید ایک اصلاح پسند حکمران تھا اس نے 1829ء میں فرمان گل خانہ کی رو سے ترکی میں انقلابی قدم کے طور پر مطلق العنانیت ختم کر کے دستوری حکومت کا آغاز کیا۔ سلطان نے اپنی مرضی سے خود اپنی مطلق العنانیت پر کچھ پابندیاں عائد کر لیں اور اس فرمان کے بموجب رعایا کو جان عزت اور املاک کا تحفظ فراہم کرنے کی ضمانت دی گئی۔ محاصل عائد اور وصول کرنے کے لئے یکساں قواعد و ضوابط معین کئے گئے اور یہ اصول پیش نظر رکھا گیا کہ امراء پر زیادہ محاصل عائد کئے جائیں اور عوام کے لئے محاصل قابل برداشت رکھے جائیں۔ مذہبی آزادی اور قانونی حقوق کا تحفظ کیا گیا اور قانون سازی کے لئے مجلس عدل قائم کی گئی۔ 1846ء میں مزید اصلاحات نافذ کی گئیں اور ملک کو یورپی ممالک کے اصول پر منظم کیا گیا۔ ادھر محب وطن ترکوں کی جماعت اس اصلاحات کو بھی ناکافی سمجھتی تھی اور مدحت پاشا نے دستوری حکومت کی انقلابی تحریک کو آگے بڑھایا۔ چنانچہ 1876ء میں سلطان عبدالمجید ثانی نے نیا دستور

نافذ کیا۔ جس کے مطابق مجلس عاملہ کو ایوان نائبین اور سینٹ پر مشتمل دو ایوانی پارلیمنٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ نئے دستور کے مطابق وزراء مملکت کا مواخذہ بھی کیا جا سکتا تھا اور سینٹ کو ان کے خلاف مقدمات کی سماعت کا اختیار تھا۔ اس طرح ترکی اور اس دستور نے ملک کی دستوری ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ نوجوان ترکوں نے انجمن اتحاد ترکی قائم کر کے دستوری تحریک کو مزید فروغ دیا چنانچہ جب سلطان عبدالمجید نے خودسری اختیار کی تو انور پاشا کی قیادت میں نوجوان ترکوں نے انقلاب برپا کر دیا جس کے نتیجے میں پارلیمنٹ نے سلطان کو معزول کر دیا اور 1876ء کے آئین کو بحال کر دیا۔ عبدالمجید کے جانشین محمد خامس نے اس دستور سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس دستور میں جو سقم رہ گئے تھے انہیں مختلف ترامیم کے ذریعے دور کیا گیا اور اس طرح ترکی سے مطلق العنانی کا انسداد ہو گیا۔ اسکے ساتھ ہی پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی میں قومیت کا جذبہ بیدار ہوا جس کے نتیجے میں اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کو جمہوریہ بنا دیا اور خلافت عثمانیہ کی تنسیخ کر دی۔

......☆......

1885ء۔ غلامی کی تنسیخ۔ انسانیت کا ایک اہم انقلابی قدم

انیسویں صدی میں مطلق العنانی کے خاتمے اور جمہوریت کے قیام کے لئے جو انقلاب آئے ان کی ترقی و کامیابی کا ایک اہم فریضہ صدیوں سے رائج غلامی کا انسداد تھا۔ غلامی کا ادارہ قدیم انسانی معاشروں کی مستقل خصوصیت اور ان کی اقتصادی زندگی کی اساس تھا جس نے رومی عہد سے ایک نئی شکل زرعی غلامی کی اختیار کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے نجی اور گھریلو غلام بھی رکھے جاتے تھے۔ ازمنہ کے یورپ نے بھی غلامی کے ادارے کو مزید پختہ کیا۔ نئی دنیا کی تسخیر کے بعد غلاموں کی تجارت کو بڑے پیمانے پر فروغ دیا گیا، کیونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ گرم خطوں میں افریقہ کے حبشیوں سے خوب کام لیا جا سکتا ہے۔ 1616ء میں غلاموں کا سب سے بڑا قافلہ امریکہ پہنچا۔ رفتہ رفتہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں غلامی زرعی نظام کا ایک مخصوص ادارہ بن گئی۔ شمالی ریاستوں میں غلامی کا رواج ویسی مضبوطی سے جڑ نہ پکڑ سکا۔ انقلاب امریکہ اور انقلاب فرانس کے نئے نظریات میں غلامی کا خاتمہ بھی مضمر تھا۔ انقلاب فرانس نے آزادی و مساوات کے نظریات کو اس شدت کے ساتھ پیش کیا کہ زرعی غلامی کا نظام بھی ٹوٹنے پھوٹنے لگا اور زرعی تحریکوں کی کامیابی سے زرعی غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن جس زمانے میں یورپ میں انسداد غلامی کی یہ تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں امریکی نو آبادیات میں غلامی کے قدیم طریقہ کی پھر تجدید ہو گئی اور تقریباً تمام نو آبادیوں میں غلامی کا نیا دور قدیم معاشروں کے نظام غلامی سے بھی بدتر اور وحشیانہ و ظالمانہ طور پر جاری تھا۔

غلامی کا نیا دور:

غلامی کے نئے دور کا آغاز درحقیقت یورپ ہی میں ہوا تھا اور یورپی اقوام نے ہی اس کو تمام امریکی نو آبادیات میں پھیلایا تھا۔ اس کی ابتدا پرتگالیوں نے کی مشہور ہنری جہاز راں کے کپتان اپنے جہازوں میں غلام بھر کر لانے لگے اور غلام بنانے کا یہ طریقہ زور پکڑ گیا۔ 1444ء میں سینی گال سے پہلی مرتبہ افریقی غلام پرتگال لائے گئے تھے جن کو گھریلو و زرعی کاموں پر لگایا گیا۔ افریقی غلام بڑے محنتی اور کار آمد ثابت ہوئے اور ان کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک دن پرتگال میں غلاموں کی تعداد وہاں کی سفید فام آبادی سے بھی زیادہ ہو گئی یہ افریقی غلام اب پرتگال

تک محدود نہ رکھے گئے بلکہ پرتگالی تاجروں نے افریقی غلاموں کو سپین میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ یہ تجارت اتنی نفع بخش تھی کہ اہل سپین بھی غلاموں کو افریقہ سے پکڑنے اور فروخت کرنے کی تجارت کرنے لگے اس کے بعد دیگر یورپی اقوام ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز بھی نے غلاموں کی تجارت شروع کردی۔ غلامی کی اس تجدید میں مسیحی کلیسا نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ 1454ء میں پوپ نکولا پنجم نے شاہ پرتگال کو اس نیک کام کا مجاز قرار دیا کہ وہ مسلمانوں اور دوسرے غیر عیسائی باشندوں کو فروخت کرے۔ عیسائی حکمران پوپ کو بطور تحفہ غلام پیش کرتے تھے جو کلیسا کے عہدے داروں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ ان عہدہ داروں کو اس بات کی ممانعت تھی کہ وہ ان غلاموں کو آزاد نہ کریں۔ عیسائیت قبول کرنے والے اگر غیر مسیحیوں سے رابطہ قائم رکھتے تو غلام بنا دیئے جاتے مختلف ممالک میں متعدد جرائم کی سزا بھی غلامی قرار دی گئی تھی۔ اس طرح ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں غلامی کے قدیم نظام کی تجدید کی گئی۔

امریکی نوآبادیاں:

امریکہ کی دریافت نے بھی غلامی میں بہت اضافہ کیا سپین والوں نے امریکی نوآبادیوں کے مقامی باشندوں سرخ ہندیوں کو غلام بنانا شروع کیا تھا۔ اس کی ابتدا خود کولمبس نے کی تھی۔ سرخ ہندیوں کو غلام بنا کر سپین بھیج دیا جاتا اس زمانے میں یہ بارٹر سسٹم بھی رائج تھا کہ اہل سپین مویشیوں کے بدلے میں سرخ ہندی غلام خرید سکتے تھے۔ ہسپانوی آبادکار جہاں قابض ہو جاتے وہاں کے مقامی سرخ ہندیوں کو غلام بنانا شروع کر دیتے تھے اور اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ اگر ان وحشیوں کو غلام نہ بنایا جائے تو جنگلوں میں بھاگ جائیں نیز انہیں غلام بنانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گیا کہ ان لوگوں کو عیسائیت کی تعلیم دی جائے گی۔ امریکی جزائر میں آدم خور سرخ ہندیوں کی سرکوبی کے بہانے بھی کثیر تعداد میں لوگوں کو غلام بنایا گیا۔

برازیل میں یہی کام پرتگالیوں نے شروع کیا۔ اس ملک کے جنوبی اور مغربی علاقوں سے غلام پکڑنا ایک مستقل پیشہ بن گیا تھا۔ یورپی ممالک میں شکر، تمباکو، کپاس، نیل اور چاول کی بڑی مانگ تھی یورپی آبادکاروں نے ان اشیاء کی کاشت امریکی کالونیوں میں وسیع پیمانے پر غلاموں کو رکھنے کا طریقہ رائج کیا۔ آبادکاران زرعی غلاموں پر شدید مظالم کرتے تھے بعض خدا ترس انسانوں کو ان غلاموں سے ہمدردی ہوئی تو انہوں نے یہ کوشش کی کہ غلاموں سے اچھا سلوک کیا جائے، لیکن آبادکار اس قسم کے شاہی احکامات کو بھی نظر انداز کر دیتے اور غلاموں پر مظالم کا سلسلہ صدیوں جاری رہا۔ سرخ ہندیوں کی آبادی تیزی سے کم ہونے کے بعد غلاموں کی تعداد میں روزافزوں اضافے کی ڈیمانڈ کو افریقی غلاموں سے پورا کیا گیا، جس سے ہر ہسپانوی آبادکار کو ایک درجن غلام برآمد کرنے کی اجازت سرکاری طور پر دی گئی۔ شاہ چارلس نے تو ایک بار اپنے ایک درباری کو سالانہ چار ہزار غلام امریکی جزائر میں بھیجنے کا اجازت نامہ دیا اس نے یہ اجازت نامہ جینوا کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ان تاجروں نے پرتگالیوں سے چار ہزار غلام خریدے اور ان کو امریکہ بھیج دیا اس طرح غلاموں کی تجارت شروع ہو گئی اور روزافزوں ترقی کرنے لگی یورپی حکومتوں نے بھی اس تجارت کی حوصلہ افزائی کی اور غلام برآمد کرنے پر محصول عائد کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کر لیا۔ ادھر بلند علاقوں کی آب و ہوا تو حبشی غلاموں کو راس نہ آئی لیکن جزائر ہسپانیہ اور نوآبادیات امریکہ میں یہ بہت پھیل گئے۔ برازیل میں ان غلاموں کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد سفید غلاموں سے بیس گنا زیادہ ہو گئی۔

غلاموں کی تجارت میں انگریزوں کا کاروبار دوسری اقوام سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ یہ تجارت سب سے پہلے ہربون ہاکنز نے شروع کی تھی۔ پھر ہسپانوی نوآبادیوں کو غلام بھیجنے کے لئے کاروبار کرنے کے لئے باقاعدہ کمپنیاں قائم کی گئیں۔ ولیم سوم نے عام اجازت دے دی۔ انگریزوں نے ایک معاہدہ کے مطابق ہسپانوی نوآبادیوں کو سالانہ 5000 حبشی غلام فراہم کرنے کا ٹھیکہ حاصل کیا اور سپلائی اس سے بھی زیادہ کی۔ 1680ء سے 1700ء تک کے بیس سالوں میں انگریزوں نے 3 لاکھ سے زائد غلام فروخت کئے اور پچاسی سال کے عرصے میں ان لوگوں نے صرف جمیکا میں چھ لاکھ سے زائد غلام بھیجے۔ غلاموں کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز انگلستان میں لیورپول تھا اس کے علاوہ لندن، برسٹل اور لنکاسٹر بھی اہم مرکز تھے۔ امریکی جنگ آزادی سے پہلے انگریزوں کی یہ تجارت بڑے عروج پر تھی۔ انگریزوں کے علاوہ فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کو بھی ان علاقوں میں غلام فروخت کرنے کی اجازت تھی۔ ہسپانوی اور پرتگالوی نوآبادیوں کے علاوہ فرانسیسی، انگریزی اور ولندیزی امریکی نوآبادیوں میں بھی غلاموں کی بڑی کھپت تھی۔ انگریزی نوآبادیوں میں پہلے تو سرخ ہندیوں کو غلام بنایا گیا، لیکن یہ اکثر غیر مفید اور خطرناک ثابت ہوئے۔ کیونکہ حسب مرضی کام نہ کرتے تھے اور جب موقع ملتا آقا کو قتل کر کے جنگل کی طرف بھاگ جاتے تھے چنانچہ اب یہاں بھی حبشی غلاموں کی مانگ ہونے لگی۔

1619ء میں ورجینیا میں ایک ولندیزی جہاز نے غلام فرخت کئے جو بہت کارآمد ثابت ہوئے اور دوسری ریاستوں نے بھی غلام منگوانے شروع کر دیے۔ انگریزی نوآبادیوں میں بھی غلاموں پر شدید ترین مظالم روا رکھے گئے ان کے علاوہ غلاموں کے لیے سخت ترین قوانین بنائے گئے۔ حبشیوں کے بے دین (غیر مسیحی) ہونے اور نسلی کم تری کو ان کی غلامی کا جواز بنایا گیا اور قانون کے مطابق ہر حبشی کو غلام تصور کیا جاتا تھا تاوقتیکہ وہ ثابت نہ کر دے کہ وہ آزاد ہے۔ قانون نے حبشیوں پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کر دیں تھیں اور سفید فاموں کو ان پر پورا اختیار حاصل تھا۔ غلاموں کی کثرت کا یہ حال تھا کہ برائن ایڈورڈ کے مطابق 1680ء اور 1776ء کے درمیان برطانوی نوآبادیوں میں تقریباً بائیس لاکھ غلام درآمد کیے گئے۔

یورپ:

اٹھارہویں صدی میں غلاموں کی تجارت کے خلاف تحریکیں پھیلنے لگیں۔ یہ زمانہ انسانیت کی تاریخ میں جمہوری رجحانات کی ترقی اور احساس کی بیداری کا زمانہ تھا۔ غلامی کو غیر جمہوری اور غیر انسانی اور مذموم ترین فعل قرار دیا جانے لگا اور غلاموں پر انسانیت سوز مظالم نے ان سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ انقلابات فرانس نے حریت اور مساوات کا پیغام سارے یورپ میں پھیلا دیا تھا اور اس پیغام کے علمبردار غلامی کے شدید مخالف تھے۔ دوسری طرف آبادکاروں کے مظالم سے تنگ آ کر حبشی غلاموں نے بھی سرکشی شروع کر دی تھی اور ان کی بغاوتوں نے ایسے نازک حالات پیدا کر دیے تھے کہ حکومتیں بھی ان مسائل کا حل ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئیں برطانیہ یورپ بھر میں غلامی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس مذموم تجارت کے خلاف سب سے پہلی آواز اور تحریک یہیں سے اٹھی غلاموں پر کیے گئے مظالم کی داستانوں نے انسانیت دوست اور حساس دل لوگوں میں عام بے چینی پیدا ہو گئی۔ برطانیہ کے ممتاز شاعر، مفکر اور مصلح غلاموں کی تجارت کو ختم کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ غلامی کے جواز پر شدت سے اعتراض کیا جانے لگا اور اس کو غیر آئینی کہا جانے لگا۔ چنانچہ یہ مسئلہ عدالت عظمیٰ برطانیہ میں پیش ہوا اور 1773ء میں عدالت نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ غلام سرزمین برطانیہ پر قدم رکھتے ہی آزاد

ہو جائے گا۔ 1776ء کو غلاموں کی تجارت کو غیر قانونی قرار دیا جانے معاملہ پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا لیکن کامیابی نہ ہوئی، مگر غلامی کی مخالفت بڑھتی چلی گئی۔ 1783ء میں برطانیہ میں ایک ایسی انجمن قائم کی گئی جس کا مقصد امریکہ میں حبشیوں کی امداد اور ان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔ ساتھ ہی غلاموں کی تجارت کی مخالفت کرنا بھی اس کا نصب العین تھا۔ 1787ء میں غلامی کے خاتمے کے لئے جدوجہد کمیٹی بنائی گئی، یہ کمیٹی غلاموں کے متعلق معلومات فراہم کرتی تھی، اور انسداد غلامی کے لئے درخواستیں جمع کرتی اور پارلیمنٹ میں یہ معاملہ اٹھانے والوں کی مدد کرتی۔ غلامی کے خلاف تحریک برابر ترقی کرتی گئی اور اس کو منسوخ کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں شدید مطالبہ کیا جانے لگا۔ آخر کار 1788ء میں تاج برطانیہ نے تحقیقات کے لئے پریوی کونسل کی ایک کمیٹی قائم کی۔ وزیر اعظم برطانیہ پٹ نے غلامی ختم کرنے کی حمایت کی انسداد غلامی کی تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ولبر فورس تھا۔ اس نے پارلیمنٹ میں غلامی کے خلاف بڑی معرکۃ آلارا تقریر کی اس ایسی بارہ قراردادیں پیش کیں جن کی اساس پر غلامی کو ختم کیا اور غلاموں کی تجارت کو ممنوع قرار دیا جائے۔ لیکن غلاموں کی تجارت کے انسداد کا بل پارلیمنٹ میں ناکام ہو گیا۔ 1793ء میں ولبر فورس نے دوسرا بل پیش کیا اور آخر کار طے ہوا کہ یکم جنوری 1796ء سے غلاموں کی تجارت بند کر دی جائے۔ غلامی کے خاتمے کے لئے بھی کئی کوششیں کی گئیں جو ناکام رہیں، لیکن یہ جدوجہد آگے بڑھتی رہی، یہاں تک کہ 1806ء میں گرینول اور فاکس برسر اقتدار آئے اور یہ طے کیا گیا کہ مناسب مدت میں اور مناسب طریقہ سے اس تجارت کو ختم کرنے کی موثر تدبیریں کی جائیں۔ 1807ء میں فاکس نے ایک اور بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جو منظور ہو گیا اور تاج نے بھی اس سے اتفاق کیا کہ یکم مارچ 1808ء کے بعد کوئی غلام نو آبادیوں میں نہیں بھیجا جائے گا اسی افریقی ادارہ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گی تاکہ غلاموں کی تجارت کرنے والوں پر نظر رکھی جا سکے اور دوسری یورپی اقوام کو بھی اس مذموم تجارت کے انسداد پر آمادہ کی جائے۔ ان قدغنوں کے لگ جانے کے بعد بھی غلاموں کی تجارت جاری رہی۔ آخر کار 1811ء میں خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دینے کا قانون پاس کیا گیا۔ اس قانون کی سختی اور سخت گیری سے برطانوی مقبوضات میں غلامی کی تجارت کا انسداد ہو گیا۔ ہندوستان میں غلامی کو ختم کرنے کی تجاویز 1842ء میں اختیار کی گئیں اور 1857ء کے بعد یہ ممنوع کر دی گئی۔

فرانس میں بھی ایک شدید کشمکش کے بعد غلامی کا انسداد کیا گیا۔ ہیٹی پر سپین کا قبضہ تھا 1697ء میں یہ فرانس کے زیر اثر آگیا یہاں حبشی غلام سفید فاموں سے 16 گنا تھے۔ ان غلاموں سے بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ غلاموں سے متعلق فرانسیسی قوانین کچھ نرم تھے لیکن ان کی خلاف ورزی کی جاتی تھی۔ غلاموں میں بے چینی پھیل گئی اور ان کی مدد کے لئے 1788ء میں پیرس میں ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس انجمن کا مطالبہ تھا کہ نہ صرف غلامی ختم کی جائے بلکہ غلاموں کی تجارت بھی بند کر دی جائے۔ پھر انقلاب آگیا اور انقلاب نے اس تحریک پر گہرا اثر ڈالا اور اعلان حقوق انسانی کے تحت غلامی کے خاتمے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ جیکبیوں نے فرانسیسی مقبوضات میں غلامی کو ممنوع قرار دیا، لیکن ہیٹی میں غلاموں کو حقوق دینے کی شدید مخالفت کی جانے لگی۔ فرانس کی قومی اسمبلی کو یہ خطرہ تھا کہ غلاموں کو حقوق آزادی عطا کرنے سے نو آبادیوں میں بے چینی پھیل جائے گی۔ اس لئے 1790ء میں ان حقوق کو سرزمین فرانس تک محدود کر دیا گیا۔ ہیٹی کے غلام بہت مایوس ہوئے اور انہوں نے بغاوت کر دی۔ آبادکاروں نے غلاموں کو سخت ترین سزائیں دیں، پیرس میں ان کے خلاف سخت

ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ 1797ء میں بالآخر قومی اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ نوآبادیوں میں بھی سیاہ فام غلاموں کو آزاد شہریوں کے حقوق حاصل ہوں گے۔ حبشی اس سے مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے پھر بغاوت کر دی۔ آبادکاروں نے انگریزوں سے مدد مانگی لیکن انگریزی فوج کے لئے بھی باغی غلاموں پر قابو پانا دشوار تھا1798ء میں انگریز فوج واپس ہو گئی۔ باغیوں کی اس کامیابی سے ہیٹی میں غلامی ختم ہو گئی اور غلام تنخواہ دار ملازم بن گئے۔ واٹرلو کی شکست کے بعد جب نپولین کو ایلبا میں نظر بند کیا گیا تو فرانس کے بوربون حکمرانوں نے پھر غلامی کی تجارت جاری کی اور غلامی کو دوبارہ رائج کرنا چاہا لیکن نپولین جب ایلبا سے واپس آیا تو اس نے غلاموں کی تجارت اور غلامی کو بالکل ختم کر دیا۔ 1815ء میں پیرس کی صلح کانفرنس نے بھی نپولین کے فیصلے کو برقرار رکھا اور 1818ء میں فرانس کی قومی اسمبلی نے اسے ایک قانون کی حیثیت دے دی اس طرح فرانس اور اس کے مقبوضات میں غلامی منسوخ کر دی گئی۔

برطانیہ اور فرانس کے علاوہ دیگر یورپی ممالک نے بھی غلاموں کی تجارت اور غلامی کو قانوناً ممنوع قرار دیا۔ یورپی ممالک میں سب سے پہلے ڈنمارک نے قدم اٹھایا۔ 1792ء میں ایک شاہی فرمان جاری کیا گیا کہ 1802ء کے اختتام سے تمام ڈینی مقبوضات میں غلامی اور غلاموں کی تجارت ممنوع ہو گئی۔ اس طرح ڈنمارک نے یہ فیصلہ برطانیہ اور فرانس سے بھی پہلے کیا۔ 1813ء میں سویڈن نے بھی غلامی کا خاتمہ کر دیا 1814ء میں ویانا کی کانگرس میں یہ طے پایا کہ جس قدر ممکن ہو سکے جلد غلاموں کی تجارت ممنوع کر دی جائے، چنانچہ ہالینڈ میں اسی سال اس کو ممنوع کر دیا گیا اور دوسرے علاقوں میں اس کے خاتمے کے لئے 1813ء کا سال مقرر کیا گیا پھر اس میں 1830ء تک توسیع کی گئی۔ 1836ء میں پرتگالی نوآبادیوں میں غلام لے جانا بھی ممنوع قرار پایا۔ اسپین نے 1820ء میں غلاموں کی تجارت ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔ 1831ء میں برطانیہ اور فرانس میں یہ معاہدہ طے پایا کہ غلاموں کی تجارت کو ختم کرنے کے لئے سمندروں میں سفر کرنے والے جہازوں کی تلاشی لی جائے۔ 1842ء میں امریکہ سے یہ معاہدہ کیا گیا کہ غلاموں کی برآمد روکنے کے لئے افریقی ساحلوں کی نگرانی کے لئے ایک مشترکہ بحری بیڑا رکھا جائے۔ ان بین الاقوامی معاہدوں کے نتائج بہت اچھے نکلے اور مختلف ممالک کے اشتراکِ عمل سے غلامی کی روک تھام میں بڑی مدد ملی۔

جنوبی امریکہ:

اسپین کی جنوبی امریکی نوآبادیات میں غلاموں کی بھرمار تھی یہ نوآبادیاں 1800ء سے 1825ء تک ہسپانوی اقتدار سے آزاد ہو گئیں اور آزادی حاصل کرنے کے بعد ان سب ملکوں نے غلامی کو بھی ختم کر دیا۔ کیوبا پر سپین کا قبضہ زیادہ مدت تک رہا یہاں 1842ء میں غلاموں کی تعداد 44 ہزار ہو گئی تھی لیکن ان کی حالت بہت خراب تھی اور قانون کو نظر انداز کر کے ان کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ عام بے چینی کی شکل میں نکلا اور اسپین نے غلاموں کی تجارت کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا 1870ء میں ہسپانوی پارلیمنٹ نے یہ قانون منظور کیا کہ ساٹھ سال کی عمر کے تمام غلام آزاد کر دیے جائیں، نیز اس قانون کے بعد غلاموں کی جو اولاد پیدا ہو گی وہ بھی آزاد ہو گی۔ اس طرح رفتہ رفتہ کیوبا سے بھی غلامی ختم ہو گئی۔

برازیل میں بھی غلامی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔ 1826ء میں اس نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ غلاموں کے تاجروں کے خلاف مؤثر قدم اٹھایا جائے 1871ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جس کے مطابق

سرکاری غلام بھی آزاد کر دیئے گئے جبکہ شاہ برازیل نے 1830ء میں غلاموں کی تجارت کو جرم قرار دیا، بہر حال 1888ء میں ایک فیصلہ کن قدم یہ اٹھایا گیا کہ غلامی کے مکمل خاتمے کا قانون نافذ کیا گیا اور سات لاکھ غلام اس قانون کی مد میں آزاد کر دیئے گئے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ:

امریکہ میں برطانوی نوآبادیات کی جنگ آزادی کے دوران غلاموں کو آزاد کر دینے کی تحریک بھی چلائی گئی اور مختلف ریاستوں نے اپنے آئین میں انسداد غلامی کی شق کو بھی شامل کر لیا سب سے پہلے میساچوسٹس نے 1780ء میں غلاموں کی ملکیت کو غیر قانونی قرار دیا 1804ء میں دیگر ریاستوں نے غلامی کے انسداد کے لئے مختلف تدابیر یں اختیار کیں چنانچہ امریکہ میں پیدا ہونے والے غلام بچوں کے بالغ ہونے پر آزادی کا حق دیا گیا۔ پینسلوانیہ میں کویکروں نے 1696ء میں غلاموں کی آزادی کے لئے تحریک شروع کی تھی، 1776ء تک یہ تحریک بڑی ترقی کر گئی۔

امریکی انقلاب آزادی کے راہنما غلامی کو ناپسند کرتے تھے۔ واشنگٹن نے اپنے غلاموں کو آزاد کر دینے کی وصیت کی تھی اور اپنی اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ تمام ممالک سے غلامی ختم ہو جائے۔ اسی طرح دوسرے راہنما بھی غلامی کے خلاف تھے۔ 1787ء میں فلاڈیلفیا کے اجتماع میں جب امریکی آئین کا مسودہ تیار کیا جانے لگا تو اس کو ترتیب والے غلامی کے مخالف تھے لیکن ان سب کے لئے اپنے نظریات پر عمل پیرا ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ کئی ریاستیں غلامی کو برقرار رکھنے کی حامی تھیں جنوبی کیرولینا اور جارجیا نے امریکی وفاق میں شمولیت اس شرط پر کی تھی کہ غلامی کو تسلیم کیا جائے۔ اس وجہ سے امریکی آئین میں غلامی یا غلام کا ذکر نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے یہ نظام برقرار رہا اور کانگریس کو اختیار دیا گیا کہ وہ غلاموں کی تجارت کو بیس سال بعد ختم کر دے۔ امریکی ریاستوں کا وفاق قائم ہوتے ہی بعض شمالی ریاستیں غلامی کو ختم کرنے لگیں تھیں۔ اسکی ابتدا 1777ء ہی میں ورمونٹ نے کی تھی۔ آخر نیوجرسی نے 1804ء میں اس پر عمل کیا لیکن جنوبی ریاستوں نے غلامی کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا اور شمالی ریاستوں سے غلاموں کو جنوبی ریاستوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ امریکہ کے اہل علم بھی غلامی کے خلاف تھے، لیکن جنوبی ریاستیں غلامی کی تنسیخ کے آمادہ نہ کی جا سکیں، مگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں غلامی کی تجارت بند کر دی گئی مگر غلامی کو ختم کرنے کا مسئلہ باقی رہا۔ شمالی ریاستیں غلامی کو ختم کر دینے کے حق میں تھیں جب کہ جنوبی ریاستیں اس کے خلاف تھیں۔ شمال وجنوب کے اس اختلاف نے بالآخر ایک نازک صورت اختیار کر لی۔ غلامی کو برقرار رکھنے کی حامی ریاستیں جو وفاق سے علیحدہ ہونا چاہتی تھیں انہوں نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ 20 دسمبر 1860ء کو جنوبی کیرولینا نے اور 9 جنوری و یکم فروری 1861ء کے درمیان چھ ریاستوں نے امریکی وفاق سے علیحدگی یا بغاوت کر دی، لیکن امریکی صدر نے ریاستوں کی اس علیحدگی کے اس اختیار کو تسلیم کر لینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 1861ء میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔
مارچ 1861ء میں ابراہم لنکن صدر منتخب ہوا۔ اس ے ابتدا ہی س مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ غلامی برقرار رکھنے کی حامی سات ریاستیں علیحدہ ہو چکی تھیں اور اب وفاق میں صرف آٹھ ریاستیں شامل تھیں اور اندیشہ یہ تھا کہ اگر جبر سے کام لیا گیا تو یہ ریاستیں بھی علیحدہ ہو جائیں گیں اور پھر ایسا ہی ہوا ان آٹھ ریاستوں میں سے تین نے علیحدگی کا رستہ اختیار کر لیا۔ اگلے چار سال تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اتنی شدید خانہ جنگی ہوئی کہ چالیس لاکھ فوجیوں نے اس میں حصہ لیا۔ ابراہم

لنکن نے ان تمام مشکلوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور اپنے جمہوری نظریات پر قائم رہا۔ 1862ء غلامی ختم کر دی گئی اس طرح امریکہ میں غلامی کا انسداد مکمل ہو گیا۔

بین الاقوامی فیصلے:

غلامی کے انسداد کے لیے مختلف ممالک نے متحدہ کوششیں بھی کیں اور اس بین الاقوامی جدوجہد کا نتیجہ بھی اچھا نکلا۔ 1815ء میں ویانا کانگرس نے غلامی کے انسداد کے لیے مشترک جدوجہد کا فیصلہ کیا جس پر بڑی حد تک عمل درآمد کیا گیا۔ آخری بین الاقوامی فیصلہ 1885ء میں برلن کانفرنس میں کیا گیا جس کی رو سے تیرہ اقوام اور امریکہ نے یہ طے کیا کہ غلاموں کی تجارت اور غلامی کی تنسیخ کے لیے باہمی تعاون اور مشترکہ کوششیں کی جائیں۔ غلامی کے انسداد کے لیے سمندروں کی ناکہ بندی ضروری تھی۔ بحر الکاہل میں یہ ناکہ بندی نہ ہونے کے برابر تھی جس کی وجہ سے غلاموں کی تجارت چوری چھپے جاری تھی۔ غلام مشرقی افریقہ سے عرب اور ہندوستان اور مشرق بعید تک بھیجے جاتے تھے۔ 1812ء میں برطانیہ نے مسقط اور زنجبار کے حکمرانوں سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ غلاموں کی تجارت بند کی جائے۔ 1822ء میں سلطان نے ہندوستان اور ایران میں غلام بھیجنے کا سلسلہ بند کرنے کا اقرار کیا لیکن تجارت پھر بھی جاری رہی۔ 1845ء میں سلطان نے یہ وعدہ کیا کہ زنجبار سے غلاموں کی برآمد بند کر دی جائے گی۔ لیکن خفیہ طور پر جاری رہا۔ 1873ء میں برطانیہ نے مطالبہ کیا کہ غلاموں کو سمگل کیے جانے والے خفیہ راستے بند کیے جائیں۔ 1876ء میں زنجبار کی بندگاہوں پر غلاموں کی تجارت ممنوع قرار پائی۔ 1890ء میں افریقہ کو یورپ کے ممالک نے آپس میں بانٹ لیا تو ملکہ وکٹوریہ کی خواہش پر برسلز میں ایک اجتماع ہوا جس میں تیرہ یورپی ممالک اور ایران و زنجبار میں غلاموں کی تجارت کو بالکل بند کر دینے کا معاہدہ کیا۔ قانون برسلز کے مطابق غلاموں کی تجارت غیر قانونی قرار دی گئی۔ 18 ممالک نے انسداد غلامی کے لیے مشترکہ طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ بحیرہ ہند، خلیج فارس اور بحیرہ احمر میں جہازوں کی تلاشی، گرفتاری اور مقدمہ چلنے کے اصول طے کیے گئے طاقتور بحری چوکیاں قائم کی گئیں تاکہ خلاف ورزی کرنے والوں کو گرفتار کیا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیسویں صدی کے آغاز میں حبشہ اور لائبیریا کے سوا تمام افریقی علاقوں میں یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

غلامی کے خاتمے کی جدوجہد بیسویں صدی میں بھی جاری رہی۔ چنانچہ جنگ عظیم اول کے خاتمے پر 1919ء میں فاتح اقوام نے سینٹ جرمن کے کنونشن میں یہ طے کیا اور جرمنی کو بھی اس کا پابند کیا گیا کہ غلامی کی ہر ایک قسم بشمول بیگار ختم کر دیا جائے اور بحری و بری راستوں سے غلاموں کی تجارت بند کر دی جائے۔ 1924ء میں ایک کمیٹی نے غلاموں کی تجارت کی وضاحت کرتے ہوئے جہیز میں دی جانے والی لڑکیوں، خرید کر پالے جانے والے بچوں اور تحویل میں رکھے جانے والے مقروضوں اور بغیر اجرت کام کرنے والے مزدوروں کو بھی غلامی کے زمرے میں شامل کر کے ان کی آزادی و تحفظ کی سفارش کی۔ 1932ء تک بین الاقوامی معاہدوں کا سلسلہ جاری رہا۔

عرب ایک ایسا ملک تھا جہاں غلامی ختم نہ ہوتی تھی اور وہاں خفیہ راستوں سے مسلسل غلام افریقہ سے لائے جاتے ۔اگرچہ تاریخ عالم میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہی معاشرہ سے غلامی کا داغ مٹانے کی کوشش کی تھی اور غلاموں کو آزادوں کے برابر کے حقوق عطا کیے تھے اور غلامی کے انسداد کے لیے ایسی موثر تدابیر پیش کی تھیں

جن پر چند سال اور عمل کیا جاتا تو صدیوں پہلے ہی غلامی ختم ہو جاتی مگر حکمرانی کے بدلے ہوئے نظام نے اسلام کی ان تجاویز پر عمل درآمد نہ ہونے دیا اور غلامی دنیا میں باقی رہی۔ عرب میں جو اسلام کو گہوارہ تھا غلامی کے انسداد کے لئے بڑی کوشش کرنا پڑی۔ آخر کار 1936ء میں ابن سعود نے ایک فرمان جاری کیا جس کے مطابق غلاموں کی تجارت اور غلاموں کا رکھنا جرم قرار دیا گیا جس سے اگرچہ فوری انسداد تو نہ مگر آئندہ کے لئے انسداد غلامی کی راہ ہموار ہو گئی۔

......☆......

1860 - تحریک بیداری نسواں - زمین کی آدھی آبادی کو حقوق دلانے کی انقلابی کوششیں

تاریخ عالم میں قدیم معاشروں میں خواتین کو بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ اگرچہ قدیم یونان میں جمہوریت اور جمہوری نظام نے بڑی ترقی کی تھی مگر عورت اس قدیم جمہوری معاشرے میں اپنا بنیادی حق حاصل نہ کرسکی رومی سلطنت میں خواتین کو کچھ حقوق دیئے گئے لیکن اس کے ساتھ پابندیاں بھی بڑھا دی گئیں۔ مسیحی کلیسا ہمیشہ سے عورتوں کی آزادی کا مخالف تھا اور اس نے خواتین کے بنیادی حقوق تک تسلیم نہ کیے۔ تحریک اصلاح کلیسا نے کلیسا کی سخت گیری کو کم کرنے کی کوششیں مگر خواتین کی معاشرتی حالت بہتر نہ ہو سکی اور دور جدید کی بیداری نسواں سے پہلے ہمیں صرف اسلام کے دامن میں خواتین کے لئے انصاف نظر آتا ہے۔ اسلام نے خواتین کو ان کے تمام جائز حقوق عطا کیے اور ان سے مساویانہ سلوک کرنے کی تلقین کی۔ اسلامی تعلیمات کے زیر اثر مسلمان خواتین کا مرتبہ دوسری اقوام کی عورتوں نے بہت بلند رہا، لیکن غیر اسلامی اثرات کے باعث خواتین ان تمام حقوق سے استفادہ نہ کرسکیں جو انہیں اسلام نے عطا کیے تھے جس سے آزادی نسواں محدود ہو کر رہ گئی ورنہ آغاز اسلام میں مسلم خواتین نہ صرف مردوں کے شانہ بشانہ تھیں بلکہ انہیں وہ تمام حقوق بھی حاصل تھے جن کے لئے مغرب کی خواتین کو انیسویں صدی میں شدید جدوجہد کرنا پڑی۔

یورپ انقلاب افرانس سے پہلے جمہوری خیالات کی ترقی کے ساتھ آزادی نسواں کا خیال بھی پیدا ہوا تھا اور ممتاز فلاسفہ یورپ نے حقوق نسواں کی حمایت کی تھی۔ انقلاب نے مساوات کے اصول پر شدت سے زور دیا اور اس کو جمہوریت کی اساس قرار دیا گیا، لیکن جمہوری رجحانات کی ترقی کے باوجود 1789ء میں جب فرانسیسی عورتوں نے اپنے حقوق کے لئے قومی اسمبلی کے سامنے ایک محضر پیش کیا گیا تو وہ نامنظور کر دیا گیا۔ تاہم انقلابی اصولوں اور جمہوریت کے علمبرداروں اور مفکروں نے عورتو کے حقوق کی حمایت جاری رکھی 1790ء سے 1860ء کا زمانہ، تاریخ یورپ میں وہ زمانہ ہے جب پہلی دفعہ تحریک بیداریِ نسواں کی واضح نشاندہی ہوئی۔ انقلاب فرانس کی وجہ سے اس دور پر روشن خیالی کی چھاپ موجود تھی اور مساوی حقوق انسانی کا چرچا عام تھا برطانیہ میں 1792ء میں میری والس سٹون کرافت MARY WALISTONCRAFT کی تحریک بعنوان، ''عورتوں کے حقوق کا جواز'' منظر عام پر آئی تھی۔ انیسویں صدی میں

آخر برطانیہ میں خواتین کو سیاسی حقوق دینے کے خیال کے بڑی تقویت پہنچی۔ سٹوارٹ مل اس تحریک کا ایک بڑا حامی تھا اور وزیر اعظم ڈزرائیلی نے بھی اس کی تائید کی تھی 1850ء میں اس مقصد کے لئے متعدد کوششیں کی گئیں جو کامیاب نہ ہو سکیں 1866ء میں خواتین نے ایک کمیٹی قائم کی اور اس نے خواتین کے حقوق کے لئے پارلیمنٹ میں محضر پیش کیا یہ محضر جان سٹوارٹ مل نے تیار کیا تھا اس کے علاوہ مل نے یہ قانونی ترامیم بھی پیش کیں کہ خواتین کو حق رائے دہی دیا جائے۔ یاد رہے کہ حقوق انسانی کے علمبردار یورپی لوگ انقلاب فرانس کے سو سال بعد تک بھی خواتین کو حق رائے دہی جیسا بنیادی حق نہیں دلا سکے تھے۔ خواتین کے ان حقوق کی حمایت کے لئے مختلف شہروں میں انجمنیں قائم کی گئیں اور تحریک بیداری نسواں ترقی کرنے لگی۔ 1869ء میں خواتین کو میونسپلٹیوں کی حد تک کچھ حقوق دیئے گئے۔ 1870ء میں جیکب برائٹ نے انگلستان کی پارلیمنٹ میں یہ تحریک پیش کی کہ انتخابات میں خواتین کو حق رائے دہی دیا جائے لیکن یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔

1884ء کے قانون اصلاح سے پہلے حقوق نسواں کی تحریک نے بڑی ترقی کر لی تھی اور ان کے مطالبات شدت اختیار کر گئے تھے لیکن وزیر اعظم گلڈسٹون اس تحریک کا مخالف تھا اور اس نے اس تحریک کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس ناکامی پر خواتین میں بڑی تلخی پیدا ہوئی اور انہوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے سیاسی قوت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ اس تحریک کو از سر نو منظم کیا گیا ملک میں اس مقصد کے لئے جو انجمنیں قائم تھیں ان کو 1897ء میں باہمی طور پر مربوط کر کے قومی محاذ کی شکل دی گئی اور مسز ہنری فاسٹ نے اس کی صدارت سنبھالی۔ 1903ء میں مسز پانکھرسٹ کی صدارت میں خواتین کی ایک معاشرتی اور سیاسی انجمن تشکیل دی گئی جس نے اپنے مطالبات منظور کرانے کے لئے پہلی مرتبہ تشدد کا راستہ اختیار کیا۔

1906ء میں خواتین نے زبردست مظاہرے شروع کئے اور پارلیمنٹ پر دھاوے بولنے لگیں۔ 1907ء میں تین ہزار برطانوی خواتین نے پارلیمنٹ کو گھیرے میں لے لیا۔ وزیر اعظم اسکوائتھ خواتین کے مطالبات ماننے کے لئے تیار نہ تھا جب حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور خواتین نے عام گرفتاریاں پیش کرنی شروع کر دیں تو مصالحت کی کوشش کی جانے لگی چنانچہ 1910ء میں ایک مصالحتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے خواتین کے مطالبات کی حمایت کی لیکن اسکوائتھ نے ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، نتیجتاً خواتین نے پھر تشدد شروع کر دیا۔ حکومت نے خواتین راہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن یہ تحریک بدستور جاری رہی۔ 1913ء میں خواتین کی تمام انجمنوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سیاسی جماعت کی حمایت کریں گی جو ان کے حقوق کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گی اور لیبر پارٹی نے خواتین کو سپورٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگ عظیم اول شروع ہو جانے کی وجہ سے بیداری نسواں کی تحریک کی جنگ سرد رہی۔ اس کے بعد 1917ء میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے خواتین کے لئے محدود حقوق کی سفارش کی۔ 1918ء میں ایک قانون پاس ہوا جس میں خواتین کو پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہونے کا حق دیا گیا۔ حقوق نسوان کی یہ تحریک مسلسل ترقی کرتی چلی گئی اور آخرکار 1928ء میں جب قومی نمائندگی کا قانون منظور ہوا تو خواتین کو بالآخر مساوی سیاسی حقوق مل گئے۔ برطانیہ کے علاوہ برطانوی مقبوضات میں بھی خواتین کے حقوق کے لئے تحریکیں شروع ہوئیں جو کامیاب ہوئیں، چنانچہ نیوزی لینڈ میں 1893ء میں آسٹریلیا میں 1902ء میں اور ہندوستان میں 1921ء سے 1927ء تک خواتین کو محدود سیاسی حقوق دیئے گئے۔ خواتین کا حق رائے دہی کا معاملہ تاریخ حقوق نسواں میں SUFFRAGETTE کہلاتا ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ:

امریکی انقلاب سے قبل امریکی نوآبادیوں میں خواتین ہر قسم کے حقوق سے محروم تھیں۔ جنگ آزادی کے نتائج کے بعد یہ طے کیا گیا کہ خواتین کے حقوق کے مسئلہ کو قومی آئین میں شامل کرنے کی بجائے ہر ریاست کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ اس کا مناسب تصفیہ کرے۔ امریکی خواتین میں بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ 1848ء میں نیویارک میں خواتین کے کنونشن نے حقوق کے لئے مطالبہ کیا یہ مغربی دنیا میں خواتین کی طرف سے پہلا مطالبہ تھا، لیکن اس کو منظور کرنے میں مشکلات حائل تھیں۔ حقوق نسواں کا مطالبہ تسلیم کرنے کے لئے ریاستی آئین میں ترمیم کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس کے لئے ایک تحریک شروع کی گئی۔ سب سے پہلے اس قسم کی تحریک کنساس میں 1867ء شروع ہوئی تھی لیکن یہ ناکام رہی۔ جمہوری پارٹی نے جب حبشیوں کو حق رائے دہی دینے کے لئے آئین میں ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا تو خواتین راہنما مس انتھونی نے یہ مطالبہ کیا کہ نہ صرف حبشیوں بلکہ خواتین کو یہ حق دیا جائے کہ وہ ووٹ ڈال سکیں۔ لیکن خواتین کے اس مطالبے کی بہت مخالفت کی گئی۔ خواتین نے بھی اپنی جدوجہد وسیع تر کرنے کا فیصلہ کیا اور 1869ء میں نیویارک میں قومی انجمن حقوق نسواں قائم کی گئی خواتین کی جدوجہد ایک مدت تک جاری رہی مگر اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہی، آخر کار خواتین نے فیصلہ کیا کہ اس مقصد کے لئے مختلف ادارے متحد طور پر کام کریں۔ 1890ء میں تمام آرگنائزیشنوں کا یہ اتحاد قائم کر دیا گیا جس نے اگلے تیس سال تک بڑی تن دہی اور لگن سے کام کیا ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف ریاستوں نے یکے بعد دیگرے خواتین کے حقوق کی حمایت شروع کر دی۔ 1918ء میں امریکہ کی جنگ عظیم اول میں شمولیت کے بعد یہ سرگرمیاں ملتوی کر دی گئیں مگر 1919ء میں اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ یہ جدوجہد شروع ہوگئی۔ آخر 1920ء میں آئین میں ترمیم کی گئی اور خواتین کو مساویانہ سیاسی حقوق مل گئے۔

1928ء میں دنیا کے بیشتر ممالک میں خواتین کے مساویانہ سیاسی حقوق کو تسلیم کر لیا گیا۔ یورپ میں سویڈن، ناروے، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، جرمنی، لکسمبرگ، فرانس، ہالینڈ اور آئس لینڈ میں خواتین کو پارلیمنٹ میں منتخب ہونے اور عہدوں پر تقرر کرنے کے مساویانہ حقوق دئے گئے۔ یونان، ہنگری، اٹلی، سپین، بیلجیم، ارجنٹائن اور برازیل میں بھی خواتین کو مشروط حقوق مل گئے۔ ایشیائی ممالک میں یہ تحریک بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی اور بیشتر ممالک میں خواتین نے یہ حقوق حاصل کر لئے۔ ترکی میں خواتین نے یہ جدوجہد 1908ء میں شروع کی اور 1935ء میں مساوی حقوق مل گئے۔ مصر میں اس تحریک کا بانی قاسم امین تھا جس کی تحریروں نے خواتین کو منظم کر دیا اور انہوں نے 1919ء میں مخالف برطانیہ تحریک میں عملی حصہ لیا۔ لیکن اس کے باوجود نئے دستور میں خواتین کے حقوق تسلیم نہیں کئے گئے۔ چنانچہ ہدا خانم کی راہنمائی میں خواتین کی آرگنائزیشن نے کام شروع کر دیا اور طویل جدوجہد کے بعد کامیابی نصیب ہوئی۔ چین میں جمہوریہ قائم ہونے کے بعد خواتین بیدار ہوئیں اور اپنے حقوق کے لئے 1922ء سے 1927ء تک شدید جدوجہد کی جو بالآخر کامیاب ہوئی۔ جاپان میں اس تحریک کا نتیجہ 1898ء کے قوانین کی شکل میں نکلا تھا اور خواتین کو حقوق عطا کر دیئے گئے۔ 1921ء میں جاپانی خواتین نے سیاسی، معاشرتی،، اقتصادی، قانونی اور تعلیمی مساوات کے لئے وسیع پیمانے پر تحریکیں شروع کر دیں، احتجاج اور مظاہرے ہونے لگے، لیکن ان مطالبات کی مخالفت کی گئی۔ 1926ء میں حکومت نے اس تحریک کو سختی سے کچل دینے کا

کوشش کی لیکن اسے دبایا نہ جاسکا۔ دوسری عالمگیر جنگ نے جاپان کے معاشرتی نظام پر بہت اثر ڈالا اور خواتین کی کامیابی کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ انڈونیشیا میں کارینی نے خواتین کی تنظیم قائم کی۔ 1912ء تک اس تحریک کو مضبوط بنا دیا اور حقوق نسواں کی تحریک جاری رہی یہاں تک کہ آزاد جمہوریہ میں خواتین نے بھی جمہوری حقوق حاصل کر لئے۔

معاشرتی حقوق:

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے آغاز میں خواتین کو نہ صرف سیاسی بلکہ معاشرتی حقوق کے لئے بھی جدوجہد کرنا پڑی ترقی یافتہ ممالک تک میں خواتین کی قانونی حیثیت مسلمہ نہ تھی اور اس کا جداگانہ قانونی وجود تک تسلیم نہ کیا جاتا تھا۔ ازدواجی زندگی میں بھی خواتین حقوق سے محروم تھیں۔ معاشی زندگی میں انہیں حق ملکیت حاصل نہ تھا۔ تعلیم صرف طبقہ امراء تک محدود تھی اور انیسویں صدی کے وسط تک یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی تعلیم نسواں کا انتظام نہ تھا ان جائز حقوق کے لئے بھی خواتین کو طویل جدوجہد کرنا پڑی۔ ان میں کچھ تو انیسویں صدی کے اواخر میں اور کچھ بیسویں صدی کے اوائل میں حاصل ہوئے۔ امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی کامل حقوق مساوات کا مطالبہ 1942ء میں جاکر پورا ہوا۔ تعلیم نسواں کی تحریک برطانیہ میں 1860ء میں منظم ہوئی اور دس سالوں میں بہت آگے نکل گئی۔ بڑی کوششوں کے بعد 1870ء میں خواتین کو تعلیمی حقوق ملے اور لڑکیوں کے لئے بھی تعلیم لازمی قرار پائی۔ برطانیہ کے علاوہ فرانس، جرمنی، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، اٹلی، چیکوسلواکیہ اور ہالینڈ میں بھی تعلیمی میدان میں خواتین کے لئے مساوی حقوق کا اصول تسلیم کیا گیا اور تعلیم نسواں کے لئے قوانین بنائے گئے۔ امریکہ میں تعلیم نسواں کے لئے انیسویں صدی میں کئی ایک انجمنیں قائم کی گئیں۔ 1833ء میں پہلا خواتین کالج قائم کیا گیا 1875ء سے 1915ء تک خواتین کی تعلیمی ترقی کے لئے جدوجہد تیز تر ہوگئی اور انہیں مردوں کے مساوی تعلیمی حقوق حاصل ہو گئے۔ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی تعلیم نسواں کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور عورتوں کو تعلیم حقوق دیئے گئے۔ بیداری نسواں اور حقوق نسواں کے لئے انیسویں صدی خواتین عالم کی تاریخ میں جہد مسلسل اور کامیابیوں کا زمانہ ہے۔ ترقی نسواں کے لئے جو تحریکیں اس زمانے میں شروع ہوئیں وہ بیسویں صدی میں منزل تکمیل تک پہنچ گئیں اور مساوات نسواں کا اصول ایک عملی حقیقت بن گیا جو کہ موجود زمانے کی جمہوری فکر میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی میں انسداد غلامی اور حقوق نسواں کے لئے خواتین کی کامیاب جدوجہد نے پرانے معاشروں کی سب سے بڑی خرابیوں کو انقلابی طور پر دور کر دیا اور نئے گلوبل معاشرے کی ترقی و تکمیل کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ بہر حال تحریک حقوق نسواں سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ نوع جس ہم خواتین کہتے ہیں کس قدر گنجلک راستوں سے گذر کر انسانی معاشرے میں اپنا مقام پاسکی جبکہ اس صنف نے مروجہ تاریخ نویسی کی تنگی دامن کو بھی چیلنج کیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اب تک علم تاریخ کا محور صرف اور صرف مرد رہا ہے عورت نہیں، کیا یہ مساوات انسانی ہے؟ اس اعتراض کے بجا ہونے سے انکار نہیں ہے لیکن تاریخ میں FEMINIS HISTORY کا پورا شعبہ وجود میں آچکا ہے جس نے خواتین کی تحریکوں کی نمو کا پورا نقشہ مرتب کیا ہے اور اس سمت کا تعین کرنے کی بھی کوشش کی جو یہ تحریکیں اختیار کر رہی تھیں۔ تاریخ کے اس شعبے نے خواتین کی سوانح کو گوشہ گمنامی سے نکالا اور نہ صرف ایسی خواتین کی سوانح کو جنہوں نے تحریک نسواں کے لئے کام کیا بلکہ نہایت معمولی حیثیت کی خواتین کی سوانح کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔ جنہیں تاریخ نے فراموش کر دیا تھا۔

1880ء انیسویں صدی کا سامراج کئی انقلابات عالم کا باعث

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری نے لفظ سامراج (امپریلزم) کی تعریف کے لئے زیادہ سے زیادہ پرانی مثال دینے کی
کوشش کی ہے، لیکن سامراج کے لفظ کے لئے 1881ء سے پیشتر کی کوئی مثال نہیں مل سکی۔ عمومی معنی میں سامراج سے مراد
کسی ریاست کا دوسرے علاقوں پر بذریعہ قوت تسلط ان علاقوں کے عوام کو محکوم اور غلام بنانا اور ان پر قوت کے ذریعے غیر ملکی
تسلط قائم کرنا ہے اس کے ساتھ ہی ان لوگوں اور علاقہ کا معاشی اور مالی استحصال کرنا بھی ہے۔ سامراج کا یہ تصور اتنا ہی
قدیم ہے جتنی انسانی تاریخ سامراج کا لفظ قدیم اصطلاح شہنشاہیت سے یہ مشتق ہے۔ انگلستان میں جیسا کہ پہلے ذکر
ہے کہ انگلستان میں یہ اصطلاح 1890ء کے بعد استعمال ہونا شروع ہوئی جب کہ انگریزی شہنشاہیت کو دنیا میں پھیلانے
کے حامیوں نے جن کی قیادت جوزف چیمبرلین جیسے بااثر لوگ کر رہے تھے، محض اپنے ملک کی ترقی پر توجہ مرکوز کرنے
بجائے انگلستان کا اثر ورسوخ دنیا بھر میں پھیلانے کے لئے کام کیا۔ چنانچہ یہ لوگ جو خود کو "سامراجی" کہلانے میں فخر
محسوس کرتے تھے، سامراجیت کی مخالفت کرنے والوں کو حقارت سے "چھوٹے انگلستانیے" کہتے تھے۔ اس کے بعد
سامراج کا لفظ دوسری زبانوں میں تیزی کے ساتھ پھیلا اور استعمال ہونے لگا۔ اس دور میں "سامراج" یا سامراجیت سے
مراد یورپ کی وہ متحارب قوتیں تھیں جو افریقہ اور ایشیاء میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے اور نوآبادیاں قائم کرنے میں مصروف
تھیں یورپ کی مختلف مملکتوں کی یہ سیاست 1880ء سے 1914ء تک بین الاقوامی سیاست پر چھائی رہی۔ چنانچہ
ملکوں کی نوآبادیاتی مہم جوئی کے اس دور کو ہی دور "سامراجیت" AGE OF IMPERIALISM کہتے ہیں۔ برطانیہ
اور یورپ کے دیگر سامراجی ممالک دوسرے ممالک پر اپنے قبضے اور تسلط کا یہ جواز پیش کرتے رہے ہیں کہ وہ ان مہذب
علاقوں یا ملکوں کے پسماندہ عوام میں تہذیب کی روشنی پھیلانے کے لئے قابض ہوئے تھے۔ یہ تہذیب مغرب، سفید فام
نسل کی نسلی، مادی اور ثقافتی برتری پر مبنی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سامراجیوں کی نسلی برتری کے نظریات نے فاشزم اور
نازی ازم جیسے ازموں کو جنم دیا تھا۔

جدید "سامراج" پر پہلا حملہ انگلستان کے ایک انقلابی ماہر سیاسیات جے۔ اے ہوبسن نے کیا ہے تھا۔ اس نے ایک

کتاب ''سامراج'' کے نام سے لکھی جو 1902ء میں شائع اس میں ہوبسن نے اس راز سے پردہ اٹھایا تھا کہ سامراجی دوسرے ملکوں کا استحصال صرف اقتصادی فوائد حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ایک اشتمالی راہنما لینن نے اپنی کتاب ''سامراجیت'' سرمایہ داری کا بلند ترین مرحلہ میں انہیں نظریات کو مزید واضح کیا تھا۔

اصطلاح سامراج کے سلسلے میں ہمیں اپنا احساس تناسب نہیں کھونا چاہیے یعنی یہ نہ فرض کر لینا چاہیے کہ یہ تحریک نئی تھی بایں ہم مغربی اقوام کے سامراج میں انیسویں صدی کے بعض اہم عناصر بھی کارفرما تھے جیسا کہ لفظ IMPERIALISM کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا ہے انگریزی زبان میں ISM ایک عقیدہ یا ایک مجموعہ اصول ہے جسے انسان بعمد دانستہ زندگی کا راہنما بنا لیتے ہیں۔ دور حاضر کے آغاز میں یورپی گروہ مختلف محرکات کے تحت اپنے ملکوں سے باہر جاتے رہے۔ انہیں شاذ ہی حکومت کی پالیسی براہ راست کوئی تعلق تھا اور شاذ ہی لوگوں میں ان کے متعلق زیادہ وسیع پیمانے پر بحث وتمحیث ہوتی تھی۔ اسکے برعکس انیسویں صدی کا سامراج تقریباً ہر ملک میں سیاسی زندگی پر اثر انداز ہوا۔ اس اس کے مقاصد، وسائل وذرائع جو سب سے زیادہ سیاست سے گہرا تعلق رکھنے پر تعلق حاصل کرنا تھا۔ 1900ء تک مغربی دنیا کا تناسب خواندگی بہت بلند ہو چکا تھا، اور باہم وسیع پیمانے پر کھلم کھلا بحثیں مباحثے کرتے تھے۔ اس زمانے میں امپیریلزم (سامراج) نے لبرل ازم، کنزرویٹوازم (قدامت پسندی) نیشنلزم (قوم پرستی)، اشتراکیت یعنی سوشلزم اور ایسے ہی دوسرے ازموں میں جگہ حاصل کر لی تھی اور سامراج ہی لوگوں کے مباحثوں کا موضوع بن گیا تھا۔ سامراج کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل دیئے جاتے تھے۔ ایک اور بدیہی نئی چیز پہلی جنگ عظیم (1914ء) کے آغاز پر نمایاں ہوئی، مغربی سامراج کی توسیع علاقائی اعتبار سے کرہ ارض کے جغرافیہ کی آخری حدود پہنچ گئی تھی۔ سامراج کی شکلوں کا سلسلہ خاصا وسیع تھا۔ براہ راست الحاق سے حلقہ ہائے اثر تک اس کے مختلف درجے تھے۔ ان درجات کے اعتبار سے پورا کرہ ارض مغربی ضبط ونظم یا مغربی اثر کی زد میں آچکا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر جو زمین کے جو حصے باقی رہ گئے تھے وہ صرف بنجر اور بے آباد علاقے تھے جو قطب جنوبی کے دائرہ میں واقع تھے ممتاز اقوام عالم ان خطوں کے انکشاف وتقسیم میں مصروف تھیں۔

1908ء میں برطانیہ نے رسمی اعلان کیا کہ فاک لینڈ ہمارے زیر اثر ہے۔ بعد میں 1982ء میں فاک لینڈ پر ارجنٹائن نے قبضہ کر لیا تھا لیکن صرف چند ماہ بعد ہی برطانیہ نے ایک زبردست جنگ کے بعد اس جزیرے پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ فاک لینڈ میں ایسے جزیرے بھی شامل ہیں جو جنوبی امریکہ کے جنوبی گوشے سے آگے واقع ہیں۔ یہ ایک کونے کی شکل کا ایک حصہ تھے جو 80 درجہ اور 20 درجہ مغربی طول بلد کے درمیان قطب جنوبی تک جاتا ہے۔ اس پر دوسری قومیں بھی دعوے کرتی ہیں۔ ناروے کے مہم جو ایمنڈسن نے اپنے ملک کا پرچم 16 دسمبر 1911ء کو خود قطب جنوبی پر لہرایا تھا۔ ایک مہینہ بعد انگریز قوم بھی وہاں پہنچ گئی اگرچہ یہ مقام انسانی بود وباش کے کے قابل نہیں مگر جب سے دنیا کی مختلف اقوام اس پر بھی اپنی ملکیت کا دعویٰ کر رہی ہیں۔ اس کا ایک پہلو اقتصادی بھی ہے۔ یہی اقتصادی پہلو جیسا کہ پہلے ذکر آیا انیسویں صدی کے سامراج کا حصہ ہے۔ سپین اور پرتگال نے امریکہ کی دریافت کے ابتدائی دور سے جس توسیع پر زور دیا تھا وہ صرف سونے چاندی اور دوسرے منافع کے لئے تھی۔ مگر انیسویں صدی اختتام کے قریب پہنچی تو سامراجی طاقتوں نے نئے اقتصادی محرکات کی وجہ سے دنیا کے کونے کونے تک اپنے اقتصادی مفاد کے لئے سامراج کو پھیلا دیا۔

سامراج کے اقتصادی نقادوں کے نزدیک پرانے ملکوں کے سرمایہ دار اور صنعت کار انیسویں صدی میں یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ جتنی چیزیں پیدا کرتے ہیں انہیں ملک کے اندر فروخت نہیں کر سکتے، مگر چونکہ وہ سرمایہ دار تھے اس لیے کم سود، کم منافع اور اپنے لوگوں میں طبقہ بالا کو کم روپیہ دے کر مشکلات حل کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے اور وہ مزدوروں کو زیادہ اجرتیں دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی دولت دولت میں دوسروں کو حصہ دار بنا کر ان کی قوت خرید بڑھانے کی بجائے غیر ملکی دنیا پر توجہ کی اور بیرونی منڈیوں کی تلاش میں مصروف ہو گئے اور سامراج ذہنیت رکھنے کی وجہ سے یہ مناسب سمجھا کہ ماتحت قوموں نے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے جس سے مغرب کے صنعتی ممالک میں زمین و اقوام پر تسلط حاصل کرنے کے لئے مسابقت شروع ہو گئی۔ یہی تلاش تھی جس کو لینن نے اپنی کتاب میں سرمایہ داری کا آخری ناگزیر مرحلہ قرار دیا تھا۔

یہ مسابقت رکھنے والی مغربی طاقتوں میں رقابتیں ان عشروں میں شروع ہوئیں بلکہ تیز تر ہوئیں، جو 1870ء کے بعد شروع ہوئے۔ جرمنی اور اٹلی کے متفرق حصوں میں نیا نیا اتحاد قائم ہوا تھا اور ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔ یہ دونوں ملک بھی میدان مقابلہ میں اتر آئے۔ جغرافیائی اکتشافات نے آخری بڑے علاقوں کے دروازے کھول دیئے جواب تک نسبتاً کم معروف تھے یعنی افریقہ۔ اقتصادی تعبیر کے حامی کہیں گے کہ بڑی طاقتوں کے صنعتی نظام زیادہ سے زیادہ پر پیچ ہو گئے اور انہیں درآمد کے لئے خام مال نیز برآمد کے لئے ارزاں مصنوعات بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو ان کے درمیان سامراجی مقابلہ تیز تر ہو گیا۔

1870ء دو دوروں کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے ایک وہ دور جسے سامراج کا سب سے زیادہ سرگرم دور قرار دینا چاہیے۔ یہ 1870ء سے پہلے تھا۔ 1815ء سے 1870ء تک سامراج میں جزواً تنزل ہوا، کیونکہ ہسپانیہ کی بیشتر امریکی نوآبادیاں آزاد ہو گئیں اور برطانیہ نے وہ ابتدائی قدم اٹھایا جن کے بعد کینیڈا بھی عملاً آزاد ہو گیا اسی دور میں فرانسیسیوں نے الجزائر میں قدم رکھا اور برطانیہ نے ہندوستان پر اپنا تسلط مکمل کر لیا بعد میں یہ دونوں سامراجی اقدام انقلابوں کا باعث بنے اور الجزائر اور ہندوستان کے لوگوں نے فرانس برطانیہ کی غلامی کا جوا، بڑی مشکل سے اپنے کندھوں سے اتارا۔

انیسویں صدی کے سامراج میں کامیاب عناصر۔ یعنی وہ عناصر جنہوں نے نئی زمینوں پر قبضہ کیا۔ برطانیہ عظمیٰ۔ جس کی سلطنت 1815ء میں بھی خاصی وسیع تھی۔ فرانس، جرمنی، اٹلی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ تھے۔ یہاں تک کہ ایک چھوٹے سے یورپی ملک بیلجیم نے جو 1815ء میں ہی ایک نئی قوم کے طور پر ابھرا تھا، گرم افریقہ میں بہت بڑا علاقہ ہتھیا لیا تھا یعنی کانگو جس کا رقبہ نو لاکھ میل تھا۔ اس کے مقابلے میں خود بیلجیم صرف گیارہ ہزار سات سو پچھتر 11775 مربع میل پر محیط تھا۔ روس ایسا ملک تھا جس نے سمندر پار توسیع میں حصہ نہ لیا تھا بلکہ اس کے بادشاہ زار نے شمالی امریکہ میں اپنا وسیع اور حد درجہ کم آباد علاقہ ایلاسکا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو فروخت کر دیا (1867ء) البتہ اس نے وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں پر ہاتھ صاف کیا اور تیزی سے مشرق بعید، ہندوستان، ایران اور چین کی طرف بڑھنے لگا۔ پرانی سلطنتوں میں صرف ہالینڈ وقت گزارتی رہی۔ پرتگال نے برازیل کھو دیا اور وہ 1822ء میں آزاد ہو گیا تھا۔ مگر پرتگیز بھی افریقی ساحل پر

ری نوآبادیوں سے اندرون افریقہ کی طرف بہت آگے بڑھ گئے۔ 1898ء میں امریکہ اور ہسپانیہ کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو ہسپانوی سلطنت کی باقیات نقشے سے بالکل مٹادی گئیں۔

عمل توسیع میں توسیع دوست قوموں کے درمیان مختلف قسم کے مقابلے جاری تھے ان میں اقتصادی مقابلے ہوتے تھے اور جنگوں تک نوبت آجاتی تھی۔ انیسویں صدی میں تقریباً ہر بڑی بین الاقوامی کشمکش کا تعلق یورپ سے باہر سامراجی رقابتوں سے تھا۔ صرف پروشیا اور آسٹریا نیز پروشیا اور فرانس کی جنگیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جرمنی اور اٹلی کے اتحاد کے مقابلے میں بھی سمندر پار کی زمینوں کے لیے کشمکش کی کوئی نہ کوئی شق موجود تھی۔ سامراج کے لئے مقابلہ ایک پر پیچ داستان ہے جو انیسویں صدی کے بین الاقوامی تار و پود میں بنی گئی۔ اب یہاں ہم صرف بڑی بڑی یورپی طاقتوں کے درمیان رقابتوں کے بڑے بڑے علاقوں کا ذکر کریں گے۔

متعلقہ علاقے:

منرو کے اصول نے امریکہ کے دونوں براعظموں کے کسی بیرونی طاقت کے حقیقی الحاق سے محفوظ رکھا جیسے جیسے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی قوت بڑھتی گئی یورپی طاقتیں منرو کے اصول کا زیادہ سے زیادہ احترام کرتی گئیں۔ یہی کیفیت برطانوی بحری قوت کی تھی۔ 1914ء کے مصیبت خیز سال تک برطانیہ اور امریکہ کے درمیان منڈیوں کے لئے، نیز جنوبی امریکہ میں سرمایہ کاری کے مختلف دائروں کے لئے مقابلہ تیز تر ہوگیا اور یہ مقابلہ بھی ان بہت سے عوامل میں سے ایک تھا جن کی وجہ سے ان طاقتوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ انیسویں صدی میں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو برطانیہ سے اس کی پرانی نوآبادیاں چھین لے۔ اس لئے آبادکاری کی نوآبادیاں اور استفادے کی نوآبادیوں میں برطانیہ کے مسائل صرف برطانوی نظام تک محدود رہے۔ اگرچہ یہ بین الاقوامی مسائل نہ تھے تاہم جنگ سے پیشتر کے عشرے میں روس اور جرمنی بعض اوقات ان میں مداخلت کے خطرات پیدا کردیتے تھے۔ سامراجی رقابت اور مداخلت کا ایک بڑا دائرہ مشرق قریب یا مشرق اوسط تھا۔ انیسویں صدی کے مغربی معیار کے مطابق یہاں کی سرزمین پسماندہ تھی، بارش کا اوسط بہت کم تھا اور جو زمینیں قابل کاشت تھیں ان کی طاقت صدیوں کی کاشت کاری کی وجہ سے کمزور پڑگئی تھی۔ ان کے طبعی وسائل بھی معمولی تھے۔ تیل ابھی نہ دریافت ہوا تھا، نہ اس کا وسیع پیمانے پر استعمال ہی شروع ہوا تھا۔ مشرق بعید کے لئے فرانس، انگلستان میں انیسویں صدی کے آغاز ہی سے رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی۔

افریقہ بھی ایک سامراجی رقابت کا قابل دید منظر پیش کرتا تھا۔ 1815ء میں افریقہ میں نہ یورپی آباد تھے اور اس کے قلب کی پوری چھان بین نہیں ہوتی تھی البتہ شمالی افریقہ کی سرزمینوں کا سب کو علم تھا جو برائے نام ترکی کے ماتحت تھیں پھر انتہائے جنوب میں راس امید پر ولندیزیوں کی ایک چھوٹی سی نوآبادی تھی جسے 1815ء میں برطانیہ نے سنبھال لیا۔ علاوہ ازیں پرتگیزوں، ہسپانیوں، فرانسیسیوں اور برطانوی کارخانے یا تجارتی کوٹھیوں کے سلسلے قدیم پرتگیزی انکشافات کے ساتھ ساتھ قائم تھے۔ افریقہ میں حبشی نسلیں آباد تھیں جو صدیوں سے بردہ فروشی کی مصیبت کا شکار تھیں۔ اس صدی کے وسط سے بہت سے افریقی علاقوں میں بردہ فروشی ممنوع ہوچکی تھی اور اب انکشافات کا سلسلہ بڑے زور و شور سے جاری تھا۔ پھر انیسویں صدی کے نصف آخر میں بڑی یورپی طاقتوں جرمنی، برطانیہ اور فرانس، پرتگال، اٹلی اور بیلجیم نے بڑی بڑی علاقائی

اور وحدتوں پر قبضہ کرلیا اور پورا براعظم یورپی ممالک میں تقسیم ہو گیا۔ صرف جمہوریہ لائبیریا اس سے مستثنیٰ تھی۔ کیونکہ اس جمہوریت کی بنیاد امریکیوں نے رکھی تھی۔ دوسرا آزاد افریقی ملک ابی سینا تھا۔ جسے حبشہ کہتے ہیں یہ افریقہ کا پہاڑی اور پسماندہ ملک تھا مگر اس پر بھی اٹلی کی نظریں للچائی ہوئیں تھیں۔ ابی سینا نے فرانسیسیوں کی مدد سے بمشکل اپنے ملک کو اطالویوں سے بچایا مگر میسولینی کے دور میں پھر اٹلی نے حبشہ پر قبضہ کرلیا تھا۔

مشرق بعید بھی سامراجی رقابتوں کی ایک بڑی معرکہ گاہ تھا یورپی طاقتوں نے پرانی نوآبادیوں پر اپنا قبضہ مستحکم کرلیا۔ اور جنوبی و مشرقی ایشیاء میں نئے علاقے حاصل کر لیے یعنی برما، ہند چینی، ملایا، نیز آسٹریلیا اور براعظم ایشیاء کے درمیانی جزائر کا وسیع جھنڈ۔ مگر قدیم اور اعلیٰ درجے کی متمدن چینی سلطنت نہ تو افریقہ کی طرح تقسیم ہوئی اور نہ ہی اس کا الحاق براہ راست عمل میں آیا۔ وہاں کی آبادی بھی حد درجہ گنجان تھی تاہم سیاسی صنعتی اعتبار سے چین اتنا منظم نہ تھا کہ یورپی مداخلت کا مقابلہ کرسکتا اور صدی کے آخر تک یہ بھی برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس جیسے سامراجی ممالک میں تقسیم ہو گیا۔ ہر طاقت نے معاہدوں کے ذریعے سے بندرگاہوں میں قیام کی اجازت لے لی تھی۔ ان بندرگاہوں میں سے یہ طاقتیں خاصے بڑے علاقوں پر اقتدار قائم کیے ہوئے تھیں۔ جسے بنیادی حیثیت میں اقتصادی سمجھنا چاہیے۔ یورپی طاقتوں کی رقابت کے علاوہ جس شے نے چین کی کمزوری کے لئے توڑ مہیا کیا اور اس پرانی مملکت کو آزاد قوموں کی فہرست میں شامل رکھا وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی نوخیز عالمی طاقت تھی۔ جس کی حکمت عملی یہ تھی کہ کہ چین کے ساتھ آزاد تجارت کا سلسلہ انتہائی حد تک جاری رکھا جائے مگر اس کی آزادی بھی محفوظ رکھی جائے۔ جاپان دو صدی تک۔ سترہویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے وسط تک باقی دنیا سے الگ تھلگ رہا۔ اس باہم پیوسطہ جزائری سلطنت کے دروازے غیر ملکیوں کے لئے اس زمانے تک بند رہے جب یورپی طاقتیں رفتہ رفتہ چین پر اپنی سامرجی گرفت مستحکم کر رہیں تھیں۔ 1854ء میں امریکہ کے بحری افسر پیری نے جاپانیوں کو اپنی بندرگاہیں بیرونی تجارت کے لئے کھول دینے پر راضی کیا۔ جاپان نے اس دور میں مغربی طور طریقے اپنائے خصوصاً اقتصادیات میں۔ اس طرح وہ انیسویں صدی کے آخر میں نہ صرف اپنی آزادی بحال رکھ سکا بلکہ اس نے اپنے مغربی استادوں کی تقلید میں براعظم ایشیاء میں سامراجی توسیع کے لئے پیش قدمی شروع کردی۔ اس طرح مغربی سامراجیت کے ساتھ ساتھ مشرق میں بھی ایک سامراجی طاقت ابھر آئی۔ جو جاپان تھی۔

......☆......

1905ء کا روسی انقلاب یا انقلابِ روس اول

نکولس دوم روس کا آخری بادشاہ تھا۔ وہ 1894ء میں برسرِ اقتدار آیا۔ 1898ء میں ملک میں اشتراکی تحریک جاری ہو چکی تھی اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ نکولائی لینن نے اس پارٹی میں روحِ رواں کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس کا اصل نام ویلادی میر اولیانوف VLADIMIR ULY ANOV تھا۔ وہ 1870ء میں پیدا ہوا تھا اس کا بڑا بھائی 1887ء میں انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں پھانسی پا چکا تھا۔ خود لینن نے بھی کئی سال سائبیریا میں جلاوطنی کے گذارے تھے۔ 1903ء میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر تفرقہ پیدا ہو گیا اور اس کے دو گروہ بن گئے ایک کا نام مینشویک مشہور ہوا یعنی اعتدال پسند اور دوسرا بالشویک کہلایا یعنی انقلابی انتہا پسند۔

1904ء میں روس کی جاپان کے ساتھ جنگ چھڑ گئی اور روس نے پے در پے شکستیں کھائیں نتیجہ یہ ہوا کہ روس کو دب کر جاپان سے صلح کرنا پڑی۔ ادھر حکومت کی اس بے وقعتی سے فائدہ اٹھا کر اکتوبر 1905ء میں انقلابیوں نے ہنگامہ برپا کر دیا لیکن یہ انقلاب بھی روس میں ہونے والے پہلے ہنگاموں کی طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ جنگ روس و جاپان کا نہایت اہم فوری اثر روس کے اندر داخلی اصلاحات کی شکل میں پڑا۔ ابھی معاملہ چل ہی رہا تھا کہ روس کا رجعت پسند وزیر داخلی پلیوے PLEHVE عمرانی انقلابیوں کے ایک بم سے جولائی 1904ء میں مارا گیا اس کا جانشین ایک اعتدال پسند شخص تھا۔ اضلاعی مجلسوں کے آزاد خیالوں نے جو آگے چل کر کاڈٹ مشہور ہوئے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر روس بھر میں دعوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا جس میں ایک قومی مرکزی نمائندہ مجلس کے انعقاد کے لئے قراردادیں منظور ہوئیں اگرچہ یہ مجلس منعقد کرنے کی اجازت حکومت نے نہیں دی، تاہم اس سے آئین یعنی بنیادی شہری حقوق، طبقات اور اقلیتوں کی مساوات اضلاعی مجالس کی ذمہ داریوں میں توسیع وغیرہ جیسے معاملات سب پر آشکار ہو گئے اور سب نے ان کی تائید کی۔ زار نے ایک مبہم بیان شائع کرایا جسے انقلاب کی امید ماند پڑ گئی اور حکومت نے آزادانہ بحث ونظر پر پابندی کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں۔ عجیب امر یہ ہے کہ ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود حکومت کے ایک کارندے ہی نے جو پولیس میں ملازم تھا، انقلاب کے لئے پہلا شعلہ بھڑکا دیا۔ اس کارندے کو پیٹر برگ کے کارخانوں میں متعین کیا گیا تھا، تاکہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو مزدوروں کی تنظیم سے روکے اور اس تنظیم کی جگہ اپنی طرف سے یونین قائم کرے۔ اس نے مزدوروں کا ایک پرامن جلوس منظم کیا اور ان سے کہا کہ میں درخواست لے کر زار کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں، درخواست میں عرض کیا جائے گا کہ

مزدوروں سے روزآنہ آٹھ گھنٹے کام لیا جائے ایک قومی مجلس بنائی جائے۔ شہری حقوق دے جائیں، مزدوروں کو ہڑتال کا حق حاصل ہو۔ ایسے ہی اور اعتدال پسندانہ مطالبات پیش کیے گئے تھے جب مزدوروں نے یہ درخواست پیش کرنے کی کوشش کی تو زار نکولس شہر چھوڑ کر چلا گیا اور فوج کو حکم دیا کہ پرامن مظاہرین پر گولی چلادی جائے جن میں سے بعض وفاداری کے نشان کے طور پر خود اس کی تصویریں ساتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ اتوار 22 جنوری 1905ء کو پیش آیا۔ تقریباً ایک ہزار مزدور اس فائرنگ سے موقع پر ہلاک ہوگئے۔ لہذا تاریخ عالم میں اسے خونین اتوار یا سرخ اتوار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان بے گناہوں کے اس قتل عام نے عام شہریوں کو انقلابی بنادیا۔ ہڑتالوں پر ہڑتالیں شروع ہوگئیں۔ اعتدال پسند مخالفین انقلاب بھی انتہاپسندوں سے مل گئے۔ یونیورسٹی کے طلباء اور پروفیسروں نے بھی انہیں اصلاحات کا مطالبہ کیا جو بم پھینکنے والے انقلابی کر رہے تھے۔

لینن LININ (تعارف)

ویلادی میر الیچ الیانوف (1870- 1924ء) لینن کا اصل نام تھا۔ وہ روسی انقلابی، کیمونسٹ پارٹی کا بانی اور سوویت یونین کا پہلا بالشویک حکمران تھا۔ سم براسک (موجودہ الیانوفسک) میں پیدا ہوا۔ کازان یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم مکمل نہ کرسکا کیونکہ اس کے بھائی الیگزینڈر کو زار روس الیکسانڈر سوم کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کی پاداش میں 1887ء میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ لینن جلد ہی انقلابی سوشلسٹ تحریک کا رکن بن گیا جس کی بناپر اسے دومرتبہ سائبریا جلاوطن کیا گیا۔

1888ء کے موسم خزاں میں اسے واپس کازان جانے کی اجازت ملی اس سے اگلے سال وہ سمارا چلا گیا جہاں اس نے قانون کا امتحان دینے کی تیاری کی اور سینٹ پیٹر برگ یونیورسٹی سے اس امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ 1900ء میں اس نے روس کو خیر آباد کہا اور سوئیٹزرلینڈ میں جا بسا۔ 1903ء میں اسے بالشویک دھڑے کا راہنما منتخب کیا گیا۔ 1905ء میں وہ مختصر عرصے کے لیے واپس آیا مگر ناکامی کے بعد اس نے انقلابی تحریک کو منظم کیا۔

بڑھتی ہوئی بے چینی اور اضطراب کو دیکھ کر ابتدا میں حکومت نے ایک مشاورتی کونسل بنانے کا ارادہ کیا جسے قانون سازی کا کوئی حق نہ ہو۔ نیز اس میں مغربی پارلیمنٹوں کا نہیں بلکہ قدیم روسی پنچائتوں کا نمونہ پیش نظر رکھا جائے۔ ایک نمائندہ قومی مجلس ہونا چاہیے۔ کم حوصلہ، تذبذب کا شکار اور نافہم نکولس دوم اپنے مشیروں کے یہ منصوبے سنتا رہا اور یہ تجویز ختم ہوگئی۔ بار بار کی مایوسی اور تاخیر کے زیر اثر مظاہرے اور ہنگامے 1905ء کے موسم گرما میں جاری رہے۔ اکتوبر میں پریس والوں نے بھی ہڑتال کر دی اور کوئی اخبار نہ چھپ سکا۔ پریس والوں نے سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کی مدد سے سوویت یعنی مزدوروں کی تنظیم بنائی جب ریلوے کے مزدور بھی ہڑتال میں شامل ہوگئے تو ماسکو اور پیٹرزبرگ کے

درمیان سفر کا سلسلہ منقطع ہو گیا جو سوویت سینٹ پیٹرزبرگ میں بنی تھی۔ اسکے متعلق لینن نے اعلان کر دیا کہ یہ مزدوروں کی پارلیمنٹ ہے نہ پرولتاری خود مختاری کی تنظیم ہے، بلکہ ایک جنگی تنظیم ہے جس کے پیش نظر خاص مقاصد ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بالشویک سوویت کو مسلح بغاوت کے متعلق اپنے پروگرام کے سلسلہ میں محض ایک آلۂ کار سمجھتے تھے کہ اس طرح اپنی عارضی حکومت قائم کر لیں اور ریاست کو جمہوریہ قرار دیا جائے کے ساتھ ہی دستور ساز مجلسیں بلائی جائیں یہ پروگرام جو 1905ء کے انتہا پسند انقلابیوں نے پیش کیا تھا، اعتدال پسند لوگوں کے پروگرام سے نسبتاً مختلف تھا۔ اس وقت انقلاب سے پہلے بورژوائی جمہوریت (سرمایہ دارانہ جمہوریت) کے مرحلے سے گذرنا ضروری تھا۔ لہٰذا وہ بورژوائی انقلاب کو ہر ممکن مدد دینے کے لئے تیار تھے۔ اب انگولس کے مشیروں نے اسے بتایا کہ دو صورتیں ہیں اول یہ کہ فوجی ڈکٹیٹر شپ عائد کر دی جائے اور مخالفت کو بزورِ قوت دبا دیا جائے۔ دوسری یہ کہ حقیقی مجلس قانون ساز بلائی جائے اور قوانین پر ویٹو کا اختیار محفوظ رکھا جائے۔ آخر زار نے یہی موخر الذکر صورت قبول کی اور اکتوبر 1905ء میں ایک منشور شائع کیا جس میں تمام شہریوں کے حقوق کی بحالی کا وعدہ کیا یہ اعلان بھی کرا دیا کہ عام بالغوں کے حق رائے دہی سے ایک قانون ساز مجلس یا دوما منتخب ہوگی۔ غرض اکتوبر کے مشہور منشور کے مطابق مطلق العنانی ختم ہوگئی، کیونکہ دوما کو زار پر قانون سازی میں ترجیح حاصل تھی۔ لیکن اکتوبر کا منشور بھی ہمہ گیر تصدیق حاصل نہ کر سکا اور انقلاب ختم نہ ہوا۔ دائیں بازو کی پارٹیوں میں سے ایک پارٹی کا نام روسی عوام کا اتحاد تھا۔ جس کی سرپرستی حکومت کر رہی تھی اس نے منشور کے خلاف مظاہرہ کیا اور مطلق العنان زار سے غیر فانی وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے ایک فوج منظم کی جس کے مختلف دستوں کا نام یوز ہائے سیاہ تھا یعنی نہایت گھناؤنا کام انجام دینے والے سو سو کے دستے۔ ان لوگوں نے منشور شائع ہوتے ہی ایک ہفتے کے اندر اندر تین ہزار یہودیوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا جو فوجیں مشرق بعید سے آئیں وہ حکومت کی وفادار ثابت ہوئیں اس طرح 1905ء کی سوویتوں میں 1917ء کی سوویتوں کے برعکس صرف مزدور طبقہ شامل تھا۔ سپاہی یا فوج شامل نہیں تھی۔ باقی رہے بائیں بازو کے پارٹی عناصر تو غیر مطمئین بالشویکوں اور عمرانی انقلابیوں نے تشدد آمیز انقلاب برپا کرنے کی متعدد کوشش کی مگر ناکام رہے حکومت نے ان کے راہنما گرفتار کر لیے اور ماسکو کے بازاروں میں کئی دن کی لڑائی کے بعد انہیں دبا دیا (دسمبر 1905)۔ مرکزی پارٹی آزاد خیالوں کی تھی وہ اس منشور پر بہت خوش ہوئے اور اصرار کیا کہ اسے اعتدال پسندوں کے پروگرام کے لئے اعتدال کا مرکز بنانا چاہیے۔ یہ لوگ اکتوبری کہلائے کیونکہ یہ اکتوبر کے منشور کے حامی تھے۔ دوسرے گروہ مثلاً کاڈٹ چاہتے تھے کہ مزید اصلاحات کے لئے آئینی جدوجہد ضروری ہے اور جاری رکھی جانی چاہیے۔ مگر 1906ء کے آغاز تک انقلاب کا طوفان تھم گیا زار نے منشور کے مطابق دوما یا پارلیمنٹ بنا دی اور بنیادی قوانین کا اعلان بھی کر دیا ان قوانین میں دوما بھی ترمیم کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔ تاج کو بدستور حق حاصل رہے گا کہ جنگ اور خارجہ امور اپنے ہاتھ میں رکھے۔ وزیر مال قرضوں اور سکوں پر ضبط و نظم رکھے گا زار نے اپنی مشاورت کے لئے جو مجلس بنائی ہوئی تھی وہ مجلس مملکت کہلاتی تھی اسے بھی نئی صورت دی گئی یہ ایک طرح کا ایوانِ بالا تھا جسے دوما کے برابر قانون سازی کے حقوق حاصل تھے اور وہ دوما کے مقابلے میں نیا بجٹ بھی پیش کر سکتی تھی۔ سب سے آخری مشق یہ تھی کہ زار دوما کو توڑ دینے کا مجاز تھا اور جب دوما کا اجلاس نہ ہو تو زار قانون سازی کا مجاز بھی تھا جسے بعد ازاں دوما منظور کر لیتی۔ دوما کا پہلا اجلاس مئی اور جولائی 1906ء میں

ہوا مگر تھوڑے ہی عرصے بعد پارلیمانی ہیر پھیر سے اسے توڑ دیا گیا۔ کاڈٹ پارٹی نے دعویٰ کیا کہ اس طرح دوما کا توڑا جانا آئین کی خلاف ورزی تھا۔ اگرچہ ان کی یہ رائے صحیح نہیں تھی مگر وہ سرحد پار فن لینڈ چلے گئے اور انہوں نے عوام کو سول نافرمانی کا مشورہ دیا۔ پہلی دوما کی تنسیخ سے ایک ایسا وزیراعظم برسراقتدار آیا جو بڑا ہوشیار اور قدامت پسند تھا۔ یہ تھا پیٹر سٹولی پن STOLYPIN وہ 1911ء تک روس کا وزیراعظم رہا اور اسی سال قتل کر دیا گیا۔ سٹولی پن نے بہت سے زرعی قانون منظور کرائے زرعی اصلاحات کے ساتھ ساتھ سٹولی پن نے دہشت پسندوں اور دوسرے انقلابیوں کے خلاف مسلسل جنگ جاری رکھی۔ مارچ، جون 1907ء میں دوسری دوما کے لئے انتخابات ہوئے مگر اسے بھی صرف تین ماہ بعد توڑ دیا گیا۔

دوسری دوما کے بعد حکومت نے انتخابی قوانین میں تبدیلی کر دی یعنی کسانوں اور اقلیتوں کی تعداد گھٹا دی اور شرفاء کے نمائندے بڑھا دیئے۔ اس طرح حکومت کو اکثریت حاصل ہو گئی جس کے نتیجے میں تیسری دوما نے 1907ء سے 1912ء تک اور چوتھی دوما نے 1912ء سے 1917ء تک اپنی طبعی معیاد پوری کی مگر یہ دونوں غیر نمائندہ تھیں اور ان کے اختیارات محدود تھے پھر بھی ان کی وجہ سے کسانوں اور مزدوروں کے حالات کچھ بہتر ہوئے۔ چوتھی دوما کے تحت حکومت رجعت پسندی کی طرف مائل ہو گئی کیونکہ سٹولی پن مر چکا تھا اس لئے بائیں بازو کی جماعتوں نے انقلاب کے لئے تنظیم سازی شروع کر دی اور یونینیں بنا کر کام کرنے کا آغاز کر دیا۔ پولیس کی قدغن بھی سخت کر دی گئی۔ اسی دوران شاہی خاندان ایک خطرناک مقام پر پہنچ گیا۔ اس ملکہ حد درجہ مذہبی اور خود رائے ایک نیم دیوانے، سراپا شر، گندے، جاہل اور اقتدار کے بھوکے راہب، راسپوٹین کے زیر اثر چلی گئی۔ ولی عہد کو کوئی مرض لاحق تھا جسے یہ ٹھیک کر دیتا تھا اسی وجہ سے راسپوٹین کو اقتدار حاصل ہو گیا۔

......☆......

1910ء انقلاب میکسکو

انقلاب میکسیکو ایک مسلح جدوجہد کا نام ہے جو طویل عرصہ سے 1876ء تا 1910ء سے حکومت پر مسلط آمر پروفرو ڈیاز PROFIRIO DIAZ کو اقتدار سے الگ کرنے کے لئے 1910ء میں رونما ہوئی۔

جنرل ڈیاز:

جولائی 1872ء میں میکسیکو کے صدر، جو آریز کے انتقال کے بعد ملک میں بغاوتوں اور انقلابیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جسے 1876ء میں ایک مستیزو جنرل پروفیریو ڈیاز نے حکومت پر قبضہ کر کے ختم کیا۔ مئی 1877ء میں ہونے والے انتخابات میں وہ باقاعدہ ملک کا صدر منتخب ہو گیا۔ ڈیاز نے ملک میں کنزرویٹو جماعت کے ساتھ تعلقات بہتر بنائے۔ اپنے مخالفوں کے خلاف اس نے فوج کو استعمال کیا اور ان کی آواز دبا دی۔ 1880 میں ڈیاز کا ایک دوست جنرل مینوئل گونزالینز صدر منتخب ہوا مگر آئندہ انتخابات میں 1884ء میں ایک بار پھر ڈیاز صدر بن گیا۔ اس مرتبہ وہ انتخابات میں اس طرح کامیاب ہوا کہ اگلے سولہ سال تک اسے کوئی اقتدار سے الگ نہ کر سکا اور وہ فوج کی مدد سے آمرانہ حکومت کرتا رہا۔ اس دور میں ڈیاز نے اپنے دوستوں کو نوازا۔ جو لوگ اس کے حامی تھے اور طبقہ امراء میں شمار ہونے لگے اسکے دور میں ملک میں اقتصادی ترقی بھی کی صنعتی طور پر بھی ملک میں خوشحالی آئی مگر لیبر یونینوں کی حوصلہ شکنی کی گئی اور انسانی حقوق بری طرح پامال کئے گئے۔ ان ترقیوں کے باوجود ملک کی کثیر آبادی غریب ہی رہی اور اس کا فائدہ صرف بڑے بڑے جاگیرداروں، کاروباری لوگوں اور بیرونی سرمایہ داروں کو پہنچا۔ تجزیہ نگاروں نے صدر ڈیاز کے عہد میں ہونے والی ترقی کو درمیانہ طبقے کے عوام کی پامالی بتایا ہے۔

1900ء میں تیل کی پیداوار میں اضافے میں پیداوار کے بعد میکسیکو تیل پیدا کرنے والا ایک بڑا ملک بن گیا۔ اس دوران صدر ڈیاز کی مخالفتوں کو کچل دینے والی پالیسیوں کے باوجود اس کی مخالفت میں اضافہ ہوا مگر 1884ء کے بعد کوئی اس کے خلاف انتخابات میں نہ ٹھہر سکا۔ 1910ء میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں ایک لبرل زمیندار فرانسسکو میڈیرو نے ڈیاز کے خلاف انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا صدر ڈیاز کا خیال تھا کہ میڈیرو اس کے خلاف انتخابات میں جیت نہیں سکتا اور گذشتہ سات انتخابات کی طرح وہ اس مرتبہ بھی حالات پر قابو پا لے گا۔ تاہم جب ڈیاز کا حالات اپنے ہاتھ سے نکلتے دکھائی دیئے تو اس نے عین انتخابات کے دن میڈیرو کو جیل میں ڈال دیا اور انتخابات میں خود کو صدر قرار دے دیا۔ صدر کے

دیگر جبر و تشدد کے ساتھ ساتھ انتخابات میں ہونے والی یہ کاروائیاں اس کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے کافی تھیں۔

اعلان بغاوت:

فرانسسکو میڈیرو جلد ہی جیل سے امریکہ فرار ہو گیا۔ 20 نومبر 1910ء کو اس نے اپنے ایک خط کے ذریعے ڈیاز حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا اور ڈیاز کے دیگر مخالفین کو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی جو میکسیکن شہری حکومت میں تبدیلی کے خواہاں تھے اس کے ساتھ ہو گئے اسی طرح میڈیرو نے میکسیکو کے کسانوں سے ملک میں زرعی انقلاب لانے کا وعدہ کیا۔ وہ بھی صدر ڈیاز کے خلاف تھے۔ اسلئے اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈیاز کو اقتدار سے ہٹانے کے اس مہم میں ملک کی دیگر سیاسی جماعتوں نے بھی میڈیرو کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ میڈیرو تشدد کے خلاف تھا اور پر امن طور پر اقتدار کی منتقلی چاہتا تھا مگر ڈیاز کو برطرف کرنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا چنانچہ جلد ہی یہ بغاوت پورے میکسیکو میں پھیل گئی اور باغیوں نے فوج سے لڑ کر کئی شہروں پر قبضہ کر لیا میڈیرو نے امریکہ سے واپس آ کر باغیوں کی قیادت کی اور مئی 1911ء تک وہ میکسیکو کی وفاقی فوج کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ صدر ڈیاز اپنی برطرفی کے لئے تیار ہو گیا۔ 21 مئی کو طے پانے والے ایک معاہدے کے بعد صدر ڈیاز مستعفی ہو کر 25 مئی 1910ء کو ملک سے فرار ہو گیا۔ اس معاہدے کے تحت اکتوبر 1910ء ہی دوبارہ انتخابات ہوئے جن میں بھاری اکثریت کے ساتھ میڈیرو کو صدر منتخب کر لیا گیا لیکن میڈیرو اپنی قابلیت کے باوجود زیادہ عرصہ حکومت نہ کر سکا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مختلف گروہوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اگرچہ میڈیرو نے آمریت پسندوں اور دیگر گروہوں کا صفایا کر دیا مگر 18 فروری 1913ء کو آرمی سربراہ ہیورٹا نے اس کے خلاف انقلاب برپا کر کے میکسیکو شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور ڈکٹیٹر بن گیا۔ 22 فروری کو جنرل ہیورٹا کے حکم پر میڈیرو کو گولی مار دی گئی۔ پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور آمرانہ طرز حکومت اپنا لیا گیا۔

حکومت کے خلاف اعلان جنگ:

آمریت پسند میکسیکن شہریوں نے ہیورٹا کی حمایت کی اور ملک میں امن قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن میڈیرو کے حامیوں میں ایک ریاستی گورنر وینوسٹیانو کارنزا VENUSTIANOCARANZA کی قیادت میں حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا امریکہ کے صدر وڈرو ولسن نے میکسیکو کی اس انقلابی تحریک کی حمایت کی۔ جلد ہی ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ 1914ء میں امریکی فوجوں نے ویرکروز پر قبضہ کر لیا جلد ہی کارنزا کی فوجوں نے میکسیکو شہر پر قبضہ کر لیا اور جنرل ہیورٹا سپین فرار ہو گیا۔

اقتدار کے لئے رسہ کشی:

اس عوامی بغاوت کے کامیاب ہو جانے کے بعد فاتح انقلابی راہنماؤں کے درمیان اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ ان انقلابی راہنماؤں میں کارنزا کو امریکی اعانت حاصل تھی لہذا کارنزا کو عبوری صدر بنا دیا گیا اس کی حکومت کے خلاف دو انقلابی راہنماؤں پانچو یلا اور ایمیلا نو زپاٹا نے بغاوت کر دی لیکن کارنزا نے انہیں شکست دے کر اپنی حکومت مستحکم کر دی 1916ء میں خانہ جنگی کے بعد کارنز کے صدارتی اختیارات تمام میکسیکو میں تسلیم کر لیے گئے۔

5 فروری 1917ء کو میکسیکو میں ایک جمہوری آئین نافذ کیا گیا۔ جس میں تعلیم، صنعت، زراعت کی پالیسیوں کی اصلاح کی گئی اس طرح ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا مگر میکسیکو بھی دنیا کا وہ ملک ہے جو مسلسل انقلابوں اور بغاوتوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ 1921ء میں صدر کارنزا کی صدارت کی معیاد ختم ہونے والی تھی اس نے پہلے سے اپنا ایک جانشین مقرر کر دیا لیکن اس کی صدارت کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اپریل 1920ء میں ملک کے تین بڑے جرنیلوں نے کارنزا کے خلاف بغاوت کر دی اور کارنزا کو حکومت چھوڑ کر فرار ہونا پڑا مگر 21 مئی کو باغیوں نے اسے پکڑ کر قتل کر دیا۔

ایڈولفوڈیلا ہیورٹا ملک کا عبوری صدر بنا۔ 1920ء کے صدارتی انتخابات میں ان تینوں باغی جرنیلوں میں سے ایک جنرل آبریگون صدر منتخب ہو گیا۔ آبریگون نے ملک میں انقلابی اصلاحات نافذ کیں۔ فالتو زمینیں کسانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ رومن کیتھولک چرچ پر آئینی کنٹرول قائم کیا گیا۔

☆

1910ء انقلاب لزبن

4 اکتوبر 1910ء کے لزبن کے انقلاب کے نتیجے میں پرتگیزیوں نے بادشاہی نظام کا ملک سے خاتمہ کر دیا۔ یہ بادشاہت 1143ء سے قائم تھی۔ یاد رہے سپین کی طرح پرتگال پر بھی مسلمانوں کی بادشاہت رہی ہے

شہنشاہیت کا قیام:

1109ء میں شاہ سپین، الفانسو ششم کی موت کے بعد ایک رئیس کاؤنٹ ہنری اور اس کی بیوی ٹریسا TERESA نے ریاست لیون LEON میں جاگیرداری کا نظام مسترد کر دیا اس پر اپنی بادشاہت قائم کی۔ 1128ء میں ہنری کے بیٹے الفانسو ہنرک نے اپنی ماں کے خلاف بغاوت کر دی۔ ٹریسا اپنے خاوند ہنری کی موت کے بعد 1112ء میں حکمران بنی تھی۔ اسکے بعد الفانسو ہنرک نے پورے پرتگال کی بادشاہت پر قبضہ کر لیا اور کئی محاذوں پر مسلمانوں کو شکست کر پرتگال کو مسلمانوں سے آزاد کرا لیا۔ 1143ء میں اس نے پرتگال کو سپین سے الگ ایک آزاد بادشاہت قرار دے دیا اور اس ملک کے پہلے بادشاہ کے طور پر حکمرانی کرنے لگا۔ یہ پرتگال کا پہلا بادشاہ تھا۔ 1179ء میں پوپ نے بھی آزاد پرتگال کو تسلیم کر لیا۔

یہ بادشاہت تقریباً آٹھ سو سال تک پرتگال پر قائم رہی اس بادشاہت کے دوران پندرہویں صدی میں پرتگال نے مہم جوئی کا آغاز کیا جس سے پرتگالی فتوحات کا آغاز ہوا جس سے پرتگال دنیا کی سب سے عظیم نو آبادیاتی طاقت بن گیا۔ پرتگالی مہم جوؤں نے افریقہ، ہندوستان، امریکہ اور بحر الکاہل میں بہت سے نئے علاقے دریافت کئے اور وہاں پرتگالی نو آبادیاں قائم کر لیں۔ اس طرح 1521ء میں اس وقت کے یورپ کا امیر ترین ملک بن گیا۔ شکر مصالحہ جات اور غلاموں کی تجارت سے پرتگال نے کثیر سرمایہ حاصل کیا مگر سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران پرتگالی تجارت پر برطانوی غالب آ گئے اور پرتگال کمزور پڑتا گیا۔

نپولین کا حملہ:

یورپ میں ہونے والی نپولین جنگوں میں پرتگال نے فرانس کے خلاف برطانیہ کا ساتھ دیا۔ 1807ء میں فرانسیسی فوجوں نے نپولین کی قیادت میں پرتگال کو فتح کر لیا تو پرتگال کا شاہی خاندان برازیل فرار ہو گیا۔ اور ریو ڈی جنیرو کو شاہی

حکومت بنالیا۔ 1808ء میں برطانوی افواج نے سر آرتھر ویلسلے کی قیادت میں فرانسیسی فوجوں کو شکست دی۔ 30 اگست 1808ء کو فرانسیسیوں کو پرتگال سے نکال دیا گیا۔ لیکن 1809ء میں فرانسیسی پھر قابض ہو گئے۔ برطانیہ نے ڈیوک آف ولنگٹن کی قیادت میں ایک فوج بھیجی جس نے بالآخر فرانسیسی فوجوں سے پھر پرتگال خالی کرا لیا۔ اس دوران پرتگال کا شاہی خاندان برازیل ہی میں مقیم رہا۔ 1815ء میں شاہ پرتگال نے برازیل کو علیحدہ سلطنت کا درجہ دے دیا 1816ء میں ملکہ پرتگال ماریا کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جان پرتگال اور برازیل کا بادشاہ بنا۔

آئینی بادشاہت کا قیام:

1820ء میں پرتگال کے کچھ آرمی آفیسر نے آئینی حکومت کے قیام کے لئے انقلاب برپا کیا۔ شاہ جان پرتگال کو آئینی بادشاہت بنانے کے لئے تیار ہو گیا اور اس نے اپنے بیٹے پیڈرو کو برازیل میں اپنا قائم مقام مقرر کر دیا۔ 1822ء میں جان کے بیٹے نے برازیل کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ مارچ 1826ء میں شاہ جان کی موت کے بعد پیڈرو نے پرتگال کا تخت بھی سنبھال لیا۔ اس نے ایک آئینی چارٹر نافذ کر کے ملک میں پارلیمانی نظام متعارف کروایا۔ دو ماہ بعد پیڈرو پرتگال کے تخت سے اپنی سات سالہ بیٹی ماریا کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ اس نے اپنے بھائی میجوئل کو ماریا کا ایجنٹ مقرر کر دیا۔ میجوئل نے 1828ء میں تخت پر قبضہ کر لیا اور ماریا کو معزول کر دیا۔ 1834ء میں انگلینڈ فرانس اور سپین کی مدد سے ماریا کو دوبارہ پرتگال کا تخت حاصل ہو گیا۔ ماریا نے 1853ء تک حکومت کی اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا پیڈرو پنجم تخت نشین ہوا۔ پھر 1861ء میں پیڈرو کا بھائی لوئیس بادشاہ بنا 1899ء میں لوئیس کی موت کے بعد اسکا بیٹا کارلوس اول بادشاہ بنا۔

جمہوری فکر کا پیدا ہونا:

کارلوس اول کے عہد میں عوام میں جمہوری فکر پیدا ہو گئی اور جمہوری قوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا 1906ء میں شاہ کارلوس نے جمہوریت دشمن جواؤ فرانکو کو وزیر اعظم بنایا تاکہ جمہوریت پسندوں کی بیخ کنی کی جا سکے۔ تاہم وہ اس میں ناکام رہا۔

شاہ اور ولی عہد کا قتل:

اسی دوران یکم فروری 1908ء کو شاہ کارلوس اور اسکے ولی عہد بیٹے لوئی فلپ کو لزبن کی گلیوں میں قتل کر دیا گیا۔ شاہ اور ولی عہد کے قاتلوں کا تعلق ایک خفیہ جمہوریت پسند جماعت کاربوناریا CORBONARIA سے تھا۔ بادشاہ اور ولی عہد کے قتل کے اس واقعے کو جمہوریت پسندوں نے سراہا اور اس کے ساتھ ہی وہ بادشاہ کے خلاف فیصلہ کن کاروائی کی تیاریاں کرنے لگے۔

انقلاب کا آغاز:

شاہ کارلوس کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا مینوئل دوم بادشاہ بنا۔ اس نے آئینی حکومت کو بحال کر دیا مگر اس کو حکومت کرنے کا صرف دو سال ہی موقع مل سکا۔ مگر وہ ملک میں شاہ پسندوں کو منظم نہ کر سکا۔ 6 اگست 1910ء کو ہونے والے

انتخابات میں عوام نے جمہوریہ کو ترجیح دیا۔ اسی دوران 3 اکتوبر 1910 کو لزبن میں ایک نمایاں جمہوریت پسند رہنما ڈاکٹر میگوئیل بمبارڈا MIGUEL BOMBARDA کو قتل کر دیا گیا، جمہوریت پسندوں نے اس بہانے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے 4 اکتوبر کو لزبن میں انقلاب برپا کر دیا جس کی وہ پہلے سے تیاری کیے بیٹھے تھے۔ اس انقلاب میں مسلح افواج نے بھی عوام کا ساتھ دیا اور شاہ میوئل دوم کو تاج و تخت سے محروم کر کے بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ شاہ میوئل برطانیہ فرار ہو گیا۔

5 اکتوبر 1910 کو ملک کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا اور ملک میں نیا پرچم رائج ہو گیا ایک عبوری حکومت تشکیل دی گئی جس کے صدر تھیوفیلو براگا تھے۔ 19 جون 1911ء کو آئینی اسمبلی کے پہلے انتخابات ہوئے اکتوبر 1911ء میں شاہ پسندوں نے جوابی کاروائی کے طور پر حکومت پر قبضہ کرنا چاہا مگر ناکام رہے۔ جمہوریہ بننے کے بعد اگلے 15 سال پرتگال میں سیاسی ابتری اور انتشار کے سال ثابت ہوئے۔

فوجی حکومت کا قیام:

مئی 1915ء میں جنرل پمنٹا ڈی کاسترو نے یکطرفہ طور پر فوجی حکومت قائم کی لیکن 15 مئی 1915ء کو ایک اور جمہوریت پسند انقلاب کے دوران جنرل ڈی کاسترو کو گرفتار کر لیا گیا اور جمہوریت پھر بحال ہو گئی۔

سالازار

انتونیو ڈی آلوارا سارلازار ANTONIO DEOLIVEIRA SLAZAR پرتگال کا ایک ماہر اقتصادیات جو 36 سال تک وزیر اعظم کی حیثیت سے ملک میں برسر اقتدار رہا۔ کوئمبرا یونیورسٹی .COIMRA U سے اقتصادیات میں ماسٹر کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر کی حیثیت سے پڑھانے لگا۔ پروفیسر سالازار کو صدر کارمونا نے پہلے وزیر خزانہ اور پھر 1932ء میں وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اسی طرح وہ پرتگال سب سے مقتدر شخص بن گیا سپین کی خانہ جنگی کے دوران سالازار نے جنرل فرانکو کا ساتھ دیا۔ جنگ عظیم دوم کے دوران 1936ء سے 1944ء تک سالازار نے وزیر دفاع کے فرائض بھی سنبھالے۔ پرتگال کی افریقی نوآبادیوں کو سالازار نے اس دور میں بھی قائم رکھا جب سارے یورپ کی نوآبادیاں افریقہ میں ختم ہو رہی تھیں۔ اتنے طویل عرصے تک اقتدار میں رہنے کے باوجود اس نے ایک سادہ زندگی گزاری وہ عوام میں بے جا اپنی مقبولیت کا قائل نہیں تھا اور کبھی کبھار عوام کے سامنے آتا تھا۔

آمریت کے سائے:

جمہوریت اور آمریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے تاریخ جمہوریت کے آغاز ہی سے یہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ مارچ

1928ء میں صدر منتخب ہونے والے کارمونا پرتگال کے باقاعدہ پہلے منتخب صدر تھے۔ کارمونا نے ملک میں اقتصادی حالات سنوارنے کے لئے کوئمبرا یونیورسٹی کے پروفیسر انتونیوڈی آلویرا سالازار کو اپنا وزیر خزانہ مقرر کیا۔ سالازار ایک شاطر شخص تھا۔ اس نے جلد ہی مالیات کے علاوہ خارجی معاملات اور دیگر حکومتی شعبوں میں قدم جما لئے اور پرتگالی سیاست کا اہم رکن بن گیا۔ 1930ء میں اس نے اپنی سیاسی پارٹی نیشنل یونین UN تشکیل دی 5 جولائی 1932ء کو سالازار ملک کا وزیر اعظم اور ڈکٹیٹر بن گیا یہ کنزرویٹو آمریت تھی۔

1933ء میں سالازار نے ملک میں نیا آئین نافذ کیا جو اٹلی کے فسطائی راہنما مسولینی کی طرز پر تیار کیا گیا تھا، اس میں عوام کے حق رائے دہی کو محدود کر دیا گیا تھا اور جمہوری اور شہری آزادیوں پر بہت سی پابندیاں لگا دی گئیں تھیں۔

سالازار 18 سال تک ملک کا وزیر اعظم رہا۔ اپریل 1951ء میں اس نے صدر کارمونا کی وفات کے بعد صدارت کا عہدہ سنبھال لیا سالازار تقریباً 35 برس تک اقتدار میں رہا 29 ستمبر 1968ء کو سالازار نے بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا یوں پرتگال میں جمہوریت نے اتنے سال حکمرانی نہیں کی جتنے سال آمریت برسر اقتدار رہی۔

.....☆.....

1911ء کا انقلاب چین

چین کی تاریخ و تہذیب تقریباً 5 ہزار سال قدیم ہے چینی تہذیب و تمدن کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہو
ہے۔ چین میں شہنشاہیت اتنی ہی قدیم ہے جتنی اس کی تاریخ۔ چین کا پہلا شہنشاہ جس کا نام مورخین نے فوہی
2738 ق م سے 2665 ق م تک حکومت کرتا رہا۔ چینی اسے دیوتا کا درجہ دیتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے
میں سیاسی بے چینی کا آغاز ہوا جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جمہوری انقلاب پر منتج ہوئی۔

تائی پنگ بغاوت:

چین میں صدیوں سے شہنشاہیت کے زیر سایہ جاگیردارنہ معاشی نظام کارفرما تھا۔ جاگیردارنہ استحصال کے باعث چینی معاشرے میں انیسویں صدی میں سخت بے چینی پائی جاتی تھی، وہ روز بروز شدید تر ہوتے ہوتے معاشی بحران کی صورت اختیار کر گئی جس کے پس منظر میں بہت ساری عوامی بغاوتیں رونما ہوئیں۔ سلطنت کے مختلف علاقوں میں جب کسانوں کے بلوے ہو جاتے تو وہ کبھی کبھی اتنی شدت اختیار کر لیتے کہ مرکز کے ارباب اختیار کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا اور طویل و شدید انقلابی جدوجہد کو دبانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس قسم کے بلوے اور تحریکیں اچانک شروع ہو جانے سے عوام الناس کی اس آرزو کا اظہار ہوتا تھا کہ معاشرے کو جاگیردارنہ استبداد سے چھٹکارا ملے۔ انیسویں صدی میں ہونے والی افیونی جنگوں کے نتائج اور چین میں زبردستی گھس آنے والی مغربی طاقتوں اور ان سے یک طرف معاہدے کرنے پر مجبور ہو جانے کے باعث معاشرے میں مزید بے چینی بڑھی اور لوگوں کو اور بھی زیادہ مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یورپی مال کا سیلاب مقامی دستکاروں کو بے کار کر گیا اور ملکی کاریگر مفلوک الحال ہو گئے۔ افیون کی درآمد کے باعث ملک کا قیمتی مبادلہ غیر ملکوں میں پہنچ گیا اور سکے کی قیمت گھٹ گئی۔ صلح نامہ نانکنگ کے بموجب چین کو بہت سا تاوان جنگ ادا کرنا پڑا۔ چینگ خاندان کی حکومت نے نئے محصول لگائے اور جبری وصولیاں شروع کر دیں اس کے باعث محنت کشوں کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ حقیقتاً کسان اتنے مفلوک الحال ہو گئے کہ انہیں اپنے کھیت چھوڑ کر جانا پڑا اور کاریگر تباہ و برباد ہو گئے۔ کیونکہ دیسی مال کی کوئی منڈی نہ رہ گئی، بلکہ نئے محصولوں سے سوداگروں اور "شینسی" طبقے کے بعض حلقوں کو بھی شدید ضرب لگی جنوبی چین پر یہ بات صادق آئی تھی جہاں غیر ملکی سوداگروں کے لئے پانچ بندرگاہیں کھل جانے کے بعد والا مال کا زوردار سیلاب آ گیا جس کے خلاف 1837ء میں ہونگ سیو چوآن نامی ایک راہنما نے جو حضرت عیسیٰ کا چھوٹا بھائی

ہونے کا دعوے دار تھا اور اس کی تبلیغ میں عیسائیت کے عناصر شامل تھے نئی تعلیمات کا آغاز کیا۔ اس کے فرقے میں محنت کش ہی نہیں بلکہ سوداگر اور شکس بھی شامل تھے۔ اس فرقے کے اراکین میں ایک یانگ سیوچنگ بھی تھا جو کوئلے کے ایک کان کن کا بیٹا تھا۔ اس نے مقامی طبقہ امراء کے خلاف لڑنے کے لئے کسانوں کا ایک دستہ منظم کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کا شمار اس فرقے کے ممتاز راہنماؤں میں ہونے لگا اور اس کے ساتھیوں نے باغی فوج کو مرکز فراہم کیا صوبہ کوانگسی کے پہاڑوں میں جہاں سرکاری فوجوں کا پہنچنا دشوار تھا وہاں اس تنظیم کے جو "انجمن حکمران آسمانی" کہلاتی تھی، ہزار ہا حامی 1840ء کی دہائی میں جمع ہوئے اور انہوں نے 1850ء میں منچوریائی حکمرانوں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ مقامی حکام اس بغاوت کو کچلنے سے قاصر رہے۔ دوسرے صوبوں سے فوج کی رسد اور سلطنت کے پہلے وزیر کی سپہ سالار اعظم کی حیثیت سے تقرری بھی بے کار ثابت ہوئی۔ 11 جنوری 1851ء کو "سلطنت آسمانی" (تائی پنگ تیشن گو) کے قیام کا نہایت دھوم دھام سے اعلان کر دیا گیا۔ اس تحریک کے شرکاء اس دن سے "تائی پنگ" بمعنی خوشحال ترین لوگ کہلائے۔ فرقے کے پیشوا ہونگ نے "تھین وانگ" یا شاہ آسمانی کا لقب اختیار کر لیا۔

تائی پنگ باغیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے پانچ لاکھ ہوگئی اور انہوں نے 1853ء کے موسم بہار میں جنوبی چین کے قدیم دارالحکومت نانکنگ پر قبضہ کر لیا اور اس کا نام بدل کر "تائی چنگ" یا آسمانی شہر رکھ دیا اور اسے تائی پنگ ریاست کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ اسی اثناء میں مغربی طاقتوں نے بھی آسمانی سلطنت سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تائی پنگوں نے نانکنگ پر قبضہ کرنے کے بعد موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور دارالحکومت پیکنگ پر فوراً قبضہ کرنے اور خود اپنی حکومت وہاں قائم کرنے کے لئے فوجوں کو شمال کی طرف نہیں بھیجا۔ ادھر امراء اور جاگیرداروں نے تائی پنگ خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک انقلاب دشمن فوج تیار کی جس کی تعداد 50 ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ فوج "جانباز ہونان" کہلاتی تھی۔ اس فوج نے تائی پنگ باغیوں سے سرکاری فوج کے مقابلے میں زیادہ موثر لڑائی لڑی۔

آخر کچھ تائی پنگ دستے مئی 1853ء میں شمال کی طرف بڑھے۔ اکتوبر تک مانچو فوجوں کو شکست دینے کے بعد وہ تیجسن کے قریب پہنچ گئے۔ جس سے دارالحکومت کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا، مگر طویل مسافت طے کرنے کی وجہ سے خود تائی پنگ فوجوں کی حالت بہت نازک تھی۔ بہت سی لڑائیوں کے بعد 1856ء میں یہ محسوس ہونے لگا کہ تائی پنگ باغی مانچو خاندان کا تختہ الٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

غیر ملکی مداخلت اور چین:

1854ء میں یورپی طاقتیں پیکنگ کی حکومت سے تجارت کے غیر محدود حقوق کا مطالبہ کر رہی تھیں اور چاہتی تھی کہ دارالحکومت میں غیر ملکی سفیروں کے داخلے کی اجازت بھی دی جائے۔ جنگ کریمیا کے بعد برطانیہ اور فرانس نے معمولی بہانوں نے چین کے داخلی معاملات میں کھلے بندوں مداخلت شروع کر دی۔ نام نہاد دوسری جنگ افیون کا خاتمہ مانچو خاندان کی مزید شکست فاش پر ہوا۔ تیئنسن کے صلح نامے میں اصل فریقین جنگ کے سوا ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی شامل تھا۔ جس نے اگرچہ جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ صلح نامہ چین پر نو آبادیاتی طاقتوں کے غلبے کی جانب ایک اور قدم کی حیثیت رکھتا تھا۔

1858ء کے صلح نامے میں برطانیہ اور فرانس کو متعدد بندرگاہوں پر تجارت کرنے کے حقوق دیئے گئے اور ملک میں سفر کرنے کی سہولت بھی فراہم کی گئی۔ سفیروں کو دارالحکومت بھیجنے کی اجازت بھی مل گئی، مگر مزید مراعات کے حصول کے لئے برطانیہ اور فرانس نے ایک مہم جو فوج پیکنگ کی طرف روانہ کر کے ایک اور لڑائی چھیڑ لی۔ شہنشاہ اور اسکے درباری خوف زدہ ہو کر شہر سے فرار ہو گئے یورپی فوج نے دارالحکومت کو وحشیانہ طور پر لوٹا اور شہنشاہ چین کے گرمائی محل سے علم و فن کے انمول خزانے لوٹ لئے گئے۔ 24 اکتوبر 1860ء کو معاہدہ پیکنگ پر دستخط ہوئے جس کی رو سے تینتسن کی بندرگاہ غیر ملکی تجارت کے لئے کھول دی گئی۔

ادھر تائی پنگ راہنماؤں کی لڑائی جاگیردارانہ نظام اور منچوریائی حکمرانوں کے خلاف ختم نہیں ہوئی تھی۔ اب اس تحریک کو ایک اور کسان راہنما سپہ سالار زو چینگ کی صورت میں میسر آیا جس کی کامیاب مدافعتی جنگی حکمت عملیوں نے انقلاب دشمن فوج کو بالآخر شکست دے کر نانکنگ کو بچایا تھا۔ اس کے دستے شنگھائی کی جانب بڑھے مگر انہیں شنگھائی فتح کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، لیکن راستے کے بہت سے چھوٹے شہر ان کے قبضے میں آ گئے۔ 1860ء سے 1862ء تک لی زو چینگ کی فوجوں نے بہت سی فتوحات حاصل کیں مگر تائی ریاست کو بذات خود بچانے کی ان میں سکت باقی نہ رہی تھی۔

1862ء کے بعد غیر ملکی طاقتیں بھی تائی پنگوں کے خلاف لڑائی میں شامل ہو گئیں۔ غیر ملکی طاقتوں کی مداخلت نے کسانوں کی اس بغاوت کے کچلنے اور تائی پنگ ریاست کا خاتمہ کرنے میں سہولت فراہم کی۔ 1863ء اور 1865ء کے درمیان سرکاری فوجوں نے تائی پنگ ریاست کے اہم قلعے فتح کر لئے۔ 1865ء میں نانکنگ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ آخر کار "آسمانی بادشاہ" ہونگ نے خودکشی کر لی اور 19 جولائی 1865ء کو نانکنگ فتح ہو گیا۔ لی زو چینگ جیسا بہادر سپہ سالار اس جنگ میں بڑی بے رحمی سے موت کی گھاٹ اتار دیا گیا۔ اگرچہ تائی پنگ دستوں نے منتشر ٹکڑیوں میں لڑائی جاری رکھی مگر اب اس بغاوت کے خرمن میں کوئی بڑی چنگاری باقی نہیں بچی تھی لہٰذا بالآخر یہ دب گئی۔

باکسروں کی بغاوت:

1899ء اور 1900ء میں چین میں مغربی طاقتوں اور جاپانی استعماریت کے خلاف عوامی ناراضگی کے نتیجے میں ایک بغاوت رونما ہوئی۔ اس کا بانی وہ فوجی گروہ تھا جسے باکسر کہتے تھے اس بغاوت کو برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، آسٹریا، روس، امریکا اور جاپان کی مشترکہ افواج نے کچل دیا تھا۔

چین پہلے مندرجہ بالا بیان کئے گئے حالات اور 1894ء میں چین و جاپان کے درمیان ہونے والی جنگ کی وجہ سے اپنی ہزاروں سالہ تاریخی عظمت کے باوجود بے بس سا ہو گیا تھا۔ انہیں دنوں اس کے تعلیم یافتہ طبقے میں ان حالات کے خلاف بڑا جوش پیدا ہوا ان لوگوں نے سمجھ لیا کہ جب جاپان موجودہ زمانے میں جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایک زبردست قوت بن سکتا ہے تو چین کیوں نہیں؟ چنانچہ اصلاحات کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ یورپی طاقتوں نے جا بجا حلقہ ہائے اثر قائم کر لئے تھے۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ ریلوں یا دوسرے صنعتی کارخانوں یا فوج کی تنظیم نو کے لئے ملک میں سرمایہ نہ تھا اور غیر ملکی سرمایہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ غیر ملکی اقتدار دائرہ زیادہ پھیلتا۔ جرمنی، روس اور فرانس نے جاپان سے کچھ جزیرے واپس کرا دیئے تھے اور تاوان کی رقم بڑھا دی تھی۔ اس سلسلے میں فرانس نے بہت سی مراعات حاصل کر لیں

1895ء میں فرانس اور روس نے چالیس کروڑ فرانک کا قرضہ چار فی صد سود پر چھتیس سال کے لئے دیا۔ چینی کسٹم کے محکمہ کو ضمانت کے طور پر گروی رکھا۔ اگلے سالوں میں انگریزوں اور جرمنوں نے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پاؤنڈ کا قرض پانچ فی صد سود پر دیا اور کسٹم سے وصول ہونے والی رقوم کو ضمانت کے طور پر رکھ لیا۔ غرض چین میں غیر ملکی اقتدار کا جال خوب بچھ گیا اور ہر غیر ملکی طاقت مزید اور زیادہ سے زیادہ مراعات کے حصول میں لگی ہوئی تھی۔ جرمنی نے کیاؤ چاؤ پر قبضہ کر لیا۔ 1899ء میں اٹلی نے بھی ایک بندرگاہ کا مطالبہ پیش کر دیا۔

مگر اب ملک میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف بڑا سخت جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ چان تنگ کے صوبے میں ایک قومی فوج تیار ہوئی جو غیر ملکی اقتدار کی سخت دشمن تھی۔ 1900 میں وہ بغاوت شروع ہوگئی جو چین کی تاریخ میں باکسروں کی بغاوت کہلاتی ہے۔ اس میں بعض غیر ملکی نمائندے بھی مارے گئے۔ بڑی مشکل سے بچاؤ کا انتظام کیا گیا اور اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مختلف غیر ملکی طاقتوں نے اپنی فوجیں چین پہنچا دیں۔ بغاوت جو ایسے محب وطن افراد نے شروع کی تھی جو اپنا فارغ وقت شمشیر زنی اور مکہ بازی میں گزارتے تھے۔ یہ بغاوت پیکنگ سے شروع ہو کر چین کے جنوبی علاقوں تک پھیل گئی۔ نانکنگ اور کینٹن میں امریکہ، فرانس اور جرمنی کے مشنریوں کو قتل کر دیا گیا۔ پھر باغیوں نے پیکنگ جانے والے راستوں پر قبضہ کر لیا اور غیر ملکی مشنریوں کے سر نیزوں پر لہرانے لگے۔

26 جون 1900ء کو امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ پیدل فوج کی دو رجمنٹ جنرل ایڈنا کی قیادت میں باکسروں کا مقابلہ کرنے کے لئے بھیج رہا ہے۔ ادھر اتحادی فوجوں نے بحریہ کے ایڈمرل سیمور کی زیر کمان تائن سن کے گرد گھیرا ڈال دیا جو پیکنگ جانے والے راستے پر ایک اہم شہر ہے۔ پہلے پہل اتحادی افواج کی پچاسی ہزار کی نفری بھی باکسروں کو شکست نہ دے سکی۔ بہر حال اس بغاوت پر قابو پا کر 1901ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ چین چالیس سال میں پینتالیس کروڑ تائل کی رقم مع سود بارہ طاقتوں کو ادا کرے۔ تجارتی محصولات پر نظر ثانی کی جائے اور مزید مراعات بھی دی جائیں۔

1911ء کا انقلاب چین:

پھر 1911ء میں چین کے اندر ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ یہ مانچو حکومت کے خلاف تھا۔ کیونکہ یہ حکومت سامراجی طاقتوں کے چین پر تسلط کو روکنے میں ناکام رہی تھی۔ اس انقلاب میں ایک عامل کارفرما تھا وہ تھا استعمار مغرب کے خلاف جنگ۔ اس لئے یہ تحریک مغرب کے خلاف تھی، یعنی مغربی حاکموں یا ان دیسی حاکموں کے خلاف جو قوم سے بغاوت کر کے مغرب کے کارندے بن گئے تھے۔

اکتوبر 1911ء میں حکومت کو معلوم ہو گیا کہ ہنکاؤ میں ایک انقلابی انجمن کا صدر قائم ہے۔ اس کے بعد انقلابیوں کے خلاف فوری کاروائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ 18 اکتوبر 1911ء کو یون شی کائی قومی اسمبلی کی طرف سے وزیر اعظم منتخب ہوا۔ اس نے انقلابیوں کے ساتھ صلح کر لی۔ انہیں دنوں سن یات سن کو یورپ سے آئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی، اسے نانکنگ کی عارضی انقلابی اسمبلی نے چین کا صدر منتخب کر لیا۔ فروری 1912ء میں نوجوان شاہ چین تاج و تخت سے دستبردار ہو گیا۔ یون شی کائی کو قومی اسمبلی نے جمہوری حکومت کا صدر چن لیا۔ سن یات سن نے اس خیال سے صدارت چھوڑ دی کہ ملک متحد رہے۔ ایک عارضی آئین بنایا گیا۔ جس کے مطابق دو ایوان تھے، لیکن یوشی کائی اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں مصروف

ہو گیا، اس وجہ سے اس کے خلاف کشمکش شروع ہو گئی..........

ڈاکٹر سن یات سن

سن یات سن 1866ء ۔ 1935ء چین کا نجات دہندہ اور جمہوریت کا بانی 1892ء میں ہانگ کانگ کے میڈیکل کالج کا پہلا گریجویٹ ۔ 1895ء میں انقلابی جماعت کے ساتھ شاہی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں قید کر لیا گیا مگر فرار ہو گیا ۔ 1895ء 1911ء انگلستان، امریکہ اور جاپان میں قیام رہا ۔ 1896ء میں انگلستان میں لندن کے چینی سفارت خانے نے اغواء کروایا واپسی پر 1911ء میں شہنشاہیت کے خلاف منظم انقلاب بپا کیا جو کامیاب رہا ۔ 1911ء میں عارضی طور پر چین کا صدر منتخب ہوا پھر 1912ء میں کینٹن کی نئی جمہوریہ کا صدر منتخب ہو گیا ۔

..........اس زمانے میں دو مختلف پارٹیاں خاص طور پر قابل ذکر تھیں ایک ترقی پسند پارٹی جو چاہتی تھی کہ نظم و نسق زیادہ سے زیادہ مستحکم رہے، دوسری ڈاکٹر سن یات سن کی قومی پارٹی (کومن تنگ) جو پارلیمانی نظام کی داعی تھی۔ 1913ء میں پارلیمنٹ کا انتخاب ہوا ۔ یون شی کائی نے محصول نمک کی ضمانت پر برطانیہ، فرانس، روس اور جاپان سے ڈھائی کروڑ پونڈ کی رقم قرض لی ۔ اس کی غرض یہ تھی کہ اس طرح اقتدار مستحکم ہو جائے گا ۔ مخالفوں نے اسے ملکی مفاد کے خلاف قرار دے کر دوسرے جوابی انقلاب کا سروسامان کر لیا ۔ یون شی کائی نے پارلیمنٹ کو قوم پرستوں یعنی کومن تنگ سے پاک کر دیا ۔ بیرونی منگولیا کی خود مختاری تسلیم کر لی ۔ مئی 1914ء میں یون شی کائی نے اپنے لئے آئندہ کے لئے دس سال تک برسر اقتدار رکھنے کا بندوبست کر لیا ۔ اور اپنے اختیارات بھی بہت بہت وسیع کر لئے ۔

1911ء کا چینی انقلاب ابتدا میں مقابلتاً خون ریزی سے پاک تھا ۔ منتخب اسمبلی اور یون شی کائی کے درمیان اقتدار کے لئے جو جنگ چھڑی تھی اس میں ڈاکٹر سن یات سن کی پارٹی نے شکست کھائی وہ اور اس کے ساتھی چین کو مغربی وضع کی پارلیمانی جمہوریت بنانے میں ناکام رہے، لیکن سن یات سن ایک قابل راہنما تھا، وہ جن خیالات کا حامی تھا انہیں چین میں جڑ پکڑنے کا موقع نہ مل سکا، مگر وہ بالکل ناپید بھی نہ ہو سکے ۔ چنانچہ ڈاکٹر سن یات کو چینی انقلاب کا اب بھی بڑا ہیرو تسلیم کیا جاتا ہے ۔ یون شی نے جو کچھ کیا وہ ایک اور فوجی مصلح آلیور کرام ویل سے ملتا ہے ۔ اسے دو طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اول "کومن تنگ" سے دوم، شاہ پرستوں سے ۔ اس حالت میں یون نے فیصلہ کیا کہ وہ قدیم چینی نمونے کی پیروی کرے گا ۔ چنانچہ اس نے مانچو خاندان کے بعد ایک نئے شاہی خاندان کی بنیاد رکھی لیکن اسکے خلاف بغاوت ہو گئی اور اسے اپنا منصوبہ ترک کرنا پڑا ۔ 1916ء میں جمہوریت از سر نو بنائی، مگر وزارت کی عنان فوج کے ہاتھ میں دے دی ۔ 6 جون 1916ء کو وفات پائی اور نئی جمہوریت کو ایک قدیم چینی سیاسی کشمکش میں چھوڑ گیا ۔ یعنی مرکزی ضبط و نظم محض برائے نام رہ گیا اور مختلف علاقوں میں طاقتور راہنماؤں نے اپنے اقتدار قائم کر لئے ۔ یوں صوبائی جنگی لارڈوں کا ایک نیا دور شروع ہوا

گیا۔

جاپان کی جارحیت:

1911 سے چین میں جو بحرانی کیفیت پیدا ہوئی تھی اس میں چین کو صرف نازک داخلی صورتحال کا سامنا نہیں تھا بلکہ ایک اور مصیبت یہ پیش آئی کہ جاپان نے جارحانہ اقدامات شروع کر دیئے۔ وہ مشرق بعید میں یورپی طاقتوں کے سامراجی مقاصد خود سنبھال رہا تھا جو ان دنوں باہم جنگ میں الجھی ہوئی تھی۔ 1915ء میں چین کو جاپان نے خفیہ اکیس مطالبات پیش کیے جن کا صاف لفظوں مطلب یہ تھا کہ چین جاپان کے زیر حمایت آ جائے اور ہر قسم کی مثبت مراعات جاپان کو دے دے۔ جمہوری چین ان دنوں اتنا کمزور تھا کہ چین نے مخلصی یا نجات کا یہ راستہ اختیار کیا کہ وسطی یورپ کی طاقتوں یعنی جرمنی، ترقی، آسٹریا، ہنگری کے خلاف اعلان جنگ کر دیا وجہ یہ تھی کہ اس طرح برطانیہ اور فرانس، امریکہ اسے اتحادی سمجھ کر اس کی جاپان سے حفاظت کریں گے۔

اگر جاپان کو یہ احساس ہوتا کہ وہ مغربیوں کے اعتراضات کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو وہ چین پر وسیع فوجی یورش کرتے اور مضبوطی سے قدم جما لیتے پھر انہیں ہٹایا بھی نہ جا سکتا۔ مگر انہوں نے صرف جزیرہ نما شان تنگ میں جرمنوں کی مراعات پر قبضہ کر لیا اور اسی کو اپنے لئے کافی سمجھا۔ جنگ کے بعد اتحادیوں نے اپنے رفیق جاپان کے عزائم کو روکنے کے لئے امریکہ کی راہنمائی میں قدم اٹھایا۔ واشنگٹن میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں جاپان کو مجبور کیا گیا کہ وہ چین کی آزادی کا احترام کرے۔ اسی عداوت کی وجہ سے جاپان نے انیس سال بعد امریکہ کی پرل ہاربر پر حملہ کیا تھا۔

......☆......

1914ء جنگ عظیم اول۔ اقوام مغرب کی سامراجی رقابتوں کے نتیجہ میں آنیوالا انقلاب زمانہ

28 جون 1914ء کو آرچ ڈیوک فرانس فرڈیننڈ ہیپسبرگ ولی عہد سلطنت آسٹریا، ہنگری اور اس کی بیوی کو سراجیو کے ایک بازار میں قتل کر دیا گیا۔ جو نئے الحاق شدہ صوبے بوسنیا کا دارالحکومت تھا۔ قاتل کا نام پرنپ تھا جو سربیا کا ایک قوم پرست تھا۔ بوسینیا پر صدیوں سے سربیا کی نظر تھی اور صوبے کے بہت سے باشندے چاہتے تھے کہ بوسینیا کا الحاق سربیا سے ہو جائے۔ آسٹریا، ہنگری کی حکومت نے سربیا کے قوم پرستوں کے عزائم سے خبردار ہو کر اور قتل کے اس واقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سربیا کی حکومت کو بڑا سخت الٹی میٹم بھیج دیا۔ سربیا نے یہ الٹی میٹم درخور اعتنا نہ سمجھا اور اسے ٹھکرا دیا۔ اس پر 28 جولائی کو آسٹریا نے سربیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ پھر ایک ہفتے کے اندر کے اندر یورپ کی تمام بڑی بڑی طاقتیں اس جنگ میں شامل ہو گئیں جو جنگ عظیم اول کہلائی۔

اعلان جنگ بظاہر اس لئے کیا گیا تھا کہ آسٹریا کے ولی عہد کو سربیا کے کسی شخص نے سراجیو میں قتل کر دیا لیکن حقیقتاً جنگ کا اعلان ایشائی تجارت پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اور تجارتی رسل و رسائل کی شاہراہوں پر قبضہ کرنے کے لئے خواہش کے سوا اس کی کچھ وجوہات نہ تھیں۔ چنانچہ ولی عہد کے قتل کو بہانہ بنا کر وہ جنگ چھیڑ دی گئی جو یورپی ممالک میں ناگزیر ہو چکی تھی وسطی یورپ کی طاقتیں (آسٹریا، ہنگری اور جرمنی) اتحادیوں (سربیا، روس، فرانس اور برطانیہ) کے خلاف تھیں۔ یا یوں کہیے کہ سربیا کے باشندے پرنپ کے ریوالور نے آخر کار تقریباً ایک کروڑ لوگوں کو موت کی گود میں اتار دیا۔

ترکی اپنے محل وقوع اور اپنی اندرونی حالت کی وجہ سے جرمن اور آسٹریا کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ لیکن خود ترکی کو ان منصوبوں اور عزائم کی خبر نہ تھی جو جرمنی اور آسٹریا کے نہاں خانہ دل میں چھپے ہوئے تھے حقیقت یہ ہے کہ بقول ڈکسن اس جنگ کا ایک بڑا سبب خود ترکی کی ایک وسیع و عریض سلطنت تھی جو غیر ترقی یافتہ، غیر منظم اور غیر محفوظ تھی جس پر قابو پانا اگر جرمنی اور آسٹریا کو اس جنگ میں فتح حاصل ہو گئی ہوتی تو ترکی کو معلوم ہوتا کہ اس کے حلیف اس سے کیا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ تو شاید ممکن ہو جاتا کہ سیورے قسم کا معاہدہ ترکی سے نہ کیا جاتا۔ مگر یہ ناممکن تھا کہ ترکی کی وسیع و عریض سلطنت

آسٹریا اور جرمنی ہاتھ صاف نہ کرتے۔ حقیقت یہ تھی کہ ترکی کے حلیفوں کی فتح کے بعد ترکی کی وہی حالت کی جاتی جو اتحادیوں نے کی تھی۔ فرق صرف یہ ہوتا کہ ٹرکی تب یہ کہہ سکتا تھا دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔

جنگ سے پہلے کی دنیا:

1914ء سے پہلے یورپ کی حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ تمام قومیں تھیں جو دوسری اقوام کے زیرنگیں تھیں اور اپنی آزادی اور خودمختاری قائم کرنے کے لئے مضطرب تھیں۔ دوسری طرف حکمران اقوام اپنے ممالک کی معاشی حالت سدھارنے اور امن وامان کی فضا پیدا کرنے کے لئے نئی تجارتی منڈیوں کی شدید ضرورت محسوس کر رہی تھیں۔ مگر تجارتی منڈیوں کے اس مسئلے میں انگلستان اور فرانس کے بعد کم اقوام ایسی تھیں جو خود کو خوش نصیب کہہ سکتی تھیں۔ آسٹریا ہنگری ایک وسیع سلطنت تھی جس کی حدود میں مختلف اقوام اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے پانچ کروڑ افراد بستے تھے مگر اس سلطنت کے پاس ایک بھی نوآبادی نہیں تھی، جہاں سے وہ کچا مال خرید کر اپنی صنعت وحرفت کو ترقی دے سکتی۔ جرمنی کے پاس کچھ نوآبادیاں ضرور تھیں مگر ان تک پہنچنے کے راستے پر اس کا مطلق اختیار نہ تھا۔ بحرروم کے اہم ترین ناکے جبرالٹر یا جبل الطارق سے لے کر مالٹا، نہر سویز، عدن، خلیج فارس، سنگاپور اور ہانگ کانگ تک کا راستہ انگریزی اقتدار میں تھا۔ ادھر نئی دنیا امریکہ میں بھی انگلستان اور فرانس کے بعد جمہوریہ امریکہ نے قبضہ جما رکھا تھا۔ روس کی بھی یہ کیفیت تھی جس کے نتیجے میں وہاں زبردست بے چینی پھیل رہی تھی اور زار روس کے لئے اپنی شہنشاہی برقرار رکھنے کا صرف یہی طریقہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنی سامراجیت سے ترکی ایران اور چین کے ساحلوں تک، اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کر دے۔ ادھر ان ممالک کی اندرونی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ ہر طاقتور قوم انہیں ''لوٹ کا مال'' سمجھ رہی تھی۔ سلطان ترکی ایک مطلق العنان حکمران تھا، لیکن یورپ کی تمام تجارتی منڈیوں پر یورپ کے سرمایہ داروں نے تسلط جمایا ہوا تھا۔ سلطنت عثمانیہ میں جتنی اشیاء پیدا ہوتی تھیں ان سب کے ٹھیکے یورپیوں نے لے رکھے تھے۔ سکے اور زرتبادلہ کی پوری مشنری بھی یورپی مہمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ جتنے بڑے بڑے بینک تھے ان سب پر یورپ کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ تمام کچا مال یورپ جاتا تھا اور وہاں سے نئی شکلوں میں تبدیل ہو کر پھر ترکوں اور عربوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا تھا۔ خود سلطنت ترکی میں صنعتی ترقی اور کارخانے مفقود تھے اور جو تھے وہ یورپی سرمایہ کاری سے قائم تھے۔ ان حالات کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے طول وعرض میں انتشار اور پراگندگی پھیلی ہوئی تھی۔ عوام میں حکومت کو بہتر بنانے کی تحریکیں بھی کام کر رہی تھیں لیکن ملک کی تعلیمی وذہنی سطح بلند نہ کی جا سکی تھی۔ ادھر ترکی کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے یورپی مقبوضات میں یورپ کے طاقتوں کے اشاروں پر انقلاب برپا تھے۔ شمالی افریقہ کے علاقوں پر بھی یورپی اقوام قبضہ کر چکی تھیں یا کرتی جا رہی تھیں۔ یورپی مفکر اس وجہ سے ترکی کو یورپ کا ''مرد بیمار'' کہتے تھے۔ بقول علامہ شبلی

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک

پھر یورپ کے وسطی اور مشرقی علاقوں میں بھی ایسی اقوام آباد تھیں جو کہ مختلف یورپی سلطنتوں کے زیر اقتدار تھیں اور چاہتی تھیں کہ وہ آزاد ہو کر اپنی خود مختار حکومتیں قائم کریں۔

بغداد برلن ریلوے:

یورپ کے حالات کا تقاضا تھا کہ یا تو حکومتیں اپنے عوام کی معاشی حالت درست کر کے انہیں مطمئن کر دیں یا پھر انقلاب کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اسی صورت حال سے بچنے کے لئے جرمنی نے مشرق وسطی کے دل بغداد تک ایک نیا راستہ نکالنے کی کوشش کی تا کہ ایشیاء کی تجارت کا راستہ جرمنی پر کھل جائے۔ 1899ء میں سلطان ترکی نے برلن تا بغداد ریلوے لائن بچھانے کی اجازت اور باقاعدہ منظوری دی۔ جس کے بعد جرمنی نے وسیع پیمانے پر ریلوے لائن بچھانے کا کام شروع کر دیا۔ جرمنی کا یہ منصوبہ برطانیہ کو ایک آنکھ نہ بھایا، کیونکہ اگر یہ تجارتی راستہ جرمنی پر کھل جاتا تو جرمنی کی مصنوعات چند گھنٹوں میں بغداد سے خلیج فارس تک پہنچ سکتی تھیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ نہ صرف بلادِ عرب اور ترکی کی تجارتی منڈیاں جرمنی کے زیر اثر آ جاتیں بلکہ ایران سے لے کر ہندوستان تک بھی اسے رسائی حاصل ہو جاتی۔ پھر چونکہ تجارتی معاشی کامیابیاں اپنے ساتھ سیاسی امنگیں بھی لاتی ہیں اس لیے کچھ عجب نہ تھا کہ کل جرمنی ان ایشیائی علاقوں پر غلبہ حاصل کر کے مشرق میں برطانوی آفتاب اقتدار کو گہنا دے۔

ادھر جرمنی اور فرانس کی سرحدیں ایسی غیر قدرتی اور غیر محفوظ واقع ہوئی تھیں کہ دونوں ممالک کو ہمیشہ ایک دوسرے سے خطرہ لگا رہتا تھا اس لئے فرانس بھی جرمنی کی برتری کو شبے کی نظر سے دیکھتا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے جرمنی میں نسلی برتری کا جذبہ بہت عام ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں کے دانشمند جرمن نسل کو برگزیدہ اور برتر ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے اور جرمن تمدن کو تمام تمدن سے برتر بتا رہے تھے۔ جرمنی نے اپنی برتری کا اعلان کچھ اس طرح کیا کہ تمام دیگر یورپی طاقتیں ٹھٹک کر رہ گئیں ان میں فرانس بھی شامل تھا ایسے میں وہ ایشاء کے دل تک جرمنی کو ریلوے لائن کیسے بچھانے دے سکتے تھے۔

جنگ عظیم اول کے خارجی محرکات:

جنگ عظیم اول کے داخلی محرکات تو وہی تھے جو اس سے پہلے ہونے والی جنگوں کے ہوتے تھے مگر اس کے خارجی محرکات کی نوعیت مختلف تھی۔ بجلی اور بھاپ کی طاقت نے انسانی حوصلوں اور امنگوں کو دنیا میں جو نئی چمک پیدا کر دی تھی اس کی وجہ سے قابلیت کی نگاہیں اب کسی ایک محدود خطے کی بجائے پوری دنیا پر اٹھ رہی تھیں۔ 1914ء میں جنگ کے خارجی محرکات میں سب سے پہلا محرک مراکش کے واقعہ کو سمجھا جاتا ہے۔ افریقہ کا یہ ملک اس وقت تمام یورپی ممالک کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

1۔ جبل الطارق کے عین سامنے ہونے کی وجہ سے یہ بحیرۂ روم کے راستے میں مداخلت کر سکتا تھا۔
2۔ اس کا ساحل چونکہ بحر روم کے علاوہ بحر اوقیانوس پر بھی واقع ہے اس لئے برطانیہ سے جنوبی افریقہ کے بحری راستے پر جہازوں کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔
3۔ مراکش میں بسنے والے انسانوں کو فوج میں بھرتی کر کے انسانی طاقت ارزانیت سے حاصل کی جا سکتی تھی۔

4- اس کی شرقی سرحد الجزائر سے ملتی ہے جو 1837ء سے فرانس کے زیر اثر تھا۔ اس لئے فرانس مراکش میں ہر قسم کی مداخلت کر سکتا تھا۔

5- اس ملک میں خام لوہا بڑی مقدار میں پایا جاتا تھا جو موجودہ مشینی عہد میں سب سے قیمتی خام مال تھا۔

ان عوامل کو سامنے رکھ کر برطانیہ چاہتا تھا کہ مراکش اس کے قبضے میں آ جائے۔ دوسری طرف فرانس بھی کچھ ایسی ہی خواہشات رکھتا تھا۔ فرانس کے وزیر خارجہ نے 1898ء میں مراکش پر قبضہ کرنے کی مکمل حکمت عملی ترتیب دی اور اس مقصد کے لئے سپین اور انگلستان سے معاہدے کئے۔ جب یہ سامراجی رقابت بڑھی تو فرانس اور برطانیہ میں طے پایا کہ اگر فرانس انگلستان کو مصر پر قبضہ کرنے دے تو وہ فرانس کے مراکش ہتھیانے کے منصوبے میں مزاحم نہ ہوگا، لیکن بظاہر دونوں عیار یورپی قوموں نے مراکش کی آزادی کا احترام کرنے کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ لیکن خفیہ طور پر دونوں ممالک پر امن قبضہ کرنے کی تدبیروں پر عمل پیرا ہو گئے۔ جرمنی نے اس سازش کو بھانپ لیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ فرانس مراکش کو ہڑپ کرنے کے درپے ہے تو وہ چراغ پا ہوا۔ فرانس نے جرمنی کی مخالفت کو ختم کرنے کے لئے اس پر بھی ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ آخر دونوں قوموں میں معاہدہ ہوا کہ مراکش کی ''مدد'' مشترکہ طور پر کی جائے، لیکن یہ معاہدہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور آخر 1909ء میں فرانس اور جرمنی کے درمیان مراکش کے سوال پر جھڑپ ہو گئی۔ 1910ء میں بظاہر یہ اختلافات دور ہو گئے مگر دل کی کدورت دور نہ ہو سکی اور آخر 1914ء میں ابھر کر سامنے آ گئی۔

تیونس اور طرابلس:

مراکش کے بعد جنگ کا دوسرا خارجی سبب تیونس اور طرابلس تھے، تیونس پر انگریز کے اشارے پر فرانس نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنا اثر قائم کر لیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ طرابلس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اٹلی اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔ اٹلی نے فرانس کا مقابلہ کرنے کے لئے جرمنی سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر مراکش یا طرابلس پر فرانس نے قبضے کی کوشش کی تو جرمنی اور اٹلی دونوں مل کر فرانس کا مقابلہ کریں گے اور جرمن فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرنے سے بھی نہیں چوکیں گے۔

اس کے علاوہ اٹلی نے برطانیہ سے ایک خفیہ معاہدہ کیا کہ اگر اٹلی طرابلس میں مداخلت کرے اور برطانیہ خاموش رہے تو اٹلی بھی مصر میں برطانوی مداخلت پر خاموش رہے گا۔ اس قسم کا معاہدہ اٹلی اور فرانس میں مراکش کے معاملے پر ہوا۔ اپنے طاقتور ہمسائیوں سے مطمئن ہوتے ہی 1911ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ طرابلس سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا، مگر ''مرد بیمار'' اپنی سلطنت کے دفاع کے قابل نہیں تھا اور تھوڑی سے کوشش کے بعد طرابلس پر اطالوی پرچم لہرانے لگا اور ترکوں کو شکست ہو گئی۔ لیکن جرمنی، آسٹریا ہنگری اور روس کو بھی اٹلی کا طرابلس پر قبضہ پسند نہ آیا اور رقابت کی آگ اندر ہی اندر سلگنے لگی۔

ریاست ہائے بلقان:

اگرچہ بلقان کے علاقے کا رقبہ کچھ زیادہ نہیں لیکن دنیا کی تاریخ میں اسکی اہمیت اس کے رقبے سے زیادہ رہی ہے۔ یہاں ایک طرف تو مختلف اقوام برسر پیکار رہی ہیں، اور دوسری طرف قریب کی طاقتور قومیں اس کمزوری اور انتشار کا فائدہ

اٹھانے کے لئے بے قرار تھیں۔ 1914ء میں تین بڑی سلطنتوں کی نگاہیں بلقان کی ریاستوں کی طرف تھیں۔ ایک روس دوسرا ترکی اور تیسرا آسٹریا ہنگری۔ 1914ء کی جنگ سے پہلے فرانس، روس، جرمنی اور آسٹریا ہنگری اور ترکی میں اس علاقے کو زیر اثر لانے کے لئے رقابتیں انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ اس رقابت میں روس اور آسٹریا ہنگری سب سے آگے تھے کہ تجارتی مقابلے کے لئے ان دونوں ممالک کے پاس کوئی سمندری ساحل نہ تھا اس لئے بلقان کے کسی حصے پر قبضہ کر کے اس مشکل کو حل کرنا ان کی اقتصادیات کے لئے ناگزیر بن گیا تھا اس اقتصادی مفاد نے روس اور آسٹریا ہنگری کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا تھا۔ دونوں اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے اور دونوں کے باہمی تعلقات روز بروز خراب ہوتے چلے گئے۔ 1878ء میں موقع پا کر بوسنیا ہرزیگووینا پر حملہ کر دیا تھا۔ چونکہ اس صوبے میں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد تھی اس لئے آسٹریا کا یہ قدم مقدس جنگ قرار پایا مگر پھر بھی روس کو اس کی یہ فتح ناگوار گزری۔ سربیا بھی آگ بگولا ہو گیا قریب تھا کہ ایک اور جنگ چھڑ جائے کہ انگلستان نے بیچ بچاؤ کرا دیا مگر رقابت کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہیں اور جنگی تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔

ایران:

براؤن نے کہا تھا کہ جب تک ایران کے ساحلوں پر بحر ہند کا پانی ٹکراتا رہے گا اس وقت تک روس اپنی ترقی کے لئے اس پر قبضے کے لئے کوشاں رہے گا۔ یہ وجہ تھی کہ بغداد ریلوے سے روس نالاں تھا مگر جرمنی نے فوراً ہی روس سے ایک معاہدہ کر کے شمالی ایران میں روسی مداخلت کو تسلیم کر لیا اور وعدہ کیا کہ جرمنی کبھی اس امر کی کوشش نہیں کرے گا کہ ایران سے تجارتی رابطے استوار کرے، نیز روس کو یہ حق دیا گیا کہ وہ تہران سے خانقین تک ریلوے لائن بچھا لے اور اپنی تجارتی سرگرمیاں ایران تک وسیع کرے۔ اس معاہدے سے روس تو مطمئن ہو گیا مگر برطانیہ کی تشویش ہندوستان میں مداخلت کے خطرے کی وجہ سے بڑھ کر جنگ پر منتج ہوئی۔

چین میں پرامن مداخلت:

کمزور ممالک پر قبضہ کرنے کے لئے یورپ کے صنعتی ممالک نے عسکری حملوں کی جگہ ''پرامن مداخلت'' کی حکمت عملی وضع کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ریلوے، ڈاک خانہ، تار گھر اور بینک وغیرہ کے سلسلے میں کسی ملک میں قدم جمائے جائیں۔ پھر ان تنصیبات کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی فوج رکھنے کی اجازت حاصل کر کے رفتہ رفتہ اس ملک کو اقتصادی جال میں اس طرح پھانس لیا جائے کہ جس طرح قرض دینے والا ساہوکار اپنے قرض دار کو سود کے جال میں پھانس لیتا ہے اور خاموشی سے اس کی ساری دولت پر قابض ہو جاتا ہے۔ یورپی سامراجیت کی اس پرامن مداخلت کے سبب سے بڑا شکار اسلامیہ کے بعد چین تھا، مگر مختلف طاقتوں کے مفادات کی موجودگی میں یہاں بھی مراکش جیسے حالات پیدا ہو گئے اور باہمی رقابتیں بڑھ گئیں اور 1914ء میں آتش جنگ کے لئے ایندھن بن گئیں۔

خفیہ معاہدے:

خفیہ معاہدوں کا رواج یوں تو بہت پرانا ہے لیکن 1870ء کے بعد جب فرانس میں جمہوریت کو استقلال نصیب ہوا تو

سلطنتوں کی مصیبت بلائے بے درماں کی طرح ٹوٹ پڑی مگر 1870ء کے بعد جو عالمی تقسیم عمل میں آئی اس سے کوئی بھی مطمئن نہ تھا۔ لیکن کسی ملک میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ تلوار کے زور پر اپنے مطالبات منوا سکے۔ جس کی وجہ سے قومی گروہ بندی کی فضا تیزی سے پھیلنے لگی اور ہر قوم دوسری اقوام سے خفیہ سرگوشیوں میں مصروف ہوگئی۔ رفتہ رفتہ خفیہ معاہدوں کا ایک جال پھیل گیا جس میں اقوام عالم بالآخر الجھ کر رہ گئیں۔........ چنانچہ جولائی 1914ء میں ولی عہد فرڈیننڈ کے قتل پر لاوا جو اندر ہی اندر پک چکا تھا پھٹ پڑا اور اگلے چار سال تک دنیا اضطراب اور بے چینی کے عالم میں خوفناک گرداب میں ہلتی رہی۔ 1914ء کے موسم گرما کے آخر تک اتحادی طاقتیں، وسطی طاقتوں کے خلاف ایک عام جنگ میں الجھ چکی تھیں۔

مغربی محاذ:

مغربی محاذ پر جرمنی نے بیلجیم پر قبضہ کرلیا اور پیرس کی طرف پیش قدمی کی۔ مارن MARNE پہلی جنگ اور ایپرے YPRES کی پہلی لڑائی کے بعد تعطل سا رہا اور تین سال تک خندقوں میں شدید لڑائی رہی۔

مشرقی محاذ:

مشرقی محاذ پر جرمنوں نے ہنڈن برگ جیسے جرنیلوں کی قیادت میں روسیوں کو ٹائن برگ اور ماموری جھیلوں کے پاس شکست دی (اگست ستمبر 1914ء) روسیوں کا جوابی حملہ ناکام رہا (1916ء) 1917ء کے انقلاب روس نے روس کی رہی سہی عسکری اہمیت ختم کردی۔ بلغاریہ وسطی طاقتوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ سربیا اور مونٹی نیگرو ستمبر 1915ء کے آخر تک مسخر ہوگئے۔ ترکی کے خلاف اتحادیوں کی مہم گیلی پولی (1915) کی ناکامی کے بعد اٹلی اتحادیوں سے مل گیا لیکن اطالوی جنگ غیر فیصلہ کن رہی یہاں تک کہ اٹلی نے کاپوریٹو CAPORETTO میں شکست 1917 کھائی۔ اس کی تلافی 1918ء میں ویٹوریو وینٹس VITTORIO VENETS کی فتح سے ہوئی وردون VERDUN کی لڑائی اور سوم SOMME کے جارحانہ حملے میں شدید جانی نقصان ہوئے (1916ء) لیکن مغربی محاذ پر کوئی بڑی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ 1916ء میں پرتگال اور رومانیہ اتحادیوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔ یونان نے سالونیکا کی مہموں میں الجھ کر 1917ء میں وسطی طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ لوسی تانیا نامی بحری جہاز کی غرقابی سے (1915) ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی غیر جانب داری خطرے میں پڑ گئی تھی جٹ لینڈ کی غیر مطمئن کن جنگ کے بعد جرمن بحری بیڑا پابند مقام رہا مگر جرمن آبدوزوں نے بڑی سرگرمی دکھائی جس کی وجہ سے 1916ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جرمنی سے سفارتی تعلقات توڑ لیے اور اس کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کردیا۔ (1917ء) جنرل پرشنگ کی قیادت میں امریکی فوج فرانس میں اتری لیکن شناتو تیری CHATEAUTHIERRY کی جنگ تک (جون 1918ء) اس نے کسی اہم لڑائی میں حصہ نہ لیا۔ ٹی ای لارنس نے ترکوں کے خلاف عربوں میں بغاوت کی آگ بڑھکائی۔ بغداد اور یروشلم 1917ء میں فتح ہوئے اپریل 1918ء میں جنرل فوش FOCH کی زیر قیادت متحدہ اتحادی زیر کمان قائم ہوئی۔ مارچ 1918ء میں وسطی طاقتوں نے اوس کے ساتھ عہد نامہ بریسٹ لٹوفیسک طے کیا۔ مارن کی دوسری لڑائی میں جرمنوں کو پیرس کے قریب ہی روک لیا گیا۔ اتحادی جواب کامیاب رہا۔ بلغاریہ، ترکی، آسٹری ہنگری نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جرمنی میں بغاوت پھوٹ پڑنے کے بعد بمقام کومپی لینیہ COMPIEGNE متارکہ جنگ پر دستخط ہوئے (11 نومبر 1918) جنگ کے بعد معاہدوں ورسائی سائی زرمین،

ٹری آنون نیلی NEULLY اور سیورے کے معاہدوں نے یورپ کا حلیہ بالکل بدل ڈالا جمہوریہ امریکہ کے صدر ولسن نے جنوری 1918ء میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیے تھے جن میں مقاصد جنگ کا اعلان کیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے جانی نقصانات کا سرسری اندازہ لگایا گیا تھا کہ کم و بیش ایک کروڑ انسان مارے گئے اور تقریباً دو کروڑ زخمی ہوئے۔ مالی نقصان کا اندازہ ایک کھرب اسی ارب اور پچاس کروڑ ڈالر براہ راست خرچ ہوئے۔ بالواسطہ خرچ کی مقدار ایک کھرب اکانوے ارب اکسٹھ کروڑ پچیس لاکھ ڈالر تھی۔

اقوام عالم کی جدید حد بندی۔ جنگ عظیم اول کے نتائج

عہد نامہ ہائے صلح:

جنگ ختم ہوتے ہی پیرس میں صلح کی کانفرنس کے لئے تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں۔ چنانچہ 18 جنوری 1919ء کو 27 فاتح حکومتوں کی طرف سے کوئی 70 نمائندے پیرس پہنچ گئے جرمنی اور دوسرے تمام متحارب ملکوں نے امریکہ کے صدر ولسن کے چودہ نکات کی بنیاد پر صلح کی درخواست کی تھی اور اتحادیوں نے نومبر 1918ء میں انہیں نکات کی بنیاد پر متارکہ جنگ کی منظوری دی تھی۔ صرف دو باتوں میں تحفظ کا انتظام کیا گیا تھا، مگر صلح کی کانفرنس شروع ہوئی تو ولسن کے چودہ نکات کو نظر انداز کر دیا گیا اور نمائندوں نے اپنے اپنے مفادات کے لئے باہم لڑنا شروع کر دیا۔ ولسن وسط دسمبر 1918ء میں یورپ پہنچا تو اس کا ایسا پر جوش استقبال کیا گیا کہ سب نے سمجھا دنیا میں ایک نئی زندگی کا دور شروع ہو گیا ہے اقوام کی جمعیت بن جائے گی جو تمام چھوٹے بڑے معاملات کا فیصلہ کرے گی، لیکن یہ خوشگوار احساس زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، اسلئے کہ جنگ میں مختلف ملکوں کو جو نقصان پہنچ چکے تھے ان کے زخم ابھی تازہ تھے اور ہر ایک کے دل میں جوش بھرا ہوا تھا کہ جرمنوں اور ان کے ساتھیوں سے سخت بدلہ لیا جائے اس میں کمی نہ کی جائے۔ شکست خوردہ اقوام کو صلح کے ان مذاکرات میں حصہ نہ دیا جائے۔

پیرس کی مجلس صلح نے تقریباً وہی راستہ اختیار کیا جس پر تقریباً ایک سو سال پیشتر وہی آنا کی مجلس صلح نپولین بوناپارٹ کی جنگوں پر کر چکی تھی۔ صدر ولسن اور اس کے ماہرین بھی آخر تنگ آ کر سخت تر شرائط صلح پر آمادہ ہو گئے۔ جرمنی کے خلاف تاوان کا مسودہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔

عہد نامہ ورسیلز:

بہر حال جرمنی کے ساتھ جو صلح نامہ ہوا تھا اس پر ورسیلز یا ورسائی کے شیش محل میں دستخط ہوئے تھے۔ لہذا یہ معاہدہ ورسلیز کے نام سے مشہور ہے۔ اسکے مندرجات یہ ہیں۔

1۔ السابس اور لورین کے علاقے فرانس کو دیئے جائیں گے۔ اس طرح کچھ علاقہ بلجیم کے حوالے کیا جائے گا

2- سار کا علاقہ پندرہ سال تک بین الاقوامی انتظام میں رہے گا۔ اس اثناء میں وہاں کی کانوں سے کوئلہ فرانس نکالے گا۔
پندرہ سال بعد وہاں رائے عامہ لی جائے گی اور اس کے مطابق فیصلہ ہو گیا۔

3- شمالی اور وسطی شلیسوگ کا فیصلہ رائے عامہ سے کیا جائے گا۔

4- مشرق میں پوزین اور مغربی پروشیا کا علاقہ پولینڈ کو دے دیا جائے گا۔

5- جرمنی جنگ کی ذمہ داری قبول کرے۔

6- جرمنی نوآبادیاں اتحادیوں کے حوالے کر دی جائیں اور جمعیت اقوام کی نگرانی میں حکمداریاں قائم کی جائیں۔

7- آئندہ جرمنی کی فوج ایک لاکھ سے زیادہ نہ ہو۔ اسے بھاری توپوں کی اجازت نہ ہوگی۔

8- جرمن بحریہ میں صرف چھ جنگی جہاز ہوں گے اور انہیں کے مطابق باقی جہاز رکھے جائیں گے۔ لیکن اسے آبدوزیں اور ہوائی جہاز رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

9- رائن لینڈ کا علاقہ پندرہ سال کے لئے اتحادیوں کے قبضے میں رہے گا

10- نہر کیل تمام اقوام کے جنگی اور تجارتی جہازوں کے لئے کھلی رہے گی۔

11- شہنشاہ جرمن اور دوسرے مجرموں کے خلاف مقدمے چلائے جائیں گے۔

12- جرمنی غیر مصافی آبادی کے تمام نقصانات پورے کرے گا۔

13- جرمنی اپنے تجارتی جہازوں اور ماہی گیری کشتیوں میں سے نصف سے زائد اتحادیوں کے حوالے کر دے گا اور اگلے پانچ سال تک 2 لاکھ ٹن وزن کے جہاز اتحادیوں کے لئے تیار کرے گا۔

14- جرمنی کی کوئلہ کی کانوں سے کوئلے کی بڑی مقدار فرانس، بیلجیم اور اٹلی کو دس سال تک دیتا رہے گا اور جو فوجیں عارضی طور پر جرمنی میں رہیں ان کا خرچ بھی جرمنی ادا کرے گا۔

15- جرمنی کی جو جائیدادیں اتحادی ملکوں میں ہیں اسے بیچنے کا اختیار اتحادیوں کو دیا جائے

حکومت جرمنی کے نمائندے نے احتجاج کرتے ہوئے اس عہد نامے پر 28 جون 1919ء کو دستخط کر دیئے۔ امریکہ نے اس میں ترامیم پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ لہذا اس نے اصل معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اسی طرح آسٹریا ہنگری سے جو عہد نامہ طے پایا وہ صلح نامہ سینٹ جرمن ST.GERMAIN کہلاتا ہے۔ آسٹریا کے شاہی خاندان کو معزول کر دیا گیا اور شاہی کی بجائے جمہوریت رائج کی گئی۔ آسٹریا اور ہنگری کی حکومتیں الگ الگ کر دی گئیں۔ کچھ علاقے کاٹ کر دوسری حکومتوں کو دے دیئے گئے۔ آسٹریا نے 11 اکتوبر 1919ء کو صلح نامہ سینٹ جرمن پر دستخط کر دیئے۔ اس عہد نامہ کی رو سے آسٹریا کو پابند کر دیا گیا کہ اگرچہ اس کی 97 فی صد آبادی جرمن ہیں مگر وہ جرمن قوم سے اتحاد نہیں کر سکتا اس کے بعد ایسے ہی صلح نامے 1920ء میں ہنگری کے ساتھ ہوئے۔ ہنگری کو خبردار کیا گیا کہ وہ نہ آسٹریا سے کسی قسم کا ناطہ جوڑ سکتا ہے اور نہ ہیپسبرگ خاندان کو تخت نشین کر سکتا ہے۔

ترکی کا خاتمہ:-

ترکی کے ساتھ معاہدہ سیورے مرتب کیا گیا اس معاہدے کی رو سے ایشائے کوچک کے سوا باقی تمام علاقے سلطنت

عثمانیہ سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ اور ایشیائے کوچک کی تقسیم یوں کی گئی کہ شمال میں بحر اسود کا ساحلی علاقہ اتحادیوں کے ایک کمیشن کے سپرد کیا گیا۔ مغرب میں سمرنا اور سمرنا کے گرد کا وسیع علاقہ یونانیوں کو دے دیا گیا۔ اور جنوبی ساحل پر ادالیہ کے چاروں طرف کا زرخیز خطہ اٹلی کو دے دیا گیا۔ قسطنطنیہ جو ترکی کا دارالحکومت خاص تھا۔ اسے چاروں طرف سے اتحادیوں کے زیر کمیشن علاقوں سے گھیر دیا گیا اور تھریس کا پورا علاقہ یونان میں شامل کر دیا گیا۔ اسکے بعد جو چٹیل میدان بچے وہ سلطنت عثمانیہ کے حوالے کر دیئے گئے کہ بھیڑ بکریاں چراؤ اور زندگی کے دن کاٹو۔

بلادِ عرب کی تقسیم:

عرب کا مسئلہ کچھ یوں طے کیا گیا کہ عراق اور مصر برطانیہ کے زیر اثر، شام فرانس کے زیر اثر اور فلسطین کا ٹکڑا شام سے الگ کر دیا گیا اور اسے برطانیہ کے تحت کر دیا گیا۔ اسے دنیا بھر کے اہل یہود کا وطن بنانا مقصود پایا۔ حجاز کی ساحلی پٹی پر شریف حسین مکہ کو سلطان بنایا گیا۔ وسط عرب اور نجد کا علاقہ بدستور ابن سعود کے پاس تسلیم کر لیا گیا اور عرب کے مشرقی ساحل پر عمان اور کویت کے علاقے برطانیہ کے زیر اثر کر دیئے گئے۔

یورپ کا نیا نقشہ اور تغیرات:

یورپ کی قومیں تقسیم یوں کی گئیں کہ مغربی ساحل پر روس کے جو صوبے تھے انہیں چار آزاد ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک فن لینڈ دوسری اسٹونیا، تیسری لٹویا اور چوتھی لتھوانیا۔ ان چاروں ریاستوں کے علاوہ بہت سا علاقہ روس سے اور کچھ جرمن سے لے کر پولینڈ کے نام سے الگ پانچویں آزاد مملکت قائم کر دی گئی۔ آسٹری ہنگری کی سابق سلطنت کو دو ٹکڑوں میں منقسم کر کے اس سے چون ہزار مربع میل کا علاقہ الگ کر کے چیکوسلواکیہ کے نام سے جداگانہ مملکت بنا دی گئی۔ یہ چھ مملکتیں تو بالکل نئی یورپ کے نقشے پر ابھر آئیں اور ان میں اگر خود آسٹریا اور ہنگری کو بھی شامل کر لیا جائے تو نئی حکومتوں کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ رومانیہ سابق ریاست کو آسٹریا ہنگری اور بلغاریہ، روس کا اتنا علاقہ دیا گیا کہ اس کی وسعت دوگنا ہو گئی رومانیہ کے علاوہ سربیا کی سابق سلطنت کو بھی آسٹریا ہنگری کے کچھ صوبے دئے گئے اور مانٹی نیگرو کی سابقہ آزاد ریاست بھی اس میں ضم کر دی گئی۔ اس طرح یوگوسلاویہ کے نام سے ایک اور نئی ریاست قائم ہوئی اسکے علاوہ بلغاریہ کا کچھ علاقہ یونان کو بھی دیا گیا۔

دو، تین سال کی محنت شاقہ کے بعد آج کل کے امریکی "ورلڈ آرڈر" کی طرح سے دنیا کا بالکل نیا نقشہ تیار کیا گیا تھا۔ یعنی جنگ کے اختتام 1918ء سے لے کر 1920-21ء تک۔ لیکن فاتح اقوام کا بنایا ہوا یہ نقشہ دنیا قبول نہ کر سکی اور ابھی صلح ناموں کی روشنائی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ اس تقسیم کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا جانے لگا۔

امریکی صدر ولسن نے جو چودہ نکات پیش کئے تھے جلد ہی ان کی ناکامی کا احساس ہو گیا تھا تاہم شروع میں صدر موصوف کا خیال تھا کہ رفتہ رفتہ حالات کی اصلاح ہو جائے گی۔ مگر آنے والے حالات و واقعات نے ان کا یہ حسن ظن غلط ثابت کر دیا جس سے صدر موصوف سیاست سے بہت برگشتہ خاطر ہوئے اور آخر عمر میں تو بالکل ہی ملول و رنجیدہ خاطر نظر آنے لگے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک انگریز مورخ ڈکسن نے جنگ کے محرکات و نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

بجوان اللہ ! کیا دنیا میں جمہوریت کو محفوظ کیا گیا ہے۔ کیا حریت و آزادی کو فتح نصیب ہوئی ہے۔ کیا انصاف کی جیت ہوئی ہے اور کیا کمزور اقوام کے حقوق کی حفاظت کی گئی ہے۔

عہد نامہ سیورے:

مندرجہ بالا بے انصافیوں کی منہ بولتی تصویر ترکی کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ سیورے تھا۔ جس کی رو سے اتحادی قسطنطنیہ پر بھی قابض ہو چکے تھے اسی اثنا میں روس کی کیمونسٹ حکومت نے ایک قرطاس ابیض میں اتحادیوں کے خفیہ معاہدے شائع کر دیے جن سے جنگ سے پہلے کے یورپی عزائم بے نقاب ہو گئے۔ ان خفیہ معاہدوں میں ترکی کے حصے بخرے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور خود کیمونسٹوں یا بالشویکوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ سے دست بردار ہوتے ہیں، نیز آبناؤں اور آرمینیا کے متعلق امریکہ نے کوئی بھی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اتحادیوں نے یونانیوں کو اکسایا اور انہوں نے 15 مئی 1919ء کو سمرنا میں فوج اتار دی، ساتھ ہی اطالوی فوج جنوبی و مغربی اناطولیہ میں پہنچ گئی۔ 18 اپریل 1920ء کو اتحادیوں نے صلح کی شرطیں ترک سلطان کے بے دست و پا حکومت کے سامنے پیش کر دیں اور ان پر دستخط کر دیے گئے۔ یہ عہد نامہ سیورے تھا جس کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

1- سلطنت حجاز کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔
2- شام فرانس کے زیر نگیں، عراق و موصل، نیز فلسطین برطانیہ کی حکمداری میں دے دیے گئے۔ اس طرح یورپ کا صدیوں پرانا یروشلم پر قبضے کا خواب پورا ہو گیا
3- سمرنا اور اس کے آس پاس کا علاقہ پانچ سال تک یونانیوں کے زیر انتظام رہے گا۔ پھر استصواب رائے سے آخری الحاق کا فیصلہ کیا جائے گیا۔
4- روڈز، دوازدہ گانہ جزائر اور دیگر جزائر اٹلی کے حوالے کر دیے گئے۔
5- تھریس اور بحیرہ ایجہ کے ترکی جزیرے بھی یونان کو دے دیے گئے۔
6- آرمینیا کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔
7- آبناؤں کو بین الاقوامی بنا دیا گیا اور ان کے متصل علاقے بھی غیر فوجی ایریا قرار دے دیے گئے۔
8- قسطنطنیہ اور اس کے ساتھ شتلجہ تک کا علاقہ اور نیز باقی اناطولیہ ترکی کے پاس رہے گا۔

جہاد آزادی:

ترکی کو مندرجہ بالا معاہدے اور یورپی طاقتوں کے بندر بانٹ رویے کی وجہ سے ایک محکوم ملک میں تبدیل کر دیا گیا جس کے خلاف ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں آزادی کے لئے جہاد کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے بڑی بے چارگی کی حالت میں فوجیں منظم کیں۔ یونانیوں کو اگست 1921ء میں نہایت خوفناک شکست دی وہ اس طرح بھاگے کہ سمرنا تک بھی نہ ٹھہر سکے۔ پھر ترکوں نے قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ فرانس، اٹلی اور بالشویک روس الگ ہو گئے۔ لائیڈ جارج برطانیہ کا سامراجی وزیر اعظم لڑنا چاہتا تھا لیکن سلطنت برطانیہ کی نو آبادیوں نے اس معاملے میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی۔ آخر لائیڈ جارج کو استعفیٰ دینا پڑا۔ مدانیہ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پورے ترک علاقے ترکوں کو دینے

کا فیصلہ کیا گیا۔ ادھر مصطفیٰ کمال نے خلافت منسوخ کر دی۔ 20 نومبر 1922ء کو لوزان میں ایک مستقل معاہدے کے لئے کانفرنس ہوئی اور 4 فروری 1923ء میں اس پر دستخط ہو گئے۔ اس کے مطابق مشرقی تھریس میں دریائے مرتزا سرحد قرار پایا امبر روس INBROS جو جزیرہ گیلی پولی کے داخلے سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھا اور فینی دوس FENEDOS کے جزیرے ترکوں کو واپس مل گئے تمام غیر ملکیوں جو رعایات دی گئی تھیں منسوخ کر دی گئیں۔ قسطنطنیہ اور تمام دوسرے ترک علاقوں کو غیر ملکی طاقتوں سے خالی کروالیا گیا اور ترکوں نے جنگ عظیم اول کے سلسلے میں معاہدے سیورے کے مطابق عائد کردہ کوئی تاوان بھی قبول نہ کیا۔

☆

1916ء۔ ترکوں کے خلاف بغاوت اور عرب انقلابات

عرب کا وہ علاقہ جس میں نجد و حجاز کے علاقے شامل ہیں عرب کہلاتا ہے اور 1914ء کی جنگ عالمگیر سے پہلے ترکی کی خلافت کے زیر اثر تھا۔ مگر حضرت امیر معاویہ کے بعد سے خلافت اسلامیہ پر جو مطلق العنانیت کا رنگ چڑھنا شروع ہوا تھا وہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے دور میں مکمل ہو چکا تھا، یوں کہیے کہ اب خلافت کو آنحضرت ﷺ اور ان کے خلفائے راشدین سے کوئی نسبت نہ رہی تھی، بلکہ شہنشاہیت اور آمریت کے جو لوازمات دنیا کی دیگر شہنشاہیوں نے اپنا رکھے تھے وہ اب قسطنطنیہ کے خلفاء کے محلات میں بھی جمع تھے اور مسلم عوام کا کاروبار حکومت میں کوئی دخل نہ تھا۔ خلیفۃ المسلمین کے نام کا خطبہ ضرور پڑھا جاتا تھا اور اسے داعی اسلام کا جانشین بھی قرار دیا جاتا تھا مگر اب خلیفہ کے تمام اطوار قیصرانہ تھے۔ اس بنا پر جہاں سلطنت عثمانیہ کے دیگر گوشوں میں بغاوتیں پھیلیں وہاں صحرائے عرب کا خطہ بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔ خلافت اور حکومت کے بعید از اسلام ہو جانے سے مسلم عوام کی اخلاقی، معاشی، مذہبی حالات میں ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی روک تھام کے لئے دنیائے اسلام میں مختلف مصلحین پیدا ہوئے مگر ان مصلحین میں سب سے زیادہ طاقت و قوت کے ساتھ اپنی آواز کو اٹھایا وہ نجد سے تعلق رکھنے والا امام محمد بن عبدالوہاب تھا۔

امام محمد بن عبدالوہاب:

یہ مذہبی مصلح سترہویں صدی کے عشرہ آخر میں عرب کے ایک قریے میں پیدا ہوا۔ جب سن شعور کو پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سی خرابیاں شہنشاہیت کے دامن میں پل رہی ہیں اور ان کے خلاف کوئی اعلانیہ طور پر آواز اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کرتا۔ محمد بن عبدالوہاب نے ان کے خلاف آواز اٹھائی اور موثر طور پر مسلمانوں کو بتایا کہ عیاشی اور نفس پرستی کی تمام برائیاں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ وہ سب ایک ایک کر کے مسلمانوں میں عود آئی ہیں اور شراب پینے والے، قمار باز اور نرم و ریشمی لباس پہننے والے مسلمانوں میں پیدا ہو چکے ہیں۔ سونے چاندی کا استعمال کرنے والوں میں توہم پرستی و ضعیف الاعتقادی آ گئی ہے۔ ساحری و جادوگری کے ٹوٹکے بھی انہوں نے سیکھنے شروع کر دیے ہیں اور داڑھی بھی منڈوانے لگے

کے انہیں تعلیمات اسلام پر چلنے کی ترغیب دی مسلمانوں کی تمام خلاف اسلام برائیوں کو بیان کر کے انہیں تعلیمات اسلام پر چلنے کی ترغیب دی۔ غرض امام صاحب نے مسلمانوں کی تمام خلاف اسلام برائیوں کو بیان کر
ہیں۔ غرض امام صاحب نے مسلمانوں کی تمام خلاف اسلام برائیوں کو بیان کر کے انہیں تعلیمات اسلام پر چلنے کی ترغیب دی مگر وہ اپنے اس کام میں شدت پسند تھے مگر ساتھ ہی ایک پر جوش باہمت اور باعمل انسان بھی البتہ امام صاحب کی اصلاح اور دعوت کا خصوصی عنوان توحید وسنت کا احیاء اور شرک وبدعت کا رد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ ہی عرصہ میں امام صاحب اور ان کے شاگردوں نے توحید وسنت کے موضوع پر بہت سارا لٹریچر تصنیف کیا اور عالم اسلام میں جہاں کہیں بھی شرک وبدعت کا رد کرنے والی کوئی تحریک برپا ہوئی۔ اسے وہابی کہا گیا۔ 1742ء میں محمد بن سعود جو عرب کی ایک چھوٹی سی ریاست کا والی تھا ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا اور اس نے سرکاری طور پر ان کا پیغام پھیلانے کی کوشش شروع کر دی۔ 1804ء تک عالم عرب امام صاحب کے پیام پر عمل پیرا ہو گیا، مگر سلطان ترکی نے ان کے نظریات کو ماننے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ محمد بن سعود نے چونکہ خلافت عثمانیہ کی تقدیس کو تسلیم نہیں کیا اور وہ باغی ہے لہذا اس تحریک کو باغیانہ قرار دے کر اسے دبانے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن ترکی نے اس تحریک کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہ کیا مگر جب پورا عالم عرب اس کے ہاتھ سے نکلا اور محمد بن سعود کے خاندان کی مستقل حکومت یہاں قائم ہوگئی تو ''باب عالی'' کو اس کے استیصال کے لئے پوری قوت سے اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا چنانچہ محمد علی پاشا خدیو مصر کو اس پہلی بغاوت کو دبانے پر مامور کیا گیا۔ 1811ء میں طوسون پاشا کی کمان میں سلطانی افواج نے عرب پر حملہ کیا اور کہیں پانچ چھ سال میں باغیوں کی طاقت کچل دی گئی۔ عبداللہ جو اس وقت اس جماعت کا امیر تھا گرفتار کر کے قسطنطنیہ لایا گیا جہاں اسے آیا صوفیہ کی مسجد کے صحن میں سزائے موت دی گئی۔ مگر اس خون ریزی سے یہ تحریک دبی نہیں البتہ اس کا مستقر صرف نجد تک محدود رہ گیا۔ ادھر اس کاروائی سے عربوں کے دلوں میں ترکوں کے خلاف نفرت وانتقام کی تلخی پیدا ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امام صاحب کی موت کو عرصہ گذرنے کے بعد بارگاہ خلافت کی مخالفت کی وجہ سے اور کچھ اندرونی خرابیاں پیدا ہو جانے کے بعد تحریک وہابیت نے جو آغاز میں صرف ایک اصلاحی تحریک تھی اب ایسی گروہ بندی کی شکل اختیار کر لی جو عقائد میں سخت رویہ اختیار کرتے اور فقہ میں امام احمد بن حنبل کے پیروکار تھے۔ پختہ قبروں اور دیگر بدعتوں کے مخالف تھے اس صورت حال نے سلطان ترکی کے ہاتھ بہت مضبوط کر دیئے اور خود عرب قبائل بھی نجد کے خلاف لڑنے لگے۔ آخر 1885ء میں نجدی حکومت کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور اس کے آخری فرمانروا کو ترکی کی افواج نے موت کی نیند سلا دیا۔

عبدالعزیز بن سعود:

مگر نجد کے فرمانروا کا ایک پانچ سالہ بیٹا بچ گیا جسے خاندان کے لوگ چھپا کر عمان لے گئے یہاں ایک غریب الدیار یتیم کی حیثیت سے اس کی پرورش ہوئی یہ لڑکا جب جوان ہوا تو قائدانہ صلاحیتیں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس کے دل میں اپنی آبائی شان وشوکت کے دوبارہ حصول کا جذبہ بھی موجود تھا۔ 1901ء میں اس نے صرف چند ساتھیوں کی مدد سے نجد کا دارالحکومت ریاض فتح کر لیا۔ پھر دس سال کے اندر اندر وہ عرب سرداران میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ترک اس زمانے میں دیگر عالمی مسائل میں الجھے ہوئے تھے، انہیں نجد کا خیال نہ آسکا۔ تاہم 1912ء میں جب یہ ریاست کافی مضبوط ہوگئی تو انہیں والئی حجاز شریف حسین شریف مکہ کو کچھ روپیہ دے کر نجد کے نئے والی کے خلاف حملہ کرایا شریف مکہ نے ابن سعود کو شکست دے کر اسے ترکی کی اطاعت پر مجبور کر دیا، مگر اس کی حکومت اور سرداری بحال

بٹھا دی۔ اس کے صرف دو سال بعد 1914ء میں جب عالمگیر جنگ چھڑی تو عرب کی سیاسی حالت یہ تھی کہ حجاز اور اس کے نواح میں ترکوں کی طرف سے شریف حسین حاکم تھا جسے شریف مکہ کہا جاتا تھا۔ حجاز کے علاوہ وسطی عرب کا تمام علاقہ عبدالعزیز بن سعود فتح کر چکا تھا۔ اب عرب میں صرف یہی دو طاقتیں دراصل عرب طاقتیں تھیں۔ جنوب میں اگرچہ یمن، عدن اور حضرموت کے علاقے اور مشرق سے خلیج فارس کے ساحل پر عمان مسقط کویت اور بحرین کی ریاستیں بھی تھیں مگر یہ عرب کا حصہ ہونے کے باوجود بیسیوں قبائلی گروہ بندیوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ اگرچہ نجد کا حکمران بھی اس قسم کا قبائلی حکمران تھا مگر اس میں قائدانہ صلاحیتیں اور صفات کی موجودگی اسے ان سے الگ کرتی تھی۔ اگرچہ ابن سعود نے یورپ کی سیاسی چالیں نہیں پڑھی تھیں مگر وہ ذہین اور زیرک واقع ہوا تھا۔ چنانچہ جب 1914ء کی جنگ میں برطانیہ اور فرانس نے آزاد عرب سلطنت کے نام پر عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کیا تو ابن سعود کو بھی دام میں لانے کی کوشش کی گئی مگر اس نے اس صف آرائی میں شمولیت میں صاف انکار کر دیا۔ اگرچہ اسے ترکوں سے شکائتیں بھی تھیں، بہرحال یہ ممکن تھا کہ وہ ترکوں کے اتحادی کے طور پر لڑتا مگر چالاک یورپیوں نے پورے عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت پھیلا دی اور دوسری طرف وہ ابن سعود کی طرف اپنے ایجنٹوں کے ذریعے دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے، اس لئے انہوں نے ابن سعود کو غیر جانب دار رہنے پر راضی کر لیا۔ اس غیر جانبداری کے لئے معاون کے طور پر جنگ کے اختتام تک پانچ ہزار پونڈ ماہانہ کا نذرانہ اسے پیش کیا گیا۔

حجاز کی نیرنگیاں:

1914ء کی جنگ میں عربوں کی بغاوت یا انقلاب کی قیادت و سیادت شریف مکہ اور اس کے بیٹے فیصل اور عبداللہ کے ہاتھ میں تھی اور ان تینوں کی باگیں مشہور انگریز ایجنٹ لارنس آف عربیا کے ہاتھ میں تھیں۔ جنگ کے اختتام پر جب ترکوں کو ان سابق وفاداروں کے ''ایفائے عہد'' کا وقت آیا تو فیصل کو عراق دے کر مطمئن کر دیا گیا۔ عبداللہ کو اردن کی حکومت دی گئی جو برطانیہ کے زیر حمایت تھی۔ حسین چونکہ ترکوں کے زمانے سے ہی شریف مکہ اور حجاز کا والی تھا اب اسے حجاز کا ''سلطان'' بنا دیا گیا اور اس کی آزاد حیثیت تسلیم کر لی گئی اور اس میں کسی قسم کی دست اندازی نہ کی گئی۔ اس کی دو وجوہات تھیں، ایک تو مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات اسی سرزمین پر واقع ہیں، اس لیے یورپی طاقتیں یہاں در اندازی کر کے اپنے مقبوضات کے لاکھوں کروڑوں مسلمان رعایا کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ نہ کرنا چاہتی تھیں۔ دوسرے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حجاز فوجی یا معاشی لحاظ سے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ بحر قلزم کے ایک سرے پر نہر سویز ہے اور دوسرے سرے پر عدن کی بندرگاہ۔ جس طاقت کے پاس یہ دونوں مقامات ہوں اس کا اس علاقے پر تسلط مضبوط تھا اس لئے اسے بھلا حجاز کے ساحل سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ انگریز کے پاس نہر سویز اور عدن دونوں تھے۔

شریف حسین بن علی:

شریف حسین، شریف مکہ، حجازی سادات کے ایک مقتدر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جس کے متعدد افراد عثمانیہ سلطنت کے زیر وساطت مکہ معظمہ کے والی رہ چکے تھے۔ وہ 1854ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ جلاوطنی زندگی گذار رہا تھا۔ تاہم 1857ء میں شریف حسین کے والد کو مکہ واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ مگر جب شریف حسین کا چچا عون الرفیق

کہ معظمہ کا والی مقرر ہوا تو اس نے اپنے بھتیجے کے اثر و رسوخ سے ڈرتے ہوئے اسے قسطنطنیہ واپس بھجوا دیا جہاں وہ لگ بھگ 17 سال مقیم رہا۔ اس کے چچا عون الرفیق کی وفات پر اسے مکہ کا والی بنا کر مکہ بھیج دیا گیا۔ ان دنوں بلادِ عسیر میں بغاوت کی آگ بھڑکی ہوئی تھی جسے شریف حسین نے اپنی ذاتی بہادری سے فرو کر دیا۔

سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی کے بعد جب عربوں میں بھی قوم پرستی کے جذبات ابھرنے لگے اور ترکوں کے ان کے خلاف ان میں بھی بے زاری پیدا ہوئی تو شریف حسین بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے سلطان ترکی کا اعتماد کھو دیا۔ سلطان عبدالحمید نے ایسی صورت میں اس کا حجاز میں رہنا مناسب نہیں سمجھا اور 1893ء میں شریف حسین کو خاندان سمیت قسطنطنیہ بلا لیا جہاں وہ اس مرتبہ 1908ء تک پورے 15 سال جلاوطنی کی زندگی گذارتا رہا۔ اگرچہ اس دوران سلطان نے اسے وزراء کی کیبنٹ میں شامل کر لیا تھا۔ 1908ء میں جب ترکی میں دوسری مشروطیت کا اعلان ہوا تو نوجوان ترکوں نے سلطان کی اجازت کے بغیر شریف حسین کو حجاز واپس جانے ت بھی دے دی اور مکہ کا والی بھی دوبارہ بنا دیا۔ جب عثمانی پارلیمنٹ کے انتخاب ہوئے تو شریف حسین کا بیٹا حجاز سے رکن منتخب ہوا۔

اسی اثناء میں جنگِ عظیم اول چھڑ گئی جس میں ترکیہ جرمنی کا حلیف بن گیا شریف حسین اور اس کے بیٹے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے حجاز کی آزادی کے خواب دیکھنے لگے۔ انہوں دنوں اتفاق سے شریف حسین کا بیٹا عبداللہ مکہ معظمہ سے استنبول جاتے ہوئے قاہرہ میں ٹھہرا جہاں اسکی ملاقات مشہور انگریز سالار لارڈ کچنر LORD KITCHNER سے ہوئی جس میں طویل مذاکرات کے بعد یہ طے پایا کہ اگر شریف حسین ترکوں کے خلاف اتحادیوں کی جدوجہد میں ساتھ دے اسے حجاز کا خود مختار حکمران تسلیم کر لیا جائے گا۔ مزید براں اتحادی شام، عراق کی بھی حصول آزادی میں مدد فراہم کریں گے۔ اسکے فوراً بعد ہی لارڈ کچنر نے پورٹ سوڈان کے راستے سامان جنگ اور امدادی رقوم بھیجنا شروع کر دیں جس پر شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد سلطان ترکی نے اعلان جہاد کیا تو شام کے گورنر جمال پاشا نے شریف حسین کو اعلان جہاد کی توثیق کرنے کو کہا اور علم نبویؐ کو دمشق بھجوانے کو کہا تاکہ اس مقدس علم کے سائے میں انگریزوں پر حملہ کیا جائے شریف حسین نے 15 دسمبر 1914ء کو علم نبویؐ تو بھجوا دیا مگر مختلف حیلے بہانے اختیار کرتے ہوئے اعلان جہاد کی توثیق نہ کی۔

دو سال بعد 10 جون 1916ء کو شریف حسین نے انگریزوں کی شہ پر اپنے محل سے بندوق چلا کر ترکوں کے خلاف اعلان بغاوت کیا اور حجاز کو ایک آزاد مملکت قرار دے دیا۔ رشوت اور آزادی کے موہوم وعدوں پر حجاز، شام اور فلسطین کے عرب قبائل شریف حسین کے بیٹے فیصل کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

لارنس آف عریبیا:

اس عرب بغاوت میں کرنل ٹی۔ ای۔ لارنس نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا اور وہ اسی بنا پر لارنس آف عریبیا کہلایا۔ یہ انگریز مہم جو 1888ء میں پیدا ہوا۔ اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ 1910ء تا 1914ء اس نے شام اور عراق میں آثار قدیمہ کی مہمات میں حصہ لیا۔ پھر قاہرہ میں محکمہ سراغ رسانی میں ملازمت حاصل کر لی۔ پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں یہ شریف حسین اور اس کے بیٹے فیصل کا رفیق کار بن گیا۔ عرب دنیا میں دیرینہ قیام کی وجہ سے بڑی فصیح عربی بولتا

سکتا تھا۔ اپنی اسی صلاحیت کو بروئے کار لا کر اس نے عرب قبائل کو چکمہ دے کر ساتھ ملا لیا۔ اسی کے زیر ہدایت ترکوں کے ذرائع مواصلات دمشق سے مدینہ تک منقطع کر دیئے گئے۔ حجاز ریلوے جو قسطنطنیہ کو مدینہ منورہ سے ملاتی تھی تباہ و برباد کر دی گئی۔ اسکے نتیجے میں ہزاروں ترک فوجی سامان رسد و خوراک کی نافراہمی کی وجہ سے بھوک و پیاس کے ہاتھوں جاں بحق ہو گئے۔ شریف حسین مکہ کو صرف حجاز کا خودمختار حکمران مان لیا گیا جبکہ اس نے پورے عرب کے بادشاہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ انگریزوں کے مقابلے میں یہ شریف حسین کی پہلی ناکامی تھی اس کے بعد اسے مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یکم اکتوبر 1917ء کو امیر فیصل انگریزی فوج کے جلو میں دمشق میں داخل ہو گیا۔ اس طرح تخریب و سازش سے عرب دنیا میں عثمانی سلطنت کا 400 سالہ اقتدار ختم ہو گیا۔ شریف حسین کی خودمختار حکومت صحیح معنوں میں 1918ء میں شروع ہوئی جب مدینہ منورہ میں ترک دستوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور پورا حجاز عربوں کے زیر نگیں آ گیا۔ شریف حسین کو انگریزوں پر بڑا اعتماد تھا اس اعتماد میں عرب دشمن سمجھوتوں کے بعد بھی فرق نہیں آیا جو برطانیہ اور فرانس میں عرب دنیا کی تقسیم کیلئے ہوئے۔ وہ انگریزوں کے ساتھ کیے گئے، حسین میکموہن معاہدے پر کامل بھروسہ کرتا تھا اور اسکی نقل اپنی جیب میں اسی طرح ڈالے پھرتا تھا کہ گویا وہ کچھ ٹھیک ہونے کی ضمانت ہے۔ لیکن شام میں اسکے بیٹے فیصل سے جو سلوک ہوا وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔

1918ء میں جنگ عظیم کا اختتام ہوا تو اتحادیوں نے عربوں سے آنکھیں پھیر لیں اور جنگ سے پہلے کیے گئے تمام وعدے فراموش کر دیئے گئے۔ فرانسیسیوں نے امیر فیصل کو دمشق سے نکال دیا۔ انگریزوں نے عراق اور فلسطین پر قبضہ کر لیا اور فلسطین کو اعلان بالفور کے ذریعے یہودیوں کا وطن بنانے کا فیصلہ کیا۔ شریف حسین نے امیر فیصل کی مدد کے لئے دوسرے بیٹے عبداللہ کو بھیجا تو انگریزوں نے اسے اردن کی بادشاہت دے کر راضی کر لیا جس کا صدر مقام عمان قرار پایا۔ ادھر شریف کی نااہلی کی وجہ سے ہر طرف بدامنی پھیل گئی۔ 1924ء میں شریف عمان آ گیا۔ بڑا بننے کا خبط اسے پہلے ہی تھا۔ 3 مارچ کو جب ترکی نے منصب خلافت ختم کرنے کا اعلان کیا تو شریف حسین نے 12 مارچ 1924ء کو خلیفہ بننے کا اعلان کر دیا تاہم اس کی خلافت کو اردن اور عراق کے سوا کسی نے تسلیم نہ کیا۔ شریف حسین کے اس عجیب و غریب رویئے نے اور سرزمین حجاز میں بدویوں کی لوٹ مار سے حرمین شریفین کے راستے مخدوش ہو جانے کی وجہ سے دیگر عرب حکمران بھی اس کے خلاف ہو گئے۔ سلطان عبدالعزیز بن سعود والی نجد اور شریف حسین میں عرصے سے سیاسی چپقلش جاری تھی۔ ابن سعود نے نہ تو شریف حسین کی بادشاہت کو تسلیم کیا تھا اور نہ وہ اس کی خلافت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھا۔ ادھر شریف حسین نے برافروختہ ہو کر اہل نجد کو حج کی ادائیگی سے روک دیا۔ اب موقع تھا کہ ابن سعود اپنی 1912ء کی شکست، جس کے بعد وہ سلطنت ترکی کا مطیع ہو گیا تھا بدلہ لیا جائے۔

حجاز پر ابن سعود کا حملہ:

ان تمام موزوں حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابن سعود ستمبر 1924ء میں قبائلی جنگجوؤں "اخوان" کا دستہ لے کر جو بظاہر اس کی فوج سے تعلق نہ رکھتے تھے طائف پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا (طائف مکہ معظمہ سے صرف 40 میل کے فاصلے پر ہے)۔ چونکہ طائف میں برائے نام فوج تھی، اس لئے معمولی مزاحمت کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا گیا۔ شریف حسین کی حکومت نے طائف کے ہاتھ سے نکل جانے کی جو خبریں بیرونی دنیا کو بھیجی ان میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ

اخوان نے عورتوں اور بچوں کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ ان خبروں سے حجاز میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی ابن سعود نے مکہ معظمہ پر حملہ کر دیا۔ شریف نے پہلے تو مقابلہ کرنا چاہا مگر جلد ہی اس نے اپنی بے بضاعتی کا احساس کر لیا کیونکہ اس کے سب سے بڑی اتحادی برطانیہ نے اس معاملے میں اس کی کوئی مدد کرنے یا مداخلت کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ جب جنگ کے بعد برطانیہ نے اسے صرف حجاز کا علاقہ دینے پر اکتفا کیا تو اسے سخت ناگوار گزرا تھا اور اس نے برطانیہ کے خلاف اظہار رائے شروع کر دیا تھا۔ جس سے برطانیہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں اتحادیوں کے خلاف کسی نئی تحریک کی شکل اختیار نہ کر لے۔ لہذا اس نے شریف حسین کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ایسی حالت میں شریف حسین کا حملہ ہوا تو ابن سعود کچھ نہ کر سکا اس نے اپنی "سلطانی" سے خود ہی دست برداری اختیار کر لی۔ سلطان ابن سعود کی افواج حدود مملکت حجاز میں پھیل گئیں اور تمام مقامات تک پہنچ گئیں۔ ابن سعود اکتوبر 1924ء میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوا لیکن احرام باندھ ہوئے، ننگے پاؤں آنکھیں نیچی کئے ہوئے اور خشوع و خضوع کے ساتھ ایک حاجی کی طرح۔

اس کے بعد جدہ کا محاصرہ کر لیا گیا مگر غیر ضروری خونریزی سے پرہیز کیا گیا۔ شریف حسین اپنے بیٹے علی کے حق میں دستبردار ہو گیا اور عقبہ کی بندرگاہ سے جہاز میں بیٹھ کر قبرص چلا گیا۔ ادھر جدہ کے بعد ابن سعود نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا۔ دسمبر 1925ء میں مدینہ منورہ تو آسانی سے فتح ہو گیا، مگر جدہ میں مزاحمت جاری رہی پھر دسمبر کے آخر میں اہل جدہ نے بھی اطاعت اختیار کر لی۔ 10 جنوری 1926ء کو مکہ معظمہ میں ایک پرہجوم تقریب میں ابن سعود نے شاہ حجاز ہونے کا اعلان کیا۔

ابن سعود نے حجاز کی عنان حکومت سنبھالتے ہی حجاج کرام کے فائدے کے لئے بہت سے اقدام کئے۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں کو انتہائی بے رحمی سے کچل دیا گیا اور حرمین شریفین کے درمیان موٹر سروس چلائی گئی۔ راستے میں جا بجا ہوٹل کھولے گئے۔ صرف ایک سال کے اندر اندر ملک میں کامل امن و سکون قائم کر دیا گیا۔ مگر نجدی قبائل جن کے بل بوتے پر ابن سعود نے حجاز فتح کیا تھا اس صورت حال سے ناخوش تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ موٹریں شیطانی سواریاں جو جادو کے زور پر چلتی ہیں اور جادو کے زور پر ہی تیار کی گئیں ہیں۔ ان کے نزدیک ابن سعود وہابیت کو بھول گیا تھا اور عیش و راحت میں پڑ کر ان ساحرانہ اعمال میں کھو گیا تھا۔ وائرلیس، ٹیلی فون، تار برقی کی ایجادات سے بھی وہ ناخوش تھے اور ان سب کو بھی جادوگری کا کام سمجھ کر توڑ پھوڑ کر پھینکنا چاہتے تھے۔ لیکن ابن سعود اپنے ان وہابی اخوان کے مقابلے میں کہیں زیادہ دانشمند اور جہاں دیدہ تھا اس کی سوچ یہ تھی کہ مسلمان آج کل خواب سے بیدار ہو رہے ہیں، انہیں ان تمام ہتھیاروں کو استعمال میں لانا چاہیے جو ان کی ترقی و بیداری میں مدد دیں۔ وہ مذہبی عبادات اور خدا پرستی کے لئے ہوائی جہاز موٹر کاروں اور دیگر سائنسی ایجادات کے استعمال کو غیر شرعی نہیں سمجھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ اپنے ہم وطن دیگر نجدیوں کی طرح تنگ دل اور تنگ فکر نہ تھا بلکہ دل و دماغ میں ان سے بدرجہا بلند واقع ہوا تھا۔

ابن سعود کی حکمت عملی:

شروع شروع میں اس کے یہ انقلابی خیالات نجدیوں کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ باغی ہو گئے۔ لیکن ان باغیوں کو جلد ہی علم ہو گیا کہ اب ان کے سردار کی طاقت اور فکر بلند ہو چکی ہے اب اس سے بازی جیتنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

سعود نے بڑی ہوشیاری کی کہ ان باغیوں کو بڑی حکمت عملی سے امیر فیصل کی عراقی حکومت کے خلاف ابھار دیا چنانچہ عراق کی جنوبی سرحد پر لوٹ مار مچنے لگی اور قتل و غارت شروع ہوگئی۔ ابن سعود جانتا تھا کہ عراق میں کسی قسم کی بدنظمی کو انگریز برداشت نہیں کریں گے۔ دنیا کا سب سے بڑا ہوائی رستہ عراق پر سے گزرتا تھا اور بغداد دنیا کے بڑے بڑے ہوائی مستقروں میں سے ایک تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شمال سے انگریزی بندوقوں اور بموں نے اور جنوب سے سعودی تلواروں نے مل کر ان مذہبی باغیوں کا صفایا کر دیا اور ابن سعود پر انگلی اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔

وسط عرب اور نجد کے بہت سے عرب قبائل کا پیشہ عرصہ دراز سے لوٹ مار چلا آرہا تھا۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے اور جب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہتا تو یہ کسی پر جا پڑتے تھے۔ ابن سعود نے ان قبائل کی ''اخوان الصفا'' کے نام سے جماعت بنائی تھی اور خانہ بدوشوں کو مختلف بود و باش اختیار کرنے پر مائل کیا اور اس کی یہ منصوبہ بندی بڑی حد تک کامیاب رہی۔ اسی طرح حجاز میں حاجیوں کو لوٹنے کے لئے جو عرب بدو جدہ سے مکہ کے راستے میں چھپ کر بیٹھ رہتے تھے اب موٹر سروس سے جدہ اور مکہ کا راستہ بہت جلد طے ہونے لگا اور لٹیروں سے نجات مل گئی۔ 1931ء سے 1935ء تک ابن سعود نے عرب کی مرکزی حکومت قائم کرنے کے لئے باقی ماندہ عرب علاقوں کو بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اس طرح پورا عرب اس کے زیر نگیں آگیا۔

سیاسی نظم و نسق:

نجد میں ابن سعود ایک مطلق العنان بادشاہ تھا، نہ کوئی مجلس شوریٰ، نہ کابینہ، نہ وزارت، نہ کوئی آئین، نہ دستور۔ عوام کو کاروبار حکومت میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ابن سعود کا سب سے بڑا بیٹا عرب دستور کے مطابق ولی عہد تھا۔ وہ زیادہ تر نجد میں رہتا تھا۔ نجدی فوج کا سپہ سالار بھی ولی عہد ہی تھا۔ مگر حجاز کی سیاسی حالت نجد سے مختلف تھی۔ 1926ء میں ایک دستور اساسی بنایا گیا جس کی رو سے حکومت ہوتی تھی۔ اس آئین میں وقتاً فوقتاً ترامیم بھی ہوئیں۔ مگر انتخاب کی بجائے ارکان نامزد کئے جاتے تھے۔ ایک کابینہ اور وزارت بھی تھی۔ جس کی صدارت ابن سعود کے دوسرے بیٹے فیصل کو سونپی گئی تھی۔ معاملات خارجہ کی وزارت اور امور داخلہ بھی اسی کے ہاتھ میں دیئے گئے تھے۔ قانون سازی کے لیے ایک اسمبلی اور حکومت کو مشاورت فراہم کرنے کے لئے ایک کونسل بھی موجود تھی۔ کابینہ وزارت صرف بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھی جبکہ بادشاہ لامحدود اختیارات کا مالک تھا۔ قصبوں اور شہروں میں عوام کی حفظان صحت کے لئے کچھ میونسپل کمیٹیاں بھی قائم کی گئیں تھیں جو محدود اختیارات کے ساتھ کام کرتی تھیں۔

معاشی حالت:

نجد و حجاز کی معاشیات کا دارومدار تیل نکلنے سے پہلے ان چند نخلستانوں پر تھا جو تپتی ہوئی ریت کے لق و دق بیابانوں میں کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ یہی علاقے ملک کی غذائی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ ریگستانی علاقوں میں بسنے والے خانہ بدوش قبائل بھیڑ بکریوں کی پرورش اور اونٹوں کی گلہ بانی سے معاش حاصل کرتے تھے۔ تیل نکلنے کے بعد سعودی عرب کی معیشت میں انقلاب آیا مگر بہت آہستہ آہستہ، اس سے پہلے مورخین کے مطابق نجد و حجاز میں عوام کا معیار زندگی بہت پست تھا، لیکن بادشاہ کو اس سے کوئی نسبت نہیں تھی اور وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹھ سے نجد کے شاہی محل میں رہتا تھا۔ شرعی طور پر وہ

ہر وقت چار بیویاں رکھتا اور جب کبھی اسے نئی شادی یا نئی بیوی کی ضرورت ہوتی تو پہلے والی چار میں سے کسی ایک کو طلاق دے دی جاتی تھی۔ ابن سعود کے عہد میں حاجیوں کو عرب راہزنوں سے عافیت نصیب ہو گئی تھی، مگر بھوک کے مارے ہوئے بھکاریوں کے غول کے غول ہر طرف حاجیوں کا پیچھا کرتے تھے اور دستر خوان پر پھینکی ہوئی ہڈی کو بھی نعمت سمجھ کر اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

تیل کی کہانی:

وسطی عرب میں ایک مستحکم حکومت کے قیام کے بعد بیرونی دنیا کے کاروباری حضرات یہ سوچنے لگے کہ عرب کی صحرائی ریت میں معدنیات کے کیا کیا خزانے چھپے ہوئے ہیں عراق اور ایران میں 1920ء کی دہائی میں تیل کی تلاش کی جا رہی تھی۔ ان ملکوں کی ارضی خصوصیات سعودی عرب سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔ 1923ء سے پہلے تیل کی تلاش کے ایک معاہدے پر سعودی حکمرانوں نے بھی دستخط کیے تھے۔ نیوزی لینڈ کا ایک باشندہ میجر ہومز ابن سعود کے نام ایک تعارفی چٹھی لایا وہ ایک انگریز کمپنی EASTERN AND GENERL SYNDICATE کا نمائندہ تھا۔ چند ماہ کی گفت و شنید کے بعد ہومز کو الاحساء کے علاقے میں تیل کی تلاش کی اجازت دے دی گئی۔ دراصل عرب کا یہی علاقہ ہی تیل کا گھر ہے۔ اس وقت صرف دو ہزار پونڈ سالانہ کی ادائیگی پر اس علاقے سے تیل نکالنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ کیونکہ خود ابن سعود کا خیال تھا کہ خدا نے اس کے ملک کو ریت کے بے کراں سمندر کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ ان دنوں یہ بھی بڑی بات تھی کہ غیر ملکیوں سے دو ہزار پونڈ سالانہ حصول کرنا طے پایا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ ایسٹرن اینڈ جنرل سنڈیکیٹ کمپنی کوئی قابل ذکر کھدائی نہ کر سکی۔ دو سال کی ادائیگی کے بعد ان کی دلچسپی ختم ہونے لگی۔ پھر جب ان کی طرف سے ادائیگی رک گئی تو تین سال کی عدم ادائیگی کے بعد 1928ء میں شاہ نے اس کمپنی کی رعایت بھی ختم کر دی۔

1930ء تک مزید کوئی رعایت تیل کی تلاش کے سلسلے میں کسی کو نہ دی گئی اس سال تک بادشاہ سلامت خود بھی بڑی مالی پریشانیوں کے شکار رہے۔ کیونکہ دنیا میں پھیلنے والی اقتصادی بدحالی نے مکہ معظمہ حج کے لئے آنے والے حاجیوں کی تعداد بھی گھٹا دی تھی۔ غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی اور عملے کے واجبات کی ادائیگی بھی دشوار ہوتی جا رہی تھی۔ شاہ کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ معدنی ذخائر کی دریافت سے یہ مالی مشکلات دور کی جا سکتی ہیں۔ انہیں دنوں چارلس کرین CHARLES CRANE نامی ایک امریکی سعودی عرب آیا اپنی آمد سے پہلے اس نے شاہ کے نام ایک تار بھجوایا بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ "جلالت مآب شاہ ابن سعود کے نام میں عربستان دیکھنا چاہتا ہوں اور اگر اجازت ہو تو وہاں آ کر آپ سے ملاقات کا خواہاں بھی ہوں۔" چارلس کرین، عربوں کا دوست" لیکن جلالت مآب کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ دور اندیشی کا دم بھرنے والے ان غیر ملکی دوستوں کے لئے ملاقات کا وقت نکال سکے۔ لہٰذا دفتر خارجہ کو ہدایت دے دی گئی کہ شائستگی کے ساتھ معذرت کر دی جائے۔ جس کی عبارت یہ تھی۔ جلالت مآب تقریب حج کی مصروفیات اور بعض داخلی امور کی وجہ آپ سے ملاقات کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔

لیکن کرین پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھا۔ حج کے بعد شاہ مکہ معظمہ سے واپس نجد جانے ہی والے تھے کہ اس نے ایک اور تار بھیجا جواب پھر انکار ہی میں دیا گیا۔ کرین بصرہ پہنچا اور وہاں سے بذریعہ کار کویت کے راستے اس نے

پہنچنے کی سبیل نکال لی۔ مگر بدقسمتی سے جب وہ کویت سے نجد جا رہے تھے تو ان کا سامنا ایک اغوائی غارت گر گروہ سے ہو گیا۔ غارت گروں نے کاروں پر فائر کھول دیا کرین کا ایک ساتھی گولی کا نشانہ بن گیا، مگر کرین بچ گیا۔ جب اس واقعہ کی خبر ریاض پہنچی شاہ بہت برا فروختہ ہوئے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ کرین بے چارہ الٹے پاؤں واپس چلا گیا، مگر اس کے عزائم استقلال کو دیکھ کر اب شاہ نے اس ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی۔ فروری 1931ء میں جب کرین انہیں ملنے کے لئے جدہ پہنچا تو شاہ اس سے ملنے کے لئے خود چل کر آئے۔ اسے شیخ محمد نصیف کے گھر ٹھہرایا گیا یہ اعزاز خصوصی تھا کیونکہ ان کے ہاں صرف بادشاہ سلامت ٹھہرتے تھے۔ ایک ماہ تک گفت شنید کے بعد شاہ کو معدنی ذخائر کی دریافت سے غیر ملکی قرضوں کی ادائیگیوں کے خواب نظر آنے لگے۔ طے یہ پایا کہ معدنیات کی تلاش کرنے والے ماہرین ارضیات کی تنخواہ کرین ادا کرے گا جبکہ باقی ضروریات بادشاہ فراہم کریں گے۔

کرین نے ایک ارضیات کے ماہر کو عرب بھیجا جس نے ظہران کے علاقے میں ایسی ارضیاتی ساختیں دیکھیں جو اس علاقے میں تیل کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتی تھیں اس نے اپنے سروے کی رپورٹ شاہ کو پیش کی۔ مگر جلالت مآب اب بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ بنجر صحرا کے بطن سے ناکارہ سی چٹانوں کے سوا اور بھی کچھ ہے۔ انہیں دنوں شہزادہ فیصل انگلستان کے تفریحی دورے پر جا رہے تھے۔ شاہ نے امریکی ماہر ارضیات کے سروے کی رپورٹ کی ایک نقل برطانیہ بھجوا دی اور برطانیہ کو تیل کی تلاش کے لئے مراعات دینے کی پیشکش بھی کی۔ لیکن برطانوی سرکار نے ممنونیت کے ساتھ تیل کی تلاش سے معذرت کر لی۔

اب شاہ کے پاس اسکے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسی امریکی ماہر ارضیات مسٹر ٹوچل سے کوئی معاہدہ کیا جائے۔ مگر مسٹر ٹوچل نے بذات خود کسی ایسے معاہدے سے انکار کر کے امریکہ میں کوئی تیل نکالنے والی کمپنی کو راضی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ پھر ایک امریکی کمپنی تیل کی تلاش پر آمادہ ہو گئی، مگر عین اسی وقت ایک برطانوی تیل کی کمپنی بھی اسی کام کے لئے جدہ پہنچ گئی۔ پھر سٹینڈرڈ آئل کمپنی سے سمجھوتہ ہو گیا مگر 1935ء میں ظہران میں کھودے گئے تیل کے کنوؤں سے تیل نہ نکلنے سے امیدیں ٹوٹنے لگیں۔ پھر ایک کنویں میں سے تیل نکل آیا اور تجارتی بنیادوں پر تیل نکلنے کے امکانات روشن ہو گئے۔ تیل 1938ء میں نکلنا شروع ہوا، مگر دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پھر رک گیا۔ اس کے بعد یہ کام اتنے عروج پر پہنچا کہ اس کی مثال نہ رہی۔ یوں ابن سعود کی قیادت میں جدیدیت اور سریع ترقی کا وہ دور شروع ہو گیا جس کی بدولت آج سعودی عرب کے باشندے اس قدر صاحب ثروت ہو گئے ہیں۔

حکومت کی قبہ شکنی کی حکمت عملی:

1929ء میں ابن سعود نے اپنے نجدی پیروؤں کو خوش کرنے کے لئے جو مذہبی عقائد میں بہت شدید تھے اور پہلے بھی بادشاہ کے خلاف بغاوت تک کر چکے تھے، اب بہت سے مزارات کے قبے تڑوا دیئے اور دلیل یہ پیش کی کہ پختہ قبر بنوانے کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔ اور ان مزاروں کو مسلمانوں نے بت بنا لیا ہے اور شرک و بدعت اختیار کر لی۔ اگرچہ ابن سعود کی یہ دلیل اسلامی نقطہ نظر سے بالکل صحیح تھی کہ اسلام میں پختہ مقابر بنانے کی اجازت نہیں، لیکن تعمیر شدہ مقابر کو توڑنے کا یہ عمل ایک دو دھاری تلوار کی مانند تھا جس نے ایک طرف تو نجدی قبائل کو تو خوش کر دیا، لیکن دوسری طرف دنیا کے مسلمانوں

کے جذبات کو مشتعل کر دیا اور رائے کے عامہ کو بھی سخت مشتعل کر دیا۔

چونکہ ملک کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ حاجیوں سے وصول کیے گئے محاصل سے منہا کیا جاتا تھا اس لئے ابن سعود کو بھی مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی فکر بھی دامن گیر تھی ہر اسلامی ملک میں اس نے اپنے پروپیگنڈہ ایجنٹ چھوڑے ہوئے تھے جو رائے عامہ کو اس کے خلاف ہونے سے روکنے کے لئے اس کے حق میں پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ جلد ہی قبہ شکنی کی یہ مہم ختم کر دی گئی لیکن اس مہم میں بہت سے عظیم الشان مقابر جو صحابہ کرام اور اہل بیت کے مزارات پر بنے ہوئے تھے تو ڈھا دیے گئے، مگر سبز گنبد کے مکین ؐ کے گنبد خضرا پر کوئی نظر بھی نہیں ڈال سکا اور وہ آج بھی محفوظ و مامون ہے اور تا قیامت رہے گا۔ اور اسلامی دنیا کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کے جواب میں سعودی حکومت کی طرف سے نجد علماؤں نے عالم اسلام کے راہنماؤں اور علماؤں کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ اگر پختہ قبروں، قبوں اور مقابر کے حق میں وہ کوئی شرعی دلیل لے آئیں تو اُسے بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے گا۔

☆

1917ء بالشویک-انقلاب روس

8 مارچ 1917ء کی صبح چشم فلک نے روس کے مشہور شہر پیٹرز برگ میں اناج کا قحط پڑنے کی وجہ سے عوام کو روٹیوں کے لئے ہنگامہ آرائی کرتے ہوئے دیکھا۔ روس کی عوام میں حکومت کے خلاف بے چینی تو بہت پہلے سے پھیلی ہوئی تھی، اناج کی قلت نے عوام کو سڑکوں پر لا کھڑا کیا۔ سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کے انبوہ کثیر جمع ہو کر روٹیوں کے لئے پکاریں مچانے لگے۔ ان پکار مچانے والوں میں تقریباً پچاس کارخانوں اور فیکٹریوں سے ہڑتال کر کے آئے ہوئے مزدور بھی شامل تھے۔ اس ہنگامہ آرائی اور شورش میں شہر کے بہت سے نانبائیوں کی دوکانیں لوٹ لی گئیں، پولیس نے روک تھام کی کوشش کی اس مقصد کے لئے فوج بھی ضرورتاً الرٹ اور تیار کھڑی تھی۔ روٹیوں کی پکار کے ساتھ ساتھ عوام انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی لگانے لگی۔ پھر سرخ انقلابی جھنڈے اور انقلابی پمفلٹ نمودار ہونے لگے۔ یعنی انقلاب پسند روسی عناصر عوام کی بے چینی اور اضطراب کو موقع غنیمت جان کر عوام کی اگلی صفوں میں آ کھڑے ہوئے اور انہوں نے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ دو دن تک تو یہ ہنگامے صرف معمولی درجے کی شورشیں رہے لیکن 10 مارچ کو صورت حال تشویش ناک ہوتی ہوئی نظر آئی۔ کارخانوں اور فیکٹریوں میں مکمل طور پر ہڑتال کی وبا پھیل گئی اور جمہور عام شورش اور ہنگامہ آرائی پر کمر بستہ ہو گئے۔ ایسی حالت میں پولیس نے گولی چلا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں تقریباً دو سو جانیں ضائع ہو گئیں۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور انقلاب کے شعلوں کو بھڑکا کر آگ لگا دی۔ فوج میں غدر مچ گیا۔ فوج اپنے نہتے بھائی بندوں پر گولی چلانے کے لئے آمادہ نہ تھی۔ 11 مارچ کو جب فوج کو عوام پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا تو اس نے بجائے عوام پر گولی چلانے کے اپنے افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ فوج کی کئی رجمنٹیں باغی ہو گئیں اور غدر مچ گیا۔ اس تشویش ناک صورتحال کو دیکھتے ہوئے پارلیمنٹ، ڈیوما کے صدر اور بعض ارکان نے گرینڈ ڈیوک مائیکل الیگزینڈروچ ALEXENDROVICH یعنی زار روس کے بھائی سے درخواست کی کہ زار روس کے محاذ جنگ پر ہونے کی وجہ سے وہ اس کا قائم مقام بن جائے اور موجودہ وزارت کو برخاست کر کے فوراً ایسی وزارت قائم کرے جو بجائے زار کے ڈیوما یعنی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہو۔ گرینڈ ڈیوک نے زار سے اس امر کی اجازت چاہی، مگر زار نے اس تجویز کو نامنظور کر کے رد کر دیا اس پر مستزاد یہ کہ پارلیمنٹ کا اجلاس بھی برخاست و ملتوی کر دیا جس سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ 14 مارچ کی صبح تک اس معمولی عوامی ہنگامہ آرائی نے باقاعدہ طور پر سنگین انقلاب اور بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ فوج کے باغیوں نے اپنے افسروں اور حاکموں کو قتل اور گرفتار کر کے

اسلحہ خانے لوٹ لئے۔ توپ خانہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ ہتھیار ان سپاہیوں میں تقسیم کر دیے جو عوام کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ اس کی فوج کا نام "سرخ گارڈز" رکھا گیا۔ اب سڑکوں اور گلیوں میں ہر طرف ہتھیار بند باغی گھومتے نظر آنے لگے۔ گلی میں جمع ہوئے لیکن بے بسی کے عالم میں کہ ان سے اب کچھ بنائے نہیں بنتی تھی۔ پہلے ڈوما سے کام لیا گیا لیکن آخر کار حکومت کی ذمہ داریوں سے مستعفی ہو گئے۔ حکومت کی ذمہ داریوں سے مستعفی ہو گئے پہلے ڈوما سے کام لیا گیا۔ ان نازک لمحات میں ملک میں حکومت کا وجود ہی باقی نہ رہا۔ ڈوما کے ارکان نے یکجا ہو کر زار کو معزول کرنے کا اعلان کیا۔ ایک بار پھر گرینڈ ڈیوک سے درخواست کی گئی کہ وہ زار کی جگہ سنبھال لیں۔ گرینڈ ڈیوک بڑا دور اندیش تھا اسے زار کی جگہ لینے میں جان کا خطرہ نظر آیا تو اس نے انکار کر دیا۔ آخر 14 مارچ مزدوروں اور سپاہیوں نے ایک سوویت تشکیل دی اور وہی نمونہ پیش نظر رکھا گیا جو 1905ء میں مزدوروں کی سوویت بناتے وقت اختیار کیا گیا تھا فرق صرف یہ تھا کہ پہلے سوویت صرف مزدوروں پر مشتمل تھی اور اب اس میں سپاہی بھی شامل تھے۔ اس سوویت کی انتظامیہ پندرہ افراد پر مشتمل تھی، جن کو عوام نے انقلاب کے سلسلے میں پالیسی وضع کرنے کا کام سونپا تھا۔ ڈیوما کا وجود انقلاب کی وجہ سے ختم ہو جانے کی بجائے اسے توڑ دیا گیا مگر اس کا اجلاس بدستور جاری رہا۔ سوویت لیڈروں میں سے جو کارل مارکس کے پیرو تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اب بھی پہلے سرمایہ داروں میں انقلاب بپا ہونا چاہیے۔ اور وہ سوویت کو بہت مقتدر ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ایک عارضی حکومت بن جانی چاہیے جس میں وہ خود شامل نہیں ہو سکتے تھے، لیکن حکومت کی محدود طور پر اعانت کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی خدمات دوما کو پیش کر دیں اور اس سے درخواست کی کہ وہ قیادت کا منصب سنبھال لے۔ بلکہ محدود رائے دہی سے ایک مجلس منتخب کر دی گئی اور سوویت نے اس مجلس کو انقلاب کی قیادت سونپ دی۔ اس طرح سوویت اور ڈیوما میں گفت و شنید کے ذریعے ایک عارضی حکومت معرض وجود میں آ گئی۔ اگرچہ ڈیوما اور سوویت میں نظریاتی اختلاف رائے تھا، مگر دونوں نے سیاسی حقوق فوراً بحال کر دینے پر اتفاق کر لیا ایک دستور ساز مجلس بنا دی گئی اسے یہ اختیار دیا گیا کہ وہ روس کے لئے آئین تیار کر کے مستقبل کی حکومت کی وضع ہیئت کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ عارضی حکومت نے 20 مارچ کو زار اور اس کی ملکہ کو گرفتار کر لیا اور مزدوروں اور سپاہیوں کی سوویت کے دباؤ کے تحت ڈیوما نے بھی سر تسلیم خم کر دیا۔ زار نے ڈیوما کو منتشر ہونے کا حکم دیا تھا اگر وہ منتشر ہو جاتی تو شاید شہنشاہی بچ جاتی لیکن اعتدال پسند عوام حامل اقتدار بن گئے جسے مارچ سے اکتوبر تک روس کے لئے تکالیف اور مصائب کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

روس اشتراکی انقلاب کا نقیب اول:

دولت اور تقسیم دولت میں توازن پیدا کرنے کا سوال انیسویں صدی کے اوائل ہی میں صنعتی انقلاب کے بعد پیدا کیا تھا۔ لیکن اشتراکیت یا سوشلزم کے نام پر ایک مکمل فلسفہ اس وقت سامنے آیا جب 1867ء میں کارل مارکس کی کتاب سرمایہ (کیپٹل) شائع ہوئی۔ سوشلزم یا بعد ازاں کیمونزم کے بنیادی اصول کارل مارکس کی اس تصنیف سے پہلے بھی موجود تھے لیکن مارکس کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ اپنے معاشی پروگرام کو کامیاب کرنے کے لئے زندگی کے تمام معاشی، مذہبی، سیاسی اور تاریخی نظریوں کو ایک نئی بنیاد پر قائم کرنے کی کوششیں کرتا ہے۔ معاشیات کا دامن زندگی کے ہر شعبے سے بندھا ہوا ہے۔ اس لئے اگرچہ مارکس کا نظریہ صرف مشینوں سے پیدا ہونے والی معاشی مشکلات کو سلجھانا تھا، لیکن جب پرانے مذہبی

معاشرتی خیالات اس کی راہ میں حائل ہونے کی کوششیں کرنے لگے تو وہ ان سب کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا نظر آتا تھا۔ جس طرح ایک کسان کھیت سے بھرپور فصل اٹھانے کے لئے اس میں اگنے والی ہر فالتو جڑی بوٹی کو اپنی درانتی کی نظر کر دیتا ہے اسی طرح کارل مارکس نے بھی اپنے معاشی نظریات کی بھی تخم پاشی کرنے کے لئے خیالات و عقائد کی تمام اگلی پچھلی عمارات کو (خواہ وہ کتنی اہم کیوں نہ ہوں) اپنے ہتھوڑے اور درانتی سے گرانے کی کوششیں کیں۔

لیکن کارل مارکس کا یہ ہتھوڑا اور درانتی اس کی زندگی میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ جرمنی میں پیدا ہوا تھا سارے یورپ میں دھکے کھاتا رہا اور انگلستان میں بھی قیام پذیر رہا مگر اشتراکی تحریک اس کی زندگی میں جلسوں اور جلوسوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ایک دو بار اس کے بعد مسلح انقلاب لانے کی کوششیں بھی کی گئیں مگر ناکام ہوئیں لیکن کارل مارکس کی موت کے 34 سال بعد اس کی توقعات کے بالکل خلاف اشتراکیت کا پہلا پودا ایک اجنبی سرزمین یعنی روس میں لگایا گیا۔ 1917ء کے اس انقلاب سے پہلے کوئی شخص مشکل سے یقین کر سکتا تھا کہ شہنشاہ زار کے مقبوضات میں بھی اشتراکیت کا جھنڈا لہرائے گا۔ خود مارکس کا خیال یہ بھی تھا کہ اس کے فلسفے کے لئے بہترین ملک صرف انگلستان ہو سکتا ہے یا وسطی یورپ لیکن زار روس کی حماقتوں اور حکومتی غلط حکمت عملیوں نے مارکس کے ارادتمندوں کو اپنی فتوحات کا پہلا موقع روس ہی میں عطا کر دیا۔ جب 1914ء میں جنگ عظیم اول میں کا آغاز ہوا ملک گیری کی بڑی بڑی توقعات لے کر زار کی فوجیں جرمنی اور آسٹریلیا ہنگری کی مخالفت کے ساتھ مشرقی یورپ میں اتر آئی تھیں اور برطانیہ اور فرانس اس کے اتحادیوں میں شامل تھے۔ مگر 1917ء میں اسے جرمنی کے ہاتھوں بہت بری طرح شکست ہوئی اور روس میں سخت ابتری اور بے چینی پھیل گئی۔

اشتراکیت کی تحریک کے راہنماؤں نے اس بے چینی اور ابتری سے فائدہ اٹھا کر زار کے خلاف کھلی بغاوت کی یا انقلاب بپا کر دیا اور اسے معزول کر کے ایک نئی حکومت بنانے کی کوششیں کیں ان کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے جرمنی سے صلح کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ برسٹ لٹوفسک کے مقام پر نئی اشتراکی حکومت نے جرمنی سے بہت دب کر جیسے پہلے 1905ء میں دب کر جاپان سے صلح کر لی تھی ویسے ہی بالکل ایک عاجز و کمزور قوم کی حیثیت سے صلح کی اس صلح کے نتیجے میں روس کو اپنا بہت سا علاقہ فاتح جرمنی کو اپنے ہاتھ سے دینا پڑا اور بہت سی پابندیاں بھی قبول کرنا پڑیں اس کے ایک سال بعد 1918ء میں جرمنی کو شکست ہوئی مگر چونکہ برطانیہ فرانس اور امریکہ کو روس کی اشتراکی حکومت سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اس لئے ان کی طرف سے بھی بریسٹ لٹوفسک کے معاہدے کو برقرار رکھنے کی کوششیں کی گئیں۔ جب 1919ء میں صلح کانفرنس منعقد ہوئی تو نئے روس کے کسی نمائندے کو شرکت دعوت نہیں دی گئی، کہا گیا کہ ابھی اس ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی ہے اس لئے اس کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا غرض اس طرح روس کی غیر حاضری میں صلح کانفرنس کی رکن ریاستوں نے بریسٹ لٹوفسک کی پیدا کی ہوئی نئی ریاستوں اور پابندیوں کو مان لینے کا اعلان کیا۔

زار کی حکومت:۔ زار کی حکومت روس میں مطلق العنان شاہی کا بدترین نمونہ تھی۔ زار مذہبی اور دینوی دونوں لحاظ سے روس کی عوام کا "باپ" تھا اور دربار و کلیسا دونوں جگہ اس کے آگے عقیدت و اطاعت سے گردن جھکانا لازم تھا جیسے ترکی میں خلیفۃ المسلمین کے آگے ضروری تھا۔ ایک حد تک وہی حیثیت روس زار کو حاصل تھی چنانچہ جب سلطان محمد ثانی کے زمانے میں یونانیوں پر سختیاں ہوئیں تو زار نے سلطان ترکی سے ان سختیوں کے ازالہ کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا کہ وہ یونان کے

عیسائیوں کا بھی محافظ ہے۔ محافظت کے اس سوال نے سلطان کو چونکا دیا وہ اپنی رعایا کا محافظ خود رہنا چاہتا تھا۔ روس کی یہ مداخلت اسے گوارا نہ تھی نتیجتاً انیسویں صدی سے پہلے جنگ عظیم تک روس اور عثمانی سلطنت کے درمیان سخت جنگیں ہوئیں اور دونوں ممالک کے تعلقات بالشویک حکومت کے قیام تک نہایت خراب رہے۔

نہلزم NIHILISM یا انعدام پسندی:

زار اگرچہ روحانی پیشوا بھی تھا اور دنیاوی سردار بھی مگر اس کے باوجود روس کے عیسائی عوام اس سے سخت نالاں تھے۔ یورپ کی جمہوری یا دستوری دنیا میں صرف زار کی حکومت ہی خالص مطلق العنانی پر مبنی تھی۔ روس کی عوام میں غربت و افلاس حد درجہ تک پہنچ چکا تھا اور زار کے خلاف بغاوت اور سرکشی کا سمندر موجزن تھا۔ انارکزم یا نراج کے جذبات روس کے نوجوانوں میں پھیل چکے تھے۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر نہلزم یا انعدام پسندی کے نام سے ایک تحریک نے جنم لیا جس کے ارکان کا کام قتل و تباہی کے سوا کچھ نہ تھا نہلزم دراصل انتقام، نفرت اور غصے کے جذبات کے اس خوفناک ترین ردعمل کا نام تھا جو زار کی شہنشاہیت کے خلاف روس کے حساس نوجوانوں میں پیدا ہو گیا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ معاشرے کا ہر ہر گوشہ گندہ ہو چکا ہے اس لئے ہر چیز کو کاملاً منہدم کر دیا جائے اسی صورت حال کا نتیجہ ہوا کہ سرکاری عہدہ داروں کے قتل کرنے کے واقعات آئے دن ہونے لگے خود شہنشاہ کو اپنی جان کا سخت خدشہ تھا انتہائی حفاظتی تدابیر کے باوجود روس کے کئی بادشاہ محل ہی میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ روس کا جرائم خفیہ تحقیقات کا محکمہ اوچرانا OCHRANA ہر وقت باغیوں کا ٹوہ لگانے میں مصروف رہتا۔ لاکھوں انسان محض شک و شبہ کی بنیاد پر گرفتار کیے جا چکے تھے چنانچہ یا تو سزائے موت دی جاتی یا پھر سائبیریا کے برفانی علاقے میں جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔ ان سختیوں کے باوجود بادشاہت کے خلاف روسی عوام میں غم و غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

روس بنیادی طور پر ایک زرعی ملک تھا مگر زار نے اسے یورپ کے صنعتی انقلاب کی بنیاد پر دوسرے یورپی ممالک کی طرح صنعتی بنانا چاہا۔ فرانس اور برطانیہ کے اشتراک سے بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے۔ 1914ء میں جنگ چھڑی تو ماسکو کے کارخانوں میں 25 لاکھ سے زائد مزدور کام کر رہے تھے مگر ان مزدوروں کی حالت بڑی خراب تھی ان مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا اور کم مزدوری دی جاتی۔ بڑھاپے اور بیماری کی صورت میں کوئی رعایت بھی نہ تھی۔ جب تک تندرست کام کرو بیمار ہو جاؤ یا ہاتھ پیر مشینوں میں آجانے کی وجہ سے ٹوٹ جائیں۔ گھر بیٹھو اور فاقے کرو۔ مزدوروں کے لئے عمر کی کوئی قید بھی نہیں تھی۔ مزدور بچہ ہو یا جوان لڑکا ہو یا لڑکی اگر کارخانہ دار کو ضرورت ہے خوب رگڑ رگڑ کر اس سے کام لیا جاتا اور اس کے بدلے میں سہولتیں مفقود تھیں۔

اشتراکیت کی تخم ریزی:

مزدوروں کی اس بدحالی نے روس کے بہت سے رحم دل انسانوں کو ان سے ہمدردی کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک جماعت 1897ء میں بنائی گئی جس کا نام اشتراکی جماعت تھا اور اس کا الحاق یورپ کے ترقی یافتہ اقوام کی اشتراکی تنظیموں سے تھا۔ اس سے 33 سال پہلے اشتراکیت کے باوا آدم کارل مارکس کی راہنمائی سے مزدوروں کی انجمن کے نام سے ایک جماعت بنائی گئی جس نے 1871ء میں زار روس کے خلاف بغاوت کر کے ایک انقلاب لانے کی کوشش

کی تحریک ناکام رہی تھی جس کے بعد زار نے باقی انقلابیوں کی سخت ترین سرکوبی کی تھی۔ کچھ دنوں تک تو سناٹا چھایا رہا مگر اشتراکیوں نے ایک جماعت پھر قائم کر لی یہ پہلی اشتراکی جماعت کے مقابلے میں امن پسند تھی۔ مزدوروں کی بدحالی اور غربت کی وجہ سے اس جماعت کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی اور ننگے بھوکے مزدوروں کی بڑی تعداد جوق در جوق اس کی رکن بنے گی، لیکن روس کی شہنشاہیت میں اس پرامن اور صلح جو جماعت کی بھی گنجائش نہ تھی۔ زار کی حکومت کسی ادنیٰ سے ادنیٰ شورش کو بھی پسند نہیں کر سکتی تھی۔

قدرت کا یہ پرانا قانون ہے کہ حق کی آواز کو جتنا دبایا جائے اتنی ہی شدت سے ابھرنے کی ہمت اس میں پیدا ہوتی ہے۔ مظلومیت ظلم ہی کے پانی سے سیراب ہوتی ہے اور مظلوموں کے غم و غصے کو تشدد و سخت گیری سے بجھانے کی جتنی کوشش کی جائے اتنا ہی وہ آگ کے شعلوں کی طرح اندر ہی اندر سلگنے لگتا ہے۔ مزدوروں کو دبا دبا کر شہنشاہ روس نے ان کے جذبات کو بے حد مشتعل کر دیا تھا۔ انہوں نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں بالآخر تخت شاہی کو الٹانے کا فیصلہ کیا۔

لینن:

لینن ایک سکول ماسٹر کا بیٹا تھا۔ وہ 1870ء میں پیدا ہوا زمانہ طالب علمی ہی سے وہ اقتدار و اختیار کی چیرہ دستیوں کے خلاف تھا اور سکول میں اس قسم کے جو مظاہرے ہوتے تھے ان میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ والدین نے اسے پیٹرز برگ وکالت کی تعلیم کے لئے بھیجا، لیکن یہاں اس کی باغیانہ انقلابی حرکتیں زیادہ نمایاں ہوئیں جن کے نتیجے میں اسے سائبیریا کے برفانی خطے میں جلاوطن کر دیا گیا۔ 1900ء میں اسے وہاں سے رہائی ملی مگر اب روس کی آب و ہوا اس کے لئے سازگار نہ تھی اسلئے وہ پیرس چلا آیا جو اُس جیسے انقلابیوں کا پرانا ٹھکانا تھا۔ یہاں سے وہ لندن آیا۔ 1905ء میں جب روس میں انقلاب کی ہوا چلی تو وہ واپس آیا مگر بغاوت کے ناکام ہونے کے بعد اسے روس پھر چھوڑنا پڑا۔ اب وہ سوئٹزرلینڈ چلا آیا اور بین الاقوامی اشتراکیت کا ایک بڑا راہنما بن گیا۔ یہیں ٹراٹسکی جیسے انقلابی سے اس کی ملاقات ہوئی جو کم عمری ہی میں مزدوروں کی جماعت بنانے کے سلسلے میں خود بھی جلاوطنی کی سزا کاٹ رہا تھا۔

ٹراٹسکی:

ٹراٹسکی عمر میں اگرچہ لینن سے چھوٹا تھا مگر اشتراکی انقلابیت میں وہ اس سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ 1898ء میں انقلاب پسندی کے جرم میں اسے بھی سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ وہ وہاں سے چھپ کر بھاگ نکلا اور سیدھا لندن پہنچا جہاں لینن جیسے انقلابی سیاس کی ملاقات ہوئی۔ 1905ء کے ناکام انقلاب کے دوران وہ بھی لینن کے ہمراہ روس آ گیا مگر پکڑا گیا اور اس بار بھی فرار ہو گیا اور بھاگ کر آسٹریا کے دارلحکومت ویانا پہنچا اور 1917 میں انقلاب روس تک بین الاقوامی اشتراکیت کا سرگرم رکن اور راہنما رہا۔ ٹراٹسکی نسلاً یہودی تھا اور ادب و خطاب میں اپنے ساتھیوں پر غیر معمولی فوقیت رکھتا تھا۔ روس کے انقلاب کی تاریخ اس نے تین جلدوں میں لکھی تھی جو 1933ء میں انگریزی زبان میں ترجمہ ہوئی اور اس کی ادبی صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔

استالن:

استالن کا باپ ایک موچی تھا اور اس کی خواہش تھی کہ مذہبی تعلیم حاصل کرے مگر استالن کا رجحان بچپن سے انقلابی سرگرمیوں کی طرف تھا۔ اس نے اشتراکی جمہوریت پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور اپنے وطن جارجیا میں شورشیں شروع کر دیں۔ 1902ء سے 1912 تک کے دس سالوں میں 12 مرتبہ سے زائد گرفتار کیا گیا اور آخر میں چار سال کے لیے سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔ ان لوگوں کے علاوہ بھی بہت سے انقلابی تھے جو روسی اشتراکیت کے دامن میں پناہ لیے ہوئے تھے۔

1905ء میں جب روسی فوجوں نے سائبیریا کے مشرقی ساحل پر جاپان سے شکست کھائی تو زار کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں۔ اشتراکیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علم بغاوت بلند کر دیا۔ قبل اس کے کہ ان کا یہ انقلاب کامیاب ہوتا کہ سائبیریا سے روسی فوجی واپس آ گئے، جن کی مدد سے زار نے یہ انقلابی کوشش کچل دی اور یہ انقلاب ناکام ہو گیا۔

انقلاب روس:

جب 1914 میں جنگ عظیم شروع ہوئی تو زار نے بھی اپنی فوجیں ترکی اور جرمن کے خلاف میدان جنگ میں جھونک دیں۔ 1917ء تک زبردست لڑائی ہوتی رہی لیکن آخر کار روسی جرمنوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور روس کو شکست ہوئی۔ خود روس میں اس شکست سے بددلی اور بے چینی کا سیلاب آ گیا جس میں زار کی شہنشاہیت بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ مارچ 1917ء میں جیسے پہلے ذکر آیا ہے روس کے عوام اور فوج دونوں نے بغاوت کر دی اور زار کو معزول کر کے جمہوریت قائم کر دی۔ مگر جب لینن وطن واپس لوٹا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کی شہنشاہیت کے کھنڈرات پر جو نئی حکومت قائم ہوئی ہے وہ اعتدال پسند مینشویک راہنماؤں کے ہاتھ میں ہے جن میں طبقہ بالا سے امراء اور روساء اور سرمایہ دار بھی شامل تھے۔ لینن نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے نتیجے میں نئی اعتدال پسند مینشویک حکومت کی نظر میں لینن اور اس کے انقلابی ساتھی کانٹا بن کر کھٹکنے لگے اور ان کی گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا۔ لیکن لینن روپوش ہو گیا۔ 20 اکتوبر 1917ء کو بالشویک پارٹی نے ایک انقلاب انگیز فوجی کمیٹی قائم کی جس کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنا طے ہوا۔ حکومت نے 25 اکتوبر کو تمام ملک سے منتخب نمائندوں کی کانفرنس مقرر کی تھی، مگر بالشویک پارٹی کو اعتماد نہ تھا کہ مجلس اس کے حق میں فیصلہ کرے گی۔ اس لیے انہوں نے 25 اکتوبر کو ہی یورش شروع کر دی اس روز حکومتی دفاتر پر دھاوا بول دیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ عارضی حکومت معزول کر دی گئی ہے اب اقتدار و اختیار حکومت مزدور اور سپاہیوں کی بنائی گئی سوویت کے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ انقلاب انگیز فوجی کمیٹی اس کی اعانت کے لئے تیار ہو گئی۔ 26 اکتوبر کو بالشویک دور حکومت کا اعلان پیٹرزبرگ میں ہوا۔ یوں تو برائے نام اس حکومت کی باقاعدہ وزارت قائم کی گئی مگر درحقیقت حکومت کی باگیں لینن اور ٹروٹسکی کے ہاتھ میں تھیں۔ لینن کمیونسٹ حکومت کی جان تھا اور ٹروٹسکی روح رواں۔ یوں روس میں آنے والے انقلاب نے اشتراکیت کا رنگ اختیار کر لیا۔

اشتراکی نظام:

بالشویک حکومت نے وجود میں آتے ہی سیاست و معیشت کا جو نظام رائج کیا وہ اشتراکی نظام تھا جو مختصراً یہ تھا۔

1- تمام دولت اور وسائل حصول دولت کو حکومت کی ملکیت قرار دیا گیا۔
2- بیرونی ممالک سے تجارت کا اختیار بھی حکومت کے سپرد کیا گیا۔
3- زار کے زمانے کے جتنے قرضے بیرونی ممالک کو واجب الادا تھے وہ سب منسوخ کردیے گئے۔
4- افراد کی ذاتی ملکیت ختم کر کے دولت کو قوم کی مشترکہ ملکیت قرار دیا گیا۔
5- کسانوں سے حکومت کی مقرر کردہ قیمت پر غلہ مانگا گیا۔ اور جو نہ دے اس کے لئے سزائے موت مقرر کی گئی۔

علاوہ ازیں بالشویک حکومت نے روس کو جنگ عظیم اول سے نکال لیا اور جرمنی سے صلح کی بات چیت کی۔ اگرچہ جرمنی نے روس کو شکست تو دے دی مگر روس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ مگر لینن جنگ کے خلاف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ روس کا ایک آدمی بھی ان سرمایہ دار ملکوں کی جنگ میں شرکت کرے۔ لہذا اس نے جرمنی سے بریسٹ لٹوفسک کے مقام پر صلح کر لی۔ اس صلح کی شرائط جرمنی کے لئے فاتحانہ اور روس کے لئے مفتوحانہ تھیں۔ مگر لینن نے ذلت کے یہ کڑوے گھونٹ عارضی سمجھ کر پی لیے۔ کیونکہ جرمنی کی شکست اسے مستقبل قریب میں صاف نظر آرہی تھی اور جرمنی کی شکست کے بعد یہ شرائط صلح خود بخود کالعدم ہو جانا تھیں۔ لیکن جرمنی کی شکست سے روس کو فائدہ نہیں پہنچا اور جو حصے روس سے کاٹ کر خود مختار ریاستوں میں تبدیل کردیئے گئے تھے وہ اسے واپس نہ مل سکے۔ روس کے مغربی ساحل پر لتھوانیا، اسٹونیا اسی وجہ سے قائم ہوئے تھے اور ایک حصے کا نام پولینڈ رکھ دیا گیا تھا۔

ان علاقوں کے روس سے کٹ جانے کی وجہ سے روس کے پاس صرف لینن گراڈ کی ایک بندرگاہ رہ گئی۔ تاہم مغرب میں جو علاقہ بالشویک حکومت کے قبضہ میں آیا اس کا تحفظ بڑی پامردی و بہادری سے کیا گیا۔ بیرونی محاذ پر جانبازانہ مقابلے کے بعد کیمونسٹ حکومت کو اندرونی باغیوں یا انقلاب شکن طاقتوں کے خلاف بھی لڑنا پڑا۔ ان اندرونی باغیوں کو کچلنے کے لئے خفیہ محکمہ اوچرانا OCHARNA کی طرز پر ایک ادارہ قائم کیا گیا جس نے انقلاب شکن طاقتوں کو بڑی بیدردی سے تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق 1918ء کے آخر سے 1919ء کے اوائل تک اس ادارے نے سات ہزار باغیوں کو سزائے موت کا حکم دیا۔

اس زمانے میں جو نظام حکومت قائم کیا گیا اس کا نام "جنگی اشتراکیت" رکھا گیا جس میں ڈکٹیٹر شپ (آمریت) اپنی آخری حدوں کو چھونے لگی اور جبر و تشدد کے بے رحم ہاتھ سے ہر مخالفت کو کچل دیا گیا۔ اپنے دشمنوں کو پست کر کے ان پر قابو پانے کے بعد حکومت نے زندگی کے دوسرے شعبوں سے قطع نظر کر کے خاص دستور حکومت میں تبدیلیاں کیں۔ آئین دستور کا پہلا مسودہ 1918ء میں تیار کیا گیا۔ جب روس میں 1921ء میں کئی اور ریاستوں کو شامل کیا گیا تو آئین و دستور میں ترامیم و تنسیخ ہوئی۔

کسانوں کی بغاوت:

بالشویک یا کیمونسٹ حکومت کے قیام کے وقت کسانوں کو اپنی طرف کرنے کے لئے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آج سے

زمینداری کا پرانا نظام ختم کیا جاتا ہے اس لئے کاشتکار بطور خود زمینوں پر قابض ہو جائیں۔ اس اعلان نے واقعی کسانوں کو خوش کر دیا اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے پرانے مالکان اراضی کو نکال باہر کیا۔ مگر اب پرانے زمینداروں کی بجائے نئے زمیندار پیدا ہو گئے۔ کمیونسٹ حکومت جو اشتراکی اصولوں کی بنیاد پر امیر غریب کا فرق مٹانا چاہتی تھی اور دولت کی زیادتی کی وجہ سے انسانی معاشرے میں جو طبقات قائم تھے ان کو ختم کرنا چاہتی تھی اس کے لئے دیہاتوں کی یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ حکومت نے جلد ہی ان نئے زمینداروں کے خلاف بھی کاروائی شروع کر دی تو ان میں برہمی پھیل گئی۔ پھر چونکہ عام کاشتکار جاہل تھے، انہیں امیر کسانوں نے بہکا دیا جس کی وجہ سے کسانوں کا پورا طبقہ بالشویک حکومت کے خلاف ہو گیا۔ بالشویکوں نے سختی کے ساتھ اس شورش کو دبانا چاہا تو اور آگ بھڑکی۔ کسانوں نے کہا کہ ہم نے پرانے زمینداروں کو اس لئے تو نہیں نکالا تھا کہ ان کی جگہ پر تم جیسے خونخوار انسانوں کو اپنے اوپر مسلط کر لیں۔ شومئی قسمت سے اس زمانے میں خشک سالی بھی آ گئی۔ غرض 1921ء میں حکومت کی سختیوں اور ارضی و سماوی آفتوں دونوں سے کسانوں کو جو نقصان پہنچا اس سے تقریباً ایک کروڑ انسان لقمہ اجل بن گئے۔ لیکن اتنے بڑے قحط اور جانی نقصان کے باوجود کسانوں کی بغاوت نہ دب گی۔ آخر لینن نے ایک نیا اقتصادی پروگرام بنا کر کسانوں سے سمجھوتا کر لیا۔ اس نئے پروگرام میں اسے اشتراکی اصولوں سے کچھ ہٹنا پڑا مگر اس وقت اس کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ نیا پروگرام یہ تھا۔

1۔ یہ اشتراکی طریقہ ختم کر دیا گیا کہ کاشتکار اپنی ضرورت کے مطابق غلہ رکھ کر باقی تمام حکومت کو دے دیں۔ اس کے بجائے یہ طے ہوا کہ صرف ایک خاص مقدار غلے کی ٹیکس کے طور پر ان سے وصول کی جائے۔ اور اس کے بعد جو کچھ بچ جائے وہ ان کی ذاتی ملکیت ہوگی جسے وہ حسب دستور منڈیوں میں بیچ سکتے ہیں۔

2۔ کارخانوں اور صنعتی کاروبار کے اداروں پر حکومت نے جو تسلط قائم کر دیا تھا اسے کچھ کم کیا گیا اور چھوٹے کارخانوں کو یہ موقع دیا گیا کہ پہلے کی طرح مال بنائیں اور بیچ کر منافع کمائیں۔

3۔ بیرونی ممالک کی کمپنیوں کو روس میں کاروبار کرنے کے سلسلے میں کچھ مراعات دی گئیں۔

4۔ بڑے کارخانوں کو بھی خود مختاری کے ساتھ ساتھ (معاشی ادارہ عالیہ) برائے نام تنظیم کرنے کی اجازت دی گئی مگر اس کو پابند بھی کیا گیا کہ مزدوروں کی اجرت وغیرہ طے کرنے اور کاروبار کی ترقی کی سکیموں کے اخراجات کو نکالنے کے بعد جو رقم بچے وہ معاشی ادارہ عالیہ کو دیں۔

5۔ اب تک جو "جنگی اشتراکیت" قائم تھی اس میں ہر ایک کو کھانے پینے کے لئے راشن کارڈ ملتے تھے۔ مگر اب اس کی بجائے ایک نیا سکہ جاری کیا گیا یہ تھا نیا اقتصادی پروگرام جس میں ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے سرمایہ جمع کرنے اور ذاتی ملکیت کو فراہم کرنے کی اجازت دی گئی تھی مگر اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ تجارت میں جو مقابلہ بازی یا کمپی ٹیشن کی جو روح ہوتی ہے اسے ختم کیا جائے اور اس کی بجائے باہمی تعاون و اشتراک عمل کی روح پیدا کی جائے۔

اس طرح اس نئے پروگرام نے کسانوں کی مخالفت بھی ختم کر دی اور شہریوں کی نئے نظام سے پیدا کردہ بے چینی کو بھی دور کر دیا لوگ آہستہ آہستہ پھر دولت جمع کرنے لگے۔ اس پروگرام سے اشتراکی حکومت کو ملکی معاشیات پر قبضہ کرنے

کے لئے نئی تجویزیں سوچنے کا موقع میسر آ گیا کیونکہ اشتراکیت کا مقصد و منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ملک کے تمام معاشی وسائل حکومت کی براہ راست نگرانی اور قبضے میں ہوں تاکہ ہر شخص کی معاشی ضروریات کی تکمیل حکومت کی جانب سے عمل میں آتی رہے۔

پہلا اشتراکی نظام:

چار پانچ سال تک کمیونسٹ حکومت کو خارجی جنگوں اور داخلی بدامنیوں سے نبرد آزما رہنا پڑا اس لئے وہ کوئی مستقل اشتراکی نظام نہ رائج کر سکی۔ 1923ء میں اس نے پہلا دستور اساسی شائع کیا جس طرح 1878ء میں دنیا کا پہلا جمہوری آئین انقلاب فرانس کے بعد تیار ہوا تھا اسی طرح 1923ء میں دنیا کا پہلا اشتراکی دستور انقلاب روس کے بعد بالشویک حکومت نے مرتب کیا۔ اگرچہ اس دستور میں کمیونسٹ پارٹی کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا مگر حقیقت یہ تھی روس کی اصلی حکمران طاقت اس پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ساتھ ہی روس میں کوئی اور جماعت بنانے کی ممانعت کر دی گئی اور صرف کمیونسٹ پارٹی کا وجود باقی رہا۔

لینن کا انتقال:

1924ء تک لینن کمیونسٹ حکومت کی راہنمائی کرتا رہا مگر اس کی صحت جواب دے چکی تھی۔ وہ اپنی انقلابی کوششوں کے دوران بندوق کی ایک گولی کا نشانہ بن گیا تھا، اگرچہ وہ گولی جان لیوا ثابت نہیں ہوئی تھی مگر وہ گولی اس کے جسم ہی میں پیوست رہی اس کے باوجود وہ حد سے زیادہ کام کرتا رہا خصوصاً انقلاب روس کے بعد اس نے بڑی محنت کی۔ 1923ء میں اس پر مرض کا سخت حملہ ہوا مگر وہ جانبر ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے آرام کرنے کی سختی سے ہدایات دیں مگر وہ باز نہ آیا۔ اسی سال اسے دوسرا شدید دورا پڑا جس نے اسے مفلوج کر دیا اور اس کے بولنے کی سکت جاتی رہی۔ 21 جنوری 1924ء کو انقلاب روس کا یہ عظیم ہیرو اور مارکسی اشتراکیت کو عملی شکل دینے والا انسان انتقال کر گیا۔

سٹالن اور ٹراٹسکی میں کشمکش اقتدار:

اتفاق سے لینن کے انتقال کے وقت ٹراٹسکی بیمار تھا اور مرکز سیاست سے دور ایک گاؤں میں مقیم تھا۔ اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے سٹالن نے جو کمیونسٹ پارٹی جنرل سیکرٹری تھا۔ بالشویک حکومت کی باگ ڈور تین ارکان کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دی جس میں خود سٹالن بھی شامل تھا اس کے علاوہ کامنیف اور زنوویف اس کے رکن تھے۔ ان دونوں حضرات کی قابلیت سے کسی کو انکار نہ تھا مگر وہ لینن کے قائم مقام بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے مگر اسٹالن جو اس منصب کے لئے ان دونوں سے زیادہ نااہل سمجھا جاتا تھا آہستہ آہستہ اقتدار پر قابض ہو گیا۔

ٹراٹسکی پورے سال بیمار رہا جب 1925ء میں صحت یاب ہوا تو اسے بتا دیا گیا کہ آپ اب تک وزیر جنگ کے عہدے پر مامور تھے لیکن آج سے آپ سے یہ عہدہ واپس لیا جاتا ہے اور آپ کو اس کی جگہ بجلی اور سائنس کا محکمہ دیا جاتا ہے۔ ٹراٹسکی نے یہ وزارت بھی خوشی سے قبول کر لی۔ لینن کے انتقال کے بعد ٹراٹسکی کے مخالفوں کو بڑی فکر ہوئی وہ ٹراٹسکی کو برسر اقتدار نہیں دیکھ سکتے تھے اس لئے اندر ہی اندر اس کے خلاف لاوا پکنے لگا۔ ادھر ٹراٹسکی نے کسی بات کی مطلق پرواہ نہ کی

اور سب پر نکتہ چینی اپنی عادت کے مطابق بلاخوف شروع کر دی اور تو اور اس نے لینن کے "نئے معاشی پروگرام" کی بھی کھل کر مخالفت کی اور کہا کہ یہ کیسی اشتراکیت ہے کہ دیہات میں ایک زمیندار طبقہ پیدا ہو رہا ہے۔ غرض ٹراٹسکی کو پارٹی سے نکالنے پر سخت اعتراض تھا۔

ٹراٹسکی کی جلاوطنی:

اسی اعتراض نے قدر رفتہ دوسرے کارکنوں کو اس کے خلاف کر دیا۔ سب سے پہلا اختلاف قومی اور بین الاقوامی اشتراکیت کے سوال پر پیدا ہوا۔ ٹراٹسکی کے مخالفوں کا کہنا تھا کہ پہلے روس میں ہمیں اپنی تنظیم کر لینا چاہیے پھر دوسرے ممالک کی طرف دیکھنا چاہیے۔ مگر ٹراٹسکی ان دلائل سے مطمئن نہ ہوتا تھا۔ وہ بین الاقوامی اشتراکیت کا حامی تھا اور بدستور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ سٹالن کے اس کے خلاف فضا ہموار کی اور بڑی چالاکی اور حکمت عملی سے پہلے زنوویف اور کامنیف کو اقتدار اعلیٰ کی کمیٹی سے علیحدہ کر کے تنہا خود کو اقتدار کا مالک بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر 1928ء میں اس نے ٹراٹسکی کو بھی پارٹی سے خارج کر کے اسے روسی ترکستان میں جلاوطن کر دیا جہاں سے 1929ء میں وہ قسطنطنیہ چلا گیا پھر انگلستان اور ڈنمارک نے اسے اپنے ہاں رہنے کی اجازت نہ دی البتہ 1931ء میں اسے سپین میں قیام کی اجازت مل گئی۔ آخر غریب الوطنی کی حالت میں اسے جنوبی امریکہ میں کسی مخالف نے گولی سے اڑا دیا۔ مورخین کے مطابق اس کی موت کا ذمہ دار بھی سٹالن ہی تھا۔

سٹالن کا عروج:

اب سٹالن روس میں ڈکٹیٹر بن چکا تھا اگرچہ اس کی شخصیت کوئی اثر انداز ہونے والی شخصیت نہیں تھی مگر وہ بڑا محنتی ضرور تھا۔ اسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ لینن کے اندھے معتقدوں میں سب سے آگے تھا اس کا اصل نام سٹالن نہ تھا دراصل یہ اس کا لقب ہے جو اسے لینن ہی نے دیا تھا۔ روسی زبان میں اسٹالن کا مطلب "فولادی انسان" کے ہیں۔ 1917ء کے انقلاب میں اس نے کوئی خاص خدمات انجام نہیں دیں تھیں مگر خانہ جنگی کے زمانے میں اس نے زارٹسین کے شہر کا اس کامیابی سے دفاع کیا تھا کہ اس شہر کا نام سٹالن گراڈ رکھ دیا گیا تھا۔ اگرچہ لینن ٹراٹسکی کو کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری بنانا چاہتا تھا مگر ٹراٹسکی نے اس کلیدی عہدے کو اپنی شان سے کمتر سمجھتے ہوئے اسے قبول نہ کیا، مجبوراً یہ عزت سٹالن کو دینا پڑی جو اس کے لیے عروج تک پہنچنے کا زینہ ثابت ہوئی۔ ٹراٹسکی کی مخالفت سے نجات حاصل کرنے کے بعد سٹالن نے جس ریاستی سرمایہ داری کو رواج دیا اس میں تجارت وصنعت کا تمام منافع حکومت کو دے دیا جاتا اور پھر ان اداروں کو جو صنعتی ترقی کی غرض سے بنائے جاتے حکومت کی طرف سے کچھ رقم گرانٹ کے طور پر دی جاتی۔ اسی طرح اشیاء کی قیمتوں کا فیصلہ بھی حکومت کرتی بعض صورتوں میں یہ نرخ لاگت سے کم ہوتا اور بعض میں زیادہ۔ اگرچہ بالشویک دراصل کمیونزم قائم کرنے میں اتنے کامیاب نہیں ہوئے جتنی کامیابی انہوں نے سرمایہ داری کو گرانے میں حاصل کی۔ بہت سے کمیونسٹوں کا خیال یہ تھا کہ روس کا انقلاب ان خطوط کے خلاف جا رہا تھا جو کارل مارکس نے متعین کئے تھے۔ تاہم روس کے سیاسی کارکن مارکس کو ہی اپنا پیغمبر سمجھتے تھے اور اس کی تصنیفات کو اس طرح پڑھتے جیسے الہامی کتب کو پڑھا جاتا ہے۔ 1848ء کا اشتمالی منشور یا کمیونسٹ مینی فسٹو انقلاب روس کا آسمانی صحیفہ تھا جس کے ایک ایک نکتہ کو زیر عمل لانے کی کوششیں کی جاتی

رہی بالکل اسی طرح جیسے 1789ء میں انقلاب فرانس کے دوران روسو کا ''معاہدہ عمرانی'' انقلابیوں کیلئے توریت وانجیل بن گیا تھا کہ اس کی ہر ہر سطر کو الہامی کتب کی سی تقدیس وتنظیم کے ساتھ دیکھا اور پڑھا جاتا تھا۔ لینن کو مارکس کے اصول کا الہامی شارح سمجھا جاتا تھا۔ جب ٹراٹسکی اور سٹالن کا اختلاف بڑھا تو دونوں ایک دوسرے کو مارکس اور لینن کے اصولوں سے ہٹ جانے کا الزام دیتے تھے اس بحث بحثی میں اسٹالن کی فتح کا مطلب یہ تھا کہ اس کی بتائی گئی شرح وتفسیر صحیح تھی اور ٹراٹسکی باطل۔ اس کے بعد سٹالن کی شرح وتفسیر کو نہ ماننا کفر والحاد ٹھہرا جس کی سزا روس میں وہی تھی جو مذہبی دنیا میں ان جرائم کی ہے یعنی جلاوطنی، حبس دوام یا موت۔

معاشی ترقی کا پنج سالہ پروگرام:

لینن کہا کرتا تھا کہ اگر ہم بھاری صنعتوں کو منظم کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو ہم اشتراکی ریاست تو کجا مہذب ریاست کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہوں گے۔ معاشی ترقی کے لئے پروگرام تو لینن کی زندگی میں ہی شروع کر دیئے گئے تھے مگر اس کے بعد اب سٹالن نے صنعتی وزراعتی ترقی کا ایک پانچ سالہ پروگرام بنایا، جس کا آغاز یکم اکتوبر 1928 سے ہوا۔ اس پروگرام کے دو حصے تھے ایک کا تعلق صنعتی ترقی سے تھا دوسرے کا زرعی ترقی سے۔ روس کی نئی حکومت دراصل صنعتی مزدوروں کے ہاتھ میں تھی جو شہروں میں رہتے تھے اور تعلیم یافتہ تھے اور اپنے سامنے شاندار مستقبل رکھتے تھے۔ لیکن روس کے کسانوں کا معاملہ اس کے برعکس تھا، ان کے سامنے کوئی مستقبل نام کی چیز نہ تھی صرف یہ ہوا کہ پرانے زمینداروں کی جگہ نئے زمینداروں نے لے لی تھی۔ اس پنجسالہ منصوبے میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ زمین کی انفرادی ملکیت ختم کر کے اجتماعی ملکیت پیدا کی جائے۔ اس مقصد کے تحت لینن کے بنائے ہوئے معاشی پروگرام کو ختم کر دیا گیا اور کسانوں سے چھین چھین کر زمینیں یا تو ریاستی ملکیت میں دے دی گئیں یا ریاست کی طرف سے کسانوں کی ایک جماعت کو اجتماعی مالک قرار دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ زمین مشترکہ ہوگی تو اس سے اٹھایا جانے والا منافع بھی مشترکہ ہوگا۔

کسانوں کی دوسری بغاوت:

اشتراکی کارکنوں نے جب دیکھا کہ ان کا پروگرام جو پہلے جاری تھا بند کیا جا رہا ہے تو انہوں نے پہلے تو خوشامد اور ترغیب سے کام نکالنا چاہا مگر جب اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا اور زمینیں چھین لی جانے لگیں اور زمینداروں کو سائبریا جلاوطن کیا جانے لگا تو جیسے ہی کوئی کسان نئے پنج سالہ پروگرام سے انکار کرتا اس کی فوری سزا کا حکم جاری ہو جاتا۔ روس میں کسان 80 فی صد تھے لہذا اب کو سزا تو دی جانا محال تھی۔ بہت کچھ کیا مگر کچھ نہ ہوا ادھر کسانوں سے بھی کچھ نہ ہو سکا تو انہوں نے حکومت کی فراہم کردہ زرعی مشینری کو توڑنا شروع کر دیا اور غلے کے گوداموں کو اپنے ہاتھ سے آگ لگانے لگے۔ فصلیں خود ہی تباہ کر دیں اور اگر کام کیا بھی تو ٹوٹے دل سے۔

اشتراکی حکومت کے لئے یہ ایک بڑا نازک وقت تھا۔ مرکزی حکومت کو مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں جن میں کسانوں کی بغاوت کی خبر تھی۔ سٹالن نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اخبارات میں کارکنان کو زیادتی کا ملزم ٹھہرایا اور کہا کہ مرکز نے جو احکام بھیجے ان کی بجا آوری میں لوگوں پر تشدد کیا گیا۔ لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف انہیں اجتماعی کاشت کاری میں شریک کر لیا گیا۔ ایسا آئندہ ہرگز نہ کیا جائے گا اور اجتماعی کاشت کاری، ریاستی کاشت کاری میں شرکت کرنا ہر کسان کی

مرضی پر منحصر ہے اس طرح سٹالن نے موقع شناسی سے کام لے کر ایک سلگتی ہوئی آگ کو دبا دیا اور دوبارہ کھیتوں میں امن سکون سے کام ہونے لگا۔

آر۔اے۔پی۔پی۔ R.A.P.P.:

بالشویک حکومت نے آر۔اے۔پی۔پی۔ کے نام سے ایک سنسر قائم کیا تھا جس میں ہر تحریر کی جانچ پڑتال ہوتی تھی اور سوائے ان تحریروں کے جن میں انقلاب روس کا پروپیگنڈا ہو اور کسی تحریر کو اشاعت کی اجازت نہیں تھی۔ ان تحریروں کے علاوہ جتنی تحریریں ہوتیں وہ سب نذر آتش کر دی جاتی تھیں۔ یہ سنسر تصویر کشی نقاشی اور شعر و ادب کی موت ثابت ہوا۔ صرف کرائے کے ٹٹو قسم کے ادیب میدان میں نظر آنے لگے۔ ہر ذاتی قابلیت رکھنے والے شاعر اور ادیب کے حوصلے پست ہو گئے۔ 1932 تک یہ سنسر قائم رہا اس عرصے میں جو لٹریچر روس میں تخلیق ہوا وہ بالکل پھیکا تھا۔ اس کے بعد البتہ تحریروں میں کچھ تازگی پیدا ہوئی، لیکن پھر بھی مکمل آزادی قلم نہ ہونے کی وجہ سے ادیب کا دماغ پابند سلاسل تھا اس لیے اعلیٰ لٹریچر پیدا نہ ہو سکا۔ انقلاب روس کے وقت روس کی عوام 70 فی صد سے زیادہ ناخواندہ تھی۔ اشتمالی روس نے جب عوام کو تعلیم دینے کا پروگرام بنایا تو سب سے بڑی دقت زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوئی، لیکن اس وقت پر جلد ہی قابو پا لیا گیا یعنی ہر زبان میں تعلیم کا انتظام کر دیا گیا۔ مگر بعض مقامات پر مخلوط آبادی ہونے کی وجہ سے کئی کئی زبانوں میں تعلیم کا انتظام کرنا پڑا، جیسے خارکوف کے شہر میں یونانی، آرمینی، جرمن، تاتاری، روسی اور یوکرین چھ الگ الگ زبانوں کے سکول کھولنے پڑے۔

بالشویک حکومت اگرچہ صرف 70 سال بعد ناکام ہو گئی (1991) مگر اس کی تعلیمی پالیسی بڑی کامیاب رہی اور پوری طرح بارآور ہوئی آج روسی آبادی 100 فی صد خواندہ ہے اور بیشتر لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

کمیونسٹ روس اور مذہب:

روس میں تشدد پسند آمریت کے بعد دوسرا بڑا الزام جو بالشویک حکومت پر لگایا گیا کہ وہ مذہب کی مخالف تھی۔ 1941ء میں جب جرمن نے روس کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا تو برطانیہ اور امریکہ نے دشمن کے دشمن کو دوست سمجھ کر روس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تو ان ممالک میں عام طور پر یہ سوال کیا گیا کہ کیا روس مذہب کے خلاف ہے؟ کیا اشتراکیت خدا سے دشمنی ہے؟ کیا اشتراکی نظام میں خدا اور مذہب کی کوئی جگہ نہیں ہے؟ اس کے جواب میں روس کی طرف سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ۔ ہمارے یہاں ضمیر انسانی کو پوری آزادی حاصل ہے حتیٰ کے خدا کے منکروں اور مذہب کے مخالفوں کو بھی کھلے عام اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی مکمل اجازت ہے۔

اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ روس کا دامن اس الزام سے پاک و صاف نہیں تھا۔ علاوہ ازیں 1936ء کے آئین کی دفع 124 میں صاف مذکور تھا کہ مذہب و کلیسا کو تعلیم عامہ کے معاملے میں دخل دینے کی اجازت نہیں اور نہ سیاست اور حکومت کے معاملات میں مذہب کی کوئی آواز تھی۔ البتہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کی بھی اجازت تھی اور مذہب کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کی بھی۔ ظاہر ہے اگر مذہب کی تعلیم دینے کی اجازت نہ ہو اور نہ کسی اور طرح سے پروپیگنڈہ کرنے کی تو لازماً مذہب پر جمود طاری ہو جائے گا جو اس کی موت کے مترادف ہو گا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اشتراکیت

تمام صاحب اقتدار افراد لا مذہب تھے اور مذہب کا مضحکہ اڑانے اور اسے ایک لغو و لایعنی ''رسم کہنہ'' قرار دینے میں سب سے آگے تھے۔

ماسکو میں جو سب سے بڑا گرجا تھا اسے ڈھا کر اس کی جگہ اشتراکی مجلس کے لئے ایک محل تیار کیا گیا۔ ابتدا میں صرف رومن کیتھولک مذہب کے کلیساؤں پر پابندیاں لگائی گئی تھیں اور پروٹسنٹ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا، لیکن بہر حال تھا تو وہ بھی مذہب ہی اور اس میں خدا کا تصور موجود تھا، اس لئے 1929ء میں ایک قانون کی رو سے پروٹسنٹ عقیدے کی عام اشاعت کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ البتہ اس بات کی اجازت تھی کہ کوئی اگر کلیسا کے اندر جا کر خاموشی سے عبادت کرنا چاہے تو کر سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے مذہب کی اشاعت کئے بغیر اسے صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتا تو اس پر کوئی پابندی نہیں تھی بہر حال اشتراکی راہنما اس فلسفے سے خوب واقف تھے مذہبی خیالات کو جبر سے دبانے کا نتیجہ برعکس نکلتا ہے۔ اس لئے وہ تعلیم و تربیت اور ترغیب و تشویق کے زیادہ موثر ذرائع سے کام لے کر مذاہب کے تصور کو ختم کرنا چاہتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اگر ایک نسل نہ سہی تو دوسری نسل میں کم از کم روس میں مذہب کا ماننے والا کوئی نہیں رہے گا۔ پیغمبران خدا کی بجائے روسی اشتراکی پیغمبران مارکس اور لینن کو یاد کریں گے اور توریت و انجیل کی بجائے ان پیغمبروں کی کتابوں کی تلاوت کی جائے گی۔ مگر روسی اشتراکیوں کا یہ خواب ادھورا رہ گیا اور صرف 70 سال بعد مذاہب عالم روس میں پھر بحال کر دیئے گئے۔

روس کا مسلمانوں سے سلوک:

غرض روس کی عیسائی اور یہودی آبادی سے مذہب بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا البتہ مسلم آبادی سے مذہب کو ناپید کرنے میں روسیوں نے بڑی کوششیں کیں مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی اس سلسلے میں کافی سختیاں اور جبر سے کام لیا گیا اور اور ساتھ ساتھ ترغیب و تحریص کے ہتھیار بھی آزمائے گئے لیکن پھر مسلمانوں کو لادین بنانے اور داعی اسلامؐ کی بجائے مارکس اور لینن سے رشتہ عقیدت استوار کرانے میں اشتراکیوں کو ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اسلام کے پرانے تاریخی شہروں کو جن میں سمرقند بخارا شامل تھے اشتراکی پروپیگنڈے کا مرکز بنا لیا گیا۔ سمرقند کی جامع مسجد کا وہ مینارہ جہاں سے اذان کی صدا بلند ہوتی تھی گرا دیا گیا اور اس کی جگہ لینن کا بہت بڑا بت وہاں تعمیر کر دیا گیا اور اس کے نیچے یہ عبارت تحریر کی گئی تھی '' اس مینارے سے اب اذان کی آواز بلند نہیں ہوگی بلکہ مارکس اور لینن کی آواز سنائی دے گی''۔ مگر 1991ء میں جب وقت نے کروٹ بدلی اور 70 سال کے بعد ایک بار پھر وہاں سے آذان کی آواز بلند ہونے لگی اور مارکس اور لینن کی آواز ہمیشہ کے لیے دب کر رہ گئی۔

ع بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اشتراکیت کا ایک اصول اخلاق یہ تھا کہ اگر مقصد اچھا ہے تو اس کے حصول کے لئے ہر ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کسی اشتراکی مقصد تک پہنچنے کے لئے ایک اشتراکی ہر گناہ، ہر معصیت، ہر بداخلاقی اور ہر جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ غرض یہ کہ اگر مقصد اچھا ہو تو پھر اس کے حصول کے لئے کوئی ذریعہ برا نہیں۔ اس اصول اخلاق کی بنا پر روس کی کیمونسٹ حکومت خوب پیٹ بھر کر جھوٹ بولتی رہی اور خوب جی بھر کر تشدد سے کام لیتی تھی۔ اپنی مسلم رعایا کے مسئلے پر خاص طور پ

تشدد اور جھوٹ سے کام لیا جاتا تھا۔ تشدد کی پالیسی ملک کے اندر اور جھوٹ ملک کے باہر عام دنیائے اسلام کے لیے۔

روس اور مذہب کی مخالفت:

لیکن یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیمونسٹوں کو مذہب سے اتنی دشمنی کیوں تھی؟ اس کی محققین نے دو وجوہات بیان کی ہیں۔ ایک تو یہی کہ مارکسی کیموزم میں کائنات کی تخلیق وتکوین صرف مادے کے تصادم در تصادم پر منحصر اور کسی مادرائے احساس وادراک دنیا کا کوئی وجود نہیں اور دوسرے اس لئے کہ زار چونکہ روس کا صرف سیاسی بادشاہ نہیں تھا بلکہ روحانی پیشوا روحانی سردار بھی تھا۔ اس نے مظالم روا رکھنے کے لئے مذہب اور کلیسا سے بھی مدد لی تھی۔ اس چیز نے قدرتاً مطلق العنانیت کے ساتھ مذہب سے بیزاری کے جذبات پیدا ہو جانا لازم تھا۔ کیمونسٹوں کے نزدیک آخر وہ کیسا خدا اور کیسا مذہب تھا جو ہمیشہ زار ہی کی حمایت کرتا تھا اور جو غریبوں اور بے کسوں کو صرف برداشت اور ضبط کی تلقین کرتا تھا۔ مذہب کے بارے میں یہ سوال عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا تھا۔ پھر روسی معاشرے میں مفلسی اور فاقہ زدگی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ ہمیں اس دور کے مشہور مصنف میکسم گورکی اور لیوٹالسٹائی کی تصنیفات سے ہو سکتا ہے۔ میکسم گورکی نے اپنی کتاب میں امیروں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''تم لوگو نے اس دنیا کو غلاظت اور گندگی کا ایک اتھاہ گڑھا بنا رکھا ہے۔ تمہارے فعل میں اور ہر قول میں نجاست اور ناپاکی کے چھینٹے اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا تمہارے دل میں ایمان وضمیر کی کوئی ہلکی سی تڑپ بھی موجود ہے؟ کیا تم کبھی بھی اس دنیا کے خالق اصلی کو یاد کرتے ہو؟ تمہارا خدا صرف پیسہ ہے اور تم صرف اس کی پوجا کرتے ہو۔ اے سرمایہ پرستو! اس عذاب الٰہی کے لئے تیار ہو جاؤ جو جلد ہی تم پر پھٹنے کو ہے۔ انسانیت کا لہو چوسنے والی جونکوں! تم کمزوروں اور بے بسوں کی محنت اور قوت کے سہارے جیتے ہو لیکن یاد رکھو ایک دن تم برباد ہو جاؤ گے اور تمہیں پائی پائی کا حساب دینا ہوگا۔ یہاں تک کہ غریبوں اور بے کسوں کے آنسوؤں کی بھی تم سے باز پرس ہوگی جو تمہاری دولت پروری کی وجہ سے بہائے جا رہے ہیں''۔ میکسم گورگی نے جو کچھ کہا تھا وہ ایک کھلی پیش گوئی تھی جسے پورا ہو کر رہنا تھا۔ زار کے مظالم کی تخم پاشی سے روس میں انارکی، بہلوم اور زراج کے جو پودے تیار ہوئے تھے انہیں بالآخر تناور ہو کر برگ وبار لانا تھا اور وہ وقت آنا تھا جب تاج شاہی اور تاج شاہی کے سب حامی غریبوں کے آنسوؤں میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جانے والے تھے۔ پھر اگر مذہب وکلیسا بھی زار کے حامی تھے تو ان کی تباہی انقلابیوں کے نزدیک کونسی غیر فطری بات تھی۔ روس کا بچہ بچہ زار شاہی کے مظالم کی یاد سانحہ کربلا کی یاد کی طرح، ہر وقت نوک زبان رکھتا تھا۔ پھر کیا ایسی یادگار کو بھی شاہی محلات کی طرح نیست ونابود ہونے کا جذبہ ''باغیوں'' میں پیدا نہ ہوتا؟ دراصل انقلابی پچھلے زمانے کی ہر یادگار کو ملیامیٹ کر دینا چاہتے تھے چاہے وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو۔

مگر روس کی مسلم عوام کا مسئلہ اس سے جدا تھا۔ وہ زار کے سیاسی مظالم کے شکار ضرور تھے مگر کلیسا کی طرح اسلام زار کا حامی نہیں تھا۔ اسلام سے زار کو دشمنی تھی اگرچہ وہ عیسائیت کا باپ تھا، لیکن وہ بھی اس کے ہاتھ سے فریاد کناں تھی اور زبان حال سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو؟

دنیا نے روس کی عیسائیت کا یہ منظر بھی دیکھا کہ اس کا ذرہ ذرہ زار کے آگے سر تسلیم خم کئے کھڑا رہتا تھا مگر اسلام نے

بات نہ تھی۔ اس لئے یہ فطری امر تھا کہ روس کی عوام اسلام سے بے زار کیوں ہوں؟ عیسائی اپنے روحانی باپ کے محل و گرجا دوں کو ڈھا دیں مگر مسلمان کیوں اپنی مسجدیں ڈھائیں؟ دراصل یہی وہ نفسیاتی فرق تھا جو روس کے مسلمان اور عیسائیوں میں قائم رہا جس کی وجہ سے اشتراکیت کے ارباب اقتیار ہر قسم کی سختیوں اور فریب آمیزیوں کے باوجود اسلام کی محبت ازبک، تاجیک، ترکمان، اور کرد باشندوں کے دلوں سے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور بالآخر سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان دنیا کے نقشے پر دوبارہ ابھر آئے ہیں۔

انقلاب روس کے اثرات:

انقلاب روس کی کامیابی کا ردعمل صرف یہی نہیں ہوا کہ اس کے نئے نظام کو دنیا نے تسلیم کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی بھی آگے یہ دنیا کی دیگر خطوں کی عوام نے بڑی گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا، یہاں تک کہ سرمایہ دار دنیا نے بھی آئندہ آنے والے خطرات کا سدباب کرنے کے لئے اس کی تقلید شروع کر دی۔ اس انقلاب کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے خلاف نکتہ چینی کرنے کی اجازت عام دنیا کی مختلف اقوام کو حاصل ہو گئی، حالانکہ انقلاب روس سے قبل دنیا کے بہت سے ملکوں میں اس پر کڑی نگرانی تھی اور اس قسم کے خیالات کو سخت خطرناک و مہلک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج بڑے بڑے سرمایہ پرست ممالک بھی اس حد تک اس فلسفہ کے قائل ہو گئے ہیں کہ بے روک سرمایہ داری یقیناً دنیا کی مادی و روحانی ترقی کے لئے سخت خطرناک ہے اس لئے اس پر کچھ نہ کچھ پابندیاں ضرور ہونا چاہیں۔ اس طرح قوم پرستی کے اس اصول سے بھی لوگ اجتناب برتنے لگے کہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اپنی سیاسی اور معاشی ترقی صرف قومی خطوط پر کی جائے۔ آج گلوبل نظریات کی وجہ سے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ معاشی دنیا میں قوم پرستی کے جذبات کا دخل حاصل ہونا او دوسری اقوام سے علیحدگی اور بے تعلقی برتنا ہر قوم کے لئے مشکلات و مصائب پیدا کر سکتا ہے۔ کیمونسٹ پارٹیاں شروع میں خلاف قانون قرار دی جاتی تھیں لیکن بعد ازاں ایک ایسا بھی دور آیا جب دنیا کے تمام حصوں میں ان کے جائز وجود کو تسلیم کر لیا گیا اور دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح ان کی سیاسی و معاشی سرگرمیوں کو بھی روا رکھا جانے لگا چنانچہ 1921ء میں انگلستان کی کیمونسٹ پارٹی نے پارلیمنٹ کے لئے اپنے جو امیدوار کھڑے کئے تھے ان کو مجموعی طور پر 75 ہزار ووٹ ملے تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ 1921ء میں انگلستان جیسے تعلیم یافتہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ملک میں ایک لاکھ کے قریب کیمونسٹ موجود تھے۔ اسی طرح انقلاب روس کے بعد دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ممالک میں ٹریڈ یونینیں قائم ہوئیں صرف انگلستان میں 1934ء میں ان کی تعداد 449 تھی جن میں صرف 19 بڑی بڑی یونینوں کے ارکان کی تعداد مجموعی طور پر 35 لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔

مزدوروں کے مفاد عامہ کے لئے ایک مستقل محکمہ انگلستان میں 1916ء میں قائم ہو گیا تھا، مگر 1923ء میں انقلاب روس کا یہ اثر لیا گیا کہ مزدوروں نے اتنی طاقت پکڑ لی کہ پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کی حیثیت اختیار کر گئے اور اس کے بعد دوسرے ہی سال وزارت پر قابض ہو گئے۔ اگرچہ اس وزارت نے بہت کم عمر پائی مگر چند ہی سال بعد 1929ء میں پھر مزدور وزارت بنی جو 1931ء تک قائم رہی۔ لیکن اس کے بعد عام کساد بازاری کی وجہ سے قومی حکومت کے نام سے سب پارٹیوں نے مخلوط وزارت بنائی جس کا وزیر اعظم مزدوروں کا راہنما مسٹر ریمزے میکڈانلڈ تھا۔ مگر مزدوروں کو مسٹر

ریمزے کا یہ "شرک" پسند نہ آیا اور انہوں نے اسے مزدور پارٹی سے خارج کر دیا جس سے مزدوری تنظیم کے ڈسپلن کا پتہ چلتا ہے۔

انگلستان کی طرح انقلاب روس کے اثرات دوسرے ملکوں پر بھی پڑے اور وہاں بھی مزدور جماعتوں نے طاقت حاصل کی۔ آسٹریلیا میں انہوں نے حکومت تشکیل دی۔ فرانس میں ایک اشتراکی راہنما لاول LAVAL وزیر اعظم بنا۔ امریکہ جیسے سرمایہ پرست ملک میں کہ جس نے بالآخر کمیونزم اور کمیونسٹ روس کو پچھاڑ دیا۔ 1930ء عالمگیر کساد بازاری میں سوشلسٹ بنیادوں پر مشترک جماعتی کاشت کا اصول بعض مقامات پر رائج کیا تھا اور بیروزگاروں کے روزینے مقرر کئے۔ اسپین میں 1931ء میں اشتراکی جمہوریت قائم ہوئی۔ اس سے اگلے سال امریکہ کے مغربی ساحل پر چلی نے اشتراکی نظام کو قبول کر لیا۔ جنوبی امریکہ کے ملک یوروگوئے نے بھی نظام معیشت کو اشتراکی بنایا۔ کیوبا اور فیدل کاسترو بھلا کس کو معلوم نہیں کہ اشتراکی تھے اور ہیں کہ فیدل کاسترو نے کمیونزم کے فیل ہو جانے کے زمانے میں آخری کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ جرمنی اور اٹلی روس اور روسی اشتراکیت کے سخت ترین مخالف تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے فسطائیت کے نام سے جو نظام تشکیل دیا تھا وہ بہت بڑی حد تک اشتراکی نظام سے متاثر ہو کر بنایا گیا تھا۔ لیگ آف نیشن یعنی اقوام متحدہ کی پیشرو نے دنیا کے مزدوروں کی اعانت کے لئے انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس نے دنیا کے مزدوروں، حکومتوں اور کارخانے داروں کے نمائندوں کی متعدد کانفرنسیں منعقد کرائیں تھیں جن میں اس امر پر غور ہوتا کہ کم ترقی یافتہ اقوام میں مزدروں کے معیار زندگی کو اس سطح پر کیسے لایا جائے جو کہ ترقی یافتہ ممالک میں رائج تھا۔ غرض انقلاب روس کے اثرات آج نوے سال سے زائد عرصہ کے بعد بھی دنیا کے ہر گوشے میں نظر آتے ہیں یہ ضرور ہے کہ کمیونسٹ بالشویک راہنماؤں کی کامل تقلید کے لئے دنیا کبھی تیار نہیں ہوئی مگر یہ قطعاً ناممکن تھا کہ اشتراکیت اور اشتراکیت جن انسانی مشکلات و مصائب کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے ان کے حل کی طرف دنیا کی توجہ مرکوز نہ ہوتی اور ان کے اثرات سے دنیا کے نظام معیشت و ریاست میں تبدیلیاں نہ ہوتیں۔

1941ء میں روس کے خلاف جرمنی کا اعلان جنگ کرانا، کمیونسٹ روس کے لئے خوش نصیبی کا ایک ایسا سبب ثابت ہوا جس کا تصور بھی مشکل تھا۔ اس جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد روس کو جو کچھ حیثیت حاصل ہوئی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ پورا مشرقی یورپ اشتراکیت کی لپیٹ میں آ گیا اور روس خود دنیائے مغرب کا تنہا رقیب بن کر ابھرا جس نے کیوبا میں میزائل نصب کر کے امریکہ کے ایوانوں کو ہلا دیا تھا۔ مگر یہی واقعہ سرمایہ دار امریکہ کے لیے اس کا خاتمہ کرنے کا سبب بن گیا۔ امریکی دماغ 1962ء کے بعد مسلسل روس اور کمیونزم کو تباہ کرنے کے منصوبہ بنانے لگے اس طرح دونوں ملکوں میں سرد جنگ شروع ہو گئی۔ جس میں امریکہ کی سازشیں بہر حال رنگ لائیں اور کمیونزم کا جہاز ہمیشہ کے لیے ڈبو دیا گیا اور روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ایک وقت میں آدھی دنیا کو فوجی اور مالی امداد فراہم کرنے والا روس خود امریکہ کا دست نگر بن کر رہ گیا۔ روس کا ایٹمی اسلحہ جس کی تیاری میں اُس نے امریکی قوم کو خلائی کامیابیوں کی طرح پیچھے چھوڑ دیا تھا اب عام بلیک مارکیٹوں میں بکنے لگے اور کمیونزم کے فلسفے کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔

☆

1917ء اعلان بالفور، فلسطین اور شرق اردن میں رونما ہونے والے انقلابی تغیرات

اعلان بالفور:

اسرائیل پہلی جنگ عظیم اور دوسری عالمگیر جنگ کے بعد عرب دنیا میں پیدا ہونے والے انقلابی جغرافیائی و سیاسی تبدیلیوں اور برطانوی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ اس کے قیام کا پس منظر تو تاریخ میں بہت دور تک پھیلا ہوا ہے لیکن دنیا کی جدید تاریخ میں 1917ء میں برطانوی وزیر خارجہ آرتھر بالفور کی طرف سے حکومت برطانیہ کو لکھا جانے والا ایک خط جو تاریخ میں اعلان بالفور کے نام سے جانا جاتا ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس اعلان کا پس منظر یہ تھا کہ ایک یہودی سائنسدان جو برطانیہ میں مقیم تھا اور جس نے برطانوی بحریہ کو جدید ہتھیاروں سے لیس کیا تھا۔ اسے جب برطانوی حکومت نے انعام و اکرام سے نوازنا چاہا تو اس نے کہا کہ مجھے اعزاز و اکرام کی ضرورت نہیں ضرورت صرف یہ ہے کہ بے خانماں یہود عالم کو حکومت برطانیہ فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دے، یہ ہی اس کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہوگا اس سلسلے میں وزیر خارجہ آرتھر بالفور نے اپنے خط میں حکومت برطانیہ کے سامنے اپنی سفارشات پیش کیں کہ برطانیہ کی پالیسی یہ ہو کہ یہودیوں کو آہستہ آہستہ فلسطین میں آباد کیا جائے۔ ان سفارشات میں یہ واضح طور پر کہا گیا تھا کہ فلسطین میں آباد غیر یہودی آبادی کے شہری اور مذہبی حقوق کو پامال کئے بغیر ایک یہودی ریاست قائم کی جائے مگر ایسا کئے بغیر اسرائیل کا قیام ناممکن تھا ۔جنگ عظیم اول کے بعد پیرس میں منعقد ہونے والی صلح کانفرنس نے فلسطین کا انتظام و انصرام برطانیہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ امریکی صدر ولسن نے بھی اس منصوبے میں دلچسپی لیتے ہوئے ایک کمیٹی مقرر کی اس کمیٹی نے اسرائیل کے خلاف سفارشات مرتب کیں۔ تاہم بااثر یہودی لابی کی سازشوں کی وجہ سے صدر ولسن کو اپنی پالیسی میں نرمی پیدا کرنا پڑی اور لیگ آف نیشن نے بھی یہودی ریاست کے قیام کی بھرپور حمایت کی اس طرح مغربی اقوام کی کاوشوں سے عالم عرب کے سینے میں مملکت اسرائیل کی ناجائز ریاست کا خنجر گھونپ دیا گیا۔

دنیا کا مظلوم ترین خطہ:

ارضِ فلسطین، دنیا کا وہ بدنصیب ترین خطہ ہے جو 1914ء کی جنگ کے بعد برطانیہ اور برطانیہ کے اتحادیوں کی سامراجی استعماری سیاست کا سب سے زیادہ شکار ہوا۔ جغرافیائی، نسلی، مذہبی، لسانی، تاریخی اور تمدنی اعتبار سے فلسطین شام کا علاقہ ہے، لیکن 1920 میں جب پہلی جنگ عظیم کے بعد عرب دنیا کی نئی تقسیم کی گئی تو ایک ظلم تو یہ ہوا کہ چھ سات لاکھ انسانوں کی ایک مختصر بستی کو شام سے الگ کر دیا گیا اور دوسرا ستم یہ ڈھایا گیا کہ ساری دنیا کے یہودیوں کو جیسا کہ اوپر ذکر آیا یہاں لاکر بسا دینے کا اعلان کیا گیا۔ شام سے یہ سرزمین الگ کر دینے کا نتیجہ تھا کہ ایک خود کفالتی اور طاقتور عرب قومیت کا جزو ہونے کی بجائے فلسطین برطانیہ کا دست نگر ہو کر رہے اور "وطن یہود" بنانے کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اس کی اقتصادی حالت سخت خراب ہو گئی تھی۔ کیونکہ جس علاقے میں 1918 تک صرف چھ سات لاکھ افراد بستے تھے وہ یہودیوں کے بے تحاشا آمد کی وجہ سے صرف 25 سال بعد یعنی 1945ء سولہ لاکھ سے زائد انسانوں کا بار کفالت اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ معاشرتی حالت بے حد ناقص ہو جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ عربوں کی موجودہ تہذیب و تمدنیت کو ختم کر کے ہزاروں سال پہلے کی معاشرت بنی اسرائیل کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ بظاہر تو یہ سب کچھ محض ایک یہودی سائنسدان کی ایما پر ہو رہا تھا مگر اصلاً یہ اسلامی تہذیب و تمدن کو نقصان پہنچانے کی سازش تھی جو اہل یورپ کے لئے کوئی نئی کوشش نہیں تھی ان کوششوں کا آغاز کسی اسامہ بن لادن کی پھیلائی ہوئی دہشت گردی کے خلاف نہیں ہوا تھا بلکہ یہ اہل مغرب کی سب سے معزز ہستی یعنی پاپائے روم نے اسلام کے خلاف تعصب کی بنیاد پر 1095ء میں شروع کی تھیں اور ان کا آغاز اسلام کے خلاف پہلی صلیبی جنگ کی شکل میں ہوا تھا۔ اب یہودیوں کی آبادکاری سے مراد بھی یہاں کی مذہبی و لسانی یک جہتی کو توڑنا تھا۔ عربی زبان یہاں صدیوں سے چلی آ رہی تھی اب ایک مردہ زبان عبرانی زبان کو اس کے مقابلے کے لئے از سر نو زندہ کیا جا رہا تھا۔ یہودی قوم چونکہ بے خانماں قوم ہونے کے باوجود دنیا کی امیر ترین قوم تھی۔ اس لیے تمام روئے زمین کے یہودیوں نے مل کر مقامی عربوں کی جائیدادیں بڑی بڑی رقوم سے خریدنا شروع کر دیں۔ عرب جوان کے مقاصد سے آگاہ نہیں تھے ان کے روپے کے لالچ میں آ گئے اسی چیز سے قدیم باشندے سخت مصیبت میں پڑ گئے یہودیوں کی آمد سے جائیدادوں کے ساتھ ساتھ دیگر اشیاء کی قیمتیں بھی بڑھ گئیں اور معیار زندگی اونچا ہوتا چلا گیا اور عرب مفلس سے مفلس تر ہوتے چلے گئے۔ یہودیوں کی پشت پناہی چونکہ ساری دنیا کے یہودیوں کی دولت اور برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی طاقت کر رہی تھی اس لئے عربوں کی بے کسی اور بے بسی کے احساس نے جنون و مایوسی کی وہ شکل اختیار کر لی جسے آج کی زبان میں دہشت گردی کہتے ہیں اور جو ملکی سیاست کا ستیاناس کر کے رکھ دیتی ہے۔

یہ تھے وہ انعامات جو اہل یورپ نے 1914ء کی جنگ کے بعد ترکوں کے خلاف برطانیہ اور اتحادیوں کی مدد کرنے کے صلے میں فلسطین کے عربوں کو دیئے اور یہ تھا ان بے شمار سرکاری اعلانات اور وعدوں کا انجام جن میں عربوں کو ایک خود مختار اور آزاد ریاست دینے کا کہا گیا تھا۔ شہنشاہیت اور مغربیت کے نام پر دنیا میں بڑے بڑے ظلم و ستم ڈھائے گئے لیکن فلسطین تہذیب مغرب کے ہاتھوں جن مظالم کا شکار ہوا ان کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ مغربیوں نے اسلامی تمدن کو مٹانے کے لئے کیا تھا۔ جنرل ایلن بی نے فلسطین کو عربوں کی مدد سے 1917ء میں فتح کیا تھا۔ جنرل نے دمشق

میں اپنی فتح کے دن صلاح الدین ایوبی کی روح کو للکارتے ہوئے کہا تھا ''لو صلاح الدین ہم واپس آگئے''۔ یعنی صلیبی جنگوں کی کڑواہٹ اہل مغرب بیسویں صدی تک نہ بھول سکے تھے۔ اگرچہ گذشتہ دو صدیوں سے وہ مسلسل عالم اسلام کے خلاف صلیبی جنگوں میں مصروف تھے اور مسلسل اہل اسلام کو غلام بنا کر اپنی صلیبی جنگوں میں ناکامی کا بدلہ لے رہے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ یہ سب کچھ وہ دنیا کو مہذب بنانے کے لئے کر رہے تھے۔ جنرل ایلن بی کی فتح تک عربوں کو علم نہیں ہو سکا کہ ان کے نئے دوست اور پرانے دشمن اہل مغرب انکی سرزمین کے لئے اپنی صلیبی جنگوں میں ناکامی کے سبب کیا کیا منصوبے تیار کر چکے ہیں۔ بھلا ہو اشتراکیوں کا جنہوں نے مغرب کے خلاف کام کرتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے خفیہ منصوبوں پر سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ مگر عرب بہت بھولے تھے وہ ابھی تک یہ سمجھ رہے تھے کہ وعدوں کے مطابق اہل مغرب انہیں ایک آزاد عرب ریاست میں بدل دیں گے۔ پھر 2 نومبر 1917ء کو برطانوی وزیر خارجہ کا ''اعلان بالفور'' شائع ہوا کہ فلسطین کو یہودیوں کا ''قومی وطن بنایا جائے گا'' عرب دنیا اب سہانے خوابوں سے چونکی۔ انہوں نے پوری طاقت سے اس منصوبے کے خلاف احتجاج کیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ برطانیہ نے یہ اعلان بدستور قائم رکھا اگرچہ حالات سے مجبور ہو کر اس میں وقتاً فوقتاً خفیف سی ترمیمیں بھی ہوئیں

یہودیوں کی تحریک قومیت:

فلسطین صرف دس ہزار مربع میل کا یک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ لیکن چونکہ اس خطے میں بیت المقدس (یروشلم) واقع ہے اس لئے یہ تینوں الہامی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے پیروکاروں کے لئے مذہبی تقدیس رکھتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی علاقہ ہے جو گیارہویں صدی سے چودھویں صدی عیسویں تک صلیبی جنگوں کا مرکز بنا رہا تھا اور جس کے لئے یورپ کے گوشے گوشے سے سرفروش اور جانباز اور بنیاد پرست عیسائی سمت سمت کر جنگ کرنے یا دوسرے لفظوں میں جہاد کرنے کے لئے آتے تھے۔ اگرچہ یہ شیوہ عیسائیت تو نہیں تھا۔ جیسا کی کہ مولانا روم نے کہا ہے۔

مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ   مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ

مگر پھر بھی پوپ کے حکم پر عیسائیت کے نام پر مرنے کے لئے وہ کشاں کشاں چلے آتے تھے۔ یہی جذبہ اگر مسلمانوں میں ہو تو ان کو بنیاد پرستی کا الزام اور غیر مہذب ہونے کی گالی تک دی جاتی ہے، مگر اہل مغرب اپنے ماضی کو عذاب سمجھ کر بھلا دیتے ہیں۔ پھر یورپ میں اصلاح مذہب اور قوم پرستی کے نعرے بلند ہوئے تو اہل یورپ کی توجہ دوسرے مسائل کی طرف مبذول ہوئی اور صلیبی جنگوں کی ہمہ ہمی ختم ہو گئی لیکن قومیت اور وطنیت پرستی کے دور میں یہودی ایک ایسی بے خانماں نسل ہو کر رہ گئی جو ہر جگہ بستی تھی مگر کسی جگہ کو اپنا وطن نہیں کہہ سکتی تھی یوں وہ ایک بین الاقوامی نسل ٹھہرائے، لیکن یورپ کی تحریک قومیت کے نشوونما کے بعد یہودیوں کی یہ بین الاقوامیت ہر قوم کو سخت ناگوار گذری۔ اگرچہ اصلاح تہذیب کی تحریک نے اہل یورپ میں مذہبی جذبات کو بہت دھیما کر دیا مگر پھر بھی یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو مظالم ڈھائے تھے وہ انجیل میں رقم تھے ان کے نیم شعوری اثرات نے قومیت کے شعوری محرکات کے ساتھ مل کر یہودیوں کے خلاف عام نفرت پیدا کر دی۔ ان حالات میں اہل یہود میں یہ احساس پیدا ہوا کہ انہیں کسی جگہ وطن بنا کر رہنا چاہیے، قدرتی امر تھا۔ شروع میں برطانیہ نے تجویز کیا کہ یہودیوں کے لیے مشرقی افریقہ کے کسی اچھے علاقے میں

کاروبار چھوڑنا مشکل ہو گیا۔ دوسرے اس پیش کش
وطن بنا دیا جائے مگر یہودیوں کے لئے یورپ میں اپنے جمے جمائے کاروبار چھوڑنا مشکل ہو گیا۔ دوسرے اس پیش کش میں
یہودیوں کے لئے کوئی دلکشی نہ تھی پھر کیا کیا جائے۔ یہودیوں کا آخر کوئی نہ کوئی وطن ضرور ہو۔ آخر 1887ء میں یہودیوں کی
جماعت نے یہ طے کیا کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے لئے ساری دنیا کے یہودیوں
کو ایک مرکزی جماعت سے منسلک کرنے کی کوشش کی گئی اور یروشلم کی پہاڑی صیہون کے نام پر اس تحریک کا نام صیہونیت
رکھا گیا۔ اس تنظیم کا ہر عاقل و بالغ یہودی ممبر ہونا لازم ٹھہرا اور ایک شلنگ سالانہ چندہ بھی رکنیت کی شرط تھی۔
فلسطین یہودیوں کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور سے بہت تاریخی عظمت رکھتا تھا اور سرزمین موعود تھا۔
مسلمانوں کے نزدیک مکہ معظمہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہی مقام تقدیس یروشلم کو یہودیوں کے ہاں تھا۔ یہودی عوام کے
لئے یہ خیال بڑا خوشگوار تھا کہ وہ حضرت موسیٰ اور ہارون کی طرح سرزمین موعود میں منتقل ہوں مگر کیسے۔ فلسطین پہلے ہی
گنجان آباد تھا اور وہاں تقریباً دس لاکھ عرب بستے تھے آخر وہ اپنے آبائی وطن کو باہر سے آنے والے یہودیوں کے لئے کیسے
خالی کر دیں اور اگر خالی کر دیں تو خود کہاں جائیں ان مشکلات کی بنا پر یہودیوں کا یہ منصوبہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ تاہم چونکہ
فلسطین کو وطن بنانے کا محرک بہت قوی تھا۔ اس لیے آہستہ آہستہ یہودیوں نے اس سرزمین پر آ کر زمینیں خریدنا شروع کر
دیں لیکن عوام اور حکومت دونوں کی اعانت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ جنگ
1914ء تک بہت کم یہودی فلسطین میں آ کر آباد ہو سکے۔

یہودیوں سے برطانیہ کا وعدہ:

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہودیوں نے اتحادیوں سے ساز باز کرنا شروع کیا اور ان سے درخواست کی کہ اگر
فلسطین کو یہود کا وطن بنا دیا جانے کا وعدہ کیا جائے تو ہم جنگ کے لئے فنڈز فراہم کرنے اور لڑنے لئے آدمی مہیا کرنے کے
لئے تیار ہیں اس وقت اتحادیوں کے سامنے صرف فتح تھی اس لیے یہودیوں کی پیش کش کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا گیا اور
پوری دنیا پر مالی تسلط رکھنے والی ہوشیار قوم نے بے دریغ سیاسی رشوت کے طور پر دے کر برطانیہ اور اتحادیوں کو موہ لیا۔
دوسرے یہودی تعلیمی اعتبار سے بھی بلند تھے ان لوگوں نے جنگ میں اپنی خدمات پیش کیں جیسے ایک یہودی ویزمین نے
جو ایک بڑا سائنسدان تھا جنگ کے دوران لکڑی سے الکوحل نکالنے کا طریقہ اختیار کیا۔ لائیڈ جارج نے اسے انعام دینا چاہا
مگر اس نے روپیہ پیسہ اور جاگیر لینے سے انکار کر دیا۔ لائیڈ جارج سے کہا کہ میری خدمت کے معاوضے میں یہودیوں کا یہ
حق تسلیم کر لیا جائے کہ فلسطین ان کا وطن ہے اور جنگ کے خاتمے کے بعد انہیں وہاں آباد ہونے دیا جائے گا۔ لائیڈ جارج
نے اس کا مطالبہ منظور کرتے ہوئے اس وقت اس سے خفیہ وعدہ کیا مگر جنگ کے دوران جب فلسطین فتح ہو گیا تو اس
وعدے کو اعلان بالفور کی شکل دے دی۔

عربوں کی بغاوت:

لیکن یہ اعلان حسب دستور سیاسی زبان میں تھا جس میں فلسطین کو یہودیوں کو وطن بنانے کو وعدہ تو تھا مگر عربوں کے
لئے مذکور تھا کہ انہیں معاشی اور سیاسی نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا عرب اس جھوٹی سیاست سے آگاہ نہیں تھے اس شرط پر
مطمئن ہو گئے مگر 1920ء میں فلسطین کے لئے جو برطانوی ہائی کمشنر بھیجا گیا وہ ہربرٹ سیموئیل تھا جو نہ صرف یہودی

تھا بلکہ ایک پر جوش صیہونی راہنما بھی۔ یہودیوں نے اس تقرری پر بڑی خوشی منائی اور کہا کہ ڈھائی ہزار سال بعد ارض فلسطین پر کوئی یہودی حاکم بنایا گیا ہے۔ عربوں نے جب یہ آوازیں سنی تو ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ تاہم بظاہر اب فلسطین کے لئے کوئی مستقل فیصلہ نہیں ہوا تھا اس لئے خاموش رہے لیکن جب 1922ء میں فلسطین کو شام سے الگ کیا گیا تو عربوں کو یقین ہو گیا کہ ان سے جو وعدے کئے گئے تھے وہ جھوٹے تھے۔ انہوں نے برطانوی انتداب قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ خصوصاً یروشلم اور جافہ میں جہاں یہودی بڑی تعداد میں آ بسے تھے بکثرت بلوے ہوئے اور زبردست لوٹ مار کی۔ سر سیموئیل نے بغاوت دبانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی 1923ء میں اعلان ہوا کہ عربوں کی ایک وزارت بنائی جائے گی۔ اس کے لئے انتخابات کرائے گئے مگر کسی عرب نے ووٹ نہ دیا اور یہ تجویز بھی ناکام ہو گئی

بغاوت کا نتیجہ:

1925ء میں سر سیموئیل کو واپس بلا لیا گیا اور لارڈ پلور کا بھجا گیا مگر وہ برطانیہ کی پالیسی پر چلنے کے سوا کیا کر سکتا تھا دوسرے عرب یہود مفاحمت کے اعلان بالفور کی روشنی میں کوئی شکل بنتی نہیں تھی۔ 1926ء میں ایک آرڈیننس جاری کیا گیا جس کے تحت یہودیوں کو اکثریت والے علاقوں میں خود مختاری دے دی گئی۔ ٹیکس لگانے کے محدود اختیارات بھی دے دئے گئے اس آرڈیننس کے نتیجہ میں فلسطین میں یہودیوں کی حیثیت بڑی طاقت ور ہو گئی مگر عربوں پر اس کا برا اثر پڑا اور بلوؤں اور ہنگاموں کی فضا پیدا ہو گئی اور ہر طرف بغاوت کی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ برطانیہ نے آہنی ہاتھوں سے یہ بغاوت دبانے کی کوششیں کیں مگر آخر یہ پالیسی بدلنی پڑی اب اعلان بالفور کی روح کے مطابق عربوں کے مفادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہودیوں کے سیلاب کو روکنے کا اعلان کیا گیا مگر اس اعلان پر یہودی ناراض ہو گئے اور ان کی ایجیٹیشن پر حکومت دب گئی اور یہ اعلان کالعدم قرار پایا۔

یہودیوں کا ٹڈی دل:

برطانیہ کی طرف سے صیہونیت کو یہودیوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جا چکا تھا اس لئے اس تنظیم کی مدد و اعانت سے یہودیوں کے غول کے غول پوری دنیا سے فلسطین میں آ کر بسنے لگے۔ 1922ء میں یہودی صرف ایک لاکھ تھے۔ 1931ء میں ان کی تعداد دو لاکھ سے تجاوز کر گئی لیکن ابھی بھی نو واردوں کا سلسلہ جاری رہا اور 1934ء میں یہودی تین لاکھ ہو گئے اور جون 1942ء میں یہ تعداد پانچ لاکھ سے بھی زائد ہو گئی اب فلسطین کی کل آبادسولہ لاکھ تھی اور یہودی اس میں پانچ لاکھ تھے۔ اب ان کا تناسب 33 فی صد ہو چکا تھا۔

تقسیم فلسطین:

ان حالات کے لازمی نتائج یہ ہوئے کہ عربوں کی خفیہ اور اعلانیہ دونوں قسم کی تنظیمیں وجود میں آئیں اور تحریکیں شروع ہونے سے دہشت گردی کی فضا پھیل گئی۔ آخر 1937ء میں ایک کمیشن ان حالات کی تحقیقات پر مقرر کیا گیا جس نے سفارش کی کہ یہودیوں کی بے روک آمد پر بند باندھنے کی اشد ضرورت ہے اور ان کی تعداد محدود کر دی جائے۔ یہ

سفارشات یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کو پسند نہ آئیں۔ عربوں کا مطالبہ تھا کہ فلسطین کو فوری آزاد کیا جائے تاکہ یہودی عرب معاملے کو جمہوری اصول کے مطابق حل کیا جائے۔ کیونکہ یہودی اقلیت میں تھے اس لیے انہوں نے آزادی فلسطین کی شدید مخالفت کی۔ جب عربوں کے مطالبے کی شدت بڑھی تو یہودیوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر فلسطین کو آزاد کرنا ہے تو یہودی اکثریت کے علاقے علیحدہ کر دیئے جائیں اور وہاں ایک جداگانہ حکومت قائم کر دی جائے۔ اس چیز نے عربوں کو بے حد مشتعل کر دیا۔ فلسطین پہلے ہی شام سے کاٹ دیا گیا پھر شرق اردن جانے کے بعد رہ ہی کیا گیا تھا جواب اسکے مزید حصے بخرے کر دیئے جائیں، لیکن برطانیہ نے یہودیوں کی آواز کو اہمیت دیتے ہوئے اپنی عرب و اسلام دشمنانہ فطرت کے مطابق اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے، 1938ء میں ایک برطانوی کمیشن فلسطین بھیجا۔ اس کمیشن نے یہودیوں کے مطالبہ تقسیم فلسطین کو حق بجانب قرار دیا۔

لیکن اتنے مختصر سے علاقے کو دو آزاد حکومتوں میں تبدیل کر دینے کا تصور اتنا ناقابل عمل تھا کہ برطانیہ کی طرف سے اس کی تائید سخت دشوار تھی اس لیے پرانے دستور کے مطابق ایک گول مول سے پالیسی کا اعلان کر دیا گیا۔ ستمبر 1939ء میں جنگ عظیم دوم کا آغاز ہوا تو عربوں کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ لیکن برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے اس تحریک کے راہنما مفتی امین الحسینی نے اعلان کیا کہ جنگ کے دوران ہر جدوجہد بند رکھی جائے چنانچہ فلسطین پر کامل سکوت طاری ہو گیا۔ پھر جنگ کے خاتمے کے بعد جب مزید یہودی یہاں آباد ہو گئے اور انہیں مسلح ہونے کا موقع مل گیا تو ستمبر 1947ء میں برطانیہ نے اقوام متحدہ کی فلسطین کمیٹی کو مطلع کیا کہ اگر فلسطین کے مسئلہ کا کوئی جلد تصفیہ نہ ہوا تو برطانوی فوجیں فلسطین سے واپس چلی جائیں گی۔ گویا برطانیہ نے یہودیوں کو مضبوط بنانے کے بعد خود کو اس مسئلہ سے جو خود اس کا پیدا کردہ تھا الگ کر لیا۔ اور فلسطین کا مستقبل یہودیوں اور عربوں پر چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں اسے حل کر لیں۔ 29 نومبر 1947 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے روس اور امریکہ کی یہ تجویز منظور کر لی کہ فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ساڑھے چار ہزار میل کا علاقہ عربوں کو دے دیا جائے جبکہ یہودیوں کو پانچ ہزار تین سو اٹھاسی مربع میل اور یروشلم اور اس کے گردونواح کا 279 مربع میل کا علاقہ اقوام متحدہ کے تحت رہے۔ یکم اگست 1948ء سے برطانیہ کا انتداب ختم ہو جائے گا جنرل اسمبلی میں تجویز کو دو تہائی اکثریت حاصل ہو گئی مگر عربوں نے اعتراض کیا کہ وہ اس قرارداد کو ناجائز تسلیم کرتے ہیں اور اس کی پابندی نہیں کر سکیں گے۔

قیام اسرائیل:

اس دوران برطانوی فوجوں کی فلسطین سے واپسی شروع ہو گئی اور ساتھ ہی عربوں اور یہودیوں میں مسلح تصادم شروع ہو گئے۔ یہودیوں نے اپنے علاقوں میں عرب اقلیت پر انتہائی مظالم کیے جس کی وجہ سے ان عربوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور بے گھر عربوں کی تعداد جلد ہی دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ عرب پوری طرح مسلح یہودی دستوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ 15 مئی 1948ء تک اندرون فلسطین عرب مزاحمت ختم ہو گئی اور 15-14 مئی کی شب برطانوی انتداب بھی ختم ہو گیا۔ اسی رات یہودیوں نے تل ابیب میں اسرائیل کی نئی یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ چونکہ عرب عوام کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی اسلئے 17 مئی کی صبح سے پھر اردن اور عراق کی فوجیں عرب مفادات کے تحفظ کے لئے فلسطین میں داخل ہو گئیں، بعد

سعودی عرب کا بھی ایک فوجی دستہ مصری فوج سے آملا مگر اس متحدہ فوج کو بھی کوئی بڑی عسکری کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ شام اور لبنان بھی اس جنگ سے قطع تعلق نہ رہے مگر وہ بھی کچھ نہ کر سکے صرف اردن کی فوج نے وسطی فلسطین اور یروشلم کے بیشتر حصے کو یہودیوں کے قبضے میں جانے سے بچالیا۔ اس دوران سلامتی کونسل کے حکم پر 11 جون کو جنگ بندی کر دی گئی۔ اس کے بعد جنگ شروع اور بند ہوتی رہی یہاں تک کہ 1949ء میں عرب ملکوں کو اسرائیل سے علیحدہ علیحدہ جنگ بندی کے سمجھوتے کرنا پڑے اور عملاً اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا۔

اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں "اے اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں" اسرائیل اس ماٹو پر پوری طرح عمل پیرا رہا۔ 1956ء اور 1967ء میں اس نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے مطابق عرب دنیا کا بہت سا علاقہ ہتھیا لیا، جس میں بیت المقدس اور فلسطین کو وہ حصہ بھی شامل تھا جو اردن کے قبضے میں تھا۔ 1948ء میں جب اسرائیلی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ صرف 5530 میل تھا مگر بعد میں یہ رقبہ 33500 مربع میل ہو گیا جو اصل فلسطین کے رقبے سے بھی تین گنا بڑا تھا۔

شرق اردن:

فلسطین، شام اور لبنان کی مستقل مگر کمزور ریاستوں کی طرح شرق اردن کی بھی 1914ء کی جنگ کے اس بے رحمانہ مذاق کا نتیجہ ہے جو برطانیہ اور فرانس نے اپنے جھوٹے وعدوں اور سرکاری اعلانوں کو پورا کرتے ہوئے عرب دنیا سے کیا تھا اگرچہ دوران جنگ عرب یہ سمجھتے رہے کہ یمن سے لے کر ترکی کی جنوبی سرحدوں تک کی سرزمین ایک طاقت ور عرب سلطنت میں بدل دی جائے گی مگر یہ سب کچھ ان کے مغربی دوستوں نے خفیہ عزائم کے خلاف تھا اس لئے جب 1920ء میں صلح کانفرنس ہوئی تو عرب سرزمین کو بیسوں چھوٹے عرب ملکوں میں بانٹ کر یورپی طاقت ان کی سرپرست بن گئی۔ امیر فیصل جس نے جنگ کے دوران اتحادیوں کی بڑی مدد کی تھی یہ معاملہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے اپنے منافق دوست فرانس اور عربیہ کی مدد سے اس ظالمانہ آپریشن کے خلاف بڑی آواز اٹھائی مگر یورپی مفسدوں کے آگے اس کی ایک پیش نہ چلی۔ فیصل کو پہلے شام میں تخت پر بٹھایا گیا مگر بعد ازاں نکال کر عراق میں حکمران بنا دیا گیا۔ حجاز شریف حسین کو عطا ہوا اور اس کے ایک اور بیٹے عبداللہ کو حجاز اور فلسطین کے بیچ میں شرق اردن کا مفلس ترین علاقہ دے دیا گیا۔ اپریل 1921ء میں اس کی رسم تاج پوشی بھی ادا ہو گئی، مگر سوال یہ تھا کہ اس علاقے کا نام کیا رکھا جائے کیونکہ تاریخ میں بھی اس ریگستانی علاقے کو کوئی علیحدہ حیثیت حاصل نہ رہی تھی۔ آخر دریائے اردن نے یہ مشکل حل کر دی کیونکہ یہ نئی ریاست اس دریا کے مشرق میں واقع تھی اس لئے اسے پہلے شرق اردن کہا جانے لگا پھر صرف اردن رہ گیا مگر عربوں کا دوست برطانیہ عرب عوام کو ایک مطلق العنان بادشاہ کے بے رحم ہاتھوں میں چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا؟ اس لئے لازم ٹھہرا کہ اردن کی بادشاہت آئینی ہو چنانچہ 1929ء میں برطانوی ہائی کمشنر کے زیر ہدایت ایک آئین یا دستور اساسی بنایا گیا مگر ابھی اس دستور کو کامیاب بنانے کے لئے کافی وقت درکار تھا اس لئے طے ہوا کہ انتداب کے اصولوں کے مطابق برطانوی ہائی کمشنر اس وقت تک حکومت کی نگرانی کرتا رہے گا جب تک عوام واقعی حکومت خود اختیاری کے اہل نہ ہو جائیں۔

اردن کی آدھی آبادی خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھی حیران کن بات یہ تھی کہ اس ریگستانی اور چٹیل ملک میں دریائے

اردن کے جنوب میں صرف تیس مربع میل کا علاقہ قابل کاشت تھا۔ اب یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہاں کی عوام خود
خود اختیاری کیوں نہیں سنبھال سکتے تھے۔ کیونکہ چند لاکھ جاہل مفلس اور خانہ بدوش قبائل کیسے سیاسی خود اختیاری حاصل کر
سکتے تھے۔ تعلیم کے لئے بھی اس ملک میں کالج قسم کی کوئی درس گاہ نہیں تھی البتہ چند سکول ضرور تھے مگر مصر، حجاز، فلسطین اور
عراق کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے ان تمام ملکوں کو جانے والے وسائل رسل و رسائل کا یہ علاقہ مرکز تھا۔

یاد رہے کہ اردن کا 40-1939ء کا بجٹ آمد و صرف پانچ لاکھ 13 ہزار پاؤنڈ تھا۔ امداد کے طور پر اسے پورا کرنے
کے لئے تھوڑی سی رقم برطانیہ بھی دیتا تھا۔ اپریل 1923ء میں اردن کو برطانیہ کے سایہ حمایت میں لیتے ہوئے وقت اس کی
کامل آزادی کا جو حق تسلیم کیا گیا تھا اس کے ایفاء کی تاریخ شاعروں کے معشوقوں کے جھوٹے وعدوں کی طرح بڑھتی رہی۔
البتہ کہیں جا کر 1946ء میں عراق کی قسم کی آزادی اردن کو بھی عطا کر دی گئی۔ اردن کا حکمران پہلے والئی کہلاتا تھا، آزادی
کے بعد آزاد بادشاہ کہلانے لگا۔

شاہ حسین:

شاہ عبداللہ کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے طلال کو پانچ ستمبر 1951ء میں شاہ اردن قرار دیا گیا تھا مگر اردن کی
پارلیمنٹ نے ان کے دماغ میں خلل ہونے کی وجہ سے اسے معزول کر دیا اور 11 مئی 1952ء کو طلال کے بیٹے حسین کو
بادشاہ بنا دیا۔ انہوں نے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی جب وہ تخت شاہی پر بیٹھے تو ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔
1956ء میں جب نہر سویز کے علاقے میں برطانیہ نے مصر کے خلاف جارحانہ کاروائی کی تو شاہ حسین نے اردن کی فوج کے
انگریز کمانڈر چیف گلب پاشا کو علیحدہ کر دیا اور برطانیہ سے تمام معاہدات ختم کر دیے جس کی وجہ سے اردن کو مالی نقصان
اٹھانا پڑا ادھر جمال عبدالناصر کی روس نواز پالیسیوں کی وجہ سے دوسرے عرب ملکوں میں کمیونسٹوں کی بڑی تعداد پیدا ہوگئی۔
مصر کی مدد سے ان لوگوں نے شاہ حسین کا تختہ الٹنے کی کئی بار کوشش کی۔ 1958ء میں جب متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئی
تو اردن نے بھی عراق سے ایک نیا وفاق بنا لیا مگر 14 جولائی کو عراق میں انقلاب آجانے کے بعد یہ وفاق ختم ہو گیا بلکہ
اردن میں بھی انقلاب کا خطرہ پیدا ہو گیا، جس سے بچنے کے لئے شاہ حسین کو برطانیہ سے مدد طلب کرنا پڑی۔ اس کے
خطرے سے بچنے کے لئے اور مصر کے حامی کمیونسٹ انقلاب پسند عناصر سے بچنے کے لئے اردن کو سعودی عرب کی طرف
جھکنا پڑا اور دونوں ملکوں میں قریبی تعاون پیدا ہو گیا۔ جون 1967ء میں جب عرب اسرائیل جنگ شروع ہوئی تو اردن
کے ہاتھ سے یروشلم اور فلسطین کا سارا علاقہ نکل گیا۔ اب اردن صرف ان علاقوں پر مشتمل ہے جو 1948ء سے پہلے شرق
اردن میں شامل تھے۔

فلسطین مہاجر:

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی ناکامی نے اردن کے لئے بڑے مسائل پیدا کر دیے۔ فلسطینی
علاقہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اردن کے لئے مالی مسائل بھی پیدا ہو گئے اور فلسطینی مہاجروں کا مسئلہ بھی سنگین صورت
اختیار کر گیا۔ اردن کے علاقوں میں فلسطینی مہاجروں کے لئے کیمپ قائم ہو جانے کے بعد یہ علاقے فلسطینی چھاپہ ماروں کا
مرکز بن گئے تھے، جہاں سے وہ اسرائیل پر حملہ کرتے تھے۔ مصر و شام کی حکومتیں ان چھاپہ ماروں کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں

تھا اسرائیلی اگر جوابی کاروائی کرتے تو نقصان صرف اردن کو پہنچتا۔ چنانچہ کئی سال تک اردن کی مغربی سرحد میدان جنگ بنی رہی۔ اشتراکی عناصر اور مصر بھی فلسطینی مہاجروں کو مدد دے کر اردن کی حکومت کے خلاف آلہ کار بنانا چاہتے تھے۔ اشتراکی عناصر کی مدد کی وجہ سے فلسطینی چھاپہ ماروں نے کھلی دہشت گردی شروع کردی اور طیارے اغوا کرنے لگے۔ پھر فلسطینیوں نے نعرہ لگایا کہ اگر فلسطین کو آزاد کرانا ہے تو پہلے شاہ حسین کی حکومت کو ختم کرنا ہوگا۔ آخر 1970ء میں فلسطینی چھاپہ ماروں اور اردن کی حکومت میں ٹکر ہوگئی۔ انہوں نے شمالی اردن میں عملاً اپنی حکومت قائم کرلی۔ آخر شاہ حسین ....

شاہ حسین (تعارف)

شاہ حسین بن طلال 1935ء۔1999ء اردن کے بادشاہ عبداللہ کے پوتے اور شاہ طلال کے فرزند عمان میں پیدا ہوئے وکٹوریہ کالج اسکندریہ اور سنڈھرسٹ کالج انگلینڈ سے تعلیم حاصل کی۔ 11 اگست 1952ء کو تخت پر بیٹھے۔ 47 سال حکومت کی۔ 1988ء میں انہوں نے دریائے اردن کا مغربی کنارہ فلسطین کے حوالے کرنے کا اعلان کیا۔ 1963ء سے اردن میں سیاسی پارٹیوں پر پابندی تھی جو 1991ء میں ختم کردی گئی تھی۔ انتقال امریکہ میں ہوا۔ (فروری 1929ء)

.... کو ملکی استحکام کے لئے چھاپہ ماروں کے خلاف سخت فوجی کاروائی کرنا پڑی جس کے نتیجے میں ڈیڑھ ہزار چھاپہ مار ہلاک ہوگئے جولائی 1971ء میں چھاپہ ماروں کے خلاف دوسری مہم میں ان کے اڈے تباہ کئے گئے اور اس کی قوت پوری طرح کچل دی گئی۔ لبیا نے اردن کے خلاف کاروائی کرتے ہوئے اس کی امداد بند کردی اور شام عراق نے اپنی فوجیں اردن میں داخل کردیں مگر اس وقت تک چھاپہ مار نکلے جا چکے تھے اور یہ فوجیں واپس بلالی گئیں۔ لیکن شام، الجزائر او رلبیا نے اردن سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ دیئے اور عراق نے اپنی سرحد بند کردی شاہ حسین فلسطین کے عرب حصے اردن میں شامل رکھنا چاہتے تھے اور انہیں فلسطین کی تنظیم آزادی P.L.O. کی نمائندہ حیثیت سے انکار تھا مارچ 1972ء میں شاہ حسین نے فلسطین اور اردن کے وفاق کی شکل میں متحدہ عرب بادشاہت کا منصوبہ پیش کیا اس منصوبے میں بیت المقدس کو فلسطین اور عمان کو وفاق کا صدر مقام قرار دیا گیا تھا، لیکن اسرائیل، مصر اور خود تنظیم آزادی فلسطین نے یہ تجویز نامنظور کردی تھی۔

اکتوبر 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اردن نے اپنے دستے شام کے محاذ پر بھیجے اس جنگ کے بعد مصر اور شام نے اردن سے متعلق اپنی خارجہ پالیسی بدل لی اور یہ دونوں ملک بتدریج اردن کے قریب آگئے اس کے نتیجے میں شاہ حسین نے 1974ء کی رباط کانفرنس میں تنظیم آزادی فلسطین کا یہ حق تسلیم کرلیا کہ وہ فلسطین کے جس حصے کو آزاد کرائے گی اس پر حکومت کرنے کا حق بھی اسی کو ہوگیا۔ اگلے ماہ شاہ حسین نے اردن کے مغرب میں فلسطینی ریاست کے قیام کے لئے اردن کے آئین میں ترمیم کردی۔ 1975ء میں اردن نے شام سے قریبی تعلقات قائم کرلئے اور دونوں ملکوں کی مشترکہ

فوجی کمان قائم کی گئی۔ ٹرانسپورٹ اور ٹیلی کمیونیکیشن تعلیم اور اطلاعات کے میدان میں باہمی تعاون قائم کیا گیا۔ ستمبر 1993ء میں اسرائیل سے امن سمجھوتہ ہوا۔ 1998ء میں شاہ حسین کینسر کے علاج کے لئے امریکہ گئے اور وہیں فروری 1999ء میں انتقال ہوگیا۔

☆

1923ء۔ترکی اور منصب خلافت کا خاتمہ۔

ایک انقلابی فیصلہ

نومبر 1918ء میں ترکی نے عہدنامہ سیورے یا التوائے جنگ کے جس عارضی صلح نامے پر دستخط کئے تھے۔اس کی شرائط اگرچہ عارضی تھیں مگر پھر بھی ان کے آئینے میں ترکی کا تاریک مستقبل صاف نظر آرہا تھا۔قسطنطنیہ جو اس وقت ترکی کا دارلحکومت تھا،اتحادی فوجوں کے تسلط میں آچکا تھا۔سلطان ترکی کی حکومت برائے نام قائم تھی۔جنگ عظیم اول کے فاتحین جو احکامات چاہتے سلطان سے جاری کروالیتے۔دوسری طرف ملک میں ہر طرف غربت و افلاس،فاقہ کشی،بے چینی اور ابتری و بدحالی کے بھوت ناچ رہے تھے۔ترکی کے جو عوامی راہنما یا فوجی افسر اتحادیوں کی نظر میں مشکوک تھے انہیں گرفتار کر کے محبوس کیا جارہا تھا۔انہیں مشکوک افراد میں ایک فوجی افسر مصطفیٰ کمال پاشا بھی تھا۔مصطفیٰ کمال کی حیثیت اس وقت اگرچہ ایک معمولی فوجی افسر سے زیادہ نہ تھی،مگر وہ ایک محب وطن تھا جب اسے اپنی گرفتاری کا خطرہ محسوس ہوا تو اس نے سلطان سے اجازت خصوصی طلب کی کہ اسے مشرقی اناطولیہ (ایشیائے کوچک کی وسطی پہاڑیوں کے درمیان) بھیج دیا جائے تاکہ وہ وہاں پہنچ کر ترک افواج کے ہتھیار رکھلوا کر انہیں مفتوح قوم کی حیثیت سے بے اسلحہ ہو جانے پر مجبور کر سکے۔ سلطان چونکہ اتحادیوں سے بہت مغلوب تھا اس لیے اس نے اس درخواست کو قبول کر لیا اور مصطفیٰ کمال اناطولیہ چلا گیا،مگر وہاں پہنچ کر کمال نے ترک سپاہیوں کو ہتھیار رکھنے کی تلقین نہیں کی بلکہ پوری گرمجوشی سے اتحادیوں اور غیر ملکیوں فاتحین افواج کا مقابلہ ہر قدم پر کرنے کا حکم دیا۔یہ خبر سلطان کو پہنچی تو باب عالی سے فرمان جاری ہوا کہ واپس چلے آؤ مگر اب مصطفیٰ کمال باب عالی کے احکام ماننے والا نہیں تھا۔اب اس کے سامنے صرف ترک قوم کا مستقبل تھا اور اسے غلامی سے اندھیروں کو اپنے وطن سے دور کرنا تھا۔اس نے سلطان کے فرمان کے جواب میں کہلا بھیجا کہ ”جب تک قوم آزاد نہیں ہو جاتی میں اناطولیہ ہی میں رہوں گا“۔

مصطفیٰ کمال کے اس جواب کو جس نے سنا اس وقت ایک احمقانہ شیخی سے کم نہ سمجھا کہ سارا ملک اتحادیوں کے نرغے میں آچکا تھا۔ترکی کے بیرونی صوبے باغی ہو چکے تھے۔ترکی کے حلیف ملک بری طرح شکست کھا چکے تھے اور خود ترکی بھی اپنی شکست کا اعتراف کر چکا تھا۔ان حالات میں ایک معمولی فوجی افسر کی اولوالعزمی کو ایک احمقانہ بڑ ہی کہا جا سکتا تھا۔مگر

اتحادی اس حماقت کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے سلطان پر زور دیا کہ اس سرکشی کی فوراً سرکوبی کی جائے۔ سلطان ڈرا کہ کہیں اتحادی اس سے اس بہانے رہی سہی سیادت اور سروری بھی نہ چھین لیں اور اسے معزول کر کے ترکی پر براہ راست قبضہ کرلیں اس ڈر سے سلطان نے ایک عدالت قائم کرکے مصطفیٰ کمال، علی فواد پاشا، ڈاکٹر عدنان اور خالدہ ادیب خانم جیسے انقلابی باغیوں کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ ادھر شیخ الاسلام سے جو اسلامی کلیسا کا ترکی میں سربراہ اعلیٰ تھا فتویٰ جاری کرادیا کہ مصطفیٰ کمال اور اس کے سات انقلابی ساتھیوں میں سے جن میں خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر عدنان وغیرہ شامل تھے، ہر ایک کو قتل کرنا کرنا باعث ثواب ہے اور جو شخص بھی اس کار خیر کو انجام دے گا وہ بلاشبہ جنت میں جگہ پانے کا مستحق ہوگا۔ یہ پہلی بار تھا کہ ترک قوم پر سلطان کے فرمان اور نہ شیخ الاسلام کے فتویٰ کا کوئی اثر ہوا۔ لیکن کیوں؟ آیئے! ترکی کے ماضی میں اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں۔

خلافت عثمانیہ اور اس کا عروج:

تیرھویں صدی کے آخر میں قائم ہونے والی سلطنت عثمانیہ پندرھویں صدی کے آخر سے سترھویں صدی کے اوائل تک عروج و اقبال کی حدود کو چھونے لگی۔ اسی زمانے میں سلیمان اعظم (1566-1520ء) کی فرمانروائی میں ترکوں کا فاتحانہ سیلاب ریاست ہائے بلقان سے گذرتا ہوا آسٹریا جیسے مغربی ملک کے دارالحکومت وی آنا تک پہنچ گیا اور جرمنی کی سرحدوں کو عبور کرکے ہر طرف ایک تہلکہ برپا کردیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے مصر بھی فتح ہو چکا تھا جس کے بعد ترک سلطان کو ''خادم الحرمین الشریفین'' کا خطاب بھی مل گیا جو دنیائے اسلام کی اطاعت و وفاداری کا بہترین وسیلہ تھا۔ اب ترک سلطان، سلطان ترکی نہ تھے بلکہ خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بن چکے تھے۔ اگرچہ یہ خلافت حضرت امیہ معاویہ کی قائم کردہ خلافت کی نمائندہ تھی اور خلافت راشدہ کے راستے اس سے الگ تھے، تاہم سلطنت کشور کشائی اور تدبر و دانائی کے لحاظ سے ترکوں کا نظم و نسق یورپ کی عیسائی مملکتوں سے اتنا بہتر تھا کہ یونان وغیرہ کے عیسائی باشندوں نے ترک فاتحین کا استقبال دیگر یورپی اقوام کے مقابلے میں بڑی گرم جوشی سے کیا تھا۔

سلطان سلیم اول کے زمانے تک جتنے سلاطین گذرے وہ سب اولوالعزم، جری، بہادر اور جنگجو تھے اور نظم و نسق سلطنت پر براہ راست نگرانی رکھتے تھے اور کوئی چیز ان کی مرضی و منشا کے خلاف نہ ہوتی تھی۔ وہ ایک طرف تو ایوان خاص و عام میں بیٹھ کر ملکی انتظام و انصرام کے لئے فرامین جاری کرتے تھے اور وزراء اور امراء کی رپورٹیں ملاحظہ کرتے تھے اور دوسری طرف میدان جنگ میں بذات خود اپنی فوجوں کی کمان کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان محمد ثانی جس نے ایک ہزار سالہ قدیم سلطنت بازنطینیہ کے پرخچے اڑا دیئے اور قسطنطنیہ جیسے عظیم الشان شہر پر اسلامی پرچم لہرا دیا تھا۔ اس کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ ایک دن اپنے وزیروں سے محو گفتگو تھا کہ ایک دیہاتی کچھ فریاد لے کر آیا۔ اول تو یہی بات کیا کم تھی کہ ایک دہقان کو یہ موقع میسر ہو وہ ایک بادشاہ کے حضور میں بے تکلف پہنچ سکے، لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب وہ دربار میں پہنچا تو وہاں سب کے لباس فاخرہ اور ایک سی وضع قطع دیکھ کر پہچان نہ سکا کہ ان میں بادشاہ کون ہے؟ چنانچہ اس نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ لوگوں میں سے بادشاہ سلامت کون ہے۔ اگرچہ اس کا یہ سوال نازیبا نہ تھا مگر دیہاتی کا یہ سوال سلطان اور اس کے وزراء کو آداب شاہی کے خلاف محسوس ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد بادشاہ ایک ممتاز جگہ پر بیٹھ کر وزراء

دربار میں گفتگو کرنے لگا پھر رفتہ رفتہ شان و شوکت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور سلطان کے درباروں تک دیہاتی کیا امراء ... کے وہ تمام لوازم جو بادشاہوں کے لئے دنیا نے مخصوص کر دیکھے تھے وہ سب ترک سلطان کے محلات میں نظر آنے لگے۔

عیش و عشرت و آرام طلبی:

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان اعظم کے بعد جو سلاطین تخت پر بیٹھے وہ محض محلات کی شان و شوکت کی نذر ہو گئے اور میدان جنگ میں دیگر امور انتظام سے غافل ہوتے چلے گئے اور آہستہ آہستہ ان میں سلطنت کا بار گراں اٹھانے کی صلاحیت نہ رہی اور ایک وقت آیا کہ وہ افسر شاہی کے ہاتھوں کٹھ پتلیاں بن گئے۔

عوام کی بیداری:

انیسویں صدی کے اوائل میں سلطان محمد ثانی جب تخت نشین ہوا تو صورت حالات بہت انحطاط پذیر ہو چکی تھی۔ اس نے اصلاح کی کوشش کرنا چاہی مگر اب سر سے پانی بلند ہو چکا تھا۔ ہر طرف سرکشی اور بغاوت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ فوجی افسروں اور سپاہیوں نے پانٹوں کی شکست کے بعد بد دلی اور شکست خودگی کی ......

سلطنت عثمانیہ کی تاسیس

سلطنت عثمانیہ کی تاسیس 1290ء سلجوق ترکوں کے زوال کے بعد عثمانی ترک ایشیائے کوچک میں غالب طاقت کے طور پر ابھرے ان کے ایک سردار عثمان اول (1259ء - 1326ء) نے 1290ء میں سلجوق ترکوں کی برائے نام بالادستی سے آزادی حاصل کر لی اور ایشیائے کوچک میں ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ سلطنت اس کے نام پر عثمانیہ کہلائی۔ چودھویں صدی کے اختتام تک جزیرہ نما بلقان کا اکثر حصہ عثمانی سلطنت کے زیر نگیں آ چکا تھا۔ 1453ء میں قسطنطنیہ پر عثمانی پرچم لہرانے لگا اور اگلی صدی میں ترک یورپ کی ایک عظیم طاقت بن کر ابھرے۔ سولھویں صدی میں ہنگری، ولاچیا اور مالدیویا کی تسخیر کے بعد عثمانی سلطنت اپنے نصف النہار پر پہنچی۔ اسی دور میں فارس شمالی افریقہ اور عرب اس کے زیر نگیں آئے۔

......ذہنیت پیدا ہو چکی تھی۔ ڈسپلن اور ضبط و نظم کی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ نظم و نسق کی حالت بدتر تھی۔ رعایا مفلوک الحال، فوج سرکش، عہدیدار رشوت خور اور صوبے باغی ہو چلے تھے۔ ان حالات میں اصلاح کا کام سخت دشوار تھا۔ پھر انقلاب فرانس نے پورے یورپ میں ایک نئی لہر دوڑا دی۔ آزادی اور مساوات کے خیالات انقلاب افزا تھے۔ جن کی وجہ سے سلطان کی مطلق العنانی کیخلاف بھی آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ ان حالات میں سلطان نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک طرف تو "جاں نثاری" کے نام سے جو باغی فوج (جاں نثاری میں نوعمر لڑکے لے کر ان کی تربیت خود حکومت کرتی تھی) اسے

نیست و نابود کر دیا جائے اور دوسری طرف عوام کو کچھ حقوق دے جائیں۔ چنانچہ 1826ء میں "جان نثاری" (کل ...
اور اس کے بعد ایک فرمان اصلاحات جاری ہوا جو کہ فرمان گل خانہ کے نام سے مشہور ہوا اس فرمان میں عوام کے ...

عثمانی سلاطین

- ☆ عثمان اول 1299ء-1326ء
- ☆ ارخان 1326ء-1359ء
- ☆ مراد اول 1359ء-1389ء
- ☆ بایزید اول 1389ء-1403ء
- ☆ سلیمان اول 1403ء-1411ء
- ☆ محمد اول 1413ء-1421ء
- ☆ مراد دوم 1421ء-1451ء
- ☆ محمد دوم 1451ء-1481ء
- ☆ بایزید دوم 1481ء-1412ء
- ☆ سلیم اول 1512ء-1520ء
- ☆ سلیمان دوم 1520ء-1566ء
- ☆ سلیم دوم 1566ء-1574ء
- ☆ مراد سوم 1574ء-1595ء
- ☆ محمد سوم 1595ء-1603ء
- ☆ احمد اول 1603ء-1617ء
- ☆ مصطفیٰ اول 1618ء
- ☆ عثمان ثانی 1618ء-1622ء
- ☆ مصطفیٰ دوم 1622ء-1623ء
- ☆ مراد چہارم 1623ء-1640ء
- ☆ محمد ابراہیم 1640ء-1648ء
- ☆ محمد چہارم 1648ء-1687ء
- ☆ سلیمان سوم 1687ء-1691ء
- ☆ احمد دوم 1691ء-1695ء
- ☆ مصطفیٰ دوم 1695ء-1703ء
- ☆ احمد سوم 1703ء-1730ء
- ☆ محمود اول 1730ء-1754ء
- ☆ عثمانی ثالث 1754ء-1757ء
- ☆ مصطفیٰ سوم 1774ء
- ☆ الحمید اول 1774ء-1789ء
- ☆ سلیم سوم 1789ء-1807ء
- ☆ مصطفیٰ چہارم 1807ء-1808ء
- ☆ محمود دوم 1808ء-1839ء
- ☆ عبدالمجید 1839ء-1861ء
- ☆ عبدالعزیز 1861ء-1876ء
- ☆ مراد پنجم 1876ء
- ☆ عبدالمجید سوم 1876ء-1909ء
- ☆ محمد پنجم 1909ء-1918ء
- ☆ محمد ششم 1918ء-1922ء
- ☆ عبدالمجید دوم 1922ء-1923ء

.........حقوق کا اعلان کیا گیا اور ملک کی حالت درست کرنے کے لیے ابتدائی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ مگر عوام جاہل تھے اور ابھی توہمات کی سطح سے اوپر نہ اٹھے تھے۔ ترک معاشرے میں غور خوض واعظوں نے اسلام کی نرالی تصویر عوام کے سامنے پیش کی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ اصلاحات جو براہ راست یورپ کی اصلاحات سے متاثر ہو کر کی گئی تھیں ان کی ...

آ گئی۔ بلکہ اس تبدیلی کو انہوں نے شک کی نظر سے دیکھا وہ سمجھے شاید اس طرح حکومت انہیں مذہب سے بیگانہ کرنا چاہتی ہے اور یورپ کے عیسائیوں کی تقلید کی جا رہی ہے۔ چنانچہ جب رشید پاشا نے تعلیم پر کام شروع کیا تو اسکا خیر مقدم کیا جانے کی بجائے انہیں قتل کی دھمکیاں دی گئیں چونکہ رشید پاشا داڑھی منڈواتے تھے اور عرصہ یورپ میں تعلیم حاصل کرتے رہے اس لیے عوام میں مشتبہ تھے۔ جب اسکولوں میں طالب علموں کو جغرافیہ کی تعلیم کے دوران نقشہ کشی سکھائی گئی تو شور اٹھا کہ رشید پاشا بچوں کو تصوری کشی سکھا رہا ہے جو اسلام میں حرام ہے۔ اس زمانہ میں یہ کوشش بھی کی گئی کہ نوجوانوں کو یورپ بھیجا جائے تاکہ وہ جدید فنون حرب سے واقف ہو کر آئیں۔ مگر کوئی شریف ترک یا عرب اس کے لئے تیار نہ ہوا کہا گیا ہم اپنے بچوں کو کافر بنانے یورپ نہیں بھیج سکتے۔ نتیجتاً ترکی فنون حرب میں یورپ سے پیچھے رہتا چلا گیا۔ تاہم ان اصلاحات کا ضرور ہوا کہ ملک میں اخبارات جاری ہوئے جن کی وجہ سے مقفی و مسجع عبارت کی بجائے سادہ اور عام فہم زبان مقبول ہونا شروع ہو گئی۔ سیاسیات کا شعور بڑھا لیکن چونکہ 95 فی صد عوام جاہل تھی اس لیے انقلاب فرانس سے ابھرنے والے نئے تصورات نے عوام میں ایک عجیب انتشار پیدا کر دیا۔ پھر قومیت کے نام پر سلطنت کے صوبے بغاوت کرنے لگے چنانچہ 1830ء میں سربیا نے ترکی کے اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے علیحدگی اختیار کر لی۔ پھر رومانیہ، یونان اور بلغاریہ نے اس کی تقلید کی ادھر مصر میں بھی قومیت کے جذبات پرورش پانے لگے اور آہستہ آہستہ یہ آگ پورے عالم عرب میں پھیل گئی۔

استبداد کا نیا دور:

ان حالات میں سلطان عبدالحمید 1876ء تا 1809ء تخت نشین ہوا اس نے بھی شروع میں اصلاحات نافذ کرنا چاہیں مگر دوسرے ہی سال جب روس سے جنگ چھڑ گئی تو اس کے خیالات بدل گئے اب اس نے ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح تحریکات دبانے کیلئے سخت تادیبی کاروائیاں شروع کر دیں جوان ترکوں کی اصلاحی اور دیگر تحریکوں اور جماعتوں کو سختی سے دبا دیا گیا۔ نظام حکومت براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مکمل مطلق العنانی کے ساتھ کاربار حکومت چلانا شروع کر دیا۔ چونکہ سلطان کا خیال تھا کہ اگر ترکی کی سلطنت میں قوم پرستی کے جزبات پروش پانے لگے تو پھر سلطنت کی خیر نہیں کیوں کہ مختلف قوموں کے کندھوں پر ترکی کی سلطنت کا تخت بچھا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے سلطنت کی مرکزیت کو بچانے کے لئے تحریکوں کو دبانے کا موقف اختیار کیا۔ مگر مساوات و حریت کے خیالات جن کے سیلاب کا بند انقلاب فرانس نے توڑ دیا تھا اب کسی قسم کی کشتہ بندی سے رکنے والا نہیں تھا۔ دوسرے یورپ کی دیگر اقوام سلطنت عثمانیہ کے یورپی صوبوں کے عیسائی عوام کو خفیہ اور اعلانیہ طور پر ترکی کے خلاف اکسا رہی تھیں۔ ادھر روس کا شہنشاہ زار عیسائیوں کا باپ ہونے کے ناطے ترکی کے صوبوں کو عیسائیت کے تحفظ کے نام پر نگلتا جا رہا تھا۔ سلطان عبدالحمید کی مشکلات اور روز بروز بڑھتی جا رہی تھی محل کی حالت اور ترکی افسروں کا طرز عمل چونکہ شاہانہ تھا اس لیے جہاں پر ایک طرف یورپ کے تعلیم یافتہ نوجوان دستوریت و جمہوریت کے نام پر اس کے خلاف صف آرا تھے وہیں دوسری طرف راسخ العقیدہ مسلمانوں میں بھی سلطان کے طرز حکومت کو خلاف اسلام کہنے والا طبقہ پیدا ہو گیا سلطان نے بہت کوشش کی کہ مسلمان اس کے روحانی اقتدار کو خلیفۃ المسلمین کے طور پر محسوس کریں مگر اس کے باوجود عرب میں وہابیت کے نام پر اور سوڈان میں مہدیت کے نام پر حقیقی اسلام کو واپس

لانے اور سلطان ترکی کے مقرر کردہ افسروں اور حاکموں کے غلبہ اسلامی طرز کا مقابلہ کے لئے یہ دو زبردست تحریکیں اٹھیں اگرچہ انہیں آہنی ہاتھ سے دبا دیا گیا مگر اس سے وہ جذبہ بغاوت نہ دب سکا جو عوام میں پیدا ہوا تھا۔ ترکی افسروں اور امیروں میں یورپ کی معاشرت آہستہ آہستہ گھر کر رہی تھی جو عوام کیلئے ناقابل برداشت تھی دوسرے اقتصادی ذرائع و وسائل پر یورپی سرمایہ دار چھائے جا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے عوام فکر وافلاس کا شکار ہو گئے۔ زمانہ شناس لوگوں کو وہ وقت قریب نظر آرہا تھا جب افلاس وفقر کا سیلاب سلطنت اور شہنشاہیت کو خس وخاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ مختصر یہ کہ انیسویں صدی سے لے بیسویں صدی تک ترکی میں تین قسم کی تحریکیں ابھری تھیں ایک اسلام کے نام پر دوسری قومیت او روطنیت کے نام پر یورپ کے اثرات سے متاثر ہو کر اور تیسری عیسائی رعایا کی تحریک آزادی۔ آخر الذکر تحریک کی اعانت یورپی طاقتیں کر رہی تھیں اس لیے اسے کامیابی حاصل ہوئی جا رہی تھی مگر سلطنت عثمانیہ کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے بے شمار نوجوانوں کا خون میدان جنگ میں بہانا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر جنگ عظیم اول تک ترکی کو مسلسل جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔۔۔۔

وہابی تحریک اور عرب (تعارف)

اسلام کی ایک اصلاحی تحریک جس کی ابتدا شیخ محمد بن عبدالوہاب نے کی تھی۔ شیخ صاحب نے اٹھارہویں صدی میں نجد میں احیاء اسلامی کی دعوت شروع کی درعیہ کا رئیس محمد بن سعود اس تحریک کا معاون بن گیا جس مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا حقیقی اسلام کا پابند بنایا جائے اور اس میں جو غیر شرعی رسومات پیدا ہو گئی ہیں انہیں محو کر دیا جائے یہ تحریک کامیاب ہوئی اور محمد بن سعود پورے نجد کا رئیس بن گیا پھر اس کے فرزند عبدالعزیز اول اور پوتے سعود کبیر نے عرب کے بڑے حصے کو زیرنگیں کر لیا یہاں تک کہ حجاز وحرمین شریفین بھی اسی سلطنت میں شامل ہو گئے ساتھ ہی شام کی تسخیر کا ارادہ کیا گیا جس پر عثمانی سلطان نے محمد علی پاشا کی قیادت میں ایک بڑی فوج وہابیوں کی قوت کو کچلنے کیلئے بھیجی جس نے وہابیوں کی قوت کو تباہ کر دیا اس قوت کا احیاء عبدالعزیز ثانی آل سعود کے عہد میں دوبارہ ہوا اس مرتبہ تمام عرب کو شامل کر کے مملکت سعودی عرب قائم کر دی گئی۔

۔۔۔۔۔۔جس نے سلطنت کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ خصوصاً جنگ بلقان وطرابلس نے تو معیشت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا اور سلطنت بے حد کمزور پڑ گئی تھی مذہبی تعلیمات کے احیائے جدید کی جو تحریک چل رہی تھی وہ ابھی ترک شہنشاہیت کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی جو مذہب کے نام پر بلند کی جا رہی تھی اس طرح ترک شہنشاہیت میں وہ تمام مصائب جمع ہو چکے تھے جو ایک کمزور اور پراگندہ مطلق العنان شاہی میں پیدا ہو سکتے تھے پھر ترک فطرتاً سخت مزاج اور جنگ جو واقع ہوئے تھے اس لیے ترک حکام کے طرز عمل سے عوام کو شکایت پیدا ہونا بھی تعجب خیز نہ تھی انہیں شکایتوں نے مہدی سوڈانی اور محمد بن عبدالوہاب کی تحریکوں کو تقویت پہنچائی تھی سلطان ترکی نے ایک طرف تو اصلاحی تحریکوں کو تو دبا دیا مگر دوسری طرف دبائے

اسلام کو متحد کرنے کے لئے بہت سی تدابیریں بھی اختیار کیں۔اس نے اپنے منصب خلافت کے مقدس ہونے پر زور دیا قسطنطنیہ سے مدینہ تک ریلوے بچھائی گئی تاکہ حاجیوں کو سفر حج میں آسانی ہو اور اس قسم کی دوسری بہت سی کوششیں کیں انہی کوششوں میں

عالمگیر اتحاد اسلامی سید جمال الدین افغانی:

PAN ISLAM ISM کے شہرہ آفاق رہنما کو بھی بلایا جسے دنیا جمال الدین افغانی کے نام سے جانتی ہے۔جمال الدین افغانی انیسویں صدی کے نصف آخر میں دنیائے اسلام کے روح رواں تھے اور عالم گیر اخوت اسلامی کے نیم مردہ قالب میں جان ڈالنے کے لئے ساری دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ان کے پیام نے مسلم عوام کے دماغوں پر بالعموم اور مسلم جوانوں کے دماغ پر بالخصوص بہت گہرا اثر کیا تھا خصوصاً مصر میں ان کی آواز کا بہت اثر ہوا چنانچہ مصری تحریک آزادی کے راہنما سعد زاغلول پاشا اور مصری حریت خیال کے راہنما مفتی عبدہ اور اسی قسم کی بہت سی دوسری ممتاز مصری شخصیات جمال الدین افغانی کی ہی تربیت یافتہ تھیں۔ترکی میں بھی آپ کی مقبولیت کا یہی عالم تھا لیکن اس کے ساتھ ہر جگہ آپ کو رجعت پسند اور امراء پرست علماء کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا.............

مہدیت اور سوڈان (تعارف)

انیسویں صدی اور اس سے پہلے انگریزوں اور مصریوں کے ہاتھوں سوڈانی عوام پر بڑی سختیاں ہوئی تھیں محمد احمد مہدی انہیں روکنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے گرد درویشوں کا ایک حلقہ جمع کیا ادھر ان کی مقبولیت کے پیش نظر انگریزوں نے انہیں گرفتار کرنے کے لئے ایک دستہ بھیج دیا جسے محمد احمد کے درویشوں نے شکست دی چونکہ نیک عملی اور ریاضت کی بنا پر مہدی مشہور تھے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے بلاوجہ آپ پر الزام لگا دیا کہ آپ نے مہدی منتظر ہونے کا دعویٰ کیا ہے کردفان (سوڈان) سے آپ کی تحریک کا آغاز 1881 میں ہوا جلد ہی سید صاحب نے ابیض پر قبضہ کر لیا انگریزوں نے زبردست بھیجی جو بری طرح تباہ ہو گئی اس کے بعد انگریزوں نے جنرل ہکس کی قیادت میں بھی آپ سے شکست کھائی۔

............ترکی میں بھی یہی صورت پیش آئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا دوسری طرف سلطان ترکی سے کہا گیا کہ یہ شخص مطلق العنان شہنشاہیت کا مخالف اور جمہوریت کا حامی ہونے کی وجہ سے آپ کے اقتدار کا بھی دشمن ہے شیخ اسلام جو سلطنت ترکی میں محکمہ دینیات کا سربراہ تھا اور تمام معاملات پر فتویٰ جاری کرتا تھا اسے جمال الدین افغانی کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ کھٹکنے لگا اسے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کے عہدے پر جمال الدین افغانی فائز نہ ہو جائے شیخ الاسلام نے آپ کے خلاف اتنا شور وشر بپا کیا کہ سلطان نے آپ کو قسطنطنیہ چھوڑ دینے کا حکم دے دیا۔ترکی سے نکلنے کے بعد آپ مصر آگئے اور مصر کی سیاسی تحریکات کا مرکز بن گئے۔جامعہ الازہر کے علمی حلقوں میں ان کو وہ مقبولیت

حاصل ہوئی کہ جس کی حد نہیں۔ مقبولیت بڑھتی اتنی پھیلی کہ وزیر ریاض پاشا بھی ان کے معتقدوں میں شامل ہو گئے ڈبلیو۔ ایس بلنٹ جو مصر کی آزادی کا بڑا حامی تھا اور جس نے لندن میں افغانی صاحب کو مہمان بنا کر رکھا اس نے آپ کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ وہ آپ کی تعلیمات کے بارے میں لکھتا ہے کہ پچھلے دو سو سال میں متعدد مسلمان گذرے ہیں جنہوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے شریعت اسلامیہ پر عمل چھوڑ دیا اور ان روایات اور رسوم سے کنارہ کش ہو گئے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا شعار تھیں۔ مصر اور ترکی میں ایسے بہت سے مصلح پیدا ہوئے جنہوں نے یورپ کو سامنے رکھ کر تحریکات چلائیں لیکن اس قسم کے مصلحوں کی تمام اصلاحات شاہی احکام کے ذریعے نافذ کی جاتی تھیں اور عوام کو حکماً ان پر عمل کرنے کا کہا جاتا لیکن کبھی عوام کے دل و دماغ پر ان اصلاحات کا نقش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

جمال الدین قرآن وحدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ اس لیے انہوں نے دینائے اسلام کو بتایا کہ اگر اسلام کے

مقصد ومنشاء........

جنگ طرابلس و جنگ بلقان

30 ستمبر 1911ء کو اٹلی نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اٹلی طرابلس پر قبضے کے لئے کوشاں تھا۔ اٹلی نے اپنی بحریہ کی مدد سے طرابلس کا محاصرہ کر لیا اور ساتھ ہی ترکی کو طرابلس چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ طرابلس اس وقت سلطنت ترکی کا ایک صوبہ تھا۔ غازی انور پاشا نے چند مجاہدین کو ساتھ لیا اور مقامی عربوں کو ملا کر مزاحمت شروع کر دی۔ اٹلی کا قبضہ صرف ساحلی علاقوں تک قائم رہا لیکن اس دوران 1912ء میں جنگ بلقان چھڑ جانے کی وجہ سے ترک طرابلس چھوڑنے پر مجبور ہو گئے لیکن اس علاقے میں اٹلی سے مقابلہ دیر تک جاری رہا۔ یورپی مقبوضات خصوصاً جزیرہ نما بلقان نے جنگ بلقان کے نام سے دو جنگیں لڑیں جن میں سے پہلی جنگ 1912ء میں لڑی گئی۔ سرویا، بلغاریہ، یونان اور مانٹی نیگرو نے ترکوں کو قسطنطنیہ کے سوا تمام یورپی مقبوضات سے نکال دیا۔ دوسری جنگ بلقان ان ریاستوں میں مفاد کے لئے ہوئی تھی۔

کو ٹھیک ٹھیک طور پر سمجھا جائے اور اگر شریعت اسلامیہ کے احکام اور سیاسی اصلاحات کے پروگرام کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام مخالف ترقی نہیں بلکہ اس کے دائرہ میں رہ کر مسلمان اپنی زندگیوں میں زبردست تغیرات پیدا کر سکتے ہیں اور بمشکل کوئی اصلاح ایسی ہوگی جو اسلام کے منافی ہو۔

جمال الدین افغانی تعلیمات کا لب لباب یہ تھا کہ دنیا کے تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ان میں رنگ، نسل ونسب کا کوئی فرق نہیں۔ ان کے اس رشتہ اخوت واتحاد کو کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ حکومت عوام کی ہونی چاہیے۔ شہنشاہیت، آمریت اسلام کے منافی ہے۔ عوام کو سیاست سے بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ دولت وثروت کی یہ تقسیم کہ چند افراد کے عیش وراحت کے لئے عوام فاقہ کشی کی زندگی گزاریں اسلامی نقطہ نظر سے سراسر غلط ہے۔ جمال الدین افغانی کے

اس انقلابی پیام نے دنیا کے مسلمانوں میں ہلچل مچا دی، خصوصاً مصر میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں ان کا زبردست ہاتھ تھا۔ اسی طرح ایران کی مطلق العنان شاہی کے خلاف آپ نے زبردست فضا پیدا کی تھی۔ کہ 1896ء میں ایک ایرانی نوجوان مرزا رضا خان نے شاہ ایران کو قتل کر دیا۔ قسطنطنیہ میں بھی ترکی یونیورسٹی کے صدر اعظم (چانسلر) خواجہ تحسین آفندی آپ کے گرویدہ ہو گئے تھے، وہ ترکی کے وزیرِ تعلیم بھی تھے۔ جمال الدین افغانی نسلاً افغانی تھے۔ 1849ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہندوستان میں پائی اور افغانستان میں عرصہ تک وزارت کے عہدے پر مامور رہے، جہاں عوام میں آپ کو زبردست مقبولیت حاصل تھی۔ مگر مطلق العنان شاہی میں کسی اصلاح پسندی کی گنجائش کیسے ہو سکتی تھی۔ اس لئے کچھ دنوں بعد آپ کو افغانستان چھوڑنا پڑا۔ قسطنطنیہ آ گئے مگر یہاں سے بھی نکالے گئے۔ پھر مصر پہنچے مگر چند سال بعد وہاں کی حکومت نے بھی اخراج کا حکم دیا۔ ہندوستان آئے تو برطانیہ نے کلکتہ میں نظر بند کر دیا۔ جب بلادِ اسلامیہ میں کہیں جگہ نہ رہی تو انقلابیوں کی سرزمین پیرس پہنچے اور وہاں سے عروۃ الوثقیٰ نام کا اخبار نکالا جو تھوڑے ہی عرصہ میں اتنا طاقتور ہو گیا کہ انقلابی فرانس کی حکومت بھی اسے ناپسند کرنے لگی۔ یہاں سے آپ لندن آ گئے اور لندن سے کام جاری کر دیا مگر یہ جگہ دنیائے اسلام سے دور تھی اس لئے روس گئے اور وہاں کوشش کر کے زارِ روس سے قرآنی تعلیمات کی اشاعت کی اجازت حاصل کی۔ یہاں سے ایران کے حالات خراب نظر آئے تو ایران چلے گئے۔ شاہ ایران سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے بڑی آؤ بھگت کی مگر جیسے ہی ان کی عوام میں مقبولیت اور ان کے نظریات سے آگاہی ہوئی اور ایران کے طول و عرض میں سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی تو ان کی گرفتاری کا حکم جاری ہو گیا کچھ روز کے بعد آپ قسطنطنیہ چلے گئے۔ یہ وقت تھا جب خلیفہ عبدالمجید نے ان کی زبردست مقبولیت اور مقناطیسی شخصیت دیکھ کر ہم جلیسی اور مصاحبی سے سرفراز کیا۔ لیکن سلطان ان کی شخصیت سے فائدہ اٹھا کر اپنی شہنشاہیت بچانا چاہتا تھا۔ لیکن جمال الدین افغانی عوام کے ہمدرد اور مونس تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دن کے بعد سلطان کی شبہ ہوا کہ ترکی میں چلنے والی سیاسی تحریکات میں جمال الدین افغانی کا خفیہ ہاتھ ہے ادھر شاہ سلطان کے سامنے قاچار کے قتل کا تازہ واقعہ تھا، جس کی نسبت سے یہ مشہور تھا کہ اس میں جمال الدین افغانی کی تعلیمات کا ہاتھ ہے۔ سلطان کے ذہن میں آیا کہ جس شخص کے اثر و رسوخ سے شاہ ایران بھی محفوظ نہ رہ سکا اس سے شاہ ترکی بھی کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ سلطان کے ان اندیشوں کے نتیجہ میں جمال الدین افغانی کو قسطنطنیہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ بظاہر وہ کسی جیل خانے میں نہیں تھے مگر ان کی نقل و حرکت پر پولیس کی کڑی نگرانی تھی اور وہ قسطنطنیہ سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ مسلسل جدوجہد اور عمر کے ساٹھ کے قریب پہنچ جانے کی وجہ سے آپ کے قویٰ میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے قید خانے میں مرض کینسر کا شکار ہو گئے اور چند دن بعد 9 مارچ 1897ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔ چونکہ سلطان کے معتوب تھے اس لیے جنازے میں بے انتہا مقبولیت کے باوجود صرف چند افراد شریک ہوئے۔ ایک گوشہ گمنامی میں دفن کر دیئے گئے۔ جنگ عظیم اول کے بعد ترکی میں ان کے مزار کا کھوج نکالا گیا اور 1920ء میں اس پر ایک خوبصورت مرمریں مقبرہ تعمیر کر دیا گیا۔ لیکن تاریخ عالم کی یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ جن کے لئے ساری زندگی جدوجہد کی ان میں سے کسی ایرانی ترک اور عرب و افغانی نے ان کا مقبرہ تعمیر نہ کیا تھا، بلکہ ہزاروں میل دور امریکہ کے ایک باشندے کرین نامی نے جس نے محض دور سے ان کا نام سنا تھا ان کا مقبرہ تعمیر کرایا اس واقعہ سے خود ترک بھی شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ ترک

اخبارات نے اس پر جو تبصرہ کیا وہ یوں تھا۔ ''جمال الدین افغانی اور ایک امریکی میں کس قدر فاصلہ ہے، دین کا فاصلہ زبان کا فاصلہ، وطن کا فاصلہ، ماحول وخیالات کا فاصلہ۔ ان میں سے ہر فاصلہ جمال الدین کو امریکی سے دور کرتا ہے مگر مسٹر کرین نے ان تمام دوریوں کو بھلا کر یہ فاصلہ طے کیا اور جس محترم اور مہربان کو ہم بھول گئے تھے اس کا مزار ہوایک ایک امریکی کے ہاتھوں آپ کے مزار کی تعمیر ایک انسان کے ہاتھوں ایک انسان کے مزار کی تعمیر ہے مگر اس سے بھی حسرتناک چیز یہ ہے کہ آپ کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ سلطان ترکی نے آپ کو زہر دے کر مروا ڈالا تھا۔ وہ انسان جو اسلامی تعلیمات کو حیات تازہ دینا چاہتا تھا۔ خلیفۃ المسلمین کے ہاتھوں متاع زندگی کھو بیٹھا۔ اگرچہ دنیائے اسلام کی اس حیرتناک شخصیت کو اپنی زندگی میں کامیابی نصیب نہیں ہوسکی مگر مرنے کے بعد اس کے پیغام انقلاب کی گونج مشرق سے مغرب تک کے مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حتیٰ کے افغانستان نے اپنے اس باسی کے مزار کو ترکی میں گوارا نہ کیا اور 1945ء میں ان کے پورے مقبرے کو کھود کر ترکی سے افغانستان بڑے تزک واحتشام سے منتقل کر دیا جہاں یہ آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے۔

ترکوں میں قوم پرستی کے جذبات کی بیداری:

سلطان عبدالمجید کی یہ کوشش کہ ادارہ خلافت دینائے اسلام میں خلافت راشدہ جیسی عظمت وتقدیس حاصل کرے ناکام ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ دنیا میں ہر جگہ قوم پرستی کے جذبات بیدار ہو چکے تھے اور قوم پرستی کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ دنیائے عرب اور ترکوں میں صرف نسلی اختلاف ہی نہیں تھا بلکہ وہ معاشرت کے اعتبار سے بھی دو مختلف قومیں تھیں۔ اس لیے ایک طرف تو عرب ترکوں کو ننگ اسلام سمجھنے لگے دوسری طرف ترکوں میں عربوں سے علیحدہ ہو کر اپنی قومی ترقی کا جذبہ شدت سے ابھرنے لگا۔ چنانچہ نامق کمال، ضیا کمال نوری، رفعت اور عبدالحق حامد جیسے ترقی پسند ادیبوں نے ترکوں کے ان جذبات کی ترجمانی اپنے ادبی جریدوں میں جس سے قوم پرستی اور حب الوطنی جذبات بیدار ہونے لگے۔

مدحت پاشا:

ترکی میں قوم پرستی اور حب الوطنی کے بانی اول مدحت پاشا تھے۔ انہوں نے سرکاری عہدے سے مستعفی ہو کر اپنی سیاسی جماعت تشکیل دی ار پھر شیخ الاسلام کے تعاون سے پہلے سلطان عبدالعزیز کو معزول کرایا پھر سلطان عبدالحمید کو تخت پر بٹھا کر اصلاحات کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ سلطان نے مدحت پاشا اور اس کی جماعت کی سیاسی طاقت کو جانچتے ہوئے مدحت پاشا کو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا اور کچھ اصلاحات بھی نافذ کیں لیکن جب عوام جب عوام کا زور بڑھا اور سلطان کو تشویش لاحق ہوئی اور مدحت پاشا پر حکومت کے خلاف سازش کرنے کا الزام لگا کر انہیں جلاوطن کر دیا گیا وراس کے ساتھ ہی آئینی اصلاحات کو بھی معطل کر دیا، لیکن ترک عوام میں مدحت پاشا بہت مقبول تھے اس لیے تھوڑے دنوں بعد عوام کے اصرار پر انہیں واپس بلوانا پڑا مگر اب ان کے قتل کی تجویز ہوئی تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ چنانچہ سلطان عبدالعزیز کے قتل کا الزام لگا کر مدحت پاشا کو سزائے موت دے دی گئی مگر برطانوی سفیر سے مدحت پاشا کے اچھے تعلقات تھے۔ برطانوی کونسل کی مداخلت پر سزائے موت کو دائمی نظر بندی میں تبدیل کر دیا گیا اور عرب میں نظر بند رہنے کا حکم دیا گیا مگر بعد میں سلطان کو یہ غیر مناسب نرمی پسند نہ آئی اور مدحت پاشا کو قید کے دران قتل کرا دیا گیا شاید سلطان عبدالمجید اپنے قتل

لیکن مدحت پاشا اور جمال الدین افغانی کا خون رائیگاں نہ گیا بلکہ محب وطن ترک نوجوان ان بے انصافیوں پر بھڑک
اٹھے سلطان نے ان کے جذبات دبانے کی بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ آخر بہت سے سیاسی فتنوں کی
وجہ سے عرصہ اتنا بڑھا کہ 1919ء میں سلطان موصوف کو اپنے ظالمانہ ہتھکنڈوں کے باوجود تاج و تخت سے دستبردار ہونا
پڑا اور سلطان محمد خامس ان کے جانشین بنے۔

لیکن اب ترک عوام کو مطلق العنان شاہی پر قانع رکھنا بہت مشکل ہو گیا۔ وطن پرستی کے سوئے ہوئے جذبات
جوش و خروش کے ساتھ جاگ اٹھے۔ ترکی کی تباہی اور اتحادیوں کے ہاتھوں حصے بخرے ہو جانے پر جو آنکھیں رو
رہی تھیں اب ان کو اس کا حل صرف ترکی قومیت کی شیرازہ بندی کرنے میں نظر آیا۔ اب تک ترک خود کو صرف مسلمان کہتے
اور صرف مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے ترک کا لفظ حقیر سمجھا جاتا تھا اور خود کو ترک کہنا کوئی فخر کی بات نہیں تھی۔ مگر
قومیت کا جذبہ بیدار ہونے کے بعد اب ترک کہلانا اور تورانی نسل سے تعلق رکھنا فخر کی بات سمجھی جانے لگی اور قدیم نسلی و قومی
ہیروں کے گڑے مردے اکھاڑ کر ان پر قومی عزت و شان کی عمارات کھڑی کی جانے لگیں۔ ترکی کے ایک شاعر نے اس
زمانے میں کہا تھا۔

میں ترک ہوں میرا دین اور میری نسل اعلیٰ ہے

اس زمانے میں یہ مصرع ترکوں کی زبان میں قومی شعر کی حیثیت اختیار کر گیا۔

عرب دنیا کا رد عمل:

ترک قومیت کے ان جذبات کی ترجمان ایک انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے تھی جو روز بروز طاقت ور ہوتی جا رہی تھی
اقوام یورپ نے جب یہ حالات دیکھے تو انہیں سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ انجمن اتحاد و ترقی کے راہنما قومیت کے علمبردار ضرور
تھے مگر اس کے ساتھ وہ اسلام کی عالمگیر برادری پر بھی زبردست زور دیتے تھے جس کی وجہ سے یورپ کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ
اگر یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو گئی تو سلطنت عثمانیہ میں جو بکھرے ہوئے مسلمان بستے ہیں ان میں عالمگیر اتحاد پیدا ہو
جائے گا جو اہل یورپ کے مفاد میں نہیں ہو گا اسی اندیشے کی بنیاد پر عربوں میں ترکوں کے جذبہ قومیت کے خلاف نفرت
پھیلانے کا کام معلمان یورپ نے شروع کر دیا۔ چنانچہ جیسے ہی انجمن اتحاد و ترقی کی کوششوں سے دوبارہ دستوری حکومت بنی
عربوں میں قومی آزادی حاصل کرنے کے جذبات بھڑکا دیئے اس کام کے لئے مشہور برطانوی ایجنٹ لارنس آف عریبیہ
نے بڑا کام کیا۔ ادھر بغداد میں عراقی افسروں نے خفیہ انجمنیں بنانا شروع کر دی۔ اسی قسم کی انجمنیں شام کی آزادی کے لئے
دمشق میں بننا شروع ہو گئیں۔ حجاز میں شریف مکہ جو سید ہونے کی وجہ سے خود کو مسلمان کی امارت و سرداری کا قدرتی حق دار
سمجھتا تھا اس نے بھی کروٹ بدلی اور اپنی عرب سلطنت کے خواب دیکھنے لگا۔ ادھر نجد کے نخلستان میں ابن سعود نے اسلام کی
تعلیمات کو دوبارہ زندہ کرنے اور سعودی حکومت قائم کرنے کے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے۔

سلطنت ترکی کے خلاف اہل یورپ کی سازشوں کی وجہ سے مختلف عناصر کا زور شور بڑھتا جا رہا تھا ان حالات سے
مجبور ہو کر ترکی کے سلطان نے 1914 میں جرمنوں سے اتحاد قائم کر کے برطانیہ فرانس اور روس کے خلاف اعلان جنگ کر

دیا اس وقت عوام میں جو انتشار پیدا ہوا تھا ترکی کی حکومت کا خیال تھا کہ جنگ مختلف مسلم عناصر کو متحد کر دے گی اور مسلمان جہاد کے نام پر سلطنت عثمانیہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں گے۔ دوسری طرف جرمنی کے اتحادی ہونے کی وجہ سے ترکی کو جدید آلات حرب کی سے آراستہ ہونے اور جدید ٹیکنالوجی کے حصول کا موقع ملے گا جہاں تک اس دوسری توقع کا تعلق تھا اس میں ترکی کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی لیکن پہلی توقع میں سخت ناکامی ہوئی اور انتہائی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ عراق میں عربوں نے ہندوستان کی انگریزی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا اور بڑی آسانی سے ہتھیار ڈال دیے اسی طرح شام میں بھی عرب ترکوں کے باغی ہو گئے اور انہوں نے جنگ میں ترکوں کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی حمایت کی۔ نجد میں ابن سعود نے انگریزوں کی پشت پناہی کی وجہ سے ترکوں سے لاتعلقی اور غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ شریف مکہ نے انگریزوں سے یہ عہد و پیمان کیا کہ اگر برطانیہ اسے بلاد عرب کی سلطانی دلا دے تو وہ عرب قبائل کو ترکوں کے خلاف آمادہ جنگ کرنے میں اتحادیوں اور لارنس آف عربیہ کی مدد کرے گا۔

شریف حسین آف مکہ:

شریف حسین ابن علی 1856ء۔ 1931ء کی زندگی کا بڑا حصہ قسطنطنیہ میں گزرا تھا۔ 1908ء میں اسے شریف مکہ مقرر کیا گیا تھا۔ جنگ عظیم اول کے آغاز میں انگریزوں نے جب ترکوں کے خلاف مختلف عناصر کو ابھارا ان میں شریف حسین مکہ بھی تھا اسے عرب شاہی کا چکمہ دے کر ترکوں کے خلاف نازک وقت میں آمادہ بغاوت (1916) کیا گیا۔ ابتدا میں انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ درہ دانیال کے رستے سے قسطنطنیہ پر براہ راست حملہ کر کے ترکی کی حکومت کو تہ و بالا کر دیں مگر 1915ء میں انہیں جزیرہ نما گیلی پولی میں منہ کی کھانی پڑی اور مصطفیٰ کمال نے انگریزی فوج کے حوصلے پست کر دیے اس کے بعد برطانیہ نے سازش کا رستہ اختیار کیا اور شریف حسین سے ساز باز کر کے عرب و عراق کی راہ سے ترکوں کو زک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔

لارنس آف عربیہ:

شریف حسین نے پہلے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا اس بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لیے ترک افواج مدینہ منورہ میں تسلط قائم کیے ہوئے تھیں۔ عربوں میں یہ افواہ بڑے زور سے پھیلائی گئی تھی کہ ترکوں نے مکہ معظمہ پر بھی گولہ باری کی ہے اس بمباری کی خبر نے قدرتاً عرب قبائل میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور سب متحد ہو کر ترکوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اس صف آرائی میں زیادہ ہاتھ مشہور انگریز ایجنٹ ٹی۔ ای۔ لارنس کا تھا جو شریف حسین مکہ کے بیٹے فیصل کا ساتھی بنا ہوا تھا کرنل لارنس اگرچہ نسلاً انگریز اور مذہباً عیسائی تھا مگر عرب دنیا میں سال ہا سال رہنے کی وجہ سے عربی زبان، عربی معاشرت، عربی رسم و رواج سے خوب واقف تھا یہاں تک کہ سارا عرب اس کے لباس اور زبان کی وجہ سے اسے عرب سمجھتا تھا۔ صرف شریف حسین اس راز سے واقف تھا کہ لارنس انگریز ہے چونکہ اس وقت اس کے دماغ پر تمام عرب دنیا کی شاہی سوار تھی اس لیے اس نے عرب دنیا سے اس راز کو چھپا لیا اور لارنس کو بھی اپنا بیٹا مشہور کر دیا۔ اس طرح لارنس عربوں میں ابن حسین کے نام سے مشہور تھا۔ وہ باقاعدہ مجلسوں میں عربی لباس میں شرکت کرتا اور انہیں عربی زبان اور فصیح و بلیغ انداز میں اسلام کی گذشتہ تاریخ سے عظیم کارنامے سنا سنا کر ترکوں کے خلاف بھڑکاتا تھا اور خود غیر قوم ہونے کے باوجود ان میں

مار رہا تھا۔ غرض اس سرگرمی میں عرب فوج کی مدد سے انگریزی فوج حجاز کے شمال سے شام کو طے کرتی ہوئی ترکی کی سرحد تک پہنچ گئی اس طرح چاروں طرف سے گھر جانے کے بعد نومبر 1918ء میں ترکوں نے روس سے التوائے جنگ کا معاہدہ کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس صلح نامے کی رو سے سلطنت ترکی نے یہ اعلان کیا کہ وہ مصر اور بلاد عرب سے دستبردار ہوتے ہیں۔

یہ تھے وہ حالات جب ترکی اتحادیوں کے چنگل میں پھنس گیا تھا اور مصطفیٰ کمال جیسے ذہین ترک فوجی افسر نے خلیفہ سے دور اناطولیہ میں ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن یہاں آ کر اس نے امیر المومنین اور شیخ الاسلام دونوں کے فرمانوں کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ ترک قوم دیکھ رہی تھی کہ عثمانی خاندان اور اس کی سلطنت کو جنگ عظیم نے بالکل تباہ کر دیا تھا اس لئے اب یہ حکمران خاندان ترکوں کی شیرازہ بندی نہیں کر سکتا۔ ادھر عربوں نے بغاوت کر کے ترکی کے دستاویزی قتل میں اتحادیوں کی معاونت کی تھی۔ ان حالات میں کوئی بھی راستہ بچا تھا تو وہ ترکی قومیت پسندی کا راستہ تھا۔ اسلام کے جوش اور اتحاد رنگ کو عرب بغاوت نے پارہ پارہ کر دیا تھا اس لئے اب آخری چارہ یہی تھا کہ ترکوں کو ترکی کے نام پر ابھار کر ملک کو اتحادیوں سے بچایا جائے اور اس کی عظمت رفتہ بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔

مصطفیٰ کمال پاشا:

مصطفیٰ کمال یونان کے شہر سالونیکا میں 1880ء میں پیدا ہوا۔ کمال کی ذہانت و فطانت اپنے گھر اور خاندان سے بہت بلند تھی۔ ماں اسے ایک دینی عالم بنانا چاہتی تھی۔ مگر کمال کے ذہن میں بچپن ہی سے فوجی زندگی سمائی ہوئی تھی اس لئے اس نے اپنے والدین کی رائے کے خلاف فوجی زندگی کو پسند کیا اور 1905ء میں ایک معمولی فوجی عہدے پر فائز ہو گیا اس سال کے بعد ترکی نے جتنی جنگیں لڑیں ان سب میں مصطفیٰ کمال نے بہادری سے شرکت کی۔ اٹلی کے خلاف طرابلس کی جنگ ہو یا برطانیہ کے خلاف گیلی پولی کا معرکہ یا روس کے خلاف کاکیشیا کی جنگ اور 1918ء میں شام کا محاذ سب میں مصطفیٰ کمال نے اپنی بہادری اور قابلیت کا سکہ جما دیا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ معمولی گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس میں تصنع اور ریاکاری نہ تھی۔ اس بنا پر وہ کبھی سیاسی مسائل پر غور نہیں کرتا تھا۔ 1917ء میں سلطان وحید الدین نے اس کی سیاسی قابلیت کا اندازہ کرتے ہوئے اسے اپنے اس وفد میں شامل کیا جو جرمن جا رہا تھا۔ اس وفد کی ملاقات معروف جرمن جرنیل لڈن ڈراف اور ہنڈن برگ جیسی زبردست جرمن شخصیات سے ہوئی۔ ان شخصیات کا ترک وفد سے سلوک اہانت آمیز تھا۔ ادھر کمال انجمن ترکی و اتحاد کا مخالف تھا اس نے سلطان وحید الدین پر زور دیا کہ وہ اس انجمن کو ختم کر دے مگر انجمن کی مقبولیت کی وجہ سے سلطان کو خطرہ تھا کہ اگر یہ اقدام کیا گیا تو اسے معزول کر دیا جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جب نومبر 1918ء میں ترکی نے التوائے جنگ کے عارضی صلح نامے پر دستخط کئے تو ملک میں مصطفیٰ کمال کا کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ مزید برآں اتحادیوں نے جن ترک فوجی افسروں اور سیاسی راہنماؤں کو مشکوک سمجھ کر گرفتار کرنا شروع کیا تھا۔ ان کی فہرست میں مصطفیٰ کمال کا نام بھی تھا۔ اسے جزیرہ مالٹا میں قید کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ان حالات میں مصطفیٰ کمال فوج کو

نہتا کرنے کے بہانے اناطولیہ پہنچ گیا اور اس نے فاتح اتحادیوں کے خلاف ترک قوم کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اناطولیہ ایک سنگلاخ علاقہ ہے اور اس کے ہر طرف دشوار گزار پہاڑ کھڑے ہیں۔ یہ ایسا قدرتی مقام تھا جہاں وہ سلطانی اور اتحادی دونوں فوجوں سے محفوظ تھا۔ سلطان نے کردوں کو اس کے خلاف اکسایا، لیکن اس چیز نے ترکوں کی صفوں میں مزید اتحاد پیدا کر دیا اس لیے ترکی میں قومی بلندی و برتری کا جو احساس پیدا ہو چکا تھا وہ اسے روا نہ رکھ سکتا تھا کہ کردوں جیسی ذلیل و حقیر قوم ترکوں کے منہ آئے۔ 11 مئی 1919ء کو اتحادیوں کا بحری بیڑہ امیر البحر کال تھروپ کی کمان میں سمرنا میں داخل ہوا اور اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ جس کے نتیجے میں ہر طرف زبردست مار دھاڑ ہوئی۔ جب اس مار دھاڑ کی دردناک تفصیلات ملک میں مشہور ہوئیں تو ترکوں میں مزید جوش بڑھا اور اس طرح مصطفیٰ کمال کو اتحادیوں کے خلاف فوج اکٹھی کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔

ترکوں کا پہلا قومی اجتماع:

غرض قومی بدحالی کی وجہ سے مصطفیٰ کمال کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ چنانچہ جون 1919ء میں اناطولیہ کے شہر ارض روم میں سینکڑوں ترک راہنماؤں کے نام دعوت نامے جاری کیے گئے تاکہ وہ آ کر قومی مجلس میں شرکت کریں اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل طے کیا جائے۔ ادھر قسطنطنیہ میں سلطان مصطفیٰ کمال کی مخالفت میں فرمان پر فرمان جاری کرتا رہا تھا اور اتحادی فوجیں بھی اس کو اور اس کے ساتھیوں کو کچل ڈالنے کی تیاریوں میں مصروف تھیں، مگر اسکے باوجود قومی مجلس کے دعوت ناموں پر راہنما بھیس بدل بدل کر ملک کے گوشے گوشے سے شریک ہوئے اور سب نے اس قومی اجتماع میں مصطفیٰ کمال کو اپنا صدر منتخب کر لیا پہلے قومی اجلاس کے کچھ ماہ بعد دوسرا قومی اجلاس منعقد ہوا جس میں ترک عوام کی طرف سے عملی کاروائیوں کے لئے ایک انتظامی کونسل تشکیل دی گئی۔ اب پوری قوم کو یقین ہو چلا تھا کہ قسطنطنیہ کی حکومت اغیار کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن چکی ہے۔ اس لیے اب نجات صرف قومی جدوجہد ہی پر منحصر ہے۔ قومی انتظامی کونسل کا مستقر ارض روم سے انگورہ (انقرہ) منتقل کر دیا گیا۔ چند دن بعد انگورہ سے انتظامی کونسل نے ایک میثاق ملی شائع کی۔ اس میثاق ملی کی رو سے ترکوں نے اعلان کیا کہ ہم عرب قوم کی ہر زمین سے دستبردار ہوتے ہیں لیکن جن علاقوں میں عثمانی مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جو مذہب و نسل و نصب العین کے لحاظ سے ایک ہیں اور ایک ملک ہیں انہیں کسی اصول یا قانون سے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔

اتحادیوں کی غلطیاں:

جب یہ میثاق ملی شائع ہوا تو دنیا میں اس پر ہنسی اڑائی گئی۔ ادھر قسطنطنیہ نے اس میثاق سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو باغی اور واجب القتل قرار دیا۔ ترکوں کی خوش نصیبی سے اتحادیوں نے اس زمانے میں تین ایسی غلطیاں کی جنہوں نے ترکوں کی آتش غیرت وحمیت کو بھڑکا دیا جس کی وجہ سے بالآخر وہ ایک آزاد قوم بن کر دنیا کے نقشے پر ابھرے۔ غلطیاں یہ تھیں۔

1- معاہدہ سیورے:

اتحادیوں کی غلطیوں میں پہلی غلطی معاہدہ سیورے تھا جو ٹھیک انہیں دنوں شائع کیا گیا تھا اس معاہدے کا ما حاصل پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ معاہدہ سیورے کی رو سے ملک کے زرخیز شاداب خطے اتحادیوں کے ماتحت کر دیئے گئے۔ سمرنا کا یونان میں شامل کرنا طے پایا۔ ادالیہ ADALIA ایک اور زرخیز علاقہ اٹلی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح ترکی کے پاس جو علاقہ رہا وہ صرف چٹیل میدانوں اور بنجر اور پتھریلی زمینوں پر مشتمل تھا۔ پھر اس پر بس نہ کیا گیا بلکہ اس چٹیل علاقے کے مشرق میں کرد اور آرمینی قوموں کو آزاد ریاستیں قائم کرنے کا حق دیا گیا اس طرح ترکوں کے سر پر دو مخالف قومیں ہمیشہ کے لئے مسلط کر دی گئیں۔ مزید برآں قسطنطنیہ کو اتحادیوں کے زیر کمیشن علاقوں سے گھیر لیا گیا اور تھریس کا پورا علاقہ بھی یونان کو دے دیا گیا۔ نیز طے ہوا کہ ترکی 15 ہزار سے زائد فوج نہیں رکھے گا۔

ایک امریکی مورخ نے اس معاہدے کو شہنشاہی حرص و آز کی ایک شرمناک مثال قرار دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں معاہدہ ورسیلز اور معاہدہ بریسٹ لٹوفسک کی شرائط بھی بہت نرم محسوس ہوتی تھیں۔ اس معاہدے کی اشاعت سے ترکوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی نجات صرف قومی جدوجہد میں ہے۔

2- بدعہدی:

مندرجہ بالا غلطی کے بعد اتحادیوں نے دوسری زبردست غلطی یہ کی کہ انگورہ یہ خبر بھیجی کہ اتحادی ترکوں کی قومی مجلس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں، بشرطیکہ اسے باضابطہ طور پر قسطنطنیہ میں منعقد کیا جائے۔ مصطفیٰ کمال اور اس کے چند دوستوں کے سوا باقی راہنما اس خوبصورت دام فریب کا شکار ہو گئے اور بہت سے ترک راہنما بڑی تمنا کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچے، جہاں جنوری 1920ء میں پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں میثاق ملی کی تمام دفعات منظور کر لی گئیں۔ ترک نمائندے مارے خوشی کے پاگل ہو گئے مگر صرف دو مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ اچانک اتحادی فوج نے قسطنطنیہ کی تمام سرکاری عمارات پر چھاپہ مار کر اور تمام ترکی مکانوں اور محلوں پر حملہ کر کے چالیس کے قریب ترک راہنماؤں کو، جو پارلیمنٹ کے اجلاس میں دور دراز سے قسطنطنیہ آئے تھے، گرفتار کر لیا اور مالٹا میں نظر بند کر دیا اس بدعہدی نے پوری ترکی کی آنکھیں کھول دیں اور سب نے مصطفیٰ کمال کی اس بات کو صحیح تسلیم کیا کہ اتحادیوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

3- یونان کا حملہ:

تیسری غلطی 1920 میں اتحادیوں نے یہ کی کہ یونان کو شہ دے کر سمرنا پر حملہ کروا دیا تاکہ انگورہ کی قومی مجلس کو درہم برہم کیا جا سکے اور سمرنا کو یونان کے تسلط میں دیا جا سکے۔ مصطفیٰ کمال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اسلحہ کی کمی اور نو تربیت یافتہ افراد کے ساتھ یونان کو شکست دی اور اتحادیوں سے اپنی طاقت کا لوہا منوالیا۔ مگر اس کی یہ فوج ایسی تھی کہ نہ اس کے پاس وردیاں تھیں اور اسلحہ بھی ناقص تھا۔ کچھ نیم تربیت یافتہ اور کچھ ناتربیت نوجوان تھے جنہیں دیکھ کر یورپ کا معمولی سپاہی بھی قہقہہ لگاتا تھا، مگر مصطفیٰ کمال نے اسی ناقص فوج کے ساتھ فاتح اتحادیوں کو یونانیوں کی آڑ میں شکست دی۔ آخر 1922ء میں یونان ہار گیا اور یونانی فوجیں تھریس سے نکال دیے گئے۔ مٹھی بھر ترکوں کی بہادری دیکھ کر ساری دنیا اور اتحادی

حیران رہ گئے۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے ابھی جنگ جیتی تھی ابھی امن کو جیتنا بھی ضروری تھا۔ یونان کی شکست کے بعد اتحادیوں نے سمجھ لیا کہ اب معاہدہ سیورے کو باقی رکھنا ممکن نہیں۔ اب 1923ء میں ترکی کی حدود کے تعین کے لیے لوزان میں ایک کانفرنس بلائی گئی، اتحادیوں نے نئی چال یہ چلی کہ فاتح "قومی مجلس" انگورہ کے نمائندوں کے ساتھ قسطنطنیہ سے بچی سلطان کے نمائندہ بھی بلوا لیا۔ یہ خبر جب انگورہ پہنچی تو ترک راہنما غصے سے تلملا اٹھے۔ انہوں نے فوراً اتحادیوں کی سازش سے بچنے کے لئے، کہ سلطان کے پردے میں ترک قوم کا اتحاد پارہ پارہ کرنا مقصود تھا، قومی مجلس کا اجلاس طلب کیا اور اعلان کیا کہ سلطنت اور خلافت دو الگ الگ منصب ہیں اس لیے سلطان ترکی خلیفۃ المسلمین نہیں ہے۔ دوسرے قانون کی رو سے سلطنت ترکی کو منسوخ کر دیا گیا۔

سلطان وحید الدین کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے جان کا خطرہ محسوس کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ جو ترک راہنما فاتح اتحادیوں کو شکست دے سکتے تھے۔ وہ اس کے لئے سزائے موت بھی تجویز کر سکتے ہیں اس طرح سلطان جان بچا کر قسطنطنیہ سے ایک برطانوی جہاز پر سوار ہو کر بھاگا۔ اس کے جانے کے بعد سلطان عبدالمجید دوم نے خلافت اور سلطنت کا مطالبہ کیا اور اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان بھی کر دیا مگر ترک سلطانی اور خلافت کا جنازہ تو سلطان وحید الدین کے فرار کے ساتھ ہی نکل چکا تھا۔ چنانچہ اب اتحادیوں نے دربار خلافت کے کسی نمائندے کے طلب کرنے پر اصرار نہ کیا۔

لوازن کانفرنس:

اس کانفرنس میں ترکی کی طرف سے عصمت انونو بھیجے گئے جو مصطفیٰ کمال کے قریبی ساتھی تھے۔ برطانیہ کی طرف سے لارڈ کرزن کو بھیجا گیا۔ عصمت انونو نے وہ تمام مطالبات جو مجلس قومی نے اپنے میثاق ملی میں شائع کیے تھے۔ اب اتحادیوں کی میز پر رکھ دیئے۔ کرزن بعض مطالبات کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا تھا، اسلئے چار مہینے کی گرما گرم بحث کے بعد بھی کانفرنس ناکام ہو گئی عصمت انونو بھی اڑ گئے اور اپنے مطالبات کے چھوٹے سے حصے سے بھی دستبردار نہ ہوئے۔ اس کانفرنس کی ناکامی عصمت انونو پر ڈالی گئی اور قریب تھا کہ ان کے خلاف قومی مجلس میں عدم اعتماد کا ووٹ ڈالا جاتا کہ مصطفیٰ کمال نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں بچا لیا۔ ترکی کو اصل خطرہ یہ تھا کہ اگر صلح نامہ نہ طے پایا تو اتحادی کہیں دوبارہ جنگ نہ چھیڑ دیں جس کی سکت اب ترکوں میں باقی نہیں تھی مگر ایسا نہ ہوا اور لوازن میں دوبارہ صلح کانفرنس منعقد کی گئی۔ ترکی نے اس بار پھر عصمت انونو کو بھیجا برطانیہ نے اس بار سر ہوریس رم بولڈ HORACERUM BOLD کو بھیجا۔ اس مرتبہ ترکی کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے گئے اور جولائی 1923ء میں صلح نامہ لوازن پر دستخط ہو گئے۔ یہ صلح نامہ ترکوں کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ ذلت آمیز معاہدہ سیورے کو اب ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا گیا۔

منصب خلافت کا خاتمہ:

اب سوال یہ تھا کہ جدید ترکی میں حکومت کس قسم کی قائم کی جائے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ خلافت کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ بعض اشتراکی روس کی طرز کی حکومت چاہتے تھے۔ کچھ کی رائے تھی کہ یورپ کی طرز پر آئینی بادشاہت قائم کی جائے۔ ان تجاویز میں خلافت کی تجویز کو گرا دینا سب سے مشکل کام تھا کیونکہ اس کا تعلق براہ راست مذہب سے تھا۔ لیکن عین اسی وقت پر برطانوی ہند سے تعلق رکھنے والی دو شخصیات سر آغا خاں اور امیر علی نے ترکی کی قومی مجلس کو خلافت کو دوبارہ قائم

کرنے کی دخواستیں پیش کیں جنہیں قسطنطنیہ کے اخبارات نے بڑی آب و تاب سے شائع کیا۔ مگر مصطفیٰ کمال نے ان تجاویز کا دوسرا رخ ترک قوم کے سامنے رکھ دیا وہ یہ تھا کہ چونکہ سر آغا خاں اور امیر علی کا تعلق برطانوی حکومت سے تھا جو ترکی کی سب سے بڑی دشمن رہی تھی۔ اس سے کمال نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بڑی آسانی سے ترک قوم کو سمجھا دیا کہ سر آغا خاں کے پردے میں یہ دراصل انگریز کی تجویز ہے اور اتحادی چاہتے ہیں کہ ہم پر پھر ایک کٹھ پتلی قسم کا خلیفہ مسلط کر دیں۔ انگریزوں اور انگریزوں کی تجاویز کے لئے ترکوں کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی وہ یورپ کی اس عیار قوم کے ہاتھوں بہت مرتبہ زک اٹھا چکے تھے۔ انگریزوں کے محکوم ہندوستان کے راہنماؤں کا خلافت کو از سر نو قائم کرنے کا مطالبہ ایک انگریز سازش معلوم دیا جس پر ''مجلس وطنی'' نے زبردست اکثریت سے خلافت کے منصب کو ختم کر کے اپنی جگہ جمہوریت کو نافذ کرنے کا ووٹ دیا، یہاں تک کہ ان اخباروں کے ایڈیٹروں پر بھی مقدمات قائم کر دیئے گئے جنہوں نے امیر علی اور سر آغا خاں کی تجاویز کو اچھالا تھا۔

شیخ الاسلام بھی رخصت ہوئے:

خلافت کی تنسیخ کے بعد شیخ الاسلام کے منصب کا سوال اٹھا۔ ترکی میں ایک عرصہ سے بادشاہت کی طرز پر یہ منصب بھی خاندانی ہو گیا تھا اس طرح علم و فضل بھی سلطنت کی طرح موروثی قرار پایا تھا۔ چنانچہ علما کے خاندان میں گود کا بچہ بھی عالم کہلاتا تھا۔ پھر شیخ الاسلام ہمیشہ ظالم سلطانوں کی ہی اعانت کرتا تھا کیونکہ وہ حکومت کا ملازم تھا۔ اسلئے جب اقتدار عوام کے ہاتھ میں آیا تو قدرتاً عوام اس طبقاتی نظام کو بھی برداشت نہ کر پائے اور شیخ الاسلام کے منصب کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔

اشتراکیت بھی مسترد:

خلافت کے قیام کی تجاویز کو مسترد کر دینے کے بعد اشتراکی روس سے اتحاد یا ادغام یا اشتراکیت قائم کرنے کی تجاویز کو رد یا مسترد کر دینا معمولی بات تھی۔ اس پر مصطفیٰ کمال نے کہا کہ ہم نے ترکی کی آزادی کو اپنے خون سے اس لئے نہیں خریدا ہے کہ اسے اتحادیوں کے پنجہ استبداد سے چھڑا کر اشتراکیوں کے آگے ڈال دیں۔ خلافت کی نامنظوری کے بعد آئینی بادشاہت کے حامیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی، مگر آئینی بادشاہت کا مطلب بھی شاہی کو زندہ کرنا ہی تھا۔ چونکہ ترک اپنی آزادی کو غاصبوں کے چنگل میں پھنسانا نہیں چاہتے تھے اور بادشاہ بہر حال بادشاہ ہی تھا اس لئے یہ تجویز بھی مسترد کر دی گئی۔

ترکی کا پہلا جمہوری آئین:

اس دوران عصمت انونو اور مصطفیٰ کمال نے مل کر ایک دستور اساسی کا مسودہ تیار کیا جسے کچھ ترمیم و تخفیف اور حکمت عملی سے کام لے کر قومی مجلس سے منظور کرایا گیا۔ اس دستور اساسی کی بنیاد جمہوریت پر رکھی گئی اور سلطنت اور شہنشاہیت کا تصور ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ اس آئین کے منظور کئے جانے کے بعد مصطفیٰ کمال کو ملک کا پہلا جمہوری صدر بنا دیا گیا مگر ابھی بھی شاہی اور خلافت کی تنسیخ جیسے انقلابی فیصلے کو بہت سے لوگ پسندیدگی کی نظر نہیں دیکھتے تھے اور کمال کی مخالفت پر اتر آئے۔ اب یہ پروپیگنڈہ کیا جانے لگا کہ ترک اسلام سے منحرف ہو گئے۔ اس پروپیگنڈے نے سب سے زیادہ اثر کردوں پر کیا کہ وہ سخت مذہبی لوگ تھے اور نسلاً ترکوں کے مخالف بھی اس لئے اس افواہ کے اڑتے ہی انہوں نے ہتھیار

سنبھال لئے اور ترک افسروں اور سپاہیوں کو بے دریغ قتل کرنے لگے۔ کردوں کی اس بغاوت کی حمایت در پردہ
ترک جماعت بھی کر رہی تھی جو ترقی پسند پارٹی کے نام سے مشہور تھی۔ اور مصطفیٰ کمال اور اس کی جمہوریت کے خلاف تھی۔
اس بغاوت کو کچھ دن بعد کچل دیا گیا۔ اور ساتھ ہی ترقی پسند پارٹیوں کے لیڈروں کو بھی چن چن کر قتل کر دیا گیا یا جلاوطن کر
دیا گیا۔ اس کے بعد کسی اور کو مصطفیٰ کمال کی مخالفت کرنے کا حوصلہ نہ رہا۔

مصطفیٰ کمال اور معاشرتی انقلاب:

حکومت اور نظم و نسق قائم کئے جانے کے بعد ترکی کی معاشرتی اور معاشی اصلاح بھی ضروری تھی۔ اس سلسلے میں مصطفیٰ کمال نے مغرب کی تقلید کی۔ اسکے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جب تک ترک یورپ کے ہم پلہ نہ ہوں گے وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ اسلامی تعلیمات اور مشرقی تہذیب کا اثر بھی ابتدائی عمر سے اس کے دل و دماغ میں کچھ کم نہ تھا مگر عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت نے اسلامی تصورات کو شدید نقصان پہنچایا تھا اس لئے اور خلافت اسلامیہ کے نام پر سلاطین عثمانیہ اور شیخ الاسلام نے ترکی کی ترقی میں جو روڑے اٹکائے تھے۔ ان کی بنا پر اس کا دل مشرقیت اور اسلام پسندی دونوں سے بیزار ہو گیا تھا۔ وہ ترکی کے انقلابی عہد کی پیداوار تھا اور یورپ کی قوم پرستی یا نیشنلزم کی طاقت و قوت کے کھلے مظاہرے اس کے سامنے تھے۔ اسلئے اس نے جدید ترکی میں جو اصلاحات نافذ کیں ان میں ماضی سے وابستگی یا اسلام سے وابستگی کو کوئی خاص خیال نہ کیا گیا۔ دراصل وہ اتحادیوں کا مخالف ہونے کے باوجود ہر طرح سے ترقی کو مغربی وضع کی قومیت میں ڈھالنا چاہتا تھا اور ترکوں کو ایک مغربی قوم بنانے کا آرزومند تھا۔ اسی بنا پر اس نے سب سے پہلے قدامت کے نشان یعنی ترکی ٹوپی کے خلاف احکامات جاری کئے۔ اس نے کہا یہ جہالت اور غلامی کے دور کا نشان ہے اس لئے اس کی بجائے انگریزی ہیٹ استعمال کیا جائے۔ اس تبدیلی پر اس نے اتنا اصرار کیا کہ اسے بجبر نافذ کیا گیا اور اس حکم کی عدولی کرنے والوں کو مستوجب سزا ٹھہرایا گیا۔

لیکن جس انقلابی قدم نے ترکوں کو انکے ماضی اور اپنے اسلاف سے بالکل دور کر دیا وہ تھا رومن رسم الخط کا اجراء اور عربی رسم الخط کی ممانعت۔ کمال کو یہ پسند نہ تھا کہ عربوں سے کچھ مستعار لیا جائے۔ لہذا 1926ء میں اس نے انگریزی حرفوں کو حکماً جاری کر کے بائیں طرف سے لکھنے کا آغاز کیا۔ پہلے صرف حکومتی اداروں میں یہ حکم نافذ کیا گیا مگر دو سال بعد 1928ء میں یہ حکم تمام ملک میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر نافذ کر دیا گیا۔

پردہ کا چلن بھی منسوخ:

عورتوں کا نقاب بھی مغربی خواتین کی تقلید میں ختم کر دیا گیا۔ ترک خواتین صدیوں سے پردہ نشیں تھیں، مگر کمال کے حکم کی خلاف ورزی کون کر سکتا تھا؟ اس لئے جو خواتین اپنی فطرت کے خلاف اس جدت کو قبول نہ کر سکیں، جب ان سے جبراً پردے کو ترک کرنے کا کہا گیا تو انہوں نے خودکشی کر لی۔ اگرچہ پردے کے لئے خودکشی کرنے والیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، تاہم کافی خواتین نے جان ہلاکت میں ڈالی مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ محکمہ دینیات دینی تعلیم کے مکاتیب و مدارس اور درویشوں کی خانقاہیں سب قلم کی ایک جنبش سے بند کر دی گئیں۔ صرف مسجد کے امام کا منصب باقی رکھا گیا، اوقاف کی آمدنی دینی امور پر خرچ کرنے کی بجائے دنیوی امور پر خرچ کرنے کا قانون بنایا گیا۔ 18 اپریل 1924ء سے تمام شرعی

بند کر دی گئیں ان کی جگہ جدید مغربی قوانین کے مطابق کورٹس اور کچہریاں قائم کی گئیں۔
اسلامی تعلیم کے لئے جو دینی درس گاہیں سرکاری یا غیر سرکاری طور پر کام کر رہی تھیں انہیں 3 مارچ 1924ء کو ایک قانون کے ذریعے بند کر دیا گیا یہاں تک کہ یکم جنوری 1926ء سے سنہ ہجری بھی منسوخ کر دیا گیا اور اسکی جگہ یورپی اقوام کی تقلید میں سن عیسوی سرکاری طور پر نافذ کر دیا گیا۔ اسکے بعد زبان کی طرف توجہ دی گئی جس نے ترکی زبان سے عربی اور فارسی کے تمام الفاظ کر نکال کر ان کی جگہ ترکی مترادفات کو رائج کیا غرض ہر لحاظ سے مصطفیٰ کمال نے ترکی کو ایک جدید قوم بنانے کے لئے مشرقی روابط سے بیگانہ کر دیا۔ اور اسلامی روایات سے دُور کرنے کی کوشش کی۔

معاشی حالت:

ترکی کی معاشی بدحالی کا سب سے بڑا اور واحد سبب یہ تھا کہ صنعتی انقلاب کے لحاظ سے وہ یورپی ممالک میں صفر تھا جن اقوام مغرب نے صنعتی ترقی کر لی تھی وہ وسیع وعریض عثمانیہ سلطنت سے نفع اندوزی کر رہے تھے اور یہاں مختلف کاروبار سنبھالے ہوئے تھے۔ ترکی کی حکومت نے ملک میں ریلوے وغیرہ بنانے کے لئے جتنے کام شروع کئے تھے ان کے ٹھیکے غیر ممالک کے صنعتکاروں کو ہی دیئے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی دولت باہر جانے لگی اور دوسری طرف خزانہ شاہی پر بیرونی قرضوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ قرضہ اتنا بڑھ گیا کہ 20 دسمبر 1881ء کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کا مالیہ قرض خواہ ممالک کو تقسیم کیا جانے لگا تھا۔ لیکن جمہوریت قائم ہو جانے کے بعد یا انقلاب کے بعد مصطفیٰ کمال نے یہ نظام بالکل منسوخ کر دیا البتہ قرضے کی ادائیگی کے لئے ملک کے بجٹ کا نصف قرض میں دیا جانا طے ہوا اس وقت ترکی کا قرضہ نو کروڑ گنی کے قریب تھا۔ جو آج کے کھربوں ڈالر بنتے تھے۔ اسکے علاوہ، ملک میں کارخانے قائم کرنے اور جدید آلات سے کاشت کرنے کا پروگرام بھی بنایا گیا۔

ڈکٹیٹرشپ:

1923ء سے 1930ء تک مصطفیٰ کمال ایک آمر یا ڈکٹیٹر کی طرح حکومت کرتا رہا۔ بظاہر ایک پارلیمنٹ اور ایک آئین موجود تھا۔ پارلیمنٹ میں حزب اختلاف قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ بس جو تجویز حکومت کی طرف سے آتی وہی حرف آخر تھی۔ اگرچہ مصطفیٰ کمال کو یہ بھی تسلیم تھا کہ یہ چیز جمہوری اصول کے خلاف ہے۔ مگر اس کا خیال تھا کہ ابھی قوم اتنی ترقی یافتہ نہیں ہوئی کہ جمہوریت کے آداب کے مطابق ایک حزب اختلاف بھی قائم کی جا سکے۔ 1930ء میں پہلی مرتبہ حزب اختلاف قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ واقعی عوام جمہوریت کے اصول سے بے خبر نکلی لہذا وہ سمجھے کہ کمال کمزور پڑ گیا ہے، اسلئے اس کے مخالفوں نے جگہ جگہ سے مخالفت شروع کر دی اور ملک کے طول وعرض میں ہنگامے ہونے لگے۔ اگر چہ ان ہنگاموں کی بنیادی وجہ کمال کی سختیوں کے ساتھ عوام کی جمہوریت سے ناواقفیت بھی تھی مگر کمال نے اس بار بھی سختی سے کام لے کر حزب اختلاف کو ختم کر دیا۔ اپنی مخالفت کو دبا دیا۔

جدید ترکی:

ترکی سلطنت کو اگرچہ جنگ عظیم اول اور عربوں کی بغاوت نے مٹانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی یا پھر اتحادیوں کی بد

عہدی اور دغا بازی نے سلطنت کو نقصان پہنچایا تھا مگر یہ باتیں مورخین کی نظر میں سطحی تھیں۔ اسکے مٹنے کا اصل سبب تو خود سلطنت کی بناوٹ میں پوشیدہ تھا۔ دنیا کی آفرینش سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ شہنشاہیت کی تعمیر ہی میں تحریک یا انقلاب کے جراثیم پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسلام نے خلافت راشدہ کی شکل میں جو سیاسی نظام دیا تھا اس میں تخریب کے ان جراثیم کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر شہنشاہیت میں لذت ہی کچھ اتنی تھی کہ جناب امیر معاویہؓ نے شہنشاہیت کا موروثی رنگ دے دیا تھا۔ یہی انجام ترکی کی خلافت اور سلطنت کا بھی ہوا گو اس نے ایک طویل عمر پائی۔ جنگ عظیم اول اس کے خاتمہ کا سبب بن گئی اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو لازماً انقلاب فرانس جیسا کوئی انقلاب بپا ہوتا اور شہنشاہیت کے پرخچے اڑ جاتے۔ بہرحال شہنشاہیت کے اختتام پر ترکی نے ایک جدید قوم کی شکل اختیار کر لی جس میں تخریب کی بجائے تعمیر و ترقی کے جراثیم موجود تھے۔

☆

1921ء آئرلینڈ کی جدوجہد آزادی

خونی اتوار:

اتوار 21 نومبر 1920 کو ڈبلن میں چودہ برطانوی افسروں کو صبح سوتے میں قتل کر دیا گیا۔ آئرلینڈ کی تاریخ میں اس دن یہ اتوار خونی اتوار کہلاتا ہے۔ اس دن ذرا دن چڑھے برطانوی فوجیوں اور اسپیشل پولیس نے ایک سٹیڈیم میں فٹ بال میچ شروع ہونے سے پہلے سٹیڈیم کو گھیرے میں لے لیا اور پھر گولیاں چلا دیں جس سے موقع پر ہی بارہ افراد ہلاک ہو گئے۔ آئرلینڈ میں حالیہ بغاوت کی یہ دبی ہوئی چنگاریاں اس وقت سلگ اٹھیں جب 1918ء میں ایک قانون کی رو سے آئرلینڈ کے لوگوں کو فوج میں جبراً بھرتی کیے جانے لگا تھا۔ اسی دوران میں سن فین SINNFEIN نامی ایک پارٹی نے بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا اور ایک بار پھر آزادی اور جمہوریت کا جھنڈا بلند کر کے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ ایک طویل عرصے کی جدوجہد آزادی کے بعد جب صورت حال بہت زیادہ خراب ہو گئی تو ری پبلکن پارٹی نے سن فین کا کنٹرول سنبھال لیا اور انتخابات میں برطانوی پارلیمنٹ میں آئرلینڈ کی مخصوص 106 نشستوں میں سے 73 جیت لیں۔ ان نو منتخب ارکان نے پالیمنٹ کے اجلاس میں لندن جانے سے پہلے جنوری 1919ء میں اپنے طور پر ڈیل آئرن نامی آئرلینڈ کی قومی اسمبلی کی بنیاد رکھی۔

اعلان آزادی:۔

21 جنوری کو آئرلینڈ کو ایک آزاد جمہوریہ قرار دے دیا گیا اس اعلان آزادی کے بعد آئرش آزادی پسندوں اور برطانوی فوج کے درمیان ایک باقاعدہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ دسمبر 1920ء میں برطانوی پارلیمنٹ آئرلینڈ گورنمنٹ ایکٹ پاس کیا۔ جس کے تحت آئرلینڈ کو دو علیحدہ کاؤنٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ULSTER شمالی آئرلینڈ کی چھ کاؤنٹیوں اور جنوبی آئرلینڈ کی 26 کاؤنٹیوں کی علیحدہ علیحدہ پارلیمنٹ قائم کر دی گئی۔ شمالی آئرلینڈ کے عوام نے جس میں پروٹسٹنٹوں کی اکثریت تھی اس محدود داخلی آزادی کو تسلیم کر لیا اور شمالی آئرلینڈ کی ریاست تشکیل دی جس کی علیحدہ پالیمنٹ 1921ء میں قائم ہو گئی۔ ایک الگ قومی پرچم رائج کر دیا گیا۔

آئرش فری سٹیٹ کا قیام:

دوسری طرف جنوبی آئرلینڈ میں 1921 کے آغاز میں IRA کے گوریلوں نے برطانوی فوج کے ٹھکانوں اور اہم حکومتی عمارات پر حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ بالآخر 6 دسمبر 1921ء کو برطانوی وزیر اعظم سر لائیڈ جارج نے آئرلینڈ کے راہنماؤں (ڈیل آئرین) سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے شمالی آئرلینڈ کی چھ کاؤنٹیوں سے علاوہ جنوبی آئرلینڈ کی 26 کاؤنٹیوں کو "آئرش فری سٹیٹ" کے نام سے آزاد کر دیا گیا اس معاہدے کے تحت طے پایا کہ آئرش فری سٹیٹ میں کینیڈا کی طرز کی حکومت قائم کی جائے گی، جس کی اپنی پارلیمنٹ اور فوج ہوگی جبکہ شمالی آئرلینڈ بدستور برطانیہ کا حصہ رہے گا۔ 15 جنوری 1922ء کو آئرش اسمبلی نے اس معاہدے کی توثیق کر دی۔

آئرلینڈ کی تقسیم:

اس معاہدے کے ساتھ ہی آئرلینڈ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایمون ڈی ویلرا DAMON DE VALIERA جیسے قوم پرست راہنماؤں نے اس معاہدے کو مسترد کر دیا اور شمالی آئرلینڈ کے ساتھ متحد آئرلینڈ کی آزادی کا مطالبہ کیا اور اسمبلی میں پھوٹ پڑ گئی اور ڈی ویلرا کے خلاف ایک جماعت اٹھ کھڑی ہوئی اس کی قیادت مائیکل کولنز اور ولیم کوسگریو کے ہاتھ میں تھی۔ یہ اس آئرش برٹش معاہدے کے حق میں تھے۔ 15 جنوری 1922 کو مائیکل کولنز نئی ریاست IFS کے سربراہ بن گئے جس کے ساتھ ہی دونوں گروپوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جو 1923 تک جاری رہی۔ 1923ء میں دونوں گروپوں نے اپنی الگ سیاسی پارٹیاں تشکیل دیں جو علی الترتیب ڈی ویلرا سن فین پارٹی اور کوسگریو کومان نا گائیڈ ہیل پارٹی۔ برطانیہ نے ڈی ویلرا کی مخالف پارٹی کی حمایت کی۔ کولنز حکومت نے IRA کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ مگر کولنز زیادہ ....

ایسٹر بغاوت

1914ء میں برٹش پارلیمنٹ پروٹسٹنٹوں کی مخالفت کے باوجود آئرلینڈ کے لئے ہوم رول کا بل پاس کیا تھا مگر ابھی نافذ نہ ہوا تھا کہ جنگ عظیم اول چھڑ گئی۔ جنگ عظیم اول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ری پبلکن گروپ نے پیٹر پیئرس کی قیادت میں برطانوی کو ختم کرنے کے لئے 24 اپریل 1914ء کو آئرلینڈ کی تاریخ کی ایک بڑی بغاوت ایسٹر بغاوت کا آغاز کیا یہ آئرلینڈ میں رونما ہونے والی 178ء کے بعد ایک اہم بغاوت تھی۔ ایک ہفتے کی لڑائی کے بعد باغیوں کو شکست ہوئی۔ اگرچہ باغیوں نے ڈبلن کے اہم حکومتی مقامات پر قبضہ کر لیا تھا مگر بعد ازاں برطانیوں نے 15 ری پبلکن باغی راہنماؤں کو پھانسی کی سزا دی۔

..........عرصہ حکومت نہ کر پایا۔ 22 اگست 1922 کو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ مائیکل کولنز کی موت کے بعد تھامس کوسگریو صدر رہا۔

ایمون ڈی ویلیرا (1882ء-1975ء)

آئرلینڈ کے بیسویں صدی کے چند بڑے سیاسی راہنماؤں میں سے ایک۔ وہ پچاس سے زائد عرصہ تک ملک کے سیاسی افق پر چھایا رہا۔ 1917ء سے 1973ء تک اہم سیاسی خدمات انجام دیں۔ وہ وزیر اعظم کے عہدے پر بھی فائز رہا اور صدر کی حیثیت سے بھی کئی بار منتخب ہوا۔ IRA، SINNFIEN اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کرنے کے بعد اس نے اپنی ذاتی پارٹی فیانا فیل کی بنیاد رکھی۔ یہ پارٹی آئرلینڈ کی سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت اختیار کر گئی اور ان کی وفات کے بعد تک کام کرتی رہی۔ ہو آئرلینڈ کی جدوجہد آزادی کا ہیرو بھی تھا۔

ڈی ویلیرا کی نئی پارٹی:

1926ء میں ڈی ویلیرا نے سن فین پارٹی سے استعفیٰ دے کر ایک نئی پارٹی FIANN A FAIL کی بنیاد رکھی فروری 1932ء میں ہونے والے انتخابات میں کوسگریو کی جماعت کو شکست ہوئی اور فیانا فیل نے آئرش پارلیمنٹ پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ مگر 1932ء تا 1937ء، ڈی ویلیرا نے آئرش فری سٹیٹ اور برطانیہ کے تعلقات منقطع رکھے۔ اس نے برطانوی بادشاہ کے ساتھ حلف وفاداری اٹھانے سے انکار کر دیا 1939ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ڈی ویلیرا نے برطانیہ کو آئرش فری سٹیٹ میں فوجی اڈے قائم کرنے کی اجازت نہ دی اور آئرلینڈ اس جنگ میں غیر جانب دار رہا 18۔ اپریل 1949ء کو آئرش حکومت نے برطانیہ کے ساتھ تمام تعلقات توڑ دیے اور آئرلینڈ کو جمہوریہ قرار دے دیا۔ تاج برطانیہ سے چھٹکارا پا کر آئرلینڈ دولت مشترکہ سے بھی الگ ہو گیا۔ مئی 1949ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے آئرلینڈ کی آزادی کو تسلیم کر لیا جون 1951ء کے انتخابات کے بعد ڈی ویلیرا ایک بار پھر وزیر اعظم بن گئے۔ جون 1952ء میں سین او کیلی دوبارہ اگلے سات سال کے لئے صدر جمہوریہ منتخب ہو گئے۔ جون 1954ء میں کاسٹیلو دو بار وزیر اعظم بن گئے۔ 1957ء میں ڈی ویلیرا تیسری بار وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ مگر 17 جون 1959ء کو انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور صدر مملکت بن گئے 1966ء میں دوبارہ پھر صدر منتخب ہو گئے۔ 24 جون 1973ء کو ڈی ویلیرا صدر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ مارچ 1974ء میں آئرلینڈ نے شمالی آئرلینڈ کو برطانیہ کا حصہ تسلیم کر لیا۔ جولائی 1977ء میں ڈی ویلیرا کی وفات سے دو سال بعد ان کی پارٹی فیانا فیل پھر برسر اقتدار آ گئی۔ 27 اگست کو برصغیر سے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کشتی میں بم پھٹنے سے ہلاک ہو گئے اس دوران پھر داخلی طور پر دہشت گردی نے زور پکڑا اور IRA کی کارروائیوں میں اضافہ ہوا۔

شمالی آئرلینڈ:

شمالی آئرلینڈ مستقل طور پر برطانیہ کا ماتحت علاقہ ہے تمبر 1998ء میں شمالی آئرلینڈ کی اسمبلی کا افتتاح ہوا 30 مئی 2000ء کو برطانیہ نے شمالی آئرلینڈ کو داخلی خود مختاری دے دی۔ آئرش فری اسٹیٹ کے قیام کے بعد جب قوم پرستوں نے آئرلینڈ کی تقسیم قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انگریزوں کے خلاف چھاپہ مار جنگ شروع کر دی۔ انگریزوں نے اس

صورت حال سے نپٹنے کے لئے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے مذہبی اختلافات کو ہوا دی جو کامیاب رہی اور 1966ء میں ان عیسائی فرقوں کے درمیان خونریز جھڑپیں شروع ہو گئیں جنہوں نے بڑھتے بڑھتے 1968ء میں ایک خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی جس کے نتیجے میں کم وبیش 12500 افراد ہلاک ہو گئے۔ 1981ء میں اینگلو آئرش بین الحکومتی کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ 1985ء برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر اور فائن گال لیبر مخلوط حکومت کے مابین ایک معاہدہ طے پایا کہ آئرش ری پبلکن آرمی کی شاخ سن فین کو شمالی آئرلینڈ کے تنازعے کے حل کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات میں شامل کر لیا جائے، اس کی شمولیت کے لئے یہ شرط بھی عائد کر دی گئی کہ یہ تنظیم پہلے اپنی دہشت گردانہ کاروائیوں کو بند کرے۔ دسمبر 1994ء میں برطانیہ آئرش ری پبلکن آرمی اور سن فن کے درمیان مذاکرات ہوئے جو ناکام رہے۔

☆

1921ء قاچاری عہد آخر کا ایران۔
انقلابوں سے پہلے کی شب تاریک

انیسویں صدی کے آخری ایام میں تہران کی شاہراہیں اکثر انسان نما زندہ شمعدانوں سے منور کی جاتی تھیں۔ زندہ انسان کے جسم میں سوراخ کر کے ان میں موم بتیاں گاڑنا اور ان جلتے ہوئے زندہ شمعدانوں کو گلی کوچوں میں پھرانا قاچاری ایران کی روزمرہ کی سزائیں تھیں۔ صرف اس پر بس نہیں، سبط حسن صاحب اپنی کتاب ''انقلاب ایران'' میں رقم طراز ہیں کہ مجرموں کی کھال کھنچوانا، ان کو زمین میں زندہ دفن کر دینا یا میخوں سے دیواروں اور درختوں پر زندہ انسانوں کو مصلوب کر کے جڑ دینا۔ گھوڑوں کی طرح انسانوں کے پیروں میں نعلیں ٹھوک دینا عام تھا۔ حکومت کے مظالم کی مخالفت کرنے والوں کو ان دہشتناک سزاؤں کا خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا تا کہ کوئی سرکش حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن پھر بھی احتجاج کی آوازیں اٹھتی رہتی تھیں۔ چنانچہ سلیمان خان نامی ایک شاعر کے جسم میں جب موم بتیاں گاڑی گئیں اور جلاد اس کا سر قلم کرنے کے لئے آگے بڑھا تو سلیمان خاں نے مولانا روم کا یہ شعر پڑھا

؎ یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار — رقصے چنیں میانہ میدانم آرزو است

ایک طرف تو عوام پر یہ مظالم ہو رہے تھے دوسری طرف بادشاہ عیاشیوں میں پڑا ہوا تھا اور بار بار یورپ کی رومانیت خیز فضاؤں کے سفر کئے جا رہے تھے جن پر سلطنت کا بلکہ قرض کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو رہا تھا اور ملک میں ابتری پھیل رہی تھی۔ اس ملک بے آئین میں طاقت وقوت کا مرکز صرف بادشاہ کی ذات تھی اور اس کا ہر فرمان قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ عوام کی نمائندگی کے لئے کوئی ایوان تو کجا کوئی مجلس امراء تک نہ تھی جو بادشاہوں کو من مانی کرنے سے باز رکھتی رعایا شہری حقوق سے یکسر محروم تھی بلکہ لوگ شہری حقوق کے تصور ہی سے نا آشنا تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے یہاں تیل کے کنوؤں بھی دریافت ہو چکے تھے اور تمباکو کی فصل بھی خاصی آمدنی افزا تھی۔ اسی لئے یورپی سرمایہ دار یہاں آن دھمکے ان دونوں تجارتوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ بادشاہ کو روپیہ چاہیے تھا۔ 1890ء میں اس نے تمام ایرانی تمباکو کی کاشت، فروخت اور برآمد کو ٹھیکہ ایک انگریز کمپنی کو دے دیا تو ملک میں سخت بے چینی پھیلی یہاں تک کہ لندن میں جو ایرانی سفیر متعین تھا وہ بھی بادشاہ کی وہ بھی بادشاہ کی اس ناعاقبت اندیشی کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے بادشاہ کے اس حکم پر

نکتہ چینی کی۔ اسی نکتہ چینی کا انجام حسب توقع فرمان برطرفی کی صورت میں نکلا مگر سفیر موصوف نے بھی زبان بند کی اور لندن میں بیٹھ کر اس مسئلے کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے لگا ادھر ایرانی قوم بھی چیخ اٹھی۔ ایرانی مجتہد نے فتویٰ دیا کہ تمباکو پینا تمباکو کو کاشت کرنا اور اس کی خرید فروخت سب حرام ہے۔

اگلی صبح لوگوں نے حقہ پینا چھوڑ دیا، یہاں تک کہ سلطان نے فتویٰ کے دوسرے دن حقہ طلب کیا۔ تو شاہی ملازمین نے حقے کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ آخر اس ملک گیر مقاطعے سے تنگ آ کر بادشاہ نے غیر ملکی اجارہ داری کا معاہدہ منسوخ کر دیا مگر برطانوی تاجروں کی وہ رقم تو بادشاہ اڑا چکا تھا لہٰذا ایک برطانوی بینک سے یہ رقم چھ فی صد سود پر حاصل کر کے واپس کی گئی اور سود کی ادائیگی کے لئے خلیج فارس کی بندرگاہوں کے محصولات بینک کے پاس رہن رکھ دیے گئے۔

جمال الدین افغانی ایران میں:

اسی زمانے میں سید جمال الدین جیسا مصلح ایران آیا اور اس نے اصلاح احوال کی کوشش شروع کی۔ پہلے پہل بادشاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی، لیکن جب دیکھا کہ اس کے خیالات بادشاہ کے مفاد میں نہیں ہیں تو، گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ ایران میں آپ نے جو کچھ دیکھا اس کی دردناک داستان آپ کے ایک خط میں ملتی ہے جو آپ نے حاجی مرزا حسن شیرازی مجتہد کے نام لکھا تھا۔

ایران سے جلاوطن ہو کر سید جمال الدین لندن پہنچے اور معزول شدہ ایرانی سفیر کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ آپ نے لندن میں ''ضیا الخافقین'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے اقتباسات مصر کے مشہور مصلح مفتی عبدہ کے عربی اخبار ''المنار'' میں بھی شائع ہوتے تھے۔ اس طرح ایرانی عوام کی رائے کو ہموار کیا جاتا تھا۔

اس اندرونی و بیرونی شورش و ہیجان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال بعد 1896 میں ایک شخص مرزا رضا خاں نے شاہ قاچار کو قتل کر دیا۔ اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا........ سید جمال الدین نے سچی باتوں کے سوا اور کیا کہا تھا؟ مگر اس سچائی کی پاداش میں اس سقراط زمانہ کی کیا درگت بنائی گئی۔ ایک مقدس خانقاہ سے اسے نہایت بے رحمی کے ساتھ گھسیٹ کر نکالا گیا.......... یہی احساسات تھے جن کی بنا پر میں نے یہ قتل کیا ہے۔ اس قتل میں میرے ساتھ ایران کے بے شمار افراد شریک ہیں جن میں علماء، امراء، تاجر، اور مزدور بھی ہیں۔

انقلاب کی لہر:

لیکن بادشاہ کے قتل کے باوجود ملک کا نظم و نسق جوں کا توں رہا۔ اس لئے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نیا بادشاہ بھی اپنے پیش رو کی طرح اسی رنگ میں رنگا گیا اور یورپ کی رنگین فضاؤں میں رنگ رلیاں منانے کا شوق اسے قرض لینے پر مجبور کرتا رہا۔ چنانچہ 1900ء میں اس نے روس سے دو کروڑ پچیس لاکھ روبل قرض لیا۔

سید جمال الدین افغانی کا ایک خط

اے پیشوائے اعظم! اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بادشاہ کا دل و دماغ کمزور ہے۔ اس کا رویہ بدترین ہے، اس کا قلب ناپاک ہے وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ ملک پر حکومت کرے اور رعایا کی اصلاح کر سکے۔ اس نے فاسق و فاجر اور جفاکار اور بدباطن افراد کو اقتدار و اختیار کا مالک بنا رکھا ہے۔ انتہا یہ کہ وہ نبی کریم ﷺ کا استہزا کرنے کی (گستاخی کی) جرات کرنے کا مرتکب ہے۔ وہ قانون شریعت کی تحقیر کرتا ہے۔ وہ شریعت کے نافذ کرنے والوں کی اہانت کرتا ہے اور علمائے کرام کو حقارت سے یاد کرتا ہے...... وہ کفار کے ملک سے جب سے واپس لوٹا ہے بالکل شتر بے مہار ہو گیا ہے کھلم کھلا شراب نوشی کرتا ہے...... اس نے ایران کا وسیع علاقہ اس کے منافع سمیت بیچ دیا ہے...... اس ملعون نے مجھے اس وقت گرفتار کرایا جب میں خانقاہ عبدالعظیم میں مقیم اور سخت بیمار تھا۔ اسکے باوجود مجھے جاڑے کے موسم میں طہران کی برف جمی سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور اسی حال میں بصرہ بھجوا دیا۔

...... پھر دو سال بعد 1902ء میں ایک کروڑ مزید لیا گیا۔ اس قرض کا نتیجہ ہوتا تھا کہ حکومت کے ٹھیکے تو بطور ضمانت روس کے ہاتھوں میں چلے جاتے اور قرض کی رقم یورپ کے ہوٹلوں کی نذر ہو جاتی۔ جہاں ایک ایک دن کا بل چھ چھ ہزار فرانک تک پہنچتا تھا۔

مطلق العنان شاہی کے ان مظالم نے ایرانی عوام میں بغاوت و انقلاب کی چنگاریاں روشن کرنی شروع کیں جو 1905ء میں بھڑک اٹھیں۔ بادشاہ سے دستوری و آئینی حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ اب بادشاہ میں عوام کے اس مطالبے کو ٹالنے کی ہمت و طاقت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ 1906ء میں عوام کی نمائندہ مجلس طلب کی گئی جس نے ایک دستور مرتب کیا جس کی رو سے بادشاہ کے اختیارات کو آئین و دستور کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن بادشاہ نے عوامی رائے دہندگان کے لئے جو شرائط رکھیں وہ اتنی سخت تھیں کہ آبادی کی اکثریت ووٹ کے حق سے محروم ہو گئی۔ 17 اکتوبر 1908ء پہلی مجلس شورائے ملی کا افتتاح ہوا۔ مگر ابھی اس مجلس کو وجود میں آئے صرف تین ماہ گذرے تھے کہ مظفر الدین قاچار۔ شاہ ایران کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ 19 جنوری 1907 کو تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ بھی اپنے زمانہ گورنری سے ہی ظلم و استبداد کے لئے مشہور تھا۔ اس کی آئین دشمنی بھی مشہور تھی۔

اجنبی طاقتیں:

روس برطانیہ کو ایران کے نئے حالات پر بڑی تشویش لاحق ہوئی انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں نئی حکومت اتنی طاقت نہ پکڑ لے کہ ان کے مفادات کو نقصان پہنچے۔ چنانچہ شاہ ایران کو ایک معاہدہ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جس کی رو سے ایران کے معاشی وسائل کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ شمالی حصے کے تمام وسائل پر روس کا اختیار ہو گیا جبکہ جنوبی حصے پر برطانیہ کا، برطانیہ کے

حصے میں جو علاقہ آیا۔ وہ ایران کا دو تہائی حصہ تھا۔ صرف وسطی علاقے کو شاہ ایران کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اتفاق سے جس دن اس معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اسی دن عباس آقا تبریزی نامی ایک شخص نے امین السلطنت کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور خودکشی کر لی۔

جب روس اور برطانیہ کے ساتھ کئے گئے اس خفیہ معاہدے کا راز عوام پر افشا ہوا تو عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی چونکہ ابھی عوام کو کچھ آئینی اختیارات حاصل تھے اس لئے عوام کے احتجاج نے موثر شکل اختیار کرنی شروع کر دی اس کے علاوہ شاہ کی بے روک ٹوک شاہی پر بند باندھنے کی کوششیں بھی کیں گئیں۔ ادھر شاہ کو عوام کا یہ رویہ پسند نہ آیا۔ اس نے 1908ء میں مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت اختیار کرتے ہوئے فوج کی مدد سے پارلیمنٹ کا محاصرہ کر لیا۔ مجلس کو الٹی میٹم بھیجا گیا لیکن ابھی بات چیت جاری تھی کہ عمارت پر گولہ باری کی جانے لگی۔ ایوان میں بھگدڑ مچ گئی اور فوج نے اندر گھس کر بائیں بازو کے راہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب ''تاریخ ایران'' میں گرفتار ہونے والے ان راہنماؤں کی تصویر چھاپی ہے۔ ان کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہیں، گلے میں طوق ہیں اور ایک موٹی سے آہنی زنجیر ان طوقوں میں پرو کر انہیں جانوروں کی طرح اکٹھا باندھ دیا گیا ہے۔ پھر ان راہنماؤں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان کے گھر لوٹ لئے گئے، ہر طرف خوف اور دہشت گردی کا ماحول پیدا کر دیا گیا۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ ان پر تشدد کارروائیوں سے عوام خوف زدہ ہو جائے گی، مگر ان مظالم نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ملک کے گوشے گوشے میں شاہ کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اب عوام کو یقین ہو گیا کہ پرامن احتجاج سے بات نہیں بنے گی۔ بغاوت و انقلاب کی چنگاریاں جگہ جگہ بھڑک اٹھیں۔ سب سے پہلے مشروطیت کے حق میں انقلاب کا پرچم تبریز سے بلند ہوا۔ اسی اثنا میں اصفہان گیلان اور دشت میں مسلح جدوجہد شروع ہو گئی۔ 5 جنوری 1909ء کو جب بختیار قبیلے کے سپاہی اصفہان میں داخل ہوئے تو عوام نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ گیلان میں حاکم شہر کو قتل کر دیا گیا۔ دشت کے انقلابیوں نے قزوین پر قبضہ کر لیا۔ قزوین سے تہران صرف 94 میل دور ہے۔ برطانیہ اور روس نے بھی انقلابیوں کو روکنے کے لئے مداخلت کی جو ناکام رہی۔ 10 مئی 1909ء کو شاہ نے آئین سے وفاداری کا چوتھی مرتبہ حلف اٹھایا لیکن اب انقلابی اس فریب میں آنے والے نہیں تھے۔ انقلابی جب تہران کی طرف بڑھے تو شاہ نے 16 جولائی کو روسی سفارت خانے میں پناہ لی۔ انقلابیوں نے تہران فتح کر کے شاہ کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے احمد شاہ کو تخت نشین اور علی رضا قاچار کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔ احمد شاہ نے منسوخ شدہ آئین کو پھر بحال کر دیا اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے اپنے باپ کی بداعمالیوں کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔

جرمنی ایک تیسری سامراجی طاقت:

جب جرمنی نے برلن بغداد ریلوے بنانی چاہی تو سب سے زیادہ اعتراض روس کو ہوا کہ کہیں جرمنی کا ہاتھ ایران تک نہ پہنچ جائے۔ اس مخالفت کے نتیجے میں پوٹسڈم کے مقام پر روس اور جرمن میں ایک خفیہ معاہدہ طے پایا جس کی رو سے شمالی ایران کو روسی حلقہ اثر تسلیم کر لیا گیا۔ روس کو جرمنی نے یقین دلایا کہ اگر وہ ایران میں ریلوے لائن بنائے گا تو جرمنی کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اس طرح جرمنی نے بھی ایران میں مداخلت شروع کر دی۔ جرمنی کو ایرانیوں کے جذبات کا اندازہ تھا لہٰذا وہ سامراج دشمنی کے بھیس میں اندر گھس آیا۔ برلن میں مقیم ایرانی قوم پرستوں کو سہولتیں فراہم کی گئیں جرمنی سے ساز باز کرنے کے بعد اب روس برطانیہ سے بھی معاملہ چکانا چاہتا تھا۔ مکر و فریب کی یہ سیاست آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ دنیا کے

انگلستان چلے گئے اور آخر 1914ء میں عالمگیر جنگ شروع ہوگئی، جس میں روس اور برطانیہ کو جرمنی سے ٹکر لینی پڑی جنگ کے دوران میں ایرانی قضیے کو بھی دخل تھا۔

1917ء میں جب زار روس کو شکست ہوئی اور روس میں بالشویک حکومت قائم کی گئی تو روس کی نئی حکومت نے عدم پالیسی کی بنیاد پر ایران سے روسی تسلط اٹھانے کا اعلان کیا۔ اس وقت وزیر خارجہ برطانیہ لارڈ کرزن نے ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے ایران میں برطانوی فوجی اڈے قائم کردیے۔ 1919ء میں ''شاہ کج کلاہ'' سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے پورا ایران برطانیہ کے سائے میں آگیا۔ یہ دیکھ کر روس کی اشتمالی حکومت نے ایران کے شمالی صوبوں میں اشتراکی جمہوریت قائم کرنا شروع کردی۔ سب سے پہلے گیلان کے صوبے میں اشتراکی جمہوریت قائم کی گئی۔ پھر مازندران کے سرسبز علاقے کو بھی اشتراکیت کی لپیٹ میں لینے کی کوشش جاری ہوئی۔ غرض ایران کی آزادی بالکل سلب ہو گئی اور سب کو یقین ہوگیا کہ شمال روس کے پاس اور جنوب پر برطانیہ کا جھنڈا لہرائے گا۔ لیکن ابھی ایرانی دماغ سے بوئے آزادی گئی نہیں تھی۔ ایرانی افواج شمال میں اشتراکیوں سے شکست کھارہی تھیں اور پیچھے دھکیلی جارہی تھیں۔ مگر شاہ ایران ابھی بھی عیش ونشاط میں گم تھا۔ ایرانی اس صورت حال پر پیچ وتاب کھارہے تھے۔ مگر ان کے ہاتھ میں کوئی اقتدار واختیار نہیں تھا۔

رضا شاہ پہلوی:

رضا شاہ پہلوی اس زمانے میں ایک غیر معروف فوجی افسر تھا، اس کی افواج شمال میں روسیوں سے شکست کھارہی تھیں۔ شاہ ایران کے احکامات سے افسر اور سپاہی دونوں بددل تھے اور بڑھتے ہوئے دشمن سے زیادہ اندرونی بدحالی سے بدحال ہورہے تھے۔ لیکن ایسے میں رضا شاہ پہلوی نے ایران کو اندرونی اور بیرونی عناصر سے بچانے کا عزم کیا۔ اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے 1921ء میں تھوڑی سی فوج لے کر شاہی محل پر دھاوا بول دیا۔ شاہ ایران کی حیثیت اب شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی اس نے یہ حالات دیکھے تو باغی جرنل سے بات چیت کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ رضا شاہ نے بادشاہ کو بتایا کہ ایران کے حالات حد سے زیادہ خراب ہوچکے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب یہ برائے نام بادشاہی بھی ختم ہوجائے گی۔ ایران ہر طرف اغیار کے پنجۂ اقتدار میں پھنس چکا ہے اب نجات کی یہی ایک صورت باقی ہے کہ آپ مجھے قسمت آزمانے کا موقع دیں اور موجودہ وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف کو برخاست کرکے مجھے یہ عہدے سونپ دیں۔ شاہ بے اختیار نے فوراً اس مشورہ یہ مشورہ مان لیا۔ اس طرح اسے برسرِ اقتدار آنے کا موقع مل گیا۔ مگر اس کی حکومت میں بھی حکومت کے اعمال و افعال پر احتساب اور نقطہ چینی کا جو حق ہوتا ہے اس کا تصور بیسویں صدی کے اولین عشروں میں ایران میں مفقود تھا۔ عوام صرف یہ نظریہ رکھتے تھے کہ بادشاہ تو تنقید سے بالاتر ہی ہوتا ہے البتہ اسے عوام کا خیال رکھنا چاہیے۔

مگر روس میں اشتمالیت کے انقلاب اور مغرب میں ترکی میں جمہوریت قائم ہونے اور عراق میں دستوری بادشاہت کے قیام کے بعد بادشاہت پسندی کے خیالات کم ہونے لگے اور ایسے افراد کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی جو موجودہ حالات سے مطمئن نہیں تھے اور معاشرتی اور معاشی نظام میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ رضا شاہ کے سامنے دو بڑے سوال تھے ایک تو امن عامہ کو برقرار رکھنا اور دوسرے ملک کے معاشی حالات ٹھیک کرنا۔ سابق شاہ کے زمانے میں ہر ضلع اور ہر صوبہ برائے

نام تہران سے تعلق رکھتا تھا ہر جگہ جو طاقت ور تھا وہ چھایا ہوا تھا اور وہاں اسی کے نام کا ڈنکا بجتا تھا لٹیروں اور رہزنوں کا دور دورہ تھا اور ملک میں کوئی ایسی ایجنسی نہیں تھی جو ان کی سرکوبی کر سکے۔ رضا شاہ نے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ دی اور فوج کی مدد سے ایران میں مکمل امن وامان قائم کیا۔

معاشی حالات:

لیکن معاشی حالات کو بہتر بنانا اتنا آسان کام نہیں تھا، ایران کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ ایک دم نئے آلات سے کاشتکاروں اور مزدوروں کا مسلح کر دیں۔ ایران کا رقبہ سواچھ لاکھ مربع میل تھا یعنی برصغیر پاک وہند کا ایک تہائی لیکن اس کا بڑا حصہ ریگستان ہے۔ تاہم ایک وسیع رقبہ بہت سرسبز وشاداب ہے جہاں اناج سبزیاں پھل اور افیون کی پیداوار کی کثرت تھی۔ صنعت وحرفت میں بھی ایران کچھ کم نہیں یہاں کے قالین آج بھی یورپ اور امریکہ میں مشہور ہیں مگر چھوٹی موٹی صنعتوں کے علاوہ مشین سازی اور بڑی صنعتوں میں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور بہت سی مصنوعات میں یورپ کا دست نگر تھا۔

تاہم ایران کی حالت ان دنوں برطانوی ہندوستان سے بہتر تھی اگرچہ رقبے کے لحاظ سے ایران برصغیر کا ایک تہائی حصہ ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے ہمیشہ برصغیر سے کم رہا ہے۔ 1925ء میں ایران کی آبادی صرف سوا کروڑ تھی۔

تیل کی دولت:

آج بھی دنیا میں ایران کی اہمیت اس کی معدنی دولت یعنی تیل سے ہے تیل کے زیادہ تر چشمے اس کے جنوبی ساحل کے قریب واقع ہیں اس بناپر 1900ء میں برطانیہ نے شاہ ایران سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ تبریز سے لے کر خراسان تک کے جنوبی علاقوں میں جو تیل کے کنویں دریافت ہوں گے ان پر برطانوی سرمایہ داروں کا حق ہوگا 1933ء میں رضا شاہ نے یہ رعایت منسوخ کر دی۔ جس نے برطانوی حلقوں میں کھلبلی مچادی۔ مگر ایک ہی سال بعد دونوں ملکوں میں ایک نیا معاہدہ طے پایا جس میں سابقہ علاقوں کو نصف کر دیا گیا، بہرحال بڑے عرصے تک غیر ملکی ایرانی تیل سے فائدہ کوڑیوں کے بھاؤ اٹھاتے رہے۔ تیل کے علاوہ ایران کی قیمتی پیداوار بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں افیون اور موتی تھے۔ افیون کی اخلاقی حیثیت جو کہ پست ہے اس لیے انجمن اقوام نے رضا شاہ پہلوی کو کہا تھا کہ اس کی بجائے کوئی اور چیز کاشت کی جائے اس کے جواب میں رضا شاہ نے کہا تھا کہ میں اس کے لئے بخوشی تیار ہوں بشرطیکہ انجمن اقوام ایران کی ایک دوسری پیداوار کو بلا محصول دوسرے ملکوں کو برآمد کی اجازت دلوائے یا کم از کم محصول لیا جائے۔ رضا شاہ کے اس جواب پر انجمن اقوام خاموش ہوگئی۔

شیعہ سنی قضیہ:

معاشرتی اصلاح کے میدان میں بھی رضا شاہ نے بہت کچھ کیا شیعہ سنی جھگڑا صدیوں چلا آ رہا تھا اور یہی قضیہ ایران کا سب سے بڑا قومی قضیہ تھا جو عقیدہ لاینحل بن چکا تھا۔ ایران اسلامی ملک میں ایسا ملک ہے جہاں شیعہ اکثریت میں ہیں اور حکومت بھی شیعہ مذہب کے افراد کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ شیعہ تبرے کے نام پر اسلام کے اولین خلفائے راشدین کو (نعوذ باللہ) لعنت ملامت کرنا ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے سنی عقیدے کے لوگوں سے قدرتی تصادم ہوتا رہتا تھا

رضا شاہ نے اس معاملے کی کافی حد تک اصلاح کی اور اعلانیہ تبرہ کرنا جرم قرار دیا اس کے علاوہ سنیوں کو سنی قانون شریعت پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی۔ سنی مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے سنی قاضی مقرر کیے گئے۔ اس طرح دونوں اسلامی فرقوں کے درمیان تلخیاں کم کرنے کی کوششیں کی گئیں تو رضا شاہ نے اسی مقصد کے لئے 1938ء میں سلطان مصر کی بہن سے اپنے بیٹے محمد رضا شاہ پہلوی کی شادی کی اور اس طرح شیعہ سنی اتحاد کے لئے ایک نئی مثال ایرانی عوام کے لئے قائم کی۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود ایران ترقی کے میدان میں ایک نو آموز سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہاں [illegible] حیثیت کی وجہ سے جمہوی نظام نہ قائم ہو سکا۔ رضا شاہ پہلوی جو ایران کا راہنما تھا اور جمہوری نظام کا خواہاں تھا اسے ایک مطلق العنان بادشاہ بنا دیا گیا تو آہستہ آہستہ اس میں شاہانہ صفات بھی پیدا ہونے لگیں اسی وجہ سے ابتدائی دور میں اس کی شخصیت میں جو خوبیاں تھیں وہ باقی نہ رہیں۔ ایران کی حکومت میں عوام کو حصہ نہ مل سکا جو کسی قوم کی حفاظت کی ضمانت ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی دوسری جنگ عظیم کے دوران 1947ء میں برطانیہ اور روس بڑی آسانی کے ساتھ ایران میں داخل ہو گئے اور رضا شاہ کو مجبوراً اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔

☆

1922ء فسطائیت کا ناگہانی انقلاب

27 اکتوبر 1922ء کو اٹلی کے دارالحکومت روم پر دو لاکھ فسطائی رضا کاروں نے دھاوا بول دیا۔ فوجی حکام نے مارشل لا کے نفاذ کے باوجود ان فسطائی رضا کاروں کو ریلوے اسٹیشنوں، ڈاک خانوں، تار گھروں، اخبارات کے دفاتر اور دیگر سرکاری عمارتوں اور اسلحے کے مراکز پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔ اٹلی کے بادشاہ نے جب یہ حالت دیکھی تو گھبرا گیا۔ روم کے گلی کوچے سیاہ شرٹوں میں ملبوس فسطائی رضا کاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ فسطائی راہنما مسولینی کے مشیر ایسے میں بادشاہ سے ملے اور اسے دھمکی دی کہ اگر اٹلی کو خانہ جنگی کے شعلوں سے بچانا ہے تو وزارت کو برخاست کر کے فسطائیوں کو وزارت عظمیٰ کا قلم دان سونپا جائے بصورت دیگر ملک میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ بادشاہ مجبور تھا اگر وہ یہ درخواست نما حکم مسترد کرتا تو شائد خود اسے کوئی اپنی گولی کا نشانہ بنا دیتا آخر اس نے فاشسٹ پارٹی کے راہنما مسولینی کو وزارت بنانے کی دعوت دے دی اس کی دعوت پر 30 اکتوبر 1922ء کو مسولینی روما پہنچا۔ اور اس نے وزارت بنائی جس میں کل تیس وزیر تھے۔ 15 فسطائی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور 15 دوسری جماعتوں سے۔ بیرونی معاملات اور داخلی امور وزیر اعظم کی حیثیت سے مسولینی نے خود اپنے ہاتھ میں رکھے۔ یہ واقعہ فسطائیت کا ناگہانی انقلاب کہلاتا ہے۔ حکومت کی یہ پوری تبدیلی کا انقلاب کامل امن و سکون کے ساتھ رونما ہوا نہ خون کا ایک قطرہ بہا اور نہ بندوق کی ایک گولی چلائی گئی۔ فسطائی رضا کاروں کو حکم دیا گیا کہ انقلاب کے بعد 24 گھنٹے کے اندر اندر روم کو خالی کر دیں بعد میں یہ رضا کار قومی فوج NATIONAL MILITARY میں بھرتی کر لیے گئے۔

فاشزم یا فسطائیت اور اٹلی:

فسطائیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ طبقات نظم میں انقلاب تھا۔ براعظم یورپ میں سیاسی پارٹیاں مختلف طبقات کے مفادات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ مفادات پارلیمانی مملکت میں تقریباً متوازن تھے۔ تو ایک طویل اور غیر فیصلہ کن سیاسی کشمکش اکثر رونما ہوتی رہی۔ اٹلی میں فرض کیا جائے کہ روس کی طرح بائیں بازو کی طرف سے انقلاب کا خطرہ پیدا ہوا تو متوسط طبقہ برسر اقتدار آیا اور اس نے اپنی انتہا پسندی کی راہ اختیار کی یہ ہی انتہا پسندی یا جانبدار قوم پرستی فسطائیت FASCISM کہلاتی ہے اس تحریک کا روم میں نشان LANSIGNIA لکڑیوں کا گٹھا اور ابھار دار کلہاڑا تھا۔ جسے اس دور کی پریوی کونسل کے روبرو پیش کرتا دکھایا گیا تھا دوسرے لفظوں میں قوم پرستی انتہا پسندانہ نعروں کے ساتھ عوام کی حمایت

حاصل کرنے میں مصروف ہوگئی اور اس نے پراسراریت کا لبادہ پہن لیا۔ 1922ء میں اٹلی میں مسولینی اسی فارمولے پر عمل کرنے پر برسراقتدار آیا۔ 1933ء میں ہٹلر کی نازی پارٹی بھی اس بنا پر اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی 1936ء میں سپین میں جنرل فرانکو نے اسی طرح اقتدار حاصل کیا۔

1930ء کے فسطائیت یورپ کے معاشی بحران کا نتیجہ تھا۔ جس نے دنیا کو پہلی عالمگیر جنگ کی لپیٹ میں لے لیا تھا بظاہر فسطائیت نے اشتراکیت کے مقابلے میں نمایاں کردار یا مقام حاصل نہیں کیا تاہم فسطائی نظریات مختلف اقوام میں معروضی حالات کے تحت رونما ہوتے رہے۔ اس طرح فسطائیت اس وقت کی دنیا میں اشتراکیت کا حریف نظام بن کر ابھرا تھا۔ یہ بھی ملک میں مطلق العنانی یا آمریت کا قائل تھا۔ اس میں فرد واحد یا ایک ہی پارٹی کی حکومت اور اقتدار پر اجارہ داری ہوتی ہے۔

اٹلی اگرچہ فاتح اتحادی جماعت کا رکن تھا مگر اس نے پہلی جنگ عظیم روسی شکست پر ختم کردی تھی اس کے ساڑھے چھ لاکھ افراد مارے جا چکے تھے اور دس لاکھ افراد زخمی ہوئے تھے۔ جنگ کے بعد ملک میں صنعتی طور پر افسردگی یا مندہ پیدا ہو گیا جس سے چند مہینوں کے اندر اندر صنعتی مزدوروں میں سے دس فی صد کو بے روزگار ہونا پڑا۔ مہنگائی بڑھی اور اجرتیں اس بڑھتی ہوئی مہنگائی کا مقابلہ نہ کر سکیں مجروحین اور مقتولین جنگ کے ورثا سے پنشنوں کا جو وعدہ حکومت نے کیا وہ پورا کرنے میں تاخیر ہوگئی جس سے متواتر ہنگامے اور ہڑتالیں بپا ہونے لگیں اس طرح ملک میں بے چینی اور بے اطمینانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

غالباً حد درجہ اہمیت کا واقعہ یہ ہوا کہ خود اطالوی حکومت نے ملک میں یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ دوران جنگ جن علاقوں کو اٹلی کو دئے جانے کا شرکت جنگ کی شرط پر وعدہ کیا گیا تھا اب اتحادی وہ علاقے خود ہتھیا رہے ہیں۔ اس سے حکومت کو امید تھی کہ وہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر لے گی، جس سے پیرس میں منعقد ہونے والی مجلس صلح کے نمائندوں پر اثر ڈالا جا سکے گا۔ مگر وہ ان احتجاجوں سے متاثر نہ ہو سکے جس سے اٹلی کی عوام کو یقین ہو گیا کہ انہوں نے رائیگاں خون بہایا۔ اٹلی میں عوامی جذبات خصوصاً فوج کے اندر، حکومت سے ہٹ کر کسی نہ کسی قسم کی انتہا پسندی کی جانب مائل ہوگئے۔ اسی طرح سارا اٹلی ''پیرس کانفرس کے غدار ساتھیو'' کے خلاف مسلح بغاوت کے لئے تیار ہو گیا۔ اٹلی نے محسوس کیا کہ وہ دنیا بھر کی نظروں میں ذلیل ہو گیا اور خود اس کے اتحادیوں نے اس سے دغا کی۔ لاکھوں جانوں کے ضیاع اور اربوں روپے کے مالی نقصان کے صلے میں اسے کچھ نہ دیا گیا۔

لیکن اس زمانے میں اٹلی میں جو جماعت برسر اقتدار آئی وہ اٹلی کے اس مجنونانہ قوم پرستانہ جوش میں شریک نہ تھی۔ اس جماعت کے افراد یہ سمجھتے کہ اٹلی کے منصوبے حد سے بڑھے ہوئے تھے اور انہیں عملی جامہ پہنانا مشکل تھا۔ علاوہ ازیں وہ اٹلی کی کمزوری سے بھی واقف تھے وہ جانتے تھے کہ اتحادیوں کو جنگ کے لئے للکارنا اٹلی کے لئے ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر ان لوگوں کی فلسفہ طرازی عوامی جوش کو ٹھنڈا نہ کر سکی۔ اتحادیوں کے خلاف سلگنے والی اس انتقام کی آگ میں چند دن بعد پرجوش وطن پرستوں کی ایک کثیر تعداد نے اٹلی کے ایک قومی شاعر ڈی اننزیو D. ANNUNZIO کی قیادت میں یوگوسلاویہ کی بندرگاہ فیوم پر دھاوا بول دیا۔ یہ بندرگاہ پہلے اتحادیوں نے اٹلی کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اتحادیوں کے لئے احتجاج کے باوجود وطن پرست اطالویوں نے اس بندرگاہ پر قبضہ کر کے اٹلی کا جھنڈا لہرا دیا۔ وطن پرست اطالوی اٹلی کو سلطنت روما

کی عظمت واپس دلانے کے لئے کوشاں تھے۔ اور چاہتے تھے روم کو دو ہزار سال پہلے والی مرکزیت حاصل ہو جائے گی۔ اطالوی وزیر اعظم ایک بڑی فوج بھیج کر قوم پرست اطالویوں کو فیوم کی بندرگاہ سے نکال باہر کیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اتحادیوں سے کسی طرح بھی مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر اس فیصلے سے اٹلی میں بہت سی قوم پرست جماعتیں وجود میں آ گئیں۔ ان میں ایک فسطائی جماعت یا فاشسٹ پارٹی نے عوام میں مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس جماعت میں وہ لوگ شامل ہوتے گئے جو جنگ کے نتیجے سے مطمئن نہ ہو سکے تھے۔ انہوں نے فوجی طرز پر جماعتی رضا کاروں کی ایک تنظیم بنائی جس کی قمیص کا رنگ سیاہ تھا۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ اٹلی کو اشتراکیت و جمہوریت کے ملے جلے اصول کے مطابق ترقی کرنا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں ایک کمیونسٹ جماعت اٹلی میں قائم تھی، لیکن فسطائیوں نے اس کے مقابلے میں عوام کو زیادہ بہتر طریقے پر اپنی طرف کھینچ لیا یوں فسطائیت مقبول تر ہوتی چلی گئی۔

مسولینی

مسولینی، فطائیت انقلاب کا بانی ایک لوہار کا بیٹا تھا۔ جو 1883ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد معلم کا پیشہ اختیار کیا، مگر یہ پیشہ اس کی ذہانت اور صلاحیت سے کم تر تھا اس لیے اس میں اس دل نہ لگا اور وہ اٹلی سے سوئٹزر لینڈ آ گیا۔ جہاں اس نے مزدوری کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسیات کا مطالعہ کیا۔ سیاسیات میں سوشلزم کے اصول اسے بہت پسند آئے اور وہ سخت قسم کا سوشلسٹ لیڈر بن گیا۔ اس نے مزدوروں کی ایک جماعت بنائی اور زور دار تقریریں اور ہڑتالیں شروع کر دیں، جن کے نتیجے میں وہ سوئٹزر لینڈ سے نکالا گیا۔ یہاں سے اٹلی آ گیا اور ایک سوشلسٹ راہنما بن گیا۔ جنگ عظیم کے بعد اسے فسطائی جماعت بنانے کا موقع ملا اور صرف چار سال کی جدوجہد کے بعد اٹلی کا وزیر اعظم بن گیا۔

1919ء میں پورے سال اٹلی میں ہڑتالوں کا زور شور رہا۔ 1920ء میں ہڑتالوں نے ہنگاموں کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ہڑتالیں بندرگاہ پر کام کرنے والے مزدوروں نے شروع کیں تھیں لیکن آخر میں ریلوے میں اور پریس میں کام کرنے والے مزدوروں میں پھیل گئیں۔ پھر مزدوروں کے پر تشدد جتھوں نے کارخانوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ستمبر 1920ء میں چھ سو بڑے کارخانے مزدوروں کے قبضے میں تھے، جن میں پانچ لاکھ مزدور کام کرتے تھے۔ ڈھائی مہینے مسلسل کارخانے مزدوروں کے قبضے میں رہے اور دونوں مالکوں اور مزدوروں میں بات چیت ہوتی رہی آخر مزدور ہار گئے اور کارخانے مالکوں کو واپس مل گئے یہ ہار دراصل اٹلی میں اشتراکیت کی ہار تھی۔ اس کے اور کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے ارکان فسطائی جماعت سے آ ملے۔ مئی 1921ء میں ہونے والے انتخابات میں فسطائی جماعت کے صرف 33 رکن اطالوی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہو سکے ان میں سے ایک خود مسولینی بھی تھا اس جماعت میں جوش و جذبہ بہت تھا مگر اتحاد اور ڈسپلن مفقود تھا۔ نہ کوئی پروگرام تھا نہ ہی کوئی ایسی مرکزی طاقت جس کے احکام سب مانتے۔ روزمرہ یہ خبریں شائع ہوتی تھیں۔

مقام پر فسطائیوں نے حملہ کر دیا۔ بم پھینکنے اور قتل کرنے کی سرگرمیاں بڑی شدت سے جاری تھیں۔ مگر مرکزی ان کا علم وقوع کے بعد ہوتا تھا۔ مسولینی جو اس جماعت کا راہنما تھا اس نے جماعت کی ابتری اور بدنظمی دیکھ کر استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس افراتفری اور بدنظمی کے عالم میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مسولینی کے اس احتجاج کا یہ اثر ہوا 1921ء میں فسطائی کانفرنس میں ارکان نے مسولینی سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ صرف اس کے احکام پر عمل کریں گے. اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرے گا اس کانفرنس کے بعد مسولینی کو ال ڈوچے ILLDUCE یعنی سردار کہا جانے لگا۔ اور ڈسپلن کے بعد فسطائیوں کی طاقت بے پناہ طور پر بڑھنے لگی۔ اب مسولینی نے سوشلزم اور جمہوریت کو چھوڑ کر نا پسندی" کا اعلان کیا اور پارٹی کا مقصد یا نصب العین یہ بتایا کہ وہ ملک کو کمیونسٹ خطرات سے بچانا چاہتی ہے۔ اگست 1922ء میں فسطائیوں کا کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کے ساتھ تصادم ہوگیا۔ مگر فسطائیوں نے ڈنڈوں سے کی خوب خبر لی۔ اس واقعہ کے بعد کمیونزم کا زور ٹوٹ گیا۔ مگر ابھی فسطائیوں کو آئین پسندوں سے بھی نپٹنا تھا۔ تبھی وہ کلی اقتدار کو پا سکتے تھے آئین پسندوں سے نپٹنے کے لئے مسولینی نے عوام کی طاقت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور فوجی طاقت کی مدد سے ناگہانی انقلاب برپا کرنے کے لئے مسولینی نے اپنے فسطائی دستوں کو روم کی طرف مارچ کرنے کا حکم دیا۔ اس میں کامیابی کے بعد وہ بالآخر وزارت عظمیٰ کا قلمدان حاصل کرنے میں صرف 39 سال کی عمر میں کامیاب ہوگیا۔ اب مسولینی اور فسطائیت دونوں کامیاب تھے۔ لیکن یہ حیرت ناک امر تھا کہ مسولینی جو اٹلی کی سب سے بڑی طاقت بن چکا تھا ابھی تک ایک غیر معروف انسان تھا جب وزیراعظم بنا تو ملک اور بیرون ملک دونوں سے صدائیں بلند ہوئیں کہ مسولینی کون ہے؟

فسطائی طرز حکومت:

مسولینی نے فوجی طاقت کے بل بوتے پر حکومت حاصل کی تھی اس لیے اپنے اقتدار کا لوہا منوانے کے لئے قدم قدم پر میکاولی کے اصول سیاسیات سے مدد لینی پڑی ویسے بھی فسطائیت کی بنیادیں اسی کے فلسفے پر استوار کی گئیں تھیں۔ جلد ہی فسطائی جماعت کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتیں ختم کر دی گئیں۔ مخالفت کو دبایا گیا اور جو مخالف نہ دب سکے انہیں گولی کی نذر کر دیا گیا عوام سے بہت سے جھوٹے وعدے کئے گئے اور بے شمار سبز باغ دکھائے گئے۔ مسولینی نے عنان وزارت سنبھالتے ہی اپنا زور خطابت اس شدت سے منوایا کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ مگر اس کی تقریروں میں کوئی ٹھوس اور تعمیری چیز نہ تھی۔ مسولینی نے اپنی ہر دلعزیزی قائم رکھنے کے لئے جو قومی مقاصد بیان کئے تھے ان میں سے کچھ پر عمل بھی کر دکھایا مثلاً فیوم کی بندرگاہ جسے اتحادیوں نے آزاد ریاست بنا دیا تھا۔ اٹلی نے یوگوسلاویہ سے براہ راست بات چیت کر کے اس کا کچھ علاقہ تو یوگوسلاویہ کو دے دیا مگر شہر اور بندرگاہ پر خود قابض ہوگیا۔ لیگ آف نیشن نے احتجاج کیا مگر مسولینی نے اس پر کان نہ دھرے۔ چونکہ برطانیہ اور فرانس جنگ کے لئے تیار نہ تھے اس لیے اٹلی کا قبضہ مستحکم ہوگیا۔ مگر اٹلی نے صرف فیوم کی بندر گاہ پر قبضہ کرنے پر قناعت نہ کی وہ شمالی افریقہ اور یورپ میں یوگوسلاویہ، یونان اور البانیہ پر اپنا پرچم لہرانے کا خواہاں تھا اور کسی موزوں بہانے کا منتظر بھی تھا۔ 1933ء میں جب جرمنی میں ہٹلر کی پارٹی برسر اقتدار آئی تو جرمنی کو طاقتور بنانے کا کام شروع کر دیا گیا اور فرانس اور برطانیہ کی مخالفت کسی کام نہ آئی۔ مسولینی نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا مئی 1936ء

میں حبشہ پر حملہ کر کے اس نے الحاق اٹلی سے کرلیا۔ پھر اپریل 1939ء میں البانیہ پر دھاوا بول کر قبضہ کر لیا گیا۔ ہٹلر اور مسولینی کے اغراض و مقاصد ایک تھے اس لیے دونوں میں یگانگت بڑھتی گئی۔ اگست 1939ء میں جب ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر کے دوسری جنگ عظیم کا آغاز کیا تو مسولینی کی آنکھوں میں اس کے پرانے خوابوں کی تعبیر آ گئی اور جون 1940ء میں اس کے کھلے طور پر جرمنی کی اعانت میں برطانیہ اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس دوران مسولینی نے اپنی فوجی طاقت بہت مضبوط کر لی تھی اور اس کے فوجی دستے یورپ میں دوڑنے لگے تھے۔ 1940ء کے اکتوبر میں یونان سے مطالبہ کیا گیا کہ فوری اطاعت اختیار کرو ورنہ تلوار اٹھالی جائے گی اور آخر اپریل 1941ء میں جرمنی کی مدد سے یونان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا۔ اس طرح اٹلی نے یوگوسلاویہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

مگر ابھی اٹلی ساڑھے چار ہزار مربع میل علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا تھا کہ جنگ کا پانسہ پلٹنے لگا۔ پہلے افریقی مقبوضات اٹلی کے ہاتھ سے نکلے۔ پھر اٹلی کی حدود میں اتحادی فوجیں داخل ہو گئیں اور آخر شاہ اٹلی نے مسولینی کو معزول کر کے نظر بند کر دیا۔ مگر اس کا دوست اور ہمدم دیرینہ ہٹلر یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا اور اس نے اپنے طوفانی دستوں کی مدد سے مسولینی کو چھڑا لیا تاہم اب مسولینی کے ہاتھ سے اقتدار نکل چکا تھا۔ ادھر ہٹلر کے غبارے کی ہوا بھی نکلنے لگی تھی۔ مسولینی نے اٹلی میں کچھ لوگوں کو جمع کر کے بڑے ہاتھ پیر مارے مگر آخر ایک غضبناک ہجوم نے ایک دن اسے برسر عام قتل کر دیا اس طرح صرف اٹلی ہی کا نہیں بلکہ دنیا بھر کا حیرت انگیز انقلابی کردار دنیا سے اٹھ گیا، لیکن اٹلی کی پیچیدگیاں ختم نہ ہوئیں اور مسولینی اپنے پیچھے جو ورثہ چھوڑ گیا وہ طویل عرصہ قائم رہا۔

شہری آزادیاں صلب کر لیں:

اٹلی کی متحدہ قومیت کا آغاز 1861ء سے ہوا تھا مگر جب عنان حکومت مسولینی کے ہاتھ میں آئی تو اس نے محسوس کیا کہ یورپ کی دوسری ترقی یافتہ اقوام کے مقابلے میں نوجوان تر قوم بننے کی وجہ سے اٹلی کی قومی تنظیم قابل اطمینان ہے اور نہ معاشی و سیاسی حالت تسلی بخش ہے۔ ملک میں بیسیوں جماعتیں ہیں اور ہزاروں لیڈر جن میں سے ہر ایک اپنا الگ راگ الاپتا ہے۔ مسولینی نے اس انتشار کو ختم کر کے ساری قوم کو لکڑی کے ایک گٹھے کی شکل دینے کے لئے مصطفیٰ کمال کی طرح ڈکٹیٹر شپ کے اصولوں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ فسطائی جماعت کے علاوہ ملک میں دوسری کسی سیاسی جماعت کا وجود نہیں رہے گا۔ کوئی اخبار، کوئی رسالہ یا کتاب شائع نہیں کی جا سکتی جس میں فسطائیت پر مخالفانہ نکتہ چینی کی گئی ہو۔ ہر اخبار مجبور ہے کہ فسطائی جماعت کے دفتر سے جو اطلاعات ملیں انہیں موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ اخبار کے پہلے صفحے پر چھاپے اور باقی اخبار میں جو کچھ لکھے وہ بھی فسطائی لیڈروں کی بنائی ہوئی پالیسی کے مطابق ہو ان احکام کا اثر یہ ہوا کہ اٹلی کے تمام اخباروں کا پہلا صفحہ سرخیوں سے لے کر خبر کے خاتمے تک ایک ہونے لگا ان خبروں میں صرف فسطائی سرگرمیوں کا ذکر ہوتا اور فسطائی لیڈروں کو سراہا جاتا تھا۔ 1926ء میں ملک کے تحفظ کے لئے ایک خاص عدالت قائم کی گئی جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ جو لوگ فسطائیت کے مخالف ہیں ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ اس عدالت کے تمام جج ملیشیا (باقاعدہ فوج) کے افسروں میں سے سخت گیر ترین انسان منتخب کیے گئے۔ انہیں سزائے موت دینے کا سپیشل اختیار دیا گیا۔ پھر فسطائیت شکن سرگرمیوں کی تعریف میں گول مول الفاظ استعمال کر کے جج جسے چاہتا اس شق کے تحت سزائے موت دے

...کاری اعداد و شمار کے تحت صرف اکتوبر 1932ء میں فسطائیت شکن مجرموں کی تعداد ایک ہزار بچپن تھی۔ لیکن جو
...پھانسی پا چکے تھے ان کی تعداد کو ظاہر کرنا اطالوی حکومت نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

...تعلیم مفت بلکہ جبری کر دی گئی تا کہ کوئی فرد جاہل نہ رہے مگر اسکول میں نصاب بھی فسطائیت سے لبریز رکھا گیا
...بھی فسطائیت کے ماہر ہی رکھے گئے۔ ہر سکول میں مسولینی کی ایک بڑی تصویر آویزاں کی گئی جس کے نیچے
...''مسولینی کبھی غلطی نہیں کرتا'' بچوں کو یہ جملہ رٹا دیا جاتا تھا۔ یہ دراصل پوپ کے لئے کہے گئے جملے ''پوپ
...غلطی نہیں کرتا'' کی بنیاد پر گھڑا گیا جملہ تھا۔

...سکول میں تعلیم کے بعد طلباء کو فوجی تربیت دی جاتی۔ سکولوں اور کالجوں میں کوئی نحیف و نزار طالب علم نہیں آ سکتا تھا
...افراد کی جگہ ہسپتالوں میں تھی جہاں مفلس و نادار لوگوں کا علاج مفت ہی نہیں جبراً کیا جاتا تھا۔

فسطائیت اور مذہب:

اشتراکیت کی طرح فسطائیت نے مذہب کو ختم نہیں کرنا چاہا وہ صرف اسے سیاست سے الگ کرنے کی خواہاں تھی۔
فسطائیت کا داعی اعظم مسولینی پکا رومن کیتھولک تھا اور اس کی جماعت کے اکثر ممبران عیسائی مذہب کے راسخ العقیدہ
...تھے۔ اس کے برعکس اشتراکیت کے راہنما پکے دہریے اور خدا کے وجود سے ہی منکر تھے اور صرف مادے کے قائل
...فسطائیت ایسے باطل عقائد نہیں رکھتی تھی۔ وہ صرف مذہب کی حدود متعین کر کے اسے گرجا گھر تک محدود کر دینا چاہتی تھی
اس کے نزدیک پادری صرف شادی۔ طلاق اور پیدائش اور موت کی رسومات کی ادائیگی میں دکھائی دینا چاہیے مگر پادری کا
...پارلیمنٹ اور کیبنٹ میں نظر نہ آنے پائے۔

حبشہ کا الحاق:

مسولینی کا فسطائی فلسفہ اور اس کی فوجی تنظیم یوں تو دنیا کی نظروں میں کھٹکنے لگی تھی۔ مگر چونکہ اٹلی کا نام لیگ آف نیشن میں
برقرار تھا اس لیے دنیا کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ امن عالم میں خلل نہیں ڈالے گا اور صرف داخلی طور پر انتہا پسندی پر عمل درآمد
جاری رکھے گا۔ لیکن 1936ء میں حبشہ کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں جب اس نے لیگ کی ثالثی کو نامنظور کیا اور تمام بین
الاقوامی معاہدوں کو بالائے طاق رکھ دیا حبشہ کے خلاف فوجی کاروائی شروع کر دی تو دنیا میں کھلبلی مچ گئی، مگر یہ کھلبلی صرف
زبانوں تک محدود تھی۔ ادھر مسولینی نے کہا کہ اگر کسی اقوام عالم نے ہمارے ہاتھ ہتھیار بیچنے سے انکار کیا تو ہم اس قوم کے
خلاف بھی اعلان جنگ کر دیں گے۔ اس دھمکی نے اقوام عالم کو سہما دیا تاہم فرانس اصرار کرتا رہا کہ حبشہ کی اٹلی کیخلاف امداد کی
جانی چاہیے۔ بہر حال بڑی بحث و تمحیث کے بعد لیگ آف نیشنز نے صرف، تیل، کوئلے اور لوہے کو اٹلی کو فراہم کرنے پر
پابندی لگائی جو مسولینی جوش فسطائیت کم کرنے کے لئے ناکافی تھی، اس لیے حبشہ جیسی کمزور قوم کو اٹلی نے ہڑپ کر کے اطالوی
سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس پر حیران کن بات یہ ہوئی کہ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو لیگ نے معمولی پابندیاں بھی اٹھا لیں۔
اگر اٹلی کی طرف سے 1940ء میں جرمنی کی حمایت میں اعلان جنگ کیا جاتا تو حبشہ کا علاقہ دنیا اٹلی کی جائز
مقبوضات میں تسلیم کر لیتی۔ اٹلی کا یہ اعلان جنگ حبشہ کے بے کس اور مظلوم باشندوں کے لئے رحمت ثابت ہوا اور 15
...1941ء میں اتحادیوں نے حبشہ کے دارالحکومت پر قبضہ کر کے حبشہ کو اطالوی استبداد کے پنجے سے چھڑا لیا۔

1932ء انقلاب سیام

آج کے تھائی لینڈ کا پرانا نام سیام SIAM تھا۔ یہ مشرق کا ایک اہم ملک ہے۔ یہاں صدیوں سے مطلق العنان بادشاہت قائم تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں سیام نے اتحادیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آسٹریا وہنگری کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ جنگ کے بعد جب اقوام متحدہ کی پیشرو لیگ آف نیشن قائم ہوئی تو سیام اس کے بانی ارکان میں شامل تھا۔

1925ء میں سیام کے بادشاہ راما ششم کی موت پر اس کا بھائی پرجادھپوک راما ہفتم کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں 24 جون 1932ء کو یہ عوامی انقلاب رونما ہوا جو آج بھی تھائی لینڈ کا یوم آزادی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ تھائی لینڈ کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔

انقلاب:

یہ انقلاب مغربی تعلیم یافتہ طبقہ، قانون دان، سیاسی لیڈر، طالب علموں اور فوجی افسروں نے شاہی حکومت کے خلاف پر امن طور پر برپا کیا تھا۔ انہوں نے 700 سالہ مطلق العنان بادشاہت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے تحت سیام کا مکمل سیاسی نظام تبدیل ہو گیا۔ اس انقلاب کے حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ انقلابیوں کا بھانڈا ایک دن پہلے یعنی 23 جون 1932ء کو پھوٹ گیا تھا۔ ان کی لاکھ احتیاط کے باوجود سیام پولیس کے ڈائرکٹر جنرل کو انقلابیوں کے پروگرام کی خبر ہو گئی۔ ڈائرکٹر جنرل نے 23 جون کی شام کو بنکاک میں انقلابیوں کی گرفتاری کے لئے بادشاہ سے اجازت طلب کی جس پر بادشاہ نے ان کی گرفتاری اگلے دن پر موخر کرنے کا حکم دیا۔ گرفتاری کا موخر کیا جانا انقلابیوں کے کام آ گیا۔

24 جون 1932ء کی صبح تقریباً 4 بجے انقلاب کی عملی کاروائی کا آغاز ہوا۔ انقلابیوں نے بنکاک کی اہم عمارت پر قبضہ کر لیا۔ محکمہ ڈاک وتار کے دفاتر پر کنٹرول کر لیا گیا۔ انقلابی فوجی دستوں نے تھرون ہال THRONE HALL کی عمارت کا رخ کیا۔ تھرون ہال کی عمارت میں انقلابیوں کو صرف FIRSTARMY کے کمانڈو سے مزاحمت کا سامنا ہوا۔ بعد ازاں اسے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے سوا بادشاہ کے وفادار فوجی دستوں میں سے کسی نے مزاحمت نہ کی۔ شاہ کے وفادار 40 افسران گرفتار کر لئے گئے۔ صبح 8 بجے تمام حکومتی اداروں پر باغیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور انقلاب مکمل ہو گیا۔ انقلاب کا دوسرا حصہ سیاسی نوعیت تھا۔ پریڈی پارٹی نے انقلاب کے دن بنکاک میں ایک انقلابی پمفلٹ تقسیم کرایا جس کے مندرجات کچھ یوں تھے۔

انقلابی پمفلٹ:

جب نیا بادشاہ تخت نشین ہوا تو عوام نے امید کی تھی کہ وہ عمدگی سے بادشاہت کرے گا۔ مگر اس بادشاہ نے بھی خود کو پہلے بادشاہوں کی طرح، قانون سے بالاتر سمجھا اور عوام کی خواہشات اور آواز کو دبا کر حکومت کرنے لگا۔ اس نے اپنے حکام کو اپنے اختیارات ناجائز طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس نے شاہی خاندان کے افراد کو عام لوگوں سے کہیں زیادہ خصوصی حقوق عطا کیے۔ مملکت کے مسائل تقدیر پر چھوڑ دیئے گئے، ملک کی اقتصادیات کمزور کر دی گئیں۔ بادشاہ نے عوام کو سلطنت کا غلام سمجھا۔ حکومت کے لگائے گئے ٹیکسوں سے عیاں ہے کہ حکومت عوام کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑنا چاہتی ہے۔

ان حالات کے باوجود پیپلز پارٹی بادشاہ سے تخت چھیننا نہیں چاہتی اور بادشاہت کو قائم رکھنا چاہتی ہے، مگر ایک آئینی قانونی بادشاہت طور پر جس میں بادشاہ بھی آئین اور قانون کا پابند ہوگا۔ وہ کوئی بات غیر آئینی نہیں کرے گا، نہ ہی اسمبلی کی منظوری کے بغیر کوئی اقدام اپنی مرضی سے اٹھائے گا۔ اگر بادشاہ نے انکار کیا یا معینہ مدت میں جواب نہ دیا تو اسے قوم سے غداری پر محمول کیا جائے گا۔ بادشاہ کو اس پمفلٹ کے مندرجات پر مبنی ٹیلی گرام بھیجا گیا اور بادشاہ سے جواب طلب کیا گیا۔ بادشاہ نے آئینی بادشاہ بننے پر اپنی آمادگی ظاہر کر دی اور عوام کو آئین عطا کیے جانے پر بادشاہ کی طرف سے نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا۔

دسمبر 1932ء میں شاہ نے ملک میں ایک مستقل آئین نافذ کیا جس کے تحت 156 ارکان کی نمائندہ اسمبلی قائم کی گئی۔ انقلابی راہنما کرنل پھایا باہول بھون پھائیو ہاسینا PHAYA BAHOL PHONPHAU HIASENA پہلے آئینی وزیر اعظم بنے۔ اکتوبر 1933ء میں شاہی اپوزیشن نے زور پکڑا۔ اسی سال شہزادہ نوداروج کی قیادت میں شاہی دستوں نے لبرل حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ 2 مارچ 1935ء کو شاہ پراجادھیپوک خرابی صحت کی بنا پر اپنے 10 سالہ بھتیجے کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا۔

دوسری جنگ عظیم:

دوسری جنگ عظیم میں تھائی لینڈ نے جاپان سے اتحاد کیا۔ اسی دوران 1939ء ہی میں ملک کا نام سیام سے بدل کر تھائی لینڈ رکھا گیا۔ جاپان کی اعانت سے تھائی لینڈ نے اپنے ہند چینی واقع علاقوں کی فرانس سے واپسی کا مطالبہ کیا۔ 25 جنوری 1942ء کو تھائی لینڈ نے امریکہ اور برطانیہ کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا۔ جولائی 1943ء میں جاپان نے ملایا کی چار ریاستیں اور برما کی دو ریاستیں تھائی لینڈ کے حوالے کر دیں۔ جولائی 1945ء میں جاپان نواز حکومت کو برطرف کر دیا گیا اور پریڈی پھانوم یانگ نے حکومت سنبھال لی۔ اس دوران ملک کو دوبارہ سیام کے نام سے پکارا جانے لگا۔ 1946ء میں تھائی لینڈ نے برطانیہ اور امریکہ سے امن معاہدے کیے۔

9 نومبر 1946ء کو فوج اور پولیس نے مل کر پریڈی کی سویلین حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ فوجی لیڈروں نے عبوری آئین نافذ کیا جس کے تحت پارلیمنٹ قائم رہی۔ اپریل 1948ء میں فوجی لیڈروں نے پھیول سارنگ گرام کو وزیر اعظم بنا دیا۔ مارچ 1949ء میں ملک میں نیا آئین نافذ کیا گیا جس کے تحت 11 مئی 1949ء کو ملک کا نام سرکاری طور پر تھائی

لینڈ قرار پایا، لیکن یہ حکومت بھی کچھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور 29 نومبر 1951ء کو فوجی افسروں کے ایک گروپ نے ایک اور پرامن انقلاب کے بعد حکومت پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے 1932ء کے آئین میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے دوبارہ نافذ کیا۔ پھیبول وزیراعظم کے عہدے پر برقرار رہے۔ 1950ء کی دہائی کے آخر میں فوجی لیڈروں نے فوج اور پولیس کے افسروں کو اسمبلی کی نمائندگی دی جس پر وزیراعظم کے ساتھ ان کے اختلاف پیدا ہو گئے۔ اسی بحران کے دوران ستمبر 1957ء میں آرمی چیف فیلڈ مارشل ساویت تھانارے نے دوبارہ انقلاب برپا کیا اور پھیبول حکومت برطرف کر دی، پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور پھیبول اور جنرل پھاؤ کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بہر حال تھائی لینڈ آج کل بھی ایک آئینی بادشاہت ہے اور موجودہ بادشاہ ایک آئینی بادشاہ ہے۔

☆

1933ء۔ جرمنی پر نازیت کا رنگ چڑھتا ہے

جولائی 1932ء میں جرمنی میں ہونے والے انتخابات میں نازی جماعت نے ایک کروڑ 37 لاکھ 33 ہزار ووٹ لیے اور رہشاغ (قومی اسمبلی) میں 230 نشستوں پر قبضہ کر لیا ان حالات میں چانسلر فان پاپن مجبور ہو گیا کہ نازیوں کو حکومت میں شامل کرے۔ چنانچہ اس نے صدر ہنڈن برگ سے کہا کہ ہٹلر کو بلا کر اس سے بات چیت کی جائے اور اگر وہ تیار ہو جائے تو کیبنٹ میں ایک وزارت اسے دے دی جائے۔ لیکن ہٹلر نے گفتگو کے بعد صاف انکار کر دیا اور کہا کہ نازی جماعت یا تو مکمل اقتدار حاصل کرے گی یا پھر کچھ نہ کرے گی ہٹلر کے اس انکار پر فان پاپن نے نازیوں سے مقابلہ کا فیصلہ کیا اور صدر سے کہہ کر رہشاغ کو پھر معینہ مدت تک کے لئے معطل کروا دیا اور اس کی بجائے قومی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی۔

عارضی طور پر فان پاپن کی یہ پالیسی کامیاب رہی اور ہٹلر کی آواز دھیمی پڑ گئی اور ملک میں نازیت کا زور کم ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد جو انتخابات ہوئے ان میں نازی جماعت کو صرف بیس لاکھ ووٹ مل سکے ان حالات میں نازیوں کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ مسولینی اور رضا شاہ کی طرح قومی انقلاب کے ذریعے حکومت پر قبضہ کر لیں چنانچہ اس کی تیاریاں شروع ہو گئیں مگر صدر ہنڈن برگ کو وقت سے پہلے ان تیاریوں کی خبر مل گئی اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر فان پاپن کو سبکدوش کر کے جنرل شلیچر SCHLEICHER کو چانسلر بنا دیا۔ مگر اسکی یہ کوشش ناکام رہی اور انقلابی بادلوں کی گرج جرمنی کے سیاسی افق پر صاف سنائی دینے لگی۔ آخر 30 جنوری 1933ء کو صدر نے مجبور ہو کر ہٹلر کو بلایا اور اسے چانسلری کا منصب پیش کر دیا اس طرح نازی بالآخر لیلائے اقتدار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چانسلر بن جانے کے بعد ہٹلر کے سامنے دو کام تھے، ایک تو سارے ملک کو نازی رنگ میں رنگ دینا اور دوسرا ملک کی اقتصادی حالت کو سدھارنا۔ پہلا کام نسبتاً آسان تھا اس لئے ہٹلر نے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ دی۔ ہٹلر کے چانسلر کا عہدہ قبول کرنے کے بعد 27 فروری کو نامعلوم افراد نے رہشاغ کی عمارت کو آگ لگا دی جس سے وہ جل کر راکھ ہو گئی۔ ہٹلر نے اس کا الزام کمیونسٹوں پر لگایا۔ ہٹلر کا یہ پروپیگنڈہ اتنا کامیاب رہا کہ اگلے انتخابات میں نازیوں کو اتنے ووٹ ملے کہ جرمنی کی تاریخ میں کسی کو نہ ملے ہوں گے۔ غرض جو نیا ایوان بنا اس میں ساری طاقت نازیون کے پاس تھی یعنی مکمل طور پر جرمنی اب نازی ہو چکا تھا۔

تاریخی پس منظر:

جرمنی یورپ کی واحد قوم ہے جو نسلی، لسانی، معاشرتی اور جغرافیائی لحاظ سے سب سے بڑی ہے۔ سپاہیانہ لیاقت اور

دماغی صلاحیتوں میں بھی یہ دوسری اقوام یورپ پر فوقیت رکھنے کی دعویدار رہی ہے۔ اسی کے نتیجہ میں جرمنوں میں اپنے آپ کو برتر و اعلیٰ سمجھنے کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ تاریخی لحاظ سے بھی جرمن اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ سیزر اور آگسٹس کے رومن شہنشاہوں کی عظیم رومی سلطنت سے کامیاب ٹکر لینے والی بھی یہی جرمن قوم تھی۔ اس کے بعد جب قرون وسطیٰ میں مقدس رومن سلطنت کا تاریخی عہد شروع ہوا تھا اس کی فرمانروائی بھی جرمنی ہی کے افراد کے ہاتھ میں رہی۔ پھر اصلاحی مذہب کا پودا لگانے والا مارٹن لوتھر بھی جرمن قوم کا فرد تھا۔ فلسفہ و سائنس کے میدان میں بھی جرمنی نے خود کو یورپ کا معلم سمجھنا شروع کر دیا کیونکہ ہیگل، مارکس اور اینگلز جیسے فلاسفر اور نطشے اور گوئٹے جیسی ادبی شخصیات اس کی خاک سے ابھری تھیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے کہ بسمارک کی قیادت میں جرمنی متحد ہوا اور 1871ء میں سارے جرمنی نے ولیم اول کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا اور برلن اس کا پایہ تخت قرار دیا گیا۔

1870ء میں فرانس سے جنگ کے بعد جرمنی نے اپنی عسکری طاقت بڑھانا شروع کر دی اور اسکے بعد بڑی جدوجہد سے کام لیا۔ اس جدوجہد کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ فرانس کو کوئی ایسا موقع نہ دیا جائے کہ وہ دوسری اقوام یورپ کے ساتھ مل کر کوئی گروہ بندی کر لے۔ مگر ہر قوم کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ اس لئے فرانس روس اور برطانیہ ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ اس اتحادی خطرے سے نمٹنے کے لئے جرمن نے آسٹریا، ہنگری اور ترکی سے جوابی اتحادی رشتہ قائم کیا۔ باہمی رقابتیں بڑھیں تو انیسویں صدی کے آخر تک پوری دنیا ایک بارود خانہ بن کر رہ گئی۔ اس پر خواہ کوئی چنگاری ارادتاً ڈال دے یا کسی اتفاقی حادثے سے اس بارود خانہ میں کوئی چنگاری گر پڑے یہ آگ سے بھڑک اٹھنے کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ 1914ء میں یہ عالمی بارود خانہ پھٹ پڑا اور اقوام عالم قومی رقابتوں کی آگ میں جلنے لگیں۔ 1919ء میں اس جنگ کے خاتمے پر محققین اس نتیجے پر پہنچے کہ اس جنگ کے ظاہری اسباب جو نظر آ رہے ہیں اس کے علاوہ اس کا اصلی سبب 1870 کی جرمنی فرانسیسی جنگ بھی ہے۔ اس جنگ کے خاتمے کے لئے جو عہد نامے طے پائے تھے دراصل وہی 1914ء کی جنگ کے سبب بنے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد 1939ء کے دوسرے اعلان جنگ تک جرمنی میں جتنی تبدیلیاں ہوئیں وہ بڑی حد تک فرانس کی مرہون منت تھیں۔ جرمن عوام نے پریذیڈنٹ امریکہ ولسن کے نکات و اصول کی آواز سن کر اپنے رہنماؤں سے بغاوت کی تھی اور قیصر ولیم کی شاہی ختم کر کے جمہوریت قائم کرنے کے بعد بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ صلح کی جھنڈی لہرائی تھی۔ صلح نامے کے بعد سب سے پہلی مایوسی جرمن کو یہ ہوئی کہ جنگ کے دوران میں کھانے پینے کی چیزیں جرمن سے روکنے کے لئے جو معاشی حصار جرمنی کے گرد قائم کیا گیا تھا اسے اٹھانے سے فرانس نے انکار کر دیا نتیجتاً جرمنی کی عوام اعتراف شکست کے بعد بھی مہینوں بھوکے مرتے رہے اور انسانیت کے نام پر رحم و کرم کی جو اپیلیں کی گئیں وہ سب بہرے کانوں سنی گئیں اور اس کے بعد جب صلح نامہ کا اعلان ہوا تو اسکی دفعات دیکھ کر جرمنی پر سناٹا چھا گیا۔ پھر لطف کی بات یہ کہ ابھی بھی صلح نامہ فرانس کی منشا کے مطابق نہیں تھا۔ فرانس چاہتا تھا کہ اپنی مشرقی سرحد کو محفوظ کرنے کے لئے جرمنی کے مغربی علاقے کو دریائے رائن سے لے کر فرانس کی سرحد تک ایک چھوٹی سی آزاد ریاست میں تبدیل کر دے تاکہ وہ دونوں ملکوں میں حد فاصل کا کام دے۔ فرانس یہ نئی ریاست قائم کر کے اس کا حق نگرانی بھی اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے

سکتے کہ جرمنی کا یہ علاقہ فرانس کے قبضے میں آجائے۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ فرانس کی ان خواہشات کو نامنظور کرتے تھے کیونکہ اس علاقے میں جرمنی کی لوہے اور کوئلے کی بہت سی کانیں تھیں، اگر یہ علاقہ جرمنی سے چھین لیا جاتا تو وہ معاشی لحاظ سے بالکل تباہ ہو جاتا۔ خطرہ یہ تھا کہ اس بے انصافی کی وجہ سے جرمنی کہیں پھر نہ اٹھ کھڑا ہو، لہٰذا امریکہ اور برطانیہ نے وعدہ کیا کہ دریائے رائن کی حفاظت کی ذمہ داری وہ خود لیتے ہیں مگر دونوں ملک اپنے وعدے کو پورا نہ کر سکے جس کی وجہ سے فرانس نے تاوان جنگ کا مطالبہ زور و شور سے کرنا شروع کر دیا اور اتنا زبردست تاوان جرمنی پر عائد کیا کہ جسے وہ پورا نہ کر سکے تاکہ اس بہانے رائن لینڈ کے اہم فوجی اور تجارتی مقامات پر قبضہ کیا جا سکے۔ اس رقم میں سے 52 فی صد کا حقدار صرف فرانس تھا۔

جنگ کے بعد جرمنی کی حالت:

یہ رقم اتنی زبردست تھی کہ جنگ کے مارے ہوئے جرمنی کے لئے اس کی کوئی قسط بھی ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ 11 جنوری 1923ء کو فرانس نے رائن لینڈ کی کوئلے اور لوہے کی کانوں پر یہ بہانہ کر کے حملہ کر دیا کہ کوئلے اور لوہے کی جو قسط ادائیگی کے لئے جرمنی نے ادا کرنی تھی وہ ادا نہیں کی گئی۔ حملے کے بعد قبضہ یقینی تھا۔ جرمنی کے کارخانہ داروں اور ڈائرکٹروں کو گرفتار کر لیا گیا اور ہر چیز پر فرانس کے عہدیدار قابض ہو گئے۔ جرمنی پہلے ہی معاشی ابتری کا شکار تھا، اب حالت مزید خراب ہو گئی۔ جنگ سے پہلے جرمنی کے سکے کی قیمت بارہ آنے سے کم نہیں تھی مگر اب یہ حال ہوا کہ مارچ 1924ء میں 670 مارک میں امریکہ کا ایک ڈالر (جس کی قیمت ہمارے روپے کے حساب سے اس وقت تقریباً تین روپیہ تھی) ملتا تھا۔ لیکن قیمت روز بروز گرتی ہی جا رہی تھی یہاں تک کہ اگست میں یہ حال ہو گیا کہ ساڑھے چار ہزار مارک میں بھی ایک ڈالر سستا سمجھا جانے لگا۔ جب فرانس نے رائن لینڈ پر حملہ کیا تو حکومت کی ساکھ بالکل گر گئی اور جرمن مارک کی ویلیو کنکر پتھر کے ٹکڑوں سے زیادہ نہ رہی۔ لاکھ مارک دے کر بھی بیرونی ممالک کا ایک سکہ حاصل کرنا مشکل ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے پاس مارک کے ڈھیر موجود تھے مگر بازار میں ان کی کوئی قیمت نہ تھی جرمن عوام بھوکوں مر رہی تھی مگر قیمتیں لحظہ بہ لحظہ چڑھتی جا رہی تھیں۔ ہر شخص مارک کو بری طرح خرچ کر رہا تھا مزدوروں کو جیسے ہی اجرت ملتی وہ دوڑ کر بازار پہنچتے کہ کہیں گھنٹہ بھر میں قیمت نہ چڑھ جائے۔ سکے کی ساکھ ملک کی ساکھ ہوتی ہے اور یہی حکومت کو قائم رکھتی ہے اگر یہ ڈانواڈول ہو تو پھر ہر چیز ڈانواڈول ہو جاتی ہے۔

جرمنی کی اس بدحالی سے برطانیہ بڑا متاثر ہوا۔ اگر فرانس کی دشمنی اور خودغرضی شامل نہ ہوتی تو وہ بھی متاثر ہوتا۔ لارڈ کرزن اس وقت برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا اس نے فرانس کی اس وحشیانہ خودغرضی پر اسے تنبیہ کی بلکہ سخت الفاظ میں اس کے رویے پر ملامت بھی کی جرمنی کی ابتری اور بدحالی کا علاج 1925ء تک پھر بھی معرض التوا میں پڑا رہا، البتہ بیرونی طور پر مارک کی ساکھ بحال کرنے کے لئے جرمنی نے ڈاکٹر شاچٹ کی مدد سے ایک نئی اسکیم تیار کی۔ پرانا سکہ منسوخ کر دیا گیا اور نئے سکے نے ابتری کو کسی حد تک دور تو کیا مگر جن لوگوں کے پاس پرانے مارک تھے وہ مفلس اور قلاش ہو گئے اس طرح اعلیٰ اور متوسط طبقے کو قلاش بنا کر کم از کم عام بدحالی کو دور کر دیا گیا۔

اقتصادی کمیٹی کی تشکیل:

برطانیہ اور امریکہ یہ جانتے تھے کہ فرانس کے تاوان جنگ کے مطالبے سے نہ صرف جرمنی کو نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ خود اور انکی تجارت بھی نقصان اٹھا رہی ہے۔ کیونکہ جرمنی اپنی بدحالی کی وجہ سے اس قابل نہیں رہا کہ وہ امریکہ یا انگلستان کی اشیاء کا گاہک بن سکے۔ لہذا اس مسئلے کے حل کے لئے ایک اقتصادی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے رکن پھر ماہرین معاشیات ہی رکھے گئے اس کمیٹی کی تحقیقات کے مطابق جرمنی یہ تاوان جنگ صرف اسی وقت ادا کرسکتا ہے جب اس کی صنعتی حالات اچھے ہوں اس لیے جہاں اسے ہر سال سونے اور سامان کی شکل میں بالاقساط تلافی کی رقم ادا کرنی چاہیے وہیں اس کے لئے بھی لازم ہے کہ اس کی صنعتی بحالی کے لئے اسے قرضے دیں اسی کمیٹی نے طے کیا کہ جرمنی کو پہلے سال ایک ہزار ملین گولڈ مارک ادا کرنے چاہیں۔ ادھر اسی سال جرمنی کو صنعتی ترقی کی بحالی کے لئے اسی کروڑ گولڈ مارک کا قرضہ دیا گیا۔ قرضے کی یہ رقم بڑھتی گئی تا آنکہ 1928ء میں اس کی تعداد 18 ارب گولڈ مارک ہوگئی۔

معاہدہ لوکارنو:

اسی کوشش کے بعد جرمنی کی بحالی کے لئے دوسری کوشش سیاسی بنیادوں پر کی گئیں۔ جرمنی نے ابھی تک صلح نامہ ورسائی پر رضامندی کا اظہار نہ کیا تھا اور نہ ہی اب تک وہ لیگ آف نیشنز کا رکن بنا تھا۔ اب برطانیہ اور امریکہ نے فرانس کو یہ یقین دلایا کہ ان حالات میں یورپ میں امن مستقل طور پر قائم نہیں ہو سکتا ان دنوں فرانس میں قدامت پسند ہار گئے اور آزاد خیال برسر اقتدار آئے۔ اس پر برطانوی وزیر خارجہ نے ایک کانفرنس کی تجویز پیش کی جو بالآخر لوکارنو پیکٹ پر منتج ہوئی اور اس سال فرانس نے رائن لینڈ سے فوجیں واپس بلا لیں۔ لوکارنو پیکٹ کی رو سے یہ طے پایا کہ جرمنی کو لیگ آف نیشنز کا ممبر بنا لیا جائے۔ لوکارنو پیکٹ دراصل برطانوی تدبیر کی جیت تھی۔ اس لیے اس کا سہرا مسٹر نیول چیمبرلین کے سر باندھا گیا اور انہیں اسی سال امن کا نوبل پرائز بھی دیا گیا۔

آئین ویمیر:

اسی زمانے میں جرمنی کی تعمیر نو کی گئی اور شہروں اور قصبوں کو دوبارہ نئے انداز سے بنانے اور سجانے کا کام وسیع پیمانے پر کیا گیا اس کام کے لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے دل کھول کر قرضہ فراہم کیا۔ نتیجتاً 1924ء سے 1929ء تک جرمن جمہوریت کی حالت بہتر ہوگئی۔ 1919ء میں جمہوری نظام جرمنی کے مدبرین سیاست نے تیار کیا تھا وہ چونکہ ویمیر کے مقام پر تیار ہوا تھا اس لئے اسے آئین ویمیر کا نام دیا گیا تھا۔۔ یہ آئین جمہوریت کا صحیح آئینہ دار تھا۔ اس میں تحریر و تقریر کی مکمل آزادی عوام کو حاصل تھی اور نظام حکومت کے گوشے گوشے میں عوام کو اختیار دیا گیا لیکن آئین چاہے کتنا ہی اچھا ہو اگر معاشی ترقی کے وسائل محدود ہوں تو پھر بے کار ہیں۔ ویمیر کے ممبران نے جرمنی کو آئین تو دیا مگر یہ آئین نہ تو عزت دلا سکا نہ روٹی۔ عزت اس لئے نہ دلا سکا کہ ورسیلز کے معاہدے کی ہر دفعہ جرمنی کے وقار پر ضرب سے کم نہ تھی۔ اس کو جنگی مجرم قرار دیا گیا۔ تاوان جنگ کی زبردست رقم عائد کی گئی اسکے اہم ترین علاقے اغیار کو دے دئے گئے۔ چند ہزار سے زائد فوج رکھنے پر پابندی لگا دی گئی۔ جرمن نسل کے لاکھوں عوام دیگر حکومتوں کے زیر اقتدار دے دئے گئے۔ مگر جرمنی

...ادا نہ کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے آئین ویمر جرمنی کی اس بے عزتی کا کوئی مداوا نہ کر سکا۔ دوسری طرف نوآبادیوں کے چھن جانے سے تجارتی منڈیاں بھی ہاتھ سے نکل گئیں اور تاوان جنگ نے ملک کا رہا سہا زرمبادلہ بھی فرانس منتقل کر دیا اس ملک کے غربت و افلاس کا علاج بھی آئین ویمر نہ کر سکا اور ایک نئے سیاسی اور معاشی نظام کی ضرورت پیش آئی۔

نازی جماعت کی پیدائش:

جرمن قوم ترکوں کی طرح اطاعت و تنظیم سے مرکب تھی۔ مشہور تھا کہ جرمنی میں صرف دو ہی قسم کے افراد ہوتے ہیں، سپاہی اور جرنل یعنی اطاعت کرنے والے اور اطاعت کرانے والے۔ جرمن قوم کا نصب العین ہے فرض اور عزت DUTY AND HAONOUR یعنی ہر حال میں ادائیگی فرض اور اس کے احساس کو نہ بھولو اور عزت کے لئے دنیا کی ہر چیز قربان کر دو۔ ویمر آئین چونکہ قوم کی شکست کے بعد مرتب ہوا تھا اور آہانت آمیز شرائط صلح سے وابستہ تھا اس لئے اس میں ...... نہ تھی......

پال ہنڈن برگ (1937-1847)

جرمن جرنیل اور سیاست دان 1866ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ آسٹرو پرشین جنگوں میں خدمات انجام دیں۔ فرانس اور جرمنی کی جنگ میں بہادری کے جوہر دکھائے اور سرخ عقاب والا تمغہ حاصل کیا۔ 1911ء میں فوج سے ریٹائر ہوا۔ 1914ء میں مشرقی پروشیا کی کمانڈ دی گئی اس نے روسیوں کو بڑی واضح شکست دی۔ جس کے نتیجے میں اسے فیلڈ مارشل بنا دیا گیا۔ پہلی بار 1925ء میں اور دوسری بار 1932ء میں جمہوریہ جرمنی صدر منتخب ہوا۔ جنوری 1933ء میں اسی نے ہٹلر کو چانسلر کا عہدہ سنبھالنے کی دعوت دی تھی اس کے نام پر ایک جہاز کا نام بھی اعزازی طور پر رکھا گیا تھا۔

......تو قوم کے لئے اسکی کوئی اہمیت نہ تھی۔ تحریر و تقریر کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر مختلف عناصر نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنا شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ شرافت و اخلاق کے مسلمہ اصولوں کے خلاف بھی آوازیں اٹھانے لگیں اور ملک میں بد اخلاقی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ صورت حال جرمن قوم کے ادائیگی فرض کے احساس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ لوکارنو پیکٹ کے بعد ملک میں صنعتی حالت بہتر ضرور ہوئی، مگر چونکہ اس بہتری کے نتائج کو فرانس کے تاوان جنگ کی صورت میں ادا کرنا تھا اس لئے غیر ضروری کفایت شعاری سے کام لیا گیا اور کم سے کم مصارف پر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس چیز نے لاکھوں مزدوروں کو فالتو یا بے کار کر دیا اس سے فائدہ یہودی چھوٹے سرمایہ داروں نے اٹھایا اور خوب دولت بٹورنے لگے جس سے جرمن قوم یہود کی خود غرضی اور غداری سے آگاہی ہو گئی لیکن یہودیوں نے اس کی پرواہ نہ کی جس سے ان کے خلاف غم و غصے کے جذبات عوام میں روز بروز بڑھنے لگے 1924ء سے 1929ء تک اگرچہ بیرونی دنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ جرمنی کی حالت بہتر ہوئی ہے مگر صورت حال یہ تھی کہ اندر ہی اندر غم و غصہ کا

لاوا پک رہا تھا ملک میں مختلف سیاسی جماعتیں تھیں جو مختلف اصولوں کا پرچار کرتی تھیں۔ کیمونسٹ پارٹی، وائٹ ہیلمٹ
لئے کوشاں تھی جو کہ سنٹرل پارٹی کیتھولک ازم کے دعقوں پر زور دے رہی تھی۔ تیسری جماعت قوم پرستوں کی تھی
قدامت پسندی میں ملک کے لئے نجات دیکھتی تھی۔ چوتھی طرف قوم پرستوں اشتراکیوں (نیشنل سوشلسٹ پارٹی) کا
گروہ تھا جو اگرچہ دیگر قوم پرستوں کی طرح قدامت کا قائل تھا مگر ملک کی معاشی تنظیم کیلئے اشتراکی بنیادوں پر
کرنے کا خواہاں تھا۔ لیکن صلح نامہ ورسلیز میں کی گئی جرمنی کی اہانت کے خلاف اسے سب سے زیادہ غصہ تھا وہ یہ
بھی برداشت نہیں کرتا تھا کہ جنگ شروع کرنے کی ساری ذمہ داریاں جرمنی پر عائد ہوتی ہیں۔ اس گروہ کا اشتراکی
مزدور اور متوسط طبقے کو بھی جاذب نظر تھا۔ جرمنی اپنی سابقہ حیثیت کی بحالی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، لیکن کامیابی کی
شکل نظر نہیں آتی تھی۔ چونکہ قوم پرست اشتراکی پارٹی، عہد نامہ ورسیلز پر تنقید کرتی رہتی تھی اس لئے قوم میں اس کی
دلعزیزی بڑھنے لگی۔ 1920ء تک یہ پارٹی صرف سات ارکان پر مشتمل تھی۔ 1929ء میں اس کے اراکین کی تعداد ایک
لاکھ 78 ہزار تک پہنچ گئی۔

اس جماعت کے ارکان نے اپنا نام مختصر کر کے نازی رکھ لیا جو دراصل قومی اشتراکی جماعت کے جرمن نام کا مخفف ہے
اس نازی پارٹی نے رفتہ رفتہ اتنی ترقی کی کہ آج 1919ء کے بعد سے 1945ء تک کی جرمنی کی تاریخ دراصل اسی جماعت
کی تاریخ ہے۔

جمہوریت کے خلاف جذبات:

جرمنی کی جو تباہی 1914ء کی جنگ کے بعد سے ہوئی وہ کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو
شاہی کے خلاف انقلاب اٹھ کھڑا ہوا جس میں لاکھوں گھر اجڑ گئے۔ پھر سکے کی ساکھ گرنے سے معاشی قیامت برپا ہوگئی۔
پھر ڈاکٹر سیاچٹ کی سکیم نے جہاں سکے کی ساکھ بحال کی وہیں بہت سوں کو دیوالیہ کر دیا۔ جرمن قوم کی بدحالی بڑھتی ہی
جا رہی تھی قومی قرضوں کا بوجھ بھی بڑھتا جا رہا تھا، لیکن ادائیگی کی کوئی صورت نہ تھی۔ ان حالات میں قدرتی طور پر جرمن قوم
کے جذبات غم وغصہ سے ہٹ کے صلح نامہ ورسیلز اور آئین ویمیر کے خلاف مجتمع ہوگئے۔ اب جرمن قوم کا نعرہ تھا ورسیلز نے
ہمیں امن دیا مگر ذلت کے ساتھ صلح کی مگر اہانت کے ساتھ اسی طرح ویمیر آئین کے خلاف ان کا الزام تھا کہ اس نے قوم کو
جمہوری آزادی دی مگر راہنمائی نہ کی۔ جرمن کو مصلح دینے کے بجائے منافع خور دیئے۔ اور اطمینان کی بجائے ابتری اور بے چینی
کی فضا پیدا کی۔

ان حالات میں صرف نازی جماعت ایسی تھی جو اپنی حکمت عملیوں کی وجہ سے اپنے اندر عوام کے لئے کشش رکھتی تھی
اس لئے قدرتی طور پر اس کے ارکان کی تعداد نہایت تیزی سے بڑھنے لگی اور اسی تیزی سے اس جماعت کے راہنماؤں نے
عوام کے دل ودماغ پر قابو پانا شروع کر دیا

ایڈولف ہٹلر:

نازی جماعت کی قوت وطاقت دراصل جس شخص کی مرہون منت ہے اسے دنیا ایڈولف ہٹلر کے نام سے جانتی ہے
۔ ہٹلر جب پیدا ہوا تو کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ معمولی ماں باپ کا یہ بچہ جرمنی کی تاریخ میں قوم پسند اشتراکیت کا

...اگر ے گا اور جرمنی کی تاریخ بدل کر رکھ دے گا۔ ہٹلر آسٹریا کے ایک گاؤں براناؤ میں 1889ء میں پیدا ہوا۔ ...ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگا۔ اسی حالت میں ان کے ...گزر گئے لیکن اس حال میں بھی جاہ طلبی اس کی روش تھی، جس کی وجہ سے اسے ویانا چھوڑنا پڑا۔ اور میونخ آ گیا ...جنگ کے بادل منڈلانے لگے اور وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ہٹلر بچپن ہی سے سپاہ گری سے دلچسپی رکھتا تھا، جنگ ...نے بڑی دلیری دکھائی جس کے نتیجے میں اسے کارپورل بنا دیا گیا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو فوج ختم ہو گئی۔ اور ہٹلر ...اور پریشانی کے دن پھر لوٹ آئے شکست ذلت اور جرمنی کی تباہی سے قوم پرست گروہ پیدا ہوئے ان میں قوم ...اشتراکی گروہ تھا، جو جنگ کے فوراً بعد قائم ہوا۔ 1920ء میں ہٹلر نے اس پارٹی کی رکنیت حاصل کی تو اس پارٹی کو وہ ...تھا جرمنی کے طول و عرض میں نیشنل سوشلسٹ پارٹی کو کوئی جانتا نہیں تھا۔ لیکن ہٹلر نے اپنے آہنی عزم سے کام ...لیا اس نے پارٹی کا جو پروگرام تیار کیا وہ ان نکات پر مشتمل تھا۔ یہودی منافع خوروں کی مخالفت، غیر ملکیوں کی ...آئین ویمیر کی مخالفت اور معاہدہ ورسیلز کی مخالفت۔ یہی نکات تھے جو بعد ازاں نازیوں کے لئے آسمانی صحیفہ بن ...

دراصل یہی نکات جرمن قوم کی دل کی آواز تھے اور جرمنی کا ہر طبقہ ان سے متفق تھا۔ ہٹلر نے جب اس پروگرام کی تبلیغ [illegible] تو اس نے متوسط طبقے کے نوجوانوں کے دل و دماغ پر جادو کا کام کیا ادھر چونکہ اس جماعت کا پروگرام تعمیری تھا ...کارخانہ داروں نے بھی اسی جماعت کی حمایت کی اور دوسرے اشتراکی لیڈروں کو بے اثر بنانے کے لئے اس ...کی روپے سے مدد کرنے لگے۔ ڈاکٹر گوبلز قسم کے تعلیم یافتہ لوگ بھی قوم پرستی کی وجہ سے اس جماعت میں شامل ہو ...گئے جس سے جماعت کو چار چاند لگ گئے۔

انقلاب لانے کی سعی ناکام:

اسی زمانے میں ہٹلر کی ملاقات مارشل لڈن ڈارف سے ہو گئی جس نے ہٹلر کو مشورہ دیا کہ وہ مسولینی کی طرح ناگہانی [illegible] کر کے جرمنی کے اقتدار پر قبضہ کر لے۔ مارشل مذکور نے کسی ایسی کوشش میں اپنی خدمات پیش کرنے کی پیشکش [illegible]۔ حالات کے پیش نظر نازیوں نے لڈن ڈارف کی تجویز کو غنیمت جانا اور فوجی انقلاب کی تیاریاں شروع ہو گئیں مگر جب [illegible] کا دن آیا تو نازی دستے ابھی میونخ سے باہر ہی تھے کہ حکومت کی فوج نے انہیں روک کر کچھ لیڈر گرفتار کر لئے۔ 8 [illegible] 1923ء کو یہ واقعہ پیش آیا۔ میونخ کے فوجی ہیڈ کوارٹروں پر قبضہ بھی کر لیا گیا۔ اگلی صبح ہٹلر اور اس کے طوفانی دستوں نے [illegible] ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کر لیا۔ راستے میں پولیس سے گولیوں کا تبادلہ ہوا جس میں سولہ پولیس والے اور بہت سے نازی خون [illegible]۔ اس ناکام بغاوت کے بعد ہٹلر کو میونخ کے قریب ایک گاؤں سے گرفتار کر لیا گیا۔ ہٹلر کا نزدیکی ساتھی زخمی [illegible] بہنے کے باوجود گرفتاری سے بچ نکلا۔ ادھر ہٹلر پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا اور پانچ سال قید کی سزا تجویز ہوئی مگر ملک میں [illegible] بھی پھیل جانے کی وجہ سے نازی جماعت کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

1925ء میں ڈاویز کمیٹی کی تجاویز زیر عمل آئیں تو جرمنی میں کچھ اطمینان و سکون کی فضا پیدا ہو گئی۔ اس چیز سے نازیوں کی مقبولیت کا گراف نیچے آنے لگا اور 1924ء میں انہوں نے ریشتاغ (پارلیمنٹ) کے انتخاب میں مجموعی طور پر

19 لاکھ ووٹ حاصل کیے تھے وہ اس سال گھٹ کر صرف نو ہزار رہ گئے۔

نازیت کی خصوصیات:

نازیوں کی تنزلی کا یہ دور 1929ء تک رہا لیکن اس کے بعد عالمگیر کساد بازاری کا جو دور شروع ہوا اس کی وجہ سے عوام پھر ان کے نعروں کی طرف متوجہ ہو گئے اور 1930ء کے انتخابات میں نازیوں نے 65 لاکھ ووٹ حاصل کر کے ریخ سٹاگ میں ایک سو سات نشستیں حاصل کیں۔ اب یہ جرمنی کی سب سے بڑی جماعت بن چکی تھی۔ میونخ میں ایک بڑے علاقہ پر اس کا قبضہ تھا۔ فوج کے سابق سپاہیوں اور بے روزگاروں کی ایک نیم فوجی تربیت یافتہ جماعت اس کے پاس ذاتی فوج کے طور پر تھی۔ ادھر عوام کی تائید و حمایت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ وقت تھا جب ہٹلر قوم کی آنکھوں کا تارا بن گیا تھا۔ وہ قوم پرستی اور اشتراکیت کے مشترکہ مسلک کے حق میں دھواں دھار تقریریں کر رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا بھوک کا علاج اشتراکیت اور ذلت کا چارہ کار قومیت، موجودہ نظام کو بدل ڈالو اور معاہدہ ورسلیز کو ختم کر دو، جرمنی کے ماتھے سے ہمیشہ کے لیے شکست چھیڑنے کا داغ مٹا دو۔ ظاہر ہے یہ سب باتیں جرمن عوام کے جوش کو دوبالا کرتی تھیں اور وہ ہٹلر زندہ باد کے نعرے دیوانہ وار لگاتے تھے۔ ہٹلر نے جرمنوں کو بتایا کہ وہ آرین نسل سے تعلق رکھنے والی دنیا کی سب سے برگزیدہ قوم ہیں اور سفید فام اقوام میں ان کا درجہ سب سے افضل ہے، جرمن تہذیب و ثقافت ہی ساری دنیا کی تہذیبوں پر حاوی ہے اور پورا یورپ بندروں کی طرح ان کی نقالی کرتا ہے۔ یہ سب خیالات تھے جنہیں سن کر جرمن قوم وجد میں آ جاتی تھی، یہی نازی ازم کی خصوصیت تھی۔

انقلابی فضا:

ویمیر آئین و دستور نے جرمنی کو جمہوریت دی مگر اس کی ذلت و بھوک کا کوئی علاج نہیں کیا۔ آئین کی اسی کمزوری کو اچھالتے ہوئے ہٹلر نے بڑی آسانی سے اس کی مخالفت میں انقلاب کی فضا پیدا کر دی تھی۔ اس نے قوم کو یقین دلایا تھا کہ جب تک نظم و نسق کے ڈھانچے کو بنیادی طور پر نہیں بدلا جائے گا۔ افلاس اور بے روزگاری کا علاج ممکن نہیں۔ اس طرح اس آئین پر عمل پیرا رہ کر جرمنی ذلت کی پنہائیوں سے نہیں نکل سکتا۔ زمانہ جدید کے یورپ کا واحد انسان ہٹلر تھا جس نے مرد اور عورت کو ہم پلہ تسلیم نہیں کیا تھا، کیونکہ اس زمانے میں روزگار حاصل کرنے کی مسابقت عورتوں اور مردوں میں پھیلی ہوئی تھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہٹلر نے اعلان کیا مرد اور عورت ہرگز برابر نہیں ہیں۔ مرد گھر کا سردار ہے اور عورت پر گھریلو زندگی کی تدبیر و تکمیل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جرمنی کے معاشی حالات بہتر نہ ہونے کی وجہ سے جنسی مساوات کے نعرے نے جرمنوں کو مضطرب کیا ہوا تھا۔ اس لیے جب ہٹلر نے نعرہ لگایا کہ، عورت کو باورچی خانہ، زچہ خانہ اور گرجا گھر کو سنبھالنا ہے تو جرمن مردوں نے اس کا خیر مقدم کیا بلکہ چند جرات مند خواتین کے سوا جرمن خواتین نے بھی ہٹلر کے اس نعرے کو تسلیم کر لیا۔

فان پاپن:

اتنی مقبولیت حاصل کرنے کے باوجود ابھی حکومت ہٹلر کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ ہنڈن برگ ریشتاغ کا صدر نشین تھا

[illegible] امراء اور خواص کر گروہ ریشتاغ کا صدر نشین تھا اور یہ گروہ نازیوں کے مسلک سے اختلاف رکھتا تھا اس [illegible] کو اس کی اعانت حاصل تھی۔ لیکن عوام کو اپنی طرف کرنا حکومت کے لیے دشوار کن کام تھا۔ بیرونی قرضوں [illegible] روپیہ درکار تھا اس لیے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ چیز حکومت کی ساکھ عوام میں گرا رہی تھی۔ ان [illegible] ہنڈن برگ نے خطرے کی بو سونگھ لی کہ کہیں نازی برسر اقتدار نہ آ جائیں اس اندیشے سے اس نے برین رنگ کی [illegible] دیکھتے ہوئے اسے چانسلر شپ سے الگ کر کے اس کی جگہ فان پاپن کو وزیر اعظم مقرر کر دیا فان پاپن بڑا مدبر انسان تھا اور عوام میں تھوڑا بہت اثر بھی رکھتا تھا۔ ہنڈن برگ کا خیال تھا کہ اس کی مدد سے عوام کی توجہ نازی ازم [illegible] جائے گی۔ مگر اس نے جو کابینہ بنائی وہ خالصتاً امراء اور نوابوں پر مشتمل تھی جنہیں ملک میں ذرہ برابر بھی مقبولیت [illegible] اس کابینہ نے قوم پرستی کا راگ بڑی شدت سے الاپنا شروع کیا اور ساتھ ہی اشتراکیت کی مخالفت میں [illegible] کا زور لگایا۔ اس حکمت عملی کے نتیجے میں وہ شوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو میدان سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ [illegible] میں لوزان میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں تاوان جنگ کی ادائیگی کو عملاً منسوخ کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ منسوخی [illegible] کے ساتھ مشروط تھی مگر پھر بھی جرمن قوم کے لئے خوشی کی بات تھی۔ فان پاپن نے اس منسوخی کا کریڈٹ اپنی کابینہ کو [illegible] ملک کے طول و عرض میں اس پر قصیدے پڑھے گئے جن میں کہا گیا کہ فان پاپن نے جو کام جرمنی کے لئے کیا ہے وہ [illegible] نہیں کر سکتا۔ فان پاپن کے اس عمل نے اشتراکی اور جمہوری جماعتوں کو بٹھا دیا مگر نازیوں نے ایک کروڑ 37 [illegible] ہزار ووٹ لے اور وہ ریشتاغ کی دو سو تیس نشستوں پر قابض ہو گئے۔ اب فان پاپن مجبور ہو گیا کہ نازیوں کو وزارت میں شامل کرے۔ ہٹلر سے گفتگو کی گئی تو اس نے وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نازی جماعت یا تو کل اقتدار لے گی یا کچھ نہیں لے گی۔ ہٹلر کے انکار نے فان پاپن کو نازیوں کے مقابلے کے لئے تیار ہو جانے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اس نے صدر سے کہہ کر ریشتاغ کو غیر معینہ مدت کے لئے بند کروا دیا اور قومی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی گئی۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا گیا اور ریڈیو اور وائرلیس پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔ تحریر و تقریر پر پابندی لگا دی گئی۔ پروشیا کو عملاً مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ اشتمالیت پسندوں پر جیل کے دروازے کھول دیئے گئے اور یہودیوں کو ایک دم ہر سرکاری کام سے فارغ کر دیا گیا۔

فان پاپن کی یہ حکمت عملی پوری طرح کامیاب رہی اور ہٹلر کی آواز بڑی دھیمی پڑ گئی اور ملک میں بظاہر نازی ازم کا زور کم ہوتا نظر آیا اس کے بعد منعقد ہونے والے انتخابات میں نازیوں کو صرف 20 لاکھ ووٹ مل سکے۔

نازی اقتدار میں:

ان حالات میں نازیوں کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ مسولینی کی طرح فوجی حملے کی مدد سے حکومت کو ناگہانی انقلاب سے برطرف کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تیاریاں شروع ہو گئیں مگر ہنڈن برگ نے خطرے کی بو سونگھ لی اور حفظ ماتقدم کے طور پر فان پاپن کو سبکدوش کر کے جنرل فان شلیچر FANSCHLEICHER کو چانسلر بنا دیا مگر یہ کوشش بے نتیجہ رہی اور ہنڈن برگ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہٹلر کو اقتدار دینے پر مجبور ہو گیا۔ 23 مارچ کو ہٹلر کو منتخب ایوان نے چار سال کے لئے مطلق العنان طور پر تمام اختیارات سونپ دیئے۔ اب ہٹلر نے اطمینان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔

مخالفین کا مسئلہ:

ملک میں وحدت خیال اور وحدت عمل پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے مخالف سیاسی جماعتوں پر حملہ کیا گیا۔ اسی طرح جس طرح مسولینی نے برسر اقتدار آتے ہی مخالفوں کو کچل ڈالنے کے پے در پے وار کر کے خاموش کر دیا تھا۔ سیاسی پارٹیوں کا سرمایہ ضبط کر لیا گیا جہاں ضرورت پڑی ان کی جماعتیں توڑ دی گئیں اور کیمپ جیل بھیج دیئے گئے۔ بعض حالات میں جسمانی ایذا رسانی سے مخالفوں کو دہشت زدہ کر کے خاموش کر دیا گیا۔ وہاں مخالفوں کو ... سے ... یا تو اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے ہٹلر پر ایمان لے آؤ یا ... کے نام فرمان جاری ہوا کہ ... زندگی گزارنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مذہب و اخلاق کا درس دینے والوں کی بھی شامت آئی ... کیمپوں میں قیدیوں کی سی ... کو محدود کر دیا گیا کہ وہ نازی ازم کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالیں۔ اخبارات ... تھیٹر، سینما ہال، ریڈیو اور پریس سب ذرائع ابلاغ نازی پروپیگنڈے کے لئے وقف کر دیئے گئے اور نازی ازم کے خلاف ابھرنے والی ہر آواز بند کر دی گئی۔

یہودیوں کو نفرت کا نشانہ بنایا گیا:

یہودیوں کو سرکاری ذمہ داری سے تو پہلے حکومت نے نکال دیا تھا۔ مگر اب وہ عام نفرت اور انتقام کا نشانہ بننے لگے اگرچہ انہیں قتل نہیں کیا گیا مگر ان کا مکمل معاشرتی بائیکاٹ کر دیا گیا۔ اس بائیکاٹ سے جرمن قوم یہودی سائنسدانوں اور ہنرمندوں سے محروم ہو گئی۔ لیکن جرمن قوم کے احیائے جدید کے نام پر یہ نقصان برداشت کیا گیا۔ ہٹلر کی ان حکمت عملیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1934ء میں پورا جرمن نازی رنگ میں رنگا گیا۔ اب نازی جماعت کے سوا ملک میں کوئی دوسری جماعت نہ رہی۔ اگر کوئی جماعت تھی بھی تو برائے نام۔ جتنے سربرآوردہ مخالف تھے یا جن پر مخالفت کا شبہ کیا جاتا تھا وہ سب قتل کر دیئے گئے۔ یہاں تک کہ ریشتاغ کے آخری چانسلر شلیچر کو بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔ اس لئے کہ اسکے خلاف شبہ تھا کہ وہ نازیوں کے خلاف کوئی سازش تیار کر رہا ہے۔

تخفیف اسلحہ اور جرمنی:

انہیں دنوں یورپ میں تخفیف اسلحہ کا بڑے زور شور سے شور اٹھا۔ ہٹلر نے جرمنی کی طرف سے مطالبہ پیش کیا کہ وہ اسلحہ کم کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اسے بھی دوسری اقوام کے مساوی اسلحہ رکھنے کا حق دیا جائے۔ اس مطالبے کے جواب میں کہا گیا کہ یہ شرط صلح نامہ ورسلیز کے خلاف ہے کہ جرمنی کو بڑی طاقتوں کے برابر حق اسلحہ سازی دیا جائے۔ اس لئے یہ مطالبہ منظور نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر ہٹلر نے تخفیف اسلحہ اور لیگ آف نیشنز دونوں کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ گویا ہٹلر نے اعلانیہ عہد نامہ ورسیلز کی خلاف ورزی شروع کر دی اور عام فوجی بھرتی کا اعلان کر دیا۔ ہٹلر نے آئین ویمیر میں دی گئی ریاستوں کے وفاق اور وحدت کو ختم کر کے جرمنی کے اتحاد کے نام پر ریاستوں سے جو خود اختیاری کو مرکز میں منتقل کر لیا۔

نازی آمریت کا عروج:

نازی ازم کو معاشی کی تنظیم کے لئے ایک جامع فلسفہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا جس کے مطابق نازیت ایک مکمل

معاشرتی نظام اور اشتراکیت کی اعلیٰ ترین قسم قرار دی گئی۔ ان مفکروں کے نزدیک اشتراکیت کا مفہوم معاشرہ کی قومی تنظیم تھا منتظم انجام کرنے والے نازیوں کی خوش قسمتی سے اگست 1934ء میں ستاسی سالہ ہنڈن برگ، صدر جمہوریہ انتقال کر گیا۔ ہٹلر کو اقتدار اعلیٰ کی مکمل باگ ڈور حاصل کرنے کا میدان صاف ہو گیا۔ اس نے چانسلر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے صدر ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ اب ہٹلر کا آفتاب اقتدار نصف النہار پر چمکنے لگا اور نازی جماعت کی طاقت شباب پر آ گئی۔ اب ہٹلر اپنے ہم خیال رفیق گوئبلز اور گورنگ کے ساتھ جرمنی کے سفید و سیاہ کو مالک بن گیا۔ اس طرح جرمنی کو نازی بنانے اور نازیت کو حاکم اعلیٰ بنانے کا کام مکمل ہو گیا۔

معاشی ترقی:

1935ء میں استصواب رائے سے یہ فیصلہ کیا جانا تھا کہ سار کا علاقہ جہاں کوئلے کی زبردست کانیں تھیں۔ جرمنی کو واپس کیا جائے یا نہیں۔ استصواب رائے کے نتیجے میں یہ علاقہ جرمنی کو مل گیا۔ 1936ء میں معاہدہ لوکارنو کو کالعدم قرار دے کر ہٹلر نے رائین لینڈ پر بھی قبضہ کر لیا، یہ کامیابیاں معاشرتی اور صنعتی ترقی کے لئے بہت مفید تھیں مگر ابھی جرمنی کے لئے اور بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

تحریک جرمن اتحاد:

نازی جماعت نے جن مقاصد کے لئے اپنی پروپیگنڈہ مشنری متحرک کر رکھی تھی، ان میں سے ایک یہ تھا کہ وسطی یورپ میں بسنے والی جرمن قوم ایک جھنڈے کے نیچے آ جائے۔ مارچ 1933ء کے انتخابات کے بعد ہٹلر نے آئین ویمیر کا منسوخ کر دیا تھا اور تمام اختیارات وزیروں کی کابینہ کو سونپ دیئے تھے۔ اسکے بعد ہٹلر کے عہد میں ریشتاغ کا کوئی انتخاب نہ ہوا جب مدت زیادہ گذری تو جنوری 1943ء میں ہٹلر نے فرمان جاری کیا کہ یہی پارلیمنٹ 1947ء تک کام کرے گی اس آمریت شاہی کا مقصد صرف یہ تھا کہ جرمن قوم میں مرکزیت پیدا ہو جائے حتیٰ کے نازی پارٹی کے سوا باقی سیاسی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے کر اسی مقصد کے لئے ختم کر دیا گیا۔

اپنی حدود میں اتحاد و مرکزیت پیدا کرنے کے بعد نازیوں کی نگاہیں وسطی یورپ کے ان جرمن علاقوں کی طرف اٹھیں جو صلح نامہ ورسلیز کے تحت کاٹ کر جرمنی سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ جہاں جہاں جرمن قوم آباد تھی وہاں نازی پارٹیاں قائم کی گئیں اور آخر 1938ء میں وہ وقت آ گیا کہ جرمنی کی فوجیں آسٹریا میں داخل ہو گئیں اور 97 فی صد جرمن آبادی کے اس ملک کو ورسلیز نے جرمنی سے کاٹ دیا تھا۔ جرمنی میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے اور چیکوسلواکیا کے جرمن علاقوں پر دھاوا بولا گیا پھر پورا چیکوسلواکیہ ہی جرمنی کے تصرف میں آ گیا پھر اس کے بعد ڈانزگ اور میمل لینڈ کی آزادی آئی جس کے نتیجے میں پولینڈ سے لڑائی لازم تھی۔ جرمنی نے ان مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے برطانیہ اور فرانس کو چونکا دیا تھا۔ اب تک یہ کوشش کی جا رہی تھی کہ جس طرح ہو جنگ کو ٹالا جائے مگر جب ہٹلر کے حوصلوں نے صلح نامہ ورسلیز کی دھجیاں بکھیرنی شروع کی تو برطانیہ اور فرانس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور 3 ستمبر 1939ء کو اعلان جنگ کر دیا گیا۔

یوکرین: نازی اپنے مقاصد کا اعلان کرتے وقت یہ بھی کہا کرتے تھے کہ یوکرین کی سرزمین کو روس اور پولینڈ کے قبضے سے نکال کر ایک آزاد ریاست بنایا جائے گا۔ 1917ء میں جو معاہدہ روس اور جرمنی میں ہوا تھا اس میں فن لینڈ اور یوکرین کو آزاد ریاست بنانا طے ہوا تھا مگر جرمنی کی شکست کے بعد بالشویک روس نے خون ریز جنگوں کے بعد یوکرین کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا اور تھوڑا عرصہ پولینڈ کے ماتحت رہنے دیا تھا۔ یوکرین کی آزادی کے سوال پر برطانیہ اور فرانس دونوں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ مگر دنیا 1939ء میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ روس اور جرمنی جو اپنے اصول سیاست کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد تھے اچانک ایک معاہدے کی رو سے متحد ہو گئے اس معاہدے کے بعد دنیا نے عجیب و غریب قیاس آرائیاں شروع کر دیں اور روس اور جرمنی کی اشتراکیت کو ایک خانے میں رکھنے کے لئے صفحات سیاہ کر دیئے لیکن صرف دو سال بعد دنیا کا یہ خیال بھی خام ثابت ہوا کیونکہ 22 جون 1941ء کو یکایک خبر آئی ہٹلر کے طوفانی دستوں نے سٹالن کی اشتراکی دنیا پر دھاوا بول دیا۔ لیکن روس پر حملہ خود جرمنی کو بڑا مہنگا پڑا۔ اب جرمنی ساری دنیا کے خلاف معرکہ آرا ہو گیا۔ اٹلی اس کا حلیف ضرور تھا، مگر اس کی فوجی طاقت جرمنی کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ جاپان بھی اپنے جداگانہ منصوبوں میں الجھا ہوا تھا۔

شروع شروع میں جرمنی کی فوجیں روس کی حد کے اندر دور تک گھستی چلی گئیں مگر یہ سرزمین ان کے لئے نپولین کی فوج کی طرح برفانی قبرستان ثابت ہوئی۔ 1943ء میں جرمنی کی حالت بگڑنے لگی اور ضعف کے آثار پیدا ہو گئے۔ پانچ سال کی مسلسل جنگ نے جرمن عوام کو تباہ کر کے رکھ دیا اور غصے کے جذبات تیزی سے پھیلنے لگے۔ ہٹلر نے ان مخالفتوں کو بھی آہنی بازو کے ساتھ دبانے کی کوشش کی مگر نقشہ پلٹ چکا تھا اور اس کے قویٰ میں اضمحلال آ چکا تھا۔ آخر 1945ء کی ایک صبح اخبارات میں ہٹلر کی موت کی خبر شائع ہوئی اور اس کے چند روز بعد جرمنی دوسری بار اپنے حریفوں کے سامنے ذلت و رسوائی کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

1936ء۔ سپین میں خانہ جنگی

بس اک ثبات ہے تغیرات کو زمانے میں

17 جولائی 1936ء کو خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ فوج کا ایک حصہ اس میں ملوث تھا۔ قوم پرست باغیوں کے ایک گروہ نے فوج کے بڑے حصے کو ساتھ ملا کر حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کی قیادت جنرل فرانکو کر رہا تھا۔ یہ زمانہ تھا جب یورپ میں قوم پرست انتہا پسندوں یعنی فاسشٹوں اور نازیوں کا طوطی بول رہا۔ جنرل فرانکو اور اس کے انقلابی ساتھی چونکہ قومی سربلندی کے داعی تھے اس لئے ان پر نازی فلسفے کا گہرا اثر تھا اور انہیں اٹلی کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی، یہی کہ اٹلی نے پچاس ہزار نفری کی ایک فوج بھی جنرل فرنکو کی اعانت کیلئے روانہ کی۔ ادھر جرمنوں نے بھی فرانکو کی ہر طرح مدد کی۔ جنرل فرانکو نے عوام میں قوم پرستی کے جذبات کو اتنا مشتعل کر دیا کہ جمہوریت و اشتراکیت دونوں فلسفے قوم پرستی کے سیلاب میں بہہ گئے۔ اور وہ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتا چلا تھا۔

تہذیب مغرب کا لنگڑا کھلاڑی:

سیاسی شعور و احساس اور قومی تنظیم و یک جہتی کے لحاظ سے سپین کو یورپ کا سب سے کم تر ملک سمجھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آٹھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلسل آٹھ سو سال کی مدت میں عربوں نے جو عمارت کھڑی کی تھی اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جو ترقی کی تھی وہ تمام عیسائی تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہو گئی۔ 1492ء میں جب آخری عرب تاجدار غرناطہ سے نکلا تو سپین کے ہر گلی کوچے سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نعرے بلند ہونے لگے۔ تنگ نظر عیسائیوں نے اس تعلیمی اور فکری ماحول کو جو مسلمانوں نے پیدا کیا تھا، خلاف عیسائیت قرار دے کر نیست و نابود کر دیا۔ اسلام سے پاک معاشرہ تیار کرنے کیلئے انہوں نے احتسابی عدالیں قائم کی جنھوں نے بے شمار مسلمانوں کو زندہ جلوا دیا یا ایذا رسانی سے ہلاک کیا۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس پر آج بھی یورپ کے مورخ شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ انکوزیشن کا ایک مورخ مسٹر لارنیٹ LAORENT لکھتے ہیں کہ سرکاری دستاویزات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ان عدالتوں نے صرف پہلے سولہ سال ہی میں نو ہزار انسانوں کو زندہ جلوا دیا تھا۔ ابھی غیر سرکاری ریکارڈ کیا کہے گا۔ یعنی آج انسانیت دوستی کے دعوے دار تہذیب مغرب کے لوگ خود اعتراف کرتے ہیں کہ سپین میں مذہب کے نام پر انسانیت پر جو مظالم ڈھائے

تھے ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

انقلاب فرانس اور سپین:

سپین میں اٹھارہویں صدی تک یہی حالات تھے۔ فرانس کا جمہوری انقلاب بھی سپین پر اثر نہ کر سکا اور سپین نے خود کو جہاں پہنچا دیا تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نپولین اعظم کا جب ستارہ اقبال چمکا تو اس نے بڑی آسانی سے سپین پر قبضہ کر لیا اور اپنے بھائی جوزف کو اس پر حکمران بنا دیا۔ ادھر صدی کے آخر میں امریکہ کی نوآبادیوں نے بغاوتیں شروع کر دیں تھیں جو آخرکار انیسویں صدی کے اوائل تک پایہ تکمیل کو پہنچ گئیں اور سپین کے ہاتھ سے سمندر پار کے تمام علاقے نکل گئے۔ ہر جگہ ہسپانوی نوآبادکاروں نے آزاد اور خودمختار حکومتیں قائم کر لیں۔ اس چیز نے سپین کی دولت اور خوشحالی کو ختم کر دیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں بادشاہ کی تخت نشینی کے لئے خانہ جنگی ہوئی جس میں ایک گروہ ملکہ ازابیلا کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا جبکہ دوسرا گروہ ایک بادشاہ کو تاج و تخت کا مالک بنانا چاہتا تھا۔ آخرکار ازابیلا کے حامی جیت گئے۔ مگر اس کی حکومت کو مطمئن نہ کر سکی تاہم یہ ستائیس سال تک حکومت کرتی رہی لیکن اس کے بعد اس کی حکومت نہ چل سکی۔ بغاوت کے آثار نظر آئے۔ ملکہ مذکورہ اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہوگئی۔ مگر نیا بادشاہ بھی حالات پر قابو نہ پا سکا اور عوام نے شاہی کا جوا گردن سے اتار پھینکنے ہی میں نجات کی صورت دیکھی اور بادشاہ کو معزول کر کے ملک میں جمہوریت قائم کر دی گئی۔ لیکن جمہوریت ہو یا بادشاہی مالی وسائل کے بغیر عوام کو کیسے مطمئن کر سکتی ہے؟ اس لئے جمہوریت بھی ناکام رہی۔ عوام میں ابھی اتنی بیداری پیدا نہ ہوئی تھی کہ جمہوری خطوط پر خوشحالی اور سرسبزی کی عمارت کھڑی کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا انہوں نے پھر بادشاہت شروع کر دی۔ اب آئینی بادشاہت کی طرف رجحان ہوا۔ عوام کی ایک منتخب پارلیمنٹ قائم کی گئی اور حکومت کا ایک اساسی دستور ترتیب دیا گیا، لیکن نتیجے میں یہ آئینی بادشاہت بھی محض فریب ثابت ہوئی اور اصل طاقت بادشاہ ہی کے پاس رہی۔

نام کی آئینی بادشاہی:

سپین کی فضا مکر و فریب، حیلہ جوئی، دجل سازی، تخویف پسندی اور رشوت ستانی جیسے افعال کے لئے بہت سازگار تھی۔ یہی وہ حربے تھے جن پر عرب حکومت کے خاتمے کے بعد سے مسلسل عمل کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس آئینی بادشاہت کا ہر شعبہ بھی انہی حربوں کا شکار تھا۔ بظاہر انتخابات ہوتے مگر رائے شماری کے وقت حسب مرضی ووٹ گھٹا یا بڑھا دیئے جاتے تھے۔ جھوٹے اعداد و شمار پیش کرنا، دھمکیاں دے کر اپنی مرضی کے مطابق رائے حاصل کرنا، رشوتوں سے کام لینا، ووٹوں میں گڑبڑ کر دینا۔ غرض فریب کاری اور جعلسازی کی جتنی شکلیں ممکن ہو سکتی تھیں وہ سب بے دریغ استعمال کی جاتی تھیں۔ عوام کے پاس اس کرپشن کو ختم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لئے ایک عرصہ یہی حالات قائم رہے۔ جب 1914ء کی جنگ شروع ہوئی تو سپین غیر جانبدار رہا۔ اسی غیر جانبداری نے اسے بہت فائدہ پہنچایا۔ سامان جنگ اور سامان خورد و نوش کے لئے دونوں فریق اس کے گاہک تھے۔ اس صورت حال سے سپین کو صنعتی طور پر بہت فائدہ پہنچا۔ بیسوں نئے کارخانے کھل گئے اور ملک سے بے روزگاری ختم ہوگئی۔ یورپ بھر کو اشیاء برآمد کی جانے لگیں۔

جنگ عظیم کے بعد:

لیکن یہ خوشحالی کا دور عارضی ثابت ہوا اور جیسے ہی جنگ ختم ہوئی تو ایک دم بے روزگاری بڑھ گئی اور کارخانے ختم ہو گئے۔ بے روزگاری کے نتیجے میں ملک میں ہڑتالوں ہنگاموں کا دور شروع ہو گیا۔

ریف پر حملہ:

بادشاہ الفانسو کافی چالاک تھا لیکن اس کے پاس ان شورشوں کو دبانے کے لئے وسائل نہ تھے۔ اس لئے اس نے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے ایک نئی چال چلی۔ 1919ء میں مراکش میں غازی عبدالکریم نے سپین کے خلاف بغاوت کر کے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ شاہ الفانسو نے سوچا ان مسلمانوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ کا اعلان کر کے سپین میں ہونے والی ہڑتالوں اور ہنگاموں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے، چنانچہ اس نے صلیبی جنگ کا بگل بجا دیا اور انجیل کے نام پر ریف "مراکش کے "بے دینوں" کے خلاف سپین کے نوجوانوں کو میدان میں آنے کے لئے للکارا۔ الفانسو کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور سپین کے نیم جاہل عوام مذہب کے نام پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ 1921ء میں ریف پر یلغار کی گئی، مگر تمام سامان حرب موجود ہونے کے باوجود سپین کو شکست ہوئی دس ہزار سپاہی قتل ہوئے اور چودہ ہزار قیدی بنا لئے گئے۔ سپین کے کمانڈر نے خودکشی کر لی تمام سامان حرب ریف کے مجاہدوں کے قبضے میں آ گیا۔

یہ شکست اتنی ہولناک تھی کہ سپین کا بچہ بچہ چیخ اٹھا اور الفانسو کی مخالفت میں ہر طرف آوازیں اٹھنے لگیں۔ بادشاہ نے عوام کو خاموش کرنے کے لئے شکست کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن قائم کیا۔ مگر عوام ان حیلوں سے مطمئن نہ ہو سکے اور بادشاہ کو اپنے تاج و تخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ری ویرا REVERA نامی ایک راہنما سپین کی عوام میں بہت مقبول ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ طے کیا کہ ری ویرا کو ڈکٹیٹر بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس کی آمریت کا رستہ ہموار کرنے کے لئے وزیر جنگ کو استعفیٰ دلوایا۔ وزیر خارجہ پر دباؤ ڈال کر ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا، حیلوں سے کام لے کر پارلیمنٹ کے اجلاس کے ملتوی کرا دیا۔ ان حالات میں قدرتا ری ویرا کو حکومت کے جزو کل پر چھا جانے کا موقع مل گیا۔ آخر 14 ستمبر 1923ء کو ری ویرا نے اپنی آمریت کا اعلان کر دیا اور بادشاہ نے سارے اختیارات اس کو سونپ دیئے۔ مگر یہ عمل ظاہراً اس طرح سٹیج ہوا کہ عوام سمجھے کہ ری ویرا نے خود اپنی طاقت سے بادشاہ کو مجبور کر کے یہ عہدہ سنبھالا ہے۔

ری ویرا:

ری ویرا کا پورا نام پرانمو ڈی ری ویرا تھا۔ وہ 1870ء میں پیدا ہوا۔ میڈرڈ میں فوجی تربیت حاصل کر کے وہ بذات خود مراکش کی جنگ میں شریک ہوا تھا۔ اسکے صلے میں اسے لیفٹیننٹ کا عہدہ دیا گیا۔ وہ فطرتاً بہادر اور اولوالعزم انسان تھا۔ جب الفانسو نے ڈرامائی انداز سے وزیر خارجہ اور وزیر جنگ کو میدان سے ہٹایا تو اس نے میدان خالی پا کر اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر حکومت پر قبضہ کر لیا اور چند ہی دن میں سپین کا مسولینی بن گیا۔ ری ویرا نے بھی مسولینی کے فسطائی اصولوں پر کار بند ہونا چاہا، لیکن فرق صرف یہ ہوا کہ اطالوی عوام کی طرح ہسپانوی عوام نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اس طرح وہ مسولینی

[illegible] حکمران رہا مگر اس دوران اس کی حکومت نہ تو داخلی [illegible]
[illegible] سات سال تک [illegible] کے تحت جرمنی کو لیگ آف نیشنز [illegible]
[illegible] 1926ء میں جب لوکارنو پیکٹ [illegible] منظور نہ ہو سکا۔ ری ویرا نے اپنے [illegible]
[illegible] مگر اس کا یہ مطالبہ [illegible] کے قریب ایک چھوٹا سا علاقہ طنجہ انٹرنیشنل قرار دیا [illegible]
[illegible] جبرالٹر [illegible] البتہ فرانس سے اتحاد کر کے اس نے غازی عبدالکریم [illegible]
[illegible] بھی اس کے حق میں مضر ثابت ہوئی۔ اب سپین کے [illegible]
[illegible] یہ پیچ [illegible] جلی اور عیش پرستی کے ان مجسموں کو برداشت کرتے۔ چنانچہ
[illegible] قرار دینا چاہا تو ملک میں ہنگامہ آرائی ہوئی اور بالآخر [illegible]

[illegible] اور بادشاہ نے ری ویرا سے استعفیٰ مانگ لیا۔ بادشاہ [illegible]
[illegible] 1929ء [illegible] کے تمام ذرائع استعمال میں لانے [illegible]
[illegible] ہر طرف شورش برپا تھی اور سخت گیری و تشدد [illegible]
[illegible] جا رہے تھے۔ جمہوریت پسندوں کی ایک جماعت نے فیصلہ کیا کہ
[illegible] پر فوجی دھاوا بول دیا جائے۔ لیکن اتفاق سے یہ راز افشا ہو گیا اور حکومت نے
[illegible] 28 اکتوبر کی بجائے 15 دسمبر مقرر ہوئی، مگر کچھ انقلابی اپنے جوش پر قابو
[illegible] پہلے انقلاب کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اس چھوٹی سی باغی جماعت کو بڑی آسانی سے
[illegible] جائے گئے۔ اس واقعہ نے سب کے حوصلے پست کر دیئے اور سارا انقلاب
[illegible] 15 دسمبر کو ایک طرف سے دارلحکومت میں فوجیں داخل ہوں گی اور دوسری طرف سے
[illegible] کے حد سے بڑھے ہوئے جوش نے کام خراب کر دیا۔ جتنے جمہوریت پسند تھے وہ سب
[illegible] اور میڈرڈ کا قید خانہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جیل بن گیا۔

جمہوریت کا قیام

[illegible] ملک کے طول و عرض میں ایک کہرام مچ گیا اور جگہ جگہ بغاوتیں ہونے لگیں ادھر جیل میں بھی راہنما
[illegible] فائدہ اٹھایا کہ انہوں نے ایک سیاسی پروگرام بنایا جو ''جیل پروگرام'' کے نام سے
[illegible] جمہوریت پسندوں کو بڑی اکثریت حاصل ہوئی جب پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد ہوا تو سب
[illegible] چنانچہ 13 اپریل 1930ء کو فیصلہ کیا گیا کہ ملک سے آئینی بادشاہت ختم کی جائے
[illegible] بادشاہ کے متعلق طے ہوا کہ اسے قتل تو نہ کیا جائے البتہ جلاوطن کر دیا جائے اور
[illegible] نکل گیا۔

[illegible] انقلاب کی خبر ہوئی تو حیرت میں رہ گئی کہ اتنا بڑا تغیر اور اس قدر امن سے پایہ تکمیل تک پہنچ
[illegible] ہوئے کہ کہیں مقابلے کی نوبت نہ آئی۔ فوج پہلے ہی باغی تھی، اس لئے

حکومت میں فوج بھی نہ آئی ادھر انقلابی جماعت برسر اقتدار آئی تو اس نے بھی انتقامی کارروائی نہیں کی اور بادشاہ کے بڑی تکریم سے سپین سے جانے دیا۔ البتہ اہل کلیسا کی شامت آ گئی۔ اہل کلیسا جو بادشاہ کے دست و بازو بنے تھے عوام کے مقابلے میں بادشاہ کا ساتھ دیتے تھے۔ دو سو سے زائد گرجا گھر جلا کر خاک کر دیئے گئے۔ عجیب انقلاب تھا جہاں کلیسا اور اہل کلیسا کبھی حکمران تھے آج انتقام کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ پاپائیت جو کل بادشاہ کے بعد حکمران تھی اس کی ہر پناہ گاہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی البتہ یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ کسی پادری کی جان نہیں لی گئی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ خفیہ طور پر پادری بھی اس تحریک سے وابستہ تھے۔ نئی جمہوری حکومت نے نیا جمہوری آئین ترتیب دیا جس میں آئین انگلستان اور آئین جرمنی کی تقلید کی گئی تھی۔

کلیسا اور جمہوریت:

آئین کی ترتیب کے بعد کلیسا سے جھگڑا چلا۔ کلیسا چاہتا تھا کہ اس کے اقتدار کو تسلیم کیا جائے لیکن جمہوریت اس کے لئے تیار نہ تھی۔ بہر حال بڑی رد و قدح کے بعد ایک معاہدہ طے پایا کہ پادری سیاست میں دخل انداز نہیں ہوں گے اور گرجا گھروں میں مذہبی رسومات کی ادائیگی تک محدود رہیں گے نہ ہی ارباب کلیسا کو ملک کی تعلیم میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی۔ نہ ہی حکومت کی طرف سے کسی جاگیر اور حکومت کے حقدار نہ ہوں گے۔ عیسائیوں کا یسوعی فرقہ JESUITS جس کے ارکان عملی سیاست و اقتدار میں حصہ لینے کے خواہاں تھے یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکے۔ ان کے احتجاج پر اس جماعت کو کالعدم قرار دیا گیا اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح سپین سے بھی نکال دیا گیا۔

صوبوں کی خود مختاری:

اس سمجھوتے کے بعد ملک میں ایک حد تک امن و سکون کی فضا بحال ہوگئی۔ لیکن کلیسا چونکہ اس سے مطمئن نہ تھا اس لئے ہر موقع کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اس وجہ سے انتشار کی حالت پوری طرح ختم نہ ہو سکی اشتراکیت پسندوں اور مزدور انجمنوں سے بھی جمہوریت کو سخت مقابلے کا سامنا تھا چنانچہ 1934ء میں سخت بلوے ہوئے اور جگہ جگہ ہڑتالیں کی گئیں اور مزدوروں کے جلوس نکالے گئے ادھر سپین کے دو صوبے باسک اور کے ٹولونیا میں خود مختاری کی تحریک نے زور پکڑ لیا یہ صوبے اپنی الگ معاشرت اور تہذیب کی بنیاد پر ہمیشہ سے اپنی الگ حیثیت کے دعوے دار تھے۔ ریویرے نے انہیں سختی سے دبا دیا تھا۔ جب اس کی آمریت ختم ہوئی تو علیحدگی پسندی کے جذبات ان صوبوں میں دوبارہ ابھر آئے۔ اگرچہ جمہوریت پسندوں نے آئین ترتیب دیتے ہوئے ان صوبوں کی خود مختاری کا خاص خیال رکھا تھا، مگر اس سے یہ مطمئن نہ ہوئے تھے۔ ان مشکلات کا حل یہ تھا کہ کم از کم کسانوں کو مطمئن کر دیا جاتا۔ چونکہ سپین اس وقت تک ایک زرعی ملک تھا۔ اس لئے کسانوں کی ہمدردی جمہوریت کے لئے بڑی اہم ثابت ہو سکتی تھی مگر ان کے لئے جاگیرداروں سے دشمنی مول لینا پڑتی تھی [illegible] افراد نے سمجھوتوں کے باوجود حکومت کے خلاف ایک طاقتور محاذ بنا لیا جس میں مراکش کے عرب بربروں کو بھی شامل کر لیا گیا۔

[illegible] کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن بے چینی کی آگ اندر ہی
[illegible] اس بغاوت کا مرکزی راہنما جنرل فرانکو تھا۔ اس کو
[illegible] GENERAL FRANCISCO FRANCO تھا۔ (1822-1975ء) 1910ء
[illegible] جہاں مشہور بربر قبیلے "ریف" کے سردار عبدالکریم کو اس
[illegible] اکیڈمی آف ملٹری میں خدمات انجام دیں۔
[illegible] 1927ء [illegible] 1931ء تک سارا گوسا [illegible] جمہوری حکومت قائم ہوئی تو اس نے ہٹلر اور مسولینی کے نقش
[illegible] کے ساتھ حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ تین سال کی مسلسل خانہ
[illegible]

[illegible]

[illegible] ستمبر 1939ء میں دوسری عالمگیر جنگ کا طوفان امڈ پڑا۔ یہ موقع
[illegible] ہٹلر اور مسولینی کے احسانات تھے۔ جن کی وجہ سے وہ سپین کا ڈکٹیٹر بنا تھا
[illegible] کی حالت اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ وہ جنگ میں شامل ہو کر ان کا احسان چکانے کے
[illegible] کا فیصلہ کیا۔ لیکن اپنے دوستوں کی اخلاقی طور پر جو مدد ہو سکتی
[illegible] فرانس اور روس نے فرانکو کو گرانے کے لئے اندرونی اور بیرونی
[illegible] 1946ء میں صورتحال یہ ہوئی کہ برطانیہ کی کوششوں سے اس کی مخالف قوتیں منظم ہونے لگیں
[illegible] کی صورت میں شاہی کو واپس لانے کو تیار نہیں تھا۔ اسی طرح فرانس کے
[illegible] برطانیہ کا رویہ [illegible] تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فرانکو کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے
[illegible] کر لیا جائے، لیکن اختلاف کے باوجود فرانکو کی طاقت کو توڑ دینے میں
[illegible] تھے۔

27 فروری 1946ء کو فرانس نے اپنی جنوبی سرحد کو سپین پر بند کر کے فرانکو کے مخالف عناصر کو شہ دی، جس کے نتیجے
[illegible] ایک طاقت ور جدوجہد شروع ہو گئی اسی اثناء میں ڈان جون نے تخت کا دعویٰ پیش
[illegible] لیکن جرمنوں کی ایک بڑی تعداد کو پناہ دے دی اور اتحادیوں کے مطالبے
[illegible] 1946ء [illegible] سان فرانسسکو کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ سپین کو انجمن اقوام متحدہ کا رکن نہ بنایا جائے
[illegible] سپین کی عوام سے اپیل کی کہ جنرل فرانکو کو ملک سے باہر نکال دیا جائے،
[illegible] 1947ء میں جنرل فرانکو نے اعلان کیا کہ سپین میں بادشاہی قائم کی
[illegible] انتخاب پر موقوف تھا۔ جس جمہوری گروہ نے فرانکو سے پہلے سپین میں
[illegible] ملک سے نکال دیا تھا لیکن اس نے اپنی حکومت باہر بھی قائم رکھی تھی۔ 1947ء میں

ہوگئی۔ جو شاہ پسند فرانکو کے مخالف باہر بیٹھے تھے انہوں نے فرانکو کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ستمبر 1949ء میں
اردن نے سپین کا دورہ کیا۔ لاطینی امریکہ کے زیر اثر اقوام متحدہ میں وہ قرار داد منسوخ ہوگئی جس کے مطابق
حکومت کو انجمن اقوام متحدہ سے خارج کیا گیا تھا۔ اس طرح نومبر 1950ء میں سپین پر اقوام متحدہ کی رکنیت کے
کھل گئے۔ 3 مئی 1945 کو پرتگال کی حکومت نے ہٹلر کی موت کا سوگ منایا تھا، لیکن چونکہ جرمنی اور اٹلی کی
دوران ملک حالات بدل گئے تھے اور عوام کو زیادہ آزادی مل گئی تھی۔ ستمبر 1950ء میں جنرل فرانکو نے اور
پرتگال نے دونوں ملکوں کے اتحاد پر زور دیا۔ 31 مارچ 1947ء کو جنرل فرانکو نے ملک میں نیا آئین نافذ کیا۔
کی رو سے وہ تاحیات سربراہ مملکت بنا دیا گیا۔ ایک ریفرنڈم کے ذریعے یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ فرانکو کے بعد
بحال ہو سکتی ہے۔ یہ فیصلہ اس نے عالمی تنقید سے بچنے کے لئے کیا تھا۔ فرانکو نے کمیونسٹ ممالک کی کھل کر
مخالفت کی جس کی وجہ سے امریکہ نے مغربی یورپ میں سپین کو مضبوط بنانے کے لئے اقدامات کئے۔ 1953ء میں
امریکہ نے ایک دس سالہ فوجی اور اقتصادی معاہدے پر دستخط کئے۔ چنانچہ فرانکو نے امریکہ کو سپین میں فوجی اڈے
بنانے کی اجازت دے دی بدلے میں امریکہ نے اسے ایک ملین ڈالر کی امداد دی۔

1950ء اور 1960 کی دہائی میں سپین نے اقتصادی طور پر بے حد ترقی کی۔ ملک میں آٹو موبائل، کنسٹرکشن، اور
انڈسٹری عروج پر پہنچ گئی اور سیاحت صنعت کا درجہ حاصل کر گئی۔ 22 جولائی 1969ء کو فرانکو نے ایک سابقہ شاہ
کے پوتے شہزادہ جان کارلوس کو اپنی موت کے بعد بادشاہ بنانے کی وصیت کی۔ پارلیمنٹ نے بھی اس کی منظوری
دے دی۔ جون 1973ء میں فرانکو نے وزارت عظمیٰ کے عہدے پر لوئس کیرو بلانکو کو فائز کیا، مگر باسک قوم پرستوں نے
اسے بم دھماکے میں ہلاک کر دیا۔ 29 دسمبر کو کارلوس آریاس نیوارو کو وزیر اعظم مقرر کیا جس نے سیاسی آزادی کا وعدہ
کیا۔ 20 نومبر 1975ء کو فرانکو نے 83ء سال کی عمر میں وفات پائی۔ 22 نومبر کو بادشاہت بحال کر دی گئی اور شہزادہ
جان کارلوس تخت نشین ہوگیا اور آئینی بادشاہ بن گیا۔

......☆......

شام نئی گرفتاری، نئی بیداری اور نئے تغیرات

شام 1941ء

1939ء میں شروع ہونے والی جنگ عظیم دوم بعض وجوہات کی بناپر شام کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی کیونکہ شام پر قابض فرانس کو جب جرمنی سے پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تو 16 ستمبر 1941ء کو فرانس کی قابض افواج نے شام کو جمہوریہ قرار دے دیا اور اس کے ساتھ ہی شام نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ عراق کے مقابلے میں شام میں عربوں کو آزادی کے لئے بہت جدوجہد کرنی پڑی۔ جنگ عظیم اول سے پہلے شام بھی سلطان ترکی کے ماتحت تھا۔ جنگ عظیم اول کے دوران اتحادیوں نے یہاں کے باشندوں کو بھی یقین دلایا تھا کہ اگر وہ ترک شہنشاہیت کو توڑنے میں اتحادیوں کا ساتھ دیں گے تو اختتام جنگ پر ان کی کامل آزاد حکومت تسلیم کر لی جائے گی۔ آزادی وخود مختاری کے سہانے خوابوں نے عربوں میں وہ تمام جذبات بغاوت و انقلاب ابھار دیے جو ترکی کی حکومت کے خلاف ان کے دلوں میں ایک عرصے سے پرورش پا رہے تھے۔ جنگ کے آغاز کے وقت ترکوں کا اندازہ تھا کہ وہ دس لاکھ سپاہی میدان جنگ میں لا سکیں گے۔ اس تعداد میں نصف کے قریب عرب بھی شامل سمجھے گئے تھے مگر جب عربوں نے اپنی آزادی اور خودمختاری کے خوابوں کی وجہ سے علم بغاوت بلند کیا تو چار لاکھ سے زائد عرب سلطان ترکی کی اطاعت سے منحرف ہو کر اتحادیوں کے جھنڈے تلے آ گئے۔ ایک مغربی مورخ نے لکھا کہ عرب بغاوت کی وجہ کسی نہ کسی حد تک یہ ضرور تھی کہ وہ ترکوں سے نفرت کرتے تھے لیکن زیادہ تر اس کی وجہ آزادی و خود مختاری کی وہ توقعات تھیں جو اتحادیوں کے اور خصوصاً برطانیہ کے پروپیگنڈے سے ان میں پیدا ہو گئی تھیں۔

خفیہ معاہدہ

اگرچہ بظاہر برطانیہ اور فرانس یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ جنگ کے خاتمے پر عرب ممالک کو آزاد کر دیا جائے گا لیکن اندرونی طور پر یہ یورپی سامراجی باہمی طور پر سائکس پکاٹ کے نام سے ایک خفیہ معاہدہ کر چکے تھے جس کی رو سے یہ طے پا گیا تھا کہ:

1. فلسطین کے علاقے کو بین الاقوامی بنا دیا جائے گا۔ یورپ کی سب حکومتیں یا برطانیہ اور فرانس دونوں مل کر اس پر تسلط رکھیں گی۔
2. شام کا ساحلی علاقہ فرانس کے زیر انتداب رہے گا۔
3. حیفہ (فلسطین) بندرگاہ اور بغداد اور بصرے کے علاقے خلیج فارس کے ساحل تک برطانوی اقتدار میں رہیں گے۔

...ں شام کے شرق کا علاقہ حلب اور دمشق سے لے کر موصل تک آزاد عرب ریاست بنا دیا جائے گا۔ لیکن اس ...یاست" کے جنوب میں برطانیہ کا اثر و نفوذ رہے گا اور یہاں کی حکومت کو برطانیہ ہی سیاسی مشیر فراہم کرے گا ...عرب شمال کے علاقے پر فرانس یہی حق رکھے گا۔

...کے راز:

روس کو اس خفیہ معاہدے کا کوئی علم نہ تھا۔ عرب بغاوت کے راہنما شریف حسین مکہ سے مصر کے ہائی کمشنر ہنری ...ن نے یہ وعدہ کیا تھا کہ شریف حسین نے اپنی عرب سلطنت کی جو حدود متعین کی ہیں ان کی آزادی کو تسلیم کر لیا ...اور عربوں کی جنگ آزادی میں شریف حسین کی مدد کی جائے گی۔ ادھر شریف حسین نے عدن کا عرب علاقہ ...قبضے میں رہنے دینا تسلیم کیا تھا، نیز بصرہ، بغداد اور حلب و بیروت کے اضلاع بھی اتحادیوں کے مفاد کی وجہ سے ...کے تسلط میں رہنے تھے۔ مگر اتحادیوں نے سرزمین عرب کی جو تقسیم 1915ء میں طے پانے والے سائیکس پی ...معاہدے کے تحت کی تھی اس کا وہم و گمان بھی شریف حسین کو نہ تھا۔ 1917ء میں جب انقلاب روس آیا اور زار کی ...شاہت ختم ہو کر اشتراکی حکومت قائم ہوئی تو نئی کیمونسٹ حکومت نے اتحادیوں کا پرانا ساتھی ہونے کی وجہ سے برطانیہ اور ...میان عرب دنیا کے متعلق طے پانے والا یہ خفیہ معاہدہ بے باکانہ طور پر شائع کر دیا۔ اسی سال برطانیہ کے وزیر خارجہ بالفور نے فلسطین کے بارے میں اعلان کیا کہ اسے یہودیوں کا قومی وطن بنایا جائے گا۔ ان چیزوں سے عربوں میں ...ب پیدا ہو جانا قدرتی امر تھا۔ نومبر 1918ء میں فرانس اور برطانیہ نے ایک مشترکہ اعلانیہ جاری کیا جس میں عربوں ...کرنے کے لئے یہ کہا گیا کہ دونوں ممالک عربوں کی آزادی میں دست اندازی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

...یاسیات کے داؤ پیچ سے ناواقف عرب اس قسم کے جھوٹے وعدوں پر یقین کر کے مطمئن ہو گئے۔ جب التوائے ...کا اعلان ہوا تو عرب سمجھے کہ اب عرب آزاد ہونے والے ہیں مگر اشتراکی روس نے اتحادیوں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اگرچہ ...فوج عراق میں حکومت کر رہی تھی مگر پھر بھی عرب سمجھے کہ جب حالت جنگ ختم ہو جائے گی تو پھر وعدے پورے کر ...یے جائیں گے۔ لیکن جب مصر کو صلح کانفرنس میں نہ بلایا گیا اور نہ برطانوی تسلط ہٹایا گیا تو عربوں کی آنکھیں کھلنا شروع ...۔ صلح کانفرنس میں عرب دنیا سے صرف نمائندہ حجاز کو دعوت دی گئی تھی وہ بھی شریف حسین مکہ کے بیٹے فیصل کو بلایا گیا ...سارے عرب کی آزادی پر شام کی حکومت مل جانے کو غنیمت سمجھتا تھا۔ 9 نومبر 1918ء کو برطانیہ اور فرانس کا مشترکہ ...شائع ہوا کہ برطانیہ اور فرانس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ترکوں کے پنجہ استبداد سے عربوں کو نجات دلائی جائے ...ان علاقوں کا نظم و نسق بھی وہیں کے باشندوں کی مرضی کے مطابق ہو۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ نہر سویز پر کس کا قبضہ ہوگا؟ ...بندرگاہوں پر کون قابض ہوگا؟ بصرہ و بغداد کے ہوائی مستقر کس کے قبضے میں ہوں گے وغیرہ وغیرہ یا عراق کے ...کے کنویں کس کے تصرف میں ہوں گے؟

انتداب یا منڈیٹ:

جب یہ سوالات سامنے آئے اور برطانیہ فرانس کے مفاد خطرے میں پڑتے نظر آئے تو سارے اعلانات اور وعدے ...کرہ ہوا میں غائب ہونے لگے۔ بڑے غور و خوض کے بعد منڈیٹ MADATE یا انتداب کی نئی اصطلاحات وضع

کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ علاقے جو ترکی یا جرمنی سے آزاد ہو گئے ہیں اور وہاں کی عوام حکومت کا نظم ونسق چلانے کے قابل نہیں ہیں اور وہاں اپنے علاقوں کو ترقی یافتہ قوموں کی سرپرستی میں دے دیا جائے تا کہ وہ انہیں تہذیب کی مقدس امانت کے طور پر محفوظ رکھیں اور انجمن اقوام متحدہ کی طرف سے ان پر حکومت کریں گویا کہ نو آبادیات نظام کی تجدید کی گئی۔ اس انتداب کے سلسلے میں عربوں کے متعلق خاص طور پر یہ طے کیا گیا کہ عرب عوام کے مشورے کے بغیر کسی قوم کا انتداب زبردستی ان پر ٹھونسا نہ جائے گا۔

آخری شرط کی رو سے ''نیم مہذب'' عربوں کو کم از کم یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی ''سرپرست'' طاقت کا خود انتخاب کریں۔ چنانچہ عربوں کی یہ خواہش معلوم کرنے کے لئے ایک کمیشن بھیجنے کا فیصلہ ہوا مگر فرانس نے اس کمیشن کے ساتھ اشتراک عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں یہ منصوبہ پیدا ہونے سے پہلے ہی کھٹائی میں پڑ گیا۔ اب اتحادیوں نے انتداب کا فیصلہ خود کرنے کا فیصلہ کیا، مگر یورپ کے معاملات کو پہلے نمٹانے کو ترجیح دی گئی، جس کی وجہ سے عراق و شام پر فوجی حکومتیں قائم رہیں۔ التوائے جنگ کے دو سال بعد 1920ء میں جب یورپ کے معاملات نمٹ گئے تب کہیں جا کر اعلان کیا گیا کہ عراق پر برطانیہ کا انتداب رہے گا اور شام کا ساحلی علاقہ جس میں لبنان شامل تھا فرانس کے زیر تسلط رہے گا۔ لیکن شام سے فلسطین اور اردن کے علاقے کاٹ دیئے جائیں گے اور ان علاقوں پر برطانوی تسلط ہو گا۔ شریف حسین کو سلطان حجاز بنایا جائے گا جبکہ اس کے بیٹے عبداللہ کو عراق اور فیصل کو شام کا سلطان بنایا جائے گا۔

پیرس کی ''صلح کانفرنس'' میں فیصل نے بہت شور مچایا کہ فلسطین کو شام سے علیحدہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس نے یہ بھی کہا کہ جہاں تک یہودیوں کے مفاد کا تعلق ہے ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ ان کو تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ اس امر پر بھی زور دیا کہ عرب جس خطے کا نام ہے اس میں حجاز سے لے کر شام و فلسطین اور عراق بھی شامل ہیں۔ لیکن صلح کانفرنس کے اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سن سکتا تھا۔ پھر فیصل انگریزی اور فرانسیسی بول سکتا اور وہ یورپی گھاگوں کے مقابلے میں الفاظ کی جنگ جیت سکتا تو شاید کوئی فائدہ پہنچ سکتا مگر فیصل کی گفتگو تو لارنس آف عریبیا کی ترجمانی کے ذریعے اہل یورپ تک پہنچتی تھی لہٰذا یہ سب بے ثمر رہا۔

غرض مذکورہ بالا فیصلے کے مطابق شام کے ساحل پر فرانس کا قبضہ ہو گیا اور شام کے اندرونی علاقے میں فیصل کو حاکم بنا دیا گیا۔ فلسطین کو یہودیوں کیلئے کھول دیا گیا تا کہ اسے وہ اپنا قومی وطن بنا سکیں۔ ادھر بصرہ و بغداد پر برطانیہ نے اپنا تسلط جما لیا۔

شام پر فرانس کی فوج کشی:

لیکن فرانس صرف شام کے ساحلی علاقے پر اکتفا کرنے والا نہیں تھا وہ پورے شام پر غلبہ چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ صلیبی جنگوں کے زمانے سے شام پر فرانس کا حق ہے اور اس کے علاوہ فرانس نے شام میں بہت سی سرمایہ کاری کی ہوئی تھی اور شام میں جو عیسائی بھی بستے تھے، فرانس صدیوں سے ان کا محافظ چلا آ رہا ہے اور اب بھی وہ اس فرض سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ مگر ان دعووں کے علاوہ شام کی فوجی، سیاسی و اقتصادی اہمیت کی وجہ سے اس پر قبضہ کرنے کا خواہاں تھا۔ مگر چونکہ برطانیہ نے امیر فیصل کو دمشق میں تخت نشین کر دیا تھا اس لئے امیر فیصل کے خلاف اس نے شام کی عوام کو ابھارنا شروع کر دیا اور آخر

1920ء میں یہ بہانہ بنا کر کہ امیر فیصل کی حکومت منصفانہ نہیں اور اس میں سیاسی ابتری و بدنظمی پھیلی ہوئی ہے فرانس [illegible] ہوئی دمشق میں داخل ہو گئیں اور امیر فیصل کو معزول کر کے تمام شام پر قبضہ کر لیا۔ شام کے باشندے پہلے ہی غیر مطمئن تھے فرانس کے قبضے کے بعد ان میں زبردست اضطراب پیدا ہو گیا۔ شامیوں کو فرانس سے سال ہا سال یہ شکایت رہی تھی کہ شام میں جو تھوڑی سی عیسائی آبادی تھی فرانس نے ہمیشہ اسے اکسا کر ملک کی سیاست میں دراندازی کی تھی اس کے علاوہ فرانس کا ایک نہایت مذموم اصول حکومت یہ تھا کہ وہ اپنے مقبوضات کے باشندوں کے دل سے بغاوت اور آزادی کے جذبات کو ختم کرنے کے لئے انہیں اپنی تہذیب و معاشرت میں رنگ لینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اسی اصول کے تحت اس کی ایک کوشش یہ تھی کہ ان لوگوں کی زبان کو خام قرار دے کر فرانسیسی زبان عام کر دی جاتی۔ علی ہذا القیاس ان کی تمام تمدنی خصوصیات کو تباہ کرنے کی سعی بھی کی جاتی۔ اس کا یہ حربہ بیسویں صدی کے آغاز سے استعمال ہو رہا تھا۔ انہیں وجوہات کی وجہ سے شام کی عوام فرانس سے متنفر تھے اور اگر انتداب کے اصول کو مان لیتے تب بھی برطانیہ کے انتداب کو پسند کرتے۔ لیکن شامیوں کے جذبات و احساسات کے خلاف وہاں فرانس کی حکومت قائم ہو گئی، مگر شامی اس حکومت کو قبول نہ کر سکے اور فوراً ہی ہر طرف بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ ان بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے جتنی سختیاں تھیں شامی عوام پر کی گئیں۔

شام پر فرانس کا یہ قبضہ صلح کانفرنس کے فیصلوں کی کھلی خلاف ورزی تھی، لیکن فاتح اقوام میں سے کسی نے فرانس سے باز پرس نہیں کی۔ آخر دو سال بعد انجمن اقوام متحدہ نے صلح کانفرنس کے فیصلے کے خلاف شام پر فرانس کا انتداب تسلیم کر لیا۔ لیکن انجمن اقوام کے فیصلے کے باوجود شام کے عوام فرانسیسی اقتدار کے خلاف بغاوت کرتے رہے۔ شام کی ایک مشہور شخصیت امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ فرانس نے ستر ہزار مسلح فوج اہل شام کو مرعوب کرنے کے لئے بلا رکھی تھی، لیکن عوام کی حریت پسندی اس فوج کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی اور وہ برابر فرانس کے خلاف نبرد آزما رہے۔

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی یورپی پالیسی کے مطابق شام سے اردن اور فلسطین کے ٹکڑے الگ کر دیئے گئے تھے۔ باقی شام کا رقبہ ساٹھ ہزار مربع میل رہ گیا جسے مزید پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا یعنی لبنان، انطاکیہ، اسکندرونہ، جبل الدروز اور دمشق، ہر صوبے کا نظم و نسق جدا، حکومت جدا، بجٹ جدا، یہاں تک کہ جھنڈا بھی جدا اور ان سب کو متحد کرنے والی کوئی چیز تھی تو فرانس کا انتداب۔ شام کی یہ تقسیم مذہبی فرقوں کی بنا پر کی گئی تھی۔ لبنان میں عیسائی زیادہ تھے اس لئے انہیں الگ کر دیا گیا، جبل الدروز میں اگرچہ مسلمان بستے تھے، مگر ان کے عقائد عام مسلمانوں سے مختلف ہیں اس لئے انہیں بھی الگ کر دیا گیا۔ اسکندرونہ میں ترکوں کی آبادی زیادہ ہے اس لیے انہیں نسلی اعتبار سے الگ کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ محض فرانس کے اقتدار کا قائم رکھنے کے لئے کیا گیا تھا تاکہ اس خطے میں نفاق و شقاق کی آگ کو ہوا ملتی رہے اور یہ لوگ بھی فرانس کے خلاف متحد نہ ہو سکیں۔ لیکن ان کے باہمی اختلافات شام کی عوام کے فرانس کے خلاف جذبات پر غالب نہ آ سکے عربوں نے بغاوتوں پر بغاوتیں جاری رکھیں اور فرانس کے لئے اطمینان سے حکومت کرنا ناممکن بنا دیا۔ تاہم ایک عرصہ فرانس گن پوائنٹ اور سنگینوں کی نوک پر یہاں حکومت کرتا رہا۔ مگر جب اس سے بھی کام نہ چلا اور عربوں کا جوش و خروش روز بروز بڑھتا رہا تو 1925ء میں کچھ راہنماؤں کو باہمی سمجھوتے کی غرض سے بلایا گیا مگر جب یہ راہنما ایوان حکومت میں پہنچے تو

... شید کے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

دمشق گولہ باری کی زد میں:

اس بدعہدی اور فریب دہی نے شامی عوام کے جوش میں مزید شدت پیدا کر دی اور ملک میں تشدد اور مار دھاڑ کا بازار گرم ہو گیا۔ ان ہنگاموں پر فرانس نے انتہائی بے رحمی کے ساتھ دمشق پر گولوں کی بارش کی جس کا اندازہ لندن ٹائم کی اس خبر سے ہو سکتا ہے۔ "دمشق ______ ایک عینی شاہد کے مطابق یہاں مسلسل 48 گھنٹے بم باری ہوتی رہی۔ اس کے ساتھ لوٹ مار کا بازار بھی گرم رہا۔ دمشق کی دو شاہراہیں، جو حمیدیہ اور مستقیم کے نام سے مشہور ہیں ان کے درمیان کا علاقہ تباہ ہو گیا خصوصاً مستقیم کی حالت تو نہایت ابتر ہو چکی تھی۔ ان بازاروں میں جتنی دکانیں تھیں سب ٹینکوں مشین گنوں اور بموں سے تباہ کر دی گئیں۔" لیکن فرانس کے اس تشدد کے باوجود بغاوت نہ دب سکی۔ اس لئے چند ماہ بعد سینیگال سے حبشیوں کی فوج بھیجی گئی جس نے شام کے تیس لاکھ نہتے عوام پر جن طریقوں سے ہوا ظلم و ستم روا رکھا جس خطے اور محلے پر شبہ ہوا کہ یہاں باغی چھپے ہوئے ہیں اسے جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ جس شامی پر شبہ ہوا کہ یہ باغیوں سے ساز باز رکھتا ہے اسے گولی مار دی گئی جس کے گھر میں چاہا فوج گھس گئی۔ واہ رے تہذیب مغرب کے انصاف پسندو۔

آزادی کا وعدہ:

اس طرح یہ بغاوت فرو کر دی گئی مگر راکھ کے ڈھیر میں اب بھی چنگاریاں سلگ رہی تھیں اب فرانس کو پالیس تبدیل کرنا پڑی۔ چنانچہ 1926ء میں اعلان کیا گیا کہ ایک نمائندہ مجلس بنائی جائی کی جس کے ارکان عوام میں سے منتخب کئے جائیں گے پھر یہ نمائندے ایک آئین بنائیں گے جس کے مطابق شام کی قومی حکومت کا قیام عمل میں آجائے گا تو پھر شام کے ساتھ فرانس ایک معاہدہ آزادی کرے گا۔ اس اعلان نے شامیوں میں کچھ سکون پیدا کر دیا پھر اس اعلان کے دو سال بعد تک آئندہ کا کوئی پروگرام نہیں پیش کیا گیا، آخر دو سال بعد انتخابات منعقد کرائے گئے اور یہ مجلس معرض وجود میں آئی۔ آئین تیار کیا گیا شامیوں کے تیار کردہ اس آئین میں سرپرست کی کوئی گنجائش نہیں تھی فرانس کو اس پر سخت غصہ آیا اور اس نے سابقہ اعلانات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس آئین کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے بعد شام میں پھر سیاسی بے چینی و اضطراب پھیل گیا۔ مگر اس کے باوجود چھ سال سے زائید عرصہ تک فرانس حکومت کرتا رہا جبر و طاقت کے خلاف شامی عوام مشتعل ہوئے تو فرانس نے ایک معاہدہ مرتب کر کے شامیوں کے سامنے پیش کیا، مگر شامی اسمبلی نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس معاہدے میں شام کے پانچ علاقوں میں تقسیم قائم رکھی گئی تھی اور شام میں فرانس کی فوجی چھاؤنیاں بھی بدستور قائم رہنا تھیں۔ صرف تھوڑے سے داخلی اختیارات شامیوں کو دئے گئے تھے اور ساتھ ہی یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ چار سال بعد انتداب اٹھالیا جائے گا۔

آزادی اور فرانس سے معاہدہ:

اس معاہدے کو نامنظور کر دینے کے سے شام کی تحریک آزادی پرامن طور پر چلتی رہی۔ آخر 1936ء میں فرانس نے ایک دوسرا معاہدہ تیار کیا جس میں فرانس نے شام کی آزادی کو تسلیم کر لیا، اور اسے ایک آزاد جمہوریہ کی حیثیت دے دی لیکن

کی رو سے فرانس اور شام میں دائمی دوستی قائم کر دی گئی جس کے تحت فرانس کی افواج شام میں رہنا تھی۔ دائمی یورپ کی اس عہد کی ڈپلومیسی نے پیدا کیا تھا۔ انطاکیہ اور اسکندرونہ میں ترکوں کی آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے مطالبہ تھا کہ یہ علاقے ترکی کو واپس کیے جائیں فرانس نے ان مطالبات پر ماضی میں بھی کان نہیں دھرے تھے فرانس کو ترکی کے ان مطالبات سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ آخر جولائی 1939ء میں فرانس نے ترکی سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت شام کے یہ زرخیز ترین علاقے ترکی کو واپس کر دیئے گئے۔ ان علاقوں کی واپسی سے شام کی معاشی حالت پر بہت برا اثر پڑا۔ اس لئے شامیوں نے فرانس کے اس فیصلے پر سخت نکتہ چینی کی اور یہ الزام لگایا کہ اس نے ترکی کو خوش کرنے کے لئے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا ہے۔ لیکن شام کی حکومت چونکہ بہت کمزور تھی اس لیے فرانس کے اس فیصلے کو بادل نخواستہ قبول کر لیا گیا۔ مگر دوسری جنگ کے بعد جب شام کی حکومت کو استحکام حاصل ہوا تو دسمبر 1942 میں ان علاقوں کی واپسی کے لئے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔

شکری القوتلی

شام کی آزادی کی جدوجہد میں جن راہنماؤں نے غیر معمولی کردار ادا کیا ان میں شام کے پہلے صدر شکری القوتلی (1891ء۔1967ء) کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا دوران تعلیم استنبول میں عرب نوجوانوں کی ایک خفیہ تنظیم ''جمعیۃ الفتاۃ'' کے قیام میں ان کا حصہ نمایاں تھا۔ 1920ء میں جب فرانس نے شاہ فیصل کو دمشق سے بے دخل کیا تو شام کے جن حریت پسندوں کو گرفتار کیا گیا ان میں القوتلی بھی شامل تھے۔ انہیں سزائے موت بھی سنادی گئی تھی مگر وہ کسی طرح جیل سے نکل بھاگے اور یورپ سے ہوتے ہوئے مصر پہنچے۔ سیاسی قیدیوں کو عام معافی کے بعد شام واپس آگئے اور ایک بار پھر آزادی کی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1923ء میں ایک بار پھر انہیں سزائے موت سنائی گئی لیکن وہ پھر روپوش ہو گئے اور مصر و حجاز میں شام کی آزادی کے لئے کام کرتے رہے۔ اپنی خدمات کی وجہ سے شام کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ مارچ 1949ء میں فوجی انقلاب کے بعد عہدہ صدارت سے سبکدوش کر دیئے گئے۔

1939ء میں شام نے اگرچہ خودمختاری حاصل کر لی تھی مگر فرانس کی بالادستی اب بھی قائم تھی۔ اسی دوران جنگ عظیم دوم چھڑ گئی اور 1941ء۔1944ء تک شام پر برطانیہ کا متحدہ فوجی قبضہ رہا۔ اتحادیوں نے جرمنوں کے خلاف شامی عوام کا تعاون حاصل کرنے کے لئے دسمبر 1941ء میں شام کی آزادی کا اعلان کیا، لیکن اس اعلان کو عملی جامہ پہنانے میں فرانس نے تین سال تک لیت و لعل سے کام لیا۔ بالآخر یکم جنوری 1944ء کو جمہوریہ شام کو مکمل اختیارات منتقل ہو گئے اور 15 اپریل 1946ء کو آخری فرانسیسی دستوں نے شام چھوڑ دیا۔

1943 میں شکری القوتلی پہلے جمہوری صدر منتخب ہوئے۔ 1945ء میں جب فرانس نے شام کی نوآزاد جمہوریہ کو ختم

کرنے کے لئے دمشق پر شدید گولہ باری کی اور شہر پر قبضہ کرلیا اس وقت شکری القوتلی سخت بیمار تھے۔ برطانوی سفیر اس حالت میں ملنے کے لئے آیا اور کہا کہ فرانسیسی فوجیں دمشق میں داخل ہوگئیں ہیں اور اب واپس نہیں جائیں گی لئے آپ فرانس کے ساتھ صلح نامے پر دستخط کردیں یا کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو جائیں۔ شکری القوتلی نے برطانوی سفیر کی تجویز رد کرتے ہوئے کہا "یا تو آپ جارحیت کو روکیں یا پھر میں اپنا پلنگ اٹھا کر میدان جنگ میں جاتا ہوں تاکہ اپنے جانبازوں کے ساتھ جان قربان کردوں"۔

شکری القوتلی کا یہ عزم اور حوصلہ تھا جس نے فرانس جیسی سامراجی طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا اور فرانس کی فوجوں کو شام چھوڑنا پڑا۔

اسرائیل اور عربوں کی پہلی جنگ بھی القوتلی کے عہد میں 1947ء میں ہوئی لیکن اس جنگ میں شام کی فوجیں کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ شام کی ناکامی نے عوام میں شدید بے چینی پیدا کردی جو بالآخر شام میں فوجی انقلاب کا باعث بنی۔

فوجی انقلاب:

اسرائیل سے جنگ کے بعد بھی شام اپنی تاریخ کے انتہائی نازک دور سے گذر رہا تھا۔ 1947ء کے انتخابات میں قوم پرستوں نے اکثریت حاصل کی اور قوم پرست راہنما جمیل مردم بے ملک کے وزیر اعظم چنے گئے۔ 18 اپریل 1948ء کو شکری القوتلی دوسری بار شام کے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن جلد ہی عوام فلسطین کے بارے میں ان کی پالیسی سے بددل ہوگئے 1948ء میں وزیر اعظم جمیل مردم بے نے استعفیٰ دے دیا۔ صدر جب بدلتے ہوئے ملکی حالات پر قابو نہ پاسکا تو اس نے شامی فوج کے کمانڈر انچیف حسنی الزعیم کو مدد کے لئے طلب کیا۔ ادھر خالد الاعظم نے شام کی نئی کابینہ تشکیل دی مگر 30 مارچ 1949ء کو صدر القوتلی اور وزیر اعظم خالد الاعظم کو حسنی الزعیم نے گرفتار کرکے فوجی قیادت کا اعلان کردیا۔ حسنی الزعیم نے اعلان کیا کہ فوجی انقلاب کا مقصد ملک میں پرامن ماحول قائم کرنا اور انتظامی حالات کو بہتر بنانا ہے۔ کمانڈر انچیف الزعیم نے پہلے وزیر اعظیم کا عہدہ خود سنبھال لیا اور 23 جون کو خود ہی صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ اپنے لئے فیلڈ مارشل کا عہدہ پسند کیا۔ مگر ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ

دوسرا انقلاب:

صرف دو ماہ بعد ایک اور فوجی افسر سامی الحاوی نے کرنل الزعیم کو قتل کرکے ایک اور انقلاب برپا کردیا۔ اس فوجی نے بھی وہی بیان دیا کہ ہم ملک میں آئینی حکومت قائم کریں گے اور ملک میں اصلاحات نافذ کی جائیں گی اور ملک کو بحران سے نکالا جائے گا۔ سامی الحاوی خود صدر بن گئے ان کے دور میں ہاشم الاتاشی کو 14 دسمبر 1949ء کو صدر منتخب کیا گیا لیکن 19 دسمبر 1949ء کو ایک تیسرے فوجی افسر کرنل ادیب ششکلی نے حاوی کو قتل کردیا اور 1954ء تک استبدادی انداز میں حکومت کی ادیب ششکلی نے شام میں انتخابات منعقد کرائے مگر تمام سیاسی جماعتوں نے ان کا بائیکاٹ کردیا۔ اس کے بعد فروری 1954ء میں بغاوت پھوٹ پڑی اور کرنل ششکلی کو سعودی عرب میں پناہ لینا پڑی۔ اکتوبر 1949ء میں ایک بار پھر جمہوری و آئینی حکومت قائم ہوگئی۔ ملک میں انتخابات کرائے گئے جن کے بعد اگست 1955ء میں تیسری بار شکری القوتلی صدر منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ مسیحی راہنما فارس الخوری کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا صدر القوتلی نے اس بار ایک

...میں صدارت سنبھالی۔ فوج اگرچہ حکومت سے بے دخل ہو گئی تھی، لیکن اسکی اندرونی و بیرونی سازشیں جاری تھیں
...کہ جب 30 اکتوبر 1956ء کو اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تو شام کوئی موثر قدم نہ اٹھا سکا۔ شام میں ان دنوں قوم
...بعث پارٹی اور کمیونسٹ عناصر زور پکڑ رہے تھے۔ ان حالات میں شام کے اشتراکیت مخالف حلقوں نے جن میں
...شامل تھے اسی کو مناسب سمجھا کہ شام کا مصر سے الحاق کر دیا جائے۔

...سے الحاق اور علیحدگی:

...سے الحاق میں صدر القوتلی کا بڑا ہاتھ تھا۔ یکم فروری 1958ء کو شام اور مصر کا الحاق وجود میں آیا اور شامی حکومت
...صدر قوتلی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ نئی مملکت کو متحدہ عرب جمہوریہ کا نام دیا گیا۔ شام اور مصر کا یہ الحاق
1961ء تک قائم رہا لیکن مصر اس اتحاد سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اس دوران شام کی حکومت پر بعث پارٹی قابض ہو گئی۔
...کی وجہ تھی کہ مصر نے شام کو ایک نوآبادی بنالیا تھا اور شام میں پولیس راج قائم ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں مصر نے شام
...عناصر کی پشت پناہی شروع کر دی تھی جن سے نجات کے لئے شامی عوام نے مصر سے الحاق کیا تھا۔

جمہوریت کی بحالی:

شام کی علیحدگی کے بعد شام میں انتخابات منعقد ہوئے جن میں غیر اشتراکی عناصر کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور
...بعث پارٹی بھی ناکام رہ گئی۔ ان انتخابات نے ثابت کر دیا کہ قوم پرستی اور سوشلزم کے جن نعروں کو عوام کی آواز
...ان کو عوام نے قطعی پسند نہیں کیا۔ جمہوریت کی کشتی اب بھنور سے نکلنے والی ہی تھی کہ......

...اور انقلاب:

8 مارچ 1963ء کو ملک میں فوج کے زیر قیادت ایک اور انقلاب آ گیا۔ یہ بعث پارٹی کا لایا ہوا انقلاب تھا جو مصر کے
...مصر کی طرف سے شام میں اسلامی عناصر کو کمزور کرنے کی کوششوں اور سازشوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا تھا۔

بعث پارٹی (تعارف)

شام کی بعث پارٹی 1940ء میں وجود میں آئی تھی۔ اس کا بانی ایک عیسائی رہنما مائیکل عفلق تھا یہ شخص 1928ء
سے 1933ء تک فرانس میں تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ واپسی پر دمشق میں اسلامی تاریخ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔
1949ء میں جب کرنل الزعیم برسر اقتدار آیا تو عفلق کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اس عہدے سے فائدہ اٹھا کر اس
نے بعث پارٹی کو مضبوط بنا دیا 8 مارچ کو بعث پارٹی برسر اقتدار آئی۔

بعث پارٹی کی حکومت:

شام کے اس انقلاب کا منصوبہ جمال ناصر کے حامیوں نے تیار کیا تھا، لیکن بعث پارٹی کے حامیوں نے قبضہ حاصل

کر لیا۔ انقلابی حکومت نے شروع میں ناصر کے حامیوں کو بھی حکومت میں شامل کر لیا گیا تھا مگر رفتہ رفتہ خالص بعث گروہوں نے ناصر کے حامیوں کو نکال باہر کیا، اور مکمل بعث پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ بعث پارٹی کے دور میں شام کی معیشت کو بھی دھچکا لگا۔ انقلاب سے پہلے شام عرب ملکوں میں خوشحال ترین ملک تھا، لیکن بعث پارٹی میں اقتدار میں آنے کے بعد ابتدائی سات سالوں میں حالات اس کے برعکس ہوگئے۔ شام کے محبِ وطن رہنما ملک چھوڑ کر بیروت میں جلاوطن کی زندگی گذرانے پر مجبور ہوگئے۔ جلاوطنی میں 1967ء میں شکری القوتلی کا انتقال ہوگیا۔ انتقال بیروت کے ایک ہوٹل میں ہوا۔ لیکن انہیں پورے اعزاز کے ساتھ دمشق میں دفن کیا گیا۔

تیسرا بعثی انقلاب:

بعث پارٹی کے اندر اختلاف بڑھتے جا رہے تھے۔ دائیں بازو اعتدال پسند راہنماؤں پر مشتمل تھا۔ اس بازو نے 13 نومبر 1970ء کو بائیں بازو کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور ڈاکٹر نور الدین اتاسی کو ہٹا کر جنرل حافظ الاسد صدر بن گئے۔

صدر حافظ الاسد:

حافظ لاسد شام کے صوبے الاذقیہ سے تعلق رکھتے تھے وہ 1928ء میں پیدا ہوئے اور بعث پارٹی کے دوسرے راہنماؤں کی طرح نصیری تھے جن کو شام میں علوی بھی کہا جاتا ہے۔ حمص کے فوجی کالج میں تعلیم حاصل کر کے وہ 1955ء میں پائلٹ آفیسر ہوگئے۔ مصر اور شام میں الحاق کے دوران قاہرہ میں سکوارڈن لیڈر رہے۔ 1961ء میں شام مصر سے الگ ہوا تو انہیں فوج سے نکال دیا گیا اور وہ پہلے سے بعث پارٹی کی رکنیت اختیار کر چکے تھے۔ 8 مارچ 1963ء کو جب بعث پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو حافظ الاسد شامی فضائیہ کے کمانڈر مقرر کیے گئے۔ 23 فروری 1966ء کو جب پارٹی کے انتہا پسند بازو نے حکومت پر قبضہ کیا تو وہ وزیر دفاع تھے۔ حافظ الاسد کا تعلق اعتدال پسند گروہ سے تھا۔ ان کے اقتدار میں آنے کے بعد شہری آزدیوں پر لگائی گئیں پابندیاں نرم کر دی گئیں۔

......☆......

1945ء ویت نام کا انقلاب اگست

1900ء تک فرانسیسی سامراج اپنے پنجے پوری طرح کمبوڈیا، لاؤس اور ویت نام یا پورے ہند چینی کے علاقے میں گاڑ چکا تھا اس نے اس پورے خطے کو فرانسیسی ہند چینی کا نام دیا تھا۔ اس کا دارلحکومت ہنوئی کو قرار دیا گیا۔ بعدازاں سائیگان جو اب ہوچی منہ سٹی کہلاتا ہے۔ فرانسیسیوں نے ویت نام کے وسائل کو نہایت بے دردی سے لوٹا۔ کمزور اور پتلی اقتصاد یات کے باعث لوگ فرانسیسی حکومت کے دشمن بن گئے۔ اگرچہ فرانسیسی حکومت نے ٹرانسپورٹ، مواصلات، تجارت صنعت کو اس ملک میں فروغ دیا اس کے باوجود دوسری جنگ عظیم سے کچھ عرصہ قبل ویت نام میں آزادی کے لئے بیداری پیدا ہوئی۔ 1920ء کی دہائی میں ویت نام کی قوم پرست جماعتوں نے اصلاحات اور آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا۔

<u>ہوچی منہ:</u>

3 فروری 1930ء کو ایک قوم پرست راہنما ہوچی منہ HOCHI MINH نے انڈوچائنا کمیونسٹ پارٹی قائم کی جس کی بناء پر فرانسیسی حکومت نے اسے جلاوطن کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم میں مشرق بعید میں جاپانیوں کا پلہ بھاری تھا۔ جاپان ہند چینی کے علاقے پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جاپان نے ویت نام پر قبضہ کر کے اسے ملایا کے خلاف فوجی اڈے کے طور پر استعمال کیا۔ جاپانیوں نے فرنچ حکام کو ویت نام میں قیام کی اجازت دی مگر اس شرط پر کہ وہ جاپان کے ماتحت کام کریں گے۔ فرانسیسیوں کے مسلسل جبر و استبداد اور پھر جاپان کی عوام کش پالیسیوں نے بالآخر ویت نام کی عوام میں انقلابی سوچ پیدا کر دی اس دوران جلاوطن رہنما ہوچی منہ نے بائیں بازو کی جماعتوں کو فرانسیسی استعماریت کے خلاف منظم کیا اور کمیونسٹ پارٹی کی بجائے ایک نئی سیاسی جماعت، ویت منھ لیگ کے نام سے قائم کی۔ اس سیاسی پارٹی کا قیام جدوجہد آزادی کے لئے ہوا تھا۔

1941ء میں ویت منہ حریت پسندوں نے شمالی علاقوں پر قبضہ کر کے ایک آزاد حکومت قائم کی۔ اسی دوران دسمبر 1941ء میں جاپان نے تمام ہند چینی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد 1942ء میں ملک کی آزادی کے لے ہوچی منہ کو محاذ حریت کا راہنما چن لیا گیا۔.......

ہو چی منہ HOCHI MINH

ویت نام کا عظیم راہنما اور نظریاتی مفکر اور انقلابی تنظیم ویت منہ کا بانی۔ غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ 1911ء میں ایک فرانسیسی بحری جہاز میں بطور بیرا ملازم ہوا۔ بعد ازاں لندن میں چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کیں۔ 1917ء میں فرانس گیا اور وہاں سوشلسٹ تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ کچھ عرصہ بعد ویت نام واپس آکر فرانسیسی استعماریت کے خلاف کمیونسٹ گوریلا تحریک ویت منہ منظم کی۔ 1945ء میں ویت منہ نے فرانسیسیوں پر حملے شروع کر دیے۔ یہ گوریلا جنگ 9 سال جاری رہی اور بالآخر 7 مئی 1954ء کو فرانسیسیوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ ہو چی منہ شمالی ویت نام کے آزاد کردہ علاقوں کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

19 اگست 1945ء میں ویت منہ نے ہو چی منہ کی قیادت میں ویت نام کی آزادی کے انقلاب کا آغاز کیا۔ یہ انقلاب بعد ازاں انقلاب اگست کہلایا۔ یہ انقلاب دراصل فرانسیسی استعماریت کے خلاف ہونے والے مظاہروں اور بغاوتوں کا دوسرا نام ہے۔

اگست کی پیش قدمی:

9 مارچ 1945ء کو جاپانیوں نے فرانسیسی حکام کو گرفتار کر کے شہنشاہ ویت نام باؤ ڈائی BAO DAI کو مجبور کیا کہ وہ آنام اور ٹونکن کی فرانس سے آزادی کا اعلان کرے۔ ویت نام اگست 1945ء تک جاپان کے زیر انتداب رہا جب منہ فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ 29 اگست 1945ء کو شہنشاہ باؤ ڈائی کو معزول کر دیا گیا جسے جاپانیوں نے تخت شاہی پر برقرار رکھا تھا۔

اعلان آزادی:

2 اگست 1945ء کو ہو چی منہ نے جاپانیوں کی رخصتی کے بعد ویت نام کی آزادی کا اعلان کیا اور اس کا نام ڈیموکریٹک ری پبلک ویت نام رکھا۔ ہو چی منہ ملک کا سربراہ بنا اور جبکہ معزول شہنشاہ کو عبوری حکومت کی سربراہی کی پیشکش کی گئی۔ ہو چی منہ نے ویت نام کمیونسٹ حکومت قائم کی۔ ملک کے بہت سے غیر کمیونسٹ بھی اس کی حمایت کر رہے تھے جو فرانس کی نوآبادیاتی حکومت کے خلاف تھے۔

چینی اور برطانوی افواج:

اسی دوران برطانوی اور چینی افواج ویت نام پہنچ گئیں اور ویت نام میں امن بحال کرنے کے نام پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی فرانسیسیوں نے جنوبی ویت نام پر اپنا کنٹرول دوبارہ سنبھال لیا، لیکن وہ یہاں ابھرنے والی مزاحمتی تحریکوں کو نہ دبا سکے۔ 2 مارچ 1946ء کو ویت نام میں انتخابات منعقد ہوئے جن میں ویت منہ پارٹی نے کامیابی حاصل کی اور صدر ہو چی منہ منتخب صدر بن گئے۔ 6 مارچ کو فرانس نے ہو چی منہ کی کمیونسٹ حکومت اور ویت نام کی آزادی کو تسلیم کر لیا، مگر

...فرانس ویت نام کی آزادی سے منحرف ہوگیا، جس کی وجہ سے فرانس اور ویت نام کے درمیان کشیدگی ... جنوبی حصوں میں اپنی افواج اتار دیں اور ویت منہ سمیت تمام آزادی پسندوں کو نکال باہر کیا۔

گوریلوں کا حملہ اور جنگ ہند چینی:

فرانس نے اس قبضے کے بعد دوبارہ نوآبادیاتی نظام بحال کرنے کی کوشش کی 19 دسمبر کو ویت منہ گوریلوں نے ہنوئی ... پر حملہ کردیا، جس سے ہند چینی جنگ کا آغاز ہوگیا۔ ویت نام حریت پسند جس میں کمیونسٹ اور قوم پرست ... تھے آٹھ سال تک فرانسیسیوں سے جنگ لڑتے رہے۔ یکم جولائی 1949ء کو فرانس نے ویت منہ مخالف ایک ... ویت نام قائم کردی۔ جس پر ویت نامی قوم پرستوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ سابقہ شاہ باؤڈائی اس کا چیف سیکریٹری ... سائیگان اس دار الحکومت قرار پایا۔ متعدد قوم پرستوں نے ویت منہ کے کمیونسٹ تسلط کی مخالفت کی اور باؤڈائی کے ... گئے۔ فرانس کے مغربی اتحادیوں نے بھی سٹیٹ آف ویت نام کی حمایت کی اعلان کردیا۔ جبکہ کمیونسٹ ممالک ... ویت نام کے حامی تھے۔ دونوں حکومتیں اپنے اپنے طور پر ویت نام کی قانونی نمائندگی کی دعویدار تھیں۔

ویت نام کی تقسیم:

آخر دری 1950ء کو ویت نام دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ایک حصہ شمالی ویت نام کہلایا اور دوسرا جنوبی ویت نام۔ ادھر ... رضا کاروں نے طفیلی حکومت اور نوآبادیاتی طرز حکومت کے خلاف چھاپہ مار جنگوں کا دائرہ اتنا وسیع کردیا کہ بالآخر 1954ء میں فرانسیسی فوج دین پھو کے مقام پر محصور ہوگئی۔ 7 مئی کو ہوچی منہ کی فوجوں نے انہیں فیصلہ کن شکست ... میں دونوں فریق جنگ بندی کے لئے رضامند ہوگئے۔ 21 جولائی 1954ء کو جنیوا سوئٹزرلینڈ میں جنگ بندی کا ... ہونے والے جنیوا کانفرنس میں ویت نام کو عارضی طور پر دو حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی ... 1956ء میں انتخابات کرا کے دونوں حصوں کو متحد کردیا جائے گا۔ ہوچی منہ شمالی اور باؤڈائی جنوبی ویت نام کا صدر ... جنیوا معاہدے کی خاص بات یہ تھی کہ نہ تو شمالی لیڈر ہوچی منہ نے اس کانفرنس میں حصہ لیا اور نہ ہی امریکہ نے اس پر ... کئے۔ ہوچی منہ 10 اکتوبر 1954ء کو آٹھ برس کی روپوشی کے بعد منظر عام پر آئے۔

امریکہ بہادر میدان میں:

فرانس ویت نام سے ہٹا تو امریکہ بہادر نے اس کی جگہ لے لی۔ امریکیوں نے جنیوا معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شمالی اور جنوبی ویت نام کو متحد نہ ہونے دیا۔ 1956ء میں ویت کانگ گوریلوں نے شمالی ویت نام کی مدد سے جنوبی ویت نام کے خلاف مسلح کاروائیاں شروع کردیں تھیں۔ 31 دسمبر 1959ء کو شمالی ویت نام میں آئین نافذ کیا گیا۔ ہوچی منہ نے جنوبی ویت نام کے صدر ڈائم کو بھی کمیونزم میں شمولیت کی دعوت دی۔ چونکہ جنوبی ویت نام کو اب امریکہ کی حمایت حاصل تھی اس لیے صدر ڈائم نے یہ دعوت مسترد کردی۔ ادھر جنوبی ویت نام میں نیشنل لبریشن فرنٹ NLF نے شمالی ویت نام کے تعاون سے صدر ڈائم کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کردی۔ جس کی وجہ سے ویت نام کے لئے امریکی فوجوں کو بھیجا گیا اور اس کی فوجی کاروائی میں اضافہ ہوگیا۔

1960ء کی دہائی میں ویت نام میں ایک لمبی اور خون ریز جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ 1964 میں شمالی ویت نام روس اور چین کی مدد سے ایک بھرپور اور طاقتور فوج کی تشکیل کی۔ یہ فوج اور لاؤس اور کمبوڈیا کی سرحد کے قریب کھڑی کر دی گئی۔ 7 فروری 1965ء کو ویت کانگ نے حملہ کر کے جنوبی ویت نام میں امریکی فوجیوں کو ہلاک کر دیا جس کے جواب میں امریکی صدر لنڈن بی جانسن نے شمالی ویت نام پر فضائی حملوں کا آغاز کر دیا اور یوں امریکہ ویت نام کی جنگ میں ملوث ہو گیا۔ یہ جنگ اگلے دس سال تک جاری رہی۔ 28 اپریل 1975ء میں امریکی صدر فورڈ نے سائگان سے تمام امریکی فوجیوں کے انخلا کا حکم دیا اور 29 اپریل کو جنوبی کی فوج نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ 8 جون 1975ء کو شمالی اور جنوبی ویت نام غیر سرکاری طور پر متحد ہو گئے اور ہنوئی کو دارالحکومت قرار دے دیا گیا۔

......☆......

دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد کے تغیرات عالم 1945ء

جنگ عظیم دوم کا آغاز:

یکم ستمبر 1939ء کو ستر لاکھ جرمن فوج نے یکایک پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ یورش کے تین مرکز تھے۔ مشرقی پروشیا، سلیزیا اور سلواکیا۔ فوج کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی، میکانکی ڈویژن بھی زیادہ تھے اور ان کے ساتھ ہوائی طاقت بھی بے پناہ تھی۔ اگرچہ پولینڈ کے پاس چھ لاکھ فوج تھی مگر وہ جرمن فوج کے طوفانی دستوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ 27 ستمبر کو وارسا پر جرمن کا قبضہ ہو گیا اور یہ برق رفتار جنگ چار ہفتوں سے بھی کم مدت میں کامیابی پر ختم ہوئی۔ اصل فیصلہ ابتدائی دس دنوں میں ہو گیا تھا۔

روس کا مشرقی سمت سے حملہ:

جب روس نے دیکھا کہ جرمن اس تیزی سے پولینڈ پر چڑھ دوڑے ہیں تو روسی فوجوں نے مشرقی جانب سے حملہ کر دیا۔ اس طرح پولینڈ جرمنی اور روس کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ تقریباً دو کروڑ اکیس لاکھ آبادی کے علاقے جرمنی کے پاس رہے اور ایک کروڑ بیس لاکھ کی آبادی کے علاقے روس کے حصے میں آئے۔ روس نے لتھونیا۔ لٹویا اور لتھوانیا سے معاہدے کر لئے۔ فن لینڈ سے کہا کہ وہ فوجوں کی نقل و حرکت بند کر دے جب یہ مطالبہ نہ مانا گیا تو روس نے فن لینڈ پر حملہ کر دیا 12 مارچ 1940ء کو فن لینڈ نے روس کی شرطیں مان لیں۔ روس نے فن لینڈ سے وہ سب علاقے ہتھیا لیے جو اس کے بڑے شہروں سٹالن گراڈ وغیرہ کے نزدیک تھے۔

مغربی اور شمالی محاذ:

ابھی فرانس اور برطانیہ پوری طرح جنگ کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے کہ جرمنی پولینڈ سے فارغ ہو کر ڈنمارک اور ناروے کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ 9 اپریل 1940ء کو ڈنمارک پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ ناروے بھی جنگ کے لئے تیار نہ تھا۔ جرمنی نے ہوائی جہازوں کے ذریعے اس کے بڑے بڑے شہروں میں فوجیں اتار دیں۔ اگرچہ فرانس اور برطانیہ ناروے تک بہت کم کمک پہنچا سکے، مگر ناروے نے جرات اور پامردی دکھائی اور مکمل مزاحمت کی مگر اپریل کے آخر تک اس کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ شاہ ناروے اور اس کے وزیر ملک چھوڑ کر برطانیہ چلے گئے۔ ادھر جرمنی کو برطانیہ کے خلاف اقدام کے لئے طیاروں اور آبدوزوں کے نہایت عمدہ مستقر مل گئے۔

ہالینڈ بلجیم اور لکسمبرگ:

10 مئی 1940ء کو بغیر کسی انتباہ کے جرمنی نے ہالینڈ بلجیم اور لکسمبرگ پر حملہ کر دیا۔ فضائی طاقت نے فوج کے اس حملے میں شاندار اعانت کی۔ ہالینڈ پہلی جنگ میں محفوظ رہا تھا مگر اس مرتبہ جرمنی نے اسے بھی نہ چھوڑا۔ بلجیم پر بڑی منصوبہ بندی سے حملہ کیا گیا یہ حملہ فوراً کامیاب ہوا اور ہالینڈ اور بلجیم کے دروازے کھل گئے۔ برطانیہ میں وزیراعظم چیمبرلین وزارت سے مستعفی ہو گئے اور چرچل نے دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر قومی حکومت تشکیل دی۔ اس اثناء میں جرمنی دریائے میوز کو عبور کر کے فرانس میں داخل ہو گیا۔ دوسری طرف اس کے بکتر بند دستوں نے دیگر یورپی ممالک کو پامال کر دیا۔ فرانس میں جنرل ڈیگال کو سپہ سالار بنایا گیا۔ جو فوج اتحادیوں نے بلجیم میں بھیجی تھی اس کا ایک حصہ پیچھے ہٹا لیا گیا۔ کوئی ساڑھے تین لاکھ فوج ڈنکرک (شمالی و مشرقی فرانس) میں محصور ہو گئی۔ جسے برطانیہ نے بڑی مردانگی سے وہاں سے نکالا۔

سقوط فرانس:

فرانس میں حالات حد درجہ خراب ہو گئے 10 جون کو اٹلی نے جنوبی فرانس پر حملہ کر دیا، 13 جون کو پیرس خالی ہو گیا۔ اگر چہ اس جنگ میں جرمنی نے پیرس پر قبضے کی اپنی خواہش پر قابو رکھا تھا اور وہ شمالی فرانس کی طرف بڑھتے ہوئے رود بار کا رخ کر رہے تھے۔ 15 جون کو جرمنوں نے پیرس پر قبضہ کر لیا، اسی روز روسی فوجیں بحیرہ بالٹک کی ریاستوں، لتھونیا، لیٹویا اور اسٹونیا میں داخل ہو گئیں۔ فرانسیسی حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور مارشل پیتاں نے سارا انتظام سنبھال لیا۔ (16 جون) ساتھ ہی جرمنی سے صلح کی درخواست کر دی چنانچہ 22 جون کو صلح ہو گئی اور فرانسیسی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ملک 3/5 واں حصہ جرمنی کے زیر نگیں دے دیا گیا۔ ایک چھوٹی سی فرانسیسی جماعت نے جس کا سربراہ جنرل ڈیگال تھا سر خم کرنے سے انکار کر دیا۔ جنرل ڈیگال نے لندن میں قومی دفاع کے لئے ایک مجلس بنالی اور اعلان کیا کہ جرمنوں کا مقابلہ کیا جائے گا۔

جنگ برطانیہ:

برطانیہ کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اگر فرانس جیسا طاقتور ہمسایہ پورا کا پورا جرمن کے قبضہ میں چلا جاتا تو برطانوی نقطہ نگاہ سے حالات بہت زیادہ خراب ہو جاتے۔ برطانیہ نے بحری بیڑے کی حوالگی کا مطالبہ کیا جو مانا نہیں گیا۔ چنانچہ برطانیہ 3 جولائی کو الجزائر کی بندرگاہ وہران پر حملہ کر دیا، جہاں فرانسیسی بحرے بیڑے کے جہاز بھی ٹھہرے ہوئے تھے اور یہ جہاز تباہ کر دیئے گئے۔ جو جہاز برطانوی بندرگاہوں میں تھے ان پر قبضہ کر لیا گیا۔ مارشل پیتاں نے اپنی حکومت کا مرکز وشی میں قائم کیا اور لاوال کو نائب وزیر بنا لیا۔ ان کی حکومت وشی حکومت کہلائی۔ مارشل پیتاں دوران جنگ فرانس کا مختار بنا رہا۔ 25 اگست 1945ء کو اختتام جنگ کے بعد اس پر مقدمہ چلا اور دشمن سے ساز باز کرنے کا مجرم ٹھہرا۔ اسے سزائے موت سنائی گئی جو بعد ازاں عمر قید میں بدل گئی۔

جنگی نقطہ نظر سے برطانیہ کے حالات بڑے نازک ہو چکے تھے اس کا سارا جنگی ساز و سامان بلجیم اور فرانس میں رہ گیا۔ آدھے سے زیادہ یورپ جرمنوں کے قبضے میں جا چکا تھا اور فرانس ختم ہو گیا تھا۔ ایسے میں جرمنوں نے ہوائی حملے شروع کر

...وقت میں فوج بھیجنے کا جو انتظام کیا اسے برطانیہ کی ہوائی طاقت نے اگست 1940ء میں سخت نقصان پہنچایا۔ ...کے ایئر مارشل گورنگ نے برطانیہ پر ہوائی حملے تیز تر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ستمبر 1940ء میں صرف جرمن ہوائی ...برطانیہ میں مقتولین کی تعداد تین سے چھ سو یومیہ تک پہنچ گئی۔ برطانوی ہوائی جہاز ان حملوں کا مقابلہ بھی کرتے ...اور ان یورپی بندرگاہوں پر بم برساتے جو جرمن کے قبضہ میں چلی گئی تھیں۔ ان حالات میں جرمنی کی کامیابی ...نہ رہا تھا چنانچہ جرمنی اٹلی اور جاپان نے 27 ستمبر کو دس سال کے لئے فوجی اور اقتصادی تعاون کا معاہدہ کر دیا۔ اس ...برطانیہ کی ہوائی فوج نے جرمنی ہوائی جہازوں کو بری طرح تباہ کرنا شروع کر دیا۔ برطانیہ کی فضائیہ چونکہ بہت اچھے ...منظم کی گئی تھی اور اس کی قیادت کا انتظام بھی اچھا تھا۔ راڈار کی ایجاد سے ہوائی حملوں کا سراغ قبل از وقت لگ جاتا ...صرف 16 ستمبر کی بحرانی جنگ میں 185 جرمن ہوائی جہاز مار گرائے گئے۔ گورنگ کے نزدیک یہ نقصان ناقابل ...ت تھا۔ ادھر چرچل نے اپنے ہوابازوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا" دنیا میں کبھی ایسی صورت پیش نہیں ...آئی کہ بہت بڑے تعداد تھوڑے سے افراد کی اتنی ممنون ہوئی ہو"۔

اگلے مرحلے میں جرمنوں نے برطانیہ کے صنعتی مراکز پر ہوائی حملے کر کے انہیں تباہ کرنے کی کوشش کی۔ 10 نومبر کو ...شہر COVENTRY کے صنعتی مراکز پر سخت حملہ ہوا، لیکن ان حملوں میں جرمنوں کو اتنا شدید نقصان پہنچا کہ وہ یہ حملے ...جاری نہ رکھ سکے۔ کہا جاتا ہے کہ 8 اگست 1940ء سے 131 اکتوبر 1940ء تک جرمنوں کے دو ہزار تین سو چھتر ہوائی ...جہاز مار گرائے گئے اس کے مقابلے میں برطانوی فضائیہ کا نقصان صرف آٹھ سو جہاز تھا۔

امریکہ کی امداد:

نومبر 1940ء میں امریکہ نے ساڑھے چھ ارب ڈالر کی رقم برطانیہ کے لئے مختص کی تھی جس کا سامان جنوری 1941 ...سے بھیج دیا گیا۔ سب سے زیادہ قلت غذائی اجناس کی تھی۔ امریکہ نے اپریل تا دسمبر 1941ء میں دس لاکھ ٹن غذائی اشیاء ...برطانیہ پہنچائیں۔ ہوائی حملوں سے برطانیہ کو شدید نقصان پہنچا تھا اس کے ہر پانچ گھروں میں سے ایک گھر تباہ ہو گیا تھا۔ ...جانوں کا نقصان بھی بہت شدید تھا۔ علاوہ ازیں مواصلات بجلی اور پانی کے وسائل درہم برہم ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ ...پارلیمنٹ اور برٹش میوزیم کو بھی نقصان پہنچا۔

لبنان، شام اور عراق:

مغربی محاذ پر صرف برطانیہ تنہا مقابلے پر رہ گیا تھا۔ عین اس موقع پر روس نے رومانیہ کا خاصا بڑا علاقہ ہتھیا لیا۔ ساتھ ہی جرمنی اور اٹلی کے دباؤ سے اس نے ہنگری کے حوالے بھی ایک بڑا علاقہ کیا۔ ان ضربوں سے رومانیہ کو شدید نقصان پہنچا ...بادشاہ کیرول ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کا بیٹا بادشاہ بنا مگر ساتھ ہی بلغاریہ نے ڈبروجا کا علاقہ طلب کر لیا۔ رومانیہ کو یہ علاقہ بھی ...چھوڑنا پڑا۔ 8 اکتوبر کو جرمن فوجیں اس غرض سے رومانیہ میں داخل ہو گئیں کہ تیل کے کنوؤں کی حفاظت کریں۔ ادھر اٹلی نے ...یونان سے مطالبہ کر دیا کہ اپنے بحری مرکز استعمال کرنے کی اجازت دو پھر اسی بہانے یونان پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے یونان ...کی امداد کی اور ایک حملہ اٹلی کے بحری بیڑے پر کیا۔ اتحادیوں کو شکستیں ہوئیں تو جرمنی نے اپنا ہوائی بیڑا اٹلی بھیج دیا۔ اسی اثنا ...میں ہنگری، رومانیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ میں معاہدے روما برلن اور ٹوکیو میں ہوئے۔ جرمن فوجوں نے یوگوسلاویہ اور یونان کو

پامال کر دیا۔ بڑی مشکل سے یونان سے برطانوی فوجوں کو نکالا جا سکا۔ 2 مئی رشید علی گیلانی وزیر اعظم عراق نے جرمنوں سے امداد طلب کی اور وہاں برطانیہ کے خلاف تحریکیں شروع ہو گئیں، جنہیں بمشکل فرو کیا جا سکا۔ شام میں بھی جرمن مداخلت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ اس علاقے کو فرانس کی وشی حکومت سے آزاد کرا لیا جائے۔ چنانچہ جولائی میں شام لبنان پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ایران میں برطانوی اور روسی فوجیں داخل ہو گئیں۔

روس پر حملہ:

ہٹلر کا پہلے ارادہ تھا کہ وہ 1914ء کی جنگ کی وہ غلطی نہ دہرانے دے گا یعنی دو محاذوں پر جنگ نہ ہونے دے گا۔ لیکن جون 1941ء میں اس نے روس پر حملہ کر دیا اور دو محاذوں پر جنگ چھیڑنے کی غلطی کا مرتکب ہوا۔ یہ محاذ بحیرہ اسود سے بحیرہ سفید تک دو ہزار میل لمبا تھا۔ جرمنوں کے علاوہ اس حملے میں اٹلی، رومانیہ، ہنگری اور فن لینڈ کی فوجیں بھی شامل تھیں۔ کل فوجوں کی تعداد تیس لاکھ سے کم نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں روسی فوج کی تعداد تقریباً بیس لاکھ تھی۔ چرچل نے روسیوں کو ہر ممکن مدد دینے کا یقین دلایا۔ اسی امداد کے لئے ایران پر قبضہ کیا گیا اگرچہ وہ غیر جانب دار تھا۔ امریکہ نے بھی ادھار اور پٹے کے معاہدے کے مطابق روس کے لئے امداد کے دروازے کھول دیئے۔

جرمنوں نے اس محاذ پر بڑی تیزی سے پیش قدمی کی وہ بہت جلد خاصے بڑے علاقے پر قابض ہو گئے۔ یہاں تک کر لینن گراڈ اور ماسکو خطرے میں پڑ گئے۔ کریمیا جرمنوں کے قبضے میں آ گیا۔ یوکرین اور شمالی قفقاز کے علاقے چھن جانے کی وجہ سے روس کے زرعی وسائل کو شدید ضرب لگی، مگر امریکہ نے کثیر تعداد میں غذائی اشیاء فراہم کر کے یہ قلت دور کرنے کی کوشش کی اور پندرہ لاکھ ٹن غذائی اشیاء روس پہنچا دیں۔ روس میں پیش قدمی اگرچہ انتہائی تیزی سے کی گئی مگر 1941ء میں روس فتح نہ ہو سکا۔ اگرچہ جرمن افواج جتنی دور تک فرانس میں گئی تھیں اس سے دوگنی دور تک روس میں گھس گئیں۔ مگر موسم گرما اور موسم خزاں تک جرمن منصوبہ بندی کے مطابق روس کا فیصلہ نہ کیا جا سکا۔ چونکہ موسم سرما جرمنی کے روس فتح کرنے کے منصوبے میں شامل نہیں تھا اس لئے جرمن فوجوں کے پاس بھی روسی موسم سرما کا مقابلہ کرنے کے لئے نپولین کی افواج کی طرح پورا ساز و سامان نہ تھا اس لئے روسیوں نے دسمبر 1941ء سے مئی 1942ء تک خاصا بڑا علاقہ جرمنوں سے واپس لے لیا۔

سٹالن گراڈ:

ابتدائی حملے کے بعد موسم سرما میں جنگ کافی حد تک رکی رہی 1942ء کے موسم گرما میں سٹالن گراڈ میں لڑائی شروع ہوئی اس شہر کو روس میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اگر یہ جرمن کے قبضے میں چلا جاتا تو روس کی جو امداد ایران کے رستے آ رہی تھی منقطع ہو جاتی اور ساتھ ہی باکو سے تیل کی درآمد بھی رک جاتی۔ اس محاذ پر روسیوں نے حد درجہ استقامت دکھائی اور اس استقامت نے روس اور جرمن کی جنگ میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ پھر روسیوں کے جوابی حملے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ امریکہ نے ہر طرح سے روسیوں کو امداد دے کر ان کے ہاتھ مضبوط کر دیئے تھے۔ 1943ء کے پہلے تین مہینوں میں جرمن اور ان کی اتحادی افواج کے تقریباً پانچ لاکھ آدمی مارے گئے یا گرفتار ہوئے۔ جب جنگ کا پانسا پلٹا تو جرمنی پیچھے ہٹنے لگا جگہ جگہ شکستیں ہوئیں۔ ادھر برطانیہ اور امریکہ نے فرانس میں نارمنڈی پر حملہ کر دیا تو جرمنوں پر مغرب میں بھی دبا

مشرقی محاذ سے فوجیں ہٹانے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں تک کہ روسی جرمنوں کا تعاقب کرتے کرتے برلن پہنچ گئے
کو سلاویہ اور اٹلی نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔

امریکہ کی جنگ میں شمولیت:

جنگ عظیم دوم میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو میدان جنگ سے باہر رکھنے کا خواہاں تھا۔ ادھر امریکہ میں بھی الگ رہنے کی پالیسی کی حمایت کرنے والی پارٹی بڑی زبردست تھی۔ تاہم پولینڈ پر نازی حملے نے امریکہ میں لوگوں کو سخت خلاف کر دیا اور سقوط فرانس کے بعد تو جرمنی کے خلاف امریکیوں کے مخالفانہ جذبات بہت گئے۔ بہر حال امریکہ کے صدر روز ویلٹ نے جنگ کے سوا اتحادیوں کی خوب امداد کی اور ان کے ہاتھ مضبوط کئے برطانیہ کو پچاس "پرانے" تباہ کن بحری جہاز بھی دیئے۔ یہ سب کچھ اگرچہ امریکہ کی غیر جانب داری کے خلاف کے باوجود ہٹلر نے امریکہ کے خلاف جنگ نہ چھیڑی مگر وہ جاپان کو ہر طرح کی امداد کا وعدہ کر چکا تھا۔ جاپان نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایشیا میں توسیع کی پالیسی پر تیزی سے عمل کیا۔ اس کی ابتدا 1931ء میں ہوئی تھی۔ چنانچہ سقوط فرانس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جاپان ہند چینی میں گھس گیا اور چین میں بھی اپنی مہم جاری حکومت امریکہ اور ہند چینی میں جاپانی فتوحات قبول کرنے کو تیار نہ تھی اور اس عمل کو جاپان کی جارحیت سمجھی تھی۔

پرل ہاربر پر حملہ:

1941ء کے موسم خزاں میں امریکہ نے جاپان سے لین دین کا سلسلہ ختم کر دیا اور جب تک یہ چین اور ہند چینی سے نہ ہو فیصلہ کیا اسے کسی قسم کا خام مال بھی فراہم نہ کیا جائے گا۔ اس بارے میں جاپانیوں اور امریکیوں میں گفت و شنید ہو رہی تھی کہ یکا یک 7 دسمبر 1941ء کو جاپانیوں نے بلا انتباہ امریکی طیارہ بردار بحری جہاز ہوائی پر امریکہ کی بندرگاہ پرل ہاربر میں اچانک حملہ کر کے شدید ضرب پہنچائی۔ بلاشبہ بہت سے جہازوں کو نقصان پہنچا مگر بحر الکاہل میں امریکہ کی نہ ہوئی اس کے نتیجے میں امریکہ نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جرمنی اور اٹلی اپنے محوری حلیف کے وعدوں کی پاسداری کے پابند تھے۔ انہوں نے 11 دسمبر کو جاپان کی حمایت میں امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اس جنگ نے حقیقی معنی میں عالمی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ 1917ء کے مقابلے بہتر طریق پر جنگ کے لئے تیار تھا مگر پھر بھی اس نے جرمنی کے خلاف اسکے سوا کچھ نہ کیا کہ روس کو بھرپور امداد مضبوط بنا دیا اور جرمن آبدوزوں کے خلاف جنگ میں پورا حصہ لیا۔ جاپان کے خلاف امریکہ تقریباً بے بس تھا۔ بحر میں اس کی بحری چوکیاں جزائر گوام، ویک آئی لینڈ اور فلپائن تھیں۔ یہ پے در پے جاپانیوں کے قبضے میں چلی گئیں۔ اور ہالینڈ کی جلا وطن حکومت بھی جنوبی و مشرقی ایشیا میں اپنی نو آبادیاں محفوظ رکھنے کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ 1942ء کے موسم بہار تک جاپان برطانیہ سے ملایا اور ہالینڈ سے انڈونیشیا سے سیام تک بلکہ برما تک پورے علاقے چھین چکا تھا معلوم ہوتا تھا وہ جلد آسٹریلیا پر بھی حملہ کرے گا، مگر اگلے تین سالوں میں جنگ کا نقشہ بدل گیا اور محوری طاقتیں شکست کھا شرائط خود سپردگی کے لئے تیار ہو گئیں۔

انقلابی موڑ:

دوران جنگ میں کئی انقلابی موڑ آئے۔ سب سے پہلا یہ تھا کہ پیش رفت رک گئی۔ ان اقدامات میں ان ہوائی جہازوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا جو طیارہ بردار جہازوں کے ساتھ تھے۔ 7 مئی 1942ء کو جنوبی بحرالکاہل میں بحیرہ کورل CORAL SEA کی جنگ ہوئی جس میں متحدہ بیڑے نے جاپان کا وہ حملہ روک دیا جو آسٹریلیا پر متوقع تھا۔

افریقی محاذ جنگ:

مغرب میں امریکہ اور برطانیہ روس کا دباؤ قبول کر کے براعظم یورپ میں دوسرا محاذ کھولنے پر راضی نہ ہوئے۔ نومبر 1942ء میں شمالی افریقہ میں فرانسیسی مقبوضات میں کئی مقامات پر اتحادی فوجیں اتاری گئیں۔ مراکش میں فرانس کی وشی حکومت نے مزاحمت کی مگر اتحادیوں نے الجزائر اور مراکش میں قدم جما لیے۔ شمالی افریقہ کی مہم بھی ایک انقلابی موڑ ثابت ہوئی۔ شمالی افریقہ کا طویل ساحلی علاقہ یعنی ساحل لیبیا اطالویوں اور جرمنوں کے قبضہ میں تھا۔ کچھ مدت صحرائی علاقوں میں دھکم پیل کی جنگ جاری رہی۔ 23 اکتوبر 1942ء کو برطانیہ نے منصوبے کے مطابق جارحانہ اقدام شروع کر دیئے۔ یہ جرمن جنرل رومیل کی پیش قدمی کے جواب میں برطانوی جنرل منٹگمری کا جوابی حملہ تھا۔ 12 نومبر تک جرمنی اور اٹلی کی فوجیں مصر سے باہر نکال دی گئیں عین اس موقع پر امریکی فوجوں نے آئزن ہاور کے ماتحت فرانسیسی مراکش اور الجزائر میں پیش قدمی شروع کر دی۔ مئی 1943ء تک افریقہ کی مہم ختم ہو چکی تھی اور جرمنی اور اٹلی کی فوجوں سے افریقہ پاک ہو چکا تھا۔

صرف اس مہم میں جرمنی اور اٹلی کے ساڑھے نو لاکھ فوجی مارے گئے یا اسیر ہوئے۔

اٹلی پر حملہ:

10 جولائی 1943ء کو جنرل آئزن ہاور کے ماتحت سسلی پر حملہ کیا گیا۔ اس حملے میں چھوٹے بڑے دو ہزار ہوائی جہاز کام میں لائے گئے اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوج اٹلی کے جنوبی ساحل پر اتار دی گئی۔ 22 جولائی تک نصف سے زائد اٹلی پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ 4 جولائی 1944ء کو اتحادی فوجیں روم میں داخل ہو رہی تھیں۔

محوری طاقتیں دفاع پر:

جنگ کے آخری دو سال میں محوری طاقتیں اپنے دفاع پر مجبور ہو گئیں۔ یورپ اور ایشیا دونوں جگہ اتحادی فوجوں نے قطعی خطوط پر پیش قدمی کے ساتھ بری حملے شروع کر دیئے اور محوری دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہو گئے۔

فرانس اور بلجیم کی آزادی:

4 جون 1944ء کو اتحادی فوجوں نے برطانیہ سے نارمنڈی پر حملہ کیا۔ دوسری جنگ عظیم کا یہ سب سے بڑا حملہ تھا۔ اس حملہ کا سپہ سالار آئزن ہاور کو بنایا گیا تھا۔ فیلڈ مارشل منٹگمری ابتدائی حملے کا کمانڈر تھا۔ 80 جنگی جہازوں نے جن پر آٹھ سو توپیں نصب تھیں سخت گولہ باری کی دس ہزار ہوائی جہاز فضا میں اعانت کر رہے تھے۔

27 جون کو فرانس کی بندرگاہ شربورگ CHERBURG پر قبضہ کر لیا گیا۔ 6 جون سے ایک سو دن کے اندر اندر بائیس لاکھ آدمی فرانس پہنچائے گئے۔ ان کے ساتھ ساڑھے چار لاکھ گاڑیاں تھیں اور چالیس لاکھ ٹن سامان بھی بھیجا گیا۔ دنیا

ہے اس قسم کے حملے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ سال ختم ہونے سے پہلے فرانس، بلجیم اور ہالینڈ جرمنوں سے آزاد
ہو گئے اور مشرق و مغرب دونوں اطراف سے جرمنوں پر حملے کا ساز و سامان کر لیا گیا۔

اتحادیوں کے شدید ہوائی حملوں نے جرمنی کی صنعت کے اہم مراکز کھنڈرات میں بدل دیئے اور نقل و حمل کے ذرائع
تباہ کر دیئے۔ 1943ء میں جرمنی کے پاس صرف تین ہزار ہوائی جہاز بچے تھے۔ ان میں سے ایک ہزار صرف جنوری
1945ء میں تباہ ہو گئے۔ ہوائی حملوں کی شدت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جنگ برطانیہ میں جتنے بم برطانیہ پر
گرائے گئے تھے، ان میں سے ہر ایک ٹن بموں کے بدلے میں تین سو پندرہ ٹن برسائے گئے۔ صرف چار مہینوں میں جرمنی کی
طاقت ختم کر دی گئی۔ مشرق کی طرف سے روسی اور پولش فوج مغرب کی طرف سے برطانیہ اور امریکہ اور ان کے اتحادی
جرمنی میں بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ دونوں طرف کی فوجیں برلن کے دروازوں پر پہنچ گئیں۔ یکم مئی 1945ء کو ہر طرف
سے گھر جانے کے بعد ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ 7 مئی کو جرمن جرنیلوں نے حوالگی کے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ جرمنی کو چار
حصوں میں بانٹ دیا گیا اور چار حلقوں کا انتظام، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس نے سنبھال لیا۔

جنگ بحرالکاہل:

مشرق بعید سے بڑھتے ہوئے جاپانی برما سے مشرقی ہندوستان میں داخل ہو گئے تھے۔ آغاز جنگ کے وقت مشہور
امریکی جرنل میکارتھر فلپائن میں تھا وہ بڑی ہمت سے وہاں سے بچ کر نکلا اور آسٹریلیا پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اتحادی
فوجوں کی کمان سنبھالی۔ پہلے چھوٹے چھوٹے جزائر کو فتح کیا گیا پھر مشرقی و جنوبی ایشیا کی برطانوی فوج کے کمانڈر جنرل
ماؤنٹ بیٹن نے امریکہ اور چین کی امداد سے جاپان کی مختلف فوجیں تباہ کیں۔ 5 مئی 1945ء تک جاپان کے مقتولین
اور برما میں جنگ کی تعداد تین لاکھ پینتالیس ہزار تھی۔ جوابی حملہ شروع ہونے پر جاپان بھی شکستوں پر شکستیں کھاتا گیا اور
پیچھے ہٹتا چلا گیا، یہاں تک کہ فلپائن بھی اسے چھوڑنا پڑا۔ فلپائن سے جاپان پر تیز ہوائی حملے شروع کر دیئے گئے۔ پھر ہیرو
شیما اور ناگاساکی پر ایک ایک ایٹم بم گرائے جانے کے بعد جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ 2 ستمبر کو حوالگی کی شرطوں پر دستخط
ہو گئے۔ جاپان کی دس لاکھ افواج چین میں تھیں، انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح یہ جنگ اختتام کو پہنچی۔

جنگ عظیم دوم کے پہلے اور بعد:

پہلی جنگ عظیم کے بعد 1919ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس نظام امن کی بنیاد ورسلیز، فرانس میں رکھی گئی تھی۔
اس کا نام "جمعیت اقوام" LEAGUE OF NATION رکھا گیا تھا۔ یہ ایک قسم کا پہلا بین الاقوامی نظام تھا۔ لیکن یہ
جس مقصد کے لئے بنا تھا اسے بالکل پورا نہ کر سکا، نہ اس زمانے کی بڑی طاقتیں آج کی بڑی طاقتوں کی طرح اپنے اغراض
کے لئے جبر و زور سے باز نہ رہ سکیں۔ نہ ہی کمزور اقوام کی حفاظت کا کوئی بندوبست ہو سکا۔ اگر چہ وہ اس بین الاقوامی مجلس
کی رکن تھیں۔ اس کی کئی وجوہات تھیں، مثلاً اصل نظام متوازن نہیں تھا۔ اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی تھی مگر ان میں سے
برطانیہ اور خصوصاً فرانس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بدلہ لے کر رہے گا اس نے اس بات پر غور و فکر نہ کیا کہ جذبہ انتقام

دوسری اقوام کے جذبات پر ترجیح دے کرے گا اور آخر معاملہ صلح و آشتی کی بجائے دوبارہ جنگ ہی کی صورت اختیار کرے گا۔ بہر طور میں امریکہ کا حصہ سب سے بڑا تھا مگر اس کے صدر ولسن نے جب دیکھا کہ فرانس اور برطانیہ اپنے خاص اغراض و مقاصد پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور انہیں امن عامہ عالم کا چنداں خیال نہیں تو وہ پیچھے ہٹ گیا اور برطانیہ اور فرانس کے لئے من مانی کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا اب سے آخر میں یہ کہ نہ اس نظام میں اقتصادی مسائل حل کرنے کا کوئی انتظام تھا نہ کوئی ایسی تجویز سوچی گئی تھی جس کے مطابق جمعیت اقوام کے فیصلوں کی بہ سہولت نافذ کیا جا سکے۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں انجمن جمعیت اقوام برطانیہ اور فرانس کی گروہ بندی کا آلہ کار بن کر رہ گئی۔ نتیجے کے طور پر جرمنی اپنی راکھ سے پھر پھڑا کر پھر نکل آیا اور 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک جمعیت اقوام اپنا بھرم کھو بیٹھی۔ ہر طرف انارکی پھیل گئی تھی۔ جو قوم بھی موقع پاتی معاہدوں کو پس پشت ڈال دیتی اور اپنے مفاد کے لئے سب کچھ کر ڈالتی تھی۔ اس طرح بین الاقوامی کشیدگی بڑھ گئی۔ ادھر جرمنی نے ہوش سنبھالتے ہی معاہدہ ورسلز کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اٹلی نے جب موقع دیکھا تو بے تکلف حبشہ پر حملہ کر دیا۔ جاپان نے ہر طرف سے بے پرواہ ہو کر چین پر دھاوا بول دیا۔ جمعیت اقوام نے اٹلی کے خلاف کا فیصلہ کیا لیکن یہ پابندیاں کوئی بھی مقصد پورا نہ کر سکیں۔ کمزور اقوام عالم میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جب انہیں شکار ہونے سے بچانے والا کوئی نہیں اور بچاؤ کی کوئی صورت بھی نہیں تو وہ بڑی طاقتوں کی ناراضگی مول کیوں لیں۔ یہ صورت حال 1919ء سے 1939ء تک دنیا میں کھل کر سامنے آ گئی۔

خود غرضی کے ہتھکنڈے:

جمعیت اقوام نے بہرحال ایک نیا تصور یہ دنیا کے دماغوں کو دیا کہ مختلف اقوام مل کر اور متحد ہو کر اپنے بچاؤ کی تدابیر اختیار کر سکتی ہیں۔ جن اقوام عالم کو پہلی جنگ عظیم میں نقصان پہنچا تھا ان سے بدلے کے شوق میں فاتحین نے حد درجہ برا سلوک روا رکھا۔ انہیں اپنے آپ کو سنبھالنے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے لئے نہ کوئی نصب العین تجویز کیا جس کی بنا پر وہ دوسری قوموں کو ہم نوا بنانے کی کوشش کرتی رہیں۔ مثلاً جرمنی میں جب ہٹلر برسر اقتدار آیا تو اس نے اپنا مقصد یہ بیان کیا کہ بالشویک ازم کے خلاف ایک متحدہ نظام بنانا چاہیے۔ جو قومیں اس کے زیر اثر تھیں ان سب کو اکٹھا کر کے ایک جتھہ تیار کیا اور اس کا نام "نظام نو NEW ORDER" رکھا۔ حالانکہ ہٹلر کی اصل غرض و غایت یہ تھی کہ جمہوری مقاصد کو دبائے اور مطلق العنانی کو فروغ دے۔ گویا اس نے نظام نو اپنے خاص مقاصد کے لئے ایک ہتھکنڈے اور فریب کے طور پر استعمال کیا۔ ملک کے داخلی معاملات میں بھی اس نے مدار غیر جمہوری نظام اور اصولوں پر رکھا۔

جاپان کو یہ خیال تھا کہ ایشیا اور خصوصاً مشرق بعید میں کوئی طاقت اس کے مقابلے پر نہیں آ سکتی اور اگر یورپی طاقتوں یا امریکہ کا اثر ایشیاء سے زائل کر دیا جائے تو پورے ایشیاء میں یا کم از کم اس کے مشرقی حصے میں جاپان سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔ لہٰذا اس نے نعرہ یہ لگایا کہ "ایشیا صرف ایشیائیوں کے لئے ہے"۔ یہ نعرہ اصلاً درست تھا۔ بشرطیکہ ایشیائی اقوام کو واقعی آزادی کی منزل پر پہنچانا مقصود ہوتا۔ مگر جاپان کا مقصود تو محض ذاتی اقتدار اور نئی قسم کا نو آبادیاتی نظام قائم کرنا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ یورپی طاقتیں اور امریکہ ایشیاء سے نکل جائیں اور ان سب کی جگہ اکیلے جاپان کو مل جائے اس منصوبے کا نام اس نے مشترکہ خوش حالی کا حلقہ۔ CO.PROSPERITY SPHERE رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم

کی تدبیروں سے وہ بین الاقوامی نظام امن وجود میں نہیں آسکتا تھا جس کے مطابق امن عالم کے لئے موثر اقدامات کئے جا سکے۔

انجمن اقوام متحدہ۔ U.N.O. :

یہی حالات تھے جن کے حل کے لئے دوران جنگ میں ایک نئے اور صحیح بین الاقوامی نظام امن کی تجویز سوچی گئی تھی اس نظام کے اصول اس منشور میں واضح کر دیئے گئے تھے جو منشور اوقیانوس ATLANTIC CHARTER کے نام سے مشہور ہوا۔ اگست 1941ء میں روز ویلٹ اور چرچل نے اسے تیار کیا تھا۔ یہ منشور 8 نکات پر مشتمل تھا۔ یعنی کوئی حکومت اپنی حدود نہ بڑھائے گی۔ کسی قوم کی مرضی کے بغیر علاقائی ردو بدل نہ ہوگا جو قومیں خود مختاری سے محروم ہو چکی ہیں ان کی آزادی بحال کر دی جائے گی۔ تجارت اور خام مال حاصل کرنے کا موقع تمام قوموں کو میسر آسکے گا۔ مزدوروں اور کارکنوں کا معیار زندگی بہتر بنایا جائے گا اور انہیں معاشی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ ہر قسم کے خوف و احتیاج سے نجات دلائی جائے گی۔ سمندر سب اقوام عالم کے لئے کھلے رہیں گے جو قومیں جارحانہ اقدامات کی ذمہ دار ہیں ان سے ہتھیار لے لئے جائیں گے۔ اور اس وقت تک یہ صورت باقی رہے گی جب تک تحفظ عامہ کا مستقل نظام وجود میں نہ آجائے۔ چنانچہ اس منشور کی بنا پر انجمن اقوام متحدہ کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس کے قیام کے ابتدائی ذمہ دار تین ملک تھے، جنہیں جنگ میں جرمنی کے خلاف سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، یعنی امریکہ برطانیہ اور روس، اور سرمایہ اس رقم سے حاصل کیا گیا جو امریکہ نے دوران جنگ میں جرمنی جاپان اور اٹلی کے خلاف لڑنے والی اقوام کے لئے ادھار اور پٹے کی پالیسی کے تحت الگ کی تھی۔ اسی دوران جنگ کی کیفیت ہی میں کئی عالمی ادارے قائم کر دیئے گئے تھے جو بعد ازاں اقوام متحدہ کے ماتحت آگئے۔ ان میں امداد اور آبادکاری کا ادارہ تعلیم وثقافت کا ادارہ، مالی امداد کا ادارہ وغیرہ شامل تھے۔

انجمن اقوام متحدہ کا منشور:

21 اگست 1944ء کو ڈمبرٹن اوک DUMBARTON OAKS واشنگٹن امریکہ میں برطانوی دولت مشترکہ اور روس کے نمائندوں کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس نے انجمن اقوام متحدہ کے قیام کی تجاویز پیش کیں۔ 25 اپریل 1945ء کو 50 قوموں کے مندوبین نے انجمن اقوام متحدہ کا منشور مکمل کیا، قرار پایا کہ اس کی ایک جنرل اسمبلی ہو جس میں پالیسیوں کے بنیادی اصول واضح ہو جائیں۔ ایک سیکورٹی کونسل ہو جو سیاسی اور فوجی نوعیت کے معاملات کی نگرانی کرے، ان کے علاوہ ایک اقتصادی کونسل اور مرکزی کونسل ہو جو اقتصادی مسائل کو حل کرے اور مجلسی جھگڑوں کو روکے۔ ایک بین الاقوامی عدالت ہو جو بین الاقوامی فیصلے کرے۔ خود انجمن کا دفتری کاروبار اچھے طریقے پر چلانے کے لئے ایک سیکرٹریٹ ہو۔ غرض ان تجاویز پر 24 اکتوبر 1945ء کو انجمن اقوام متحدہ باقاعدہ طور پر وجود میں آگئی اور ٹریگیف لی TRYGVELIE ناروے سے تعلق رکھنے والی شخصیت اس کا پہلا جنرل سیکرٹری مقرر ہوا۔ جمعیت اقوام کی اسمبلی کا اجلاس آخر 18 اپریل 1948ء کو جنیوا میں ہوا۔ اس میں یہ جمعیت توڑ دی گئی اور اس کا اثاثہ اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا گیا۔

اقوام متحدہ کا کام و کردار: اقوام متحدہ کے منشور کی تصدیق ابتدا میں صرف 19 اقوام عالم نے کی تھیں پھر اس میں اقوام عالم شامل ہوتی گئیں اور آج کے رکن ممالک کی تعداد 184 ممالک سے زیادہ ہے۔ مگر تمام ممالک مساوی حیثیت کے مالک ہونے کے اصول پر قائم کیا گیا۔ یہ ادارہ صرف امریکہ کا ذیلی ادارہ بن کر رہ گیا اور جمعیت اقوام کی طرح بہت سے معاملات کو نمٹانے میں ناکام رہا۔ 1947ء میں فلسطین کی تقسیم کا مسئلہ ہو یا کشمیر کا۔ یا عراق میں امریکہ کی کھلی جارحیت اور افغانستان میں کھلی مداخلت کا۔ اقوام متحدہ ان معاملات میں امریکہ کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور رہا۔ لیکن اس ادارے نے بعض معاملات کو حسن خوبی سے بھی نمٹایا ہے۔

محوری ممالک کا فیصلہ

جرمنی کے متعلق فیصلہ: 17 جولائی 1945ء کو برلن میں برطانیہ امریکہ چین روس اور فرانس کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں جمہوریہ امریکہ کا صدر برطانیہ کا وزیر اعظم اور روس کا آمر سٹالن شامل تھے جرمنی کے متعلق آخری فیصلہ کیا گیا۔ کانفرنس میں پہلے حصے میں صلح کے اصول بیان کیے گئے مثلاً جرمنی کی عسکریت ختم کر دی جائے گی، نازی پارٹی کے قائم کردہ ادارے توڑ دیے جائیں گے اور جنگی مجرموں پر مقدمات چلائے جائیں گے۔ دوسرے حصے میں جرمنی پر بعض اقتصادی پابندیاں عائد کی گئیں مثلاً جنگی سامان اور اسلحہ بنانے کی مخالفت وغیرہ۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ فاتحین کو وہ تمام وسائل اختیار کرنے کا حق ہے جو ان پابندیوں کے سلسلے میں ضروری سمجھے جائیں گے۔ تیسرے حصے میں یہ اصول طے پایا کہ جرمنی نے مختلف ممالک کو جو نقصانات پہنچائے ہیں اور جو تکلیفیں دی ہیں ان کی تلافی جس حد تک ممکن ہو ضرور کرائی جائے۔

جاپان کا فیصلہ:

جاپان کے لیے شرائط اس کے ہتھیار ڈالنے سے پہلے ہو چکی تھیں۔ انکے مطابق جاپان کا فوجی کنٹرول امریکہ نے سنبھال لیا شہنشاہ کا عہدہ بحال رکھا گیا، فوجی تنظیمات آہستہ آہستہ توڑ دی گئی۔ کوریا کو روس اور امریکہ کے حوالے کر دیا گیا، تاکہ وہاں جمہوری حکومت کا بندوبست کر سکیں۔ جزائر کریل KURLLE اور سکھالین کا جنوبی حصہ روس کو دے دیا گیا۔ بیرونی منگولیا کو روس کا نقطہ اقتدار مان لیا گیا اور پورٹ آرتھر اور منچوریا کی ریلوے لائین کی نگرانی چین اور روس نے سنبھال لی۔ اندرونی منگولیا منچوریا اور تائیوان، فارموسا، چین کے حوالے کر دیئے گئے۔ ہانگ کانگ پر برطانیہ قابض ہو گیا۔ جو جاپانی فوج انڈونیشیا اور مشرقی ایشیا میں رہتی تھی اس نے سنگاپور میں اپنے آپ کو برطانیہ کے حوالے کر دیا۔

دوسرے ممالک کا فیصلہ:

اٹلی، رومانیہ، ہنگری، بلغاریہ، اور فن لینڈ کے ساتھ صلح کے جو معاہدے ہوئے ان پر پیرس میں دستخط کیے گئے۔ ان کے مطابق اٹلی کے کچھ علاقے فرانس کو دے دیئے گئے۔ ایڈریاٹک کے تمام جزائر یوگوسلاویہ کے حوالے کر دیئے گئے۔ اٹلی شمالی افریقہ کی اپنی نوآبادیاتی سے دست بردار ہو گیا اور ٹریسٹ کو آزاد علاقہ قرار دے دیا گیا رومانیہ نے سربیا اور شمالی بکوونیا

کے علاقے روس کے حوالے کردیئے۔ فن لینڈ نے پٹسامو PETSAMO کی بندرگاہ روس کے حوالے کردی نیز پورکالا PORKALA کے بحری مراکز پچاس سال کے لئے روس کو دے دیئے۔

جرمنی کی ہیت حاکمہ:

جرمنی میں ہیت حاکمہ اتحادیوں کی ایک کونسل کے حوالے کردی گئی تھی، جس کے چار ارکان تھے برطانیہ، فرانس روس اور امریکہ ان سب کے الگ الگ حلقے مقرر کردیئے گئے اس طرح برلن کو چار حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ 20 نومبر 1945ء کو بڑے بڑے نازی لیڈروں کا مقدمہ اتحادیوں کی مشترکہ عدالت میں پیش ہوا۔ علاوہ ازیں ہزاروں نازی ان کے عہدوں سے الگ کردیئے گئے اور اکثر کے خلاف مقدمے چلائے گئے غذائی اجناس کی خاصی مقدار باہر سے جرمنی پہنچائی گئی اور سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت دی گئی۔ ہر حلقے میں الگ انتخابات ہوئے تاکہ ملک میں یک جہتی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔

پھر اتحادیوں میں جرمنی کے انتظام پر اختلاف پیدا ہوگئے۔ فرانس برطانیہ اور امریکہ نے اپنے زیر اثر حلقوں میں ایک نئی حکومت بنائی اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ جرمنی میں۔ وفاقی جمہوریت قائم کی جائے چنانچہ بون کو دارالحکومت بنا کر ایک جمہوریت قائم کردی گئی۔ ادھر روس نے مشرقی جرمنی میں انتخابات کا بندوبست کیا اور وہاں ایک جداگانہ حکومت وجود میں آنے کے ساتھ ہی جرمنی، مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی میں تقسیم ہوگیا۔ کوریا کی جنگ کے باعث مغربی جرمنی کے حالات تیزی سے بدلنے لگے اور وہ سابقہ دشمن ملک سے ایک مغربی حلیف ملک کی حیثیت اختیار کرگیا۔ چنانچہ 19 ستمبر 1950ء کو مغربی طاقتوں نے اعلان کیا کہ ان کے بغل بچہ مغربی جرمنی پر حملہ پر خود ان کے خلاف سمجھا جائے گا۔

دیوار برلن:

مشرقی اور مغربی جرمنی کا یہ فرق بڑھتے بڑھتے دیوار برلن کی شکل اختیار کرگیا۔ مغربی جرمنی کا دارالحکومت بون بن گیا جبکہ 1955ء میں مشرقی جرمن کی حکومت کی انتظامیہ نے مشرقی برلن کو دارالحکومت قرار دیا۔ مہاجرین کی مسلسل آمد کو روکنے کے لئے 13 اگست 1961ء کو مشرقی جرمنی کی پولیس نے 254 میل لمبی دیوار تعمیر کرنا شروع کردی اس دیوار کی تکمیل پر مشرقی اور مغربی برلن الگ الگ ہوگئے۔ شہر کے دامن پر اس بدنما داغ کو مشرقی جرمنی نے جدید سرحد کا نام دیا اور اسے بلا اجازت عبور کرنے والوں کے لئے انعام سزائے موت تجویز کیا۔ روس اور دنیائے مغرب کے درمیان سرد جنگ کا یہ تلخ نشان اور مشرق و مغرب کے ناقابل حل اختلافات کا یہ منہ بولتا ثبوت اگلے تقریباً تیس سال تک قائم رہا۔ دیوار چنے جانے کے بعد مشرقی جرمنی والوں کو مغربی جرمنی جانے کے لئے ایک خاص پرمٹ کی ضرورت ہوتی تھی اور دیوار پر تعینات پہرہ دار کوئی رعایت برتنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے وہ اکثر بغیر وارننگ دیئے دیوار عبور کرنے والوں کو گولی مار دیتے تھے لیکن ان سختیاں لاگو کرنے کے باوجود روزانہ تقریباً دو ہزار مہاجرین اس دیوار کو عبور کرتے تھے۔ صرف چند موقعوں پر برلن کے لوگوں کو ایک دوسرے کے علاقے میں جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ 1989ء میں اس دیوار کے گرائے جانے تک بہت سے افراد نے اس دیوار کو بغیر پرمٹ کے عبور کرنے کی کوششوں میں اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔

☆

1947ء برصغیر پاک ہند کی تقسیم

ایک خونیں انقلاب

22 جولائی 1947ء برصغیر کی آئندہ کی مسلم ہندو ریاستوں کے درمیان ایک تقسیم کونسل کا اعلان عافیت و آزادی کا اعلان تھا جو آخری وائسرائے برطانوی ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے زیر صدارت کیا گیا۔ قائد اعظم اور قائد ملت، خان لیاقت علی خان نے پاکستان کی طرف سے اس پر اس نیت سے دستخط کیے کہ لفظاً اور معناً اس معاہدے کی پاسداری کی جائے گی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ تقسیم برصغیر کے معاملے میں ہندو کی نیت ٹھیک نہ تھی اور نہ ہی وہ اس پر قناعت کرنے کے لیے تیار تھا جو واقعی اس کا حق تھا۔ اس کو برصغیر پر حکومت کرنے کی ہوس تھی۔ لنڈی کوتل سے راس کماری تک وہ برصغیر پر ہندو راج قائم کر کے مہابھارت بنانا چاہتا تھا۔ کانگرس نے 3 جون 1947ء کو منصوبے کے مطابق جو پی پٹیل، جواہر لال اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سازش سے تیار کیا گیا تھا، ہندوستان کی تقسیم کو منظور کیا تھا۔ مگر ہندو مہاسبھا نے اسے منظور نہیں کیا تھا۔ وہ اس منظوری کے خلاف بھی احتجاج کرتی رہی۔ اکثر دیکھا گیا کہ وہ جو اشخاص کانگرس کے رکن تھے وہی مہاسبھا میں بھی شریک تھے۔ تقسیم برصغیر کی مخالفت میں ہندو مہاسبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ ایک پروگرام کے تحت کام کر رہی تھی اور بلاشبہ کانگرس اور حکومت ہند کی تائید انہیں حاصل تھی۔ ان کا ایک ہی مقصد تھا جو تقسیم کانفرنس کے کمرے میں بیٹھ کر کی گئی ہے اسے قتل و غارت گری سے سبوتاژ کر دیا جائے اس طرح پاکستان قائم ہی نہ ہو سکے گا اگر ہو گیا تو فوراً منہدم ہو جائے گا۔

پھر جوں جوں تقسیم کے دن نزدیک آنے لگے، اگست کے شروع ہی میں وسیع پیمانے پر سکھوں کو ساتھ ملا کر پنجاب میں بدامنی شروع ہو گئی۔ اس بات کی وافر شہادتیں موجود ہیں کہ یہ فسادات راشٹریہ سیوک سنگھ کے اشارے پر سکھوں نے شروع کیے تھے۔ لاہور امرتسر اور شیخوپورہ کے پورے پورے علاقے فسادات کی لپیٹ میں آ کر جلنے لگے۔ پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں شعلے اٹھ رہے تھے اور دیہات میں مسلح گروہ لوٹ مار کر رہے تھے، جلا رہے تھے، قتل عام کر رہے تھے اور زنا بالجبر ہو رہے تھے۔ ہزاروں خواتین اٹھا لیں گئیں جن کو ان کے عزیز و اقارب نے پھر کبھی نہ دیکھا۔ پنجاب کی سرحدی فوج جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں تھے، امن و امان قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ فوج کی جماعتوں نے

...کے لوگوں پر فائر کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر یہ فوج توڑ دی گئی اور ہندوستان اور پاکستان کی فوج کے
...کیا کہ امن قائم کریں۔ مغربی پنجاب میں بھی مسلمانوں نے نہیں، سکھوں اور ہندوؤں نے 2 مارچ 1947ء
...شروع کی تھی اور مسلمانوں کو حفاظت خود اختیار کے تحت ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ شاید ان حفاظتی مقابلے میں
...پہنچا ہو مگر مسلمانوں کی یہ مدافعت جارحانہ نہیں تھی۔ اس پر مسلمانوں کو قائداعظم کے احکامات کی تعمیل فرض تھی
...درمیان جو اقلیتیں ہیں ان کی حفاظت کرو اور اسی وجہ سے انتہائی اشتعال کے باوجود مسلمان قائداعظم کے احکام
...کرتے رہے تھے۔ لیکن سکھوں نے کیا کیا اور ہندوؤں نے کیا کیا ان مظالم کو قلم بیان نہیں کر سکتا۔ انہیں مظالم کی وجہ سے
...کی خونیں انقلاب سے بھی کہیں زیادہ خونچکاں اور خون آلودہ ہے۔

...میں انیسویں صدی میں جو علاقائی قومیت پرستی کا نظریہ ابھرا تھا ہندو وہی نظریہ ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے
...نزدیک ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سب علاقائی طور پر ایک ہی قوم "ہندوستانی" تھے۔ آج بھی اسی یک قومی
...پرچار کر کے ہندو اسلام اور ہندومت کا فرق ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر اسلام کی حقانیت کو ختم نہیں کر سکتے۔ ہندوؤں
...کی قومی نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں نے دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اسی دو قومی نظریہ کی بنیاد پر بالآخر
...ہند میں تقسیم ہوا۔ 1857ء میں دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد اور وہاں کے آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر کو
...کرنے کے بعد انگریزوں نے پورے برصغیر پر نوے سال حکومت کی۔ جبکہ بنگلہ دیش پر برطانوی راج تقریباً ایک
...قائم رہا، جبکہ پاکستانی علاقوں پر یہ راج تقریباً ایک سو سال قائم رہا۔ انگریزوں کا دور برصغیر کی تاریخ کا بڑا اہم
...اس دور میں زندگی کے ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا جو برصغیر کی تاریخ میں
...کہلاتا ہے۔ یہ دور صنعتی ترقی اور سائنس کا دور تھا۔

انگریزوں نے جہاں برصغیر کو لوٹا وہاں ذرائع نقل حمل کو ترقی بھی دی اور برصغیر میں ایک سرے سے دوسرے سرے
...پختہ سڑکوں اور ریل کی پٹریوں کا جال بچھا دیا۔ دریاؤں پر فولادی پل تعمیر کئے۔ لیکن ان تمام سہولتوں کے ساتھ غلامی
...انہیں دھوکے اور آزادی کے متوالے آزاد ہو کر رہے۔

...بیداری کا زمانہ:

برطانوی حکومت نے انیسویں صدی کے آخر میں نظام حکومت کے سلسلے میں برصغیر کے باشندوں کی رائے معلوم
...کی ضرورت اور شکایات کے بارے میں ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کے نام سے ایک
...جماعت قائم کرائی جو عوام کی شکایات حکومت تک پہنچاتی تھی۔ بعد میں یہ جماعت عوام کی نمائندہ اور طاقتور جماعت
...اور ہندوستانیوں کے مطالبات زیادہ جرات سے حکومت کو پیش کرنے لگی۔ انہیں مطالبات میں ایک نمائندہ حکومت کا
...مطالبہ تھا۔ سرسید مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو کانگرس میں
...ہونے سے روکا اور جدید تعلیم کے حصول پر زور دیا۔ ان کے نزدیک سیاست کے میدان میں اترنے سے مسلمانوں اور
...میں پھر تصادم ہو سکتا تھا جو مسلمانوں کے لئے انجام کار نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ ان کی مخالفت کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ
...ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور مسلمان پوری آبادی کے ایک چوتھائی تھے۔ اس لیے اگر یہاں برطانوی

پارلیمانی جمہوریت کی طرز پر نمائندہ حکومت ہوتی تو مسلمان ہمیشہ کے لئے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہندو اکثریت کے سامنے بے بس ہوتے۔ پھر طریق انتخابات کا مسئلہ بھی پیچیدہ تھا۔ اگر مسلمانوں میں برطانوی طریقہ انتخاب رائج کیا جاتا تو اول تو مسلمان منتخب ہی نہیں ہو پاتے، اگر ہو جاتے تو ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے والے (آج ہندوستان میں یہ صورت حال ہے۔ ایک فالور مسلمان ہوتے جو مسلمانوں کی صحیح طور پر نمائندگی نہیں کر سکتے تھے۔ سر سید احمد خان کے انتقال کے بعد مسلمانوں نے اپنے قومی وجود کے تحفظ اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر 1906ء میں مخلوط انتخاب کی بجائے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔ جسے برطانوی حکومت نے منظور کر لیا۔ اس مطالبے کے ساتھ مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت بھی محسوس کی اور اس مقصد کے لئے 30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں کل ہند مسلم لیگ وجود میں آئی۔ یہ مسلمانوں کی پہلی قومی سیاسی جماعت تھی۔ اس کا پہلا باقاعدہ اجلاس دسمبر 1907ء میں کراچی میں منعقد ہوا۔ ادھر کانگرس میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کی گئی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر جیسے راہنما اس جماعت میں شامل ہوئے۔ 1919ء سے 1922ء تک تحریک خلافت کے نام سے ایک تحریک چلائی جس نے ترک موالات یعنی برطانوی حکومت سے عدم تعاون کی شکل اختیار کر لی۔ تحریک خلافت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا مگر اس کے بعد ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد ختم ہو گیا۔ کانگرس ایک سیکولر جماعت ہونے کے باوجود مختلف معاملات میں مسلمانوں کی مخالفت اور ہندوؤں کے مفاد کی نمائندہ جماعت بن گئی اس نے مسلم اکثریت رکھنے والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق تسلیم نہیں کئے اور اردو زبان کے حقوق تسلیم نہیں کئے اور اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے خلاف محاذ بنالیا اور ہندی زبان کی سرپرستی کرنے لگے۔ ہندو مسلم اختلاف ابھرنے کے زمانے میں مولانا محمد علی کا انتقال ہو گیا اور ان کے خلا کو پر کرنے کے لئے علامہ اقبال جیسے راہنما میدان میں اترے اور اپنی کوششوں سے مسلمانوں کو مایوسی سے بچایا

....

علامہ محمد اقبال (تعارف)

علامہ محمد اقبال 1877ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1899ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ 1908ء میں واپس پنجاب تشریف لائے۔ اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر اور مفکر تھے۔ انہیں حالی اور اکبر کی طرح قومی موضوع پر شاعری کی اور اپنی شاعری سے قوم میں بیداری پیدا کی اور اسلام کا پیغام ان تک پہنچایا۔ اسی وجہ سے علامہ کو شاعر اسلام بھی کہا جاتا ہے۔ اقبال میں اسلام کی انقلابی تعلیمات کا شعور بدرجہ اتم موجود تھا انہوں نے یورپی وطنیت اور قوم پرستی کو رد کرتے ہوئے مسلمان قوم کو الگ حیثیت کا مالک قرار دیا جس کے لئے ہندوستان میں ایک الگ ریاست قائم ہو۔

..................29 دسمبر 1930ء کو انہوں نے خطبہ الہ آباد میں مسلم ریاست کے تصور کو پیش کیا اور یقین ظاہر کیا کہ

یہ ریاست قائم ہو کر رہے گی۔ اسکے بعد جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کیا تو یہ علامہ اقبال ہی تھے جنہوں نے اپنے خطوط میں تقسیم برصغیر کا یہ تصور زیادہ واضح الفاظ میں ان تک پہنچایا۔ 21 اپریل 1938ء کو علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا، مگر اس کے صرف دو سال بعد 23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں ان کی تقسیم کی تجویز کو قرارداد پاکستان کی شکل میں عملی شکل دے دی۔ پاکستان کی آزاد مملکت مسلمانوں نے جس راہنما کی قیادت میں قائم کی وہ محمد علی جناح تھے جنہیں عوام قائداعظم کے خطاب سے یاد کرتی ہے۔ قائداعظم جب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو اس وقت مسلم لیگ کو صرف کاغذی جماعت کی حیثیت حاصل تھی، لیکن قائداعظم کی صدارت میں مسلم لیگ میں ایک نئی جان پڑ گئی اور وہ ایک فعال جماعت بن گئی۔ 1936ء کے انتخابات میں تو مسلم لیگ کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی لیکن 1946ء میں ہونے والے انتخابات میں مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے اور صوبائی اسمبلیوں کی 441 نشستوں میں سے 425ء پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے اور اس طرح مسلم لیگ آئینی طور پر مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔

....

قائداعظم محمد علی جناح

محمد علی جناح 25 دسمبر 1876ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سندھ مدرسۃ الاسلام سے حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے۔ انگلستان سے واپسی پر انہوں نے بمبئی میں رہائش اختیار کر لی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ سیاست میں حصہ لینے کے بعد پہلے کانگرس اور پھر 1913ء میں مسلم لیگ کی نمائندگی اختیار کی۔ اول اول آپ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر تھے۔ مگر بعد ازاں آپ نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی اور سیاست سے کنارہ کش ہو گئے بلکہ ملک ہی چھوڑ دیا اور انگلستان میں رہنے لگے۔ علامہ اقبال اور دیگر لوگوں کی دعوت پر دوبارہ 1934ء میں ہندوستان واپس آئے اور 1936ء میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ اگلے 11 سال میں آپ نے وہ کارنامہ انجام دیا جو مسلمان راہنماؤں میں کوئی دوسرا انجام نہ دے سکتا تھا۔ وہ تھا تقسیم برصغیر اور پاکستان کا قیام۔

....

پھر 19 اپریل 1946ء کو دہلی میں مسلم لیگ سے منتخب ارکان اسمبلی کا ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں یہ قرارداد پیش کی گئی کہ ”شمال مغرب میں پنجاب، سرحد صوبہ سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک خودمختار مملکت مسلم ریاست کے طور پر قائم کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر اگر کوئی دستور مسلط کرنے یا مرکز میں مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف جبراً عبوری انتظام کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمان اپنی بقا اور قومی تحفظ کے لئے ہر ممکن طریقوں سے اس کی مخالفت کریں گے۔ یہ تھا مسلمانان ہند کا آخری فیصلہ جو انہوں نے تقسیم برصغیر کے حق میں دیا تھا۔
پھر جب برطانوی حکومت تقسیم برصغیر کا منصوبہ، برصغیر پاک و ہند کے راہنماؤں کو پیش کیا تو 3 جون 1947ء کو آل

انڈیا ریڈیو نے قائد اعظم پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے اپنی اپنی قوم کی طرف سے منصوبے کی منظوری کے اعلان نشر کیے۔ جس کی تصدیق آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور 14 جون کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی نے کر دی۔ 22 جولائی کو وائسرائے کی صدارت میں ہندوستان اور پاکستان میں اقلیت کی حفاظت کی ضمانت میں معاہدہ ہوا جو اعلان عافیت و آزادی کہلایا اور جس میں اقلیت کی جان و مال و آبرو اور مذہب کی حفاظت کا عزم کیا گیا مگر مشرقی پنجاب میں لیڈروں اور سکھ تقسیم کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ 28 جولائی 1947ء سے وسط نومبر تک ہندوؤں اور سکھوں نے جو حملے کیے ان کی تعداد کچھ یوں ہے۔

☆ مسلمان مہاجرین کی ٹرینوں پر 54 حملے
☆ سیالکوٹ اور جموں کی سرحد پر 63 حملے
☆ واہگہ اور قصور کی سرحدوں پر 28 حملے

ہندوؤں اور سکھوں کے ان حملوں میں کتنے مسلمان قتل ہوئے اور کتنی خواتین بے آبرو ہوئیں اور کیا کیا مظالم کیے گئے اس کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرقی پنجاب کے مسلمان اس ہنگامہ و فساد کے لئے بالکل تیار نہ تھے، ان میں کوئی عسکری تنظیم نہیں تھی اور وہ بالکل غیر مسلح تھے۔ حملہ آوروں کی تعداد کہیں سینکڑوں اور کہیں ہزاروں میں تھی۔ وہ سب تلواروں برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہوتے اور ان کے پاس آتشیں اسلحہ بھی ہوتا تھا۔ وہ برین گنوں، بندوقوں اور سٹین گنوں یہاں تک کہ توپوں تک سے مسلح ہوتے تھے۔ یہ ہندو اور سکھ حملہ آور پہلے ریٹائرڈ فوجی افسروں سے تربیت یافتہ تھے اور فوج اور پولیس کی قیادت میں اور ان کی اعانت سے حملے کرتے تھے۔ ان حملہ آوروں کے درمیان مسلمانوں کی حالت بالکل وہی تھی جو ہانکے کے شکار میں ہرن جیسے بے ضرر جانور کی ہوتی ہے۔

تقسیم برصغیر کے خلاف مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے دلی میں جو کچھ کیا گیا اس کے متعلق ایک فوجی افسر کے بیان کا خلاصہ مورخین نے کچھ یوں دیا ہے۔ یہ فوجی افسر ہیڈ کوارٹر انڈیا کی کوارٹر ماسٹر جنرل برانچ کے ساتھ اس مقصد کے لئے مقرر کیے گئے تھے کہ حکومت پاکستان کی کراچی کو روانگی کا بندوبست کریں۔

4 ستمبر 1947ء

غیر مسلم پناہ گیروں کے کیمپوں میں ہر روز جلسے ہو رہے تھے۔ مشرقی پنجاب کی حکومت کو ہدایت تھی کہ پاکستان کے عملے یا اس کے مال و اسباب بچ کر نکلنے کا موقع نہیں دیا جائے۔ دہلی کی طرف سے آنے والی تمام ٹرینوں پر حملے کیے جاتے اور مسافر تہ تیغ کر دیئے جاتے۔ دہلی میں کرفیو کے نفاذ کے باوجود سکھ تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جیپوں میں گھومتے نظر آتے تھے۔ نواح دہلی میں 3 ستمبر کو فسادات شروع ہو گئے۔ پالم کے ہوائی اڈے سے جلتے ہوئے دیہاتوں کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ ان دیہات کے مسلمان باشندوں کو لوٹا گیا، قتل کیا گیا اور گھروں سے نکال دیا گیا۔

7 ستمبر:

پنجاب میل کے بعد جو ٹرین بھی آئی بی پی پر دہلی سے روانہ ہوتی وہ نظام الدین کے قریب روک لی جاتی تھی۔ مسلمان مسافروں کو گھسیٹ کر اتار لیا جاتا اور ہلاک کر دیا جاتا۔ 9 بجے کے بعد دہلی کے اسٹیشن پر قتل عام اور لوٹ مار کا ہنگامہ شروع

ہوگیا۔ 9 بجے کر دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ کناٹ پیلس میں لوٹ مار شروع ہوگئی۔ پولیس اور فوج الگ کھڑی تماشہ دیکھتی رہی اور اس نے لوٹ مار کرنے والوں کو کچھ نہ کہا۔ دہلی کے تمام حصوں سے لوٹ مار اور قتل و آتشزنی کی خبریں آرہی تھیں۔ 5 ستمبر کو کافرول باغ میں امتحان کے ہال کے باہر بہت سے ان مسلمان لڑکوں کو ذبح کر دیا گیا جو میٹرک کا امتحان دینے کے لئے آئے تھے۔ 7 ستمبر کو لودھی اور ولنگٹن کے اڈے پر جو مسلمان مارے گئے ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ایک انگریز نے بتایا کہ اس ہنگامہ قتل میں مسلمانوں کو مارنے کے لئے اسٹین گنیں اور تلواریں استعمال کی گئیں۔ ابھی ایسے بہت سے بیانات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں جن میں ہندوؤں کے شدید رویئے کا ذکر ہے جو ان میں حقیقتاً تقسیم برصغیر کے خلاف ابھرا تھا۔

قیامِ پاکستان:

7 اگست کو قائداعظم کراچی پہنچ گئے، جہاں 11 اگست کو پاکستان کی مجلس دستور ساز کا پہلا اجلاس ہوا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر کے وائسرائے اور گورنر جنرل کی حیثیت سے کراچی آکر 14 اگست کو نئی مملکت پاکستان کے اختیارات اس کے نئے گورنر کے حوالے کر دیئے اور 15 اگست کو قائداعظم نے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھالیا۔

قیامِ بھارت:

15 اگست 1947ء کو بھارت وجود میں آگیا اور برصغیر کی تقسیم مکمل ہوگئی مورخین کے مطابق یہ تقسیم تشدد کے بغیر عمل میں نہ آسکی۔ جغرافیائی اعتبار سے مختلف نسلی گروہ اور مذہبی گروہ برصغیر میں مل جل کر رہتے تھے۔ اگرچہ بھارت اور پاکستان ایسی مملکتیں نہیں بن سکے جن میں صرف ہندو یا مسلمان ہی رہتے۔ ان کے ساتھ اب بھی مختلف اقلیتیں شامل ہیں۔ تقسیم کا جو خط پنجاب میں کھینچا گیا اس سے قوموں میں سخت تلخی پیدا ہوگئی تھی جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں جانیں تلف ہوگئیں۔ ہندو پاکستانی جب علاقے سے نکل کر ہندوستان چلے گئے جبکہ مسلمان ہندوستان سے پاکستان آئے اس سے پناہ گیروں کا مسئلہ دونوں ملکوں کے لئے پیدا ہوا اور اس نے نازک صورت حال اختیار کی۔ مگر چند سالوں میں اسے معقول طریقے سے حل کر لیا گیا۔ 1947ء میں تقسیم کے باعث یہ خطرہ بھی پیدا ہوا تھا کہ دونوں ملکوں میں جنگ شروع ہو جائے گی مگر آخر دونوں نے اس تقسیم کو قبول کر لیا اور یوں برصغیر پاک و ہند میں انقلاب آزادی جو 1857ء کے انقلاب آزادی سے بھی زیادہ خونیں انقلاب تھا پایہ تکمیل کو پہنچا۔

☆

خانہ جنگی اور چین میں 1949ء
کمیونسٹ انقلاب کی تکمیل

22 جنوری 1949ء کو قوم پرست قوتوں نے پیکنگ کا کنٹرول چینی کمیونسٹوں کے حوالے کر دیا جو اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ طویل عرصے سے چین میں جاری خانہ جنگی اب ختم ہونے کو ہے۔ ایک مہینے سے زائد محاصرے کے بعد جنرل فو تسوی (نیشنل کمانڈر) اور کمیونسٹوں کے درمیان ایک سمجھوتہ میں ملک کا کنٹرول بڑے پرسکون ماحول میں منتقل کر دیا گیا۔

اگرچہ چین میں صدیوں سے قائم شہنشاہت کو ختم کر دیا گیا تھا اور جمہوری حکومت قائم ہو گئی تھی، لیکن افراتفری اور بے چینی ختم نہ ہو سکی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مختلف چینی صوبوں کے گورنروں کو بڑی فوجی طاقت حاصل تھی اور وہ اپنے لئے مستقل اقتدار کے خواب دیکھ رہے تھے۔ دوسرے جاپان چین کو اپنے زیر اثر رکھنے کے لئے کوشاں تھا۔ 1917ء میں مانچو خاندان کی شہنشاہی ایک بار پھر قائم کرنے کی کوشش کی گئی، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس سال چین نے جرمنی، آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اپنے علاقوں میں ان دو یورپی ملکوں کے حقوق ختم کر دیے۔ جاپان نے روس میں کمیونزم کے خطرے کا احساس کرتے ہوئے اپنی تربیت یافتہ چینی فوجوں کو سائبیریا بھیج دیا، اور منچوریا میں ترقیاتی منصوبوں کے لئے قرضوں کا انتظام کیا۔ جنگ ختم ہوئی چین کے جو علاقے جرمنی کے زیر اثر تھے، صلح کانفرنس میں انہیں چین کو واپس دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر بڑا احتجاج ہوا، منگولیا کے حاکم نے چین کی برتری مان لی۔ 1920ء سے 1926ء تک چین میں خانہ جنگی کا سلسلہ رہا یہی وہ زمانہ تھا جب قوم پرست چیانگ کائی شیک برسر اقتدار آیا۔ اور ڈاکٹر سن یات سن کی وفات کے بعد قوم پرست تحریک کا سربراہ بنا۔

قوم پرستوں کی کامیابی:

حکومت چین نے 1914ء میں ساٹھ لاکھ ڈالر کی رقم امریکہ کو ادا کر دی۔ یہ اس رقم کا بقایا تھا جو 1910 کے شورش کے دوران میں بطور تاوان چین کے ذمہ ڈالی گئی تھی۔ 1926ء میں چیانگ کائی شیک نے شمالی علاقوں کی شورش ختم کرنے کی مہم شروع کر دی۔ ادھر 1927ء میں اس کے مخالف کمیونسٹوں نے نانکنگ پر قبضہ کر لیا۔ چیانگ کائی شیک اور قوم پرست پارٹی، کومن تانگ کے قدامت پسند ارکان نے انتہا پسند ارکان کے ساتھ مل کر ایک نئی حکومت بنا ڈالی۔ شمالی علاقوں

کی مہم کے دوران چیانگ کائی شیک کو کئی خطرات سے بھی سابقہ پڑا لیکن وہ کمیونسٹوں کو شہروں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ 1928ء میں نانکنگ کی حکومت کا اقتدار خاصے بڑے علاقے میں مستحکم ہو گیا۔ 1931ء میں قومی کنونشن نانکنگ میں منعقد ہوئی جس نے نیا دستور منظور کر لیا۔ غرض عام حالات بہتر ہو رہے تھے۔ مگر جاپان کی مداخلت نے اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دی۔

جاپان کی دراندازیاں:

جاپان کوریا اور منچوریا میں بدستور شورشوں اور فتنوں کی آگ بھڑکاتا رہا، یہاں تک کہ 1932ء میں منچوریا میں بادشاہی قائم کر دی گئی اور اسے چین سے الگ کر کے اس کا نام مانچوکو رکھ دیا گیا۔ کوریا پہلے ہی جاپان کے زیر اثر تھا۔ روس نے مشرقی چین کی ریلوے لائن 1935ء میں مانچو کے حوالے کر دی۔ جاپانی فوج مسلسل فتح و تسخیر میں لگی رہی۔ 1937ء میں جاپان نے چین کے خلاف باقاعدہ جنگ شروع کر دی، بعض شہروں پر بے دردی سے بم برسائے گئے۔ پہلے جنوبی چین کی ناکہ بندی کی تھی، پھر پورے ساحلی چین کی ناکہ بندی کا انتظام کر لیا۔ جمعیت اقوام نے جاپان کے اس اقدام کی مذمت کی۔ چین کا دارالحکومت نانکنگ سے چنگ کنگ لے جایا گیا۔ نانکنگ بھی شدید جنگ کے بعد جاپانیوں کے قبضے میں چلا گیا، اور انہوں نے وہاں خوفناک ظلم کیے۔ اکتوبر 1938ء میں کینٹین اور ہنکاؤ بھی جاپانیوں کے قبضے میں آ گئے۔ یہ حالات تھے جب دوسری عالم گیر جنگ شروع ہو گئی۔

تعلیمی تحریک:

اس دوران چین میں تعلیمی تحریک کو بھی بڑی تقویت پہنچی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یورپی اقوام کے تعلقات زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ اور یورپی فکر و ادب کے لئے چین میں اشاعت کی اچھی صورتیں نکل آئیں تھیں، دوسرے جمہوری حکومت کے تحت عوام میں تحریر و تقریر اور روشن خیالی کے اچھے مواقع پیدا ہو گئے تھے۔ بہت سے اخبار نکلے جرائد شائع ہوئے جن سے لوگوں کا علمی ذوق بڑھا۔ تعلیمی تحریک کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1912ء میں ابتدائی تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد 28 لاکھ تھی جبکہ 1935ء میں یہ تعداد بڑھ کر ایک کروڑ سولہ لاکھ اڑتیس ہزار تک پہنچ گئی تھی جو تعلیمی تحریک کی انقلابی کامیابی تھی۔

انقلابی خانہ جنگی:

کیم اگست 1927ء کو شمالی مہم کی فوج کے تیس سپاہیوں نے جو چینی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں رہ چکے تھے، یا اس سے متاثر تھے، صوبہ چیانگ شی کے شہر نان چھنگ میں مسلح بغاوت کر دی، اس بغاوت کی قیادت چو این لائی۔ چو تہ ہ لونگ اور دیگر انقلابی کر رہے تھے۔ اکتوبر کے اوائل میں انہیں قوم پرست فوج نے آگھیرا اور بھاری جانی نقصان پہنچایا۔ 11 دسمبر 1927ء کو کوانگ چو میں چانگ تھائی لی اور لیہ چیان ینگ کی قیادت میں مسلح بغاوت کا آغاز ہوا، جس میں شمالی مہم کی فوج کی چوتھی آرمی کی ٹریننگ کور اور کوانگ چو کے مزدوروں کے سرخ محافظوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ان بغاوتوں نے کومنتانگ کے قتل عام کی پالیسی پر ضرب کاری ضرب لگائی۔ اس کے بعد چینی کمیونسٹ پارٹی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو

گئی جس کی دوران مزدوروں اور کسانوں کی سرخ فوج کا قیام عمل میں آیا۔۔۔۔۔

ماؤزے تنگ (تعارف)

ماؤزے تنگ (1893ء - 1976ء) کمیونسٹ راہنما اور چین کی تحریک آزادی کا قائد وسطی چین کے صوبہ ہونان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ 1911ء میں ڈاکٹر سن یات سن کی اس تحریک میں شامل ہو گیا جس کا مقصد چین میں جمہوریت قائم کرنا تھا۔ 1917ء میں روس میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا تو ماؤ اس سے متاثر ہوا۔ 1918ء میں گریجویشن مکمل کر کے بیجنگ میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوا۔ یہاں انقلاب پسندوں کی خفیہ تحریک کا رکن بن گیا۔ 1925ء میں اس نے اپنا مشہور مقالہ ''چینی معاشرت میں طبقات کا تجزیہ'' لکھا، جس کی وجہ سے 1927ء میں چیانگ کائی شیک نے کمیونسٹوں کے خلاف کاروائی کا آغاز کیا تاریخ میں یہ جنگ انقلابی خانہ جنگی کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ جنوری 1949ء تک جاری رہی۔

انقلابی لانگ مارچ:

اکتوبر 1934ء میں 80 ہزار سپاہیوں پر مشتمل سرخ فوج کی پہلی فرنٹ آرمی نے (جسے مرکزی سرخ فوج بھی کہا جاتا تھا) صوبہ فوچیان کے علاقوں چھانگ تھینگ اور نینگ ہوا اور صوبہ چیانگ شی کے علاقوں ژوئی چن اور یوی تو کو چھوڑ کر لانگ مارچ کا آغاز کیا اور یہ سرخ فوج چار محاصروں کو توڑ کر کوانگ تو نگ ہونان اور کوانگ شی سے ہوتی ہوئی کوئی چو جا پہنچی۔ لانگ مارچ کے دوران سرخ فوج کو سخت خطرات کا سامنا کرنا پڑا اور اسے بھاری نقصانات بھی اٹھانے پڑے، حتیٰ کہ اس کے پچاس فی صد سے بھی کم سپاہی اس مہم سے زندہ بچے۔ اس لانگ مارچ میں چھ ہزار میل کا فاصلہ طے کیا گیا۔ مشرقی چین سے ماؤزے تنگ کی راہنمائی میں یہ کمیونسٹ فوج شمال مغربی چین میں ینان پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ فاصلہ طے کرنے میں اسے 368 دن لگے اس دوران وہ چین کے بارہ صوبوں سے گذرے۔ انہیں 18 سلسلہ ہائے کوہ اور 24 دریاؤں کو عبور کرنا پڑا۔ تاریخ عالم کا یہ سب سے طویل سفر تھا۔

جاپانی سامراج کے خلاف متحدہ مزاحمت:

فروری 1933ء جاپان چین پر پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہو گیا تھا، مگر قوم پرست راہنما چیانگ کائی شیک نے اس حملے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پانچ لاکھ کی فوج کے ساتھ مرکزی انقلابی کمیونسٹ علاقے کے خلاف محاصرے اور سرکوبی کی چوتھی مہم کا آغاز کیا تھا۔ تاہم انقلابی سرخ فوج نے اس کے اس حملے کو بھی ناکام بنا دیا۔ 1933ء تک کمیونسٹ انقلابی فوج کی تعداد تین لاکھ تک جا پہنچی۔ اکتوبر 1933ء میں چیانگ کائی شیک نے ایک بار پھر انقلابی علاقوں چیانگ شی اور فوچیان کے خلاف تقریباً دس لاکھ فوج کے ساتھ پانچویں مہم کا آغاز کیا۔ اس مرتبہ سرخ فوج اپنے سے بہت بہتر فوج کے خلاف ناکام

چینی دستے لانگ مارچ کر کے مرکزی انقلابی علاقہ چھوڑنا پڑا۔ ابھی خانہ جنگی اپنی پوری شدت سے جاری تھی کہ جاپان کی فوج نے مارکو پولو پل یا لوکو چیاؤ پر حملہ کر دیا (7 جولائی 1937ء) یہ مقام پیکنگ کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ واقعہ چین کی تاریخ میں "لوکو چیاؤ" واقعہ کے نام سے مشہور ہے اور اس سے جاپان کے خلاف چین کی ہمہ گیر جنگ مزاحمت کا آغاز ہوتا ہے۔

واقعہ لوکو چیاؤ کے اگلے دن ملک کی سالمیت کو خطرے میں دیکھتے ہوئے چینی کمیونسٹ پارٹی یا انقلابیوں نے ایک اعلان نامہ جاری کیا جس میں تمام چینی قوم کو جاپان کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ مزاحمت میں شریک ہونے کی اپیل کی گئی۔ جاپان کے خلاف فوجی متحدہ محاذ کے قیام کی رسمی کارروائی کی رفتار تیز کرنے کے لیے پارٹی نے ایک اور اعلان 15 جولائی کو جاری کیا، جس میں کومنتانگ (قوم پرست) اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان خانہ جنگی سے قطع نظر کرتے ہوئے، اشتراک وتعاون پر زور دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چوان لائی کو صوبہ چیانگ شی روانہ کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ چیانگ شیک سے اس معاملے پر گفتگو کرے۔

13 اگست کا جاپان نے شنگھائی پر حملہ کر دیا۔ اس کا اگلا ٹارگٹ چینگ تھا۔ اب چیانگ کائی شیک کا اقتدار اور چین میں برطانیہ اور امریکہ کے مفادات خطرے میں پڑتے نظر آئے جس سے کومنتانگ کے پاس جنگ مزاحمت میں حصہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے چین کی کمیونسٹ پارٹی سے معاہدہ کیا اور اس معاہدے کے تحت سرخ فوج کا نام تبدیل کر کے "قومی انقلابی فوج کی آٹھویں روٹ آرمی" رکھا گیا، ستمبر میں کومنتانگ نے کومنتانگ۔ کمیونسٹ اشتراک عمل کے سلسلے میں اعلان جاری کیا اور چینی کمیونسٹ پارٹی کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس طرح جاپان کے خلاف قومی متحدہ محاذ کے قیام کی رسمی کارروائی مکمل ہو گئی۔

اکتوبر 1938ء میں ڈوہان اور کوانگ چو پر قبضہ کرنے کے بعد جاپان کی پیش قدمی رک گئی جس سے یہ جنگ اسٹراٹیجک تعطل کا شکار ہو گئی۔ چیانگ کائی شیک اور اس کے ساتھی متزلزل نظر آنے لگے اور انہوں نے کمیونزم کے خلاف سرگرمی سے اور جاپان سامراج کے خلاف غیر فعال انداز میں جدوجہد کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ 1939ء کے موسم سرما سے 1943 کے موسم گرما تک چیانگ کائی شیک نے کمیونسٹوں کے خلاف تین بھرپور حملے کیے۔ تاہم چینی کمیونسٹ پارٹی نے اپنا دفاع کرتے ہوئے ہر بار اس کی فوجوں کو شکست دی اور کومنتانگ کے تمام حملوں کو ناکام بنا دیا۔

جاپان کے خلاف فتح:

دنیا بھر میں فسطائیوں کے خلاف اتحادیوں کی فاتحانہ مہم کے دوران چین کے آزاد شدہ علاقوں نے بھی 1944ء میں جاپان کے خلاف جزوی طور پر جوابی حملے کیے اور بعض اہم فتوحات حاصل کیں۔ 1945ء کے موسم بہار تک ملک کے 19 علاقے آزاد ہو چکے تھے، جن کی مجموعی آبادی ساڑھے نو کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔ ان علاقوں میں سرخ فوج کو عوام کی اعانت حاصل تھی۔ جاپانی حملہ آور پسپا ہو کر بڑے شہروں تک محدود ہو گئے۔ 8 اگست 1945ء کو سوویت یونین نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اس کی سرخ فوج نے چین کے شمال مشرقی صوبوں میں جاپانی جارحین کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ دریں اثناء آزاد علاقوں میں عوامی فوج نے بھی بڑے پیمانے پر جوابی حملے شروع کر دیے 14 اگست کو جاپان

نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے 2 ستمبر کو اس نے متعلقہ دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ یوں آٹھ سالہ جدوجہد کے بعد جاپان کے خلاف جنگ میں عوام کو آخری اور مکمل فتح حاصل ہوئی۔

تیسری انقلابی خانہ جنگی:

اگست 1945ء میں چیانگ کائی شیک نے امریکہ کی ہدایت پر امن کا ایک منصوبہ وضع کیا اور انقلابی راہنما ماؤزے تنگ کو تین بار تار ارسال کیا کہ وہ چھونگ چھینگ میں آ کر اس سے مذاکرات کرے۔ کائی شیک کی اس چال کا مقصد یہ تھا کہ اگر ماؤزے تنگ نے اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تو اس پر الزام لگایا جا سکے گا کہ وہ خانہ جنگی شروع کرنا چاہتا ہے اور اگر اس نے مذاکرات کی دعوت قبول کر لی تو امن مذاکرات کے ذریعے عوام کو فریب دیا جا سکے گا اور جنگ کے لیے تیاری کا وقت بھی مل جائے گا۔ حقیقی امن کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے اور کومنتانگ کا اصلی چہرہ بے نقاب کرنے کے لیے چینی کمیونسٹ پارٹی نے ایک وفد چھونگ چھینگ بھجوایا۔ اس وفد کے سربراہ خود ماؤزے تنگ ہی تھے 10 اکتوبر 1945ء کو دونوں گروہوں نے ایک دستاویز پر دستخط کیے جس میں خانہ جنگی سے بچنے کی کوششوں اور طاقتور چین کا قیام عمل میں لانے کی تجویز پر زور دیا گیا تھا۔

تاہم ابھی معاہدے کا اعلان ہی ہوا تھا کہ کومنتانگ کے لاکھوں فوجی جنوب مشرق میں آزاد شدہ کمیونسٹ علاقوں پر حملے کے لیے پیش قدمی کرنے لگے۔ جوابی کارروائی میں سرخ فوج اور عوام نے کم از کم ایک لاکھ جارحین کو غیر فعال بنا دیا اور کومنتانگ کی خانہ جنگی کو شروع کرنے کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس پر چیانگ کائی شیک نے امن قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے 10 جنوری 1946ء کو صلح نامے پر دستخط کر دیئے۔ مگر آزاد شدہ علاقوں پر اکا دکا حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس دن صلح نامے پر دستخط ہوئے اسی دن کمیونسٹ پارٹی نے چین کی دوسری سیاسی پارٹیوں سے سیاسی مشاورت کانفرنس منعقد کی جس میں کومنتانگ کے ایجنٹوں نے حملہ کر کے کم و بیش ساٹھ مندوبین کو زخمی کر دیا بعد میں کومنتانگ نے کئی سیاسی راہنماؤں کا سیاسی قتل بھی کیا۔ چیانگ کی ناکامی کو کومنتانگ کی چھٹی مرکزی کمیٹی کے دوسرے مکمل اجلاس میں جو مارچ میں منعقد ہوا چیانگ کائی شیک نے سیاسی مشاورت کانفرنس کی مذکورہ قراردادوں کو پرزے پرزے کر دیا اور 26 جون کو کومنتانگ کے فوجی دستوں نے آزاد کمیونسٹ علاقوں پر حملہ کر دیا۔ خانہ جنگی پھر شروع ہو گئی۔

اکتوبر 1947 میں عوامی فوج نے آزادی کا ایک منشور جاری کیا جس میں عوام سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ چیانگ کائی شیک کا تختہ الٹ کر چین کو آزادی سے ہمکنار کریں۔ اسی منشور پر عمل کرتے ہوئے عوامی فوج نے ہر محاذ پر کومنتانگ کی فوجوں کو شکست دی اور شمال میں واقع مشرقی اور وسطی چین کے بہت سے علاقے آزاد کرا لیے۔ چیانگ کائی شیک کی تمام فوجوں کا صفایا کر دیا۔ یکم جنوری 1949ء کو چیانگ کائی شیک نے ایک اعلان جاری کیا جس میں ایک بار پھر امن کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ 22 جنوری کو پیکنگ کمیونسٹوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ماؤزے تنگ نے بھی حقیقی امن قائم کرنے کے لیے آٹھ شرائط پیش کیں جن میں جنگی مجرموں کو سزا دینے کی شرط بھی شامل تھی۔ اس پر چیانگ کائی شیک نے ریٹائر ہونے کا اعلان کیا۔ یکم اپریل کو کومنتانگ کے راہنماؤں نے امن کی دستاویز پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اگلے دن 21 اپریل 1949ء کو عوامی فوج آزادی کے دس لاکھ سپاہیوں نے دریائے یانگ سی کو عبور کر کے جنوب کی جانب پیش قدمی

شروع کر دی۔ 23 اپریل کو اس نے نان چینگ پر قبضہ کر لیا۔ جو چیانگ کائی شیک کی رجعت پسند حکومت کا مرکز تھا اس طرح کومنتانگ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر عوامی فوج نے برق رفتاری سے کومنتانگ کی باقی ماندہ فوجوں کا تعاقب کر کے جون جولائی 1950ء تک مکمل صفایا کر دیا۔

عوامی جمہوریہ چین کا قیام:

21 ستمبر 1949ء کو چینی سیاسی مشاورتی کونسل کا مکمل اجلاس پئی پھنگ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں 662 مندوبین نے شرکت کی۔ کانفرنس میں پئی پھنگ یا پیکنگ کا نام بدل کر بیجنگ رکھا گیا اور ماوزے تنگ کو مرکزی جمہوری حکومت کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ چواین لائی کو نئی جمہوریہ کا وزیراعظم اور وزیر خارجہ نامزد کیا گیا۔ یکم اکتوبر 1949ء کو بیجنگ میں تین لاکھ شہریوں نے تھیان آن من چوک میں ایک تقریب میں شرکت کی جس میں نئے چین کے قیام کا رسمی طور پر اعلان کیا گیا۔ یہ اعلان چیئرمین ماوزے تنگ نے کیا۔ دنیا کی چوتھائی آبادی کے بیدار ہو کر چینی تاریخ کے نئے دور میں داخل ہونے کا اعلان۔ ماوزے تنگ کے عوامی جمہوریہ چین کے اس اعلان آزادی کو ہندوستان، برما، روس، برطانیہ وغیرہ نے تسلیم کر لیا اور ملک میں وسیع پیمانے پر تعمیری کام شروع ہو گیا، لیکن عوامی جمہوریہ چین کے قیام سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو بڑا دھچکہ پہنچا۔ کومنتانگ کا باغی راہنما چیانگ کائی شیک اپنے بچے کھچے سپاہیوں کے ساتھ جزیرہ فارموسا روانہ ہو گیا جو بعد ازاں تائیوان کہلایا۔ 1950ء میں تائیوان کی عوامی جمہوریہ چین سے حفاظت کے لئے امریکہ نے اپنا ساتواں بحری بیڑہ بھیج دیا۔ 1955ء میں امریکہ نے تائیوان کی حفاظت کی ذمہ داری لی۔ تائیوان کو اقوام متحدہ میں امریکہ کے بل بوتے پر پورے چین کی نمائندگی حاصل رہی۔ کہیں جا کر 1971ء میں اسے اقوام متحدہ سے نکالا گیا۔ 1975ء تک چیانگ کائی شیک تائیوان کا صدر رہا۔ اس کی وفات کے بعد ین چیا گن وہاں کا صدر بنا۔

☆

1952ء مصر برطانوی دور سے فوجی انقلاب تک اور مابعد

مصراوردامِ غلامی:

آج کل مصر دنیا کے اہم ترین ملکوں میں شامل ہوتا ہے، لیکن مصر کی اہمیت انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب سے قبل کچھ نہ تھی۔ دنیا اسے محض ایک قدیم تہذیب کے گہوارے کی حیثیت سے جانتی تھی۔ مگر جب یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہوا اور مصنوعات کی کھپت کے لئے یورپی سامراجی نئے بازاروں کی تلاش میں نکلے تو انہیں معلوم ہوا کہ مصر ہی ایک ایسا مقام ہے جسے یورپ اور ایشیا کے درمیان دروازہ کہا جاسکتا ہے اور جہاں سے ہوکر مشرق و مغرب کے راستے گذرتے ہیں۔ نپولین بونا پارٹ پہلا یورپی حکمران تھا جس نے اس حقیقت کو محسوس کیا اور 1798ء میں مصر پر حملہ کردیا۔ کئی سال تک اس کی فوجیں مصر پر قابض رہیں۔ اسی دوران نپولین نے مصری زبان، مصری معاشرت، اور مصری تاریخ کو یورپ میں متعارف کرایا۔ اس دوران خود مصر کو یورپ اور اہل یورپ کی ترقیوں کا براہ راست علم ہوا، مگر یورپ کی الجھنوں کی وجہ سے نپولین مصر پر مستقل تسلط قائم نہ کرسکا، مگر اہل یورپ کے لئے نئی راہیں کھول گیا۔

محمد علی پاشا:

1808ء میں محمد علی پاشا نے سلطان ترکی کے نام پر مصر فتح کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔ سلطان ترکی نے محمد علی پاشا کو وائسرائے مصر مقرر کردیا، لیکن محمد علی پاشا حکمرانی کے باوجود یورپ کی طاقتیں اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے باز نہ آئیں۔ شروع میں تو فرانسیسی آئے تھے پھر برطانیہ نے اپنا حلقہ اثر مصر تک بڑھایا۔ اس سے فرانس اور برطانیہ میں رقابت بھی بڑھی۔ اٹلی کے لئے بھی مصر کی اہمیت کچھ کم نہ تھی۔ آخر 1887ء میں انگلستان اور اٹلی میں ایک خفیہ معاہدہ طے پایا کہ اگر اٹلی مصر پر انگریزی اقتدار کو برداشت کرے تو برطانیہ اس کے معاوضے میں طرابلس پر اطالوی قبضہ گوارا کرے گا۔ اس معاہدے کے بعد اٹلی سے انگلستان کی رقابت تو ختم ہوگئی مگر برطانہ اور فرانس میں چشمک باقی رہی۔ آخر بیسویں صدی کے وائل میں ایک ایسا خفیہ معاہدہ فرانس اور برطانیہ میں بھی طے پاگیا جس کی رو سے فرانس نے مصر سے اس شرط پر ہاتھ اٹھایا کہ مراکش کے معاملے میں برطانیہ کچھ نہیں بولے گا۔ لیکن یہ سب معاہدے خفیہ اور اندر ہی اندر تھے۔ ظاہر ہے سب یورپی

طاقتیں ہمیشہ بڑے زور و شور کے ساتھ مصر کی آزادی کا اعلان کرتی رہیں۔ ادھر محمد علی پاشا کے عہد میں یورپی طاقتوں کے قدم مصر میں جم سکے۔......

محمد علی پاشا

محمد علی پاشا 1769ء۔1848ء مصر کا خدیو حکمران۔ ابتدا میں عثمانی وائسرائے کی حیثیت سے مصر کو فتح کر کے والیِ مصر بنا دیا گیا۔ 1818ء میں نجد کی وہابی تحریک کے خلاف فوجی کاروائی کر کے نجد پر قبضہ کر لیا۔ سلطان ترکی سے اختلاف کی بنا پر خود 1831ء میں بغاوت کر دی لیکن اگلے ہی سال صلح کر لی۔ سلطان محمود ثانی نے اسے شام کا بھی والی مقرر کیا۔ 1841ء میں مصر کا موروثی حکمران بنا دیا گیا۔ 1830ء میں سوڈان فتح کر کے مصر میں شامل کر لیا۔ فرانسیسی مشیروں کے تعاون سے مصر میں جدید فوجی نظام کی بنیاد ڈالی۔

......محمد علی پاشا دراصل مصر کا خود مختار والی و حاکم تھا۔ اسی بنا پر اس کے انتقال کے بعد موروثی حکمران کے طور پر اس کے بیٹے ابراہیم پاشا کو تخت نشین کیا گیا، مگر تخت نشینی کے صرف دو ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد اس بیٹا عباس پاشا حاکم مصر بنا، مگر خاندان ملوکیہ کے بچے کھچے افراد نے اس کے دادا محمد علی پاشا کی فتح مصر کا بدلہ لینے کے لئے اسے بھی صرف چار سال بعد قتل کر دیا۔ اب محمد علی پاشا کے سب سے چھوٹے بیٹے سعید پاشا کا والی مصر بنایا گیا۔ نہر سویز بنانے کی منظوری اسی نے دی تھی۔ سعید پاشا کے بعد 1863ء میں اس کا بھتیجا اسمٰعیل پاشا تخت نشین ہوا، اس نے سلطان ترکی کو خوش کرنے کے لئے خراج کی رقم دگنی کر دی اور سلطان کی جگہ ''خدیو'' کا لقب اختیار کیا۔ نہر سویز کا کام اسی کے عہد میں 1869ء میں پایا تکمیل کو پہنچا اور 18 نومبر 1969 ہی کو پہلا بحری جہاز اس نہر سے گزرا۔ 1872ء میں سلطان ترکی نے اسمٰعیل پاشا کو غیر ملکوں سے معاہدے کرنے اور فوج رکھنے کا اختیار دے دیا۔ دوسرے لفظوں میں مصر کا خود مختار حکمران بن گیا اور داخلی اور خارجی امور میں پوری طرح آزاد ہو گیا۔ اسمٰعیل پاشا نے خود مختاری کے حصول کے بعد ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا۔ ان منصوبوں میں بجٹ بنانے یا آمدنی و خرچ کا حساب رکھنے کی وجہ سے جلد ہی نوبت قرض لینے تک پہنچی۔ اہل یورپ ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ بڑی نیازمندی سے اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر پہنچ گئے۔ مگر اخراجات بڑھنے کی وجہ سے خدیو کی ضرورتیں روز بروز بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ 1875ء میں وزیر اعظم انگلستان نے نہر سویز کے حصص خریدنے کی پیشکش کی۔ خدیو کو روپیہ چاہیے تھا، چنانچہ مصر کے حصص صرف 40 لاکھ گنی میں فروخت کر دیئے گئے۔ مورخین کے مطابق انگلستان کے لئے یہ تجارت بڑی منافع بخش رہی اور نہر سویز کے حصص ہی انگلستان کا اقتدار مصر پر قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئے۔ نہر کی نگرانی کے بہانے انگلستان کی فوجیں آسانی سے مصر میں داخل ہو گئیں۔ نہر سویز سے گذرنے والے جہازوں میں برطانوی جہاز 1933ء میں 55 فی صد تک پہنچ گئے۔ لیکن خدیو مصر نے قرضوں کا بوجھ اتنا بڑھا لیا تھا کہ نہر سویز بیچنے کے بعد بھی اس کی گلو خلاصی نہ ہو سکی اور انگلستان اور فرانس نے مصر کی آمدنی کے دیگر شعبوں پر بھی قبضہ کر لیا

اور یہاں تک کہ مصر کے پورے مالیے پر قابض ہو گئے۔ اسمٰعیل پاشا کی مالی پریشانیوں کی وجہ سے سلطان ترکی نے 1879ء میں فرانس اور برطانیہ کی در پردہ کوششوں سے اسمٰعیل پاشا کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا توفیق پاشا حاکم مصر بن گیا۔ انگلستان کو 2 مزید مواقع ایسے میسر آئے کہ وہ سرزمین مصر پر اپنا سامراجی تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

احمد عربی پاشا (تعارف)

احمد عربی پاشا 1841ء۔ 1911ء: مصری تحریک آزادی کا مشہور راہنما۔ ازہر سے تعلیم حاصل کی اور فوج میں بلند منصب حاصل کیا۔ بعد ازاں وزیر جنگ مقرر ہوا۔ ملک میں غیر ملکی اثر کا سخت مخالف تھا۔ 1882ء میں انگریزی اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی اور تل الکبیر کے مقام پر سخت جنگ لڑی۔ اپنوں کی غداری کی وجہ سے شکست کھائی۔ گرفتاری کے بعد سزائے موت دی گئی جو جلاوطنی میں بدل دی گئی۔ اگلے انیس برس سری لنکا میں جلاوطنی میں بسر کیے۔ 1901ء میں واپس مصر آئے، اسی دور میں تصنیف و تالیف کا کام کیا۔

دامِ صیاد سے نکلنے کی اولین کوشش:

ایسا پہلا موقع 1882ء میں پیش آیا جب مصر کے وزیر جنگ عربی پاشا کی قیادت میں ترکی اور یورپ دونوں کے اقتدار کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا گیا۔ مغربی ممالک کے خلاف مصری عوام کے جذبات مشتعل تو تھے ہی، لیکن جس چیز نے عربی پاشا کی تحریک کو آگ کی طرح پورے ملک میں پھیلایا وہ قانون ادائیگی قرضہ تھا۔ جو پانچ یورپی طاقتوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے خدیو مصر توفیق پاشا نے پاس کیا تھا۔ اس قانون نے مصریوں کو یقین دلایا کہ اب یورپ سود خور ساہو کاروں کی طرح مصر کو ہڑپ کیے بغیر نہیں رہے گا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ سلطان ترکی بھی یورپ کا مالی اسیر ہے، وہ بھی اہل مصر کے لیے کچھ نہ کر سکے گا۔

برطانیہ کی مداخلت:

1882ء میں احمد عربی پاشا کی قیادت میں مصر نے ترکی اور فرنگی دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہ تحریک دراصل مصر کی پہلی قوم پرستانہ تحریک تھی۔ عربی پاشا نے خدیو مصر سے مطالبہ کیا کہ وہ وزارت کو بدل دے اور فوج کی تعداد بڑھا کر 18 ہزار کر دی جائے۔ عربی پاشا چونکہ وزیر جنگ تھے اس لیے مصر کی پوری فوج نے ان کا ساتھ دیا اور اس نے مستقل جنگ شروع کر دی۔ اس موقع پر برطانیہ نے فرانس، ترکی اور خدیو مصر تینوں کے سامنے بغاوت سے پیدا ہونے والے بھیانک نتائج کا نقشہ کھینچا اور ان کی اعانت حاصل کی اور پھر پوری طاقت سے تحریک کو کچل ڈالنے کے لیے فوجی اقدامات شروع کر دیئے۔ عربی پاشا اور برطانوی فوجوں میں باقاعدہ ٹھن گئی۔ شروع میں مصری فوجیں غالب رہیں مگر برطانیہ نے ہندوستانی سپاہیوں کی کمک پر کمک منگوالی۔

برطانیہ نے اس جنگ کا آغاز اسکندریہ کے خوبصورت شہر پر بے دریغ گولہ باری سے کیا۔ آخر دو مہینوں کی مسلسل جنگ کے بعد عربی پاشا اور اس کی فوج کو شکست ہوگئی اور اس طرح انگریزی اقتدار کا راستہ صاف ہوگیا۔ عربی پاشا گرفتار ہوئے اور انہیں سزائے موت سنائی گئی، مگر عوام میں ان کی مقبولیت کی وجہ سے یہ فیصلہ منسوخ کر دیا گیا اور انہیں لنکا میں قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ 19 برس محبوس رہے۔ 1901ء میں انہیں مصر جانے کی اجازت ملی، مگر اب ان کے قویٰ جواب دے چکے تھے اور مصر پر برطانوی تسلط بھی مکمل ہو چکا تھا۔ انگریزی سامراجیت کا نمائندہ لارڈ کرومر تھا جس نے مصری تحریک آزادی کو کچلنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ عربی پاشا کی تحریک ناکام ہو جانے کے بعد، برطانیہ کا ایک ایجنٹ مستقل طور پر مصر پر متعین کر دیا گیا جو مصر پر برطانیہ کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ تاہم بظاہر مصر کی آزادی کو بحال اور قسطنطنیہ سے اس کا تعلق برقرار رہا۔

مہدی سوڈانی:

عربی پاشا کی شکست کے بعد مصر پر قبضہ جمانے کا دوسرا موقع برطانیہ کو مہدی سوڈانی سے مقابلے کی وجہ سے ہاتھ آیا۔ مہدی سوڈانی کی تحریک مذہبی رنگ رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے مصری عوام نے خیال کیا کہ عربی پاشا کی جو تحریک ناکام ہو چکی ہے وہ مہدی کی قیادت میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔ اسی احساس کی وجہ سے مصری تحریک قومیت کے تمام عناصر سمٹ کر مہدی کے گرد جمع ہوگئے۔ مہدی سوڈانی کی یہ تحریک مصر۔ ترکی اور برطانوی حکومتوں کو سخت ناگوار گذری، سوڈان ابھی مصر کے زیر حکومت تھا۔ چونکہ مصر اور ترکی دونوں اس بغاوت کو دبانے سے قاصر تھے اس لئے برطانیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مہدی کی بغاوت کو دبانے کے سلسلے میں سوڈان کے سارے علاقے کی نگرانی اپنے نام منتقل کرا لی۔ 1885ء میں مہدی کا انتقال ہوگیا، مگر اس کا بیٹا خلیفہ کی حیثیت سے سوڈان کی مفتوحہ علاقہ پر قابض تھا اور مزید فتوحات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ 1896ء میں برطانوی جنرل لارڈ کچنر کی قیادت میں انگریزوں اور مصر کی متحدہ فوجوں نے مہدی سوڈانی کے جانشینوں کے خلاف جنگ شروع کی جو دو سال جاری رہی اور کچنر کی فوجیں پورے سوڈان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ عوام کے دل سے مہدی کی روحانی عظمت زائل کرنے کے لئے اور اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے انگریزوں نے مہدی کی قبر سے اس کی ہڈیاں تک نکال کر پامال کیں اور ان کی توہین وتذلیل کی۔ قسطنطنیہ اور قاہرہ میں اس خبر پر خوشی منائی گئی کہ دغاباز کا حشر اچھا ہوا۔ مگر اب برطانوی انتداب کی شکل میں اس سے کہیں زبردست وطاقتور مہدی ان پر مسلط ہوگیا

مصر برطانوی اقتدار میں:

اصلاً 1882ء میں ہی مصر پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہوگئی تھی۔ یہ بالادستی 1922ء تک قائم رہی۔ برطانوی تسلط اور استعماراتی حکمت عملی سے مصر میں قومی وسیاسی تحریک کو فروغ حاصل ہوا اور اصلاحات کا وہ کام جو اعرابی پاشا شروع کیا اور جس کی آبیاری سید جمال الدین افغانی نے کی ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ 1892ء میں توفیق پاشا کو بھی معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ عباس ثانی کو گدی پر بٹھایا گیا۔ انہیں حالات کے دوران 1914ء میں پہلی عالم گیر جنگ چھڑ گئی۔ آغاز جنگ کے چند دن بعد برطانیہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ۔ مصر کو ملک معظم کی حمایت میں لیا جاتا ہے آج کے

بعد اسے برطانیہ کا زیر حمایت علاقہ تصور کیا جائے۔ اس اعلان سرپرستی کے ساتھ ہی مصر کے خدیو عباس ثانی کو بھی معزول کر دیا گیا اور ان کی جگہ حسین کامل نے لے لی اور سلطان مصر کا لقب اختیار کیا۔ دوران جنگ مصریوں سے برطانیہ نے جس برے برتاؤ کا رویہ اختیار کیا اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ برطانیہ کا وعدہ تھا کہ مصر کے جوانوں کو بھرتی نہیں کیا جائے گا، مگر امدادی فوج کے نام پر جبری انہیں بھرتی کیا گیا اور ترکوں کے خلاف انہیں لڑایا بھی گیا۔

مہدی سوڈانی

محمد احمد مہدی سوڈانی (1843ء-1885ء) دینی تعلیم مکمل کر کے عبادت گزاری کے لئے دریائے نیل کے ایک جزیرے میں جا بیٹھے۔ وہیں ان کے گرد درویشوں کا ایک حلقہ اکٹھا ہو گیا۔ اسی زمانے میں انگریزوں کے ہاتھوں مصری اور سوڈانی عوام پر بڑی سختیاں ہوتی تھیں۔ مہدی انہیں روکنا چاہتے تھے۔ حکام کو ان کی یہ روش پسند نہ تھی۔ حکومت نے ایک دستہ فوج ان کی گرفتاری کے لئے بھیجا جسے ان کے ساتھ درویشوں نے شکست دی۔ ریاضت اور نیک عملی کی وجہ سے مہدی مشہور ہو گئے۔ انگریزوں نے بلاوجہ الزام لگایا کہ انہوں نے مہدی منتظر ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ البتہ انگریزوں کے خلاف جنوبی سوڈان میں ایک تحریک انہوں نے شروع کی تھی۔

عوام کی بے چینی اور جدوجہد آزادی:

زمانہ جنگ کے مصائب کا نقشہ ابھی مصریوں کے دماغ سے محو نہ ہوا تھا کہ مصریوں کو صلح نامہ پیرس میں شامل نہ کیا گیا۔ اس برطانوی طرز عمل سے انہیں معلوم ہوا کہ اب مصر برطانیہ کے پنجہ اقتدار میں دبا ہوا ہے اور آزادی کی نعمت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس طرز عمل کے معلوم ہوتے ہی مصر میں غیظ و غضب کی ایک آگ لگ گئی۔ سعد زاغلول پاشا اس وقت کے سب سے نمایاں ممتاز اور ہردلعزیز مصری راہنما تھے۔ وہ کئی بار مصر کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے مصر کے مطالبہ آزادی کو منوانے کے لئے ایک جماعت بنائی جو وفد پارٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس جماعت میں لوگ جوق در جوق شامل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے مصر میں تہلکہ مچ گیا۔ برطانیہ نے جب یہ حالات دیکھے تو مارچ 1919ء میں زاغلول پاشا کو اس کے تین ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا اور انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ برطانیہ کی اس پالیسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اب مصریوں کا غم و غصہ قابو سے باہر ہو گیا، جس کے نتیجے میں توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔ ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیئے گئے، ریلوے لائن اکھاڑ پھینکی گئیں، لیکن توڑ پھوڑ کے اس جہاد میں خاص قابل ذکر بات یہ تھی کہ یہ سب توڑ پھوڑ نہایت امن و سکون سے کی گئی اور اس میں کوئی انسانی جان تلف نہ ہوئی صرف ایک گاؤں میں اٹھارہ انگریز قتل ہوئے اس کے علاوہ پورے مصر میں خون کا ایک قطرہ تک نہ بہایا گیا۔ برطانیہ نے عوامی بغاوت کچلنے کے لئے لارڈ ایلن بی کو ہائی کمشنر بنا کر بھیجا لارڈ ایلن بی نے جب دیکھا کہ عوام آزادی کے مقابلے میں جان کو اہمیت نہیں دے رہے تو اس نے تشدد کی بجائے مفاہمت کی پالیسی اپنائی۔ زاغلول پاشا اور اس کے ساتھی جلاوطنی سے واپس بلا لئے گئے اور راہنماؤں کی ایک کانفرنس منعقد کرائی

کہ ملک میں امن وامان بحال ہو چکے۔ ایلن بی نے ان سے اپیل کی کہ اگر موجودہ جدوجہد کو ختم کر دیا جائے تو برطانیہ مصر کے مطالبہ آزادی پر غور کرنے کے لئے تیار ہے۔

مشروط اعلانِ آزادی:

اس اپیل کے بعد اگرچہ توڑ پھوڑ کا جہاد ختم کر دیا گیا مگر اس کی جگہ پرامن حربے یعنی ہڑتالیں وغیرہ شروع ہو گئیں۔ اہل مصر کا جوش وخروش دبا نہیں بلکہ اس کا رستہ بدل گیا۔ اب برطانیہ کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اعلان حمایت و سرپرستی منسوخ کرے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ مصر کو یورپ اور ایشیا کے درمیان رستے کی حیثیت حاصل تھی، اس سے بے تعلق ہو جانا برطانوی مفاد کے خلاف تھا۔ برطانوی دانش وروں نے بڑے غور وخوض کے بعد 28 فروری 1922ء کو ایک اعلان کیا جس میں مصر کو آزاد اور مختار مطلق آزاد ریاست تسلیم کر لیا مگر یہ اعلان آزادی مشروط تھا۔ انہی شرائط میں برطانوی مدبرین نے برطانوی مفاد کا راز کا پوشیدہ کر دیا تھا۔ شرائط کچھ یہ تھیں:

1. سلطنت برطانیہ مصر کے ذرائع آمد ورفت کی نگرانی کرے گی۔
2. مصر پر حملہ کرنے والی غیر ملکی طاقت کا مقابلہ بھی سلطنت برطانیہ کی ذمہ داری ہوگی۔
3. اقلیتوں کے حفاظتی امور اور مصر کے خارجی معاملات کی دیکھ بھال بھی برطانوی حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔
4. سوڈان کی حکومت برطانیہ کے پاس رہے گی۔

سعد زاغلول پاشا (تعارف)

مصریوں کی اس جنگ آزادی میں سعد زاغلول پاشا مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتے تھے، وہ ہٹلر، گاندھی، مصطفیٰ کمال ہر ایک سے جدا شخصیت کے مالک تھے۔ مگر مصریوں میں جو ہر دلعزیزی حاصل تھی وہ کسی اور راہنما کو حاصل نہ تھی۔ ان کا تعلق فلاحین مصر (کسانوں) سے تھا۔ 1860ء میں پیدا ہوئے۔ ازہر سے تعلیم پائی۔ 1882ء میں انگریزی اقتدار کے خلاف جو بغاوت ہوئی اس میں پیش پیش تھے۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد گرفتار ہوئے مگر رہا ہو کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا، مگر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے جلد ہی وزیر تعلیم بنائے گئے اور وزیر قانون کی حیثیت سے مصر کے قبطی عیسائیوں سے سمجھوتہ کیا۔ حب الوطنی کے جرم میں دو بار جلاوطن کئے گئے۔ ان کی وفد پارٹی کی کامیابی کے بعد وزیر اعظم بنائے گئے۔

اعلان آزادی کی ان شرائط پر مصر میں سخت ہنگامہ اٹھا۔ خاص طور پر پہلی اور دوسری شرائط کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ سوڈان بھی دریائے نیل کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے مصر کے لئے بہت اہم تھا کیونکہ وہاں سے دریائے نیل کو بند کر کے مصر کو تباہ کیا جا سکتا تھا۔ 1922ء میں برطانیہ کی طرف سے جو آزادی مصر کو دی گئی اس کے مطابق اسمٰعیل پاشا کے بیٹے فواد کو آزاد مصر کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ اسمٰعیل پاشا نے نہر سویز برطانیہ کے ہاتھ فروخت کر کے قوم کے لئے غلامی خریدی تھی، لیکن یہ کام بیچارہ اپنی ماؤف ذہنیت سے انجام دینا چاہتا تھا۔ مصری اس سے نفرت کرتے تھے اور وہ ملک برطانیہ کی سنگینیوں کی

پھر اس میں مصر کا بادشاہ بنا ہوا تھا۔ مصری معنوی بادشاہت سعد زاغلول پاشا اور ان کے وفد پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ 1923ء میں ایک جمہوری دستور کا اعلان کیا گیا۔ مصری پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے، جن میں وفد پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی اور سعد زاغلول پاشا وزیر اعظم بنائے گئے۔ مصر کے سامنے اب ایک ہی سوال تھا اسے کامل آزادی دی جائے۔ زاغلول پاشا نے برطانیہ کے سامنے بہت سے عارضی حل پیش کیے جن سے مصری عوام کو مطمئن کیا جا سکتا تھا مگر برطانیہ نے ایک نہ سنی۔ اس کے نتیجے میں عوام میں پھر جوش کا سیلاب آ گیا۔ خفیہ انجمنیں بننے لگیں اور دہشت انگیزی پیدا ہو گئی۔ انگریز افسروں کو قتل کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ مصری افواج کا کمانڈر انچیف اور سوڈان کا گورنر جنرل بھی قتل کر دیا گیا۔ برطانیہ نے سارا الزام سعد زاغلول پاشا کے سر لگا دیا۔ مجبوراً انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کے بعد شاہ فواد نے حکومت براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی اور مصر میں استبداد کا دور شروع ہو گیا۔ برطانیہ نے یہ حالات دیکھے تو خوشی کا اظہار کیا۔ 1926ء تک یہ حالات رہے اس کے بعد پھر الیکشن ہوئے اور وفد پارٹی کی جیت ہوئی مگر سر لائیڈ جارج نے جو مصر میں ہائی کمشنر تھا زاغلول پاشا کے وزیر اعظم بننے پر اعتراض کیا۔ اپنے آقاؤں کے اعتراض کے بعد شاہ فواد، زاغلول پاشا کو وزارت بنانے کی کیسے دعوت دے سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر سرکاری وزارت بنائی گئی اور مصری آئین کے خلاف وفد پارٹی کو حکومت کو مسند سے دور رکھا گیا۔ اسی دوران سعد زاغلول پاشا کا انتقال ہو گیا۔ سعد زاغلول پاشا کے بعد وفد پارٹی کی قیادت مصطفیٰ النحاس پاشا 1867ء۔1865ء نے سنبھال لی۔ وفد پارٹی نے نحاس پاشا کی قیادت میں 1936ء اور 1942ء میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

مصر کا دوسرا اعلان آزادی:

1935ء کے اوائل میں شاہ فواد نے 1923ء کے منسوخ شدہ آئین کو دوبارہ بحال کرنے کا اعلان کیا، جس سے وفد پارٹی مصر کی واحد طاقت ور جماعت بن گئی۔ اس سے شاہ پرستوں اور قوم پرستوں میں بڑے معرکے ہوئے اور نوبت بلوے تک جا پہنچی۔ آخر ایک غیر جانب دار وزارت بنائی گئی تاکہ مصر کی کامل آزادی کے بارے میں برطانیہ سے بات چیت کرے۔ اس بات چیت کے نتیجے میں 1936ء میں برطانیہ نے ایک دوسرا معاہدہ مصر سے کیا جس پر اگست 1936ء میں لندن میں دستخط کیے گئے۔ اس کے بعد دوسرا معاہدہ 1937ء میں ہوا۔ ان معاہدوں کی رو سے برطانیہ نے مصر سے فوج نکال لی اور صرف نہر سویز کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی فوج باقی رہی۔ سوڈان برطانیہ کے پاس رہا۔ 1936ء میں شاہ فواد کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا شاہ فاروق تخت نشیں ہوا۔

شاہ فاروق کی تخت نشینی:

شاہ فاروق کی عمر تخت نشینی کے وقت صرف سولہ سال تھی۔ شاہ فاروق نے اپنے باپ کے مطلق العنان اور آمرانہ طریقے جاری رکھے حکومت میں عدم دلچسپی کی وجہ سے عیش و عشرت میں مبتلا ہو گیا۔ ان کے عہد میں 1944ء سے 1952ء تک مصر میں پولیس راج قائم رہا۔ وفد پارٹی اور شاہ فاروق کے درمیان اقتدار کی کشمکش جاری رہی۔ اسی کشمکش کے دوران ایک نئی جماعت ''اخوان المسلمین'' مصر میں ابھری جو مصر میں اسلامی انقلاب لانا چاہتی تھی۔ شاہ فاروق کے آمرانہ طرز حکومت کی وجہ سے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ اس زمانہ میں قیام اسرائیل اور فلسطین کی تقسیم سے مزید

دلچسپی پیدا ہوئی۔

فوجی انقلاب اور بادشاہت کا خاتمہ:

جب تقسیم فلسطین کا اعلان ہوا اور انگریزی فوجوں نے 1948ء میں فلسطین خالی کیا تو عوام کے دباؤ کے تحت مصری فوج بھی اسرائیل کی نئی صیہونی مملکت کے خلاف جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہوگئی۔ شام اور اردن کی طرح مصر نے بھی اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کر دیں۔ لیکن مصری فوج اتنی کامیابی بھی حاصل نہ کر سکی جتنی اردن کی مختصر سی فوج نے حاصل کی۔ مصری فوج صرف غزہ کی مختصر سی پٹی پر قبضہ کر سکی۔ بالآخر مصر نے بھی دوسرے عرب ملکوں کی طرح جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا۔

جمال عبدالناصر (تعارف)

جمال عبدالناصر 1918ء۔ 1970ء مصر کے سیاسی راہنما اور صدر۔ ملٹری اکیڈمی قاہرہ سے تعلیم حاصل کی۔ 23 جنوری 1952ء کو انہوں نے شاہ مصر، فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ 1953ء میں نائب وزیر اعظم اور 1954ء میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔ جون 1956ء میں مصر کے صدر اور 1958ء میں عرب متحدہ جمہوریہ کے صدر بنے۔ 25 مارچ 1965 کو اگلے چھ برسوں کے لیے مصر کے صدر منتخب ہوئے، مگر 28 ستمبر 1970ء کو اپنے عہدے کی مدت پوری ہونے سے پہلے وفات پا گئے۔ اپنے عہدہ صدارت کے دوران انہوں نے نہر سویز کو قومیا لینے کا بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔

23 جولائی 1952ء کو فوجی انقلاب، گیارہ فوجی افسروں پر مشتمل ایک خفیہ فوجی تنظیم لائی جو آزاد افسروں کی سوسائٹی کہلاتی تھی۔ شاہ فاروق کو اقتدار سے الگ کر کے آئین منسوخ کر دیا گیا اور عبوری حکومت قائم کر دی گئی 7 ستمبر 1952ء کو نئے کمانڈر انچیف جنرل نجیب وزیر اعظم مقرر کر دیئے گئے۔ 18 جون 1953ء کو بادشاہت کا نظام ختم کر دیا گیا اور ملک کو جمہوریہ قرار دیا گیا۔ جس کے بعد جنرل نجیب صدر بن گئے۔ جنرل نجیب کی سربراہی میں ایک انقلابی کمانڈ کونسل قائم کر دی گئی انقلابیوں نے شروع میں محب وطن افراد کے تعاون سے اصلاحات اور تعمیر جدید کا کام کا آغاز کیا۔ شہریوں کی کمیٹیاں بنائی گئیں تاکہ نئے آئین کی تشکیل اور نئی حکومت کی ترتیب میں مدد کریں۔ 9 ستمبر 1952ء کو اصلاح اراضی کا بھی اعلان کیا گیا۔ دو سو ایکڑ سے زیادہ اراضی رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ انقلابیوں میں سے کسی کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ مستقل حکومت کریں۔ اس لئے توقع تھی کہ جلد جمہوری حکومت بحال ہو جائے گی، مگر یہ خیال جلد ہی غلط ثابت ہوا اور فوجی تسلط مضبوط ہوتا چلا گیا۔ جنرل نجیب اور اس کے ساتھی جلد جمہوریت بحال کرنے کے خواہاں تھے جبکہ جمال عبدالناصر جو اس انقلاب کی پشت پر اصل طاقت تھے جمہوریت کی بحالی کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے انقلاب ناکام ہو جائے گا۔ جنرل نجیب اور کرنل ناصر میں اختلاف بڑھتا چلا گیا، جس کے نتیجے میں جنرل نجیب کو مختلف اختیارات سے محروم کر دیا گیا اور نجیب

صرف صدر رہ گئے۔ اس کے بعد 14 نومبر 1954 کو صدارت کا عہدہ بھی ان سے چھین لیا گیا اور جمال ناصر صدر اور وزیر اعظم دونوں عہدوں پر فائز ہو گئے۔ جنرل نجیب کی حمایت میں کچھ فوجی افسروں نے مظاہرہ کیا جو بے ثمر رہا۔ اس تبدیلی کے بعد سے اخوان بھی جمہوریت کے حامی تھے وہ بھی ناصر کی سختیوں کا نشانہ بنے۔ جنرل نجیب کی علیحدگی کے بعد پورے مصر پر صرف جمال ناصر کا اقتدار قائم ہو گیا۔ وہ اپنی وفات تک تقریباً سولہ برس مصر پر بلا شرکت غیرے حکومت کرتے رہے۔ نہر سویز سے برطانوی فوجوں کی واپسی اور سوڈان سے الحاق مصر جیسے بڑے مسائل چلے آرہے تھے۔ 1951ء میں نہر سویز سے متعلق مصر اور برطانیہ کے معاہدے کی تنسیخ کے بعد برطانوی فوجوں نے یہ علاقہ خالی کر دیا تھا جس سے یہ مسئلہ بڑی حد تک مصری حکومت کی مرضی کے مطابق حل ہو گیا تھا، لیکن سوڈان کا مسئلہ مصر کی مرضی کے مطابق حل نہ ہو سکا۔ یکم جنوری 1956ء کو برطانیہ نے سوڈان کو آزاد کر دیا۔ 1956ء میں مصر کا نیا آئین تیار ہو گیا جس کے تحت کرنل جمال ناصر جمہوریہ مصر کے صدر منتخب ہو گئے۔ اس آئین میں مصر کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیا گیا اور عبادت تحریر و تقریر کی آزادی اور نجی ملکیت کا حق تسلیم کیا گیا۔

اشتراکیت کی طرف جھکاؤ:

صدر ناصر شروع شروع میں مغرب کے خلاف نہ تھے، لیکن 1954 میں وہ روس اور اشتراکی بلاک کی طرف زیادہ جھکنے لگے اور اس طرح مصر اور مغربی ملکوں میں کشمکش شروع ہو گئی جس کا پہلا اظہار اسوان بند کی تعمیر کے سلسلے میں ہوا۔ اسوان بند کی تعمیر کے لئے مغربی ملکوں نے امداد اور قرض دینے کا وعدہ کیا تھا مگر مصر کے اشتراکی میلان کو دیکھ کر قرض دینے کے وعدے کو واپس لے لیا گیا۔ ادھر ناصر نے نہر سویز کو جو اب تک برطانیہ اور فرانس کی ملکیت چلی آرہی تھی، قومی ملکیت میں لے لیا اور اعلان کی اسوان کا بند نہر سویز کی آمدنی سے تعمیر کیا جائے گا۔

اسرائیل کا حملہ:

اس کے جواب میں برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل سے سازش کر کے مصر پر 29 اکتوبر کو حملہ کرا دیا۔ ادھر برطانیہ اور فرانس نے خود بھی نہر سویز کے علاقے میں فوجیں اتار دیں۔ مگر رائے عامہ برطانیہ اور فرانس کی اس جارحیت کے خلاف تھی۔ امریکہ نے بھی اس کی پرزور مذمت کی جس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کو فوجیں واپس بلانا پڑیں۔ اسرائیل نے بھی جزیرہ نما سینا خالی کر دیا۔ نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے کر اور برطانیہ اور فرانس کے حملوں کا جرأت سے مقابلہ کر کے ناصر نے جس ہمت کا ثبوت دیا تھا اس سے مصر کے وقار اور جمال ناصر کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تھا۔ اس مقبولیت کا فائدہ اٹھا کر صدر ناصر نے عرب اتحاد کی کوششیں تیز تر کر دیں۔ 1958ء سے 1960ء تک کا زمانہ عرب اتحاد کی تاریخ میں کامیاب ترین زمانہ تھا۔ 1958ء میں شام نے مصر سے الحاق کر لیا اور متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئی۔ اس جمہوریہ میں یمن بھی شریک ہو گیا، مگر صدر ناصر کی آمرانہ پالیسیوں کی وجہ سے متحدہ عرب جمہوریہ کی گاڑی زیادہ دیر نہ چل سکی اور شام الگ ہو گیا اور پھر یمن نے بھی علیحدگی اختیار کر لی،

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ:

صدر ناصر کا روس کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے روس نے مصر کو اسلحہ اور دیگر امداد سے نوازا جس کی وجہ سے صدر ناصر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ مصر دنیائے عرب کا طاقتور ترین ملک ہے اور اسرائیل کے مقابلے میں وہ روس پر بھروسہ کر سکتا ہے چنانچہ اس نے اسرائیل کو دھمکیاں دینا اور مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ اقوام متحدہ کو جو فوج اسرائیل اور مصر کی سرحد پر متعین تھی اسے واپس بھیج کر آبنائے عقبہ کو جہاز رانی کے لئے بند کر کے مصر نے اسرائیل کی ناکہ بندی کر دی۔ 1967ء کے پہلے ہفتے میں اسرائیل نے بغیر کسی اعلان جنگ کے اچانک مصر پر حملہ کر دیا۔ نہ صرف صحرائے سینا بلکہ دوسرے عرب ملکوں کے بہت سے علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا اور عربوں کو نہایت ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اس شکست نے صدر ناصر کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا، مگر پھر واپس لے لیا۔

☆

ایران انقلاب سے انقلاب تک
1952ء اور ڈاکٹر مصدق کا تختہ الٹا گیا

1933ء میں جو تیل کا نیا معاہدہ کیا گیا اسے ایران اور اینگلوایرانی تیل کمپنی دونوں کو فائدہ پہنچا تھا۔ یہ معاہدہ رضا شاہ اول نے کیا تھا جسے 1941ء میں برطانوی اور روسی فوجوں کے بیک وقت حملے کے بعد ایران کا اتنی بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے اپنے بیٹے محمد رضا کے حق میں دست بردار ہونا پڑا۔ اس لحاظ سے محمد رضا پہلوی کی حکومت کا آغاز بڑے نازک حالات میں ہوا تھا۔ ملک میں چار سال تک روسی اور برطانوی فوجیں قابض رہیں اور ایرانی حکومت ان دونوں بڑی طاقتوں کی مرضی کے بغیر کوئی اہم قدم نہیں اٹھا سکتی تھی، لیکن یہ تسلط عارضی نوعیت کا تھا۔ جنگ کے بعد غیر ملکی افواج ملک چھوڑ گئیں لیکن روسی مداخلت سے ایران کو خطرہ لاحق ہوا تو شاہ کو امریکہ کی طرف جھکنا پڑا اور ایران اور امریکہ میں ایک باہمی سمجھوتہ ہو گیا۔

جب سے ایران میں تیل دریافت ہوا تھا 1933ء کے معاہدے کے باوجود غیر ملکی کمپنی کو ایران سے زائد مالی فائدہ حاصل ہو رہا تھا۔ ایرانی یہ چاہتے تھے کہ تیل کے بڑھتے ہوئے منافع میں ایران کو بھی شامل کیا جائے۔ تیل کمپنی اور ایران میں کشمکش اس قدر بڑھی کہ ایران نے ایک ماہر قانون اور رکن پارلیمنٹ۔ ڈاکٹر مصدق 1879ء۔ 1967ء کو جو قومی محاذ پارٹی کے لیڈر تھے تیل کی صنعت کو قومیا لینے کا مطالبہ پڑا۔ اس کے ساتھ ملک میں ہنگامے پھوٹ پڑے جن کے دوران وزیر اعظم جنرل رزم آرا (1901ء)۔ 1951ء کو 7 مارچ 1951ء کو قتل کر دیا گیا، کیونکہ وہ تیل کو قومی ملکیت میں لینے کے خلاف تھے۔ 29 اپریل 1951ء کو شاہ نے ملکی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر مصدق کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اسی دوران پارلیمنٹ نے ایک بل کے ذریعے اتفاق رائے سے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا، شاہ کو بھی مجبوراً اس بل پر دستخط کرنا پڑے۔ اینگلو ایرانی کمپنی نے اس اقدام کے جواب میں اکتوبر 1951ء میں تیل کے کنویں اور آبادان کی آئل ریفائنری کو بند کر دیا اور انگریز ملازمین کو انگلینڈ واپس بھیج دیا۔ مغرب کے انتظامی اقدامات کے خلاف روس نے ایران کے تیل کے بحران پر قابو پانے کے لئے، روسی ماہرین کی خدمات پیش کیں جو ڈاکٹر مصدق نے رد کر دیں۔ ڈاکٹر مصدق کی اس منفی پالیسی کی وجہ سے ایران شدید اقتصادی بحران میں پھنس گیا۔ اور توڑ پھوڑ کی تحریک اور ہنگامے کمیونسٹوں

فدائیان اسلام نامی ایک مذہبی گروہ نے شروع کی تھی اس پر قابو نہ پایا جا سکا۔ اسی دوران ایران میں..............

ڈاکٹر مصدق

ڈاکٹر مصدق (1880ء۔ 1967ء) ایران کے وزیر اعظم۔ ان کا تعلق شاہان قاچار کے خاندان سے تھا۔ 1906ء میں جب ایران کا آئین بنا تو انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی جس کی پاداش میں انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ 1907ء میں واپس ایران آئے تو انہیں محکمہ بحالیات میں ملازمت مل گئی، لیکن یہاں بھی وہ ٹھہر نہ سکے کیوں کہ ان پر حکومت مخالف کارروائیوں کا الزام تھا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد انہیں وزیر خزانہ کی حیثیت سے کابینہ میں شامل کر لیا گیا، لیکن پھر مخالفانہ سرگرمیوں کی وجہ سے برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اپریل 1951ء میں جب اینگلو ایران تیل کا تنازعہ ابھرا تو حسب سابق انہوں نے حکومت مخالف رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے وہ وزیر اعظم بنا دیئے گئے، مگر محمد رضا شاہ پہلوی کا تختہ الٹنے میں ناکام ہو جانے کے بعد خود ان کا تختہ الٹ دیا گیا اور وہ قید کر دیئے گئے۔ قید کاٹنے کے بعد وہ سخت علیل ہو گئے اور علاج کے لئے یورپ چلے گئے۔ واپسی پر سرطان کے عارضہ میں 1967ء میں انتقال ہو گیا ایران کی ایک انقلابی شخصیت ہونے کی وجہ سے وہ تاریخ ایران میں کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

..............ایک تحریک بھی زور پکڑ گئی وہ یہ تھی کہ بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت قائم کی جائے۔ یہ کوئی نئی تحریک نہیں تھی اور شاہ قاچار کے عہد میں بھی چلتی رہی تھی۔ اگر رضا شاہ کبیر قاچاری حکومت کو ختم کر کے خود بادشاہ نہ بن جاتے تو ایران کب کا ایک جمہوریہ بن گیا ہوتا۔ ایرانی عوام کو ایک شکایت یہ بھی تھی کہ آئین میں علماء کو فیصلہ کن اختیار نہیں دیئے گئے تھے۔

استصواب رائے:

10 اگست 1953ء کو ڈاکٹر مصدق نے ایک استصواب رائے کے ذریعے بادشاہت کو ختم کرنا چاہا۔ جوابی کارروائی میں محمد رضا پہلوی نے ڈاکٹر مصدق کو برطرف کر کے جنرل فضل اللہ زاہدی کو نیا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس کے باوجود ایران میں حالات بادشاہ کے لیے اتنے کے ناسازگار ہو چکے تھے کہ رضا شاہ پہلوی کو ملک سے فرار ہونا پڑا۔ لیکن اسی دوران بادشاہت کے مسئلہ پر فدائیان اسلام اور ڈاکٹر مصدق میں اختلافات پیدا ہو گئے، ادھر سی آئی اے نے ڈالر کے اصراف سے تہران کی سڑکوں پر شاہ کے حق میں مظاہرے کروائے۔ جنرل زاہدی نے فوج کے استعمال سے جو بلوائیوں میں شامل کر لی گئی، ڈاکٹر مصدق کے حامیوں کو کچل دیا گیا اور 9 اگست کو ڈاکٹر مصدق کا تختہ الٹ کر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ڈاکٹر مصدق پر فوجی عدالت میں غداری کا مقدمہ چلایا گیا اور سزائے قید سنائی گئی۔ جنوری 1954ء میں تیل کی کمپنیوں کا ایک کنسورشیم بنایا گیا جس کے بعد ایران کے لئے تیل کی رائلٹی پچاس فی صد کر دی گئی اور برطانوی تیل کمپنی سے ایرانی

حکومت کو منتقل ہو گیا، جس کے تحت اگرچہ تیل ایرانی ملکیت میں ہی رہا مگر اسے نکالنے اور تقسیم کرنے کا ٹھیکہ امریکی کمپنیوں کو دے دیا گیا۔ اس طرح امریکیوں نے 75 ہزار ڈالر خرچ کر کے 75 ارب کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ ان کے لیے سوا ارب ڈالر تھا اور تیل کی فروخت سے حاصل ہونے والے منافع میں ایران کا حصہ پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا۔ ملکی آمدنی بڑھنے سے ملک میں خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

انقلاب سفید:

تیل کی ملکیت کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد شہنشاہ ایران نے ملک کو ترقی دینے اور عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو دور کرنے کے لئے کئی اہم اقدامات کئے، جن کو "انقلاب سفید" کا نام دیا گیا۔ انقلاب سفید کا منصوبہ شاہ نے 26 جنوری 1963ء کو استصواب رائے کے ذریعے منظور کرایا تھا۔ ایرانی حکومت نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے دوسرے منصوبے بھی شروع کئے جن میں سپاہ دانش کے نام پر تعلیم کو عام کرنے کا منصوبہ، سپاہ بہداشت کے نام سے حفظان صحت کا منصوبہ وغیرہ شامل تھے۔ ایرانی خواتین کو بھی پہلی دفعہ حق رائے دہی حاصل ہوا۔ شہنشاہ ایران کو ان کارناموں کی وجہ سے 1965ء میں ایرانی پارلیمنٹ نے ان کی خواہش پر شاہ آریہ مہر کا خطاب دیا۔ گویا وہ آریا نسل کے آفتاب ہو گئے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں ان تمام ظاہری کارناموں کے باوجود ایسی بھیانک آمریت کا آغاز ہوا تھا جس کے آگے قاچاریوں کی مطلق العنانی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔

یہ تھا پس منظر جس میں اندرونی طور پر امریکہ نے ایران میں پیش قدمی کی اور ایک فوجی انقلاب کے ذریعے شاہ کو دوبارہ تخت پر لا بٹھایا۔ 1955ء معاہدہ بغداد میں شمولیت کے ذریعے امریکہ کی سرپرستی قبول کر لی گئی۔ ایران کی جنگی صلاحیت بڑھانے پر شہنشاہ نے ضرورت سے زیادہ توجہ دی، کیونکہ وہ ایران کو دنیا کی عظیم ترین فوجی طاقت بنا دینا چاہتے تھے۔ اسلحہ کی خریداری پر پانی کی طرح پیسہ بہایا گیا اور ہتھیاروں کا اتنا ذخیرہ جمع کر لیا گیا جو کام نہیں آ سکتا تھا۔ ان غلط پالیسیوں کی وجہ سے ایران میں گرانی بڑھ گئی جو عام آدمی کے لئے ناقابل برداشت تھی، پھر سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہوئی کہ اعلیٰ طبقے کی خوشحالی کے ساتھ ساتھ ایران میں وہ تمام اخلاقی خرابیاں عام ہو گئیں جو دولت کی کثرت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ معاشرے میں اسلامی اقدار کو فروغ دینے کی بجائے مغربی تہذیب اور مادیت کو کھل کر فروغ دیا گیا اور جب علما نے حکومت کے اس رویے کی مخالفت کی تو ان کے خلاف سخت کاروائی کی گئی۔ 1963ء میں امام خمینی کو جو بعد میں اسلامی انقلاب کے داعی کی حیثیت سے ابھرے، ایران سے جلاوطن کر دیا گیا۔

جبر استبداد:

شہنشاہ ایران نے عوامی بے چینی کے اسباب معلوم کرنے اور ان کو دور کرنے کی بجائے آمرانہ طریقے اختیار کئے اور مخالفت کو اور مخالف عناصر کو تشدد کے ذریعے دبانے کی کوشش کی۔ ملک میں سیاسی قیدیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی جن کو ساواک نامی خفیہ پولیس کے ادارے کے ذریعے تشدد کا شکار بنایا جاتا تھا یا قتل کروا دیا جاتا تھا اس ریاستی تشدد کی وجہ سے نوجوان ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد امریکہ اور یورپ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ 1971ء میں شاہ ایران نے ایران میں قائم شہنشاہیت کی اڑھائی ہزار سالہ سالگرہ منائی۔ ایک ایسے دور میں جب دنیا میں سلطانی جمہور کا زمانہ آ چکا تھا۔ یہ جشن

بادشاہت ایک بے وقت کی راگنی تھی جسے ایک ایسا حکمران ہی منا سکتا تھا جسے اپنے عوام کے جذبات کی کوئی پروا نہ ہو۔ بادشاہت نے اپنے آمرانہ اختیارات کو مضبوط بنانے کے لئے مارچ 1975ء میں ملک میں تمام سیاسی پارٹیاں ختم کردیں اور صرف ایک سیاسی جماعت رستاخیز قائم کی گئی جس کا صدر سابق وزیراعظم امیر عباس ہویدا تھا۔ اس غیر جمہوری اقدام سے مذہبی مخالفین کو زیر زمین سرگرمیاں اختیار کرنے پر مجبور کردیا گیا۔ مخالفت جتنی بڑھتی گئی حکومت اتنا ہی زیادہ ظلم و جبر اختیار کرتی گئی۔ وکلاء کے ادارے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ایک بیان کے مطابق جو اس نے 1975ء میں جاری کیا تھا، دنیا کے کسی ملک کا انسانی حقوق کا ریکارڈ اتنا خراب نہیں تھا جتنا شاہ کے دور میں ایران کا تھا۔

فری میسن:

یہودیوں کی خفیہ بین الاقوامی تنظیم کو اس دوران میں ایران میں خوب عروج حاصل ہوا شاہ ایران سمیت تمام اہم شخصیتیں فری میسن تحریک سے تعلق رکھتی تھیں۔ امیر عباس ہویدا جو 1965 سے 1975ء تک وزیراعظم رہے تھے گریڈ ماسٹر کے منصب پر فائز تھے ایک سابقہ وزیر خارجہ خلعت بری بھی فری میسن تھے۔ ان کو بھی سزائے موت دی گئی تھی۔ تحریک انقلاب کے دوران وزارت عظمٰی کی کرسی سنبھالنے والے جعفر امامی کے گھر سے جو خفیہ دستاویزات برآمد ہوئیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ ایران میں فری میسن تنظیم ایشیا کی سب سے بڑی اور سب سے فعال تنظیم تھی۔ شاہ ایران خود اس کے رکن تھے ان کے علاوہ ایران کی دیگر اہم شخصیات میں ممتاز سیاسی اور انتظامی شخصیتوں کے علاوہ نام نہاد علماء تک فری میسن بن چکے تھے۔ اصفہان سے جو فہرست برآمد ہوئی تھی اس کے مطابق اصفہان کا ہر قابل ذکر فرد فری میسن ہو چکا تھا۔

مختصر یہ کہ سیاسی گھٹن، آزادی کے فقدان، جاسوسی نظام کی ہیبت، معاشی انصاف کی حالت زار، مغربی افکار و تہذیب کے سیلاب، فری میسنوں اور بہائیوں کی اجارہ داری اور مذہبی عناصر پر جبر و تشدد روا رکھنے سے ایران میں اندر ہی اندر انقلابی لاوا پکنے لگا تھا۔ یہ لاوا آخر کار 1978ء کے اوائل میں اچانک پھوٹ نکلا اور اس سے پہلوی خاندان کی حکومت کی ساری عمارت کو زمین بوس کردیا......

محمد رضا شاہ پہلوی

آریہ مہر محمد رضا شاہ پہلوی 1919ء۔ 1980ء رضا شاہ پہلوی کے بڑے بیٹے اور جانشین انگلستان اور سوئٹزرلینڈ میں تعلیم پائی۔ 1941ء میں والد کی معزولی کے بعد تخت نشین ہوئے۔ پہلی شادی فوزیہ، شاہ مصر کی بہن سے ہوئی مگر بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے بھی اور اس کے بعد ملکہ ثریا کو طلاق دے کر فرح دیبا سے شادی کرلی۔ جس کے بطن سے ان کے بیٹے تولد ہوئے۔ 1953ء میں تیل کی صنعت قومیانے سے جو بحران پیدا ہوا اس پر شاہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ بعد ازاں مصدق کا تختہ الٹ گیا۔ شاہ واپس آگئے اور 1979ء تک برسر اقتدار رہے۔

1958ء سے عراق پیہم انقلابات کی زد میں

14 جولائی 1958ء کو بغداد ریڈیو سے اعلان نشر کیا گیا کہ عراقی فوج شاہ فیصل ثانی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ آرمی نے شاہ فیصل کی اردن بعد میں خبر آئی کہ شاہ فیصل، ان کا ولی عہد اور وزیر اعظم نوری السادات کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اور لبنان میں ہونے والی بغاوتوں کو دور کرنے پر مدد دینے پر مخالفت کی تھی۔ یہ بغاوت دراصل روس نواز گروہ نے کی تھی اور خود عراق کے انقلابی بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس فوجی انقلاب کے سربراہ جنرل عبدالکریم قاسم تھے جو عراقی مسلح افواج کے سربراہ تھے۔ انہوں نے 27 جولائی 1958ء کو عراق کو جمہوریہ قرار دیا لیکن یہ تبدیلی صرف نام کی حد تک تھی اور بادشاہت نے آمریت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ عراقی باشندے جو وزیر اعظم نوری السعید کے دور میں آزادی اور اظہار رائے کا حق چھن جانے پر وزیر اعظم سے نفرت کرتے تھے۔ قاسم کے دور میں زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیئے گئے۔

عراق پر برطانوی تسلط:

عثمانی حکومت کے دور میں 1831ء میں عراق کو براہ راست قسطنطنیہ کے زیر انتظام کر دیا گیا تھا۔ قبائل کی خود مختاری ختم کر کے جدید اصلاحات کا آغاز کیا گیا تھا۔ مواصلات کا جدید نظام قائم ہوا۔ بغداد ریلوے بھی قائم کی گئی۔ اصلاح ترقی کا یہ کام عثمانی سلطنت کے زیر انتظام جاری تھا کہ جنگ عظیم اول چھڑ گئی اور عربوں میں عثمانی سلطنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ 1916ء میں عرب بغاوت شروع ہو گئی تو اس میں عراقی افسر بھی پیش پیش تھے۔ انگریز فوجوں نے 22 نومبر 1914ء کو بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ اور بغداد کی طرف پیش قدمی شروع کر دی لیکن 29 اپریل 1916ء کو ترک فوجوں نے انگریزوں کو کوت العمارہ کے مقام پر شکست دے کر پسپائی پر مجبور کر دیا۔ لیکن اسی سال کے اختتام پر انگریزوں نے دوسرا حملہ شروع کر دیا 16 مارچ 1917ء کو بالآخر بغداد پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ جنگ عظیم اول کے آخری مرحلے پر 4 نومبر 1918ء کو موصل پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح انگریز پورے عراق پر قابض ہو گئے۔

آزادی کا وعدہ:

عربوں نے عثمانی خلافت کے خلاف انگریزوں کی مدد اس شرط پر کی تھی کہ انگریزوں نے ان سے آزادی کا وعدہ کیا تھا۔ مارچ 1920ء میں اس وعدے کے مطابق دمشق میں شریف حسین آف مکہ کے بڑے بیٹے امیر فیصل کو بادشاہ بنا دیا گیا

...نے شریف حسین کے دوسرے بیٹے امیر عبداللہ کو عراق کا حکمران تسلیم کرلیا گیا۔لیکن برطانیہ نے عراقیوں ...کو تسلیم نہیں کیا اور عربوں سے وعدہ خلافی کرتے ہوئے عراق کو براہ راست اپنے انتظام میں لے لیا اور ...نے اس ...پر شور مچایا تو جواب ملا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہم تمہیں آزاد ضرور کریں گے لیکن ابھی ذرا ہوپ ...ہو جانے دو۔لیکن اس کے دو سال بعد برطانوی انتداب قائم رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔انتداب کا اعلان ہوتے ...بغاوت پھوٹ پڑی۔

...آزادی:

...کے ساتھ برطانیہ کے غیر منصفانہ سلوک کے خلاف جولائی 1920ء سے اکتوبر تک بغاوت کا جو طوفان اٹھا اس ...برطانوی سپاہی مجروح و مقتول ہوئے ان دو ہزار برطانوی سپاہیوں میں گورے کم اور ہندوستانی زیادہ تھے۔ ...زخمی اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد 8450 تھی مگر ان کے حوصلے بلند تھے اور ان کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔

...آزادی:

...وں کی ان قربانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ کو جلد ہی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ عراق کے باشندوں کے ...اشتراک کے بغیر ان پر حکومت کرنا ممکن نہیں لیکن آج مسلسل کئی سالوں کی جدوجہد اور لاکھوں عراقیوں کا خون بھی ...یکیوں کے دل پر جمی برف کو نہیں پگھلا سکا اور آج کے دور میں ایک جھوٹے الزام پر یعنی کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری ...الزام میں خوشحال عراقی قوم کو جدید زمانے کے چنگیزیوں نے خاک و خون میں نہلا دیا مگر کیمیائی ہتھیاروں کا سراغ ...سکا مگر افسوس کہ آج اقوام عالم میں کوئی قوم ایسی نہیں کہ امریکہ بہادر سے اس کے ظلم واستبداد اور ناانصافی کے ...بارے میں پوچھ گچھ کرسکے۔کل برطانیہ نے جس بات کا اعتراف کیا تھا مگر آج امریکی عراقیوں کی بے مثال......

شاہ فیصل اول

...فیصل اول 1885ء۔ 1933ء۔ 1921ء میں عراق کے تخت پر بیٹھے شریف مکہ کے تیسرے بیٹے، قسطنطنیہ میں ...تعلیم پائی۔جنگ عظیم اول میں 1916ء تک ترک فوج کے خلاف شام میں خدمات انجام دیں پھر لارنس عربیہ کی ...جماعت میں شامل ہوگئے۔1920ء میں شام میں ان کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا، لیکن فرانس نے اسے شام سے نکال باہر کیا اس کے بعد 1921ء میں برطانیہ نے عراق کا بادشاہ منتخب کیا اور استصواب رائے عامہ سے ان کی بادشاہت کی تصدیق کردی۔شاہ نے ہر معاملہ میں انگریزوں کی حمایت کی۔

......جراتوں کے باوجود اس بات کا اعتراف بھی نہیں کرسکے کہ دنیا کی اس بہادر قوم پر ان کے اپنے اشتراک ...کے بغیر تو حکومت کرنا بھی ممکن نہیں۔خدا کرے کہ ایشیاء کی اس بہادر قوم کو امریکیوں کے چنگل سے جلد آزادی

امیر فیصل کی تخت نشینی:

اکتوبر 1920ء میں چند سربرآوردہ عراقی لیڈروں کو انگریز ہائی کمشنر نے طلب کیا اور عارضی وزارت بنا کر انہیں یقین دلایا کہ جلد ہی عراق کا بادشاہ بھی کسی عراقی ہی کو بنا دیا جائے گا۔ عراق کے وطن پرستوں نے بادشاہ کے لئے ایک ایک آدمی کو منظور کیا۔ لیکن برطانیہ کی خواہش تھی کہ اس کے وفادار دوست امیر فیصل کو عراق کا بادشاہ بنایا جائے۔ کیونکہ فرانس نے اسے شام سے نکال دیا۔ اگرچہ عراق کے وطن پرست حلقوں نے امیر فیصل کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا مگر 23 اگست 1921ء کو باضابطہ طور پر برطانیہ نے فیصل کو شاہ عراق بنا دیا اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ جبکہ عراقیوں کا منتخب شدہ امیدوار بادشاہ جلاوطن کر دیا گیا۔ غیر ملکی انگریز حکومت کے مقابلے میں عراقیوں نے امیر فیصل عرب سمجھتے ہوئے غنیمت جانا مگر جس روز رسم تاجپوشی کے دن امیر فیصل کو لندن سے نوآبادیات کے وزیر نے ٹیلی گرام بھیجا کہ تاجپوشی کی تقریب میں جو خطبہ پڑھا جائے گا اس میں یہ ظاہر بھی کیا جائے کہ عراق میں اقتدار اعلیٰ برطانوی ہائی کمشنر کو حاصل رہے گا۔ امیر فیصل یہ پیغام موصول کر کے سخت پریشان ہوا کیوں کہ اسے معلوم ہوا تھا کہ اگر خطبے میں اس قسم کا اعلان کیا گیا تو عراقی خود اس سے بدظن ہو جائیں گے اور اسے انگریزوں کا پٹھو سمجھ کر اس کے خلاف بھی بغاوت کر دیں گے۔ چنانچہ امیر فیصل نے برطانیہ کو جواب دیا کہ مجھے ایک آزاد بادشاہ بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ایک آزاد بادشاہ کسی ہائی کمشنر کے ماتحت نہیں ہو سکتا۔ ہاں ایک آزاد بادشاہ برطانیہ سے معاہدہ دوستی ضرور کر سکتا ہے۔ چنانچہ پہلا حکم واپس لے کر برطانیہ نے اکتوبر 1923ء میں شاہ فیصل سے ایک "دوستانہ معاہدہ" کر لیا۔

دستور اساسی:

اس معاہدے کے بعد عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل اسمبلی طلب کی گئی جس نے عراق کا آئین تیار کرنے کے کام کا آغاز کیا۔ جون 1924ء میں یہ آئین تیار ہو گیا۔ اس آئین پر برطانیہ کی تقلید میں بادشاہ کے اختیارات محدود کر کے عراق کی بادشاہت کو آئینی بنا دیا گیا۔ اس آئین کے مطابق عراقی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس 1925ء میں منعقد ہوا۔ لیکن عراق کی یہ دکھاوے کی آزادی صرف داخلی اختیارات تک محدود تھی۔ خارجی معاملات ابھی برطانیہ کے ہاتھ میں تھے اس سلسلے میں برطانیہ اور فرانس میں مخاصمت پائی جاتی تھی۔ فرانس جس نے امیر فیصل کو شام سے نکال دیا تھا وہ عراق میں بھی اس کی حکومت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ خفیہ طور پر جانتا تھا کہ امیر فیصل برطانیہ کا آدمی ہے اور اس کی آڑ میں دراصل برطانیہ خود عراق پر حکومت کر رہا ہے برطانیہ کے انہیں شبہات کو دور کرنے کے لئے برطانیہ نے امیر فیصل کو آئینی بادشاہت کا ڈرامہ رچانے کے لئے کہا تھا تاکہ فرانس رام ہو جائے۔ چنانچہ 1925ء میں بالآخر فرانس نے فیصل کی حکومت کو جائز تسلیم کر لیا۔

لیکن عراقی عوام جو برطانوی انتداب سے اصل آزادی کے خواہاں تھے۔ فرانس کے اس فیصلے پر انہیں کوئی خوشی نہ ہوئی۔ عراقی عوام نے ایک بار پھر آزادی کی جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو انہیں فرانس روس اور ترکی کی ہمدردیاں حاصل تھیں، جو برطانیہ سے یہ رقابت رکھتے تھے کہ آخر عراق سے صرف برطانیہ فائدہ حاصل کرے اور دوسرے بھی اس میں

ر کیوں نہ ہوں؟ ان حالات میں برطانیہ نے عراق سے 1927ء میں ایک معاہدہ کیا جس میں اسے ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا اور جمعیت اقوام کا رکن بنانے کے لیے برطانیہ نے عراق کی سفارش کرنے کا وعدہ کیا مگر 1932ء سے پہلے عراق انجمن اقوام کا رکن نہ بن سکا اور 1933ء میں عراق کی آزاد مملکت کو دنیا نے تسلیم کرلیا۔

آزادی کے بعد:

8 ستمبر 1933ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے امیر فیصل کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد ان کے بیٹے شاہ غازی تخت نشین ہوئے، لیکن عین عالم جوانی میں ایک ناگہانی حادثے میں ان کی موت بھی واقع ہو گئی اور ان کے نابالغ بیٹے شاہ فیصل ثانی کو 4 اپریل 1939ء کو تاج و تخت کا وارث قرار دیا گیا۔ لیکن تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف چار سال تھی۔ اس لیے فیصل اول کے بھائی اردن کے شاہ عبداللہ کی زیر نگرانی میں بادشاہ کے چچا عبداللہ کو اس کا سرپرست بنا دیا گیا۔ فیصل ثانی کی باقاعدہ تخت نشینی 1953ء میں عمل آئی، لیکن اس کے بعد بھی عراق میں سب سے مقتدر شخصیت عبداللہ ہی کی تھی جو شریف حسین مکہ کے بڑے صاحبزادے علی کے صاحبزادے تھے۔ جب حجاز سے سلطان ابن سعود نے علی کو بے دخل کیا تھا تو وہ اپنے بھائی امیر فیصل کے پاس چلے آئے تھے اور وہیں 1935ء میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

نوری سعید پاشا مرد آہن عراق:

شاہ فیصل اور عبداللہ کے بعد، عراق کے دور بادشاہی میں سیاسی طور پر تیسری اہم شخصیت نوری سعید پاشا تھی، جو عراق کے پہلے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے اور 1930ء سے 1958ء تک چودہ مرتبہ عراق کے وزیر اعظم بنے عراق کے ترکی اور برطانیہ سے قریبی تعلقات قائم کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ کمیونزم کے سخت خلاف تھے، لیکن یاد رہے کہ نوری سعید پاشا کوئی جمہوریت پسند انسان بھی نہیں تھے۔ وہ اس دور کے عراق کے مرد آہن تھے۔ انہوں نے کبھی بھی عوام کی خواہشات کا احترام نہیں کیا تھا، اور سیاسی مخالفین کو سختی سے دبایا تھا، انکے زمانے میں قوم کو تقریر و تحریر کی آزادی حاصل نہیں تھی جس کی وجہ سے اخبارات کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور سیاسی زندگی کو معطل کر دیا گیا تھا۔ 1954ء میں انہوں نے سیاسی جماعتوں کو بھی ختم کر دیا۔ نوری سعید بڑے پیمانے پر برطانیہ نواز تھے اور ان کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ انگریزوں سے زیادہ انگریزی مفاد کا خیال رکھتے تھے۔ عراق انہی کی کوششوں سے معاہدہ بغداد میں شامل ہوا تھا۔

استبدادی حکومت اور فوجی انقلاب:

نوری سعید پاشا کی استبدادی حکومت اور آمریت نے عوام کو شاہی خاندان اور خود نوری سعید کے خلاف کر دیا اور نوری سعید کی وزارت کو برخاست کرنے کا مطالبہ عوام میں زور پکڑتا گیا۔ پھر جب جمہوری عمل سے حکومت میں تبدیلی لانا ممکن نہ ہوا تو بالآخر انقلاب کا راستہ اپنایا گیا اور جنرل عبدالکریم 14 جولائی 1958ء کو نوری سعید کی حکومت کا تختہ الٹ دیا یہ انقلاب بہت خون ریز تھا اور اس کے دوران جیسا کہ پہلے ذکر آیا نوری سعید پاشا کے ساتھ ساتھ نوجوان فیصل ثانی اور ان کے ساتھ شاہی خاندان کے تمام افراد جن میں خواتین بھی شامل تھیں وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیئے گئے اور شاہ فیصل اور ان کے اہل خانہ کی لاشوں کی بے حرمتی اس حد تک کی گئی کہ انہیں بغداد کی سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ عراق کے اس فوجی

انقلاب کے ساتھ ہی اس عرب ملک میں بادشاہت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

1958ء کے فوجی انقلاب کے بعد:

جنرل عبدالکریم 1958ء سے 1963ء تک عراق کے صدر اور وزیر اعظم رہے۔ نئی حکومت نے 27 جولائی 1958ء کو عراق کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا، مگر اصل میں جنرل قاسم بھی آمر ہی تھے اس لئے ان کے عہد میں عوام کو آزادی حاصل نہ ہو سکی۔ انقلابی خود کئی جماعتوں میں منقسم تھے۔ کچھ قوم پرست، کچھ بعث پارٹی کے طرف دار تھے، کچھ مصری صدر جمال عبدالناصر کے حامی تھے اور کچھ کمیونسٹ تھے۔ خود ان انقلابیوں کے درمیان بھی سازشیں ہوتی رہیں۔ کبھی ناصر کے حامی غالب آ جاتے اور کبھی کمیونسٹ غلبہ حاصل کر لیتے۔ آخر جنرل عبدالکریم نے ناصر کے حامیوں کو کچلنے کے لئے کمیونسٹوں کا سہارا لیا، جس میں کمیونسٹوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس کمیونسٹ غلبہ کے دوران اسلام پسندوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے۔ عوامی عدالتیں قائم ہوئیں جن کے تحت پانچ ہزار مسلمان موت کی گھاٹ اتار دیئے گئے۔ فوج میں اسلام پسند عناصر میں نجیب ربیعی اور رفعت سیری کو بغاوت کے الزام میں سزائے موت دی گئی۔ اسلامی کتب خانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا، گویا بیسویں صدی میں کمیونسٹوں میں ہلاکو خان کی روح حلول کر گئی۔ حکومت کے اس اسلام دشمن طرزِ عمل سے عوام مشتعل ہو گئے اور ہر جگہ کمیونزم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس دار و گیر میں موصل اور کرکوک میں بہت سے کمیونسٹ مارے گئے، باقی بغداد بھاگ گئے۔ عبدالکریم نے جب عوام کو کمیونزم کے خلاف پایا تو خود بھی کمیونسٹوں کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

....

جنرل عبدالکریم (تعارف)

عبدالکریم قاسم (1914ء۔1963ء) عراقی جمہوریہ کے پہلے صدر۔ تعلیم کے بعد فوج میں شمولیت اختیار کی 1955ء میں عراق کی فوج کے انیسویں بریگیڈ کا سربراہ مقرر ہوا۔ 14 جولائی 1958ء کو وزیر اعظم نوری السعید نے انہیں حکم دیا کہ وہ اردن کی شاہی حکومت کی حفاظت کے لئے اپنا بریگیڈ لے کر اردن جائیں، اسی دن جنرل قاسم نے اردن جانے کی بجائے عراق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ شاہ فیصل، امیر عبداللہ اور وزیر اعظم نوری السعید مارے گئے، لیکن جنرل عبدالقاسم بھی اپنے فوجی ساتھیوں سے وفا نہ پا سکے اور 18 فروری 1963ء کو اپنے ہی دوستوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

.............فروری 1960ء میں اہل عراق کو سیاسی آزادی مل گئی۔ نئے اخبارات نکلے اور سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں۔ اسی زمانے میں اسلام پسندوں نے ''الحزب الاسلامی'' قائم کی۔ شروع میں حکومت نے اس اسلامی جماعت کے

کی اجازت نہیں دی تھی، لیکن عدالت عالیہ عراق نے حکومت کے فیصلوں کو مسترد کر دیا اور یہ اسلامی جماعت وجود میں آ گئی۔ اس دوران جنرل قاسم کے مخالف عناصر اور بعث پارٹی کے حامی قاسم کے خلاف خفیہ سازشوں میں لگے رہے۔

1963ء کا انقلاب:

8 فروری 1963ء کو عرب بعث سوشلسٹ پارٹی کی قیادت نے عراق کی شخصی آمریت کا جنازہ نکال دیا فوجی اور عوامی حلقوں نے مل کر جنرل عبدالکریم قاسم کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور دوسرے دن انہیں گولی مار دی گئی۔ اس انقلاب یا ضد انقلاب کی قیادت عبدالسلام عارف نے کی جو 1958ء کے انقلاب میں جنرل عبدالکریم کے دست راست تھے، لیکن چونکہ وہ جمال ناصر کے حامی تھے اس لئے جلد ہی دونوں راہنماؤں میں اختلافات کی خلیج حائل ہوگئی۔ عبدالکریم قاسم نے انہیں اپنے راستے سے ہٹا کر نظر بند کر دیا۔ عبدالسلام عارف ایک مذہب پسند اور معتدل انسان تھے۔ ان کے عہد میں 3 مئی 1964ء کو عراق میں عارضی آئین نافذ کیا گیا۔ بعث پارٹی جو عراق میں مسلسل زور پکڑتی جا رہی تھی اس نے نئے انقلاب کے بعد وزیر اعظم احمد حسن البکر کی قیادت میں بغاوت کی جو کچل دی گئی عبدالسلام عارف ہی کے عہد میں کویت کو تسلیم کیا گیا جس پر تنازعہ چلا آ رہا تھا۔

عبدالرحمٰن عارف بحیثیت صدر عراق:

ان کے عہد میں مصر اور عراق کو متحد کرنے کا ایک معاہدہ بھی ہوا مگر ان کی اچانک موت کے سبب جو ایک ہوائی حادثے میں ہوئی۔ یہ معاہدہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ عبدالسلام عارف کے بعد ان کا بھائی عبدالرحمٰن عارف 17 اپریل 1966 کو صدر منتخب ہوا۔ 30 جون 1966ء جو جمال الناصر کے حامیوں نے انقلاب لانے کی ایک اور کوشش کی جو ناکام رہی۔ عبدالرحمٰن عارف کے عہد کا اہم واقعہ عراق میں زرعی اصلاحات کا نفاذ تھا۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عبدالرحمٰن عارف ہی عراق کا صدر تھا، جنگ کے بعد روس اور عراق کے تعلقات میں اضافہ ہوا لیکن دسمبر 1967ء میں عبدالرحمٰن عارف نے نئے انتخابات منسوخ کر دیئے اور اخبارات پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ اس سے سیاسی پارٹیوں کو بڑی مایوسی ہوئی مگر بعث پارٹی خفیہ سازشوں کے ذریعے اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ اس نے 17 جولائی 1968ء کو احمد حسن البکر کی قیادت میں کامیاب بغاوت کی اور عبدالرحمٰن عارف کا تختہ الٹ دیا۔

1968ء کا انقلاب سفید:

17 جولائی 1968ء کو بعث پارٹی ایک بار پھر جمہوری طریقے کی بجائے انقلاب کے ذریعے حکومت پر قابض ہوگئی اس انقلاب کا نام انقلاب سفید تھا۔ اس انقلاب کی خوبی یہ تھی کہ اس میں ایک آدمی بھی قتل نہیں ہوا۔ بعث پارٹی نے احمد حسن البکر کو صدر بنا دیا جبکہ صدام حسین نائب صدر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ 1958ء کے بعد عراق میں جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں سب سے زیادہ مستحکم یہ حکومت تھی لیکن بعث پارٹی کے استحکام کی بنیادیں جبر و استبداد پر رکھی گئی تھیں۔ اس جبر کے خلاف گذشتہ سالوں میں کئی بار جوابی انقلاب بپا کرنے کی کوشش کی گئی جو ناکام رہی۔ بعث پارٹی کے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد یعنی 30 جولائی 1968ء کو وزیر اعظم لیفٹیننٹ جنرل عبدالرزاق النائف کو گرفتار کر کے مراکش جلاوطن کر دیا گیا۔

ان پر جوابی انقلاب لانے اور سوشلسٹ اقتدار پر نظر ثانی کرنے کا الزام تھا۔ 1969ء میں یعنی اگلے سال 50 افراد کو حکومت کے خلاف جاسوسی کرنے کے الزام میں پھانسی دی گئی۔ مذہبی عناصر خاص طور پر بعث پارٹی کے عہد میں نشانہ بنائے گئے۔ 30 جولائی 1973ء کو عراق کے ڈائریکٹر جنرل سیکورٹی، کرنل ناظم قزار نے بغاوت کی ناکام کوشش کی اس واقعہ کے بعد انقلابی کمانڈ کونسل نے صدر احمد حسن البکر کو آمرانہ اختیارات دے دیئے۔ اس کے بعد سے عراق اندرونی سورشوں بغاوت اور ہنگاموں پر بعث پارٹی کے مخالف عناصر کی ایذا رسانی اور جبر استبداد کا مرکز بنا رہا۔ عراق میں برسر اقتدار بعث پارٹی کا یہ گروپ اگرچہ سوشلزم کا دعویدار تھا لیکن شام کی بعث پارٹی کے مقابلے میں نہایت اعتدال پسند تھا۔ آئین کے تحت جو 22 جولائی 1968ء کو نافذ کیا گیا تھا اور جس میں کئی ترامیم کی گئی تھیں۔ اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا تھا۔ اسی آئین کے تحت عراق ایک پاپولر ڈیموکریٹک ریاست تھی۔ یہ اصطلاح خالص اشتراکی نوعیت کی تھی۔ بعث پارٹی کی حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کو نہ صرف تسلیم کرلیا بلکہ جولائی 1973ء میں بعث پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کے اشتراک وتعاون سے قومی ترقی پسند محاذ بنایا گیا تھا۔ اس وقت ملک میں ایک تیسری پارٹی بھی قائم تھی جس کا نام کردستان ڈیموکریٹک لیگ تھا کئی سال تک فلسطین کے معاملے پر بعث پارٹی کی حکومت روسی نکتہ نظر کی ترجمان رہی، لیکن پھر۔

کمیونسٹوں کے خلاف کارائی:

دونوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اس کا اظہار اس وقت ہوا جب حکومت عراق نے اپریل 1978ء کی عراقی کمیونسٹ پارٹی کے 14 اراکین کو پھانسی دی جو عراق میں روس نواز پالیسی کے حامی تھے اس موقع پر پہلی مرتبہ عراق نے اعتراف کیا کہ عراق پورے فلسطین کو آزاد کرانا چاہتا ہے جبکہ روس اسرائیلی ریاست کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد سے عراق اور روس کے درمیان تعلقات میں سرد مہری پیدا ہوگئی اگرچہ دونوں ملکوں میں 1973ء میں ہونے والا معاہدہ قائم تھا۔ عراق کے صدر احمد حسن البکر پورے گیارہ سال تک اقتدار میں رہنے کے بعد 16 جولائی 1979ء کو صدارت سے مستعفی ہوگئے۔

صدام حسین:

عراق کے صدر احمد حسن البکر کے نائب جنرل صدام حسین اس کی جگہ انقلابی کمانڈر مقرر ہوگئے۔ ان کے برسر اقتدار آتے ہی 8 اگست 1979ء کو حکومت عراق نے ایسے 21 افراد کو پھانسی دی جن میں خود انقلابی کمانڈر کونسل کے پانچ ارکان بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ 33 افراد کو ایک سال سے پندرہ سال کی سزائے قید دی گئی۔ ان لوگوں پر الزام تھا کہ وہ شام کے صدر حافظ الاسد سے ساز باز کررہے تھے لیکن اصل معاملہ سیاسی مخالفت کا تھا۔ صدر صدام حسین سب کچھ برداشت کرسکتے تھے مگر سیاسی مخالفت برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے۔ 1970ء میں نافذ ہونے والے عبوری آئین کے تحت صدام حسین نے صدر مملکت اور مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کا عہدہ سنبھال لیا۔

ایران عراق جنگ:

صدر صدام حسین کے عہد کا ایک بڑا واقعہ ایران عراق جنگ تھا۔ اس جنگ کا باعث جو دونوں ملکوں میں تقریباً آٹھ سال سے جاری رہی، تنازع شط العرب تھا۔ 1980ء میں عراقی فوجوں نے مشترکہ سرحد عبور کرکے ایران پر حملہ کردیا اور

ایران کے اہم علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ نومبر 1987ء میں کہیں جا کر دونوں ممالک جنگ بندی کے لئے آمادہ ہوئے مگر پھر جنوری فروری 1988ء میں جنگ نے شدت اختیار کرلی۔ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے دارالحکومتوں پر میزائل بھی پھینک دیئے۔ تاہم 18 جولائی 1988ء کو دونوں ملک اور خصوصاً ایران ڈرامائی انداز میں صلح کے لئے اور جنگ بندی کے لئے تیار ہوگیا۔ 20 اگست دونوں ملکوں میں جنگ بند ہوگئی۔ اس جنگ میں عراق پر کیمیاوی ہتھیار استعمال کرنے کا الزام بھی لگایا گیا تھا۔

خلیج کی جنگ:

12 اگست 1990ء کو عراق نے صدر صدام حسین کی قیادت میں اچانک کویت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا اور اسے اپنا صوبہ قرار دے دیا۔ جواز یہ تھا کہ کویت عراق کا تیل چوری کر رہا تھا۔ پہلے تو دنیا کو اس ان ہونی صورت حال کا یقین نہ آیا کہ عراق نے کویت پر قبضہ کرلیا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے صدر صدام حسین نے کہا تھا کہ اس کام کے لئے اسے امریکہ نے شہ دی تھی۔ بقول سفیر امریکہ اپریل گلیسپی APRIL GLASPIE کہ اگر عراق کویت پر قبضہ کرتا ہے تو امریکہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا، مگر امریکہ اس بات کی تردید کرتا ہے، مگر امریکی حکومت کے بیان پر شک اور صدام حسین کے بیان میں صداقت زیادہ پائی جاتی ہے۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ امریکہ نے ہی یہ سارا ڈرامہ کیا تھا کہ پہلے سرخ کپڑا دکھا کر یا گرین سگنل دے کر عراق کو کویت پر حملے کی شہ دے دی اور پھر اس کو قبضہ سے چھڑانے کے لئے اس پر بمعہ پڑوسی ملکوں اور اتحادیوں کے امریکہ کا حملہ اور اپنی فوجوں کی تعیناتی، یہ سب امریکہ کی سوچی سمجھی سکیم تھی، دوسرے لفظوں میں جس طرح فلم میں کوئی شخص اپنی بہادری ظاہر کرنے کے لئے پہلے خود ہی اپنے ساتھیوں سے حملہ کروا دیتا ہے پھر بچانے لے لئے خود میدان میں اتر پڑتا ہے۔ یہی کھیل امریکہ نے کھیلا تھا۔ مقصد صرف عراق کو کمزور کرنا تھا، لیکن یہاں صرف یہ بات خود صدام حسین کے خلاف جاتی ہے کہ اگر اسے بروقت امریکہ کی بدنیتی کا علم ہوگیا تھا تو پھر اس نے اقوام متحدہ کی قراردادوں یا الٹی میٹم پر کویت سے 15 جنوری 1991ء تک بروقت اپنا قبضہ ختم کر کے اپنے ملک کو جنگ سے کیوں نہیں بچایا۔ عراق کے خلاف کارروائی کا آغاز ہوا اور اس جنگ میں شکست کھا کر عراق کو اپنا قبضہ ختم کرنا پڑا۔

امریکہ کی بالادستی:

اس جنگ کے نتیجہ میں عراق پر جو پابندیاں لگائی گئیں ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ وہ اپنے WMD یا وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ختم کر کے اور اقوام متحدہ کے ماہرین اس بات کی تصدیق کریں کہ نہ صرف ہتھیار ختم کئے جا چکے ہیں بلکہ ان کی تیاری کے لئے انفراسٹرکچر بھی تباہ کیا جا چکا ہے۔ جب تک ماہرین ان دونوں باتوں کی تصدیق نہیں کرتے عراق پر پابندیاں جاری رہیں گی۔ عراقی معیشت کی تباہی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ ان پابندیوں نے پوری کر دی چنانچہ عراق چار سو بلین ڈالر کا مقروض ہوگیا۔ وہ ملک جو صدیوں سے زرخیز ہلال کے نام سے مشہور تھا اب اپنی عوام کے لئے صرف صد خوراک بھی بیرون ممالک سے درآمد کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اور ایک طرف تو عراق کی معیشت تباہ ہوگئی جب کہ دوسری طرف امریکہ کو اسی بہانے عراق کے ہمسائیہ ممالک میں فوجی اڈے حاصل ہوگئے، جن کے ذریعے اس خطے کی معیشت اور سیاست بلکہ تیل کی دولت پر بھی مکمل تصرف حاصل ہوگیا اور اب امریکہ اور اس کے اتحادی مغربی ممالک کو یہ

خطرہ بھی نہ رہا کہ 1970ء کے عشرے کی طرح کوئی ملک مغربی ملکوں کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کر سکے گا۔ اس خطے میں امریکہ کی فوجوں کی موجودگی اور اس کی بالادستی شاید امریکہ کی سکیم یا پھر صدام حسین کی حماقتوں کے سبب سے حاصل ہو گی۔

صدام حکومت کا خاتمہ کیوں نہ ہوا:

امریکہ نے کویت کا قبضہ چھڑانے اور عراق کو شکست دینے کے بعد صدام حکومت کو ختم کیوں نہیں کیا، جبکہ اس سے پہلے جرمنی میں ہٹلر یا دیگر ایسی جنگوں میں جنونی کیفیت رکھنے والی حکومتوں کو ختم کیا جا چکا تھا۔ یہاں ایک طرف تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ امریکہ کے اتحادی ممالک نے کہا تھا کہ چونکہ کویت آزاد کرانا ہی ان کا مقصد تھا اس لئے اب جنگ جاری رکھنا اور صدام حکومت کا خاتمہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہوگا مگر مورخین نے یہ بھی لکھا کہ دراصل صدام حکومت کا قائم رہنا بھی امریکی مفاد میں تھا اس لئے کہ کویت سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک میں امریکی فوجیں اسی صورت میں موجود رہ سکتی تھیں جب ان کے ممالک کے سر پر صدام حسین کے خطرے کی تلوار لٹکتی رہے۔ شواہد اسی نظریے کی تائید کرتے ہیں ہاں یہ بات عین ممکن ہے کہ دونوں عوامل شامل ہوں یعنی امریکی مفاد بھی اور یورپی ملکوں کا اصرار بھی۔

امریکہ کا ٹوپی ڈرامہ:

اقتصادی پابندیوں کے ختم کرنے کے لئے یہ شرط تھی کہ اقوام متحدہ کے ماہرین اس بات کی تصدیق کریں کہ عراق کے پاس موجود کیمیائی اور تباہی پھیلانے والے دیگر ہتھیار تلف کر دیئے گئے ہیں اور ان کی تیاری بھی ممکن نہیں یہ کام ڈرامائی انداز میں ہوتا رہا۔ اقوام متحدہ کے ماہرین آتے ہتھیار تلف کرتے، لیبارٹریوں کا معائنہ کرتے اور رپورٹس لکھتے۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلتا رہا پھر اچانک ڈرامائی انداز میں عراقی حکومت ان کے رستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی کر دیتی یا کسی اور جھگڑے کے نتیجے میں کام رک جاتا اور ماہرین واپس چلے جاتے اس پر امریکی اور برطانوی طیارے معمولی سی بمباری کرتے جس سے کئی بے گناہ عراقی شہری مارے جاتے لیکن صدام حسین کے اقتدار کو پھر بھی قائم رکھا جاتا یعنی جو حکومت اقوام متحدہ کے ماہرین کے ساتھ تعاون نہ کرتی اور اس کے خلاف اتحادیوں کو بمباری بھی کرنا پڑتی مگر اسے ختم نہیں کیا جاتا۔ اس کے نتیجے میں اس علاقے میں کشیدگی اور تناؤ کی حالت برقرار رہتی اور صورت حال وہی رہتی جس کے نتیجے میں امریکہ نے عراق کے ہمسائی ممالک کو عراق کی جارحیت سے بچانے کے لئے اس خطے میں اپنی افواج کو بھیجا تھا۔ اگر یہ سب کچھ ہی امریکہ کا منشا تھا پھر ہم اسے امریکہ کا ٹوپی ڈرامہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔

تیل کے بدلے بھی خوراک نہ مل سکی:

اس نوع کے اتنے بہت سے واقعات اور ڈرامے موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ خلیج کی جنگ اور صدام کی ظاہری مخالفت کے باوجود صدام اور امریکہ کے بیچ میں کوئی نہ کوئی تعلق اور تعاون کا سلسلہ موجود تھا اور صدام حکومت کو برقرار رکھنے اور علاقے میں کشیدگی باقی رکھنے میں امریکہ کی مرضی شامل تھی۔ 1996ء میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی تیل کے بدلے خوراک OIL FOR FOOD پروگرام شروع کیا گیا تھا جس کے تحت عراق اتنا تیل دنیا کو بیچ سکتا تھا

جس سے خوراک اور دوائیں خرید کر وہ اپنی عوام کی کفالت کر سکے اس کی یہ رقم اس کو نقد صورت میں نہ ملتی بلکہ اقوام متحدہ اس رقم کے بدلے میں اسے خوراک اور دوائیں فراہم کرتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عراقی عوام بھوک اور بیماری کے ہاتھوں مرتے رہے۔ واقعات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اس طریقے سے حاصل کی گئی خوراک اور دوائیں عوام تک تو پہنچتیں بلکہ گوداموں میں پڑی سڑتی رہتی یا دیگر مقاصد کے لئے استعمال ہو جاتیں اس دوران ہزاروں عراقی بچے بھوک اور ناقص غذا سے ہلاک ہو گئے لیکن کیا ان بچوں میں صدام حسین کے بچے بھی شامل تھے؟ ہر گز نہیں صدام اور اس کے رفقا حسب دستور پر تعیش زندگی گزارتے رہے۔ یہ ساری مصیبت صرف عراقی عوام کے لئے تھی۔

کیمیاوی ہتھیار اور مابعد:

عراق میں مختلف ذرائع بتاتے ہیں صدام کے ذاتی محلات کی تعداد 70 سے زائد تھی اور اس کی سالگرہ کے موقع پر شہر میں اتنے کلوگرام کے کیک کاٹے جاتے تھے جتنے سال اسے برسر اقتدار آئے ہوئے ہو گئے تھے جبکہ عین اسی دوران عراقی عوام اور اُن کے بچے بھوک اور بیماری کے ہاتھوں مر رہے تھے۔

ایسی حکومت جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے جبر و استبداد کی بنیادوں پر کھڑی ہوئیں ہوتی ہیں اور ایسے حکمران اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو سفاکانہ طریقے سے خاموش کر دیتے ہیں۔ صدام حسین نے کردوں کے خلاف 1985ء میں مسٹرڈ گیس کا استعمال کیا تھا جس کے نتیجے میں پانچ ہزار سے زائد کرد باشندے ہلاک ہو گئے۔ صدام حسین کے عہد میں شیعہ جو عراق میں 60 فی صد ہیں انہیں ان کی مذہبی رسومات کی ادائیگی کی اجازت نہیں تھی۔ یوں اگر چہ حکومت کی پالیسی سیکولر کہلاتی تھی جبکہ عملاً یہ مذہب دشمنی پر مبنی تھی۔ یہ اور ایسے دیگر اقدامات جو صدام نے اپنی عوام کے ساتھ روا رکھے، انسانیت سوز تھے۔

مگر کیا جارج بش نے ایسے انسانیت سوز واقعات روکنے کے لئے عراق پر حملہ کیا تھا یا کوئی اور وجوہ تھیں، یعنی وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ممنوعہ ہتھیاروں کی موجودگی۔ محققین کے مطابق امریکہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ عراق کے پاس اب کیمیائی ہتھیار موجود نہیں رہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جنگ کے بعد یہ ہتھیار نہ پائے گئے۔ 1995ء میں صدام حسین کا داماد جنرل حسین کامل جب عراق سے فرار ہو کر اردن پہنچا تو اس نے بیان دیا تھا کہ تمام ممنوعہ ہتھیار اس کی نگرانی میں ضائع کیے جا چکے ہیں، چنانچہ امریکہ کو بھی اس بارے میں شبہ تک نہ تھا اسی بنا پر اس نے اقوام متحدہ کے ماہرین کو ان کے اصرار کے باوجود ان کا کام جاری رکھنے کا موقع نہ دیا اور ہتھیاروں کی موجودگی اور نائجر سے یورینیم کی خریداری کے بارے میں جو دستاویزات پیش کی گئی تھیں وہ کئی برس پرانی بلکہ کئی ایک جعلی بھی تھیں۔ لہذا یہ سوچنا ہی غلط ہے کہ امریکہ نے عراق پر حملہ محض ممنوعہ ہتھیاروں کی بنا پر یا ان کے خطرے کے پیش نظر کیا تھا۔

آمریت اور حقوق انسانی کی پامالی:

جہاں تک آمریت اور حقوق انسانی کی پامالی کا تعلق ہے یہ امریکی عوام کی ہمدردیوں کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے، امریکی حکومت کا نہیں۔ آپ کو یاد ہو گا امریکی حکومتیں نہ صرف یہ کہ ماضی میں آمریتوں کی حمایت کرتی رہیں۔ مثلاً موبوتو، پنوشے، اور ضیاالحق جیسے مکروہ فوجی آمروں نے امریکہ ہی کی مدد و اعانت کے بل بوتے پر نہ صرف اپنے اپنے ملکوں میں جمہوری حکومتوں کا تختہ الٹا بلکہ امریکی حمایت ہی کی بدولت لمبے عرصے تک برسر اقتدار رہے۔ آج بھی غور سے دیکھیں دنیا کے

کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس لئے کہ وہ امریکی مفادات کی درجنوں ممالک پر حکمرانی کرنے والے آمروں کو امریکہ حفاظت کر رہے ہیں۔ لبنان کے علاوہ تقریباً تمام عرب ملکوں میں یا تو مطلق العنان بادشاہتیں ہیں یا سول آمریتیں، جن میں فقط شام امریکہ کا تابع فرمان نہیں باقی سب یا تو اس کے حامی ہیں یا پھر اس کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ پوری مسلم دنیا میں سے فقط ترکی، لبنان، انڈونیشیا، البانیہ اور ایران میں چوتھائی، آدھی یا تین چوتھائی جمہوریت ہے۔ جیسی جمہوریت مصر اور پاکستان میں ہے، ٹھیک ویسی ہی جمہوریت تو صدام کے عراق میں تھی۔ یاد رہے کہ آخر صدام بھی تو ریفرنڈم کرا کر عوام کے ''ووٹوں'' ہی کے ذریعے صدر منتخب ہوتا رہا تھا۔ سو آمریت یا حقوق انسانی کی پامالی کی وجہ سے بھی امریکی حملہ نہیں ہوا تھا ورنہ عرب بادشاہتیں تو الگ مصر وغیرہ بھی اس مقصد کی خاطر بڑے فٹ کیس بنتے اور امریکہ بہادر آج ان پر حملہ کر چکا ہوتا۔ رہے بنیادی انسانی حقوق جن سے صدام نے عوام کو محروم کر رکھا تھا تو امریکی حکومت کے لئے یہ کونسا ایسا ضمیر کا معاملہ تھا؟ نہ صرف یہ کہ جہاں امریکہ کی فرمانبردار حکومتیں قائم ہیں وہاں بھی عوام کو بھی بنیادی انسانی حقوق حاصل نہیں بلکہ خود امریکہ بھی اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے جہاں بھی اسے ضرورت پڑے ان کی پامالی سے چوکتا نہیں۔ رہا یہ الزام کہ صدام نے کردوں اور ایران کے خلاف کیمیائی ہتھیار استعمال کئے تھے۔ آج کا مورخ شاید اعتراف کرے گا کہ یقیناً صدام نے ایران اور کردوں کے خلاف ان جرائم کا ارتکاب کیا تھا، لیکن جب صدام ان جرائم کا ارتکاب کر رہا تھا تو کیا اسے امریکہ کی مکمل حمایت حاصل نہ تھی بلکہ بعد میں کیمیائی ہتھیاروں کے حصول کی رسیدیں بھی امریکیوں ہی نے ثبوت کے طور پر دکھائیں جن کے ذریعے سے امریکہ اور برطانیہ نے کیمیائی ہتھیار عراق کو فراہم کئے تھے۔ کیا جن ہتھیاروں کو عراق سے واپس لینے کے لئے اس پر حملہ کرنا جائز ہے تو ان مہلک ہتھیاروں کے بنانے اور برآمد کرنے والے ظالموں کے خلاف کوئی کاروائی کرنا عین ثواب نہیں ہوگا، اور انسانی حقوق کی پامالی کرنے والوں کے ساتھ جہاد نہیں ہوگا۔

شاید عراق پر حملے کی وجوہات صرف یہ تھیں کہ عراق اب امریکی مفادات کے خلاف اقدام کرنے لگا تھا جن میں سے ایک 2000ء میں اس کا اپنا تیل ڈالر کی بجائے یورو میں بیچنے کا فیصلہ بھی شامل تھا۔ یہ بات امریکہ کے خلاف جاتی تھی اور وہ اسے کیسے گوارہ کر سکتا تھا۔

☆

1956ء ہنگری میں کمیونزم کے خلاف

بغاوت یا ناکام انقلاب

ہنگری یورپ کا پہلا ملک ہے جہاں عوام بہت جلد کمیونزم کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اہل ہنگری دراصل پولینڈ اور روس سے آزادی چاہتے تھے۔ اس پر سخت کشمکش شروع ہوگئی۔ اس کشمکش کا آغاز 1955ء میں وزیراعظم ناگی کی جبری معزولی سے ہوا تھا۔ اس کی جگہ اینڈرس ہیگڈوس کو نیا وزیراعظم بنادیا گیا جس نے کمیونسٹ پارٹی کے راکوسی کی آمرانہ پالیسیوں کو دوبارہ جاری کردیا۔ ان پالیسیوں سے عوام میں بے چینی پھیلنی شروع ہوگئی۔ عوام نے سخت ناپسند کیا۔ اسکے علاوہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کی گئیں۔ اگرچہ میتھاس راکوسی کو پارٹی کی صدارت سے ہٹا دیا گیا مگر اس کی پالیسیاں بدستور جاری رہیں۔ ان پالیسیوں کی وجہ سے دارالحکومت میں عوام نے مظاہرے شروع کر دیئے جس سے خانہ جنگی کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہ بغاوت جلد ہی پورے ملک میں پھیل گئی۔ 23 اکتوبر کو وزیراعظم اینڈرس مظاہروں اور عوامی بغاوت روکنے میں ناکام ہوگیا۔ چنانچہ اس کی جگہ آئمری ناگی کو دوبارہ وزیراعظم بنادیا گیا۔ ناگی نے عنانِ وزارت سنبھالتے ہی ملک کو غیر جانب دار قرار دے دیا۔ اس وجہ سے ناگی کی دوبارہ حکومت صرف چند روز ہی چل سکی۔ دراصل ہنگری میں روسی مداخلت کو ناجائز قرار دینے کے لئے آئمری ناگی نے ملک کو غیر جانب قرار دیا تھا۔ لیکن روس نے اس کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرتے ہوئے

روسی حملہ:

27 اکتوبر 1956ء کو ہنگری پر حملہ کر دیا 4 نومبر کو دو لاکھ روسی فوج اڑھائی ہزار ٹینکوں کے ساتھ ہنگری میں داخل ہوگئی۔ اب ایک طرف عوام تھے دوسری طرف روسی فوج جو ان کے مظاہرے اور بغاوت ختم کر کے کمیونسٹ حکومت قائم کرنا چاہتی تھی۔ روسی فوج نے بے دریغ نہتی عوام پر فائرنگ کر کے سینکڑوں شہری ہلاک کر دیئے۔ ادھر ہنگری کی کمیونسٹ پارٹی کے راہنما نوجیرو نے ان مظاہرین کے خلاف روسی مداخلت کی بھرپوری حمایت کی یہ فسادات بوڈاپسٹ سے پورے ملک میں پھیل گئے۔ مظاہرین نے ایک شہر گیور میں آزاد ہنگری حکومت بھی قائم کر لی۔ ہنگری کی نیشنل آرمی نے بغاوت کا ساتھ دیا۔ روسی مداخلت اور کمیونسٹ حملے کے خلاف وزیراعظم آئمر ناگی نے عوام سے بھرپور مدد کا مطالبہ

کیا۔ ادھر روسیوں نے جہازوں، ٹینکوں اور جدید اسلحے کی مدد سے بغاوت کو کچلنے کی کوشش کی اور بے رحمانہ کارروائیوں سے پرہیز نہ کیا۔ روسی فوج نے ہنگرین پارلیمنٹ کی عمارت پر چڑھائی کر دی اور وزیر اعظم ناگی سمیت دوسرے حکومتی عہدیداروں کو گرفتار کر لیا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لئے روسی فوج نے دس ہزار ہنگرین عوام کو ہلاک کیا۔ سینکڑوں اور ہزاروں قید کر لئے گئے۔ روسی ٹینکوں نے بوڈاپسٹ کو ایک جنگی میدان میں بدل دیا اور عمارتوں اور علاقوں کو مسمار کر کے اپنے تئیں ہنگری کی باقی عوام کو خوب سبق سکھایا......

آئمری ناگی IMER NAGY

ہنگری کے ایک دہقان خاندان میں 1896ء میں پیدا ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران روسیوں نے گرفتار کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گیا اور روسی فوج میں خدمات انجام دیں۔ 1929ء میں وہ مستقل رہائش کے لئے ماسکو چلا گیا جہاں اس نے زرعی سائنس کے شعبے میں کام کیا۔ جنگ عظیم دوم میں ہنگری پر سوویت یونین کے قبضے کے بعد ہنگری واپس آیا اور جنگ کے بعد قائم ہونے والی حکومت میں اس نے ہاتھ بٹایا۔ 1944ء سے 1948ء تک مختلف وزارتوں میں فائز رہا۔ 1953ء میں وزیر اعظم بنا مگر اپنے آزاد خیالات اور پالیسیوں کی وجہ سے معزول کر دیا گیا۔ 1956ء میں دوبارہ روس مخالف وزیر اعظم بنا 1958ء میں اسے سزائے موت دی گئی۔

4 نومبر کا حملہ:

یہ روسی کارروائی کا شدید ترین دن تھا۔ اس دن صبح سویرے روس، رومانیہ اور چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ افواج نے ہنگری کے دارالحکومت پر حملہ کر دیا۔ سرکاری ریڈیو سے اس حملے کا اعلان کچھ یوں کیا گیا کہ "روسی فوج نے ہنگری کے دارالحکومت پر حملہ کر دیا ہے تا کہ ایک قانونی حکومت کا تختہ الٹا جا سکے۔ پھر ریڈیو پر اعلان کرتے ہوئے آئمرے ناگی نے کہا "ہنگری کی عوام اور فوج جنگ میں مصروف ہیں اور ہنگری کی آزاد حکومت ابھی قائم ہے"۔ کچھ دیر بعد ہنگری ریڈیو سے ایک اور ڈرامائی اعلان میں مدد کی اپیل کی گئی یہ ریڈیو کا آخری اعلان تھا۔ اس دوران روسی جہاز بوڈاپسٹ پر نیچی پروازیں کر رہے تھے۔ جبکہ ایک ہزار روسی ٹینک شہر کی سڑکوں پر دندناتے پھر رہے تھے۔ مسلح دستوں نے شہر سے باہر جانے والے دستوں کی ناکہ بندی کر دی اور ٹینکوں نے شہر کے وسط میں عمارات کو نشانہ بنایا۔ اس روسی فوج کے سامنے ہنگری کی فوج کمزور اور بے بس تھی۔ پھر پارلیمنٹ پر چڑھائی کر دی گئی اور وزیر اعظم کو گرفتار کر لیا گیا۔

ہنگری اور دوسری جنگ عظیم:

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہنگری بھی اتحادیوں کی سختی کا شکار رہا تھا۔ 4 جون 1920ء کو ہنگری اور اتحادیوں کے درمیان

معاہدہ TRIANON طے پایا تھا۔ اس کے تحت ہنگری کا دو تہائی علاقہ (283000 کلومیٹر) اس سے لے لیا گیا تھا۔ یہ علاقہ چیکوسلواکیہ اور یوگوسلاویہ کو دے دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے جب 1933ء میں جرمنی میں نازی پارٹی برسر اقتدار آئی تو جنگ کے براہ راست اثرات ہنگری پر بھی پڑے۔ جرمنی کے ایڈولف ہٹلر نے ہنگری سے وعدہ کیا کہ اگر وہ جرمنی کا ساتھ دے تو وہ اس کے کھوئے ہوئے علاقے واپس دلا دے گا۔ پھر 1938ء میں ہٹلر نے ہنگری کو اجازت دی کہ وہ چیکوسلواکیہ اور یوگوسلاویہ سے اپنے علاقے واپس لے لے۔ 2 نومبر 1938ء کو جرمنی اور اٹلی نے ہنگری کا 12012 کلومیٹر علاقہ ہنگری کو دے دیا۔ 15 فروری 1939ء کو وزیراعظم آئمریڈی نے استعفیٰ دے دیا اور ٹیلیکی TELEKI وزیراعظم بنا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہنگری کے وزیراعظم ٹیلیکی نے 2 اپریل 1941ء کو خودکشی کر لی۔ اسی ماہ ہنگری نے یوگوسلاویہ پر حملے میں جرمنی اور اٹلی کا ساتھ دیا اس طرح وہ محوری طاقتوں کی طرف سے میدان جنگ میں اتحادیوں کے خلاف کود پڑا۔ 1943ء میں ہٹلر نے محسوس کیا کہ ہنگری زیادہ دیر تک جنگ میں جرمنی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا جرمنی نے مارچ 1944ء میں ہنگری پر قبضہ کر لیا۔ ہنگری میں نازی پارٹی کی حکومت قائم کی اور ہنگری کے تقریباً پانچ لاکھ یہودیوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا۔ پھر جرمنی کے پاؤں اکھڑنے لگے اور 17 اکتوبر 1944ء کو سوویت یونین نے ہنگری پر قبضہ کر لیا۔

اتحادیوں سے معاہدہ اور عوامی جمہوریہ ہنگری کا قیام:

20 جنوری 1945ء کو ہنگری اور اتحادیوں میں ایک معاہدہ ہوا جس میں ہنگری 1938ء میں واپس لیے گئے علاقوں کو واپس کرنے پر رضامند ہو گیا۔ روسی قبضے کے بعد یکم فروری 1946ء کو عوامی جمہوریہ ہنگری کا قیام عمل میں آیا اور زولٹن ٹلڈی اس کے پہلے صدر نامزد ہوئے نیز لمیرنس وزیراعظم اور میتھیاس راکوسی ہنگرین کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری مقرر کیے گئے۔ جمہوریہ بننے کے بعد ہنگری کو بہت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

کمیونسٹوں کا قبضہ:

31 اگست 1947ء کو ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے جن میں کمیونسٹ اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ انہوں نے صرف 22 فی صد ووٹ لئے لیکن اس کے باوجود انہوں نے حکومت کے اہم اور کلیدی عہدوں پر قبضہ کر لیا اور ملک کا کنٹرول سنبھال لیا انہوں نے باقی سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا۔ 1948ء میں ملک میں نیا پرچم رائج کیا گیا اور کمیونسٹ پارٹی جو ملک کی واحد سیاسی جماعت تھی اس کا نام بدل کر ہنگرین ورکرز پارٹی رکھ دیا گیا۔

نیا آئین:

20 اگست 1949ء کو ملک میں سوویت طرز کا نیا آئین نافذ کر دیا گیا جس کے تحت ہنگری عوامی جمہوریہ بن گیا۔ میتھیاس راکوسی جو کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر تھا اس نے 1952ء میں وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے آمرانہ طرز عمل اختیار کر لیا۔ 1953ء میں اس کی جگہ آئمری ناگی کو وزیراعظم بنا دیا گیا مگر راکوسی بدستور کمیونسٹ پارٹی کا سربراہ رہا۔ ناگی نے نئی پالیسیاں جاری کیں جن کے تحت ہنگرین عوام کو ذاتی آزادی عطا کی گئی اور مقامی آبادی کا معیار

زندگی بلند کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ راکوسی اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں نے ناگی کی اصلاحات کی شدید مخالفت کی بالآخر جب مخالفت سے کچھ نہ بن سکا تو راکوسی نے اپنی پارٹی صدارت کے خصوصی اختیار استعمال کرتے ہوئے زبردستی ناگی کو جبراً معزول کردیا بلکہ اسے پارٹی سے بھی نکال دیا گیا اس کے بعد انڈرس ہیگڈوس کو وزیراعظم بنایا گیا جس نے راکو سی کی پالیسیوں کو دوبارہ جاری کیا جس سے عوام میں بے چینی پھیل گئی اور وہ کمیونسٹوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے مگر چونکہ وہ کمیونسٹوں کے عروج کا دور تھا لہٰذا جیت کمیونسٹوں کی ہوئی۔ چونکہ روس نے فوجی طاقت کے زور پر کمیونزم کے خلاف اٹھنے والی ہنگرین عوام کی آواز کو دبادیا۔

......☆......

1958ء پاکستان مارشل لا سے مارشل لا تک

17 اکتوبر 1958ء کو صدر پاکستان سکندر مرزا نے کمانڈر انچیف محمد ایوب کی مدد سے پاکستان کا پہلا مکمل مارشل لا نافذ کر دیا۔ 1956ء کا پہلا آئین پاکستان معطل کر دیا گیا اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور سیاسی جماعتیں ختم کر دی گئیں پاکستان کی تاریخ میں وزیر اعظم ملک فیروز خان نون کا دور وزارت سیاسی سازشوں بدعنوانیوں اور بے یقینی کا دور تھا۔ یہ مارشل لا اسی کا نتیجہ تھا۔ سکندر مرزا پاکستان کے فوجی حکمرانوں میں پہلے تھے، انہوں نے نہ صرف محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے حلف اٹھایا تھا بلکہ بعد ازاں گورنر جنرل اور صدر پاکستان کے عہدے پر فائز ہو کر ملک میں پہلی بار مارشل لا لگانے کا سہرا بھی اپنے سر پر باندھ لیا تھا۔ وہ شخصیت جس نے گورنر جنرل ملک غلام محمد سے جبراً استعفیٰ لیا وہ جنرل سکندر مرزا ہی کی تھی اس کے بعد پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ گورنر جنرل کے عہدے پر ایک فوجی افسر یعنی خود سکندر مرزا فائز ہو گیا۔

گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالتے ہی سکندر مرزا نے سیاست کے ایوانوں میں اپنی مکروہ سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیے دھونس اور دھاندلی کے ذریعے ارکان اسمبلی کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ وزیر اعظم چودھری محمد علی (جن کو قائد اعظم کے عہد حکومت میں سیکرٹری جنرل کا اعزاز حاصل تھا) کو مختلف حیلے بہانوں سے پریشان کرنے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ تاریخ پاکستان میں چودھری محمد علی پہلے تھے جنہوں نے سب سے زیادہ توجہ آئین سازی پر دی تھی انہیں کی کوششوں سے فروری 1956ء میں آئین کی تیسری خواندگی مکمل کروا کر اسے اسمبلی سے پاس کروا لیا گیا تھا۔ لیکن یہ آئین اس وقت تک نافذ العمل نہیں ہو سکتا تھا جب تک گورنر جنرل سکندر مرزا اس پر اپنی مہر تصدیق نہ ثبت کر دیں۔

چودھری محمد علی یہ محسوس کر رہے تھے کہ وزیر اعظم اور صدر مسلم لیگ کے عہدے ایک شخصیت میں جمع ہو جانے کی وجہ سے مسلم لیگ کی عوامی حیثیت ختم ہو رہی ہے۔ لہذا انہوں نے خود مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور سردار عبدالرب نشتر کو صدر مسلم لیگ منتخب کروا دیا۔ ان کے اس اقدام کے خلاف سکندر مرزا کا سازشی ذہن ایک بار پھر گردش میں آ گیا اور انہوں نے گورنر مغربی پاکستان مشتاق گورمانی کو اعتماد میں لے کر مسلم لیگ کا عوامی زور توڑنے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔

ری پبلکن پارٹی کا قیام:

اسی سلسلہ میں ری پبلکن پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی گئی۔ اس جماعت کے بنتے ہی وزارتوں کا

جمعہ بازار لگ گیا۔ مفاد پرست اور ابن الوقت سیاست دان جوق در جوق ری پبلکن پارٹی میں شامل ہونے لگے۔ سیاسی وفادار تھے جو چڑھتے سورج کی پوجا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یہ جماعت بہر حال ہارس ٹریڈنگ کا شاہکار تھی۔ اس کے قائم ہوتے ہی سکندر مرزا کے ہاتھ میں جیسے جادو کی چھڑی آ گئی وہ پاکستانی سیاست میں جب چاہتے اپنی پسند کی تبدیلیاں لا سکتے تھے۔

وزیر اعظم چودھری محمد علی جن کے خلاف سکندر مرزا نے سازشوں کے جال بچھائے انہوں نے جوابی حربے آزمانے کی بجائے اصولوں کی خاطر وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور ایوان اقتدار از خود چھوڑنے والوں میں اپنا نام لکھوالیا۔ لیکن آئین سازی کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ سید حسین سہروردی کو سکندر مرزا نے حکومت بنانے کی دعوت دی انہوں نے ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کی مشترکہ وزارتیں قائم کیں، مگر سہروردی سے بھی سکندر مرزا کی نہ بن سکی اور سہروردی کو بھی حکومت سے الگ کر کے قائد حزب اختلاف، آئی آئی چندریگر کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی، پھر ان کے بعد سکندر مرزا نے ملک فیروز خان نون کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔

فوجی انقلاب کا منصوبہ:

نون کا دور وزارت ہر لحاظ سے مضحکہ خیز تھا اس میں منصوبہ بندی کا مکمل فقدان تھا اس وزارت میں شامل وزراء صرف اس لئے وزارت میں شامل تھے کہ وہ وزیر بننا چاہتے تھے۔ ادھر ملک فیروز خان نون کا سہروردی سے تعلق سکندر مرزا کو ناپسند تھا۔ سکندر مرزا اپنی تخلیق کردہ ری پبلکن پارٹی کی بے وفائیوں کی شکایت کر رہے تھے۔ دوسری طرف آئندہ الیکشن میں ری پبلکن پارٹی کو شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ مارچ 1958ء میں ہونے والے انتخابات کی تاریخ مارچ سے نومبر تک موخر کر دی گئی۔ حزب اختلافات کے پروپیگنڈے نے مرزا کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا ان حالات میں ستمبر میں سکندر مرزا نے اس وقت کے چیف جسٹس مرزا محمد منیر اور کمانڈر انچیف محمد ایوب خان کے ساتھ شکار کا پروگرام بنایا جو بہت معنی خیز تھا۔ شکار تو محض ایک بہانہ تھا حقیقت میں اس دوران فوجی انقلاب کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

پہلے مکمل مارشل لا کا نفاذ:

جب کسی ملک یا صوبے میں ابتری جنگی حالات یا بغاوت کا ظہور یا بدامنی کا اندیشہ ہو جس کا سد باب کرنے سے پولیس اور سول حکومت عاجز ہو تو ایسے ہنگامی حالات میں مارشل لا یا یعنی فوجی قانون نافذ کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلا مارشل لاء لاہور کے ضلع میں لگایا گیا تھا اس کے بعد سکندر مرزا اور ایوب خان شکار سے واپس آئے تو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت 7 اکتوبر 1958ء کو مارشل لاء صدر پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا نے نافذ کر کے 1956ء آئین کی تنسیخ کا اعلان کیا۔ کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا اور خود سکندر مرزا نے پاکستان کی مسلح افواج کی کمان سنبھال لی۔

مارشل لاء کے نفاذ کو ضروری قرار دیتے ہوئے ایوب خان نے اس کی وجوہات پر کچھ یوں روشنی ڈالی کہ ملک تباہی کے خطرے سے دوچار تھا اور اس کی سالمیت خطرے میں پڑ چکی تھی اگر موجودہ افراتفری اور بے راہروی کو اسی طرح جاری رہنے دیتے تو شاید کیا سے کیا ہو جاتا۔ سیاست دان ملک کے مفاد کو بے دریغ ذاتی مفاد کے لئے قربان کر رہے تھے، ان

میں بعض تو اعلانیہ پاکستان توڑنے کی تدبیریں کررہے تھے ...... سکندر مرزا چاہتے تھے کہ ایوب خان اس کی فرمانبرداری کریں وہ اس کے خلاف بھی حسب عادت سازشوں کا تانا بانا بن رہے تھے کہ ایوب خان کو اس کی خبر ہوگئی۔ ایوب خان نے سکندر مرزا کو صدارت سے ہٹانے کو فیصلہ کرلیا، کیونکہ سکندر مرزا کی محلاتی سازشیں بے نقاب ہوگئیں تھیں اب ان کے لئے چپ چاپ دستبرداری کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب سکندر مرزا نے اپنے عہدے سے علیحدگی کا اعلان کیا اور ملک چھوڑ کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ لندن چلے گئے۔ 1969ء میں حرکت قلب بند ہوجانے سے ان کا انتقال ہوگیا، انکی وصیت کے مطابق انہیں تہران میں دفن کیا گیا۔...... واہ رے وفاداری پاکستان میں دفن ہونا بھی پسند نہیں کیا۔

میجر جنرل سکندر مرزا

میجر جنرل سکندر مرزا بمبئی اور سینڈھرسٹ کالج انگلستان سے تعلیم حاصل کی اور 1929ء میں فوج سے منسلک ہوئے 1926ء میں انڈین پولیٹکل سروس کے لئے منتخب ہوئے اور مختلف مقامات پر اسسٹنٹ کمشنر اور کمشنر کے عہدے پر فائز رہے۔ قیام پاکستان کے بعد حکومت پاکستان میں وزارت دفاع کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ 1954ء میں مشرقی پاکستان کے گورنر بنائے گئے۔ پھر ملک غلام محمد کی خرابی صحت کی بنا پر انہیں قائم مقام گورنر جنرل پاکستان بنایا گیا مگر جلد ہی گورنر جنرل بن گئے۔ 1956ء میں پہلے آئین کے نفاذ کے بعد پہلے صدر پاکستان منتخب ہوئے 7 اکتوبر کو ملک میں سیاسی بحران کی وجہ سے پاکستان کی تاریخ کا پہلا مارشل لاء نافذ کیا ....

جنرل محمد ایوب خان کا عہدہ:

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد دو اشخاص کے بیک وقت برسر اقتدار رہنے سے جو دو عملی پیدا ہوگئی تھی اسے 27 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا سے استعفیٰ لکھوا کر ختم کردیا گیا تھا۔ اسکے ساتھ ہی ایوب خان نے صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی کے ساتھ ہی ملک میں ایبڈو کا قانون بھی لاگو کردیا گیا تھا یعنی یا تو مقتدر سیاسی راہنما اپنے خلاف لگائے گئے بدعنوانیوں کے الزامات کی جواب دہی کریں یا چھ سال کے لئے سیاست سے کنارہ کش ہوجائیں۔ فروری 1960ء میں ایوب خان کی حکومت نے بنیادی جمہوریتوں کے نام پر منتخب ہونے والے 80 ہزار ارکان سے رائے شماری کرا کر صدر ایوب خان کے لئے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ یکم مارچ 1962ء کو صدر ایوب خان نے آئین اعلان کیا۔ یہ ایک جمہوری وفاقی، یک ایوانی اور صدارتی طرز حکومت کا آئین تھا۔ اس آئین میں ملک کے دونوں حصوں کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی۔ 2 جنوری 1965ء کو اس آئین کے تحت پھر صدارتی انتخابات ہوئے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے حزب اختلاف کی طرف سے مشترکہ امیدوار کے طور پر انتخابات میں حصہ لیا، لیکن صدر ایوب خان دوبارہ صدر منتخب ہوگئے۔

فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان

جنرل محمد ایوب خان (1907ء۔1974ء) ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعزازی طور پر سینڈہرسٹ کالج انگلستان سے فوجی تعلیم حاصل کی۔ 1928ء میں فوج میں کمیشن لیا۔ دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر نمایاں خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد 1954ء میں وزیر دفاع کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 7 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا نے آئین منسوخ کر کے مارشل لا نافذ کیا تو جنرل ایوب خان کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا، بعد ازاں ایوب نے عہدہ صدارت بھی سنبھال لیا 1969ء تک بلا شرکت غیرے صدر پاکستان رہے۔ 20 اپریل 1974ء کو وفات پائی۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ اور معاہدہ تاشقند:

1965ء کے اوائل میں بھارتی فوج نے رن کچھ میں کچھ پاکستانی علاقوں پر قبضہ کر لیا تو پاکستانی افواج بھی حرکت میں آئیں، اس کے نتیجے میں کشیدگی بڑھی اور 6 ستمبر 1965ء کو بھارت نے بغیر کسی اعلان جنگ کے مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ سترہ روز تک جاری رہی۔ پھر 23 ستمبر کو سلامتی کونسل کی ایک قرارداد کے مطابق جنگ بندی ہوگئی۔ 10 جنوری 1966ء کو روس کی مساعی سے پاک بھارت کے سربراہان کے درمیان معاہدہ تاشقند پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے دونوں ملکوں کی فوجیں اپنی پرانی سرحدوں پر واپس چلی گئیں اور کشمیر سمیت تمام باہمی تنازعات کا بات چیت کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا گیا۔

وزیر خارجہ پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کو ''معاہدہ تاشقند'' پسند نہ آیا اور انہوں نے اس کو بنیاد بنا کر احتجاجی تحریک کا آغاز کیا۔ 1967ء میں دائیں بازوں کی پانچ سیاسی جماعتوں جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، قومی جمہوری محاذ اور نفاذ اسلام پارٹی نے بھی ایک متوازی تحریک زور شور سے شروع کر دی۔ 1968ء میں اس احتجاجی تحریک میں نیشنل عوامی پارٹی۔ جمعیت علمائے اسلام اور عوامی لیگ بھی شامل ہو گئیں۔

جمہوری مجلس عمل کا قیام:

10 جنوری 1969ء کو ان تمام جماعتوں نے مل کر ''جمہوری مجلس عمل'' قائم کی اور اپنے آٹھ نکات کو پورا نہ ہونے تک آئندہ انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب سیاسی مظاہروں نے شدت اختیار کی تو صدر ایوب خان نے حزب اختلاف سے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے بارے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ جس کے لیے حزب اختلاف نے چند شرائط پیش کیں۔ ایوب خان نے آئندہ فروری میں ہونے والی صدارتی انتخابات میں حصہ نہ لینے کا، سیاسی قیدیوں، شیخ مجیب الرحمٰن، ذوالفقار علی بھٹو اور ولی خان کی رہائی اور ہنگامی حالات کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ 26 فروری کو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ بھٹو اور بھاشانی نے اس کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ یوں تمام ملک میں ایک افراتفری مچ گئی۔ خصوصاً

مشرقی پاکستان میں مظاہروں، ہنگاموں اور بلوؤں کی ایک نئی رو چل نکلی۔

دوسرے مارشل لاء کا نفاذ:

ان حالات میں پر امن انتقال اقتدار کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ چنانچہ صدر ایوب خان نے اپنا اقتدار اپنے بنائے ہوئے آئین کے مطابق سپیکر کو دینے کی بجائے کمانڈر انچیف یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ 25 مارچ 1969ء کو یحییٰ خان نے پاکستان کی تاریخ کا دوسرا مارشل لا نافذ کر دیا۔ آئین اور اسمبلی کو مارشل لا کی روایت کے مطابق توڑ دیا گیا۔ وحدت مغربی پاکستان ONE UNIT کو توڑ کر سابقہ صوبے بحال کر دیئے گئے۔ 29 مارچ 1970ء کو حکومت پاکستان کی طرف سے "لیگل فریم آرڈر" جاری کیا گیا جس کے تحت دسمبر 1970ء میں آئندہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا گیا۔ ان انتخابات میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اتنی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی کہ اسے آئین ساز اسمبلی میں سادہ اکثریت حاصل ہو گئی۔ مغربی پاکستان کے دو حصوں، پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔ اقتدار کے مسئلے پر ان سیاسی جماعتوں میں حسب سابق رسہ کشی شروع ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں عوامی لیگ نے مارچ 1971ء میں اقتدار نہ ملنے پر مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کی آڑ میں بھارت نے پاکستان میں شرپسندی کو ہوا دی۔ شرپسندوں کے خلاف فوجی کاروائی کرنا پڑی۔

بنگلہ دیش کا قیام:

نومبر 1971ء میں بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ 17 دسمبر 1971ء مشرقی پاکستان میں متعین پاکستانی افواج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پورے مشرقی پاکستان پر ہندوستان کا قبضہ ہو گیا۔ ان حالات میں وہاں بنگلہ دیش وجود میں آیا اور مشرقی پاکستان ختم ہو گیا اور پاکستان کے 93 ہزار فوجی جنگی قیدی بنا لیے گئے۔

بھٹو صاحب کا عہد:

20 دسمبر 1971ء کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے مغربی پاکستان کی اسمبلی میں اکثریت پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے صدر مملکت اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا اور جنرل یحییٰ نظر بند کر دیئے گئے۔ 1972ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک معاہدہ شملہ معاہدہ کے نام سے ہوا جس کی رو سے 93 ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ 1973ء میں پاکستان کی نیا آئین تیار اور منظور کر لیا گیا۔ چودھری فضل الٰہی کو صدر مملکت اور ذوالفقار علی بھٹو کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔

اسلامی سربراہی کانفرنس:

چودھری فضل الٰہی کے دور صدارت اور بھٹو صاحب کی وزارت عظمٰی کے دور میں، 1974ء میں ان کے لئے سب سے زیادہ باعث عزت و افتخار واقعہ 22 فروری کو لاہور میں منعقدہ اسلامی سربراہی کانفرنس تھی، جس کے افتتاحی اجلاس سے صدر فضل الٰہی چودھری نے خطاب کیا۔ اسی کانفرنس میں پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ 1975ء میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ حیات شیرپاؤ کا سیاسی قتل ہوا، جس کے نتیجے میں نیشنل عوامی پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ 1976ء میں

پاکستان و بھارت میں دوبارہ سفارتی تعلقات بحال ہو گئے۔ مارچ 1977ء میں عام انتخابات منعقد ہوئے......

جنرل آغا محمد یحییٰ خان (تعارف)

جنرل آغا محمد یحییٰ خان (1917ء۔1980ء) ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے تعلیم حاصل کی اور 1938ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد مختلف کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ ستمبر 1965ء میں پاک بھارت جنگ میں نمایاں خدمات انجام دینے پر ہلال جرات کا تمغہ حاصل کیا۔ ستمبر 1966ء میں کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ 25 مارچ 1969ء کو صدر ایوب کے استعفیٰ کے بعد چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں نے 1970ء کے منصفانہ الیکشن کرائے، مگر انہیں کے عہد میں مشرقی پاکستان کے سقوط کا واقعہ پیش آیا۔

..........جس کے بعد حزب اختلاف کی نو متحدہ جماعتوں ''قومی اتحاد محاذ'' نے بھٹو حکومت پر انتخابات میں سنگین دھاندلیوں کے الزامات عائد کر دیئے

قومی متحدہ محاذ کی تحریک:

ملک میں انتخابات کے بعد ہنگامہ آرائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور حکومت کے خلاف پورے زور شور سے تحریک چلائی گئی۔ بھٹو صاحب نے اس تحریک کو اپنے خلاف ایک سازش قرار دیا اور اسے کچلنے کی بھرپور کوشش کی۔ ملک خانہ جنگی کے دھانے پر پہنچ گیا۔ اس دوران فوج نے بھٹو صاحب کے ساتھ تعاون نہ کیا۔ اس دوران بھٹو نے فوج کے سربراہ گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان سے استعفیٰ حاصل کر کے جنرل ٹکا خان کو فوج کا سربراہ مقرر کیا۔ اس وقت پاکستان نے چین کے اشتراک سے اپنے ایٹمی پروگرام کا آغاز کر دیا تھا جو مغربی ممالک کے لئے باعث تشویش تھا۔ انہیں دنوں جنرل ٹکا خان نے ریٹائرمنٹ اختیار کی۔ جس کے بعد بھٹو نے سات فوجی افسروں کو جبری ریٹائر کر کے جنرل ضیاء الحق کو فوج کا سربراہ بنا دیا۔ اگرچہ پہلے ضیاء الحق کے ساتھ بھٹو صاحب کے اچھے تعلقات تھے مگر 1977ء کے انتخاب کے نتیجہ میں چلنے والی تحریک میں دونوں میں فاصلہ پیدا کر دیا۔ جو 5 جولائی 1977ء کو رنگ لایا۔

تیسرے مارشل لا کا نفاذ:

بھٹو صاحب اور حزب اختلاف کے درمیان لیبیا اور سعودی عرب نے مذاکرات کرائے اور دوبارہ انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی یہ مذاکرات جاری تھے اور فریقین میں کوئی سمجھوتہ ہو جانے کا قوی امکان تھا کہ 4 اور 5 جولائی 1977ء کی شب جنرل ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹ کر فوجی انقلاب بپا کر دیا اور قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور بہت سی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ بھٹو صاحب کو احمد رضا قصوری کے والد، نواب احمد خان کے قتل کے کیس

ایف ایس ایف کے تین کارکنوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے عدالت میں بھٹو کی رہائی کے لئے درخواست دی۔ جس کے بعد بھٹو صاحب ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو (تعارف)

ذوالفقار علی بھٹو 1928ء۔1979ء لاڑکانہ سندھ میں پیدا ہوئے۔ 1950ء میں برکلے یونیورسٹی کیلیفورنیا سے سیاسیات میں گریجویشن کی۔ تعلیم کے بعد 1953ء میں سندھ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی 1958ء تا 1960ء صدر ایوب کی کابینہ میں وزیر تجارت رہے۔ پھر جون 1963ء سے 1966ء تک وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالے رہے۔ دسمبر 1967ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ ان کی جماعت نے 1970ء کے الیکشن میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ دسمبر 1971ء میں عنان اقتدار ان کے ہاتھ میں آئی۔ اگست 1973ء تک صدر پاکستان رہے پھر 1973ء کے آئین کے مطابق وزیر اعظم بنے اور 1977ء تک برسر اقتدار رہے۔ 4 اپریل 1979ء کو پھانسی دی گئی۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے نواب احمد علی قصوری کا قتل کروایا تھا۔

صدر ضیاء الحق کا عہد حکومت:

لیکن ایف ایس ایف کے سربراہ مسعود احمد نے وعدہ معاف گواہ بن کر عدالت میں بیان دیا کہ نواب احمد رضا کے قتل کا حکم انہیں ذوالفقار علی بھٹو نے دیا تھا۔ عدالت نے اس بیان کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے بھٹو صاحب کی ضمانت منسوخ کر دی اور انہیں 4 اپریل 1979ء کو سزائے موت دی گئی۔ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگانے کے بعد اسے خونی انقلاب کی شکل نہ دی نہ ہی آئین منسوخ کیا صرف اس کی کئی دفعات پر وقتی طور پر عمل درآمد روک دیا گیا۔ صدر مملکت فضل الٰہی چوہدری کو بھی ان کے عہدے پر برقرار رکھا، مگر بعد ازاں انہوں نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ اگرچہ ضیاء الحق نے صرف 90 دن میں انتخابات کرانے کا وعدہ کیا تھا مگر بعد ازاں احتساب کو لازمی قرار دے کر 17 نومبر 1979ء کو منعقد کئے جانے والے انتخابات کو بھی غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیا۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ مخالف سیاسی لیڈروں کو گرفتار یا نظر بند کر دیا گیا۔ فوجی عدالتوں کا دائرہ کار بڑھا دیا گیا۔ اخبارات پر کڑی سنسر شپ لگا دی گئی او اسلام کو عملی طور پر نافذ کرنے کا اعلان کیا۔

مجلس شوریٰ کا قیام:

وفاقی سطح پر مجلس شوریٰ کا قیام بھی جنرل ضیاء الحق کی اسلامی خواہشات کا آئینہ دار تھا۔ نفاذ اسلام کے لئے متعدد عملی اقدامات کئے گئے، مثلاً سرقہ، ڈکیتی، زنا، امتناع شراب، تہمت زنا اور تازیانوں کی سزاؤں سے متعلق قانون "حدود" جاری کیا گیا۔ زکوٰۃ آرڈیننس کے نفاذ سے پہلی مرتبہ پاکستان میں زکوٰۃ کی وصولی کا نظام نافذ کیا گیا۔ عشر کا نظام قائم کیا گیا۔

وفاقی شرعی عدالت احتساب قائم کی گئی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے اختیارات بڑھا دیئے گئے۔ بلا سود بینکاری کی سہولتیں پیدا کی گئیں۔ 1980ء میں افغانستان پر روسی حملے کے بعد ضیاء الحق صاحب نے افغانستان کو روسی انتداب سے نکالنے کی کوششیں کیں۔ پاکستان میں افغان مہاجرین کی آمد کے بعد اقوام متحدہ اور بالخصوص امریکہ نے خصوصی امداد دی۔ اس طرح پاکستان میں یکے بعد دیگرے تین مارشل لا لگائے گئے اور فوجی انقلاب آئے۔ چوتھی مرتبہ جنرل پرویز مشرف نے میں اقتدار پر قبضہ کیا۔ مگر مارشل لاء نافذ نہیں کیا گیا۔ نگران کا دور حکومت بھی آمرانہ تھا۔

جنرل محمد ضیاء الحق (تعارف)

جنرل محمد ضیاء الحق (1924ء۔1988ء) صدر پاکستان، جالندھر مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئے۔ دہلی سے تعلیم مکمل کی اور مئی 1945ء میں فوج میں کمیشن لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران برما اور مشرق بعید میں خدمات انجام دیں۔ 1947ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ 1964ء میں کوئٹہ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج میں انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔ مئی 1968ء میں کرنل کے عہدے پر ترقی کی۔ یکم مارچ 1976ء کو جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ 1977ء میں قومی اتحاد کی الیکشن کے خلاف چلائی جانے والی تحریک سے جب ملک انقلاب کے دھانے پر پہنچ گیا تو جنرل ضیا الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور گیارہ سال تک پاکستان کے حکمران رہے۔

......☆......

1959-کیوبا میں انقلاب

16 جنوری 1959ء کو ہوانا کیوبا کی سڑکوں پر عوام جشن منانے کے لیے نکل آئے اور سرخ اور سیاہ رنگ کے جھنڈے عمارتوں کاروں اور گھروں پر لہرائے گئے۔ یہ سب کیوبا کی حکومت میں ہونے والی اس انقلابی تبدیلی کی خوشی میں تھا جو آج صبح ہی کیوبا کے انقلابیوں نے ایک فوجی مہم کے دوران صدر FLUGENICIO BTISTA کی استبدادی حکومت کا تختہ الٹ کر حاصل کی تھی۔ یہ انقلابی راہنما فیڈل کاسترو FIDEL CASTRO کی سرکردگی میں ہوا تھا۔ ادھر صدر بتستا نے خون خرابے سے بچنے کے لیے استعفیٰ دے دیا اور ڈومینکن ری پبلک میں پناہ لے لی۔

پس منظر:

کیوبا کو مشہور ہسپانوی مہم جو کرسٹوفر کولمبس نے 28 اکتوبر 1492ء کو دریافت کیا تھا۔ کولمبس نے جزیرہ پر قبضہ کے بعد اس کا نام سپین کی شہزادی جوانا JUANA کے نام پر جوانا رکھا بعد ازاں یہاں سرخ ہندی قبیلے کیوبنکن کی مناسبت سے یہ جزیرہ کیوبا کہلایا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں یہاں نوآبادیاں قائم ہونا شروع ہوئیں اور اگلے چار سو برس تک یہ جزیرہ ہسپانوی نوآبادی بنا رہا۔

سپین کے خلاف جدوجہد:

سپین کی چار سو سالہ حکمرانی کے خلاف باقاعدہ جدوجہد 1868ء میں شروع ہوئی۔ آزادی کی یہ جدوجہد کیوبا کی تاریخ میں دس سالہ جنگ کہلاتی ہے۔ اس جدوجہد کی قیادت ایک زمیندار کارلوس دی کاسپیڈس نے کی۔ اس انقلابی گروہ نے کیوبا کی آزادی اور غلامی کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ سپین نے ان کے یہ مطالبات مسترد کر دیے جس کے نتیجے میں جنگ کا آغاز ہوا۔ 1875ء میں انقلابی گروہ نے یک طرفہ اعلان آزادی کر دیا اور جنرل توماس ایلسٹراڈا پالما کو عبوری صدر بنا دیا، لیکن جنگ ابھی جاری تھی۔ یہ جنگ 1878ء میں سپین سے معاہدہ ZANJN پر ختم ہوئی۔ اس معاہدے میں سپین نے جزیرہ میں سیاسی اصلاحات کے نفاذ کا وعدہ کیا۔ 1886ء میں کیوبا میں غلامی کا خاتمہ ہو گیا لیکن آزادی ہنوز نہ مل سکی۔ فروری 1895ء میں سپین نے کیوبا میں آئینی ضمانتیں معطل کر دیں تو 23 فروری کو جوز مارٹی اور جنرل میکسمو گومیز بائز کی قیادت میں سپین کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی۔ ان باغیوں کو امریکی حمایت حاصل تھی۔ اس لڑائی میں ہزاروں کیوبن

مارے گئے۔ ادھر سپین بھی 1898ء تک کیوبا کے صرف ساحلی شہروں پر قبضہ برقرار رکھ سکا۔ امریکی صدر ولیم میکنلے کیوبا کے معاملے میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ 15 فروری 1898ء کو ایک امریکی بحری بیڑا باغیوں کی مدد کے لیے کیوبا پہنچا۔ کیوبا کے دوران سپین نے امریکہ کا ایک بحری جہاز غرق کیا تو اپریل 1898ء امریکہ براہ راست اس لڑائی میں کود پڑا۔ اس طرح کیوبا کی جدوجہد آزادی ہسپانوی امریکی جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ اس جنگ میں سپین کو شکست ہوئی اور اس نے اگست میں ہتھیار ڈال دیئے۔

کیوبا امریکہ کی تحویل میں:

10 دسمبر 1898ء کو ایک معاہدہ پیرس میں طے پایا جس کی رو سے سپین نے جزیرے کا اقتدار امریکہ کے حوالے کر دیا امریکی فوج کیوبا پر قابض ہو گئی۔ امریکہ نے کیوبا میں ایک فوجی حکومت قائم کر دی۔ یکم جنوری 1899ء سے 20 مئی 1902ء تک امریکہ کی فوجی حکومت برسر اقتدار رہی۔ جنرل لیونارڈ ووڈ LEONARD WOOD اس حکومت کا سربراہ تھا۔ امریکی فوج کی کیوبا میں موجودگی کو کیوبا اور امریکہ کے شہری ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ امریکی فوجی حکومت کے عہد میں کیوبا میں ترقیاتی کام کئے گئے۔ عوامی بہبود کا پروگرام شروع کیا گیا۔ اس دوران تمام شعبوں کے لئے کیوبن شہری بھرتی کئے گئے۔ کیوبا کی عوام کا دباؤ بڑھ جانے کے بعد امریکہ نے فیصلہ کیا کہ حکومت عوام کے حوالے کر دی جائے۔

آزادی خود مختاری:

چنانچہ 5 نومبر 1900ء سے 21 فروری 1901ء تک ہوانا میں آئینی کنونشن منعقد ہوا۔ 12 جون 1901ء کو کیوبا میں آئین نافذ کر دیا گیا۔ اسی آئین کے تحت امریکہ کو کیوبا میں مداخلت کا حق مل گیا۔ اس کے علاوہ امریکہ کیوبا میں بحری اڈے بنانے کا بھی مجاز ٹھہرا۔

جمہوریہ کیوبا:

پہلی کیوبن کانگرس کا اجلاس 5 مئی 1902ء کو ہوا۔ 20 مئی 1902ء کو جمہوریہ کیوبا وجود میں آ گیا۔ سابقہ پوسٹ ماسٹر جنرل توماس اسٹراڈا پالما کو جمہوریہ کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ امریکی فوجیں جزیرے سے واپس چلی گئیں اور قومی پرچم رائج ہو گیا۔ 1903ء میں ایک معاہدے کے تحت امریکہ نے گوانتاموبے کی بندرگاہ لیز پر مستقل لے لی اور وہاں بحری اڈہ قائم کیا گیا۔ اسی بحری اڈے میں گوانتانام کی بدنام زمانہ امریکی جیل ہے۔ 5 فروری 1904ء کو امریکی فوج کا آخری دستہ بھی امریکہ چلا گیا۔ اور وہ مکمل طور پر امریکی تسلط سے آزاد ہو گیا۔

کرپٹ انتظامیہ:

پالما حکومت کی انتظامیہ کرپشن میں اتنی ملوث ہو گئی کہ حزب اختلاف نے پالما حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ (جولائی 1906ء)۔ 29 ستمبر کو صدر پالما نے استعفیٰ دے دیا اور ایک عبوری حکومت تشکیل دی گئی۔ یہ حکومت امریکہ کی طرف سے تھی جس کے سربراہ چارلس ماگون تھے۔ یہ حکومت 28 جنوری 1909ء تک قائم رہی۔

امریکی مداخلتیں:

28 جنوری 1909ء کو دوسری کیوبا جمہوریہ قائم ہوئی اس کے صدر لبرل جنرل میگویل تھے۔ یکم اپریل کو امریکی فوجیں واپس چلی گئیں۔ جلد ہی اس حکومت پر بھی بدعنوانی کے الزامات عائد کر دیئے گئے۔ 1912ء میں سیاہ فاموں نے اورینٹ میں خونی بغاوت کر دی۔ جس کے بہانے سے امریکی فوجیں پھر کیوبا میں داخل ہو گئیں۔ فروری 1917ء میں لبرلوں کے کارکنوں نے بغاوت کر دی۔ ان دونوں بغاوتوں کے دوران امریکی فوج جزیرے میں امریکی مفادات کی نگرانی کے بہانے سے جزیرے میں داخل ہو گئی۔ 1916ء میں قدامت پسند پارٹی کے صدر مینوکال دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔ اس نے امریکی فوج کی مدد سے باغیوں پر قابو پالیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران 7 اپریل 1917ء کو کیوبا نے اتحادیوں کی حمایت میں جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 1924ء میں انتخابات منعقد ہوئے جن میں لبرل پارٹی کے امیدوار جیراڈ میکاڈو مورالس کو صدر منتخب کر لیا گیا۔ دوبارہ منتخب ہونے کے بعد جیراڈ پہلا آمر مطلق بن گیا۔ اس نے مارشل لا نافذ کر کے کانگرس سے ایمرجنسی کا نفاذ اور اسمبلی معطل کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ ان اختیارات سے کام لے کر اس نے حزب اختلاف کو بری طرح کچل دیا۔ اس کے خلاف فوج نے بغاوت کر دی۔ اگست 1933ء میں استعفیٰ دے کر یہ ملک سے فرار ہو گیا۔

بتستا بادشاہ گر:

اکتوبر 1933ء میں ایک فوجی سارجنٹ فلجنسیو بیٹسٹا FULGENCIO BETISTA نے یونیورسٹی کے پروفیسروں اور طالب علموں سے مل کر نئی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ایک پانچ رکنی کمیٹی نامزد کر دی۔ جس کے سربراہ خود بیٹسٹا تھا۔ اس کمیٹی نے کارلوس مینوئیل صدر (عبوری) مقرر کیا۔ لیکن چند ماہ بعد اسے فوج نے برطرف کر دیا۔ اب ریمون گراؤ سان مارٹن کو صدر بنایا گیا۔ اس صدر کی حکومت کیوبا میں امریکی اثر و رسوخ کم کرنا چاہتی تھی اور مختلف تبدیلیوں کو متعارف کرانا چاہتی تھی۔ امریکہ نے اس نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف باتستا مکمل امریکی حمایت کے ساتھ میدان میں آیا۔ اس نے 1934ء میں سان مارٹن کو برطرف کر دیا اور آرمی چیف کی حیثیت سے 1940ء تک آمر بن کر حکومت کرتا رہا۔ باتستا دراصل بادشاہ گر کے فرائض انجام دیتا رہا اور اپنی پسند سے برائے نام صدر منتخب کرتا رہا۔ باتستا کی حکومت کو جمہوریہ امریکہ کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ 1934ء میں باتستا نے امریکہ سے ایک معاہدہ کر کے اس کی اجارہ داری قبول کر لی تھی۔ 1936ء میں باتستا نے ایک سیاسی راہنما فیڈر ریکولا ریڈو کو صدر بنا دیا۔ اس نے سماجی اور اقتصادی اصلاحات کا پروگرام شروع کیا۔ 1940ء میں کیوبا کا نیا آئین نافذ ہوا۔ اب باتستا خود صدر بن گیا اور اس نے سان مارٹن کو شکست دی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران کیوبا نے جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ 1944ء میں نئے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات میں باتستا دوبارہ الیکشن نہیں لڑ سکتا تھا اس لئے اس نے اپنے ایک حمایتی کارلوس زائیاس کو صدارتی امیدوار نامزد کیا، لیکن پرانے کھلاڑی سان مارٹن نے اسے شکست دے دی۔ اس دور میں کیوبا خوراک کی کمی کا شکار رہا۔ 1948ء میں باتستا پھر صدارتی امیدوار بن کر سامنے آیا مگر الیکشن ہونے سے صرف تین ماہ پہلے باتستا نے فوج کی مدد سے کارلوس کا تختہ الٹ دیا اور ایک بار پھر آمر مطلق بن بیٹھا۔ اس نے کانگرس معطل کر دی اور 1954ء میں

انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا اس کے ساتھ آئین معطل کر کے پارلیمنٹ توڑ دی اور ایک عبوری حکومت قائم کر لی۔

فیڈل کاسترو سٹیج پر نمودار ہوتا ہے:

26 جولائی 1953ء کو ایک نوجوان وکیل فیڈرل کاسترو نے باتسٹا کی آمریت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے سانتیاگو ڈی کیوبا میں فوج کی بیرکوں پر حملہ کیا لیکن اسے ناکام بنا دیا گیا۔ کاسترو کی بغاوت کچل دی گئی اور کاسترو کو اس کے انقلابی ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ یکم نومبر 1954ء کو وعدے کے مطابق الیکشن کرائے گئے باتسٹا بلا مقابلہ چار سال کے لئے صدر منتخب ہو گیا۔ 24 فروری 1955ء کو باتسٹا نے صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا اور 1940ء کا آئین ملک میں بحال کر دیا۔ باتسٹا نے اس دوران ملک کی خوشحالی کے لئے کام کیا اور ملک میں صنعت لگائی گئی۔ آئینی حکومت کی بحالی کے بعد کاسترو اور دیگر سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ کاسترو بعد ازاں جلاوطن ہو کر میکسیکو چلا گیا۔

فیڈل کاسترو

فیدل کاسترو (1926ء) کیوبا میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم سانتا گو میں حاصل کی 1942ء میں ہوانا گیا اور 1950ء میں قانون کی ڈگری لی اسی دوران کیوبا کے 200 انقلاب پسند طالب علموں کا ایک گروہ تیار کیا اور 26 جولائی 1953ء کو سانتیاگو کی فوجی بیرکوں پر حملہ کر کے بہت سے فوجی ہلاک کر دیئے۔ یہ تھی اس کی پہلی انقلابی کوشش جس کی پاداش میں اسے گرفتاری کے بعد 15 سال کی قید کی سزا دی گئی۔ مگر 1956ء میں کیوبا کی پارلیمنٹ نے سیاسی قیدیوں کی معافی کا قانون منظور کیا تو کاسترو اور اس کے ساتھی بھی رہا ہو گئے۔ پھر جلاوطن ہو کر میکسیکو میں انہوں نے کیوبا کے نوجوانوں کی مختصری فوج بنائی۔ 2 دسمبر 1958ء کو یہ فوج کاسترو کی قیادت میں کیوبا کے صوبہ اورینٹ کے ساحل پر اتری۔ کیوبا کے ہزاروں نوجوان اس فوج میں شامل ہو گئے اور انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد سے کاسترو خاموش زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ ان کے بقول وہ دنیا کے آخری کیمونسٹ ہیں۔

انقلابی تحریک:

میکسکو ہی میں کاسترو نے وہ فیصلہ کن انقلابی تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں انقلاب بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اس دوران کاسترو کا چھوٹا بھائی روال اور بائیں بازو کا ایک انقلابی راہنما چی گویرا امریکہ کی ریاست فلوریڈا اور نیویارک سے چندہ جمع کر کے مالی امداد پہنچاتے رہے۔ فیڈرل کاسترو نے ان دونوں کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میرے پاس روزآنہ بیس ہزار ڈالر ہوتے تھے، لیکن میرا معصوم بچہ دودھ کے لئے بلک رہا تھا، کیونکہ میں عوام کی اس امانت سے اپنے لئے خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانے میں میری رہائش جس مکان میں تھی، کئی بار عدم ادائیگی بل کی وجہ سے اس کی بجلی

ہائی گئی تھی۔

کیوبا کو واپسی:

آخر میکسکو پولیس ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی اور خانہ تلاشی میں اس کے گھر سے بڑی تعداد میں اسلحہ برآمد ہو گیا۔ چنانچہ اسے میکسکو سے نکال کر کیوبا بھیج دیا گیا۔ جب انہیں کیوبا بھیجا گیا تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ پھر دسمبر 1958ء میں اپنے 82 ساتھیوں کے ساتھ ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی میں وہ کیوبا کے مشرقی ساحل پر اترے۔ صدر باتستا کو ان کی آمد کی خبر ہو چکی تھی اور کاسترو نے بھی اسے پیغام بھیجا تھا کہ وہ اس سے نفسیاتی جنگ لڑنے کے لئے آیا ہے...... کیوبا کی فضائیہ نے ان کی اور ان کے ساتھیوں کی تلاشی شروع کر دی۔ وہ سارا دن گنے کے کھیت میں چھپے رہتے تھے آخر چی گویرا، روال اور کاسترو میسترا کے پہاڑی علاقے میں پناہ گزین ہو گئے۔ یہاں انہوں نے بڑے بڑے زمینداروں پر اپنی عدالت میں مقدمے چلائے اور ان کی زمینیں غریبوں میں بانٹ دیں اس طرح وہ عوام میں "رابن ہڈ" مشہور ہو گیا۔ کیوبا کے مفلس اور نادار باشندے اسے ہر قسم کی مدد دینے لگے۔ کیوبا کیتھولک یونیورسٹی گروپ کا سربراہ فادر آرمنڈ ارینتے بھی اس کے متعلق کہنے لگا کہ چونکہ کاسترو کا ہاتھ غریبوں کے کندھے پر ہے وہ یقیناً غریبوں کا بھلا کرے گا۔..........

ارنسٹو چی گویرا، ایک انقلابی

ERNESTO CHE GUEVERA، (1928ء۔1967ء) لاطینی امریکہ کا کمیونسٹ انقلابی۔ ارجنٹائن میں پیدا ہوا۔ ڈاکٹری کی تعلیم کے بعد اس نے ارجنٹائن کو خیر باد کہا۔ ابتدا میں ارجنٹائین اور گوئٹے مالا کی کمیونسٹ تحریکوں میں حصہ لیا پھر 1956 میں کیوبا آ گیا اور حکومت کے خلاف گوریلا سرگرمیوں میں فیدل کاسترو کے ساتھ حصہ لیا جلد ہی فیدل کاسترو کا معتمد بن گیا۔ 1959ء میں انقلاب کیوبا کے بعد اسے نیشنل بینک کا صدر اور وزیر صنعت مقرر کیا گیا مگر اس کی انقلابی روح اب یہاں بھی نہ ٹھہر سکی اور 1961ء میں خفیہ طور پر بولیویا چلا گیا۔ اپریل 1965ء میں کاسترو نے اعلان کیا کہ گویرا نے کیوبا کی شہریت ترک کر دی ہے۔ بولیویا میں انقلابی کے طور پر پکڑا گیا اور سزائے موت دی گئی۔

ماسکو پرست کمیونسٹ:

اس سے پہلے صدر باتستا نے کاسترو اور اس کے ساتھیوں کو ماسکو پرست کمیونسٹ کہنا شروع کر دیا۔ پھر جب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیوبا کی کمیونسٹ پارٹی نے ان کا ساتھ دینے کی پیشکش کی تو انہوں نے اس پیشکش کو سختی سے ٹھکرا دیا اور کہا......... میں نہ کبھی کمیونسٹ تھا اور نہ کمیونسٹ ہوں اور اگر بالفرض کمیونسٹ ہوتا بھی تو اتنا بزدل نہیں ہوں کہ اپنے سیاسی عقائد چھپاتا پھروں..........

پھر انقلابیوں نے باتستا حکومت کا اقتدار ختم کرنے کے لئے یہ انقلابی تدبیر سوچی کہ گورنمنٹ کی آمدنی ختم کر دی جائے۔ جس کا دارومدار صرف گنے کی کاشت اور فصل پر تھا۔ چنانچہ اس پروگرام کا اعلان ہوتے ہی کاسترو اور اس کے ساتھیوں نے گنے کے کھیتوں کو نذرِ آتش کرنا شروع کر دیا اس کام کا آغاز انہوں نے اپنے عزیزوں کے کھیت نذرِ آتش کرکے کیا۔

کیوبا کی سب سے رومانوی شخصیت:

باتستا حکومت کے خلاف کاسترو اور اس کے ساتھیوں کی اس دو سالہ تحریک کے دوران امریکی عوام اور اخبارات نے انہیں بڑھ چڑھ کر داد دی اور اخبار نیویارک ٹائمز نے اسے کیوبا کی سب سے اہم اور رومانوی شخصیت قرار دے دیا۔ جب کاسترو اور اس کے ساتھیوں نے جنوری 1959ء میں باتستا حکومت کا تختہ الٹ دیا تو امریکہ کی حکومت نے پانچ دن میں ہی کیوبا کی نئی انقلابی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

انقلاب کے بعد:

انقلاب کے بعد کاسترو نے ہیلی کاپٹر پر سوار ہو کر پورے کیوبا کا دورہ کیا۔ ہر جگہ عوام نے اسے گلے لگایا اور مبارک باد پیش کی۔ جب اس کا ہیلی کاپٹر لوگوں میں گھر جاتا تو وہ اس کے دروازے میں کھڑے ہو کر لوگوں کو مبارک باد کا جواب دیتے۔ کیوبا کے باشندوں کو پہلی بار ایسا انقلابی ہیرو مل گیا تھا جسے دنیا کی کوئی طاقت خرید نہیں سکتی تھی۔ اس کا چرچا جلد ہی پورے لاطینی امریکہ میں ہونے لگا۔

آمریت کے بدلے آمریت:

یہ درست تھا کہ کاسترو بڑا دیانت دار نکلا اور کبھی نہیں بکا مگر جس آمرانہ نظام کو اس نے اپنے انقلاب کے ذریعے ختم کیا تھا وہ اسے جمہوری نظام میں نہ بدل سکا، اور آمریت کے بدلے اس نے آمریت ہی قائم کر دی۔ 1940ء کے آئین سے غداری کے مرتکب ہونے پر باتستا پر مقدمہ چلایا گیا مگر ساتھ ہی یہ آئین منسوخ کر دیا گیا اور بنیادی قانون نافذ کر دیا گیا، جس کے تحت انہیں نجی املاک ضبط کرنے، مزدوروں اور کارخانہ داروں یا مالکان صنعت کے باہمی مسائل کے متعلق آمرانہ فیصلے کرنے اور ہر قسم کے مصارف اور اخراجات منظور کرنے کے آمرانہ اختیارات کاسترو کو حاصل ہو گئے۔ صدر باتستا اور ان کے فوجی ساتھیوں پر چن چن کر مقدمے چلائے گئے اور پانچ سو افراد کو گولی سے اڑایا گیا۔ جب باتستا حکومت کے ایک ایسے ہی افسر کے وکیل نے دلیل پیش اور اس کا جرم ثابت نہ ہوا تو ٹریبونل پریزائڈنگ آفیسر نے جواب دیا ''کچھ بھی ہو اسے گولی ضرور ماری جائے گی کیونکہ قوم کی بگڑی ہوئی صحت اسی طرح بحال ہو سکتی ہے''۔

شدید نقطہ چینی کا جواب:

جب کاسترو کی آمرانہ کارروائیوں پر امریکہ اور لاطینی امریکہ کے اخبارات اور میڈیا نے شور مچایا تو مردِ آہن کاسترو نے جواب دیا ''کیا انہیں اس سے پہلے باتستا حکومت کے مظالم نظر نہیں آئے تھے اور انہوں نے ان مظالم پر شور کیوں نہیں مچایا تھا۔ یہ لوگ جنہیں سزائیں دی جا رہی ہیں باتستا ہی کی طرح کے قاتل لوگ ہیں۔'' پھر حکومت امریکہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ پچاس سال سے کیوبا کی نااہل حکومتوں کو اسلحہ اور امداد فراہم کرتا آ رہا ہے۔ جس سے ہزار ہا بے گناہ افراد

ہلاک کیے گئے ہیں۔ اب اگر کیوبا کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی گئی تو چاہے وہ امریکہ ہی کیوں نہ ہو اس سے لاکھوں افراد سے انتقام لیا جائے گا۔

انقلابی اصلاحات:

اس کے بعد کاسترو نے مختلف اصلاحات کی طرف توجہ دی اور مکانوں اور زمینوں کے کرائے کم کر دیئے۔ کیوبا کی 31 فی صد اراضی ضبط کر لی گئی اور انہیں اشتراکیہ فارمز میں تقسیم کر دیا گیا حتیٰ کہ بعض قریبی رشتہ داروں کی زمینیں بھی چھین لی گئیں۔ رفتہ رفتہ کیوبا کی کمیونسٹ پارٹی سے اس کی صلح ہو گئی اور انہوں نے کمیونسٹوں کو اپنی حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیا۔ انہوں نے اپنے دور اقتدار میں آج تک یعنی پچھلے پچاس سالوں میں کبھی انتخابات منعقد نہیں کرائے اور اس کی دلیل یہ دی کہ انتخابات کا فائدہ ہی کیا ہوگا کیونکہ ووٹر پھر مجھے ہی ووٹ دے کر صدر بنا دیں گے۔

کاسترو کی پالیسیاں:

اگرچہ کیوبا کی عوام انہیں ہیرو اور نجات دہندہ سمجھتے تھے مگر دولت مند طبقے سے متوسط طبقے تک کے لاکھوں افراد کیوبا چھوڑ کر امریکہ چلے گئے۔ کاسترو حکومت نے کیتھولک عیسائی پادریوں کو بھی یہ کہہ کر پکڑنا شروع کر دیا کہ یہ سب امریکہ کے ایجنٹ ہیں جنہوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ 1959ء میں وہ جب امریکہ کے دورے پر واشنگٹن گئے تاکہ حکومت امریکہ سے کوئی مفید سمجھوتہ ہو جائے۔ لیکن صدر آئزن ہاور نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے عین اس دن جارجیا میں گالف کھیلنے کا پروگرام بنا لیا جس دن کاسترو نے ان سے ملاقات کرنا تھی وہ انہیں نائب صدر نکسن کے سپرد کر گئے جو انہیں سارا دن ان کی غلط پالیسیوں پر سرزنش کرتے رہے۔ سینیٹر جان ایف کینیڈی نے صدر آئزن ہاور کی سرد مہری کا برا منایا۔ سابقہ صدر ٹرومین نے بھی کاسترو کے حق میں یہ الفاظ کہے کہ کاسترو جو کچھ بھی کر رہا ہے کیوبا کی بہتری کے لئے کر رہا ہے۔

کمیونسٹ بلاک میں:

امریکہ سے بے زار ہو کر کاسترو نے اس زمانہ دوسری بڑی سپر پاور یعنی روسی کمیونسٹ بلاک کی طرف توجہ دی، جو پہلے ہی سے اس لمحے کے منتظر تھے۔ چنانچہ روس سے کیوبا کو دس لاکھ ٹن چینی کا آرڈر بھی مل گیا جس کے عوض انہیں جنگی طیارے فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کاسترو کا جھکاؤ کمیونسٹ بلاک کی طرف ہو گیا۔ اور اس نے کیوبا میں امریکیوں کے کاروبار ضبط کرنے شروع کر دیئے۔ اس کے ردعمل کے طور پر صدر آئزن ہاور نے سی آئی اے کو کاسترو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی خدمت پر معمور کیا۔ حتیٰ کہ 3 جنوری 1961ء کو امریکہ نے کاسترو کی حکومت سے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں کاسترو نے حکومت امریکہ پر الزام لگایا کہ وہ کیوبا پر حملہ کرنا چاہتی ہے۔ اگرچہ حکومت امریکہ نے اس الزام کی تردید کر دی لیکن امریکی اخبارات، دی نیشن اور سینٹ لوئی پوسٹ وغیرہ نے اس بات کی تصدیق کی کہ سی آئی اے کیوبا پر حملہ کرنے کے لئے باغیوں کو تربیت دے رہی ہے۔

صدر کینیڈی کے عہد میں:

صدر آئزن ہاور کے بعد جب کینیڈی صدر بنے تو ان پر زور دیا گیا کہ کیوبا پر حملہ کیا جائے کیونکہ جونہی یہ حملہ ہوگا اہل

کیوبا کاسترو کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ چنانچہ 1963ء میں امریکی بحریہ کے جہازوں نے کیوبا کے ساحل پر واقع چھاپہ مار اتارے۔ بحران میں بیشتر مارے گئے اور گیارہ سو کے قریب قیدی بنالئے گئے۔ یہ امریکہ کے وقار اور گھمنڈ پر ایک کاری ضرب تھی۔

اشتراکی ملک قرار دیا گیا:

کاسترو نے یکم مئی 1961ء کو یوم مئی کے موقع پر کیوبا کو اشتراکی ملک قرار دے دیا اور ایک سیاسی بیان میں کہا ”اگر مسٹر کینیڈی کو اشتراکیت سے چڑ ہے تو ہمیں سامراجیت اور سرمایہ داری سے چڑ ہے......“ ایک سال بعد انہوں نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ وہ کارل مارکس اور لینن کے نظریاتی پیروکار ہیں اور مرتے دم تک اسی پر قائم رہیں گے۔ 1963ء میں اشتراکی نظریات کا پرچار کرنے کے لئے 14 سال سے 19 سال کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ”سپاہ دانش“ قائم کردی جس کا کام یہ تھا کہ وہ دیہات میں تعلیم بالغاں کے علاوہ گنے کے کھیتوں پر محنت کرے۔ اس وقت انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے بڑے زمین داروں کو ختم کرکے اور اجتماعی فارم نہ قائم کرکے غلطی کی ہے۔ غلط منصوبہ بندیوں کی وجہ سے کیوبا غذائی قلت کا شکار ہونے لگا، بھوک اس قدر عام ہوگئی کہ عوام نے کھلے بندوں کمیونزم مردہ باد اور ہم بھوکے ہیں ہمیں کھانا دو کے نعرے لگانے شروع کردیئے۔

کیوبا میں روسی مزائلوں کی تنصیب اور امریکہ روس مزائل بحران:

1962ء میں امریکہ کے صدر کینیڈی نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ روس نے کیوبا کی فوجی تنصیبات پر بین البراعظمی ایٹمی میزائل نصب کردیئے ہیں جس سے امریکہ کی سلامتی کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ اگر روس نے یہ ایٹمی میزائل کیوبا سے نہ ہٹائے تو دنیا ایک بڑی ایٹمی جنگ کے خطرے سے دوچار ہوسکتی ہے۔ مگر امریکہ نے روس اور کیوبا کو میزائلوں کی اس تنصیب کے نتیجے میں سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکی دی۔ اس دھمکی کے جواب میں کاسترو نے اپنی فوجوں کو ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لئے تیار رہنے کا حکم دے دیا اور دوسری طرف روسی لیڈر خروشیف نے لچکدار پالیسی کا اظہار کیا اور ایٹمی جنگ سے بچنے کے لئے دونوں طاقتوں کے سربراہوں کی ایک ہنگامی میٹنگ پر زور دیا۔ دراصل کاسترو نے اکتوبر 1962ء میں خفیہ طور پر پانچ ہزار روسی تکنیکی ماہرین کو کیوبا میں چاروں طرف ایٹمی میزائل نصب کرنے کی دعوت دی تھی اور ساتھ ہی امریکہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ 1961ء کی غلطی کا اعادہ کرے گا تو اسے منہ کی کھانی پڑے گی۔ لیکن صدر کینیڈی کو جب ایٹمی میزائلوں کی تنصیب کا پتہ چلا تو اس نے امریکی بحریہ کو کیوبا کی ناکہ بندی کا حکم دیا۔ اس صورت حال اور جنگ کے شروع ہوجانے کے خطرے کو دیکھتے ہوئے خروشیف نے کیوبا میں نصب شدہ ایٹمی میزائل اکھڑوا کر روس واپس منگوالیے صرف شرط یہ رکھی گئی کہ کیوبا کی ناکہ بندی ختم کی جائے۔ اس پر امریکہ نے ناکہ بندی ختم کردی اور اس طرح ایٹمی جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔

فیڈل کاسترو کو صدمہ:

1964ء میں فیڈل کاسترو کے وقار کو اس وقت سخت صدمہ سے دوچار ہونا پڑا جب اس کی سب سے عزیز ہمشیرہ وانیتہ

کیوبا سے فرار ہو کر میکسیکو پہنچ گئی اور اس نے اعتراف کیا کہ وہ کیوبا سے فرار ہونے والوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کرتی رہی ہے۔ اس نے اپنے ایک اور بیان میں کہا۔" کیوبا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور میرے دونوں بھائی فیڈل اور راول جو کچھ کر رہے ہیں میں اس پر خاموش نہیں رہ سکتی، کیونکہ انہوں نے میرے ملک کو ایک سمندری جیل میں بدل دیا ہے اور عوام کو کمیونزم کی صلیب پر لٹکا دیا ہے۔

امریکہ کو دوستانہ پیشکش:

صدر کینیڈی کے قتل کے بعد جانسن صدر بنے تو کاسترو نے ایک بار پھر واشنگٹن سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے صدر جانسن کو خط لکھا کہ اگر وہ یعنی امریکہ کیوبا میں سازشیں کرنا بند کر دے تو کیوبا بھی لاطینی امریکہ کے بعض ملکوں کے باغی گروہوں کو امداد دینا بند کر دے گا، مگر صدر جانسن نے بھی کاسترو کی پیشکش کو درخور اعتنا نہیں جانا۔

دنیا کی طویل ترین تقریر:

1965ء میں فیڈل کاسترو نے قوم کے نام دنیا کی طویل ترین تقریر کی جو قریب قریب پوری رات جاری رہی۔ انہوں نے کیوبا کی عوام کو حوصلہ دیا کہ اب اہل کیوبا اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ ایک ہاتھ سے گنے کے کھیت کاٹیں اور دوسرے ہاتھ سے بیرونی جارحیت کا مقابلہ کریں مگر ان کی یہ طویل ترین تقریر اس زمانے میں کیوبا کی اقتصادی بدحالی کے بحران پر پردہ نہ ڈال سکی۔ کیونکہ اس وقت تک تقریباً دو لاکھ افراد کیوبا کو چھوڑ کر جا چکے تھے مگر 1966ء میں جب نیو یارک میڈیکل کالج کے ڈائریکٹر نے ہوانا میں ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کی تو کیوبا کے دورے سے واپس آ کر انہوں نے امریکی اخباروں کو بیان دیا بے شک کیوبا میں جمہوریت نہ سہی مگر وہاں کی حکومت بھی عوام کی خواہشات کا احترام کرتی ہے۔

سوویت یونین کے زوال کے بعد:

سوویت یونین کے زوال کے بعد کیوبا کی معیشت کو خاصا دھچکا پہنچا۔ اسے اقتصادی ترجیحات تبدیل کرنا پڑی۔ تاریخ کے اس اہم موڑ کے بعد مشرقی یورپ کے ملکوں کی بجائے لاطینی امریکہ کے ہمسائیوں سے تعلق بہتر بنانے پر زور دیا جانے لگا۔ ملک میں حیاتیاتی ٹیکنالوجی سے متعلق صنعت کو بہتر بنا گیا جسے مخالف امریکہ نے حیاتیاتی ہتھیار بنانے کی کوشش قرار دیا۔ 2002ء میں سابق امریکی صدر کارٹر نے کیوبا کا دورہ کیا تو اس کا مقصد وہاں حیاتیاتی انجینئرنگ کی کارگاہوں کا معائنہ کرنا بھی تھا اس جدید صنعت نے کیوبا کی اقتصادیات کو قابل ذکر سہارا دیا ہے۔ 1961ء کے بعد کیوبا اور سوویت یونین میں خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ کاسترو نے امریکہ سے مایوس ہو کر دونوں ممالک کو قریب تر کرنے میں ذاتی دلچسپی لی تھی اور باہمی تجارت میں بھی کیوبا بہت سی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ مگر گورباچوف کے برسر اقتدار آنے کے بعد سوویت یونین کی خارجہ حکمت عملی میں آنے والی تبدیلیوں سے ان دونوں ملکوں کے قریبی تعلقات بھی متاثر ہوئے۔ سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد بورس یلسن کے زیر قیادت روسی حکمت عملی کے اجماع میں آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ نے خصوصی تعلقات پر نظر ثانی کی اس کے نتیجے میں کاسترو کو اپنے طویل زمانہ اقتدار کے دشوار ترین مراحل

سے گزرنا پڑا۔

شدید قلتوں کا سامنا:

نوے کی دہائی کے اول میں تیل، فاضل پرزہ جات، خام مال اور روزمرہ کی اشیائے صرف کی کیوبا میں شدید قلت ہو گئی۔ حکومت ان قلتوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کو قابو میں رکھنے والے جو اقدامات کر رہی تھی وہ اس پر مستزاد تھے اس دورانیے میں کیوبا کے انقلاب کی بقا کے امکانات معدوم ہوتے نظر آتے تھے لیکن کیوبا کے انقلاب اور خود کاسترو کو لاحق بڑا خطرہ بھی وقوع پذیر ہونے کو ہے۔ اپنے جنگ جو گوریلا ساتھیوں کی طرح خود کو دنیا کا آخری کیمونسٹ کہنے والا کاسترو بھی عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔

موجودہ نسل کو جنگ انقلاب لڑنے والوں کا ہیروازم ویسے متاثر نہیں کرتا جیسے ان کے والدین کو کیا کرتا تھا۔ اس امر کے امکانات بھی نظر نہیں آتے کہ کاسترو اقتدار چھوڑ دے گا۔ یہ سوال اپنی جگہ جواب طلب ہے کہ کاسترو ایسے وسائل فراہم کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ قوم اس کی وفات کے بعد بھی اس کے انقلاب کو زندہ رکھ سکے گی۔

.......☆.......

1962ء۔ الجزائر کی آزادی اور فوجی انقلاب

3 جولائی 1962ء کو الجزائر ایک طویل عرصے کی جدوجہد آزادی کے بعد فرانس کی سامراجی تسلط سے آزاد ہوا۔ اس دن ہزاروں الجزائری خوشی اور انبساط کے عالم میں سڑکوں پر نکل آئے اور ائیر پورٹ پر اپنی نئی حکومت کا والہانہ اور پر جوش استقبال کیا۔ وزیر اعظم یوسف بن خدا اور ان کا عملہ صدر فرانس چارلس ڈیگال کے ہمراہ الجزائر کے اعلان آزادی کے چند گھنٹے بعد تونس سے الجزائر پہنچے۔ صدر ڈیگال نے اقتدار اعلیٰ الجزائر کو منتقل کرنے میں دو دن لگائے۔ الجزائر کی عوام نے گزشتہ اتوار کو متفقہ طور پر ووٹ ڈال کر آزادی کے حق میں فیصلہ کر دیا تھا آخری نتیجہ 99.72 فی صد رہا۔ اس کے ساتھ ہی فرانس کے 123 سالہ نو آبادیاتی اور سامراجی تسلط کا خاتمہ ہو گیا۔

الجزائر اور فرانس:

انیسویں صدی میں شمالی افریقہ میں مغربی ممالک کی سیاسی چالبازی یا ڈپلومیسی کا پہلا شکار الجزائر کا بننا پڑا تھا۔ ساڑھے آٹھ لاکھ مربع میل کے اس ملک کا بیشتر جنوبی حصہ اگرچہ صحرائی ہے لیکن شمال کی ساحلی پٹی قدرتی مناظر کی خوشنمائی اور آب وہوا کی خوشگواری میں اور زرخیزی کی وجہ سے جنت نظیر ہے۔ جغرافیائی طور پر فرانس کے جنوبی ساحل کے بالکل سامنے واقع ہونے کی وجہ سے یہ فرانس کی حریص نگاہوں کو ہر وقت دعوت دیتا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل تک یہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا جس کے بہادر امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے اسے 1553ء میں فتح کر کے عثمانیہ سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ جب ترکی کی طاقت ٹوٹتی چلی گئی تو فرانس نے دیگر یورپی طاقتوں سے ساز باز کر کے 1830ء میں اس پر حملہ کر دیا۔ عثمانی ترکوں نے کچھ مزاحمت کی مگر فرانس نئے آلات جنگ اور نئی جنگی حکمت عملی میں ترکی سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ اس لیے ترکوں کو شکست ہوئی اور وہ الجزائر کو فرانسیسیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

بحری قزاقوں کا اڈا:

فرانس نے الجزائر پر حملہ کرنے کا سب سے بڑا سبب یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ سرزمین بحری قزاقوں کی آماجگاہ ہے جو بحیرہ روم سے گذرنے والے تمام پر امن جہازوں پر جنگلی درندوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات غلط نہ تھی اور اس سے سپین اور انگلستان بھی نالاں تھے، مگر عثمانیہ سلطنت اس شکایت کا ازالہ کرنے میں ناکام رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس نے

اس بحری قزاقی کے خطرے کو دور کرنے کی کوشش پہلے بھی کی تھی مگر ناکام رہے تھے۔ چونکہ الجزائر میں فرانس کا مفاد زیادہ تھا اس لیے اس نے 1830ء میں اس علاقے پر اپنی فوجیں اتار دیں۔ ترکی نے اگرچہ الجزائر میں اپنی شکست تسلیم کر لی مگر الجزائر کے لوگوں نے آزادی برقرار رکھنے کی جدوجہد جاری رکھی اور اگلے پچاس سال تک یہاں خوفناک بغاوتیں ہوتی رہیں اور تحریک آزادی چلتی رہی۔

سید عبدالقادر:

الجزائر کی اس تحریک آزادی کا ہیرو سید عبدالقادر تھا جس کا تعلق مصر کے فاطمی خلفاء کے خاندان سے تھا۔ فرانس کے حملے کے دو سال بعد الجزائر کے تمام قبائل نے مل کر اسے اپنا امیر منتخب کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں یورپی سامراجیت کے چھا جانے سے عبدالقادر کو دنیا کے کسی ملک سے اخلاقی و مالی اعانت کا امکان بھی نہیں تھا مگر عبدالقادر نے حیرت انگیز استقلال اور مدبرانہ دانائی سے فرانس کی سامراجیت کا مقابلہ کیا۔ عبدالقادر کی یہ بہادرانہ جدوجہد انقلابات عالم کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرانس کی طاقت کھلے طور پر عبدالقادر اور اس کے ساتھیوں سے کہیں زیادہ تھی اور کئی بار انہیں بری طرح شکست بھی ہوئی لیکن ہر شکست سے بددل ہو کر بیٹھ جانے کی بجائے عبدالقادر نے اپنی ٹوٹی پھوٹی طاقت کو مجتمع کر کے ایک نیا محاذ بنانے کی کوشش کی۔ ہر شکست کے بعد فرانس نے یہ سمجھا تھا کہ شاید اب بغاوت نہ ہو مگر ہر بار عبدالقادر ایک نئی شکل میں سامنے آجاتا۔

ایک بڑی طاقت سے مقابلہ:

فرانس کے پاس اس وقت افریقہ اور ایشیاء میں بے شمار نوآبادیاں تھیں جن کی طاقت وہ الجزائر کے خلاف استعمال کر رہا تھا، پھر فرانس کے ساتھ تمام مغربی ملکوں کی ہمدردیاں بھی تھیں اور الجزائر بالکل تنہا تھا۔ آخر 1844ء میں فرانس نے عبدالقادر کو مکمل شکست دی اور وہ مراکش کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ فرانس نے سلطان مراکش کو باغی کی سپردگی کا کہا، سلطان اتنا طاقتور نہ تھا کہ فرانس جیسی طاقت کے اس مطالبے کو رد کر دیتا۔ آخر دو تین سال کی ردوقدح کے بعد الجزائر کی تحریک آزادی کا ہیرو ایک قیدی کی حیثیت سے فرانس لے جایا گیا اور اہل وعیال سمیت وہیں قید کر دیا گیا۔ لیکن عبدالقادر کی گرفتاری سے الجزائر کی تحریک آزادی دب نہ سکی اور اس کے نئے راہنما پیدا ہو گئے۔ فرانس کے خلاف غم وغصہ کی فضا یونہی قائم رہ گئی۔ ادھر فرانسیسیوں نے عبدالقادر کا برین واش کر کے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ الجزائر کے جاہل اور غیر منظم اور نیم مہذب باشندے فرانس جیسی طاقت کو مغلوب نہیں کر سکتے۔ اسکے خیالات اس حد تک بدل دینے کے بعد اسے 1852ء میں رہا کر دیا گیا۔ فرانس کا خیال تھا کہ اس کے خیالات بدل دینے سے الجزائر کی تحریک آزادی کو دبانے میں کوئی مدد مل سکے گی، مگر عبدالقادر اپنے اس نئے رول میں الجزائر کی عوام کو متاثر نہ کر سکا، تاہم فرانس نے اس کی دلجوئی میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس کا وظیفہ بڑا خطیر مقرر کیا اور اسے ایک اعزازی خطاب سے بھی نوازا۔ اس صورت حال نے عوام میں اس کی ہردل عزیزی بالکل ختم کر دی۔

آزادی حاصل کرنے میں ناکامی:

عبدالقادر کے بعد الجزائر کو اس جیسا کوئی بڑا لیڈر نہ مل سکا مگر آزادی کی جدوجہد جاری رہی اور 1856ء اور 1857ء میں فرانس سے بڑی بڑی جنگیں لڑی گئیں، مگر ناکام رہیں اور الجزائر کی آتش آزادی عارضی طور پر دبا دی گئی، مگر احساس آزادی کی چنگاریاں نہ بجھائی جا سکیں۔ الجزائر کی یہ تحریک آزادی دبانے کے لئے فرانس نے بڑی وحشت اور بربریت کا ثبوت دیا۔

نئی تدابیر اور نئے دام:

فرانس کے دوررس دماغوں نے اس اس دوران یہ تدبیر سوجھی کہ الجزائر کے شمالی علاقی میں ایک یورپی آبادی قائم کر کے ایک نئی اقلیت پیدا کر دی جائے، پھر اس اقلیت کے نام پر الجزائر کو ایک افریقی ملک کی بجائے فرانس کا حصہ قرار دیا جائے۔ چنانچہ 1864ء میں فرانس نے پہلے پتھر کے طور پر نپولین سوم کا یہ اعلان جاری کیا کہ الجزائر کوئی نو آبادی نہیں ہے بلکہ فرانس کا ایک صوبہ ہے گویا اس اعلان کے ساتھ فرانس کی سرحدیں رود بار انگلستان سے صحرائے افریقہ کے شمال تک پھیل گئیں، لیکن چونکہ فرانس کی یہ منطق کسی لحاظ سے صحیح نہیں تھی اس لئے الجزائر میں شورش بدستور جاری رہی۔ 1870ء میں جب جرمنی نے فرانس پر حملہ کیا تو فرانس کو پوری طاقت اس جنگ میں لگا دینا پڑی۔ الجزائر نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے پوری طاقت سے آزادی کی لڑائی شروع کر دی، لیکن چونکہ کوئی یورپی طاقت اس کی پشت پناہی نہیں کر رہی تھی اس لیے میدان پھر بھی فرانس کے ہی ہاتھ رہا۔ الجزائر کی تحریک آزادی کو تیونس سے بھی تھوڑی بہت اخلاقی مدد ملتی تھی اس لئے فرانس نے اس کانٹے کو بھی راہ سے ہٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ 1881ء میں تیونس پر حملہ کر دیا مگر ادھر الجزائر کے مجاہدوں نے فرانسیسیوں کی گردن مروڑ دی مگر تیونس اور الجزائر دونوں ہی جدید اسلحے سے خالی تھے اس لئے دونوں جگہ فرانسیسی ہتھیاروں کی جیت رہی۔

ظلم اور سختیاں:

فرانس نے الجزائر کو اپنا صوبہ بنانے کا کام پوری طاقت سے شروع کر دیا تھا۔ بغاوت و سرکشی کے جرم میں ہزاروں آدمیوں پر مقدمات چلائے گئے۔ ہزاروں مربع میل اراضی سے الجزائیر کو بے دخل کر دیا گیا۔ داخلی خودمختاری ختم کر کے ہر شعبے میں فرانس کا اقتدار مکمل کر دیا گیا۔ ہر قسم کے ٹیکس اور تاوان جنگ تک عائد کر کے عوام کو مفلس و بے دست و پا بنا دینے کی کوشش کی گئی۔

جنگ عظیم اول:

ان بے پناہ سختیوں کے نتیجے میں عرصہ تک کوئی قابل ذکر تحریک الجزائر میں نہ ابھر سکی۔ 1914ء کی جنگ شروع ہوئی تو فرانس کو الجزائر کی مدد کی ضرورت لاحق ہوئی، اس لئے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ الجزائریوں سے وعدہ کیا گیا جنگ کے بعد الجزائر کو آزاد کر دیا جائے گا۔ فرانس موت زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اور جرمنی اسے صفحہ ہستی سے مٹا دینے پر تلا ہوا تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں نو آبادیوں سے آزادی کے وعدے پر مدد مانگی گئی اور کہا گیا کہ ہم چھوٹی چھوٹی قوم کو آزاد کر دیں گے۔

فریب اصلاحات:

دنیا کے دیگر ممالک کی طرح الجزائر کے باشندے بھی یورپیوں کے اس فریب میں مبتلا ہو گئے اور فرانس کو جان و مال سے امداد فراہم کرنے لگے اس جنگ میں الجزائر کے 62 ہزار آدمی مارے گئے۔ جنگ کے خاتمے پر الجزائر کے ساتھ بھی وہی حشر کیا گیا جو شام و عراق سے کیا گیا تھا۔ اب الجزائریوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ منظم اور جاندار تحریک چلا سکیں۔ یورپین آبادی ایک طاقت ور اقلیت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور دولت و اقتدار پر اس کا قبضہ تھا۔ تاہم عرب دنیا کی تحریکوں کو دیکھتے ہوئے الجزائریوں نے بھی اپنے حقوق کے لئے ایک تحریک شروع کی۔ آخر بڑی کوششوں کے بعد تین قسم کی اصلاحات فرانس کی "جمہوری شہنشاہیت" نے عطا کیں۔

1- قصبوں اور شہروں کے مقامی انتظام کے لئے محدود اختیارات رکھنے والی میونسپل کمیٹیاں۔
2- فوج میں چند ابتدائی درجوں تک الجزائریوں کو ترقی دی گئی۔
3- فرانسیسی شہریت کے حقوق مگر اس شرط پر کہ الجزائر کے باشندے اپنے شخصی قوانین سے دست بردار ہو جائیں۔

چونکہ یہ شرط الحاد اور بے دینی کے قریب تھی اس لئے صرف چند لوگوں نے اسے قبول کر کے فرانسیسی شہریت اختیار کی مگر قانون سے الجزائر میں آباد چالیس ہزار یہودیوں کو فائدہ پہنچا۔ انہوں نے بغیر کسی پس و پیش کے فرانسیسی شہریت قبول کر لی۔ 1944ء میں اس قانون میں ترمیم وزمی کی گئی اور شخصی قانون سے دستبرداری کی شرط نکال دی گئی لیکن اب فرانسیسی شہریت اختیار کرنے کے لئے فرانسیسی ثقافت کو اختیار کرنا لازم ٹھہرایا یعنی فرانس کا واضح مقصد الجزائریوں کو اسلام سے بدگمان کرنا تھا اسی وجہ سے ایسے قوانین جاری کئے گئے جن سے فائدہ اٹھانے کے لئے مسلمانوں صریحاً عیسائیت اختیار کرنا پڑے۔ الجزائر کی فتح کے وقت الجزائر میں 176 مساجد تھیں لیکن فرانسیسی قبضے دوران صرف 37 مساجد بقایا رہ گئیں، باقی 139 مساجد یا تو مسمار کر دی گئیں یا پھر انہیں گرجا میں تبدیل کر دیا گیا۔ الجزائر شہر کی جامع مسجد آج بھی گرجا کی شکل میں فرانسیسی غلبے کی یاد دلاتی ہے۔

آزادی کی تحریکیں:

اب فرانسیسیوں کی حکومت اتنی مضبوطی سے الجزائر میں پنجے گاڑ چکی تھی کہ صرف مسلح بغاوت کے ذریعے آزادی حاصل کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ اب تک ہونے والی تمام بغاوتیں سختی سے کچل دی گئیں تھیں۔ بیسوی صدی کی تیسری دہائی میں الجزائر کی قومی جدوجہد آزادی کا دوسرا دور شروع ہوا جسے ہم سماجی اصلاح اور پرامن سیاسی جدوجہد کا دور کہہ سکتے ہیں۔ الجزائر کے ایک مزدور راہنما مسالی حج نے 1924ء میں "انجم الافریقۃ الشمالی" کے نام سے ایک مزدور تنظیم قائم کی اس نے جلد ہی ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ نتیجتاً 1936ء میں حکومت نے یہ تنظیم توڑ دی۔ مسالی حج نے اس کے بعد فوراً ہی الجزائری عوام کی پارٹی کے نام PPA نام سے ایک نئی تنظیم قائم کر لی جس نے 1947ء میں جمہوری آزادیوں کی فتح کی تحریک کے نام سے ایک نئی تنظیم کی شکل اختیار کر لی اس کا مختصر نام MLTD تھا اس کے ساتھ مسلمانوں کی کئی اور تنظیمیں بھی قائم ہو گئیں۔ ان میں ایک تنظیم "حزب منشور الجزائر" تھی اس کو 1943ء میں فرحت عباس نے قائم کیا تھا۔ یہ جماعت فرانسیسی یونین میں رہ کر الجزائر کو خود مختار جمہوریہ بنانا چاہتی تھی۔ بعد میں اسی جماعت کا نام جمہوری اتحاد

مسلمان الجزائر ہو گیا۔

الجزائر کی ایک اور جماعت اور اہم تنظیم "جمعیت العلماء الجزائر" تھی۔ اسے 1924ء میں شیخ عبدالحمید بن بادیس نے قائم کیا تھا۔ وہ الجزائر کے ایک ممتاز عالم تھے یہ تنظیم فرانس کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کرتی تھی اور اپنا پیام مدرسوں کتابوں اور اخبارات وجرائد کے ذریعے عوام تک پہنچاتی تھی ہفت روزہ البصائر جو طنجہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس جمعیۃ کا ترجمان تھا۔ سیاسی اعتبار سے جمعیت العلماء الجزائر ملک کی آزادی اور شمالی افریقہ کے دوسرے ملکوں سے اتحاد چاہتی تھی جمعیت العلماء نے الجزائر میں مسلم ثقافت کو بھی زندہ رکھا اور یہ جمعیۃ بہت سے مدرسے اور تعلیمی ادارے چلاتی تھی۔

الجزائری محاذ اور مسلح بغاوت:

1951ء میں مندرجہ بالا جماعتوں نے کئی دوسری جماعتوں سے مل کر الجزائری محاذ برائے دفاع حریت تشکیل دیا اور اس طرح الجزائر کی تحریک آزادی ایک نئے دور میں داخل ہو گئی اس دوران انتہا پسند نوجوانوں کے ایک گروہ نے آئینی طریقوں سے ناامید ہو احمد بن بیلا کی قیادت میں 1947ء میں خفیہ تنظیم QS قائم کی جس کا مقصد MTLD سے رابطہ قائم رکھتے ہوئے مسلح بغاوت کرنا تھا۔ مارچ 1954ء میں اس تنظیم نے قاہرہ میں انقلابی کمیٹی برائے اتحاد وعمل CROA قائم کی اس کمیٹی نے یکم نومبر 1954ء سے مسلح بغاوت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ بغاوت شروع ہونے کے بعد اس تنظیم نے قومی محاذ آزادی کا نام اختیار کر لیا FLN اس کے تحت جو فوج منظم کی گئی وہ قومی آزادی کی فوج ALN کہلائی۔ آہستہ آہستہ دوسری سیاسی جماعتوں کے راہنما جیسے فرحت عباس اور یوسف بن حدہ بھی قومی محاذ آزادی میں شامل ہو گئے۔ ستمبر 1958ء میں الجزائر کی عارضی حکومت بھی قائم کر دی گئی۔

احمد بن بیلا (تعارف)

احمد بن بیلا 1919ء میں مغربی الجزائر میں پیدا ہوئے اور ایک فرانسیسی سکول میں تعلیم پائی۔ دوسری عالمی جنگ میں بن بیلا نے فرانسیسی فوج میں خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد انہوں نے قومی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ مسالی حج کی عوامی پارٹی اور اس کے جانشین MTLD میں کام کیا۔ 1947ء میں انہوں نے مسلح جدوجہد شروع کرنے کے لئے اپنی خفیہ تنظیم قائم کی۔ 1949ء میں ان کی اس تنظیم نے ڈاک خانے پر چھاپہ مار کر کئی لاکھ روپے حاصل کر لیے جس سے ان کی تنظیم کو مالی تقویت پہنچی۔

استصواب رائے عامہ:

فرانسیسی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کرنا اس جدید دور میں کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن الجزائر کے حریت پسندوں نے ہر قسم کی مشکلات کے باوجود جہاد آزادی جاری رکھا اور سات سال کی لڑائی کے بعد لاکھوں مسلمان

مجاہدوں کے جام شہادت نوش کرنے کے بعد آخر کار فرانس الجزائر کی آزادی کا مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یکم جولائی 1962ء کو فرانس نے اہل الجزائر کی رائے معلوم کرنے کے لئے استصواب رائے کرایا جس میں وہاں کے باشندوں نے پورے اتفاق رائے کے ساتھ آزادی کے حق میں ووٹ دیا جس کے نتیجے میں 3 جولائی 1962ء کو تقریباً 132 سال کے بعد الجزائر کو فرانسیسی استعمار سے آزادی مل گئی۔ الجزائر کی عارضی حکومت نے یوسف بن خدہ کی قیادت میں حکومت کا انتظام سنبھال لیا، لیکن الجزائر کی آزادی کے حقیقی معمار احمد بن بیلا کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ 1954ء میں جب باضابطہ طور پر مسلح جدوجہد آزادی کا آغاز ہوا تو احمد بن بیلا قومی آزادی کی فوج کے کمانڈر مقرر کیے گئے تھے۔ 22 فروری کو وہ دوسرے مجاہدین آزادی کے ساتھ مراکش سے تیونس جا رہے تھے تو ان کے تیارے کو زبردستی الجزائر میں اتار کر فرانس میں انہیں گرفتار کرلیا۔ اگلے پانچ سال بن بیلا فرانس کی قید میں رہے اور اس دوران انہوں نے اپنے مراکشی وکیل کے ذریعے الجزائری راہنماؤں سے رابطہ قائم رکھا جو الجزائر میں جہاد آزادی میں مصروف تھے۔ ستمبر 1959ء میں صدر ڈیگال نے الجزائر کی آزادی کا حق تسلیم کرلیا پھر بھی کہیں جاکر 18 مارچ 1962ء کو جنگ بندی کا معاہدہ ہوا اور بن بیلا رہا کردیے گئے اس کے بعد انہوں نے یوسف بن خدہ سے اختیارات لے لئے۔ 8 ستمبر کو نیا آئین نافذ کیا گیا اور اسی آئین کے تحت بن بیلا الجزائر کے پہلے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ 15 ستمبر 1963ء سے وہ ملک کے صدر بن گئے اور عہدہ صدارت پر 1965 تک فائز رہے۔ اسی سال 19 جون کو ان کے خلاف انقلاب بپا ہوا اور حواری بومدین نے جو ان کا ہی ایک ساتھی تھا، ان کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔.........

حواری بومدین (تعارف)

حواری بومدین (1921ء - 1979ء) ایک کسان کے بیٹے تھے۔ قسطنطیہ اور جامعہ ازہر میں تعلیم پائی۔ فرانس کے خلاف جدوجہد آزادی کے دوران مصر میں فوجی تربیت حاصل کی، مزید تربیت کے لئے مراکش بھی گئے۔ 1955ء میں مغربی الجزائر کے فوجی دستوں یا گوریلا دستوں میں شامل ہو گئے۔ 1960ء میں قومی فوج آزادی میں شامل میں کمانڈر مقرر ہوئے اس کا ہیڈ کوارٹر تیونس میں قائم کیا گیا تھا۔ الجزائر کی آزادی کے وقت (1962) بومدین کی کمانڈ میں تیس ہزار فوج تھی انہوں نے احمد بن بیلا کو صدر بننے میں مدد دی اور خود وزیر دفاع بن گئے۔ صدر بننے کے بعد 1976ء میں ہونے والے انتخابات میں انہیں سو فی صد ووٹ ملے تھے۔

فوجی انقلاب:

19 جون 1965ء کی صبح ریڈیو الجزائر نے صبح کے وقت ایک خبر نشر کی جس میں بتایا گیا کہ الجزائر میں ایک فوجی انقلاب، کودیتا کے ذریعے صدر احمد بن بیلا کا تختہ الٹ دیا گیا اور حواری بومدین ملک کے نئے سربراہ بن گئے۔ اس انقلاب کے سربراہ حواری بومدین کو احمد بن بیلا کا کابینہ میں وزیر دفاع بنایا گیا تھا۔ مئی 1963ء میں وہ نائب وزیر اعظم بنے۔

الجزائر کے لئے یہ بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ ملک سیاسی انتشار کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور یوسف بن حذہ اور کریم بن قاسم نے احمد بیلا کی حکومت کو چیلنج کرنا شروع کر دیا تھا۔ باہمی اختلافات کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ فوج جس نے آزادی کی جنگ لڑی تھی اسے حکومت وقت کا ماتحت رہنا چاہیے تھا، لیکن اس فوج نے ملک میں جگہ جگہ زرعی زمینوں پر قبضہ کر لیا اور کہا کہ یہ ہمارا حق ہے۔ ہم نے ملک وملت کے لئے جہاد آزادی لڑا تھا اب اس کا صلہ ملنا چاہیے۔ لیکن بن بیلا چاہتے تھے کہ مجاہدین آزادی ہوں یا عام شہری سب کی حیثیت مساوی ہے اور آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو بھی ملکی قوانین کا پابند رہنا پڑے گا وہ ریاست میں ریاست کی حیثیت نہیں اختیار کر سکتے۔ ان حالات میں حواری بومدین نے بن بیلا کا ساتھ دیا تھا اور اس بحران پر قابو پا لیا ورنہ بصورت دیگر الجزائر آزادی کے بعد ایک خوفناک خانہ جنگی کا شکار ہو جاتا۔

اختلافات کی خلیج:

کچھ عرصہ ساتھ چلنے کے بعد بومدین اور بن بیلا میں نظریاتی اختلاف نے شدت اختیار کر لی۔ احمد بن بیلا کا رحجان چین کی طرف تھا جبکہ حواری بومدین افریقہ کے مخصوص حالات کی وجہ سے روس کی جانب جھکاؤ رکھتا تھا۔ بن بیلا نے الجزائر میں ایک سربراہ کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے صرف دو دن پہلے الجزائر میں انقلاب آ گیا کیونکہ یہ کانفرنس چین کی پالیسی کے عین مطابق تھی۔ 1965ء کے اوائل میں احمد بن بیلا نے وزیر خارجہ عبدالعزیز بوتعلقہ کو اس کے عہدے سے ہٹانے کے لئے کاروائی کرنا چاہی اس کے خلاف کرنل بومدین اور فوج نے فیصلہ کیا کہ سیاست دانوں کے خلاف کاروائی کرنے کا وقت آ پہنچا ہے جنہیں بعد میں فرقہ پرست اور نااہل قرار دیا گیا 19 جون 1965ء کو احمد بن بیلا کو الجزائر میں ان کے گھر پر نظر بند کر دیا گیا اور اور انقلابی کونسل نے اعلان کیا کہ اس نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔

1963ء کا آئین معطل:

حواری بومدین 1965ء سے 1969ء کے اوائل تک صدر رہے۔ انہوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ 1963ء کا آئین معطل کر دیا۔ اس آئین کے تحت ایک قومی اسمبلی بھی قائم کی گئی تھی وہ بھی توڑ دی گئی اگلے پندرہ سال تک الجزائر پر قومی انقلابی کونسل فرمانوں کے ذریعے حکومت کرتی رہی۔ یہ کونسل 24 افراد پر مبنی تھی جو زیادہ تر فوجی افسر تھے۔ 1967ء میں الجزائر نے عرب ہمدردی میں اسرائیل کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا، لیکن الجزائر کی فوجوں نے جنگ میں عملی طور پر حصہ نہ لیا تھا اس موقع پر الجزائر نے امریکہ سے سفارتی تعلقات بھی توڑ لئے تھے جو 1974ء میں پھر بحال ہو گئے۔

قومیائے جانے کی پالیسی:

صدر بومدین نے قومیانے کی پالیسی اختیار کی تھی۔ 1965ء میں کانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ 1966ء اور 1968ء کے درمیان بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف کارخانوں اور فرانس کی تیل کی کمپنیوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا گیا اسی زمانے میں ملک میں زرعی اصلاحات بھی نافذ کی گئیں۔ 1967ء میں بائیں بازو کے کرنل طاہر زبیری نے بغاوت کی جو ناکام رہی اور اسے تیونس میں پناہ لینی پڑی۔ 1974ء میں ہسپانوی صحرا کے

مسئلے پر الجزائر اور مراکش کے تعلقات خراب ہو گئے۔ الجزائر صحرا کے پولیسار چھاپہ ماروں کی مدد کرتا رہا تھا۔ صدر بومدین نے اپنے عہد میں فرانس اور روس دونوں سے قریبی تعلقات قائم رکھے اور ان سے وسیع پیمانے پر فوجی امداد حاصل کی۔ جنوری 1979ء میں طویل عرصہ تک علیل رہنے کے بعد صدر حواری بومدین نے وفات پائی۔ ان کے بعد کئی دن کے بحث و مباحثے کے بعد شاذلی بن جدید کو فروری 1979ء میں الجزائر کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ شاذلی بن جدید نے سیاسی قیدیوں کو رہا کیا۔ احمد بن بیلا ایک طویل عرصہ سے قید تھے۔ 4 جولائی 1979ء کو انہیں بھی رہا کر دیا گیا مگر حکومت کی نگرانی رکھی گئی۔

......☆......

1960ء۔ ترکی میں فوجی انقلاب اور اس کے بعد

ترکی میں کمال اتاترک کی وفات 1938ء کے بعد جمہوری ارتقائی عمل جاری تھا۔ مئی 1954ء میں ہونے والے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کو کامیاب حاصل ہوئی اس پارٹی کی بنیاد 1946ء میں عدنان مینڈرس نے رکھی تھی چنانچہ اس کے راہنما عدنان مینڈرس نے نئی حکومت بنائی۔ جلال بایار کو صدر جمہوریہ منتخب کیا گیا۔

حکومت پر فوج کا قبضہ:

عدنان مینڈرس کی حکومت بظاہر بڑی پائیدار نظر آئی تھی لیکن 23 مئی 1960ء کو یکا یک ایک فوجی انقلاب برپا ہوا اور جنرل جمال گرسل اور اس کے ساتھیوں نے اختیارات سنبھال لئے اور صدر وزیراعظم اور بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر لیا ملک میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ قومی اسمبلی توڑ دی گئی، سیاسی سرگرمیاں ختم کر دی گئیں۔ انقرہ اور استنبول کے بین الاقوامی ہوائی اڈے بند کر دیئے گئے اور بینکوں پر فوج متعین کر دی گئی۔ جب انقرہ یعنی دارالحکومت پر فوج نے قبضہ کیا تو پولیس نے فوج پر فائرنگ کی لیکن جلد ہی جمہوری حکومت کی وفادار فوج پر قابو پا لیا گیا۔ سابق صدر جلال بایار نے خودکشی کی ناکام کوشش کی اور وزیراعظم عدنان مینڈرس ملک سے فرار ہونا چاہتے تھے کہ انہیں اناطولیہ جاتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔

انقلاب کے بعد ریڈیو انقرہ پر جمال گرسل نے قوم کے نام پیغام نشر کیا کہ سیاسی بحران اور افسوس ناک واقعات رونما ہونے کی بنا پر اور ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے ترکی کی مسلح افواج نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا ہے۔ یہ اقدام ملک میں سیاسی جماعتوں کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کے لئے بھی کیا گیا ہے۔ نیز اس انقلاب کا مقصد ملک میں آزادانہ فضا میں غیر جانبدارنہ انتخابات کے ذریعے جمہوریت کو بحال کرنا ہے۔ صدر جمال گرسل نے انقلاب کے مزید مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ترکی کو کمال اتاترک کے اصولوں کی طرف لوٹانا اور عوامی نمائندوں کو اقتدار سونپنا اور ایسا دستور تشکیل دینا جس کی کوئی خلاف ورزی نہ کر سکے۔ عدلیہ کو آزاد رکھنا اخبارات کو مکمل آزادی دینا۔ گذشتہ حکومت کی بد عنوانیوں کی تحقیقات کے بعد مجرموں کو سزائیں دینا۔ سیاسی آزادی بحال کرنا اور ملکی معیشت کو سنبھالنا ہی ہمارا مقصد ہے۔

عارضی آئین کی تشکیل:

انقلابی حکومت نے گذشتہ حکومت کی طرف سے بند کئے جانے والے اخبارات کو دوبارہ شائع ہونے کی اجازت

دے دی اور صحافیوں سمیت تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ 21 جون 1960ء کو ایک عارضی آئین کی تشکیل کی گئی اور اس عبوری دور میں قانون سازی کے اختیارات قومی اتحاد کمیٹی کے سپرد کر دیے گئے۔ 18 وزیروں پر مشتمل ایک کابینہ تشکیل دی گئی۔ بعد ازاں کچھ اگست کو دس وزیر برطرف کر دیے گئے اس طرح کابینہ میں صرف تین غیر فوجی وزیر رہ گئے۔ 21 اکتوبر 1960ء کو عدالت کے ایک فیصلے کے مطابق ڈیموکریٹک پارٹی کو ختم کر کے اس کے کسی سابق رکن کو دوبارہ انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی۔

جمہوریت کی بحالی:
جنرل جمال گرسل نے ہمسایہ ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی بات کی تو روس نے پھر سیاسی ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے ترکی حکومت کو اپیل کی کہ وہ غیر جانبدار پالیسی اختیار کرلے۔ یہ تجویز 28 جون کو روسی وزیر اعظم خروشیف نے جنرل گرسل کے نام ایک خط میں لکھ کر بھیجی۔ جنرل گرسل نے نہایت ملائمت کے ساتھ اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ترکی کی نیٹو طاقتوں کے ساتھ دفاعی وابستگی کے باعث ترکی پر خود ہی اسلحہ بندی کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ یہ بات عوام پر واضح کر دی گئی کہ نئی انقلابی حکومت زیادہ دیر تک اقتدار اپنے ہاتھ میں نہیں رکھنا چاہتی اور جمہوریت کی بحالی چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے نئی حکومت نے کچھ عملی اقدامات بھی کئے۔ اکتوبر میں یونیورسٹی کے تقریباً 197 پروفیسر برطرف کر دیئے گئے۔ ان میں دو پروفیسر بھی شامل تھے جنہوں نے گذشتہ حکومت کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ 30 دسمبر 1960ء کو حکومت نے ایک دو ایوانی آئین ساز اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا۔ اس اسمبلی کے ایوان نمائندگان کے لئے 362 اراکین کی تعداد مقرر کی گئی۔ قومی اتحاد کمیٹی کے ارکان کی تعداد 23 تھی۔ اس کو ایوان بالا قرار دیا گیا۔ انتخابات کے انعقاد کے لئے اکتوبر 1961ء تک کی حد مقرر کی گئی۔ 6 جنوری 1961ء کو آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں سیاسی جماعتوں پر سے پابندی ہٹالی گئی۔ 27 مئی 1961ء کو نیا آئین منظور کیا گیا جو کی توثیق 9 جولائی کو استصواب رائے میں کر دی گئی۔ اکتوبر 1961ء میں ہونے والے انتخابات میں کسی جماعت نے اسمبلی اور سینٹ میں واضح اکثریت حاصل نہ کی۔ لہذا کوئی جماعت بھی تنہا حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہ تھی۔

عدنان میندرس (تعارف)

ترک سیاست دان پیدائش (1899ء۔1961) قانون دان اور ماہر زراعت کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ 1950ء میں پہلی بار ڈیموکریٹک حکومت کے وزیر اعظم بنے۔ دوبارہ 1954ء اور 1957ء کے انتخابات میں بھی کامیاب ہوئے۔ 1938ء میں ترکی میں عربی میں اذان دینے اور تلاوت قرآن مجید پر پابندی تھی۔ عدنان نے 1951ء میں یہ پابندی ختم کردی۔ اسلام پسند تھے اور ترکی کو ایک اسلامی ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ 27 مئی 1960ء کو غیر حقیقت پسندانہ معاشی حکمت عملی اپنانے، حزب اختلاف پر دباؤ ڈالنے اور اخبارات پر پابندی کا الزام لگا کر جنرل جمال گرسل نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ان پر آئین کی خلاف ورزی کرنے کا مقدمہ چلایا جس میں سزائے موت دی گئی تھی۔ جو دراصل ان کے اسلام پسند ہونے کی سزا تھی۔

جنرل گرسل عہدہ صدارت پر:

27 مئی 1962ء کو قومی اسمبلی نے جنرل گرسل کو اگلے سات سال کے لئے ملک کا صدر منتخب کر لیا۔ جمال گرسل نے سابق صدر ترکی عصمت انونو کی قیادت میں ایک مخلوط وزارت قائم کر دی، جو ری پبلک پارٹی اور جسٹس پارٹی پر مشتمل تھی۔ اس طرح ترکی میں فوجی حکومت کا عبوری دور ختم کیا گیا اور جمہوریت بحال ہو گئی۔

سابق راہنماؤں کو سزائیں:

ستمبر 1961ء میں جب نئے انتخابات ہو رہے تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے راہنماؤں پر مقدمہ چلانے والی عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ یہ تمام راہنما ایک جزیرے میں محبوس رکھے گئے تھے۔ مقدمے کی سماعت کے دوران 1068 گواہوں نے گواہی دی۔ عدالت کے کل 1203 اجلاس ہوئے۔ مقدمے کی سماعت کے آخر دن 633 افراد بطور ملزم عدالت میں موجود تھے۔ وکیل سرکار نے 238 ملزموں کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ بیشتر ملزموں کو سزائے موت سنا دی لیکن بعد ازاں قومی اتحاد کمیٹی نے اکثر کی سزا میں تخفیف کر کے اسے عمر قید کی سزا میں بدل دیا۔

سابق وزیر اعظم کو پھانسی:

3 افراد کی سزائے موت کی توثیق کر دی گئی ان تینوں کو 16 اور 17 ستمبر کی درمیانی شب پھانسی دے دی گئی۔ ان تینوں ملزموں میں وزیر اعظم عدنان مندریس اور وزیر خارجہ زور کر شامل تھے۔ صدر جلال بایار کی سزائے موت کو عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے عمر قید میں بدل دیا گیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اتاترک کے بعد عدنان مینڈیس ترکی کے سب سے مقبول راہنما تھے مگر ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ترکی کے آئین سے سیکولرازم کی دفعہ نکالنا چاہتے تھے۔.........

عصمت انونو (تعارف)

جمہوریہ ترکی کے ایک سیاست دان جو ترکی کے صدر کے عہدے پر فائز رہے اور اسمبلی میں وزیر اعظم اور اور قائد حزب اختلاف بھی بنے۔ 27 برس کی عمر میں ترک فوج میں کپتان بنا دیئے گئے تھے۔ 1908ء میں انقلاب ترکی میں پیش پیش رہے۔ پہلی جنگ عظیم میں عملی طور پر حصہ لیا۔ جنگ عظیم کے بعد اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال کے ساتھ مل کر عوامی فوج تیار کی۔ انونو کے مقام پر یونانیوں کو شکست دی اسی وجہ سے انونو آپ کے نام کا لاحقہ بن گیا۔ پہلی لوازن کانفرنس میں لارڈ کرزن کی دھمکیوں سے ذرا مرعوب نہ ہوئے تین مرتبہ وزیر اعظم بنے۔

وزارتی بحران:

عصمت انونو نے جون 1963ء میں دوبارہ جو وزارت تشکیل دی تھی وہ ان کے استعفیٰ کے باعث دسمبر میں دوبارہ ٹوٹ گئی۔ دراصل دوسری بار بھی وزارت بنانے کے باوجود ان کی مشکلات میں کمی واقع نہ ہو سکی۔ حزب اختلاف کے

مطالبات کی فہرست اتنی طویل تھی کہ انہیں پورا کرنا شائد حکومت کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس دوران دو مرتبہ ناکام فوجی بغاوتیں بھی ہوئی تھیں اور حزب اختلاف کی طرف سے دباؤ بھی پڑ رہا تھا۔ کچھ انہیں وجوہات کی بنا پر انہوں نے مئی 1963 میں استعفیٰ دے دیا اور جسٹس پارٹی کو علیحدہ کر کے نئی کابینہ تشکیل دی تھی لیکن اسکے باوجود حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی اور دسمبر 1963ء میں انہوں نے دوبارہ استعفیٰ دے دیا کہ شاید تیسری بار وزارت سازی سے وہ اپنی پوزیشن مستحکم کر سکیں۔ نومبر 1963ء کے ضمنی انتخابات میں جسٹس پارٹی یا حزب عدالت کی کامیابی نے عصمت انونو کی پوزیشن کو مزید کمزور کر دیا۔

حزب عدالت کو دعوت اور ناکامی:

عصمت انونو کے استعفیٰ کے بعد صدر جمال گرسل نے حزب عدالت کے قائد کو وزارت بنانے کی دعوت دی مگر وہ وزارت بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تیسری بار پھر عصمت انونو کی کابینہ تشکیل دینے کی دعوت دینا پڑی۔ عصمت انونو جو ایک زیرک اور تجربہ کار سیاست دان تھے انہوں نے ایک مخلوط وزارت تشکیل دی اور قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

1965ء کے انتخابات:

فروری 1965ء میں عصمت انونو نے قرض کے مسئلہ کی وجہ سے ایک بار پھر وزارت عظمیٰ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ دراصل قوم یونان سے جنگ چاہتی تھی مگر عصمت انونو جنگ کے حق میں نہیں تھے اس لئے انہیں استعفیٰ دینا ہی پڑا۔ دوسری جمہوریہ کے قیام کے بعد........

سلیمان ڈیمرل

ترکی کے ایک سیاست دان اشیائے کوچک کے ایک گاؤں اسلام کوئی میں 1924ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ترکی میں آبپاری کے منصوبوں پر کام کیا۔ 1960ء میں فوجی تربیت حاصل کی۔ جسٹس پارٹی کی دوسری کانگرس کے صدر اور بعد ازاں مخلوط وزارت میں نائب وزیراعظم بنے۔ 1965ء میں ان کی پارٹی نے اکثریت حاصل کی اور وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اپریل 1967ء میں انہوں نے پاکستان کا دورہ بھی کیا تھا۔

10 اکتوبر 1965ء کو دوسرے عام انتخابات ہوئے اور دوران عوام کی اکثریت حزت عدالت پارٹی سے متاثر نظر آئی۔ دراصل ڈیموکریٹک پارٹی پر پابندی کے بعد اس کے راہنماؤں نے حزب عدالت کے نام سے پارٹی بنائی تھی جو کافی مقبول تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی اور اب جسٹس پارٹی نے ملک میں مذہب پر لگائی گئی پابندیوں کو نرم کر دیا۔

ترکی میں آذان:

ترکی میں اذان دینے اور تلاوت قرآن شریف کرنے کی اجازت دی تھی چنانچہ ان وجوہات کی بنا پر اسلام پسند ترک عوام جسٹس پارٹی کے حامی ہو گئے۔ ادھر انقلابی حکومت کی یہی کوشش تھی کہ ملک سے مذہب نام کی چیز کو ختم کیا جائے۔ جمال گرسل نے برسر اقتدار آنے کے بعد مذہبی آزادی پھر سلب کر لی تھی اس کی وجہ سے حکومت سے نفرت اور اسلام سے محبت کے جذبات عوام میں ابھرے تھے۔

نئی وزارت کا قیام:

1965ء کے انتخابات کے بعد ترکی میں پہلی بار ایک جماعتی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ صدر جمال گرسل نے حزب عدالت کے راہنما سلمان ڈیمرل کو وزارت تشکیل دینے کی دعوت دی انہوں نے 22 وزراء پر مشتمل کابینہ بنائی اس وزارت نے اعتدال پسندی سے کام لیا اور ملک میں اشتراکی سرگرمیوں کی موثر روک تھام کی اس کے باوجود روس سے تعلقات بھی خراب نہ ہوئے۔

آر سی ڈی کا قیام:

اسی عہد میں پاکستان ایران اور ترکی میں علاقائی تعاون کا ایک معاہدہ RCD طے پایا اس ادارے کے قیام کے مقاصد آزادانہ تجارت کا فروغ تینوں ملکوں میں آمدورفت کی سہولت کا قیام اور ویزہ کی پابندی ختم کرنا اور دانشوروں اور طلباء کے تبادلے وغیرہ کی سہولتوں کا اجرا تھا

فوجی مداخلت:

سلمان ڈیمرل کی حکومت کو 1968ء کے اوائل میں سیاسی کشیدگی اور سیاسی بے چینی کا سامنا کرنا پڑا دائیں بازو اور بائیں بازو میں جھگڑا اچل نکلا۔ یونیورسٹیوں میں جھڑپوں کے بعد فوج طلب کر لی گئی۔ اکتوبر 1969ء میں ہونے والے انتخابات میں بھی عدالت پارٹی نے اکثریت حاصل کی لیکن 1970ء اور 1971ء میں طلباء اور مزدوروں کی بے چینی بڑھ گئی اور انتہا پسند عناصر کے باہمی تصادم نے ترکی میں امن عامہ کا مسئلہ پیدا کر دیا، جس کا سہارا لے کر فوج نے 12 مارچ 1971 کو سلمان ڈیمرل کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور فوج ایک مرتبہ پھر حکومت میں دخل انداز ہو گئی۔

مخلوط وزارتوں کا قیام:

مارچ 1971ء سے اکتوبر 1973ء تک ترکی میں فوج کی نگرانی میں دائیں بازو کی حکومت قائم ہوئی جس کی سربراہی نہاد ام، فرید ملین اور نعیم تالو نے کی اس دوران ملک کے کئی صوبوں میں مارشل لگا رہا اور بائیں بازو کی سرگرمیوں کو سختی سے دبا دیا گیا۔ 1973ء میں انتخابات ہوئے تو کسی بھی پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔ جمال گرسل کے بعد جودت صونائی ترکی کے صدر رہے۔ (1966ء۔ 1977ء) ان کے بعد فخری کوروترک کو صدر بنایا گیا صدر کوروترک اور صونائی کا تعلق بھی فوج سے تھا۔ فخری کوروترک کے صدر بننے کے بعد ترکی حکومت میں فوج کی شرکت ختم ہو گئی اور 25 جنوری 1974ء کو خلق پارٹی اور ملی سلامت پارٹی نے مل کر مخلوط حکومت بنائی۔ اس میں خلق پارٹی کے راہنما بلند ارجویت کو وزیراعظم اور ملی سلامت

پارٹی کے راہنما نجم الدین اربکان کو نائب وزیراعظم بنایا گیا۔

انتخابات 1977ء:

1977ء میں ہونے والے انتخابات میں بلند ایجویت کی پارٹی آر پی پی کو 213 نشستیں حاصل ہوئیں، جبکہ سلمان ڈیمرل 189 سیٹیں حاصل کر سکے۔ بلند ایجوت نے وزیروں کی ایک کونسل بنائی مگر اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ نہ حاصل کر سکے اس کے بعد سلمان ڈیمرل نے دو پارٹیوں کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنائی۔ کلیدی وزارتوں پر دونوں اتحادی پارٹیوں کی وزراء متعین ہونے کی وجہ سے سیاسی تشدد میں اضافہ ہو گیا۔ طلبا میں تصادم تیز تر ہو جانے کی وجہ سے ایک تہائی یونیورسٹیاں بند کر دی گئیں۔ اس طرح یہ مخلوط وزارت بھی ناکام ہو گئی۔

بلند ایجوت کی واپسی:

2 جنوری 1978ء میں بلند ایجوت نے پھر نئی حکومت تشکیل دی، لیکن ملک میں سیاسی حالات بہتر ہونے کی بجائے مزید خراب ہوئے۔ سیاسی قتل کی وارداتیں بڑھ گئیں۔ اور حکومت ملک میں امن وامان قائم کرنے میں ناکام ہو گئی۔ دسمبر 1978ء میں ترکی کے تیرہ صوبوں میں دو ماہ کے لئے مارشل آنا فذ کر دیا گیا۔ کردوں کی بغاوت کی وجہ سے جلد ہی باقی چھ صوبوں میں بھی آخر مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

......☆......

1962ء (برما) میں پرامن فوجی انقلاب اور مابعد

ہمارے ملک پاکستان کی طرح میانمر یا برما بھی ایشیاء کا وہ مظلوم ملک ہے جس کی تاریخ میں جمہوریت سے زیادہ عرصہ فوجی آمریت قائم رہی ہے۔

1960ء کے انتخابات:

برما نے برصغیر پاک وہند کے بعد 4 جنوری 1948ء کو آزادی حاصل کی تھی۔ آزادی کے بعد یہاں مغربی طرز کا پارلیمانی آئین نافذ کیا گیا تھا۔ یونو برما کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد پہلے انتخابات 1951ء اور دوسرے 1956ء میں منعقد ہوئے تھے۔ 1958ء میں حکمران پارٹی دو گروپوں میں تقسیم ہوگئی جس سے ملک میں خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہوگیا چنانچہ اس خطرے کے پیش نظر وزیراعظم یونو نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل نی ون NEWIN کو ملٹی حکومت تشکیل دینے کا حکم دیا۔ یوں فوج کو پہلی بار اقتدار میں آنے کا موقع مل گیا۔ 6 فروری 1960ء میں ملک میں تیسرے عام انتخابات منعقد ہوئے، جس میں یونو گروپ نے فیصلہ کن کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ یونو ایک بار پھر وزیراعظم بن گئے، لیکن ملک کے سیاسی اور نسلی بحرانوں پر قابو نہ پایا جاسکا۔

پرامن فوجی انقلاب:

2 مارچ 1962ء کو جنرل نی ون نے ایک پرامن فوجی انقلاب کے ذریعے یونو حکومت کا تختہ الٹ دیا، وزیراعظم یونو کو گرفتار کر کے آئین معطل اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی۔ ملک میں انقلابی کونسل کے تحت ایک کمیونسٹ حکومت قائم کر دی گئی۔

بعدازاں جنرل نی ون نے فوجی وردی اتار دی اور برما کو ایک سوشلسٹ ری پبلک بنانے کا عزم کیا۔ چنانچہ جولائی 1962ء میں جنرل نی ون نے انقلابی کونسل "برما سوشلسٹ پروگرام پارٹی" قائم کی۔ یہ ملک کی واحد قانونی جماعت کی شکل اختیار کر گئی، تاہم اس نمائشی تبدیلی کے باوجود ملک سیاسی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور ملک اسی طرح آمریت کے شکنجے میں جکڑا رہا، جنرل نی ون اکیلا اختیارات واقتدار کا مالک بنا رہا۔ آمریت کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ 16 سال بعد ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے باقاعدہ تحریک چلائی گئی، پولیس، فوج اور فائرنگ، لاٹھی چارج اور تشدد، کوئی چیز اس تحریک کو ختم نہ کرسکی۔ بالآخر 23 جولائی 1988ء کو جنرل ون کو اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کرنا پڑا، ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا کہ جلد

ہی برما کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ ایک استصواب رائے سے کیا جائے گا۔ اسی دوران بانی برما جنرل آنگ سان کی بیٹی آنگ سان سوچی نے جمہوریت کی بحالی میں اپنا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن فوج نے ان کی یہ عوامی بغاوت کچل دی۔ رنگون سمیت کئی شہروں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ تعلیمی ادارے بند کر دیے گئے۔ سول و ملٹری حکام نے ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔

حکومت کی تبدیلی:

جنرل نی ون کے استعفیٰ کے بعد یوسین ون کو حکومتی پارٹی کا چیئرمین اور یو سان یو کی جگہ ملک کا صدر بنا دیا گیا۔ یہ طلبا کا بدنام زمانہ قاتل تھا۔ اس کی قیادت میں نئی سول حکومت قائم ہوئی اور یک جماعتی نظام کا خاتمہ ہو گیا، مگر مظاہرے شدت اختیار کر گئے اور تین ہزار سے زائد افراد رنگون کے گلی کوچوں میں مارے گئے۔

ایک اور تبدیلی:

یوسین ون ملک کی بدامنی پر قابو نہ پا سکا چنانچہ صرف سترہ دن بعد 9 اگست کو مستعفی ہو گیا۔ اب اناڑی جنرل یو مانگ مانگ اس کی جگہ پارٹی کا راہنما و ملک کا صدر بنا۔ لیکن ملک بدستور ہنگاموں کی لپیٹ میں رہا۔

ایک اور فوجی انقلاب:

18 ستمبر 1988ء کو برما کی سیاست نے ایک اور کروٹ بدلی اور فوج کے سربراہ نے ایک اور فوجی انقلاب برپا کر کے مانگ مانگ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ جنرل سا مانگ جو فوج کا سربراہ تھا اب صدر بن گیا۔ یوں جولائی 1988ء تا ستمبر 1988ء تک ملک کے اقتدار کی سکرین پر تین چہرے بدلے، تاہم حکومت ہر حال میں جنرل نی ون اور اس کے وفادار فوجی ٹولے کے ہاتھ میں رہی۔........

جنرل نی ون

مارچ 1962ء میں جمہوریت کا گلا گھونٹ کر برسر اقتدار آنے والے جنرل نی ون نے پاکستان کے جنرل ایوب خان اور دیگر جنرلوں کو آمریت میں پیچھے چھوڑ دیا۔ 1988ء تک اس نے جمہوریت کے حق میں اٹھنے والی ہر آواز کو بے رحمی سے خاموش کر دیا۔ اس کی صدارت میں برما میں تشدد اور بدسلوکی ایک اداراتی صورت اختیار کر گئی۔ فوج ہمیشہ جمہوری تحریکوں کے جواب میں تشدد کا استعمال کرتی رہی۔ اس طرح تشدد کا دائرہ کار پورے ملک میں پھیل گیا۔ 1988ء میں فوجی حکومت کے خلاف چلنے والی تحریک میں طلباء نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا اور جمہوریت کی بحالی کے لئے بھرپور تحریک چلائی، جس کے نتیجے میں جنرل نی ون کو مستعفی ہونا پڑا۔

.... اس بات کا ثبوت یہ تھا کہ اس انقلاب کے پیچھے جنرل نی ون کا ہی ہاتھ تھا۔ 27 ستمبر 1988ء کو جنرل نی ون نے ایک مرتبہ پھر ملک کی صدارت سنبھال لی۔

مسز آنگ ساں سوچی

مسز آنگ ساں سوچی ایک بڑے قومی راہنما جنرل آنگ سان کی بیٹی ہیں، جنہوں نے ملک کو برطانوی استعمار سے چھٹکارا دلانے کے لئے مسلح جدوجہد کی تھی۔ 1961ء میں آنگ ساں سوچی ابھی 14 برس کی تھیں کہ ان کی والدہ کو بھارت میں برما کا سفیر مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح سوچی نے دہلی میں بھی تعلیم پائی۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ چلی گئیں، جبکہ ان کے والد کا انتقال 1948ء میں آزادی سے پہلے ہو چکا تھا۔ تعلیم کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ نیویارک میں اقوام متحدہ کی ملازمت کی، پھر وہ بھوٹان کے وزیر خارجہ کی مشیر بنیں۔ یہیں ان کی ملاقات ایک برطانوی سکالر مائیکل اریس سے ہوئی جو بعد ازاں ان کی شادی میں بدل گئی۔ (1972ء)۔ 1985ء میں آنگ ساں سوچی کو جاپان یونیورسٹی سے سکالر شپ ملا۔ پھر 1988ء میں وہ اپنی والدہ کی وفات پر برما واپس آگئیں۔ 19 جولائی 1989ء کو انہوں نے اپنی والدہ کے وفات کے دن کی نسبت سے ایک ریلی کی قیادت کا اعلان کیا تو برما کی سڑکیں فوج سے بھر گئیں۔ اگرچہ ملکی امن و امان کی خاطر ریلی کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا مگر حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا۔

دوبارہ فسادات:

مگر جنرل کے عہدہ صدارت سنبھالتے ہی ملک میں ایک بار پھر فسادات پھوٹ پڑے۔ ستمبر کے انقلاب میں ملک میں نافذ 1974 کا آئین معطل کر دیا گیا اور جنرل سا مانگ نے 19 رکنی کونسل SOLORC نام سے قائم کی۔ اس کونسل نے برما کی حکومت کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ جنرل سا مانگ اس کونسل کا چیئرمین بن گیا۔ نئی فوجی حکومت نے ''برما سوشلسٹ پروگرام پارٹی'' کا نام BSPP سے بدل کر NUP یا نیشنل یونٹی پارٹی رکھ دیا اور برما کے سرکاری نام سے بھی سوشلسٹ ری پبلک کا لاحقہ ختم کر دیا گیا۔ مگر یہ انقلابی لیڈر بھی پہلے لیڈروں کی طرح جنرل نی ون کے سیاسی اتحادی تھے۔

NLD کی بنیاد:

24 ستمبر 1988ء کو مسز آنگ سان سوچی نے نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی کی بنیاد رکھی۔ سوچی اس پارٹی کی جنرل سیکرٹری مقرر ہوئیں۔ برما کے عوام جمہوریت کے خواہش مند تھے چنانچہ سوچی کی قیادت میں جمہوریت کے قیام کے لئے جدوجہد شروع ہوگئی ادھر جنرل سا مانگ نے وعدہ کیا کہ ملک میں کثیر الجماعتی سیاسی نظام رائج کیا جائے گا۔ 29 ستمبر کو فوجی حکمران جنرل سا مانگ نے اپنی کابینہ میں 8 جرنیل مزید شامل کر لئے۔ جس سے کرپشن میں اضافہ ہوا۔ فوجی حکمرانوں نے ملکی وسائل عوام کے مسائل حل کرنے کے لئے استعمال کرنے کے بجائے اسلحہ خریدنے کے لئے استعمال کئے۔

[illegible] نام:

26......1989ء کو برما کا نام تبدیل کر کے میانمر رکھ دیا گیا۔ 20 جولائی جمہوریت پسند راہنما مسز سوچی کو اس

کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا جن کے جلوسوں سے حکومت پریشان تھی۔

پہلے کثیر الجماعتی انتخابات:

27 مئی 1990ء کو 30 سال بعد ملک کے پہلے کثیر الجماعتی انتخابات منعقد ہوئے۔ فوجی الیکشن کمیشن نے مسز آنگ سان سوچی کو نااہل قرار دے کر انتخابات سے دور رکھنے کی کوشش کی، لیکن ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود انکی پارٹی NLD نے فیصلہ کن کامیابی حاصل کی۔ 485 میں سے 392 نشستیں حاصل کر کے NLD نے فوجی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کامیابی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے انتخابی نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اقتدار منتقل کرنے سے انکاری ہوگئی۔ چنانچہ ملک میں ایک بار پھر ہنگامے شروع ہو گئے جنہیں حکومت نے طاقت کے بل بوتے پر دبا دیا۔ اسی سال اکتوبر میں مسز آنگ سان سوچی کو امن کا نوبل انعام دیا گیا، مگر اسے وصول کرنے کے لئے انہیں ملک سے باہر جانے کی اجازت نہ ملی اور یہ انعام ان کے خاوند اور بیٹوں نے وصول کیا۔

جنرل تھائی شون:

20 دسمبر 1991ء کو جنرل سامانگ ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ 24 اپریل 1992ء کو جنرل تھان شوئی نے جنرل سامانگ کو برطرف کر دیا اور خود اقتدار سنبھال لیا۔ جنرل تھان شوئی، صدر، وزیر اعظم اور کونسل کے چیئر مین مقرر ہوئے۔ اس حکومت نے بھی اپنی پیش رو حکومتوں کی طرح رائے عامہ پر سخت پابندی عائد رکھی اور تقریباً بیرونی دنیا سے رابطے منقطع رکھے، مگر 10 جولائی 1995ء کو مسز آنگ سان سوچی کو رہا کر دیا گیا مگر نظر بندی ضرور ہٹا دی گئی پر پابندی ابھی باقی تھی، وہ دارلحکومت سے باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ سوچی نے اس پابندی کو توڑنے کی بڑی کوشش کی جو فوجی حکومت نے مسلسل ناکام بنا دی۔ 2000ء میں ایک عرصہ سے بند تعلیمی ادارے کھول دیئے گئے۔ NLD اور جمہوریت کا سفر جاری تھا۔ حکومت ہر قیمت پر مسز سوچی کی آواز دبانا چاہتی تھی۔ 30 مئی 2003ء کو برما کے شہر یو YEU میں NLD کے ایک اجتماع پر حکومت کے ایجنٹوں نے حملہ کیا، جس کے نتیجے میں چار افراد ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے ادھر حکومت کو بہانہ ہاتھ آگیا اور مسز سوچی کو پھر نظر بند کر دیا گیا۔

.......☆.......

1964ء۔ انقلاب زنجبار

انقلابی کاروائی:

12 جنوری 1964ء کو تقریباً سہ پہر 2 بجے دن 800 سے زائد مسلح افریقی انقلابیوں نے جو بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے زنجبار کے پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد انقلابی دو پولیس اسٹیشنوں اور ایک مقامی ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کامیابی میں عرب پولیس کے غیر تربیت یافتہ ہونے کا زیادہ ہاتھ تھا، جبکہ انقلابیوں میں 600 تربیت یافتہ فوجی شامل تھے جن کی قیادت کمیونسٹ تربیت یافتہ فیلڈ مارشل جان اوکیلو کر رہا تھا۔

انقلابیوں کے ہاتھ پولیس سے چھینے گئے جدید اسلحے سے زیادہ مضبوط ہو گئے اور وہ پرعزم ہو کر شہر کی دفاعی اور فوجی عمارات کی طرف بڑھنے لگے، تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ آسانی سے ان عمارات پر بھی قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

انقلاب شروع ہونے کے چھ گھنٹے کے بعد انقلابی تمام سرکاری اہم عمارات اور ٹیلی فون ایکسچینج پر قابض ہو چکے تھے۔ جلد ہی جزیرہ کا چھوٹا سا واحد ہوائی اڈا بھی ان کے قبضے میں آگیا۔ سلطان زنجبار سید جمشید بن عبداللہ، جو جولائی 1963ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد سلطان بنے تھے، آزادی کے صرف ایک ماہ بعد، اپنے وزیر اعظم محمد شرمت حامدی اور اس کی کابینہ کے ساتھ شاہی محل چھوڑ کر شاہی بجرے پر فرار ہو گئے۔

اس تمام انقلابی کارائی میں تقریباً 80 افراد ہلاک اور 200 سے زائد زخمی ہوئے جن میں اکثریت عربوں کی تھی۔

آئندہ تقریباً 12 گھنٹے جاری رہنے والی لڑائی میں 161 امریکی شہریوں نے انگلش کلب میں پناہ لی۔ بعد ازاں برطانیہ نے ان شہریوں کو زنجبار سے نکال لیا۔ زنجبار کے سرکاری مورخین کے مطابق اس انقلاب کی ساری منصوبہ بندی افرو شیرازی پارٹی ASP کے راہنما عابد عمانی کردمے نے کی تھی۔ انقلاب کے بعد زنجبار کی 200 سالہ شاہی ختم ہو گئی اور اسے جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ ASP کے راہنما عابد عمانی کردمے جمہوریہ زنجبار اور پمبہ کے پہلے صدر منتخب ہو گئے۔ کابینہ اور پارلیمنٹ کی جگہ 30 رکنی انقلابی کونسل نے لے لی، جس کو عارضی طور پر قانون سازی کا اختیارات حاصل تھے۔

زنجبار کا تاریخی پس منظر:

زنجبار مشرقی افریقہ میں واقع ہے۔ 1728ء میں یہاں عمان کے عرب حکمرانوں کو حکومت قائم ہو گئی تھی اور عرب تاجر جو یہاں تجارت کرنے آئے تھے بعد ازاں جزیرے کے مالک بن بیٹھے۔ یہاں کے حاکم اب عمان کے سلطان کے

1824ء میں عمان کے سلطان سید محمد سعید نے اپنا دارالحکومت زنجبار منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور 1832ء میں وہ زنجبار منتقل ہو گیا۔ یہاں اس نے اپنے شایانِ شان ایک شاہی محل تعمیر کرایا۔ سلطان نے جزیرے میں لونگ اور پام آئل کی پیداوار میں اضافہ کیا۔ سلطان سید سعید نے 1856ء میں وفات پائی اور اس کا ایک بیٹا ماجد زنجبار کا سلطان بنا جبکہ دوسرے نے عمان کی سلطانی سنبھالی۔ 1861ء میں سلطان ماجد نے زنجبار کو مسقط سے علیحدہ اور ایک آزاد مملکت قرار دے دیا۔ 1870ء میں سلطان ماجد کے انتقال پر اس کا بھائی برقش سلطان بنا۔ اس کے عہد میں جرمن اور برطانوی اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ 1888ء میں سلطان برقش کے انتقال پر سلطان حماد ثوینی حکمران بن گیا 1890ء میں سلطان نے برطانیہ کے زور دینے پر زنجبار اور پمبہ کے جزیرے برطانیہ کے زیرِ حفاظت علاقے قرار دے دیئے۔ اس طرح زنجبار ایک برطانوی کالونی بن گیا، مگر سلطان کا اقتدار بھی برطانیہ کے زیرِ سایہ قائم رہا، البتہ اس کے ساتھ ایک برطانوی ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔ 1891ء میں برطانیہ نے یہاں پہلی آئینی حکومت قائم کی۔ سر لائیڈ میتھیو اس کا پہلا سربراہ (وزیر اعظم) بنا۔ 1890 میں برطانیہ اور جرمنی میں زنجبار ٹریٹی نامی معاہدہ ہوا جس کے تحت سلطان کے ملک کو دونوں یورپیوں نے تقسیم کر لیا۔ ٹانگانیکا جرمنی کے پاس چلا گیا جبکہ زنجبار پر انگریز قابض ہو گئے۔ 1896ء میں سلطان حماد کا انتقال ہو گیا جس کے بعد خالد بن برقش نے شاہی محل پر قبضہ کر کے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کیا، مگر برطانیہ نے اسے نکال کر حمود بن محمد کو سلطان زنجبار بنا دیا۔

1911ء میں حمود بن محمد کے بعد خلیفہ بن حروب برسرِ اقتدار آیا۔ وہ مشرقی افریقہ کا پہلا سلطان تھا جس نے مسلمانوں کو منظم کیا۔ سلطان حرب کو ایک طویل عرصہ حکومت نصیب ہوئی اور وہ اپنے انتقال 1960ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ بن خلیفہ سلطان بن گیا۔ نومبر 1960ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے زنجبار کا نیا آئین تشکیل دیا جس کے تحت جنوری 1961ء میں قانون ساز کونسل کے پہلے انتخابات ہوئے۔ جون میں دوبارہ انتخابات ہوئے جن کے بعد زنجبار میں ہنگامے پھوٹ پڑے اور تشدد کے بے شمار واقعات رونما ہوئے ان انتخابات میں افرو شیرازی پارٹی نے 10 سیٹیں حاصل کیں تھیں۔ دیگر جماعتوں میں زنجبار نیشنل پارٹی بھی 10 سیٹیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ 1962ء میں زنجبار کو داخلی خود مختاری دینے کا فیصلہ کیا تھا اور 10 دسمبر 1963ء کو زنجبار ایک آزاد ملک بن گیا۔ آزادی کے اگلے مہینے زنجبار بائیں بازو کی جماعت کے انقلاب کا شکار ہو گیا۔

ٹانگانیکا سے ادغام:

26 اپریل 1964ء کو زنجبار کے صدر عابد کردے اور ٹانگانیکا کے صدر جولیس نائرے نے وفاق کے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت زنجبار اور ٹانگانیکا میں باہمی ادغام سے 30 اکتوبر 1964ء کو متحدہ جمہوریہ تنزانیہ وجود میں آیا۔ جولیس نائرے اس کے صدر اور عابد کردے نائب صدر بنے۔ 1970ء میں ملک کے قانونی نظام کو دوبارہ منظم کیا گیا۔ 1972ء میں ایک فوجی افسر نے صدر عابد کردے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ انکی جگہ عبود جومبے صدر بنے۔

1967ء۔ انقلاب یونان

یونان میں طویل سیاسی انتشار کے بعد 14 اپریل 1967ء کو پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور مئی میں نئے انتخابات کو اعلان ہوا۔ لیکن اس کے صرف ایک ہفتے بعد، 21 اپریل 1967ء کو چشم فلک نے دیکھا کہ یونانی فوج کے ٹینکوں نے شاہی محل کا محاصرہ کرلیا۔ دارالحکومت میں فوج نے تمام اہم حکومتی اداروں پر قبضہ کرلیا۔ تین فوجی افسروں پر مشتمل فوجی جنتا نے ''قومی حکومت'' قائم کرنے کا اعلان کیا ان میں کرنل جارج پاپاڈوپولوس۔ بریگیڈیر جنرل سٹائلیانو پیٹاکوس اور کرنل نکولس میکاریزو بھی شامل تھے۔ جنتا نے آئین کی بنیادی شقیں معطل کردیں۔ شاہ کانسٹنٹائن کو بادشاہ برقرار رکھا گیا، مگر اس کے اختیارات برائے نام تھے۔ انقلاب کے بعد فوجی راہنماؤں نے سپریم کے کورٹ کے چیف پراسیکیوٹر کانسٹنٹائن کو وزیر اعظم مقرر کردیا۔ مئی میں اعلان کیا گیا کہ ریفرنڈم کے ذریعے ملک میں نیا آئین منظور ونافذ کیا جائے گا۔

13 دسمبر 1967ء کو جوابی کاروائی کے طور پر شاہ نے فوج میں اپنے حامی افسران کی مدد سے جنتا کو برطرف کرنے کی کوشش کی، مگر ناکامی کے بعد بادشاہ اپنے خاندان سمیت اٹلی فرار ہوگیا۔ جلد ہی فوجی جنتا نے جنرل جارجیوس زوئٹاکس کو قائم مقام بادشاہ اور ایک فوجی جنرل، کرنل جارجیوس پاپاڈیولوس کو وزیر اعظم مقرر کردیا۔ 29 ستمبر 1968ء کو ایک ریفرنڈم کے ذریعے نئے آئین کی منظوری لے لی گئی۔ 1968ء کو اس آئین کی رو سے وزیر اعظم کے اختیارات میں اضافہ ہوگیا اور ملک میں پریس کی آزادی ختم کردی گئی۔

یونان کا انقلاب آزادی:

یونان دنیا کی قدیم ترین تہذیب وتمدن کا امین ملک ہے۔ یونانی معاشرہ تقریباً 6 ویں صدی قبل مسیح میں وجود میں آیا تھا۔ اس وقت کا یونان، فن تعمیر، فلسفہ، سائنس، ڈرامہ، ادب، اور جمہوریت کی تاسیس میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جب رومی سلطنت نے پہلی دوسری صدی ق م میں یونان پر قبضہ کیا، اس وقت سے یونان کو مسلسل بازنطینی، ترک حکمرانوں کے قبضے میں رہا۔ تقریباً 1821ء تک یہاں عثمانی ترکوں کی حکومت رہی۔ 1821ء میں یونان نے عثمانی ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ چونکہ پورا یورپ یونانی تہذیب کو اپنی پہلی تہذیب قرار دیتا ہے، اس لئے اہل مغرب خاص طور پر برطانیہ اس کی مدد و حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جنوری 1824ء میں برطانوی شاعر لارڈ بائرن ذاتی طور پر یونان کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے یونان آیا۔ انقلاب آزادی کی قیادت اس گروہ نے کی جسے عموماً جزائری یونانی کہتے ہیں۔ یہ بحیرہ ایجہ کے جزیروں

کے تاجر تھے، جو خفیہ انجمن پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ یونانیوں نے پیلوپونیس کے مقام پر ترکوں کو شکست دی۔ 1824ء میں سلطان ترکی محمود دوم نے مصر کے گورنر محمد علی پاشا سے فوجی امداد طلب کی چنانچہ 1825ء میں مصری افواج ترکوں کی امداد میں یونان میں داخل ہو گئیں، لیکن یورپی طاقتوں کی مداخلت سے آخر مصر اور ترکی کے بحری بیڑے کو ڈبو دیا گیا جو یونان میں لنگر انداز تھا۔ سلطان ترکی نے 1827ء میں یونان کی آزادی کو تسلیم ضرور کرلیا مگر یونانیوں کو ملک کا اقتدار منتقل کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ چنانچہ پھر جنگ شروع ہوگئی۔ فرانس، برطانیہ اور روس نے یونان میں فوجی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ترکوں اور مصریوں کو شکست دی۔ 1829ء میں جب مصر جنگ سے دستبردار ہوا تو یونان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ 1830ء کی لندن کانفرنس میں یورپی ممالک نے یونان کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔ یونان کو پہلے پہلے جمہوریہ قرار دیا گیا اور انتونیو کاپودستریاس اس کے پہلے صدر بنے۔ 9 اکتوبر 1831ء کو صدر انتونیو کاپودستریا کو قتل کر دیا گیا اور ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا لیکن ہمدرد یورپی طاقتوں نے بہت جلد خانہ جنگی کو کنٹرول کرلیا۔

بادشاہت کا قیام:

11 مئی 1832ء میں لندن کانفرنس میں یورپی طاقتوں نے یونان میں بادشاہت قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور 17 سالہ پرنس آف بویریا آٹو OTTO کو یونان کا بادشاہ نامزد کر دیا اور یونان کی سرحدیں ترتیب دے دیں۔ اس وقت ملک کی آبادی تقریباً آٹھ لاکھ تھی۔ اگست میں یونانی پارلیمنٹ نے اوٹو کی بطور بادشاہ نامزدگی کو منظور کرلیا۔

پرامن انقلاب:

بادشاہ نے یونان کے دارالحکومت ناپلیا NAUPLIA میں اختیارات سنبھال لئے مگر 1843ء میں یونانیوں نے ایک پرامن انقلاب کے ذریعے شاہ کے جرمن مشیروں کو ملک سے نکال دیا، اور 1844ء میں یونان ایک آئینی بادشاہت بن گیا۔ 23 اکتوبر کو ایک بغاوت کے بعد شاہ اوٹو کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ ڈنمارک کے شہزادے جارج کو نیا بادشاہ منتخب کرلیا گیا۔ شاہ جارج اول 1863ء سے 1913ء تک یونان کا حکمران رہا۔ نومبر 1864ء میں نیا آئین نافذ کیا گیا اور اس کے تحت شاہی اختیارات کم کر دیئے گئے اور پارلیمنٹ کے اختیارات وسیع ہو گئے۔ 18 مارچ 1913ء کو 68 سالہ شاہ جارج اول کو قتل کر دیا گیا، اور اس کا بیٹا کانسٹنٹائن تخت نشین ہوا۔

جنگ عظیم اول:

جنگ عظیم اول کے دوران وزیر اعظم اور یونان کی عوام نے اتحادیوں کی حمایت کا اعلان کیا مگر شاہ کی بیوی ایک جرمن خاتون تھی اس لئے شاہی جوڑے کی ہمدردیاں جرمنی کے ساتھ تھیں۔ اسی بناء پر 1917ء میں شاہ کانسٹنٹائن اول کو معزول ہونا پڑا اور اس کا بیٹا الیگزینڈر تخت نشین ہو گیا۔ 2 جولائی 1917ء کو یونان نے اتحادیوں کی طرف سے جنگ عظیم اول میں شرکت اختیار کی۔ 25 اکتوبر 1920 کو نوجوان شاہ الیگزینڈر انتقال کر گیا تو 20 دسمبر کو سابقہ شاہ کانسٹنٹائن اول کو دوبارہ تخت نشین کر دیا گیا۔ 1921ء میں یونان نے ترکوں کے خلاف دوبارہ جنگ شروع کر دی۔ 1922ء میں جنرل نکولاؤس پلاسٹراس نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔

فوجی انقلاب:

27 ستمبر 1922ء کو جنرل پلاسٹیراس نے ایک فوجی انقلاب برپا کر دیا جس کے بعد شاہ کانسٹنٹائن کو دست بردار ہونا پڑا۔ اس کا ولی عہد جارج دوم کے نام سے بادشاہ بنا دیا گیا۔ دسمبر 1923ء میں جنرل پلاسٹیراس کی انقلابی کمیٹی نے نوجوان بادشاہ جارج دوم کو ملک چھوڑنے کا حکم دیا۔ چنانچہ قتل کے خوف سے بادشاہ 19 دسمبر 1923ء کو تخت سے دست بردار ہو کر روپوش فرار ہو گیا۔ جنوری 1924ء کو ایک بار پھر ملک کو جمہوریہ بنانے کا اعلان کیا گیا۔

جمہوریت کا قیام:

25 مارچ کو پارلیمنٹ نے باقاعدہ اعلان کر کے ملک کو جمہوریہ قرار دیا اور جارج دوم کی معزولی کے حق میں ایک قرارداد منظور کر لی جس سے ملک میں بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ 13 اپریل کو ایک ریفرنڈم میں عوام نے جمہوریت کی توثیق کر دی پہلی یونان جنگ کے ہیرو، ایڈمرل پاؤلوس کونڈوریوٹس ملک کے پہلے صدر منتخب ہوئے، مگر یہ جمہوریت بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔

ایک اور انقلاب:

26 جون 1925ء کو جنرل تھیوڈورس پنگالوس نے ایک انقلاب برپا کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ 3 جنوری کو اس نے آمرانہ اختیارات حاصل کر لئے۔ اپریل میں خودساختہ انتخابات کرا کے وہ صدر منتخب ہو گیا، لیکن 22 اگست 1926ء کو آنے والے ایک جوابی انقلاب میں اسے معزول کر دیا گیا۔ یہ انقلاب اس کے اپنے ری پبلکن گارڈ نے برپا کیا تھا۔ اب جنرل جارجیولس کونڈلیس نے اقتدار سنبھال لیا۔ ستمبر میں پاؤلوس سابقہ صدر عہدہ صدارت پر بحال کر دیئے گئے۔ جمہوریہ کے بعد یونانی عوام دو گروہوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ وہ جو جمہوریت نواز تھا اور دوسرا شاہ پسند۔ 3 جون 1927ء کو نیا آئین نافذ کیا گیا اور 3 جولائی 1928ء کو وینزیلوس دوبارہ وزیراعظم منتخب ہو گیا۔ دسمبر 1929ء میں مسٹر زیمس ZAIMIS منتخب ہو گئے۔

جنوری مارچ 1933ء میں ہونے والے انتخابات میں شاہ پسند برسر اقتدار آ گئے اور ٹسالڈارس نے وزارت عظمٰی سنبھال لی اسی دور جمہوریت پسندوں نے جو ناکام جمہوری انقلاب 1933ء اور 1935ء میں برپا کرنے کی کوشش کی جون 1935ء میں ہونے والے انتخابات میں جنرل جارجیولس کونڈلس وزیراعظم منتخب ہوئے۔ یہ شاہ پرست وزیراعظم تھے ان کی حکومت شاہ جارج دوم کو دوبارہ بادشاہ بننے کی دعوت دی۔

بادشاہت کی بحالی:

اکتوبر 1935ء میں پارلیمنٹ نے بادشاہت بحال کر دی اور 3 نومبر 1935ء کو ایک ریفرنڈم میں عوام نے بادشاہت کے حق میں ووٹ دیئے۔ 25 نومبر 1935ء کو شاہ جارج دوم نے 12 سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس آ کر تخت و تاج دوبارہ سنبھال لیا۔ جنگ عظیم دوم میں شاہ جارج کی حکومت کو جلاوطن ہو کر لندن منتقل کرنا پڑا۔ جمہوریت کا سفر بھی جاری رہا۔ مارچ 1946ء میں ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں ایک بار پھر شاہ پسند برسر اقتدار آ گئے اور شاہ دوم دوبارہ جلاوطنی سے واپس آ گئے۔ یکم اپریل 1947ء کو شاہ جارج کا انتقال ہو گیا اور ان کا بھائی پال اول تخت نشین ہوا۔ پال اول نے 1963ء میں انتقال کیا اور اس کا بیٹا کانسٹنٹائن دوم کے نام سے تخت نشین ہوا۔

لیبیا میں اطالوی قبضے سے 1969ء
بادشاہت کے خاتمہ تک

خفیہ مغربی معاہدے:

مغربی اقوام نے اپنے استعماری ارادوں کو جامہ تکمیل پہنانے کے لئے بیسویں صدی کے پہلے عشروں میں ایک دوسرے سے بہت سے خفیہ معاہدے کیے تھے جن میں سے ایک فرانس اور اٹلی کے درمیان طے پایا تھا جس کی رو سے فرانس کو مراکش میں کھل کھیلنے کی اجازت تھی اور اس کے جواب میں اٹلی کو طرابلس میں سامراجی کاروائیوں کی کھلی چھٹی حاصل ہوگئی تھی۔

1911ء کی اطالوی یلغار:

1911ء میں اٹلی نے طرابلس پر جو آج کا لیبیا ہے ایک بڑی فوجی یلغار کی تھی اس بڑی فوجی یلغار کی تہ میں دو سامراجی عوامل تھے، مگر اس یلغار کے جو ظاہری اسباب بتائے گئے۔ ان میں ایک دلچسپ سبب یہ بھی تھا کہ ایک نوجوان اطالوی لڑکی مسلمان بھگا کر لے گئے اور اس سے شادی کرلی۔

مرد بیمار یورپ:

ترکی کی سلطنت روز بروز زوال پذیر تھی، پھر طرز حکومت اتنا ناقص تھا کہ پایہ تخت ہی میں انقلاب بپا ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں طرابلس جیسے دور دراز صوبے کو اطالوی حملہ آوروں سے بچانا ترکی کے بس میں نہیں تھا، تھوڑی سی معرکہ آرائی کے بعد ترک فوجیں پیچھے ہٹ گئیں مگر طرابلس کے باشندوں نے اتنی جلدی ہار نہ مانی وہ اپنی آزادی کے لئے برابر لڑتے رہے لیکن جب 1914ء کی جنگ ختم ہوئی اور اتحادیوں نے ترکی سے معاہدہ کیا تو طرابلس کو متفقہ طور پر اطالوی مقبوضہ علاقہ تسلیم کرلیا گیا۔ مگر مجاہدین آزادی طرابلس نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اپنی جدوجہد آزادی جاری رکھی۔

سنوسی تحریک:

طرابلس کی اس جدوجہد آزادی میں سنوسی تحریک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ 1927ء میں جب اٹلی نے جدید اسلحہ

کے بل بوتے اور دوسری مغربی استعماری طاقتوں کی پشت پناہی سے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش شروع کی تو سنوسی جانبازوں کے پاس یہ دونوں طاقتیں نہیں تھیں تاہم چار سال تک یہ جانباز نہتے ہونے کے باوجود اٹلی کا مقابلہ کرتے رہے آخر کمزور اور طاقتور میں جنگ جاری رہی۔ 1931ء میں سنوسیوں کو کامل شکست ہوگئی، اور سنوسی راہنماؤں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

اٹلی کے ہولناک مظالم:

1911ء سے 1931ء تک کے 20 سال میں طرابلس کے جذبہ آزادی کو کچلنے کے لئے اٹلی نے جن ظالمانہ ہتھکنڈوں سے کام لیا انہیں دیکھ کر ہسپانوی مسلمانوں پر اہل یورپ کے سولھویں صدی میں کیئے گئے مظالم بھی شرما جاتے ہیں۔ مصر کے ایک مورخ نے لکھا تھا کہ آج ہم اہل یورپ کے مظالم کے لئے جو تحقیق کرتے ہیں کہ ہسپانوی حکومت نے مسلمانوں پر کیا کیا مظالم کیئے اور یہ کہ قرون وسطی میں لوگوں پر کیا بیتی، حالانکہ ہماری آنکھوں کے سامنے طرابلس موجود ہے جاؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ آؤ کہ آج جو مظالم اطالوی وہاں ڈھا رہے ہیں وہ کسی طرح بھی اندلس سے کم نہیں۔

عورتوں اور بچوں کے قتل عام:

1912ء میں ایک جرمن نامہ نگار نے لکھا تھا کہ دنیا میں آج تک کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ اس قسم کی بے ایمانی اور بے رحمی نہیں کی ہوگی جیسی اٹلی نے طرابلس میں روا رکھی تھی۔ اٹلی کے فوجی جرنیلوں نے فوجی قوانین کی بھی پروا نہیں کی۔ تمام قیدیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، اس قتل عام میں ان قیدیوں کو بھی نہ بخشا گیا جو میدان جنگ سے نہ پکڑے گئے تھے بلکہ جنھوں گھروں میں گھس گھس کر صرف شبہ میں پکڑا گیا تھا اور اس میں خواتین بوڑھے اور بچے بھی شامل تھے آسٹریا کا ایک جنگی نامہ نگار چلا اٹھا کہ حقیقت یہ ہے کہ اٹلی نے نہ صرف یورپ کے جنگی اخلاق مذاق اڑایا ہے بلکہ پوری دنیا عیسائیت کو دنیا اسلام کی نظر میں ذلیل و رسوا کر دیا ہے۔.........

سنوسی تحریک

شمالی افریقہ کی ایک مذہبی اور سیاسی تحریک کا بنیادی مقصد سنت اور شریعت کی پیروی کرنا تھا سنوسی تحریک کے بانی سید محمد بن علی ادریسی (1787ء۔ 1859ء) تھے جو الجزائر کے قصبے سنوس میں پیدا ہوئے تھے۔ جب الجزائر پر فرانس کی گرفت مضبوط ہوگئی تو وہاں سے طرابلس آگئے اور یہیں سے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ سنوسی تحریک کے ذاکر بڑے سادہ اور اصلاحی تھے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں بڑے ظاہر و باطن میں یکسانیت پیدا کرنا اس کا ماٹو تھا۔ سنوسی تحریک کے پیرو اسلامی مملکتوں میں یورپی استعماریت کے سخت خلاف تھے۔ انیسویں صدی کے نصف سے لے کر، بیسویں صدی کے نصف تک جو تحریکیں مراکش، طرابلس، مصر اور سوڈان میں ابھریں ان کی تعلق سنوسی تحریک سے ہے۔

مظالم کی ابتدا:

ایک روزنامہ نگار نے لکھا کہ 27 اکتوبر 1911ء کو اس کا گذر ایک کنویں کے پاس سے ہوا وہاں ایک نوجوان عرب خاتون ایک بچے کو گود میں لئے ہوئے پانی بھرنے کے لئے آئی، ابھی وہ کنویں کے قریب نہ پہنچی تھی کہ گولیاں چلنے کی آواز آئی اور اس عورت کا لاشہ زمین پر آ گرا اور وہ بچہ اس کی گود سے نکل کر بھاگا۔ جب میں نے ایک فوجی افسر کو بتایا کہ اس کے آدمیوں نے ایک عورت کو مارا ہے تو وہ بڑی سرد مہری سے بولا ہاں میرے آدمی یہ تمیز نہ کر سکے وہ عورت ہے یا مرد۔

خواتین کو برہنہ کرکے پھانسی:

مگر اس کا کیا کیجئے کہ جب اطالیوں نے لیبیا میں اپنی آمد کے موقع پر تقریباً 20 ہزار افراد کو پھانسی دی ان میں سے اکثر خواتین کو برہنہ کر کے پھانسی پر لٹکایا گیا، کیا اس موقع پر بھی اطالوی مرد اور عورت کی تمیز کھو بیٹھے تھے؟ اطالوی فوجی جہاں بھی جاتے تھے عورتوں پر پل پڑتے تھے اور ان کی عصمت ریزی کرتے تھے۔ اگر خواتین مزاحمت کرتیں تو موت کی گھاٹ اتار دی جاتیں۔ ایک مقام پر دو سو کے قریب عرب خواتین اطالوی فوج کی ان وحشیانہ حرکتوں سے بچنے کے لئے جنگلوں کی طرف نکل گئیں، مگر جب اطالوی درندوں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو یہ ظالم انہیں جنگلوں سے واپس پکڑ لائے ان فوجی کیمپوں میں ان کی عصمت دری کر کے انہیں چھوڑ دیا۔ اٹلی کے ان مظالم کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے تیونس اور الجزائر میں پناہ لی اور تقریباً 60 ہزار کے لگ بھگ مصر میں داخل ہوئے۔

عمر مختار

لیبیا کی تحریک آزدی کے مجاہد، برقہ میں پیدا ہوئے۔ 1911ء میں جب اٹلی نے بن غازی پر قبضہ کیا تو انہوں نے تحریک آزادی کی قیادت سنبھال لی پیرانہ سالی میں انہوں نے لیبیا کی عوام کو اٹلی کے استبداد سے نجات دلانے کے لئے جدوجہد کو جاری رکھا۔ بالآخر 1932ء میں اطالوی حکومت نے انہیں گرفتار کر کے ان پر نام نہاد مقدمہ چلایا اور سزائے موت سنائی گئی۔ انہیں سزائے موت ان کے ساتھیوں سمیت ہوائی جہاز میں اوپر لے جا کر نیچے زمین پر پھینک کر دی گئی اس طرح اس ستر سالہ مجاہد سے غیر انسانی سلوک کیا گیا۔ جو شاید اہل یورپ کو ہی زیب دیتا ہے۔

اطالوی دور حکومت اور لیبیا کا قیام:

اطالوی دور حکومت جو 1911ء سے جنگ عظیم دوم کے خاتمے تک پھیلا ہوا ہے اطالوی حکمرانوں نے لیبیا کے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھایا مگر ان کے دور میں کچھ تعمیری کام بھی انجام پائے۔ تقریباً اڑھائی لاکھ ایکٹر نیم صحرائی زمین قابل کاشت بنائی گئیں مگر ساتھ ہی لاکھوں یورپی آبادکاروں کو یہاں آباد کر کے مقامی باشندوں سے زمین چھین کر انہیں

دے دی گئی اور مقامی لوگوں کو صحرائے اعظم کی طرف دھکیل دیا گیا۔ جون 1940ء میں اٹلی نے جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے جنگ عظیم دوم میں شرکت کی اس دوران لیبیا کے امیر محمد ادریس نے اپنے وطن کی آزادی کی خاطر برطانیہ کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور جرمنی اور اٹلی کے خلاف برطانیہ اور اتحادیوں کی مدد کی۔ 1943ء میں جب جرمن سپہ سالار رومیل کو افریقہ میں شکست ہوئی تو طرابلس اور سائرے نیکا برطانیہ کے قبضے میں آ گئے اور فزان پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ جون 1949ء میں برطانیہ نے محمد ادریس سنوسی کو سائیرے نیکا کا امیر تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد لیبیا کی آزادی کے لئے گفت و شنید ہوئی جس کے نتیجے میں فزان طرابلس اور سائیرے نیکا کو ایک وفاق کی شکل دے دی گئی جو لیبیا کہلایا۔ محمد ادریس سنوسی کو اس نئے ملک کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

آزادی کے بعد:

لیبیا میں دستور ساز اور قانون ساز اسمبلی پہلے سے قائم تھی جو دو ایوانوں پر مشتمل تھی ایک سینٹ اور ایک ایوان نمائندگان۔ لیبیا کو ایک جمہوریہ بنانا بھی اس لحاظ سے آسان تھا مگر میں ایک آئینی بادشاہت قائم کر دی گئی۔ یوم آزادی کے ان پر دستور ساز اسمبلی نے بادشاہی نظام کے حق میں فیصلہ دیا اور لیبیا میں موروثی بادشاہت قائم کر دی گئی۔ محمد ادریس سنوسی کا تعلق اگرچہ سنوسی تحریک سے تھا جو اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایک خانقاہی اور روایتی تحریک تھی جس میں اسلام کی سیاسی اور اجتماعی فکر سے واقفیت کا فقدان تھا۔ لیبیا نے 29 جولائی 1953ء کو برطانیہ سے دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا۔ آزادی کے بعد ایک اہم مسئلہ فوجی اڈوں کا تھا جو برطانیہ اور امریکہ نے جنگ عظیم دوم کے زمانے میں قائم کئے تھے۔ ان اڈوں کی موجودگی آزاد لیبیا کے لئے ایک خطرہ تھی اس لیے لیبیا میں آزادی کے فوراً بعد ان اڈوں کو ختم کرنے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا آخر 9 ستمبر 1954ء کو ایک معاہدے کے تحت ان اڈوں کا کچھ مالی امداد کے عوض کچھ عرصہ قائم رکھنے کی اجازت دی گئی۔ فرانس نے بھی 1955ء میں طے پانے والے ایک معاہدے کے تحت صحرائی علاقے اسے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ 27 اپریل 1963ء کو شاہ ادریس نے وفاقی نظام ختم کر کے پورے ملک میں واحدانی طرز کی مرکزی حکومت قائم کی اور ملک کو دس انتظامی صوبوں میں تقسیم کر دیا۔

محمد ادریس سنوسی

جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا (1911) سید محمد ادریس ایک نوجوان تھے انہوں نے مجاہدانہ انداز میں اٹلی کے حملوں کا مقابلہ کیا۔ 1920ء میں اٹلی نے طرابلس پر ان کی امارت تسلیم کر لی۔ مگر بعد میں جب اٹلی پر فاشسٹوں کی حکومت قائم ہوئی تو اٹلی نے طرابلس پر دوبارہ تصرف شروع کر دیا۔ 1923ء میں ادریس سنوسی کو وطن چھوڑ کر مصر میں قیام کرنا پڑا۔ دوسری جنگ عظیم میں ادلیس سنوسی اور اس کے ساتھیوں نے اتحادیوں سے تعاون کیا نتیجتاً جنگ عظیم دوم کے بعد انہیں لیبیا کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ 1969ء میں ان کے خلاف فوجی انقلاب برپا ہوا اور انہیں برطرف کر دیا گیا۔

ترقی کی سست رفتار:

آزادی کے بعد سے ملک میں ترقیاتی کاموں کی رفتار بہت سست تھی ملک کے وسائل محدود تھے اور ملک کا بڑا حصہ صحرائے اعظم کا ایک کونا تھا، جس کی وجہ سے رقبے کے لحاظ سے پاکستان سے دوگنا ہونے کے باوجود آبادی صرف چودہ لاکھ تھی۔ 1957ء میں صحرائے اعظم کے حصے میں تیل کی دریافت کے بعد معیشت میں انقلاب آ گیا۔ 1961ء تک ملک تیل برآمد کرنے والے ملکوں میں شامل ہو گیا 1951ء میں فی کس سالانہ آمدنی صرف چالیس ڈالر تھی لیکن 1965ء تک بڑھ کر 1425 ڈالر تک ہو گئی۔ 1951ء میں ملک کا بجٹ صرف 70 لاکھ پونڈ تھا۔ 1965ء میں بڑھ کر ساڑھے 34 کروڑ ہو گیا۔ اب ملک امریکہ اور برطانیہ کی مالی امداد کا محتاج نہ رہا۔ طرابلس میں دو یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ یکم ستمبر 1961ء کو شاہ ادریس یونان کے سرکاری دورے پر تھے کہ فوج نے بغاوت کر کے شاہی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اور لیبیا کو ایک جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔

فوجی انقلاب اور معمر قذافی:

یکم ستمبر 1969ء کو ایک پرامن فوجی انقلاب کے ذریعے انقلابی کونسل نے شاہ ادریس کی اٹھارہ سالہ پرانی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ولی عہد شہزادہ حسن الرضا نے تمام اختیارات فوج کے حوالے کرنے کا اعلان کیا۔ لیبیا کا یہ فوجی انقلاب بھی عراق اور شام میں آنے والے انقلاب کی طرح ایک فوجی گروہ نے برپا کیا تھا جس کے سربراہ معمر قذافی تھے۔ عراق اور شام کے مقابلے میں مورخین نے اس انقلاب کو مصر اور سوڈان میں آنے والے انقلاب سے مشابہ قرار دیا ہے، کیونکہ لیبیا کے انقلابی فوجی افسر بعث پارٹی کی قسم کے کسی نظریات پارٹی کے آلہ کار نہیں تھے، اور اسلام کے متعلق ان کا رویہ بھی معاندانہ نہیں تھا، بلکہ ان پر اسلام کا گہرا اثر دکھائی دیتا تھا۔ انقلاب کے بعد 1951ء کا آئین معطل کر دیا گیا اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی، اس کے بعد سے لیبیا پر ایک فوجی کمانڈ کونسل کی حکومت قائم ہے، اس فوجی کونسل کے سربراہ گذشتہ چالیس برس سے معمر قذافی ہیں۔

بانی انقلاب معمر قذافی (تعارف)

محمد معمر قذافی (1942ء ۔) لیبیا کے سیاسی راہنما۔ 1961ء بن غازی کی فوجی درس گاہ سے تعلیم حاصل کی۔ لیبیا کی حکومت نے ان کا مقالہ جو فوجی حکمت عملی سے متعلق تھا چھاپنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کئی دوستوں کا اپنا ہم خیال بنا کر فری آفیسر نامی ایک خفیہ تنظیم قائم کی اور انقلاب کی راہیں ہموار کرنے لگے۔ ستمبر 1969ء میں انہوں نے انقلاب بپا کر کے شاہ ادریس کو معزول کر دیا ور بادشاہت ختم کر دی اور خود وزیر اعظم بن گئے۔ ان کی انقلابی نے حکومت امریکی اور برطانوی فوجی اڈے بند کر دیئے اور تیل کی صنعت کو قومی تحویل میں لے لیا۔ 14 اپریل 1986ء کو امریکہ نے انہیں ہلاک کرنے کے لئے طرابلس اور بن غازی پر ہوائی حملہ کرایا۔

1969ء میں ایک خفیہ سوسائٹی قائم کی گئی تھی اور شاہ ادریس جنہیں وہ برطانیہ کا ایجنٹ سمجھتے تھے کو اقتدار سے بے دخل کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ یکم ستمبر 1969ء کو معمر قذافی اور ان کے ساتھیوں نے طرابلس اور بن غازی میں ایک وقت کاروائی کرتے ہوئے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ یاد رہے انقلابیوں کی عمر 20 اور 30 سال کے درمیان تھی۔ قذافی نے جنوری 1970ء میں وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا لیکن جولائی 1972ء میں یہ عہدہ عبدالسلام جلود کے سپرد کر دیا اور خود صدر بن گئے۔

انقلابی اصلاحات:

صدر قذافی نے برسر اقتدار آتے ہی لیبیا کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچادی اور داخلی اور خارجی میدانوں میں مسلسل جرأت مندانہ اقدامات کئے۔ ان کے عہد میں پہلی مرتبہ لیبیا نے دنیائے عرب اور دنیائے اسلام کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔ تیل کی آمدنی نے لیبیا کی معیشت کو مضبوط بنا دیا۔ صدر قذافی نے اصلاحات کا آغاز مختلف اداروں کو قومی تحویل میں لے کر کیا ملک میں صنعتیں تو نہیں تھیں اس لئے بعض تیل کی کمپنیوں کو قومی تحویل میں لیا گیا اور بعض میں حکومت شریک ہوگئی بینک اور بیمہ کمپنیاں بھی قومیالی گئیں اس کے بعد قذافی نے برطانوی اور امریکی فوجی اڈوں کو خالی کرانے پر توجہ دی اور ان ملکوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ چنانچہ مارچ 1970ء میں برطانیہ نے اپنا اڈا ختم کر دیا اس کے تین ماہ بعد امریکہ نے اپنا مشہور ہوائی اڈہ ویلس WHEELUS کا اڈا خالی کر دیا وہیلز کا اڈا خالی کرانے کے بعد قذافی نے اس کا نام مشہور مسلم فاتح عقبہ بن نافع کے نام پر رکھ دیا۔ جولائی 1970ء میں اطالوی آبادکاروں کی زمینیں ضبط کر لی گئیں اور جب اطالوی ملک چھوڑ کر چلے گئے تو طرابلس کے بڑے گرجا گھر کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا اس کا نام جامع جمال عبدالناصر رکھا گیا 1972ء میں روس سے ایک معاہدہ کیا گیا اور تیل کے بدلے اسلحہ خرید لیا گیا اس طرح صدر قذافی نے مختصر عرصے میں لیبیا کو بیرونی اثرات سے پاک کر دیا۔ 1973ء میں انہوں نے چین کے ثقافتی انقلاب کے نمونے پر لیبیا میں ایک ثقافتی انقلاب کا آغاز کیا لیکن اس کا مقصد ملک میں کوئی کمیونسٹ انقلاب لانا نہیں بلکہ اسلامی انقلاب لانا تھا۔ اس مقصد کے لئے کمیونزم اور سرمایہ داری اور الحاد کے خلاف مہم چلائی گئی اور ان سے متعلق کتابوں کو جلا دیا گیا۔

آزادی کی تحریکوں کی حمایت:

صدر قذافی عرب اتحاد اور اتحاد اسلامی کے علمبردار ہیں، انہوں نے مسلسل مصر اور تیونس وغیرہ سے اتحاد کی کوششیں بھی کیں مگر یہ کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان ملکوں کا معاشرہ اتنا مغرب زدہ ہو چکا تھا کہ وہ لیبیا کے ثقافتی اسلامی انقلاب کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا، لیکن اور وجہ مورخین نے یہ بتائی کہ صدر قذافی حد سے زیادہ تیز مزاج اور جلد باز تھا۔ ان کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے رہے ہیں۔ بادشاہوں کا تختہ الٹنا اور دوسرے ممالک میں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرنا بھی ان کا مشغلہ رہا ہے۔ یہ کام آزادی جمہور کے نقطہ نظر سے جتنا بھی اچھا ہو، مگر دور اندیشی سے خالی ہے اور بداعتمادی کا باعث بنتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جن دنوں وہ مصر سے اتحاد کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے اسی زمانے میں وہ صدر سادات کا تختہ پلٹنے کی کوششوں میں بھی مصروف تھے۔ 1971ء میں انہوں نے مراکش کے شاہ حسن کے خلاف بغاوت میں باغی عناصر کی مدد کی اور وہ مراکش کے خلاف صحرا کے معاملے

میں بھی صف آرا رہے انہوں نے سوڈان میں صدر نمیری کے خلاف صادق المہدی کی مدد کی اور سوڈان پر حملہ کردیا۔ فلسطینی چھاپہ ماروں کی مدد سے اردن کے شاہ حسین کا تختہ الٹنے کی کوشش بھی کی۔ 1977ء میں مصر کے خلاف فوجی کاروائی کرنے میں مصروف تھے۔ کہ صدر سادات نے پیشگی کاروائی کر کے لیبیا کے سرحدی مورچوں کو تباہ کر دیا۔ صدر قذافی نے چاڈ کے مسلمانوں کی مدد کی تا کہ وہ عیسائی اقلیت کے تسلط سے آزاد ہو سکیں۔ فلپائن میں مورو مسلمانوں کی جنگ آزادی میں انہوں نے اسلحہ اور رقم دونوں سے امداد کی ہندوستان نے جب 1971ء میں پاکستان پر حملہ کیا تو صدر قذافی نے پاکستان کی پرزور حمایت کی۔ انہوں نے یوگنڈا کے صدر ایدی امین کو آمادہ کیا کہ وہ یوگنڈا سے اسرائیلیوں کو نکال دیں۔ شمالی آئرلینڈ میں وہاں کی ری پبلکن آرمی کی اور خود امریکہ میں سیاہ فام جنگ پسندوں کو مدد فراہم کرتے رہے۔ اگرچہ صدر قذافی کی اس مدد و اعانت کا مقصد صرف مظلوموں کی حمایت ہے مگر ساری دنیا کا داروغہ بننا بھی تو ناعاقبت اندیشی کے سوا کچھ نہیں اور ایک خطرناک کھیل ہے۔ اتحاد اسلامی کا دعوے دار ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی اس پالیسی سے افتراق پیدا کیا۔ سوڈان میں انہوں نے نمیری کی مخالفت کر کے اور صادق المہدی کی حمایت کر کے یقیناً اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی لیکن مصر سے تصادم دونوں ملکوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا اور جو طاقت دشمنوں کے خلاف استعمال ہو سکتی تھی وہ اپنوں کے خلاف ضائع کی گئی۔ اسی طرح اری ٹیریا کی جنگ آزادی میں انہوں نے حبشہ کی مدد کر کے کمیونسٹوں کے ہاتھ مضبوط کر دیئے۔ ان کی یہ پالیسیاں دور اندیشی اور سیاسی بصیرت کی بجائے تضاد، منافقت اور ناتجربہ کاری کی عکاسی کرتی ہیں۔

لیبیا میں اسلام:

لیبیا میں انقلاب، 1969ء کے بعد سے کوئی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ نہیں ہے۔ عرب سوشلسٹ یونین جو 1971ء میں قائم کی گئی تھی، ملک کی واحد سیاسی جماعت ہے جو صدر قذافی کی آمریت کی آئینہ دار ہے۔ صدر قذافی نے اپنی اصلاحات کو سوشلزم کا نام دیتے ہیں۔ لیکن سوشلزم بھی دوسرے عرب ملکوں کے سوشلزم سے مختلف ہے اور ان میں مارکس، لینن اور ماؤ کے افکار کا غلبہ ہے نہ مرعوبیت پائی جاتی ہے۔ لیبیا میں سوشلزم کا لفظ صرف اصطلاح تک محدود ہے یہی وجہ ہے کہ لیبیا کی خارجہ پالیسی بین الاقوامی کمیونزم یا سوشلزم سے وابستہ نہیں اور خود صدر قذافی کھل کر کمیونزم اور الحاد کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ 1977ء میں لیبیا کی عمومی عوامی کانگرس نے چار نکاتی اعلان کیا تھا۔ جو مختصراً یہ تھا۔

1۔ لیبیا کا سرکاری نام الجماہیر العربیہ اللیبیہ الشعبیہ الشتراکیہ، یعنی لیبیا کی عرب عوامی سوشلسٹ جمہوریہ ہو گیا۔
2۔ قرآن ملک کا ضابطہ حیات ہوگا۔
3۔ سیاسی نظام کی بنیاد عوام کے براہ راست اقتدار پر ہوگی۔
4۔ مرد اور خواتین دونوں کے لئے تعلیم لازم ہوگی۔

اگرچہ اس اعلان سے سیاسی طاقت اللہ کی بجائے عوام کے ہاتھ میں دی گئی تھی مگر ساتھ ہی قرآن کو ملک ضابطہ حیات قرار دے کر اس کی تلافی کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ بہر حال صدر قذافی کی حکومت میں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

☆

1966-نائیجیریا-فوجی انقلاب سے فوجی انقلاب تک

نائیجیریا کے فوجی راہنما جنرل آئرنسی IRONSI نے جنوری 1966ء میں ایک نہایت بھیانک سازش کے ذریعے نائیجیریا کی آئینی حکومت کا تختہ پلٹ کر انقلاب بپا کر دیا۔ مسلمانوں کے ہردلعزیز سیاسی راہنما احمد و بیلو اور ابوبکر اتفادہ بلیوو کو قتل کر دیا گیا۔ وفاقی ڈھانچے کو ختم کر کے مرکزی حکومت قائم کر دی گئی۔ اپنے ہردلعزیز سیاسی راہنماؤں کے قتل سے نائیجیریا کے مسلمانوں کو بھی تکلیف پہنچی، اس پر مستزاد یہ کہ جنرل کو وفاقی ڈھانچے کو ختم کر کے پورے ملک پر ایبو قبائل کو تسلط قائم کرنا بھی منظور تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد شمال میں وسیع پیمانے پر ایبو باشندوں کے خلاف فسادات شروع ہو گئے۔ پھر جولائی 1966ء میں فوج کے ہاؤسا سپاہیوں نے بغاوت کر دی جنرل آئرنسی کو قتل کر دیا گیا اور ایک ہاؤسا جنرل یعقوبو گوان کی قیادت میں ایک نئی حکومت قائم کر دی جس میں وہ لوگ شامل کر دیئے گئے جن کا شمال اور مشرق کی حکمران پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

غلامی سے آزادی تک:

قرون وسطیٰ میں نائیجیریا کا شمالی علاقہ منظم ریاستوں کا حصہ تھا۔ آٹھویں صدی میں یہ کانم بورنو سلطنت میں شامل تھا اس سلطنت میں 1086ء میں اسلام رائج ہوا۔ پرتگالی پہلے یورپی تھے جو نائیجیریا پہنچے۔ انہوں نے بینن کی سرحد کے قریب اپنے تجارتی مراکز قائم کئے اور یہاں غلاموں کی تجارت شروع کر دی۔ دریائے نائیجر کے علاقے میں وسائل کی تلاش کی مہم میں جو پہلا یورپی یہاں آیا وہ سکاٹ لینڈ کا مونگو پارک تھا جو غالباً 1796ء میں آیا تھا۔ اس کے بعد دیگر برطانوی مہم جو 1830ء میں یہاں پہنچے۔ پھر آہستہ آہستہ انگریز یہاں چھا گئے۔ 1906ء تک جنوبی نائیجریا کا تمام علاقہ جس میں لاگوس بھی شامل تھا برطانوی نوآبادی بن گیا۔ تمام علاقوں کے باشندے خصوصاً شمالی نائیجریا کے لوگوں نے برطانوی حکمرانی کی شدید مخالفت کی، لیکن انگریزوں نے انہیں شکست دی۔ یکم جنوری 1914ء کو برطانوی تسلط مکمل ہو گیا۔ برطانیہ نے شمالی اور جنوبی نائیجریا کو متحدہ کر کے ایک علاقہ نائیجریا کی شکل دی اور اسے اپنا زیر حفاظت علاقہ قرار دے دیا۔ لاگوس اس برطانوی نوآبادی کا دارالحکومت بن گیا سر فریڈرک لوگرڈ، متحدہ نائیجیریا کا پہلا گورنر جنرل تھا اس نے مقامی

سرداروں کی مقامی حکومتوں کی پالیسی جاری رکھی۔

لیفٹننٹ جنرل آئرن سی

انگلستان کی فوجی درس گاہ سینڈھرسٹ کے تربیت یافتہ، ایبو قبیلہ سے تعلق رکھنے والے نائجیر کے فوجی جنرل۔ نائجیریا میں فوجی بغاوت کے بعد مردِ آہن بن کر ابھرے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ جنرل آئرنسی نے ملک میں اس وقت فوجی حکومت قائم کی جب شدید خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا اور وزیروں کو قتل کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ جنرل آئرنسی ایک رحم دل انسان تھا، مگر اس کے پاس جو طاقت کی چھڑی تھی اس کو وہ اچھی طرح استعمال کرنا جانتے تھا۔ ان کی سرکردگی میں کانگو میں اقوام متحدہ کی فوجوں نے آسٹریلیا کے باشندوں کو جو بچانے کا کارنامہ انجام دیا تھا اس پر انہیں آسٹریلیا کی حکومت نے ''نائٹ'' کا خطاب دیا تھا۔

1920ء میں کہیں جا کر مقامی لوگوں نے حکومت میں نمائندگی کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ نائجیرین قانون ساز کونسل قائم کی گئی۔ اس کو لاگوس کی نوآبادی میں قانون سازی کا محدود اختیار دیا گیا۔ جنوبی صوبے میں اسمبلی قائم کر دی گئی مگر شمالی صوبے میں برطانوی گورنر کی حاکمیت بحال رکھی گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عوام نے داخلی خودمختاری کا مطالبہ کیا۔ 1947ء میں برطانیہ نے نائجیریا کو پہلا آئین عطا کیا جس کے تحت ہر علاقے کی اپنی اسمبلی قائم ہوئی۔ 1957ء میں داخلی خودمختاری دے دی گئی۔ شمالی علاقے کا راہنما ابوبکر تفادا بلیو (1912ء۔ 1966ء) فیڈریشن کا پہلا وزیراعظم بنا۔ 1959ء کے انتخابات میں وہ منتخب وزیراعظم بن گیا۔ یکم اکتوبر 1960ء کو نائجیریا کو آزادی دے دی گئی۔ سر ابوبکر تفادا بلیو وزیراعظم اور نامدی ازیکوے NNAMDI AZIKIWES پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ نائجیریا کو آئینی بادشاہت قرار دیا گیا اور ملکہ ایلزبتھ دوم، ملک کی ہیڈ آف سٹیٹ تھیں۔ گورنر جنرل ملکہ نمائندہ۔

آزادی کے بعد:

12 فروری 1961ء کو سابقہ برطانوی کیمرون کا شمالی حصہ نائجیریا میں شامل ہو گیا کیونکہ وہاں کے عوام نے ایک ریفرنڈم میں نائجیریا میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا۔ آزادی کے ابتدائی دنوں میں ملک کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نسلی دشمنیوں، مذہبی تفریق اور سیاسی تفریق کی وجہ سے فیڈریشن کے اتحاد کو کافی دھچکا پہنچا۔ 1962ء میں ایک بڑا سیاسی بحران یہ پیدا ہو گیا کہ یوربا نسل کے لوگوں نے مغربی حصے میں تسلط قائم کر لیا۔ یکم اکتوبر 1963ء کو نائجیریا کو وفاقی جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ گورنر جنرل نامدی پہلے وفاقی صدر مقرر ہوئے۔ اکتوبر 1965ء میں آزاد نائجیریا کے پہلے تمام انتخابات ہوئے۔ سر ابوبکر کو دوبارہ وزیراعظم منتخب کر لیا گیا۔

پہلا فوجی انقلاب:

15 جنوری 1966ء کو ملک کا پہلا فوجی انقلاب برپا ہوا۔ 25 نوجوان فوجی افسروں کے انقلابی گروپ کی قیادت کمانڈر انچیف جنرل آئرنسی نے کی۔ اس خونین انقلاب میں جیسے کہ پہلے ذکر آیا وزیر اعظم سر ابوبکر تفاوا (54) کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ شمالی نائیجیریا کے وزیر اعلیٰ احمد و بیلو مغربی نائیجیریا کے وزیر اعلیٰ اکنتولا اور دیگر اعلیٰ عہدہ دار بھی مارے گئے۔ جنرل آئرنسی نے 17 جنوری کو ملک میں فوجی حکومت قائم کر دی۔ مئی میں اس نے وفاق کو ختم کر کے مضبوط مرکزی حکومت قائم کر دی اور اپنے قبیلے ایبو IGBO کے کئی ارکان کو اپنا مشیر مقرر کر دیا۔ شمالی علاقے کے ہاوسا قبائل نے اس تبدیلی اور ایبو قبائل کے تمام ملک پر کنٹرول کو تسلیم نہ کیا۔ چنانچہ ہاوسا اور ایبو قبائل کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی اور ہزاروں ایبو مارے گئے۔ جون 66ء میں فوجی حکومت نے آئین معطل کر کے سپریم ملٹری کونسل بنا دی۔ سیاسی جماعتیں اور قبائلی جرگے توڑ دیئے گئے۔

جوابی انقلاب:

29 جولائی 1966ء کو شمالی آرمی کے افسروں کے ایک گروپ نے جوابی انقلاب برپا کر کے جنرل آئرن سی قتل کر دیا اور جنرل یعقوبو گوران نے اقتدار سنبھال لیا۔ 31 اگست کو فوجی صدر نے وفاقی طرز حکومت کو بحال کر دیا۔ مشرقی ریاست کے فوجی گورنر نے جنرل یعقوبو گوران کو سربراہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ادھر ایبو قبائل نے وفاق توڑنے کی دھمکی دے دی۔ ستمبر 1966ء میں شمالی علاقے میں ہاوسا قبائل نے ایبو قبائل پر حملہ کر دیا اور ان کے تیس ہزار افراد ہلاک کر دیئے۔ نتیجتاً خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

بارہ ریاستوں میں تقسیم:

نائیجیریا 1960ء میں آزادی کے بعد سے انتظامی لحاظ سے تین خودمختار ریاستوں میں منقسم تھا وہ ان میں سے ہر ریاست کے الگ الگ صوبے تھے یہ صوبے بالعموم قبائل کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے۔ دوسرے فوجی انقلاب کے بعد جنرل یعقوبو گوران کی حکومت نے مئی 1967ء میں ملک کو بارہ خودمختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا، ان ریاستوں میں سے چھ شمال میں بنائی گئیں اور تین مشرق میں۔

بیافرا اور نائیجیریا کی کشمکش:

اس تقسیم کا مقصد یہ بتایا گیا کہ اس طرح کوئی ایک علاقہ اپنی آبادی کی کثرت کی بنیاد پر دوسرے علاقے پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا اور تمام قبائل کو حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ ملنے کی وجہ سے بداعتمادی ختم ہو جائے گی۔ ملک کی یہ نئی تقسیم شمالی مسلمانوں کے حق میں سب سے زیادہ نقصان دہ تھی، کیونکہ اس طرح ان کا شمالی علاقہ چھ ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اس تقسیم کا مقصد دراصل شمال کی برتری پر ضرب کاری لگانا تھا، لیکن ایبو قبائل نے اس تقسیم کو محض اس لیے قبول نہیں کیا کہ خود ان کا علاقہ بھی تین ریاستوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ ایبو فوجی راہنماؤں نے جب دیکھا کہ ان کا اقتدار مرکزی حکومت پر بھی ختم ہو گیا اور مشرقی ریاست میں بھی وہ اقتدار میں نہ رہے تو انہوں نے 30 مئی 1967ء مشرقی

نائجیریا کے وفاق سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اور اپنی نئی مملکت کا نام بیافرا رکھا۔ نائجیریا کی وفاقی حکومت نے ملک کا اتحاد برقرار رکھنے کے لئے جولائی 1967ء میں بیافرا کے خلاف فوجی کارروائی شروع کر دی اور جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ نائجیریا اور بیافرا کی اس کشمکش میں جلد ہی بین الاقوامی طاقتیں بھی ملوث ہو گئیں۔ وفاقی فوجیوں کے فرضی مظالم کی داستانیں گھڑی گئیں اور مشہور کیا گیا کہ نائجیریا کی اس لڑائی کا مقصد مشرقی علاقے سے عیسائیوں کو ختم کرنا ہے۔ تنزانیہ آئیوری کوسٹ وغیرہ نے بیافرا کو تسلیم کر لیا تھا۔ ادھر عیسائیت کی بنیاد پر فرانس اور پرتگال نے بیافرا کو اسلحہ فراہم کرنے کی کوشش بھی کی۔ چین نے بھی بیافرا کی حمایت کی۔ نائجیریا کو بھی بعض ممالک سے امداد ملی خصوصاً روس نے بڑی تعداد میں طیارے فراہم کیے۔ دولت مشترکہ میں شامل ہونے کی وجہ سے، برطانیہ کو بھی نائجیریا کی امداد کرنا پڑی۔ آخر کار ڈھائی سال کی جنگ کے بعد 12 جنوری 1970ء کو بیافرا نے ہتھیار ڈال دیئے اور ایبو راہنما کرنل اوجوکو AOJUKWE فرار ہو گیا۔ اس جگہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشہور ایبو راہنما اور سابق گورنر جنرل نامدی نے بھی جنگ کے آخری دنوں میں وفاق کی حمایت کرنا شروع کر دی۔

جمہوری حکومت کی بحالی:

یعقوبو گوران (1966ء۔1975ء) کے دور صدارت میں نائجیریا کو بارہ ریاستوں میں تقسیم وفاقی نظام کو بحال اور بیافرا کی بغاوت کو فرو کرنے کے علاوہ بھی کئی اہم اقدامات کئے گئے۔ مثلاً 1973ء کی جنگ میں عرب ملکوں سے اتحاد کے لئے اسرائیل سے سفارتی تعلقات ختم کر دیئے گے۔ یعقوبو گوران 1976ء میں شہری یا جمہوری حکومت کو بحال کرنے کا اعلان کیا مگر 1974ء میں وہ اپنے اس اعلان سے منحرف ہو گئے، جس پر طلباء نے مظاہرے شروع کر دیئے۔ گرانی میں اضافے اور بدعنوانیوں پر قابو نہ پانے کی وجہ سے یعقوبو گوران کی حکومت کے خلاف بے چینی بڑھتی گئی۔

29 جولائی کا انقلاب:

یہاں تک کہ جب یعقوبو گوران افریقی اتحاد کی تنظیم کے سربراہی اجلاس میں شرکت کے لئے یوگنڈا گئے تو 29 جولائی 1975ء کو بریگیڈیئر مرتلا رفائی محمد نے بغیر کسی خونریزی کے یعقوبو گوران کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ نئی فوجی حکومت نے سرکاری ملازمین کی وسیع پیمانے پر تطہیر کی، تمام ذرائع ابلاغ قبضے میں لے لئے گئے فوج کی تعداد بھی کم کر دی گئی اور 1979 تک شہری حکومت بحال کر دینے کا وعدہ کیا۔ 3 فروری 1976ء جنرل مرتلا رفائی محمد نے نئے دارالحکومت اور 19 ریاستوں کے قیام کا اعلان کیا۔ مارچ میں نئی ریاستوں کی حد بندی کی گئی۔ نیا دارالحکومت صوبہ نائجر میں رابوجا کے مقام پر قائم کیا جانے کا فیصلہ کیا گیا۔

جنرل رفائی کی موت:

اس اعلان کے صرف دس دن بعد جنرل رفائی محمد ایک ناکام بغاوت میں مارے گئے اور ان کی جگہ لیفٹنٹ جنرل اولیگن اوباسنجو OLSEGUN OBASANJO سربراہ مملکت بن گئے۔ ان کے زمانے میں لوکل کونسلوں کا انتخاب ہوا اور لوکل کونسلوں نے 31 اگست 1977ء کو دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کیا۔ اس کا پہلا اجلاس 6 اکتوبر 1977ء کو منعقد ہوا۔

حکومت، سیکولر آئین:

فوجی حکومت نے جو دستوری مسودہ پیش کیا وہ سیکولر نوعیت کا تھا، اس لیے اس پر مسلمانوں نے شدید اعتراضات کیے اور مطالبہ کیا کہ اسلام کو آئین میں مسلمانوں کی تعداد کے مطابق جگہ دی جائے۔ نیا آئین تیار ہو جانے کے بعد فوجی حکومت نے جمہوری حکومت کی بحالی کی طرف ایک اور قدم اٹھاتے ہوئے 24 جولائی 1977ء کو صوبوں کے فوجی گورنر ہٹا دیئے اور سیاسی پارٹیوں سے پابندی ہٹا دی۔ عام انتخابات میں مسلمان راہنما شیہو شگاری کی قومی پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں اور صدر کا انتخاب بھی شیہو شگاری نے جیت لیا۔ یکم اکتوبر 1979ء کو شیہو شگاری نے صدارت کے عہدے کا حلف اٹھایا اور اس طرح 13 سال کے بعد نائیجیریا میں حکومت بحال ہو گئی۔ صدر شگاری نے ملک میں سبز انقلاب لانے کی کوششیں کیں مگر ملک کی اقتصادی حالت بدستور خراب رہی۔

اور انقلاب:

اگست 1983ء میں منعقد ہونے والے انتخابات میں صدر شگاری ایک مرتبہ پھر منتخب ہو گئے، مگر انتخابات کے چند ماہ بعد 31 دسمبر 1983ء کو میجر جنرل محمد بوہاری نے شگاری کا تختہ الٹ کر حکومت پر قبضہ کر لیا۔ یکم جنوری 1984ء کو قومی اسمبلی کی جگہ ایک بار پھر سپریم ملٹری کونسل تشکیل دی گئی۔ جنرل بوہاری اس کونسل کے چیئرمین اور ہیڈ آف دی سٹیٹ بنے۔ آئین معطل کر دیا گیا۔ 9 فروری 1984ء کو نیا آئین نافذ کیا گیا۔ بوہاری نے سختی سے سادگی کا پروگرام رائج کیا جس سے لوگ منحرف ہو گئے۔

انقلاب:

نائیجیریا میں 27 اگست 1985ء کو چھٹا فوجی انقلاب برپا ہوا اور یوں نائیجیریا انقلابوں کی سرزمین بن گیا۔ میجر جنرل محمد ابراہیم بیڈا موسی بابا لگیڈا سربراہ مملکت بن گئے اور آرمڈ فورسز رولنگ کونسل تشکیل دی گئی۔ فوجی حکومت نے 1992ء میں جمہوری حکومت بحال کرنے کا وعدہ کیا۔ مئی 1989ء میں ایک اور نیا آئین نافذ کیا گیا اور ایک صدارتی حکم سے سیاسی جماعتوں سے پابندی ہٹالی گئی۔ ملک میں پانچ بڑی سیاسی جماعتیں سامنے آئیں، لیکن 1987ء میں ریاستوں کی تعداد 19 سے 21 کر دی گئی تھی۔ 7 اکتوبر 1989ء کو اچانک حکومت نے اعلان کیا کہ ملک میں صرف دو جماعتوں سوشل ڈیموکریٹک اور نیشنل ری پبلکن کنونشن کو کام کرنے کی اجازت ہو گی۔

جنوری 1990ء میں جنرل ابراہیم کے دست راست جنرل بالی نے بطور احتجاج وزارت داخلہ سے استعفیٰ دے دیا جن کا تعلق طاقتور عیسائی فرقے سے تھا۔ اپریل میں عالمی بینک سے 120 ملین کا نیا قرضہ لیے جانے پر طلباء اٹھ کھڑے ہوئے اور صدر کے خلاف بغاوت بھی رونما ہو گئی۔ باغیوں نے لاگوس ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کر لیا مگر بغاوت کو ناکام بنا دیا۔ اپریل 1991ء شمال مشرقی شہر باچی BAUCITI میں مسلم کش فسادات ہوئے، جن کے نتیجے میں ریاستوں کی تعداد بڑھا کر 30 کر دی گئی اور ابوجہ کو دارالحکومت قرار دے دیا گیا۔ 23 جون 1993ء کو فوجی حکومت نے صدارتی انتخابات کرائے جن کے نتیجے میں اپوزیشن رہنما موشود ابیولا MOSSHOOD ABIOLA نے کامیابی حاصل کی، مگر

صدر ابراہیم نے اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر دیا جس پر ملک میں شدید مظاہرے پھوٹ پڑے۔ صدر ابراہیم اپنا عہدہ ارنسٹ شونیکان کے حوالے کر کے رخصت ہوئے جس نے عبوری حکومت قائم کر لی۔ 17 نومبر 1993ء کو وزیر دفاع اور آرمی چیف جنرل سانی اباچا SANI ABACHA نے عبوری حکومت کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا تمام سیاسی ادارے ختم کر دیے گئے اور ملک میں مطلق العنان آمریت قائم ہوئی۔ پھر 1997ء میں انتخابات منعقد کرائے گئے اور 1998ء میں پارلیمنٹ منتخب ہوئی۔ انہیں دنوں میں جنرل اباچا دل کے دورے سے انتقال کر گئے اور صدارتی عہدہ مسلح افواج کے سربراہ، جنرل عبدالسلام ابوبکر نے سنبھال لیا۔

☆

1966ء۔ چین میں احیائے انقلاب کی تحریک یا ثقافتی انقلاب

عظیم ترین قدم:

ماؤزے تنگ چین کا ایک عظیم انقلابی راہنما تھا جس کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ماؤ نے جس منظم طریقے سے اپنے دشمنوں کو ختم کیا اس سے ماؤ جدید تاریخ عالم میں مبینہ طور پر ایسا شخص کہلایا جس نے تاریخ کے کسی اور راہنما کے برعکس زیادہ تعداد میں اپنے ہی آدمیوں کو قتل کرایا۔ ایک اندازے کے مطابق 1955ء میں تقریباً دس لاکھ چینی غداروں، انقلاب دشمنوں اور بورژوا سرمایہ داروں کو کمیونسٹوں نے موت کی گھاٹ اتارا تھا۔ اس طرح پورے سماجی طبقات کا صفایا کر دیا گیا۔ ماؤ کے انتقام کا نشانہ بننے والے افراد کے لئے کسی قسم کے رحم کا مظاہرہ نہ کیا جاتا تھا۔ 1958ء میں جبری صنعت کاری کی روسی اور ہندوستانی مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ماؤ نے اپنا عظیم ترین قدم گریٹ لیپ GREAT LEAP نامی پالیسی جاری کردی۔ نعرہ یہ لگایا گیا کہ چین مغرب کا سہارا لیے بغیر صنعت کاری کر سکتا ہے اور کرے گا۔ چینی زراعت کو بھی اس کے ساتھ زبردستی اجتماعی بنا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ دونوں شعبوں میں تباہ کن نکلا۔ لاکھوں افراد قحط اور بھوک کا شکار ہو کر مر گئے اور چینی معاشی ترقی لڑکھڑا گئی۔

عظیم پرولتاری ثقافتی انقلاب:

ابھی چین سے ماؤ کے عظیم ترین قدم کے منفی اثرات زائل نہیں ہوئے تھے کہ 7 مئی 1966ء کو عظیم پرولتاری ثقافتی انقلاب کا آغاز کر دیا گیا جولائی 1966ء میں ترمیم کر کے آئین میں ماؤ کے اختیارات وسیع کر دیئے گئے۔ ماؤ نے ثقافتی انقلاب کے نام سے دراصل 1949ء کے کمیونسٹ انقلاب کے احیاء کے لئے یہ تحریک چلائی تھی۔ ماؤ کو خطرہ محسوس ہوا تھا کہ جس طرح روس اصل کمیونزم سے انحراف کر چکا ہے اس طرح چین بھی اس کے قائم کردہ خطوط پر چل نکلے گا۔ ادھر ماؤزے تنگ کے جو ساتھی چین کو اس اقتصادی پریشانی سے نکالنے کے خواہاں تھے جو عظیم ترین قدم کے ترقیاتی پروگرام نے پیدا کی تھیں۔ ماؤ ان سے اس لئے خفا تھا کہ انہوں نے اس کے کردار کو فراموش کرنے کی کوشش کی تھی جو چیئرمین ماؤ جیسے خود پرست کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اسی وجہ سے مخالفوں کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے اب ماؤ نے ثقافتی انقلاب کا

سہارا لیا تھا۔ اس مقصد کے لئے طلبا کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں ریڈ گارڈز نامی نیم فوجی تنظیم کے یونٹوں میں منظم کیا گیا۔ ان دستوں کا کام ثقافتی انقلاب کے راستے میں آنے والوں پر حملہ کر دینا تھا۔ ماؤ دراصل خود کو تنقید کرنے والوں اور بڑے پارٹی کارکنوں سے نجات دلانا چاہتا تھا، جس کے بارے میں اسے بدگمانی تھی کہ وہ کمیونسٹ کاز کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اور در پردہ طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کر رہے ہیں۔ عظیم ثقافتی انقلاب کی قیادت تو ماؤ ہی کر رہا تھا، جبکہ اس انقلابی تحریک کی قیادت میں دوسرا نمبر اس کی بیوی جیانگ چنگ کا تھا۔ ثقافتی انقلاب گروپ اگرچہ رسمی طور پر پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی سب کمیٹی تھی، تاہم 1966ء سے 1968ء تک چین کا سب سے بااختیار ادارہ تھا جس کا مقصد سرخ گارڈز کی مدد سے طبقاتی نظام کی قیادت کا خاتمہ تھا اور انقلاب دشمنوں کے خلاف کاروائیاں کرنا تھا۔ اس تحریک کے دوران کمیونسٹ پارٹی کے دوسرے راہنماؤں پر جو ماؤ یا جیانگ کے مخالف سمجھے جاتے تھے، اور ساتھ ہی عام لوگوں پر ظلم وتشدد کی انتہا کر دی گئی۔ جیانگ اور اس کے ساتھیوں کو بلا اجازت اور بلا وارنٹ ہر گھر میں گھسنے اور تلاشی لینے کا اختیار حاصل تھا، جس کے ذریعے وہ انقلاب دشمنوں کی سرگرمیوں سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور پھر ان کی ہر طرح سے بیخ کنی کرتے تھے۔ ثقافتی انقلاب کے نام پر ریڈ گارڈز کو اجازت دی گئی تھی کہ چین کی روایتی اقدار اور تمام غیر انقلابی چیزوں پر بے دریغ حملہ کریں۔ کمیونسٹ پارٹی کے عہدداروں کی وفاداری کا امتحان لینے کے لئے ان پر تشہیری طور پر کڑی تنقید کی جاتی تھی۔ بہت سے عہدے داروں اور چینی راہنماؤں پر نہ صرف زبانی حملے کیے جاتے تھے بلکہ جسمانی تشدد کا بھی نشانہ بنایا جاتا تھا، جس سے بہت سے لوگ ہلاک ہوگئے، بہت سے یونٹوں کا اسلحہ چھین لیا گیا۔ جیانگ نے ماؤ کے جاںنثار حامیوں پر مشتمل گروپ تشکیل دیئے، تاکہ مخالفین کو اقتدار سے باہر کیا جا سکے..........

جیانگ چنگ (تعارف)

چیئرمین ماؤزے تنگ کی بیوی نے 1914ء میں صوبہ شینڈ ینگ میں پیدا ہوئی اس نے کنگڈاؤ سے اداکاری کی تعلیم حاصل کی اور 1933ء میں شنگھائی آ گئی، جہاں اس نے ڈراموں میں حصہ لینا شروع کیا ساتھ ہی کمیونسٹ پارٹی رکنیت بھی حاصل کر لی اور زیر زمین سرگرمیوں میں بھی شرکت کرتی رہی، ان سرگرمیوں کی بنا پر اسے قید بھی کاٹنا پڑی۔ 1935ء میں آرٹ کے نقاد سے شادی کر لی تاہم صرف دو برس بعد علیحدگی ہو گئی۔ اب وہ مکمل طور پر انقلاب سے وابستہ ہوگئی اور وہ ژانگ سی صوبے میں کمیونسٹوں کے مرکز میں کام کرنے لگی، یہیں اس کی ملاقات ماؤ سے ہوگئی، پھر یہ ملاقات شادی میں بدل گئی لیکن ماؤ کی موت کے بعد جیانگ چینگ کو ناجائز اختیارات کے استعمال کی وجہ سے 15 سال قید کاٹنا پڑی۔

..........ماؤ کی چھوٹی سی ریڈ بک یا چیئرمین ماؤزے تنگ کے افکار و اقوال کمیونسٹ عقائد کی بنیاد بن گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چین کے کچھ صوبوں میں انارکی پھیل گئی۔ 1969ء میں ماؤ کو وہاں نظم ونسق بحال کرنے کے

فوج سے کام لینا پڑا۔ ریڈ گارڈز اور فوج کے درمیان ہونے والی جھڑپوں میں ووہان کے مقام پر ایک ہزار سے زائد لوگ مارے گئے۔ پھر فوج کی کمان سے ثقافتی تطہیر کا عمل ختم کر دیا گیا مگر ماؤ پر تنقید کرنے والے مخالفین کا پتہ کاٹنے کے اس عمل نے چین کو بیس سال پیچھے دھکیل دیا۔ ماؤ کے اس اقتدار کا مثبت پہلو صرف ایک تھا کہ اس نے چین کو مغرب کے استحصال سے بچا لیا اور سلامتی کونسل میں مستقل نشست کے ساتھ ایک بڑی طاقت بنا دیا۔ 70ء کے عشروں میں ثقافتی اور تعلیمی اداروں پر جیانگ چنگ (ماؤزے تنگ کی بیوی) اور اس کے ساتھیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ تاہم جیانگ کے سیاسی کیریئر کا خاتمہ ثقافتی انقلاب کے ساتھ ساتھ 1975ء میں ہی ہونے لگا تھا جب اس کا گروپ پارٹی بیوروکریسی کے لئے ایک چیلنج بن کر ابھرنے لگا تھا۔ جہاں تک ثقافتی انقلاب کا تعلق ہے ماؤ اور جیانگ اپنی مخلصانہ کوششوں کے باوجود ایسا کوئی انقلاب حقیقی طور پر نہیں لا سکے مگر افراتفری کی فضا ضرور پیدا ہوئی، اس سے پیدا ہونے والی انارکی نے شہروں میں اقتصادی طور پر زندگی کو مفلوج کر دیا۔ 1968ء میں چین کے صنعتی پیداوار کا گراف 1966ء سے بھی نیچے آ گیا۔ ثقافتی انقلاب کے ابتدا ہی میں بڑے بڑے مرکزی عہدہ داروں کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا گیا تھا ان میں ماؤ کے آئندہ جانشین اور پارٹی سیکرٹری، سیکرٹری ڈینگ ژیاؤ پنگ بھی شامل تھے۔ جنوری 1967ء میں اس تحریک کا رخ مرکز سے صوبوں کی طرف مڑ گیا۔ فروری 1967ء میں پارٹی کے باقی عہدہ داروں نے ثقافتی انقلاب کو روکنے کے لئے آواز اٹھائی جسے ماؤ اور اس کے انقلابیوں نے نظر انداز کر دیا جس سے ثقافتی انقلاب کی تحریک اور تیز تر ہو گئی۔ 1967ء میں وزیر دفاع اور جمہوریہ کے نائب چیئرمین مارشل لن پیاؤ کی وساطت سے فوج کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ریڈ گارڈ کی راہ میں مزاحم نہ ہو اس سے فوج میں مزید گروہ بندی پیدا ہو گئی۔ صورت حال اس وقت مزید بگڑ گئی جب 1967ء کے موسم گرما میں فوج کے ایک کمانڈر پارٹی کے دو راہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ثقافتی انقلاب کا ایک پہلو یہ تھا کہ جن چینی شہریوں کا غیر ملکیوں سے کوئی بھی تعلق تھا انہیں اس تعلق کی پاداش میں سخت سزا بھگتنی پڑی۔

☆

1969ء۔سوڈان میں فوجی انقلاب

25 مئی 1969ء میں کرنل جعفر محمد النمیری نے آٹھ سو فوجیوں کی مدد سے حکومت پر بغیر کسی خون خرابے کے قبضہ کرلیا، کیونکہ ان دنوں سوڈانی فوج کی بڑی تعداد جنوب میں جنگ میں مصروف تھی، انقلاب کے بعد وہ انقلابی کمانڈ کونسل کے سربراہ اور ملک کے صدر بن گئے۔ انہوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد تمام سیاسی جماعتیں توڑ دیں 64 سیاست دانوں اور تمام اعلیٰ فوجی افسروں کو گرفتار کرلیا اور سوڈان کا نام ڈیموکریٹک جمہوریہ سوڈان رکھا اور سوشلزم کے ذریعہ ملک کو ترقی دینے کے عزم کا اظہار کیا۔

سوڈان کی جدید تاریخ:

سوڈان کی جدید تاریخ کا آغاز مصری حکمران محمد علی پاشا کی فتح سوڈان سے ہوتا ہے۔ 1870ء میں سوڈان کا انتہائی جنوبی صوبہ بھی مصر میں شامل کرلیا گیا تھا۔

مہدی سوڈانی:

مصری حکومت کے سوڈان کے باشندوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا جس کا سوڈانیوں میں بڑا شدید ردعمل ہوا۔ 1883ء میں انہوں نے ایک درویش صفت انسان محمد احمد کی راہنمائی میں جو مہدی سوڈانی (1844ء۔1885ء) کے نام سے مشہور ہوا، علم بغاوت بلند کردیا۔ مہدی سوڈانی کے پیروؤں نے جو درویش کہلاتے تھے، دو سال کے اندر اندر تقریباً پورے سوڈان پر قبضہ کرلیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز مصر پر اپنا تسلط قائم کرچکے تھے۔ چنانچہ مصری حکومت نے مہدیوں کی بغاوت کچلنے کے لئے ایک انگریز فوجی جنرل گورڈن کی خدمات حاصل کیں، لیکن جنرل گورڈن کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور جنرل گورڈن مارا گیا۔ 26 جنوری 1885ء کو خرطوم پر درویشوں کا قبضہ ہوگیا۔ مہدی سوڈانی مصر پر حملے کی تیاریاں کررہے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ مہدی سوڈانی تاریخ اسلام کے ایک عظیم شخصیت تھے۔ وہ صرف ایک سیاسی اور عسکری راہنما اور حکومت کے بانی ہی نہ تھے بلکہ ان کے مصلح بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مصر میں ان کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے بھی ہوئی تھی۔ مصر میں جامع ازہر میں تعلیم کے بعد سوڈان واپسی پر انہوں نے تصوف کی منزلیں طے کیں اور شریعت کے احکامات کی سختی سے اتباع کرتے رہے۔ ایک دفعہ سوڈان کے شہر بربر میں اپنے استاد کی طرف سے دی گئی

دعوت میں کھانا انہوں نے اس وجہ نہیں کھایا کہ اس میں ظلم کا شائبہ تھا۔ اس طرح انہوں نے تصوف میں اپنے شیخ سے اس وقت تعلق توڑ دیا جب شیخ نے اپنے بچے کے ختنے کی تقریب میں ناچ گانے کا اہتمام کیا۔ 1880ء میں وہ سلسلہ سمانیہ کے شیخ بنے اور انہوں نے کئی سال دریائے نیل کے ایک جزیرے آبا میں رہائش اختیار کر لی۔ 29 جون 1881ء میں انہوں نے لوگوں کو کتاب وسنت پر عمل کی دعوت کے ساتھ ہی اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اس کے بعد جب ان کی یہ دعوت مقبول ہوئی تو سوڈان کے مصری حکام اور مہدی کے حامیوں میں جھڑپ کا آغاز ہوا جو بالآخر مہدی کی فتح پر ختم ہوا۔ مہدی سوڈانی نے خرطوم پر قبضے کے بعد نیل کے کنارے ام درمان نامی شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے اصلاحات نافذ کرنا شروع کر دیں۔ ان اصلاحات میں ملکی انتظامات کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ان رسوم کو ختم کرنے کی بھی کوششیں کی گئیں جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں۔

خلیفہ اول عبداللہ:

مہدی سوڈانی کی وفات کے بعد ان کا جانشیں خلیفہ اول عبداللہ 1885ء۔1898ء حکومت ذمہ داریاں سنبھالنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر پر درویشوں کا حملہ ناکام ہوگیا اور مصری فوج نے اپنے نئے انگریز جنرل لارڈ کچنر کی قیادت میں 1898ء میں سوڈان پر حملہ کر دیا۔ درویشوں نے اگرچہ بے مثال شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا لیکن وہ جدید اسلحے اور آتشیں ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ خلیفہ عبداللہ نومبر 1899ء میں خود میدان جنگ میں کام آیا اور سوڈان پر مصری اور انگریزی تسلط قائم ہو گیا۔ جنوری 1900ء میں مشہور درویش سپہ سالار عثمان دغنہ جس نے مہدی سوڈانی کے زمانے میں بڑا نام پیدا کیا تھا، گرفتار ہو گیا۔ لارڈ کچنر نے جذبہ انتقام سے مغلوب ہو کر مہدی سوڈانی کی قبر کشائی کروائی اور ہڈیاں نکلوا کر جلا دیں یہ تھا یورپ کی انسانیت نواز تعلیمات کا اثر۔ اسکے بعد 1903ء اور 1908ء میں درویشوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف بغاوتیں کیں لیکن ناکام رہیں۔ انگریزوں نے اپنے عہد میں مہدی سوڈانی اور انکے پیروکاروں کو بدنام کرنے کی ہر ایک سازش کی اور مشہور کیا کہ انہوں نے مہدی منتظر ہونے کا دعویٰ کیا تھا مگر سچائی اس کے برعکس تھی وہ سوڈان میں تحریک بیداری کے پیش رو تھے۔

برطانوی دور انتداب:

لارڈ کچنر اگرچہ مصری فوج کا سردار تھا مگر سوڈان پر مصری قبضہ اصل میں مصری حکومت کو بحال کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ سوڈان پر برطانوی استعماریت کے تسلط کا پیش خیمہ تھا۔ 1899ء میں برطانیہ اور مصر میں ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے سوڈان پر برطانیہ اور مصر دونوں کی بالادستی تسلیم کر لی گئی، لیکن درپردہ سوڈان کے حقیقی حکمران انگریز ہی تھے۔ 1924ء میں سوڈان کے انگریز گورنر جنرل کے قتل کے بعد مصر کا رہا سہا آئینی سہارا بھی ختم کر دیا گیا اور سوڈان کو براہ راست برطانیہ کے زیر انتداب لے لیا گیا۔

برطانوی دور میں آزادی حاصل کرنے سے پہلے سوڈان کے باشندے دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ مصر اور سوڈان کے اتحاد کا حامی تھا اور دوسرا مصر سے مکمل علیحدگی چاہتا تھا۔ پہلے گروہ کو اشقہ پارٹی کی حمایت حاصل تھی اور اس کے راہنما اسماعیل الازہری تھے۔ سوڈان کے ایک بااثر صوفی سلسلے کے راہنما سید سر علی میرغنی بھی اسی گروہ کے ساتھ تھے۔ جبکہ

دوسرا گروہ جو علیحدگی کا حامی تھا اس کے قائد مہدی سوڈانی کے ایک صاحبزادے سر عبدالرحمٰن تھے۔ سوڈانیوں کے اس باہمی اختلاف کی وجہ سے سوڈان اور مصر کے درمیان الحاق کا فیصلہ نہ ہو سکا اور یکم جنوری 1956ء کو برطانیہ نے سوڈان کو آزاد کر دیا۔

آزادی کے بعد:

آزادی حاصل کرنے کے بعد اشقہ پارٹی کے سربراہ اسماعیل الازہری نے پہلی حکومت بنائی جو کچھ عرصہ کے بعد ٹوٹ گئی اور سوڈان میں قوم پرستی کی سب سے بڑی علمبردار امہ پارٹی نے عبداللہ خلیل کی راہنمائی میں حکومت بنائی۔ اب مصر کے ساتھ الحاق کی امید ختم ہو چکی تھی لیکن مصر اب بھی خفیہ طور پر جوڑ توڑ کر رہا تھا۔

انقلاب اول:

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نومبر 1958ء میں سوڈان ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہو گیا جیسے انقلاب اس زمانے میں دیگر اسلامی ممالک میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ سوڈانی فوج کے کمانڈر انچیف نے 17 نومبر کو ملک کی آئینی اور جمہوری حکومت توڑ دی اور فوجی حکومت قائم کر دی۔ پھر کچھ عرصہ بعد جب ملک کے سیاسی راہنماؤں نے ملک میں آئینی حکومت کی بحالی پر زور دیا تو 1961ء میں ملک کے ممتاز سیاسی راہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جنرل ابراہیم عبود کی آمریت اگلے چار سال تک قائم رہی، بالآخر حریت پسند عوامی طاقتوں کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ 15 نومبر 1964ء کو مستعفی ہو گئے اور ملک میں ایک بار پھر جمہوریت بحال کر دی گئی۔ 1965ء میں ایک نئی دستور ساز اسمبلی قائم کی گئی آئین سازی میں سیاسی جماعتوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ آئین اسلامی تعلیمات کا غماز ہو۔

سوشلسٹ انقلاب:

یہ صورت حال ملک کے کمیونسٹ عناصر کے لئے پریشانی کا باعث بنی جو سوڈان کو ایک سیکولر ریاست بنانے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ مئی 1969ء میں فوج کے کمیونسٹ خیال افسروں نے نمیری کی قیادت میں ملک کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سوڈان پر سوشلسٹ آمریت قائم کر دی گئی۔ بیشتر اشتراکی ممالک کی طرح سوڈان میں بھی تمام سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور تمام اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ ام درمان کی اسلامی یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ اخوان المسلمین اور امہ پارٹی کے اسلام پسند راہنماؤں خصوصی طور پر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ جزیرہ آبا پر بھی مہدی سوڈانی کے پیروؤں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اس پر حملہ کیا گیا اس حملے میں امہ پارٹی کے راہنما اور مہدی سوڈانی کے پوتے ہادی المہدی۔ 1915ء۔ 1970ء سرکاری فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ امہ پارٹی کے دوسرے راہنما صادق المہدی کو جو 1966ء۔ 1967ء میں سوڈان کے وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے اور صدیق المہدی کے صاحبزادے ہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ ملک کے بزرگ راہنما اور آزادی کے معمار محمد اسماعیل الازہری کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں پر اسرار طور پر ان کی موت واقع ہو گئی۔

صدر نمیری کا دور صدارت:

اکتوبر 1969ء میں سوڈان کی کابینہ میں تین کمیونسٹ وزیر پہلی مرتبہ شامل کئے گئے جس پر انصار نے احتجاجی مظاہرہ

...مظاہرے کو صدر نمیری نے سختی سے کچل دیا۔ اس میں ایک ہزار انصار مارے گئے لیکن صدر نمیری کو جلد ہی اندازہ ہو
...کمیونسٹوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب انہیں معلوم ہوا کہ کمیونسٹ وزیر سرکاری رازوں سے اپنی پارٹی کو مطلع
کرتے ہیں تو انہوں نے نومبر 1970ء میں ان وزیروں کو برطرف کر دیا۔ یہ بات باعث حیرت تھی کہ سوشلزم کے نام پر

صدر جعفر محمد نمیری

سوڈان کے سوشلسٹ انقلاب کے بانی جعفر محمد نمیری 1932ء میں پیدا ہوئے۔ خرطوم کے فوجی کالج سے تعلیم حاصل کر کے فوج میں ملازمت کی 1953ء میں سوڈان کی آزادی کے لئے انہوں نے ایک خفیہ سوسائٹی بھی قائم کی تھی۔ آزادی کے بعد 1957ء میں انہوں نے پھر یہ سوسائٹی قائم کی مگر گرفتار ہوئے۔ جنوری 1967ء میں ایک ناکام فوجی انقلاب لانے کی کوشش میں گرفتار ہوئے لیکن پھر بحال کر دیئے گئے۔ 1969ء میں ان کی خفیہ تنظیم ایک بار پھر حرکت میں آئی اور انہوں نے انقلاب برپا کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ 1985ء میں خود ان کا تختہ الٹ دیا گیا۔

......کے صرف دو سال بعد 12 فروری 1971ء کو اعلان کیا گیا کہ سوڈان سے کمیونزم کے تمام آثار مٹا دیئے جائیں گے۔ 19 جولائی 1971ء کو روس اور بلغاریہ کی مدد سے سوڈانی فوج کے کمیونسٹ افسروں نے بغاوت کر دی اور انہوں نے صدر نمیری کو گرفتار کر کے میجر ہاشم العطا کی سربراہی میں حکومت قائم کر لی، لیکن یہ باغی حکومت تین دن سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ فوج نے نمیری کا ساتھ دیا اور مصر اور لیبیا سے بھی ان کو مدد ملی۔ مصر نے نہر سویز کے کنارے متعین سوڈانی دستوں کو بھی طیاروں کے ذریعے سوڈان پہنچا دیا۔ انہوں نے 22 جولائی کو نمیری کو قید سے آزاد کرا دیا۔ باغی افسروں کو گولی مار دی گئی اور فوج سے تمام کمیونسٹ افسر نکال دیئے گئے۔

منتخب صدر:

13 ستمبر 1971ء کو ایک استصواب رائے کے بعد جس میں چالیس لاکھ ووٹ نمیری کو ملے انہیں ملک کا منتخب صدر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ملک کی واحد سیاسی پارٹی سوڈانی سوشلسٹ یونین قائم کر لی پھر جنوری 1974ء میں وہ دوسری مرتبہ صدر منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد انقلابی کمانڈ کونسل توڑ دی گئی اور قومی اسمبلی تشکیل دی گئی۔

جنوبی سوڈان کا مسئلہ:

سوڈان کے داخلی مسائل میں سب سے بڑا اور اہم مسئلہ جنوبی سوڈان کا ہے۔ اس خطے میں آبادی کی اکثریت غیر مسلم ہے۔ اگرچہ زیادہ تعداد میں مظاہر پرست آباد ہیں مگر مسیحی اپنی کم تعداد کے باوجود مظاہر پرستوں کی قیادت کرتے ہیں، انکی طرف سے جنوبی سوڈان کو سوڈان سے الگ کرنے اور اس مسئلے کو بین الاقوامی رنگ کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ ماضی میں

یہاں کئی مسلح بغاوتیں بھی رونما ہوئیں۔ نمیری نے اس مسئلے کو طاقت کی بجائے مذاکرات سے حل کرنے کی کوشش کی۔ 1973ء میں اس علاقے کو داخلی خودمختاری دے کر اس مسئلے کو حل کر دیا۔ صدر نمیری نے سوڈان میں بائیں بازو کے کمیونسٹوں کی طاقت کچل دی مگر دائیں بازو کے عناصر کی طاقت توڑنے میں ناکام رہے۔ دائیں بازو کے مخالفین میں سب سے زیادہ طاقت ور انصار تھے جن کو لیبیا کے صدر قذافی کی حمایت حاصل تھی۔ انکے راہنما صادق المہدی کی صدر قذافی سرپرستی کرتے رہے تھے۔ جنوری 1973ء اور پھر جولائی 1976ء میں انصار کی طرف سے نمیری کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی مگر ناکام رہی۔ جولائی 1977ء میں نمیری اور صادق المہدی نے ملاقات کے بعد دونوں فریقوں میں ایک معاہدہ طے پا گیا تھا۔ سوڈان کے صدر جعفر النمیری اپریل 1985ء میں مصر اور امریکہ کے دورے پر تھے کہ انہیں پتہ چلا فوج نے ایک بغاوت کے ذریعے انہیں حکومت سے بے دخل کر دیا ہے۔ نئے صدر سوار الوہاب تھے۔

......☆......

1971ء۔ مشرقی پاکستان کی راکھ سے بنگلہ دیش کا ظہور

اگر حکومت کی تبدیلی انقلابات کہلاتی ہے تو ایک قوم کا دوسری قوم میں بدل جانا اس سے بڑا تغیر ہے اور تغیرات زمانہ ہی تو انقلابات عالم ہیں۔ ایسا ہی ایک انقلابی تغیر 1971ء میں رونما ہوا جس نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں بدل دیا۔

23 مارچ 1940ء قرارداد پاکستان کی منظوری کا دن ہے۔ 23 مارچ 1971ء پاکستان کے دولخت ہونے کا دن بھی قرار پایا۔ یہ عجیب اتفاق ہے اسی تاریخ کو پاکستان کے وجود میں آنے کی قرارداد پاس ہوئی۔ اسی تاریخ کو 1971ء میں شیخ مجیب الرحمن اور پاکستان کی دیگر سیاسی جماعتوں کے درمیان اتفاق رائے نہ ہو سکا اور مذاکرات ناکام ہو گئے۔ یہ مذاکرات کوئی عام مذاکرات نہ تھے بلکہ ان کی ناکامی نے مشرقی پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اسی ناکامی کے بعد شیخ مجیب الرحمن نے مکتی باہنی کے مسلح دستوں کی سلامی لی اور ان کی رہائش گاہ اور ڈھاکہ کی اہم عمارات پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا دیا گیا، جو بنگلہ دیش کی اعلان آزادی کے مترادف تھا۔ آج کا یوم پاکستان جو استقلال پاکستان کے پس منظر میں منایا جاتا ہے ڈھاکہ میں بالکل ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ عوامی لیگ نے اسے یوم مزاحمت کے طور پر منایا۔ عوامی لیگ کے چند کارکنوں نے پاکستان کا قومی پرچم جلا ڈالا۔ قائداعظم کی تصویر پھاڑ ڈالی اور ان کا پتلا بنا کر نذر آتش کر دیا۔ عجیب انقلاب زمانہ تھا مسلم لیگ جس شہر میں تخلیق ہوئی جہاں اس کا پرچم بنا تھا، اس شہر میں اس کا پرچم جلایا جا رہا تھا۔ پاکستان ہونے کی یہ نمائندہ علامتیں ختم کیے جانے کے بعد بنگلہ دیش کا پرچم ہر جگہ لہرانے لگا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ٹیگور کا مشہور نغمہ "سنار بنگلہ" قومی ترانے کے طور پر نشر کیا جانے لگا۔ مجیب الرحمن نجات دہندہ بنگلہ دیش کی تصاویر عوامی مقامات پر جگہ جگہ آویزاں کر دی گئیں سبز اور قرمزی رنگ کا بنگلہ دیشی پرچم لہرا رہے تھے، جبکہ پاکستانی پرچم صرف دو مقامات پر نظر آ رہا تھا، ایک گورنمنٹ ہاؤس اور دوسرا مارشل لا ہیڈکوارٹر کی عمارت پر۔ مگر تنہا تنہا بنگالی نوجوان شہر کی سڑکوں پر "جے بنگلہ" کے نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ وہ واقعی 23 مارچ کو یوم آزادی کے طور پر منا رہے تھے۔

مگر بنگلہ دیش کی آزادی کے طور پر۔

آپریشن سرچ لائٹ:

25 مارچ 1971ء کی شب صدر یحییٰ خان کے حکم پر ملٹری ایکشن ''آپریشن سرچ لائٹ'' کے ذریعے شیخ مجیب الرحمٰن کو ان کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈھاکہ شہر خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ 26 مارچ کی صبح مسٹر بھٹو جو مجیب الرحمٰن کے ساتھ دیگر سیاست دانوں کے ہمراہ مذاکرات کے لئے آئے تھے، واپس کراچی پہنچ گئے۔ ایئرپورٹ پر بھٹو صاحب نے کہا ''خدا کا شکر ہے پاکستان بچ گیا'' مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ گذشتہ رات آپریشن سرچ لائٹ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کیمپس پر حملہ کیا گیا تھا۔ وہاں عینی شاہدوں نے بے شمار لاشے بے گور کفن دیکھے تھے اور بہت سوں کو ایک ہی قبر کی شکل میں کئی انسانوں یا مردوں کی شکل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ ہاں اگر بھٹو صاحب قومی اسمبلی میں عوامی لیگ کی 169 نشستوں کے مقابلے میں اپنی 86 نشستوں کے ساتھ حزب اختلاف کے بنچوں پر بیٹھ جاتے تو شاید پاکستان بچ جاتا۔ اے کاش ایسا ہو جاتا!

عوامی لیگ کے قیام سے بنگلہ دیش تک:

نواب زادہ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد حکومتی پارٹی مسلم لیگ انتشار کا شکار ہو گئی تھی۔ اس سے علیحدگی اختیار کرنے والے سیاستدانوں نے اپنی مختلف سیاسی پارٹیاں بنالیں، ان میں سے ایک عوامی لیگ تھی۔ جسے مشرقی پاکستان کے ممتاز سیاسی راہنما حسین شہید سہروردی نے 1952ء میں قائم کیا تھا۔ 1954ء میں مشرقی پاکستان میں ہونے والے صوبائی انتخابات میں صوبہ کی دوسری سیاسی جماعتوں سے مل کر عوامی لیگ نے مسلم لیگ کے خلاف ''جگتو فرنٹ'' بنایا تھا۔ اس سیاسی محاذ نے مسلم لیگ کو شکست فاش دی۔ 310 نشستوں میں سے مسلم لیگ کو صرف دس نشستیں حاصل ہو سکی تھیں، باقی سب جگتو فرنٹ کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے جس سے عوامی لیگ صوبہ میں ایک بڑی سیاسی جماعت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔

عوامی لیگ اور جگتو فرنٹ کا ایک مطالبہ تھا کہ اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ چنانچہ مئی 1954ء کو بنگالی زبان کو قومی زبان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ حسین شہید سہروردی کے بعد عوامی لیگ کی قیادت شیخ مجیب الرحمٰن کے ہاتھ میں آ گئی، جو نظریات کے لحاظ سے حسین شہید سہروردی سے بالکل مختلف اور کٹر قوم پرست بنگالی تھے۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے خلاف چلائی جانے والی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور علیحدگی پسندانہ رجحانات کی کھل کر حمایت کی۔ صدر ایوب کی آمریت کے زمانہ میں ان رجحانات کو مزید تقویت ملی۔ اسی زمانے میں فروری 1966ء میں شیخ مجیب نے اپنے مشہور زمانہ چھ نکات پیش کئے جو بالآخر ملک کو دولخت کرنے کا باعث بنے۔

دسمبر 1970ء میں جب پاکستان میں پہلے عام انتخابات منعقد ہوئے تو مشرقی پاکستان کی 169 سیٹوں میں سے 167 عوامی لیگ نے جیت لیں۔ انتخابات کے بعد شیخ مجیب نے اپنے 6 نکات کی بنیاد پر پاکستان کا آئین بنانے کا اعلان کیا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد یحییٰ خان نے اس مسئلہ کا حل قومی اسمبلی یا مجلس دستور ساز میں طے کرنے کی بجائے مذاکرات سے طے کرنا چاہا۔

فوجی کارروائی:

پھر جب 23 مارچ 1971ء کو یہ مذاکرات ناکام ہو گئے تو 25 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان میں فوجی [illegible] نافذ کر دی۔ ادھر مجیب الرحمٰن کی ہدایت پر سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریک شروع [illegible] ہونے لگا، جس کی وجہ سے بڑی شدت کے ساتھ فوجی کارروائی شروع کرنا پڑی۔ [illegible] پاکستان کے باشندے بشمول ہندو اور مسلمان لاکھوں کی تعداد میں فرار ہو کر ہندوستان [illegible] بھی جو عام انتخابات میں پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے، ہندوستان پہنچ گئے۔ جہاں انہوں نے [illegible] اپریل 1971ء کو بنگلہ دیش کی آزاد حکومت قائم کر لی۔

مکتی باہنی:

ان بنگالی پناہ گزینوں نے مکتی باہنی یعنی فوج آزادی کے نام سے رضاکار فوجی دستے بھی قائم کیے۔ ان دستوں نے بھارتی حکومت کے تعاون سے مشرقی پاکستان میں تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان حالات میں اسلام پسند جماعتوں نے پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے البدر اور الشمس کے نام سے رضاکار تنظیمیں بنا کر چھاپہ ماروں یعنی مکتی باہنی کے دستوں کا مقابلہ کیا اور حکومت کو صوبہ میں امن و امان قائم کرنے میں مدد دی۔

بھارتی مداخلت:

نومبر 1971ء میں بھارتی فوجوں نے مشرقی پاکستان میں براہ راست مداخلت شروع کر دی اور 3 دسمبر 1971ء کو بھارت اور پاکستان میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ شروع ہونے کے تین دن بعد بھارتی حکومت نے بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ یاد رہے کہ بھارت دنیا میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک تھا۔ مشرقی بازو مغربی حصے سے ایک ہزار میل کی دوری کے سبب اندرونی اور بیرونی محاذ پر بیک وقت زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا اور 17 دسمبر پاکستانی فوج نے بھارتی فوج کے جنرل اروڑا سنگھ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

[illegible] ہونے تک:

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے روداد صدیق سالک صاحب نے اپنی کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" میں بیان کی ہے وہ لکھتے ہیں جب جیسور شہر میں بغاوت کی آگ بھڑکی تو بنگالیوں نے شہر میں موجود تمام غیر بنگالیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ پاکستانی فوج کو یہ بغاوت کچلنے میں تین دن لگے۔ وہاں سے آگے جھینیدا اور بیناپول کو جانے والی سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور مکانات سے فوجیوں پر گولیاں چلائی گئیں۔ چٹاگانگ میں میجر ضیاء الرحمٰن نے ایسٹ بنگال رجمنٹ کے باغیوں کی قیادت کرتے ہوئے غیر بنگالیوں کے لیے شہر کو مذبح خانہ میں تبدیل کر دیا۔ محلوں کو آگ لگا دی گئی، عوامی لیگ کے دفتر میں مردوں اور عورتوں کو بچوں کے ساتھ قتل کرنے کے لے لایا جاتا۔ سرنجوں کے ذریعے زندہ انسانوں کے جسموں سے خون نچوڑ لیا جاتا اور پھر ان زندہ لاشوں کے ٹکڑے کر دیئے جاتے چٹاگانگ میں چند دنوں میں تقریباً بارہ ہزار غیر بنگالی قتل کیے گئے۔ چٹاگانگ میں پاکستانی فوج کا خاصا جانی نقصان ہوا۔ یہاں ایسٹ بنگالی رجمنٹ نے بغاوت

کرکے مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے بیشتر افسروں کو ان کے بیوی بچوں سمیت شہید کر دیا۔ چٹاگانگ میں میجر ضیا الرحمن باغیوں کی قیادت کر رہا تھا۔ یہ انتہائی متعصب بنگالی تھا اس نے بہت سے غیر بنگالیوں کو اصفہان جیوٹ مل میں جمع کر کے قتل کر دیا گیا۔ پاکستانی فوج چٹاگانگ پہنچی تو قتل گاہ کا منظر دیکھا نہ جاتا تھا۔ فرش اور دیواریں انسانی خون سے لت پت تھیں۔ خواتین کے کپڑے اور بچوں کے کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ جودھے پور میں بنگالی بٹالین نے بغاوت کی تو اس میں تمام مغربی پاکستانیوں کو قتل کر دیا، حالانکہ یہ ان کے برس ہا برس کے ساتھی تھے۔ صدیق سالک صاحب لکھتے ہیں" جب ہم چھاؤنی پہنچے تو دیکھا پانچ بچے گندگی کے ڈھیر پر کھڑے تھے اور ان کے پیٹ سنگینوں سے پھاڑ دیئے گئے۔ ان کی مائیں دوسری طرف پڑی تھیں تمام کی نچی ہوئیں۔ فوج کے کواٹروں میں گئے تو دیکھا ایک میجر کے خون آلود کپڑے پڑے تھے دوسرے کواٹر میں ایک ماں مردہ پڑی تھی اور ایک شیر خوار بچہ مردہ ماں کی ایک چھاتی سے دودھ پینے کی کوشش کر رہا تھا جو شاید انجانے میں ظالموں کے ہاتھ سے بچ گیا تھا۔ تیسرے کواٹر میں داخل ہوئے تو ایک چار سالہ بچی چلائی مجھے قتل مت کرو میرے ابو بھی آ رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ ظلم وستم اور تخریب کاری مکتی باہنی نے کی تھی جس کی تربیت اور جنگی کاروائیوں کا اہتمام تمام بھارت کرتا رہا اس میں پاکستانی مسلح افواج کے سابق اور حاضر دونوں قسم کے بنگالی افسر اور جوان شامل تھے۔ اس تنظیم کا ایک حصہ فدائیوں پر مشتمل تھا جسے ہدایت تھی کہ خاص خاص سرکاری حکام اور پاکستان کی وفادار شخصیات کو قتل کرے اور گرفتار ہونے کی بجائے فوراً خودکشی کر لے۔ بہر حال دنیا کے بڑے سے بڑے خونی انقلابوں سے زیادہ بنگلہ دیش کے اس انقلاب آزادی میں انسانی خون بہا اور انسانی لاشوں کی اتنی بہتات ہو گئی کہ مردار خور جانور کھانے سے عاجز آ گئے۔ مقتولوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستانی فوج نے بھی جس انداز میں جوابی کاروائی کی اس سے بھی بہت سی انسانی جانیں تلف ہو گئیں۔

آخری منظر:

13 دسمبر 1971ء کو مشرقی کمانڈ نے جی ایچ کیو کو ایک پریشان کن پیغام بھیجا، پاکستان کی درخواست پر سلامتی کونسل جنگ بندی کے مسئلے پر غور کر رہی تھی۔ بھارت کی سر توڑ کوشش یہ تھی کہ جنگ بندی کی قرارداد پاس ہونے سے پہلے ڈھاکہ پر قابض ہو جائے۔ بھٹو صاحب نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت میں تاخیر کر کے دشمن کی یہ آرزو خدا جانے کیوں پوری کر دی۔ جنرل نیازی کو جنگ بندی ہونے تک جنگ لڑنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جنرل نیازی 6 دسمبر سے ہی جنگ ذہنی طور پر ہار چکا تھا اور گورنر کے سامنے آنسو بہانے سے اس کی بہادری سامنے آ چکی تھی۔ 14 دسمبر کو دشمن کے طیاروں نے گورنر ہاؤس پر راکٹ برسائے اس وقت گورنر صاحب ایک اہم اجلاس کی صدارت کر رہے تھے گورنر اور ان کی کابینہ نے فوراً استعفیٰ دے دیا اور یحییٰ حکومت کے مزید احکامات ماننے کی بجائے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ریڈ کراس کی پناہ میں چلے گئے جو غیر جانب دار علاقہ قرار دیا گیا تھا۔

گورنر صاحب جا چکے تھے، ان کی کابینہ جا چکی تھی، مغربی پاکستان سے ڈھاکہ کا رابطہ کٹ چکا تھا، جی ایچ کیو جنرل نیازی سے لاتعلق اور جنرل نیازی اپنے آپ سے بھی بے نیاز، ڈھاکہ میں کرفیو، روشنیاں گل تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ مشرقی

پاکستان کو مرنے کے لیے کسی تاریک قبر میں اتار دیا گیا تھا، اب صرف فرشتہ موت کی آمد کا انتظار تھا۔ جنرل نیازی نے امریکی کونسل جنرل سے ملاقات کی اور بھارت سے جنگ بندی کی دخواست کی مگر اب جنرل نیازی کے پاس پیش کرنے کے لیے کچھ نہ بچا تھا لہذا اس نے اپنے تمغے ریوالور اور اپنی فوج کے ہتھیار پیش کر کے جنگ بندی قبول کر لی اور 16 دسمبر کو 90 ہزار پاکستانی فوجی جنگی قیدی بن گئے۔ 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ میں مشرقی پاکستان کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور اس کی راکھ سے بنگلہ دیش کے وجود کا ظہور ہوا، جیسے ققنس اپنی ہی راکھ سے جی اٹھتا ہے مگر یاد رہے یہ سب کچھ بھارت کی سازش اور بنگالیوں سے ساز باز کا نتیجہ تھا۔

باضابطہ اعلان آزادی:

محترمہ اندرا گاندھی اس موقع پر بول اٹھی تھیں میں نے دو قومی نظریہ (جو بنیاد پاکستان ہے) خلیج بنگال میں ڈبو دیا ہے جس نظریے کو گاندھی اور نہرو جیسے گھاگ سیاست دان نقصان نہ پہنچا سکے تھے، اندرا گاندھی بالآخر اس کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ 8 جنوری 1972ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کو بھٹو صاحب نے رہا کر دیا اور وہ براستہ لندن ڈھاکہ پہنچا جہاں اس نے 10 جنوری کو بنگلہ دیش کی آزادی کا باضابطہ اعلان کیا۔

12 جنوری 1972ء کو شیخ مجیب بنگلہ دیش کے پہلے وزیر اعظم اور ابو سعید چودھری پہلے صدر بن گئے۔ بھارت جو محسن بنا تھا اس کے ساتھ دوستی اور تعاون کا 25 سالہ معاہدہ طے پا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجیب نے تمام بینک اور پاکستانی صنعتیں قومی تحویل میں لے لیں۔ شیخ مجیب کو بنگلہ بندھو کا خطاب دیا گیا مگر انقلاب آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے والے اس راہنما کو لیلا اقتدار زیادہ عرصہ نصیب نہ ہوئی۔ دسمبر 1974ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے صدارتی نظام نافذ کیا گیا۔ 25 جنوری 1975ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کو ملک کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

انقلاب در انقلاب:

مجیب الرحمٰن نے منصور علی کو وزیر اعظم مقرر کیا، اس کے علاوہ مجیب نے ایک اور نئی سیاسی جماعت بنگلہ دیش کسان مزدور عوامی لیگ بنائی۔ 24 فروری کو بنگلہ دیش ایک یک جماعتی ریاست بن گیا جو مجیب کی آمرانہ روش کی غمازتھی۔ اگرچہ مجیب بابائے قوم کے خطاب سے نواز گیا تھا مگر وہ اندرونی بے چینی اور خلفشار کو ختم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ دوسرے وہ کھلے طور پر بھارت نواز تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس کے خلاف نفرت بڑھنے لگی۔ 15-14 اگست کو جب پاکستان میں 28 یوم آزادی منایا جا رہا تھا، بنگلہ دیش کے چند محب وطن عناصر نے فوج کے ساتھ مل کر مجیب الرحمٰن کے خلاف انقلاب برپا کر دیا، اس فوجی انقلاب میں جو ایک خونی انقلاب تھا شیخ مجیب الرحمٰن منصور علی اور مجیب کے تمام اہل خانہ قتل کر دیئے گئے۔ ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا خوندکر مشتاق احمد نے صدر اور محمد عبد اللہ نائب صدر کے عہدے پر فائزہ ہو گئے، اس کے تین ماہ بعد 3 نومبر کو ایک بھارت نواز فوجی افسر میجر جنرل خالد مشرف ایک اور انقلاب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جس پر صدر خوندکر مستعفی ہو گئے۔ 7 نومبر کو ایک دوسرے فوجی افسر کرنل ابو طاہر نے جنرل مشرف کے چار روزہ دور کا خاتمہ کر دیا اور عبوری صدارتی نظام قائم کر کے چیف جسٹس کو صدر کے عہدے پر فائز کر دیا۔

صدر محمد یحییٰ خاں

آغا محمد یحییٰ خان (1917ء-1980ء) پاکستان کے سابقہ چیف آف سٹاف اور صدر مملکت 1938ء میں تعلیم کے بعد فوج میں کمیشن حاصل کیا، دوسری عالمی جنگ میں خدمات انجام دیں۔ 1945ء میں کوئٹہ میں سٹاف کالج میں انسٹرکٹر مقرر کیے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ستمبر 1965ء میں پاک بھارت جنگ میں نمایاں خدمات انجام دینے پر ہلال جرات ملا۔ ستمبر 1966ء میں جنرل محمد موسیٰ کے بعد کمانڈران چیف مقرر ہوئے۔ صدر ایوب کے مستعفی ہونے کے بعد 1969ء میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جون 1970ء میں ون یونٹ توڑ کر صوبوں کی حیثیت بحال کر دی۔ 7 دسمبر 1970ء کو پاکستان کے پہلے عام انتخابات منعقد کرائے جنہیں غیر ملکی مبصروں نے شفاف کہا، مگر اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل نہ کر سکے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کی بجائے مذاکرات پر زور دیا نتیجتاً مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا اعلان ہو گیا۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد 20 دسمبر 1971ء کو اقتدار جناب بھٹو کو سونپ دیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن

شیخ مجیب الرحمٰن 1922ء-1975ء بنگلہ دیش کے بانی، مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند راہنما۔ اسلامیہ کالج کلکتہ اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ 1939ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور گوپال گنج میں لیگ کی شاخ قائم کی۔ 1946ء میں انتخابات میں قریہ قریہ جا کر مسلم لیگی امیدواروں کے حق میں رائے عامہ ہموار کی۔ قیام پاکستان کے بعد لیگ سے الگ ہو گئے۔ مارچ 1948ء میں بنگلہ زبان کو قومی زبان قرار دینے کی تحریک کی قیادت کی۔ حسین شہید سہروردی نے عوامی لیگ بنائی تو مجیب الرحمٰن اس کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس سال متحدہ محاذ جگتو فرنٹ کے ٹکٹ پر مشرقی پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن منتخب اور 1954ء میں صوبائی کابینہ کے وزیر چنے گئے مگر جلد مستعفی ہو گئے 1955ء میں دستور ساز اسمبلی کے رکن چنے گئے اور پھر وزیر تجارت و محنت رہے۔ 1963ء میں عوامی لیگ کی تنظیم نو کی۔ 1966ء میں عوامی لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ چھ نکاتی پروگرام پیش کرنے پر گرفتار ہوئے۔ اگرتلہ سازش میں بھی گرفتار ہوئے۔ آخری مرتبہ مارچ 71ء میں گرفتار ہوئے اور مقدمہ میں سزائے موت سنائی گئی مگر 72ء میں رہا کر دیئے گئے۔

1971ء یوگنڈا میں صدر ملٹن ابوتے کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا

25 جنوری 1971ء کو یوگنڈا کے صدر ملٹن ابوتے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔
انقلابی فوجی افسروں نے ابوتے کے حامی افسران اور فوجیوں پر اچانک حملہ کر کے انہیں ہلاک کر دیا اور حکومت کا تختہ ... میجر جنرل عیدی امین کی سرکردگی میں کامیاب ہوگئے۔

...یقہ کا موتی:

یوگنڈا افریقہ کا موتی کہلاتا ہے۔ یہاں پتھر کے زمانے سے انسان آباد ہیں۔ پندرہویں صدی میں مسلمان قبائل نے ...نام HEMA اور SIMA تھا۔ یوگنڈا میں بنتو قبائل پر برتری حاصل کی۔ پندرھویں صدی میں بن یورو BUNYORO نامی پہلی سلطنت وجود میں آئی۔ 1939ء میں یوگنڈا میں شاہ سونا دوم SUNA 2 برسر اقتدار آیا۔ ...شاہ کے عہد میں، 1844ء میں ایک عرب قبیلہ یا تجارتی قافلہ یوگنڈا سے گذرا اور شاہ سونا کے دربار میں حاضر ہوئے ...ان کے اسلامی عقائد سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔

...ی قربانی کا رواج:

یوگنڈا ان دنوں متحد نہ تھا بلکہ قبائلی سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا۔ بن یورو، کراگوئے بوسوگا اور تورو سلطنتیں یہاں قائم تھیں۔ ...کے عہد میں جب عرب یہاں پہنچے تو اس دور تک بادشاہ دیوتاؤں کی خوشنودگی کے لئے بڑے پیمانے پر انسانی قربانی ...مذموم رسم پر عمل پیرا تھا۔ عربوں کے کہنے پر شاہ سونا نے یہ ظلم ختم کر دیا۔

1862ء میں انگریز مہم جو جیمز گرانٹ اور جان ہانگ سپیک یہاں پہنچے۔ وہ دریائے نیل کا منبع تلاش کرتے ہوئے ...وکٹوریہ تک پہنچے یوگنڈا آنے والے یہ پہلے یورپی تھے۔ 1864ء میں یہاں جارج گورڈن جو مصری فوج کے کمانڈر ...دوسرے انگریزوں کے ساتھ یہاں پہنچے اس دوران اینگلو امریکن ہنری سٹینلے یوگنڈا کے بادشاہ موتیسا کے دربار میں ...اور اسے عیسائیت کی دعوت دی۔ پھر انیسویں کی صدی کے آخر تک عیسائی مشنریوں کی کوشش سے عیسائیت بحیثیت

مجموعی مسلمانوں پر فتح پاچکی تھی۔.........

صدر عیدی امین

عیدی امین (1925ء۔۔) یوگنڈا کا فوجی افسر اور صدر قصبہ کوبوکو میں پیدا ہوا۔ نوجوانی میں برطانوی فوج میں خدمات انجام دیں اور برما کی مہم میں شمولیت اختیار کی، پھر کینیا میں ماؤ ماؤ حریت پسندوں کے خلاف مہم میں حصہ لیا۔ جنوری 1971ء میں صدر ابوتے کا تختہ الٹ کر صدر بنا۔ اپریل 1979ء میں یوگنڈا کی باغی فوج نے دارالحکومت کمپالا پر قبضہ کر کے حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور عیدی امین کو فرار ہوتے بنی۔ 1974ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان آیا۔

............1888ء میں برطانوی مفادات کی نگرانی کے لئے امپیریل برٹش ایسٹ افریقہ کمپنی وجود میں آئی۔ 1890ء میں یورپی ملکوں نے برسلز میں اینگلو جرمن معاہدہ طے کیا جس کے تحت افریقہ کی یورپی ممالک میں تقسیم عمل میں آئی یوگنڈا اور کینیا پر برطانیہ کا حق تسلیم کیا گیا۔ برطانوی کمپنی نے کمپالا میں برٹش ہیڈ کوارٹر تعمیر کیا۔ 1894ء کے آغاز میں برطانیہ نے یوگنڈا سمیت چار افریقی حکومتوں کو اپنا زیر حفاظت علاقہ قرار دے دیا۔ 19 جون 1894ء کو برطانیہ نے یوگنڈا پر مکمل قبضہ کر دیا۔ اسے شاہی کالونی کا درجہ دے دیا۔ اس کے لئے عیسائی پادریوں نے پہلے ہی حالات سازگار بنا رکھے تھے۔ 1896ء میں ملک کا نام بوگنڈا سے یوگنڈا رکھ دیا۔

شیر خوار بادشاہ:

1897ء میں شاہ موانگا نے برطانیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ چنانچہ انگریزوں نے اسے برطرف کر کے اس کے ایک شیر خوار بچے کو بادشاہ بنا دیا۔ 1900ء میں ایک معاہدے کے تحت انگریزوں نے قبا کا کو خصوصی اہمیت دی اور ایک آئین کے ذریعے اسے سماجی اور سیاسی نظام دیا۔

سیاسی بیداری:

1944ء میں دوسری جنگ کے زمانے میں یوگنڈا کے شاہ موتیسا دوم کی زیر قیادت آزادی پسند تحریکوں نے برطانیہ کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ 1945ء میں زبردست فسادات ہوئے۔ سیاسی بیداری پیدا ہو جانے کی وجہ سے یہاں کی سیاست کا ایک نیا رخ ملا۔ 1953ء میں شاہ موتیسا دوم نے بوگنڈا سلطنت کو یوگنڈا سے الگ کرنے کا مطالبہ کیا تو انگریزوں نے اسے معزول کر کے جلاوطن کر دیا، لیکن اس نے 1955ء میں جلاوطنی سے واپس آ کر تاج و تخت دوبارہ سنبھال لیا۔

یوگنڈا پیپلز کانگرس:

1960ء میں ایک مقامی قوم پرست عیسائی راہنما ملٹن ابوتے نے یوگنڈا پیپلز کانگرس کی بنیاد رکھی۔ برطانیہ سے آزادی کا مطالبہ جاری تھا، چنانچہ 1962ء میں ملک کو داخلی خود مختاری دی گئی [illegible] اکتوبر کو اگلا ملک کے پہلے وزیر اعظم منتخب ہوئے [illegible] سلطنتوں بوگنڈا، بن یورو، تورو اور انکول کو داخلی طور پر بادشاہت کا حق دیا گیا۔ [illegible] 1962ء میں ایک معاہدہ [illegible] اپریل 1962ء کو ملک کے پہلے انتخابات منعقد کیے گئے، جن میں یوگنڈا کانگرس نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ [illegible] ملٹن ابوتے وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ 9 اکتوبر 1962ء کو برطانیہ نے یوگنڈا کو مکمل آزادی دے دی۔

آزادی کے بعد:

موتیسا دوم نے گورنر جنرل اور ملٹن ابوتے نے ملک کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ 9 اکتوبر 1963ء کو دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے یوگنڈا کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ موتیسا دوم کو ملک کا پہلا صدر بنا دیا گیا۔ اگرچہ اختیارات وزیر اعظم کے پاس تھے مگر آئینی سربراہی صدر کے پاس تھی۔ جلد ہی ان دونوں کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے اور سازشوں اور جوڑ توڑ کا بازار گرم ہو گیا، جس سے ملک میں سیاسی بحران بڑھتا چلا گیا۔

صدر موتیسا کی برطرفی:

22 فروری 1966ء کو وزیر اعظم ابوتے نے مکمل اختیارات اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے صدر موتیسا کو برطرف کر دیا۔ 24 فروری کو اس نے آئین معطل کر دیا۔ ملک میں صدارتی نظام رائج کر دیا گیا اور آئینی بادشاہت بھی ختم کر دی گئی۔ اس پر بوگنڈا قبیلے نے بغاوت کر دی۔ اپریل 1966ء میں قومی اسمبلی نے نیا آئین منظور کیا جو عبوری طور پر نافذ کر دیا گیا۔ اس آئین کے تحت ابوتے صدر بن گیا۔ بوگنڈا قبیلے کی بغاوت کے نتیجے میں کباکا کے محل پر حملہ کر کے اسے برطانیہ جلاوطن کر دیا گیا۔ جہاں وہ 1969ء میں انتقال کر گیا۔

نیا جمہوری آئین:

8 ستمبر 1967ء کو قومی اسمبلی نے نیا جمہوری آئین منظور کر کے نافذ کر دیا جس کے تحت ملک سے موروثی بادشاہتوں کو ختم کر دیا گیا اور ملک کو ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ملٹن ابوتے ملک کا منتخب صدر بن گیا۔ اس کے اگلے دور میں ملک میں بدعنوانی اور کرپشن بڑھتی چلی گئی۔ دسمبر 1969ء میں بوگنڈا قبیلے کے لوگوں نے صدر ابوتے کو قتل کرنے کی کوشش کی جس کی ناکامی کے بعد ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی جو اگلے دو سال تک قائم رہی۔

انقلاب کی آمد:

25 جنوری 1971ء کو آرمی چیف میجر جنرل عیدی امین نے صدر ابوتے کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور خود اقتدار پر قابض ہو گیا۔ صدر ابوتے اس وقت سنگاپور کے سرکاری دورے پر تھا۔ 20 فروری کو فضائیہ اور آرمی کے دیگر افسروں نے عیدی امین کو صدر نامزد کر دیا۔ عیدی امین کے عہد میں یوگنڈا اسلامی ممالک کی تنظیم کا رکن بنا۔ صدر نے آئین منسوخ کر دیا

اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی۔ 14 اگست 1972ء کو یوگنڈا اس وقت کی پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا جب صدر عیدی امین نے 60 ہزار ایشیائی باشندوں کو ملک سے نکال دیا اسرائیل سے سفارتی تعلقات ختم کر کے اس کے مشیروں کو ملک سے چلتا کیا۔ برطانوی باشندوں کو بھی ملک بدر کر دیا گیا۔ برطانوی کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا جس سے ملک معاشی بدحالی سے کسی حد تک بچ گیا۔ اسی وجہ سے 1972ء میں برطانیہ نے عیدی امین کا تختہ الٹانے کی سازش کی مگر ناکام رہی۔

صدر عیدی امین کی پاکستان آمد:

1973ء میں عیدی امین نے امریکی سفارت کاروں کو بھی ملک سے نکال دیا۔ 20 فروری 1974ء کو لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لئے صدر عیدی امین پاکستان تشریف لائے اس کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ یوگنڈا میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔

مالی بحران:

برطانیہ اور کئی افریقی ملک عیدی امین کی پالیسیوں سے نالاں تھے۔ 1978ء تک یوگنڈا مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ مالی بحران کو دور کرنے کے لئے امین نے عرب ملکوں سے قرضے حاصل کیے اسی سال تنزانیہ سے تنازعہ پیدا ہو گیا۔ اکتوبر 1978ء میں صدر امین نے تنزانیہ کے صدر جولیس نائرے کی حکومت کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی کی مگر ناکام رہا اس کارروائی کے جواب میں صدر جولیس نائرے نے یوگنڈا میں عیدی امین کے مخالفوں کا اسلحہ فراہم کرنا شروع کر دیا اور جوابی طور پر صدر امین کی حکومت کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

تنزانیہ کی مداخلت:

29 مارچ 1979ء کو صدر نائرے نے یوگنڈا امین مخالف تنظیم ''یوگنڈا نیشنل لبریشن آرمی'' UNLA کی مدد کے لئے تنزانیہ کے 45 ہزار فوجی یوگنڈا میں داخل کر دیئے اس فوج نے ماساکا اور مبارا نامی یوگنڈین شہر برباد کر دیئے اور کمپالا کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دوسری جانب لیبیا کے صدر معمر قذافی نے صدر عیدی امین کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اس سے پہلے کہ قذافی کی فوج امین کا اقتدار بچاتی تنزانیہ نے کمپالا پر قبضہ کر لیا۔ 11 اپریل 1979ء کو باغی صدر عیدی امین کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گئے اور صدر عیدی امین نے تنزانیہ کے صدر کے لئے جو کچھ بویا تھا وہ اسے خود کاٹنا پڑا۔ امین نے پہلے تو شمالی علاقوں کو طرف فرار ہونے کی کوشش کی مگر جب وہاں پناہ نہ ملی تو پہلے لیبیا آ گئے اور پھر سعودی عرب میں پناہ لی۔

ادھر عیسائی فوجوں کا یوگنڈا پر قبضہ ہو گیا صدر نائرے کے ایما پر ایک عیسائی پروفیسر یوسف لیوے نے صدر کا عہدہ سنبھالا یہ صاحب اگرچہ پیدا مسلم گھرانے میں ہوئے تھے مگر عیسائی مشنریوں کے ہتھے چڑھ جانے کی وجہ سے یہ عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ تنزانیہ کی توقعات پر پورے نہ اترے تو گاڈفرے بن عیسیٰ کو صدر بنا دیا گیا۔ 1980ء میں فوجی کمیشن نے ملک میں نئے انتخابات کرائے جن میں سابقہ صدر ملٹن ابوتے دوبارہ صدر منتخب ہو گئے۔ 1981ء میں UNLA نے عیدی امین کے قبیلے کاکوا اور صوبہ نیل کے دیگر مسلم قبائل کے خلاف خون ریز انتقامی کارروائی شروع کر دی۔ 1982ء میں جب تنزانیہ کی افواج واپس چلی گئیں تو حکومت مخالف گوریلا گروپ متحرک ہو گئے۔

ایک اور انقلاب:

UNLA کے گوریلے یوگنڈا کے وسطی علاقے پر ٹوٹ پڑے جہاں بوتے کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے قومی مزاحمتی فوج NRA کی مسلح تحریک ابھری تھی۔ جہاں جدید تاریخ عالم کا بدترین ظلم کیا گیا اور دو سے پانچ لاکھ افراد قتل کر دیئے گئے۔ اوبوتے کی حکومت کے خلاف فوجی اور باغی متحرک ہو گئے 27 جولائی 1985ء کو ایک فوجی انقلاب کے ذریعے اوبوتے کی آئینی حکومت ختم کر دی گئی انقلاب کے راہنما بریگیڈئر جنرل باسلو اوکیلو، اوکیلو، او چیلو قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی قیادت میں فوجی افسروں نے آئین معطل کر کے حکومت سنبھال لی صدر اوبوتے زمبیا فرار ہو گیا۔ تیسرے دن یعنی 29 جولائی کو ایک جوابی انقلاب آیا اور لیفٹننٹ جنرل ٹیٹو اوکیلو لسٹو انے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور صدر کا عہدہ سنبھال لیا لیکن قومی مزاحمتی فوج نے NRA نے اسے ملک کا سربراہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اگلے چھ ماہ میں NRA کے گوریلوں نے جنوبی یوگنڈا میں سرکاری افواج کو تتر بتر کر دیا اور ملک کے بیشتر علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر دیا۔

17 دسمبر 1985ء کو این آر اے کے راہنما یوویری کا گوٹا موسیوینی اور سرکاری افواج کے درمیان ایک سمجھوتا ہوا جو دیرپا ثابت نہ ہو سکا اور جنوری 1986ء میں کمپالا میں خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ 25 جنوری کو سرکاری فوجیں کمپالا سے پسپاہ ہو گئیں اور دارالحکومت پر NRA کا قبضہ ہو گیا۔ 29 جنوری 1986ء کو NRA کے راہنما کا گوٹا نے یوگنڈا کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا اور ملک کی تمام سیاسی جماعتیں کالعدم قرار دے دی گئیں۔

یوگنڈا بادشاہت کی بحالی:

موسیوینی کے صدارتی دور میں ملک میں امن و امان قائم ہوا۔ 1993ء میں بوگنڈا کی قدیم روایتی بادشاہت بحال کر دی گئی اور قدیم روایتی نظام بھی بحال کر دیا گیا۔ رونالڈ مونیڈا موتی بی دوم بوگنڈا کا بادشاہ منتخب ہوا۔ مارچ 1994ء میں پارلیمانی نظام اور پارلیمنٹ بحال کر دی گئیں۔ 18 نومبر 1994ء کو لیٹو موسو نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ 2001ء تک صدارتی انتخابات میں موسینی 70 فی صد ووٹوں سے کامیاب ہو کر تیسری بار ملک کے صدر منتخب ہوئے۔

......☆......

1973ء افغانستان انقلابات قطار اندر قطار

17 جولائی 1973ء کو داؤد کے انقلاب کے ساتھ ہی افغانستان کا وہ آئینی دور ختم ہو گیا جو 1964ء کے آئین کے تحت ظاہر شاہ کے عہد کی آخری دہائی میں شروع ہوا تھا۔ داؤد خاں اس سے قبل ظاہر شاہ کے تحت افغانسان کا وزیر اعظم رہا تھا وہ ظاہر شاہ کا عم زاد تھا۔ 1973ء میں جب ظاہر شاہ علاج کے لیے اٹلی گیا تو اس نے اسکی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انقلاب کا اعلان کر دیا بادشاہت کے نظام کو ختم کر کے ملک میں صدارتی نظام نافذ کیا۔ داؤد خاں افغانستان کا پہلا صدر بن گیا۔ ظاہر شاہ نے بھی فوراً انقلاب کو تسلیم کر لیا اور 14 اگست 1973ء کو روم میں تخت سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔

افغانستان تاریخ جدید کے آئینہ میں:

اٹھارویں صدی سے پیشتر دنیا کے نقشے پر افغانستان کا وجود نہیں تھا۔ اس کا ایک حصہ ایران کے ماتحت تھا دوسرا ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کے تحت تھا اور تیسرے حصے پر بخارا کے خوانین حکمران تھے۔ نادر شاہ نے 1737ء میں افغانوں کو قندھار سے نکال باہر کیا تھا پھر اس نے مشرق کی جانب پیش قدمی تو باقی افغانستان اور نیز مغربی ہند پر بھی قبضہ کر لیا۔

احمد شاہ ابدالی:

احمد شاہ ابدالی ہی آج کے افغانستان کا بانی ہے اس نے نادر شاہ درانی کے قتل کے بعد افغان صوبوں کی عنان اقتدار سنبھالی وہ ابدالی قبیلے کی شاخ سدوزئی سے تعلق رکھتا تھا اس نے اپنے عہد میں ہندوستان پر تقریباً نو حملے کیے وہ نادر شاہ کے ہندوستانی مقبوضات پر اپنا حق تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات پر افغان سلطنت مشرقی ایران پورے افغانستان پورے بلوچستان اور پورے مشرق کی سمت میں کشمیر و پنجاب پر مشتمل تھی۔

احمد شاہ کے جانشیں:

1773ء میں احمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشیں ہوا۔ اس نے دار الحکومت قندھار سے کابل منتقل کر دیا۔ اس کے عہد میں تدریجاً افغانستان میں بھی اختلال پیدا ہو گیا اور وہ ہندوستان کے علاقوں کا نقصان بھی نہ روک سکا۔ تیمور شاہ کے بعد افغانوں میں خاندانی جھگڑوں کا آغاز ہو گیا جو مدتوں جاری رہے۔ پنجاب سکھوں نے مستقل طور پر

افغان حکومت سے چھین لیا۔ بہر حال 1839ء تک ابدالی خاندان کا اقتدار افغانستان سے ختم ہو گیا۔ دوست محمد خان بارک زئی کے کابل پر قابض ہونے کے بعد۔ آخری ابدالی حکمران شاہ شجاع نے انگریزوں کی مدد سے دوبارہ تخت حاصل کر لیا لیکن زیادہ عرصہ تخت پر قابض نہ رہ سکا۔

امیر دوست محمد خاں:

1842ء میں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی اور اس ہنگامے میں شاہ شجاع مارا گیا اور انگریزی فوج کے بھی چار پانچ ہزار سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ ستمبر 1842ء میں انگریزوں نے انتقامی کاروائی کرتے ہوئے کابل کو جلا کر راکھ کر دیا۔

بارک زئی خاندان:

انگریزوں کی کابل سے واپسی کے بعد امیر دوست محمد خان نے بخارا سے واپس آ کر 1843ء میں کابل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ دوست محمد خان بارک زئی خاندان کی حکومت کا بانی تھا اس نے افغانستان پر پہلی مرتبہ 1826ء سے 1839ء تک حکومت کی تھی اس کے بعد وہ 1843ء سے 1863ء تک حکمران رہا اس کے عہد میں پشاور پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ دوست محمد خان اور انگریزوں میں 1853ء میں ایک معاہدہ ہوا جو ایرانیوں کے خلاف تھا۔ یہ معاہدہ پشاور کہلاتا ہے۔ دراصل ایرانی ہرات پر قابض ہو گئے تھے۔ 1863ء میں دست محمد خان نے دس مہینے کے محاصرے کے بعد یہ شہر ایرانیوں سے واپس لیا، مگر اسی دوران امیر دوست محمد خان کی وفات ہو گئی۔

امیر شیر علی خان:

افغانستان میں امیر دوست محمد خان کی وفات کے بعد خانہ جنگی شروع ہو گئی امیر کے تیسرے فرزند شیر علی خان کی حکومت کو برطانیہ نے تسلیم کیا لیکن اسے کئی سال کی جدوجہد کے بعد صحیح معنی میں امارت افغانستان مل سکی۔ اس کی خارجہ پالیسی یہ تھی کہ برطانوی دباؤ میں توازن پیدا کرنے کے لئے روس کی طرف جھکاؤ رکھا جائے۔ اسی وجہ سے برطانوی ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلق میں تناؤ پیدا ہو گیا جو 1878ء۔ 1879ء میں افغانستان کی دوسری جنگ پر ختم ہوا۔

امیر یعقوب خان:

1879ء میں امیر شیر علی خان کا فرزند یعقوب خان تخت نشین ہوا۔ انگریز ملک کے بڑے حصے کو پامال کر چکے تھے لہذا امیر یعقوب خان معاہدہ گندمک قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس معاہدے کی رو سے درہ خیبر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ انگریزوں نے سالانہ ساٹھ ہزار پونڈ امداد دینا قبول کی۔ یہ بھی طے پایا کہ افغانستان کے خارجہ معاملات کا انتظام حکومت برطانیہ کرے گی اس کے علاوہ برطانیہ کو تجارت کی کامل آزادی حاصل ہو گئی۔

امیر عبدالرحمٰن خان:

امیر یعقوب خان 1880ء میں حکومت سے دست برداری اختیار کی اور امیر شیر علی خان کا ایک بھتیجا جو روس چلا گیا تھا اب امیر بنا کر واپس بلا لیا گیا، اسی امیر کے عہد میں ڈیورنڈ لائن قائم کی گئی جو افغانستان روس برطانوی ہند کے درمیان سرحد کے طور پر متعین کر دی گئی۔ اسی امیر کے دور میں روس کے ساتھ بھی سرحد پامیر کے ساتھ متعین کر دی گئی۔ افغانستان کی

ایک تنگ سی پٹی برطانیہ کے مقبوضات اور روس کو الگ کرتی ہے یہ پٹی واخان کہلاتی ہے۔

امیر حبیب اللہ خان:

1901ء۔1999ء عبدالرحمٰن کا فرزند حبیب اللہ خان 1901ء میں امیر افغانستان بنا وہ آہستہ آہستہ حرم اور مذہبی عالموں کے زیر اثر چلا گیا۔ ادھر یورپی خیالات بتدریج پھیلنے لگے۔ برطانیہ نے امیر حبیب اللہ خان کے عہد میں ایک نیا معاہدہ کیا جس سے سابقہ تمام معاہدوں کی تجدید ہوگئی۔ 1907ء میں ایران کے معاملے پر روسیوں اور انگریزوں میں اتحاد ہوگیا۔ روسیوں نے افغانستان میں برطانیہ کی مقتدر ریاست تسلیم کرلی اور وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ آئندہ افغانستان کے معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔

جنگ یورپ اور امیر حبیب اللہ کا قتل:

افغانستان پہلی عالم گیر جنگ میں غیر جانب دار رہا۔ اگرچہ جرمنی اور ترکی نے سفارتی طور پر بڑا زور دیا کہ افغانستان کو مذہبی طور پر ترکی کا ساتھ دینا چاہیے لیکن برطانوی ہندوستان کی حکومت نے امیر افغانستان کو بڑی رقوم دے کر راضی کیا کہ وہ غیر جانب دار رہے۔ 19 فروری 1919ء کو جلال آباد کے قریب امیر حبیب اللہ خان کو قتل کردیا گیا اور قدامت پسند علماء نے اس کے بھائی نصر اللہ خان کے امیر ہونے کا اعلان کردیا۔ اس کے بیٹے امان اللہ خان حاکم کابل نے محض دارالحکومت کو اپنے قبضے میں رکھا بلکہ فوج بھی اس کی حامی رہی اس وجہ سے نصر اللہ خان دست بردار ہوگیا۔

امیر امان اللہ خان (تعارف)

امان اللہ خان شاہ افغانستان (1892ء۔1960ء) اپنے والد امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد 1919ء میں قابل کے تخت پر بیٹھے۔ چند ماہ افغانستان کی تیسری جنگ چھڑ گئی اس جنگ میں برطانیہ کامیاب رہا مگر معاہدہ روالپنڈی میں برطانیہ نے افغانستان کی کامل آزادی کو تسلیم کرلیا۔ اب تک فرمانروا افغانستان امیر کہلائے۔ امان اللہ نے شاہ کا لقب اختیار کیا۔ ایک روشن خیال حکمران ہونے کے ناطے امان اللہ خان نے افغانی عوام میں بہت کم سیاسی شعور ہونے کے باوجود امان اللہ نے ملک میں مغربی طرز کی آئینی بادشاہت قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ 1928ء میں اپنی ملکہ ثریا کے ہمراہ یورپ ہندوستان اور روس کا دورہ کیا۔ وہاں کے سماجی انقلاب سے بہت متاثر ہوئے، واپس آکر افغانستان میں سماجی اصلاحات نافذ کیں اس پر افغانستان کے رجعت پسند حلقے شاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ادھر انگریز بھی ان سے خفا تھے کیونکہ ان پر اثر روس کا زیادہ تھا۔ انگریزوں نے ان کے خلاف بچہ سقہ کو بغاوت پر اکسایا اور اس کی مدد کی۔

امان اللہ خان:

1919ء ۔ 1929ء ۔ امان اللہ کے امیر بننے کے وقت انگریزوں کے خلاف جذبات موجزن تھے۔ ہندوستان
سلسل چار سال تک جنگ لڑ لڑ کے تھک گیا۔ امیر امان اللہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور جہاد کا
کر دیا اور ہندوستان کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن ہندوستان پر
نوں کا یہ حملہ چند ابتدائی کامیابیوں کے بعد ختم ہو گیا کیونکہ خود افغانستان پر بڑے حملوں کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ
فریقوں میں سے کوئی بھی مزید جنگ کے لئے تیار نہ تھا۔ لہذا گفت و شنید شروع ہو گئی اور 8 اگست 1919ء کا ایک
جس کے مطابق پہلی مرتبہ افغانستان کی کامل آزادی کو تسلیم کیا اور وہ خارجہ پالیسی میں بھی آزاد قرار پایا، لیکن برطانیہ
ملنے والی امداد بند کر دی گئی۔

بچہ سقہ (تعارف)

بچہ سقہ، اصل نام میر حبیب اللہ خان تھا کچھ عرصہ افغان فوج میں ملازمت کی بعد ازاں راہزنی شروع کر دی
امان اللہ کے خلاف بغاوت ہوئی تو بچہ سقہ اپنے گینگ کو لے کر کابل پر حملہ آور ہوا اور حکومت پر معمولی کوشش
سے قبضہ کر کے حبیب اللہ خان غازی کے نام سے تخت نشیں ہوا۔ تقریباً آٹھ ماہ حکومت کی نومبر 1929ء میں
نادر خان نے کابل پر چڑھائی کی تو بچہ سقہ فرار ہو گیا لیکن جلد ہی گرفتار کر لیا گیا اسے کابل لا کر سر عام پھانسی دی
گئی۔

بادشاہت اور اصلاحات:

اب تک افغانستان کے حکمران خود امیر کہلاتے آئے تھے۔ 1926ء میں امان اللہ خان نے شاہ کا لقب اختیار کر لیا۔
روشن خیال حکمران تھا، وہ چاہتا تھا کہ افغانستان ترقی کر کے ایک جدید ملک بن جائے اس کے لئے اس نے بہت سی
اصلاحات کیں۔ کابل میں ایک یونیورسٹی قائم کی اور جدید تعلیم کو فروغ دیا۔ زراعت اور صنعت کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ یہ
زمانہ تھا جب ایران میں رضا شاہ اور ترکی میں مصطفیٰ کمال اپنے اپنے ملکوں کو دنیا کی جدید ریاستوں میں بدل رہے تھے۔
ان کی طرز پر چل کر امان اللہ خان نے افغانستان میں جمہوری طور طریقوں کو رائج کرنا چاہا جن کے افغان عوام اپنی کم علمی کی
وجہ سے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اگرچہ امان اللہ خان رضا شاہ اور مصطفیٰ کمال کے مقابلے میں زیادہ اسلام پسند تھے لیکن ان
کے اس طرز عمل کی وجہ سے خصوصاً اپنی ملکہ ثریا کو بے پردہ کرانے کی وجہ سے ملک میں بے چینی پھیل گئی۔ قبائلی ہر طرف سے
ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ انگریزوں نے بھی ان حالات سے فائدہ اٹھاتے
ہوئے باغیوں کی پشت پناہی کی۔

جدید افغانستان میں پہلا انقلاب:

چنانچہ ایک معمولی شخص جو بچہ سقہ کے نام سے مشہور تھا جو درحقیقت ایک راہزن اور ڈاکو تھا۔ مسلح قبائل کی مدد سے کابل پر قبضہ کر لی امان اللہ خان ملک کو خونریزی سے بچانے کے لئے 14 جنوری 1929ء کو تخت سے دستبردار ہو گئے اور افغانستان چھوڑ کر اٹلی چلے گئے وہیں ان کا انتقال 1951ء میں ہوا۔

محمد نادر شاہ:

ان حالات میں تخت افغانستان کے کئی دعوے دار پیدا ہو گئے۔ انہیں میں ایک جنرل محمد نادر خان بارکزئی تھے جو یورپ سے اسی سال واپس آئے تھے۔ انہوں نے فوج جمع کی اور 18 اکتوبر 1929ء کو کابل پر حملہ کر دیا اور قبضہ کرنے کے بعد 19 اکتوبر کو شاہ افغانستان ہونے کا دعوے دار ہوا۔ امیر حبیب اللہ گرفتاری کے بعد مارا گیا اور آہستہ آہستہ تمام دعوے دار مسخر ہوتے چلے گئے۔ بادشاہ کی بھی عام حکمت عملی یہ تھی کہ ملک کو جدید خطوط پر لانے کا کام جاری رکھا جائے مگر اس کے لئے جارحانہ انداز نہ اختیار کیا جائے امیر امان اللہ کی طرح 1923ء کے دستور جیسا ایک دستور نافذ کیا گیا اس میں پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل تھی ایک ایوان کے رکن نامزد کئے جاتے تھے جبکہ دوسرے کے تمام ممبر منتخب کئے جاتے تھے۔

محمد ظاہر شاہ:

جو لوگ محمد نادر شاہ کے ہاتھوں سزا پا چکے تھے ان میں سے ایک ملازم نے 8 نومبر 1933ء کو نادر شاہ کو قتل کر دیا اس واقعہ کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں تھی اس لئے نادر شاہ کا بیٹا محمد ظاہر شاہ ان کے بعد تخت نشیں ہو گیا اس نے اپنے چچاؤں کی مدد سے اپنے باپ کی دانشمندانہ اور پر اعتدال پالیسی جاری رکھی اس کے عہد میں ایک شامی پیر نامی ایک مذہبی راہنما نے 1938ء میں حکومت کے خلاف بغاوت کی اور شکست کے بعد وزیرستان کی طرف بھاگ گیا مگر اسے گرفتار کر کے شام بھیج دیا گیا۔

دستور 1964ء:

اکتوبر 1964ء میں محمد ظاہر شاہ نے ایک نیا دستور نافذ کیا جس کی رو سے افغانستان کی بادشاہت آئینی قرار پائی ملک میں سیاسی جماعتیں وجود پذیر ہوئیں اور انہیں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی گئی۔ 1964ء کے دستور کے تحت 1965ء میں ایوان زیریں کے انتخابات منعقد ہوئے۔ ان کے بعد دوسرے عام انتخابات 1969ء میں منعقد ہوئے۔

داؤد کا انقلاب:

1964ء کے اس آئینی دور کا خاتمہ 1973ء میں داؤد خان کے انقلاب سے ہوا۔ افغانستان ظاہر شاہ کے زمانے سے روس پر انحصار کرتا تھا اب انقلاب کے بعد داؤد خان نے دیگر ممالک سے بھی رابطے استوار کئے۔ 1978ء میں داؤد خان بھارت کے دورے پر گیا تو اس نے بھارت سے درخواست کی کہ وہ افغان فوج کی عسکری تربیت میں مدد کرے اس سے پہلے افغان فوجی افسر تربیت کے لئے روس جایا کرتے تھے۔

دوسرا انقلاب:

داؤد کی قائم کردہ جمہوریت زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکی اور اگست 1977ء میں کابل میں سیاسی قتلوں کا ایک سلسلہ چل نکلا اور سیاسی قتل جس کے بعد داؤد خان کو بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ 17 اپریل 1978ء کو رونما ہوا۔ یہ قتل میر اکبر خیبر کا قتل جو کسی زمانے میں پرچم جریدے کا ایڈیٹر بھی رہ چکا تھا سیاسی جماعتوں نے اکبر خیبر کے جنازے کو احتجاجی مظاہرے کی شکل دے دی اس جنازے میں کم و بیش دس ہزار افراد نے شرکت کی۔ داؤد خان نے اس جنازے کے مظاہرے کے فوری بعد سیاسی راہنماؤں کی گرفتاری کا حکم دے دیا جس پر داؤد خان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا گیا۔ 27 اپریل 1978ء کو داؤد کی جمہوریہ افغانستان مرگئی اس کی جگہ عوامی جمہوری افغانستان PRA نے لے لی قصر صدارت پر بمباری کے دوران داؤد خان ہلاک ہو گیا۔ کرنل عبدالقادر نے جو داؤد خان کے انقلاب میں بھی شریک تھا اعلان کیا کہ آج سے اقتدار عوام کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا ہے اب کاروبار حکومت مسلح فوج کی ایک انقلابی کونسل سرانجام دے گی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی داؤد کی قائم کردہ انقلاب کونسل میں بھی ردوبدل کیا گیا پرانی کونسل میں تمام ارکان فوجی تھے اب 30 غیر فوجی اور 5 فوجی شامل کیے گئے۔ نور محمد ترہ کئی صدر انقلاب کونسل مقرر کیے گئے اس نے پہلا حکم یہ جاری کیا کہ آئندہ نور محمد ترہ کئی صدر مملکت اور وزیر اعظم حکومت افغانستان ہوگا۔ روس نے بلا تاخیر ......

ظاہر شاہ

محمد ظاہر شاہ، محمد نادر شاہ، شاہ افغانستان کے فرزند، بادشاہی کے زمانے میں انتظامی تربیت حاصل کی، فرانس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انفنٹری کالج میں داخلہ لیا۔ نومبر 1933ء میں جب نادر شاہ ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بن گئے تو یہ تخت نشین ہوئے اور اگلے چالیس برس تک افغانستان پر حکمران رہے۔ جدید تاریخ افغانستان میں ظاہر شاہ سب سے طویل عرصہ تک برسر اقتدار رہے۔ انکے عہد میں افغانستان میں تعلیم، زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا اور افغانستان اپنی پسماندگی کے باوجود ایک ترقی پذیر ملک بن گیا۔ ملک میں جدید آئین کے نفاذ کے بعد 1941ء میں ان کے چچا اور چچا کے بیٹے یعنی شاہی خاندان کے لوگ حکومت سے نکال دیئے گئے۔ 1973ء میں ظاہر شاہ اٹلی کے جزیرہ اسچیا میں آنکھوں کے علاج کے لیے مقیم تھا کہ اسے بہنوئی اور چچازاد، داؤد خان نے اس کا تختہ الٹ دیا۔

...... اس انقلابی کونسل کو تسلیم کر لیا 31 مارچ 1979ء کو کونسل نے ایک حکم نامے کے ذریعے کونسل کو قانون سازی کا سرچشمہ قرار دے دیا۔ کرنل عبدالقادر جس نے اس نئے سرخ انقلاب کی خبر ریڈیو کابل سے نشر کی تھی اور جس کے ذہن نے صدر داؤد خان کا زور توڑنے کے لیے صدارتی محل پر بمباری کرائی تھی۔ حکومت کے خلاف سازش کرتا ہوا پکڑا گیا اور اس کے بعد اس سازش کے الزام میں ملوث ہونے کے شبہ میں جن دیگر افراد کو گرفتار کیا گیا ان میں افغانستان کی اہم

شخصیات بھی شامل تھیں۔

چیف آف سٹاف جنرل شاہ پور۔

1- صدر، جمہوریت ہسپتال ڈاکٹر میر علی اکبر۔

2- وزیر منصوبہ بندی سلطان علی کشمند۔

3- وزیر امور عامہ کرنل محمد رفیع۔

4- وزیر سرحدی امور نظام الدین تہذیب۔

5-

صدر داؤد خان

صدر داؤد خان (1908ء-1978ء) شاہ افغانستان ظاہر شاہ کے عم زاد، فرانس میں تعلیم پائی 21 سال کی عمر میں کابل واپس آگئے اور پیادہ فوج کے اسکول میں داخل ہو گئے۔ 1935ء میں ظاہر شاہ کی ہمشیرہ سے شادی ہوئی۔ اسی سال انہیں مشرقی صوبے کا گورنر اور ساتھ ہی جنرل آفیسر کمانڈنگ بنا دیا گیا۔ بعد ازاں وزیر جنگ اور وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔ 1953ء میں وزارت عظمیٰ کا قلم دان سنبھالا اور 1962ء میں مستعفی ہو گئے۔ جولائی 1973ء میں ظاہر شاہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انقلاب برپا کر کے اس کا تختہ الٹ دیا اور بادشاہت ختم کر کے ملک کو جمہوریہ قرار دیا۔ 19 جولائی 1973ء کو جمہوری افغانستان کے پہلے صدر اور وزیر اعظم بنے 27 اپریل 1978ء کے انقلاب میں باغیوں کے صدارتی محل پر بمباری کرنے سے اپنے اہل خانہ جن میں ان کے بھائی داؤد خان کے تین بیٹے ان کی بیویاں پوتوں اور پوتیاں سمیت 30 افراد شامل تھے کے ساتھ گولیوں سے اڑا دیئے گئے۔ ہلاک ہونے کے بعد داؤد کی لاش کو باندھ کر کابل کی سڑکوں پر گھمایا گیا۔

نظام الدین کشمند اور رفیع موت کے گھاٹ اترنے سے بچ گئے لیکن جنرل شاہ پور اس سے قبل گولی کا نشانہ بن گئے۔ تمام لوگوں کی گرفتاری 17 اگست 1978ء کو ہوئی تھی انقلابی عدالت کے روبرو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ سرخ انقلاب کے خلاف بلاشبہ سازش کر رہے تھے اس حلفی بیان پر ان کے دستخط ثبت کرائے گئے اور پھر ان کی تصویریں بھی پریس میں شائع کر دی گئیں ان اعترافات میں جا بجا یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ ہم پرچم پارٹی کے رکن ہیں۔ اور ہم نے طے کیا تھا کہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور ترہ کئی کی بجائے ببرک کارمل کو برسر اقتدار لایا جائے۔ اگرچہ کارمل اس وقت نائب صدر اور نائب وزیر اعظم کے عہدوں پر فائز تھے مگر انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ مراتب زادہ اور نور محمد نور بھی تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد ترہ کئی حکومت نے ان تینوں کو حکم بھیجا کہ ملک واپس آجائیں مگر ان تینوں نے مشرقی یورپ کی راہ سے ماسکو جانا پسند کیا۔

تیسرا انقلاب:

ترہ کئی اور حفیظ اللہ امین کے باہمی اختلافات انقلاب کے تھوڑے عرصہ بعد [illegible]
ت بھی نہ رہ سکی اور ترہ کئی جگہ صدر بننا چاہتے تھے۔ ان محلاتی سازشوں کا نتیجہ [illegible]
وزارت عظمیٰ سے دست کش ہونا پڑا ترہ کئی اس سے پہلے ملک کا صدر بھی تھا اور وزیر اعظم بھی [illegible]
جب ترہ کئی وزارت عظمیٰ چھوڑی تو حفیظ اللہ امین کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ [illegible]
ہوئی اس کے مطابق حفیظ اللہ امین کو حکومت کی تشکیل کا پورا اختیار دے دیا گیا۔ ترہ کئی حکومت [illegible]
یادی تھی اس کا احساس اب افغانستان کے عوام کو بھی ہونے لگا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے [illegible]
ن آیا ہے۔ ترہ کئی حکومت کے خلاف رائے عامہ سے امین نے فائدہ اٹھایا اور 14 اور 15 ستمبر 1979ء [illegible]
حکومت کے خلاف انقلاب بپا کر دیا۔ مورخین کے مطابق وزیر اعظم اور صدر امین [illegible]
اور امین غالب آ گیا اور اس کے حکم سے 18 اکتوبر 1979ء کو ترہ کئی کا گلا دبا کر ہلاک کر دیا گیا [illegible]
مطابق ترہ کئی ایک عرصہ سے شدید مرض کا شکار تھا جس کا دورہ پڑنے کی وجہ سے موت واقع ہوگئی۔ حفیظ اللہ امین [illegible]
جمہوریہ افغانستان کا دوسرا صدر بن گیا۔ ترہ کئی کی مانند اس کا اقتدار بھی طاقت، تشدد اور سازش کا نتیجہ تھا [illegible]
نے ہی اشتراکی ممالک سے اس کے نام تہنیتی پیغام آنا شروع ہو گئے۔ روس نے [illegible] امین حکومت تسلیم کر لی [illegible]
امین کو ورثے میں ایسی پارٹی ملی تھی جو دھڑے بندیوں کا شکار تھی اس میں نظریاتی اختلافات [illegible]
یاں بے شمار تھیں۔ اکتوبر 1979ء میں حفیظ اللہ امین کے خلاف بھی انقلابی کوشش ہوئی مگر کامیاب نہ ہوئی۔

چوتھا انقلاب:

27 دسمبر 1979ء کو حفیظ اللہ امین کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اسی روز ببرک کارمل نے عوامی جمہوریہ افغانستان کے تیسرے
صدر کی حیثیت سے قوم کو ایک نشری خطاب کیا، لیکن اس حقیقت کو بہت سے مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ کارمل نے [illegible]
خطاب 27 دسمبر 1979ء کو کابل ریڈیو سے نہیں کیا تھا روس کی خبر رساں ایجنسی طاس نے 28 دسمبر 1979ء کو خبر دی [illegible]
کی افغان حکومت نے روس سے درخواست کی ہے کہ وہ اسے فوری امداد فراہم کرے [illegible]
بریژنیف نے ببرک کارمل کو پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے اعلیٰ ترین عہدے [illegible] بعض مورخین کے مطابق 23 دسمبر 1979ء [illegible]
روسی فوج افغانستان میں اس چوتھے انقلاب کے فوری بعد بلکہ [illegible] 27 دسمبر 1979ء [illegible]
شروع ہو گئی تھی۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ اور اسٹراٹیجک سٹڈیز نے روسی فوج کے داخلے کی [illegible] مشتمل تھی۔ یہ بات بھی [illegible]
کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی بتایا گیا تھا کہ پہلی فوجی کیمپ پانچ ہزار افراد پر [illegible]
دسمبر کو کابل میں موجود نہیں تھا بلکہ اس کا نشری خطاب ریڈیو تاشقند سے نشر کیا گیا تھا [illegible]
تاشقند ریڈیو سے ببرک کارمل کا خطاب نشر کیا گیا تھا تو کابل ریڈیو سے موسیقی نشر ہو رہی تھی [illegible]
حقائق پر جو کتابچہ شائع کیا تھا اس میں کابل کی 27 دسمبر والی تقریر شامل نہیں اس کی بجائے جو تقریر دی گئی ہے اس کے
نیچے لکھا تھا کہ یہ تقریر 29 دسمبر کو کی گئی تھی۔

روسی مداخلت اوراس کے خلاف مزاحمت:

اواخر دسمبر 1979ء میں روس کی سرخ فوج نے بین الاقوامی قوانین اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے 80 ہزار فوج کے ساتھ جو جدید اسلحے سے لیس تھے افغانستان پر زوردار حملے کی صورت میں افغانستان جیسے غیر جانبدار ملک اور انتہائی پسماندہ ملک پر قبضہ کرلیا۔ 1982ء کے اوائل میں مغربی ذرائع کے مطابق روسی فوج کے [illegible] افغانستان میں موجود تھے ان کا مقابلہ کرنے والے افغانی مجاہدین آزادی کی تعداد روسی فوج سے تین چار گنا زیادہ تھی۔ بظاہر یہ افغان مسئلہ 27 دسمبر 1979ء کو اس وقت شروع ہوا تھا جب سوویت دستے افغانستان میں داخل ہوئے۔ مگر بعض تجزیہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حقیقتاً یہ مسئلہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان صدر داؤد کا تختہ الٹ کر برسراقتدار آئی اور اس انقلاب کو روس نواز ہونے کی وجہ سے سرخ انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس روس نواز انقلاب کو امریکہ نے ناکام بنانے کے لئے اس وقت کوششیں شروع کردی تھیں۔ ادھر پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے امریکہ کی ان کوششوں کی حمایت واعانت شروع کردی۔

خانہ جنگی کی لپیٹ میں:

روسی فوج کی آمد کے بعد افغانستان اپنی تاریخ کی سب سے خوفناک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا۔ روس نے افغان حکومت کی جدید ترین اسلحے اور افواج سے مدد کی اسی دوران 50 لاکھ افغان اپنے گھربار چھوڑ کر پاکستان آگئے اور کچھ ایران چلے گئے تقریباً پندرہ لاکھ جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے۔

اعلان جہاد:

22 اگست 1981ء کو افغان گروہوں نے متحد ہوکر روس کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ روس کھل کر ببرک کارمل کی پشت پر آگیا۔ روس نواز حکومت اور روسیوں کے خلاف نفرت پھیلنے کی وجہ سے شہروں میں مظاہرین پر تشدد میں اضافہ ہوا۔ 1980ء میں ببرک کارمل نے خلق پارٹی کے رکن اسد اللہ سروری کو نائب وزیراعظم کے عہدے سے ہٹا کر پرچم پارٹی کے سلطان علی کشمند کو اس کی جگہ مقرر کیا تو خلق اور پرچم پارٹی میں مخاصمت انتہا کو پہنچ گئی۔ ادھر حکومت میں پرچم پارٹی کو مزید بالادستی حاصل ہوگئی۔ 1985ء میں مجاہدین کو سات بڑی تنظیموں نے متحدہ طور پر سیاسی و عسکری جدوجہد کا فیصلہ کیا۔ 12 اپریل 86ء کو امریکہ نے مجاہدین کو سٹرینگر میزائل دینے کا اعلان کیا یہ کندھے پر رکھ کر چلائے جانے والے میزائل تھے ان میزائلوں نے روسی فضائیہ کو بڑا نقصان پہنچایا۔ اسی ماہ ریڈیو کابل سے اعلان کیا گیا کہ ببرک کارمل بیمار ہے اور ماسکو میں مقیم ہے۔ 4 مئی 1986ء کو حاجی محمد سمکانی کو صدر مقرر کردیا گیا۔ پھر نومبر 1986ء میں ببرک کارمل کو تمام پارٹی اور حکومتی عہدوں سے فارغ کردیا گیا۔ ڈاکٹر محمد نجیب اللہ نے مکمل اختیارات سنبھال لئے۔ فروری 1988ء میں افغان شوریٰ نے ظاہر شاہ سے ملاقات کرکے اسے عبوری حکومت کا سربراہ بننے کی پیشکش کی جو انہوں نے مسترد کردی۔ 23 فروری 1988ء کو احمد شاہ مسعود کو عبوری سربراہ بنانے پر اتفاق ہوگیا اسی دوران جینوا میں افغان جنگ کو ختم کرانے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔

معاہدہ اور روسی فوج کا انخلا:

14 اپریل 1988ء کو جینوا معاہدہ ہوا۔ جس پر امریکہ روس افغانستان اور پاکستان کے وزرائے خارجہ نے دستخط کئے۔
کے بعد افغان مجاہدین اور نجیب حکومت میں جنگ بندی ہو گئی تا ہم نجیب اللہ حالات کو بہتر بنانے میں ناکام ہو گئے اور
علاقوں میں دوبارہ جنگ چھڑ گئی جینوا معاہدے کے تحت افغانستان سے روسی فوجوں کا انخلا شروع ہو گیا جو 15 فروری
میں مکمل ہوا۔

عبوری حکومت کی تشکیل:

27 مئی 1988ء کو ڈاکٹر اسلم شرک وزیر اعظم بنے جو جبکہ 20 فروری کو سلطان علی کشمند کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ ادھر
جماعتی اتحاد کی افغان مجلس شوریٰ نے 23 فروری 1989ء کو راولپنڈی میں عبوری حکومت تشکیل دی جس میں
پروفیسر صبغت اللہ مجددی صدر اور پروفیسر عبدالرسول سیاف وزیر اعظم بنے اس عبوری حکومت کا اجلاس مشرقی افغانستان
خوست میں ہوا۔ مسلم ممالک میں سب سے پہلے اس حکومت کو سعودی عرب اور بحرین نے تسلیم کیا۔

حکومت کے خلاف بغاوت:

روسی فوجوں کی واپسی سے نجیب حکومت کمزور پڑ گئی تھی اور مجاہدین کا اثر ورسوخ بڑھتا جا رہا تھا۔ 8 مارچ 1990ء کو
میں نجیب اللہ کے خلاف ہونے والی ایک فوجی بغاوت ناکام ہو گئی اور بغاوت کا سرغنہ جنرل شاہنواز تنائی نے
میں پناہ لینے کی درخواست کی۔

مجاہدین کی فتح:

31 مارچ 1991ء کو مجاہدین نے خوست پر قبضہ کر لیا۔ 21 مئی کو اقوام متحدہ نے افغانستان میں امن قائم کرنے کے
تجاویز پیش کیں جو مجاہدین کی عبوری حکومت نے مسترد کر دیں جلد ہی اقوام متحدہ نے نجیب اللہ کو استعفیٰ دینے پر رضامند
16 اپریل 1992ء کو ڈاکٹر نجیب نے استعفیٰ دے کر خود کو کابل میں موجود اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا اس کے ساتھ
مجاہدین کے مختلف گروہ کابل میں داخل ہو گئے۔ 25 اپریل کو کابل پر احمد شاہ مسعود اور حکمت یار نے قبضہ کر کے اسلامی
حکومت کی بنیاد رکھی۔ 28 اپریل کو ملک پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد ملک کا نام تبدیل کر کے اسلامی مملکت افغانستان
رکھا گیا۔ مجاہدین نے بالآخر 14 سال جنگ لڑنے کے بعد فتح حاصل کی تھی جو بعد ازاں عارضی ثابت ہوئی۔ پروفیسر صبغت
اللہ مجددی کو افغانستان کا صدر بنا دیا گیا۔

خانہ جنگی کا آغاز:

28 جون 1992ء کو مجددی نے ملک کی صدارت پرامن طور پر جمعیت اسلامی کے راہنما پروفیسر برہان الدین ربانی
کے حوالے کر دی لیکن مختلف قبائل میں اور مجاہدین کے درمیان ایک نئی خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ صدر ربانی حالات کو بہتر
بنانے میں ناکام رہے اور گلبدین حکمت یار اور ربانی کے حامیوں کے درمیان اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ 7 مارچ
1993ء کو اسلام آباد میں افغانستان میں امن قائم کرنے کا معاہدہ کیا گیا جس کے تحت حکمت یار نے وزارت عظمیٰ قبول کر

کے جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ مگر جلد ہی ربانی اور حکمت یار میں دوبارہ شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ خانہ کعبہ میں معاہدہ ہونے کے باوجود افغانی پھر آپس میں لڑنے لگے۔ اس بار ملک آپس کی خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ بین الاقوامی سطح پر بدامنی کو روکنے کے لئے جو کوششیں کی گئیں وہ بے سود ثابت ہوئیں۔ یکم جنوری 1994ء کو صدر ربانی وزیر اعظم حکمت یار اور کمیونسٹ ملیشیا کے راہنما جنرل عبدالرشید دوستم کے درمیان اقتدار کے لئے خونی لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ اسکے نتیجے میں افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی وہ کھنڈرات میں بدل گیا۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ قیدیوں کو بھوکے شیروں کے آگے ڈال دیا جاتا اور نوجوان لڑکیوں کی آبروریزی کر کے خودکشی پر مجبور کر دیا جاتا۔ زخمی بوڑھے اور بچے بھوکے مر رہے تھے اور نام نہاد مجاہدین اقتدار کے لئے ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔

طالبان کا قیام:

اس خانہ جنگی اندر بدامنی سے تنگ آ کر اگست 1994ء میں ملا محمد عمر اخوند نے طالبان کے نام سے ایک فورس منظم کی۔ طالبان دینی مدرسوں اور درس گاہوں کے طلباء پر مشتمل تھے اور ان میں اکثر نے پاکستان سے دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے طالبان نے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں۔ ستمبر 1995ء میں طالبان نے ہرات اور شمال مغربی افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ 26 ستمبر 1996ء کو طالبان نے پیش قدمی کر کے ملک کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سے پہلے جون 1996ء میں حکمت یار نے ربانی سے دوبارہ امن معاہدہ کر کے پھر سے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ 27 ستمبر 1996ء کو طالبان نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ ربانی اور حکمت یار نامعلوم مقام کی طرف فرار ہو گئے۔

طالبان کی حکومت:

طالبان نے ربانی حکومت کو ختم کر کے سابقہ صدر ڈاکٹر نجیب اللہ اور اس کے بھائی کو اقوام متحدہ کے دفتر سے پکڑ کر سر عام پھانسی پر لٹکا دیا۔ طالبان کے ذرائع کے مطابق انہوں نے افغانستان سے تمام خرافات اور خرابیوں کو ختم کر کے اسلامی حکومت قائم کی اور شریعت اسلامیہ بحیثیت آئین و قانون ملک میں نافذ کر دیں۔ تمام افغان قبائل اور مجاہدین نے ملا محمد عمر مجاہد کو اپنا امیر المومنین تسلیم کر لیا۔ قندھاران کا صدر دفتر قرار پایا۔ طالبان کے زیر انتظام افغانستان کو چار انتظامی زونوں شمالی جنوبی مشرقی اور مغربی افغانستان میں تقسیم کیا گیا۔ پاکستان نے اپنے دوستوں یعنی طالبان کی حکومت کو فوری تسلیم کر لیا یہ بات اور کہ یہی وجود دوستاں آج پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لئے کوشاں ہے اور طالبان نہ صرف پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہیں بلکہ انہوں نے وادی سوات پر اپنی عسکریت پسندی سے قبضہ کر لیا تھا۔ 19 مئی 1997ء کو جنرل دوستم کے قریبی ساتھی جنرل عبدالمالک نے اس کے خلاف بغاوت کر کے طالبان کا ساتھ دینے کا اعلان کیا دوستم فضائیہ کے سربراہ جنرل محمد حفیظ اللہ بھی جنرل مالک سے جا ملے۔ 25 مئی کو طالبان نے جنرل دوستم کی حکومت کے دارالحکومت مزار شریف اور فوجی ہیڈ کوارٹرز شبرگان پر قبضہ کر لیا اور جنرل دوستم ترکی فرار ہو گیا۔ 25 اکتوبر 1997ء کو امیر المومنین ملا محمد عمر نے ملک کا نام ایک اور مرتبہ تبدیل کر کے اسلامی امارت افغانستان رکھ دیا۔ 8 اگست 1998ء کو طالبان نے شمالی اتحاد کے اہم مرکز مزار شریف پر مکمل قبضہ کر لیا۔ 13 ستمبر کو ایران نواز حزب وحدت کے مرکز بامیان پر بھی طالبان کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح 80 فی صد افغانستان طالبان کے زیر اقتدار آ گیا جہاں امن و امان قائم ہو گیا اور غیر اسلامی

حرکات پر سخت سے پابندی لگادی گئی۔

نائن الیون کا واقعہ:

10 ستمبر 2001ء کو شمالی اتحاد کے اہم کمانڈر احمد شاہ مسعود بم دھماکے میں مارے گئے۔ 11 ستمبر 2001ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں دہشت گردی کے جو بدترین واقعات پیش آئے امریکہ نے ان کا الزام افغانستان کی طالبان حکومت اور ان کے مہمان سعودی نژاد اسامہ بن لادن پر عائد کر دیا۔ طالبان نے اس الزام کو یکسر مسترد کر دیا۔ اس کے ساتھ امریکہ نے حالت جنگ کا اعلان کر دیا۔ اسامہ بن لادن نے بھی اس امریکی الزام کی تردید کی اور کہا کہ وہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کی تباہی میں ملوث نہیں ہیں۔ یہ بات بعد کے واقعات سے صحیح ثابت ہوئی کیونکہ یہ سب امریکہ کا اپنا کیا دھرا تھا۔

افغانستان پر امریکی حملہ:

اسی دوران امریکہ کے ممکنہ انتقامی حملے کے لئے بھارت ترکمانستان اور ترکی نے اپنے فوجی اڈے امریکہ کو دینے کا اعلان کر دیا اور ہر قسم کی مدد و اعانت کا یقین دلایا۔ امریکہ نے افغانستان کو اسامہ بن لادن کو اس کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا جسے طالبان نے مسترد کر دیا۔ 24 ستمبر 2001ء کو پاکستان نے طالبان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا اور افغانستان سے اپنے سفارتی عملے کو بھی واپس بلا لیا۔ 25 ستمبر کو سعودی عرب نے طالبان سے سفارتی تعلقات توڑ دیئے۔ 28 ستمبر کو امریکہ اور برطانوی کمانڈوز نے افغانستان میں اسامہ کی تلاش کے لئے کاروائیاں شروع کر دیں ادھر امریکہ نے جو ڈیڈ لائن دے رکھی تھی اس کے ختم ہونے کے بعد 17 اکتوبر 2001ء کو امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر دیا اس حملے میں برطانیہ بھی امریکہ کا اتحادی تھا۔ کابل جلال آباد اور قندھار پر اتحادیوں نے میزائلوں کی بارش کر دی اس بمباری سے ہزاروں بے گناہ شہری مارے گئے اور ان کے گھر تباہ ہو گئے۔ اس طرح دہشت گردی کے جواب میں ریاستی دہشت گردی کا آغاز ہو گیا۔

بے پناہ بمباری:

امریکیوں نے جدید ہتھیاروں سے کام لیتے ہوئے بے پناہ بمباری سے افغانستان کو کھنڈرات میں بدل دیا۔ عراق کے بعد یہ امریکہ کی ریاستی دہشت گردی کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسلامی ممالک سمیت ساری دنیا کو نائن الیون کا ڈرامہ کر کے خاموش کر دیا گیا تھا۔ طالبان کے تمام ٹھکانے تباہ کر دیئے گئے۔ اکتوبر کے آخر تک طالبان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ شمالی اتحاد کی فوجیں برہان الدین ربانی، جنرل عبدالرشید دوستم، فہیم قاسم اور یونس قانونی کی قیادت میں کابل میں داخل ہو گئیں۔ طالبان نے کابل خالی کر دیا اس کے ساتھ ہی شمالی اتحاد کی فوج نے ملک میں لوٹ مار شروع کر دیا۔

صدر حامد کرزئی:

برہان الدین ربانی نے دوبارہ ملک کا سربراہ ہونے کا اعلان کر دیا لیکن امریکہ افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت مسلط کرنا چاہتا تھا اس مقصد کے لئے امریکہ نے جرمنی میں افغانستان کے مستقبل کے لئے ایک کانفرنس منعقد کرائی جس

میں تمام افغان گروپ جمہوری حکومت کے قیام کے لئے رضامند ہو گئے۔ چنانچہ ایک پشتون سردار حامد کرزئی کو عبوری حکومت کا سربراہ بنانے پر اتفاق رائے ہو گیا۔ 18 اپریل 2002ء کو سابقہ شاہ محمد ظاہر شاہ 29 سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس پہنچ گئے ان کے تین بیٹے بھی واپس آگئے۔

افغانستان میں طالبان کی شکست:

افغانستان میں طالبان کی شکست کے بعد تواتر سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا طالبان کی شکست اسلام اور اسلام پسندوں کی شکست تھی؟ اس بات کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں محققین کی طالبان کے بارے میں آراء کو دیکھنا ہوگا کہ اسلام کی تعلیمات اور طالبان کے نظریات کس حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں اور تھے۔ خصوصاً پاکستان میں طالبان کی حالیہ کاروائیوں اور سوات پر قبضے سے تو یہ جائزہ لینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم عصر مورخین اور محققین کی طالبان کے بارے میں آراء اور خیالات پیش ہیں۔

اسلامی تعلیمات:

اسلام حصول علم دینی اور دنیاوی ترقی کشادہ دلی تحمل برداشت اور رواداری کی تلقین کرتا ہے اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ آیات قرآنی کے مطابق لکم دینکم ولی الدین کا سلوک اور جبکہ مسلمانوں کے ساتھ لا اکراہ فی الدین (دین میں کوئی جبر نہیں) کا رویہ اپناتا ہے اور طالبان کے نظریات وعقائد کیا ہیں؟ محققین نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

طالبان کے نظریات:

حصول علم کی تلقین کے مطابق فرمان رسول تو دور کی بات ہے انہوں نے تو تعلیمی اداروں کو ہی بند کر دینے کا حکم دیا او رلڑکیوں کے لئے تو تعلیم ان کے ہاں ایک شجر ممنوعہ قرار پائی۔ حال ہی میں پاکستان کے علاقوں میں نسوانی تعلیمی اداروں پر ان کے حملے اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ باوجود شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے دعووں کے خود اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ اسلام نے دیگر فرائض کی طرح حصول علم کو تمام مسلمانوں پر بلا تخصیص مرد و عورت فرض قرار دیا ہے۔

عدم برداشت:

مورخین کے مطابق، طالبان کی عدم برداشت کی پالیسی بھی بالکل واضح ہے۔ جو اسلامی رواداری کی حکمت عملی کے خلاف ہے۔ وہ نہ صرف غیر مسلموں بلکہ طالبان مخالف مسلم فرقوں شیعہ اور بریلوی سنی کے لئے بھی اپنے عقائد پر عمل پیرا رہنا ناممکن بناتے ہیں۔ جن علاقوں میں طالبان کا عمل دخل ہے وہاں بزرگان دین کے مزارات اور زیارت گاہیں بند کر دی گئیں اور ارادت مندوں کا وہاں جانا جرم عظیم بن گیا۔ موسیقی سننا اور دیگر ہلکی پھلکی تفریحات گناہ عظیم بن گئیں جن پر حدود لاگو کر دی گئیں اور سزائیں قید اور کوڑوں کی شکل میں دی جانے لگیں اسلام دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کے احترام کا سبق دیتا ہے۔ صحابہ کرام کے عہد کی مثالیں موجود ہیں۔ یہی سبق دیتی ہے مگر طالبان نے مذاہب عالم کی یادگاروں کی بے حرمتی کا رویہ اختیار کیا اور دنیا کے سب سے پر امن مذہب بدھ مت کے بانی کے ہزاروں سالوں قدیم مجسموں کو مسمار کر دیا۔ کیا

طالبان بھول گئے تھے کہ ان سے پہلے تاریخ اسلام کا مشہور بت شکن محمود غزنوی بھی افغانستان میں ... ان یادگاروں کو نہیں ڈھایا تھا۔ بانی اسلام ﷺ کی تعلیمات کے مطابق جنگ میں بھی بوڑھوں بچوں اور خواتین ... جائز نہیں مگر القاعدہ کی قیادت 1996ء سے علی اعلان یہ کہہ رہی ہے ......

ملا عمر اخوند۔ بانی طالبان

ملا محمد عمر 1959ء میں قندھار کے مقام پر نودی میں پیدا ہوئے۔ ملا کا تعلق غلزئی قبیلے سے ہے۔ افغانستان پر روسی حملے کے دوران ملا صاحب حرکت انقلاب اسلامی نامی ایک تنظیم کی طرف سے روسیوں کے خلاف لڑے تھے اور اس جنگ میں انہوں نے بہت سے روسی ٹینک تباہ کیے تھے۔ 1986ء تا 1989ء کی جنگ جلال آباد میں وہ شدید زخمی ہوئے اور اپنی ایک آنکھ کھو بیٹھے۔ ایک آنکھ سے محروم ہونے کے بعد سے انہوں نے ایک مدرسے سے اسلامی تعلیمات کی تحصیل کی اور قندھار کے نزدیک ایک مدرسے میں ملا کے فرائض انجام دیئے۔ اسی دوران کراچی میں ان کی ملاقات اسامہ بن لادن سے ہوئی۔ 1989ء میں کابل کی کمیونسٹ حکومت کے خاتمے اور روسی فوج کے چلے جانے کے بعد افغانستان شدید خانہ جنگی کا شکار ہو گیا، جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ملا محمد عمر نے اپنے مدرسے کے صرف پچاس طالب علموں کے ساتھ طالبان نامی جہادی تحریک شروع کی۔ قندھار و دیگر افغانی صوبوں پر قبضے کے بعد ان کے ساتھیوں نے انہیں امیر المومنین کا خطاب دیا۔ 1996ء میں کابل پر ان کی تنظیم کا قبضہ ہو گیا اور وہ امیر افغانستان بن گئے۔ مگر افغانستان کا امیر بننے کے بعد بھی وہ بہت کم قندھار سے باہر نکلے۔ اپنی امارت افغانستان کے دوران وہ صرف دو مرتبہ کابل آئے۔ (1996ء تا 2001ء) یوں سیاہ پگڑیوں میں ملبوس طالبان افغانستان میں شریعت اسلام کے نفاذ میں کامیاب ہو گئے مگر بعض معاملات میں ان کی شدت پسندی نے انہیں بے حد نقصان پہنچایا۔ ایسی ہی صورت حال 2001ء میں پیش آئی جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ امریکی حملے کے بعد ملا محمد عمر زیر زمین چلے گئے۔ خیال ہے کہ وہ افغانستان یا پاکستان کے پشتون علاقوں میں کہیں پوشیدہ ہیں۔ امریکہ نے ان کی گرفتاری یا ان کے متعلق خبر دینے والے کو ایک کروڑ ڈالر انعام مقرر کیا مگر تا حال وہ پوشیدہ ہی ہیں اور ان پر انعام بڑھا دیا گیا ہے۔ 2008ء میں وزیرستان کے معاملے میں بھی انہوں نے اہم کردار ادا کیا آج کل طالبان جو شدت پسندانہ کاروائیاں پاکستان میں کر رہے ہیں، لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے پیچھے بھی ملا محمد عمر کا ہاتھ ہے۔ سوات میں شدت پسندانہ کاروائیوں کے نتیجے میں تقریباً 25 لاکھ افراد بے گھر ہو چکے ہیں اس کے علاوہ سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر 2009ء میں لاہور میں حملہ ہوا اور پولیس مرکز لاہور میں حملوں کی ذمہ داریاں بھی طالبان قبول کر چکے۔ مگر مورخین اور وقت اس کا فیصلہ کل کریں گے۔

کر امن کی حالت میں بھی تمام امریکیوں کو مار دیا جائے اگر ان تمام نظریات میں طالبان اسلامی
تعلیمات کا صرف اعتراف بھی کرتے تو ان کی شکست اسلام پسندوں اور اسلام کی شکست ہوتی مگر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ
لوگوں نے یہ بات بھی دہرائی کہ طالبان کی شکست عارضی ہے اور وہ تاریخ کے اوراق میں یقینی فتح کہلائے گی جیسے امام
حسین، ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کی شکستیں ان کی ہمیشہ قائم رہنے والی فتح میں بدل گئی ہیں۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اسلام کے
ان عظیم ہیروز اور طالبان میں کوئی مماثلت پائی جاتی ہے۔ امام ہوں، ٹیپو سلطان ہو، یا نواب سراج الدولہ، ان جیسے پر عزم
لوگوں کے بلند مقاصد کے مقابلے میں آج کے طالبان اور القاعدہ کے نظریات اور ایجنڈا میں کیا فرق ہے؟ طالبان اور
القاعدہ کے انہی نظریات نے غیر مسلم اقوام کی نظر میں دین کو دہشت گردی بنا دیا ہے جبکہ اسلام تو امن کا نام ہے۔ تعلیمی
اداروں کی بندش، تعلیم نسواں پر پابندی، دوسرے فرقوں کے عقائد میں دخل دینا۔ بزرگان دین کے مزارات پر جانے والوں
کو کوڑے مارنا، موسیقی اور اس نوع کی دیگر تفریحات کو شجر ممنوعہ بنا دینا۔ ٹی وی سیٹ رکھنے کو عظیم گناہ جاننا اور کسی شخص کی
داڑھی طالبان کے مقرر کردہ سائز سے کم زیادہ ہو تو اسے سزا دینا، مخالف عقائد کے حامل مسلمانوں کی زندگیاں چین کے
عیسائیوں کی طرح تنگ اور پر عذاب بنا دینا کیا عین اسلام ہے؟ اور امام حسین اور سلطان ٹیپو کے بلند مقاصد سے ملتا ہے۔
دوسرے لفظوں میں اگر طالبان کے سامنے دنیائے اسلام کی ان عظیم شخصیات جیسا کوئی عظیم مقصد ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ
ان کی شکست عارضی ہے اور یہ تاریخ میں فتح کہلائی گی۔ مگر طالبان کے پاس تو صرف ایک ایجنڈا ہے شدت اور انتہا پسندی
کا ایجنڈا، جس میں مخالف عقائد رکھنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو دبانا اور ان پر تشدد روا رکھنا عین اسلام ہے مگر یہ بات
صاحبان عقل و فراست کی تو سرے سے سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے انتہا پسندانہ خیالات ہمیں کسی عظمت سے ہمکنار کر دیں
گے؟ یاد رہے کہ طالبان نے اپنے مخالف فرقوں کے مسلمانوں سے اگر ذرا سی بھی رواداری برتی ہوتی تو افغانستان میں ان
کے اقتدار کے خاتمے پر افغانستان کے مسلمان یوں خوشیاں نہ مناتے جس طرح انہوں نے اب منائی تھیں۔ جنگ میں عام
مسلمانوں کو تو مروا دیا جاتا ہے لیکن ملا عمر کی طرف سے قندھار میں ہتھیار ڈالنے کے بدلے میں اپنے لئے جان بخشی او
محفوظ راہداری کی شرط رکھی جاتی ہے اور عام مسلمانوں کے بیوی اور بچے تک مروا دیئے جاتے ہیں جبکہ ملا عمر کا خاندان دو
گاڑیوں میں سوار ہو کر چمن میں پناہ لیتا ہے تو سوچنا پڑتا ہے کیا یہ اسلام اور کسی عظیم مقصد کے لئے جنگ تھی؟ یہ ہیں ہم عصر
مورخین کے طالبان کے بارے میں خیالات۔ اب آپ ہی بتلائیں کہ ہم بتلائیں کیا۔

محقق لکھتے ہیں کہ اگر طالبان کے پاس کوئی عظیم مقصد ہوتا تو وہ امام حسین اور ٹیپو سلطان کی طرح میدان جنگ میں
جام شہادت نوش کرتے نہ کہ اپنے اور اپنے خاندان کے لئے لینڈ کروزر میں سیٹ ہو کر کسی محفوظ مقام پر چلے جانا پسند کرتے
۔ یاد رہے کہ امام حسین نے اپنے ساتھیوں کے سر کٹانے کے بعد بھی اپنے اور اپنے خاندان کے سرنڈر کے بدلے میں جان
بخشی اور محفوظ راہداری نہیں مانگی تھی یقیناً میدان جنگ میں ہونے والی شکست فتح میں بدل جاتی اگر ملا عمر لینڈ کروزر میں بیٹھ
کر اپنے خاندان کے ساتھ یوں محفوظ مقام پر نہ جاتے۔ مورخین کے مطابق آج شریعت اسلام کے نام پر تشدد اور دہشت
گردی کے عزائم رکھنے والے لوگوں کے لئے یہ سوال لمحہ فکریہ سے کم نہیں؟ یہ ہیں طالبان کے بارے میں محققین کے تجزیات
اور رائے۔ مگر اگر طالبان اپنے رویہ میں رواداری اور انسانی ہمدردی جیسے اسلامی اصول اپنا لیں تو مورخین اور محققین بلکہ ان

کے مخالفین بھی ان کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے کیونکہ وہ فی زمانہ واقعی اسلام کو اس خالص تر شکل میں نافذ کرنے کے عظیم کام کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں جس کے لیے جہاں بہادری اور بے جگری سے اسلام کے نام پر لڑنا نہایت ضروری ہے وہاں اُمت مسلمہ کے دوسرے فرقوں اور گروہوں سے اتحاد بھی اتنا ہی ضروری خیال کیا جاتا ہے تاکہ اسلام ایک متحد دین کی شکل میں آج کی دنیا میں ابھر کر سامنے آ سکے۔

......☆......

1973ء چلی میں مارکسٹ حکومت کے خلاف انقلاب

11 ستمبر چلی میں ملک کے پہلے سوشلسٹ اور مارکسٹ صدر سلوا ایڈورالاندے SALVADOR ALLENDE جو بین الاقوامی شاعر بھی تھے ایک فوجی انقلاب میں ہلاک کر دیئے گئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ انہوں نے خودکشی کی تھی۔ مارکسٹ صدر کی بیوی کا الزام ہے کہ اس انقلاب یا بغاوت کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ تھا۔ چلی کو مارکسٹ شکنجے سے آزاد کرانے کا عہد کرتے ہوئے ملٹری جنتا نے جنرل آگسٹے پنوشے AUGUSTE PINOCHET کی قیادت میں صدارتی محل پر قبضہ کر لیا اور حالت محاصرے کا اعلان کیا۔..........

صدر سلواڈور الاندے

چلی کا پہلا مارکسٹ صدر 26 جولائی 1908ء کو چلی امراء کے ایک خاندان میں پیدا ہوا 1932ء میں اس نے میڈیکل میں چلی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی سے وہ سوشلسٹ خیالات کا حامی تھا۔ 1937ء میں وہ چلی کا وزیر صحت منتخب ہوا۔ 1945ء میں اس نے سینٹ کی نشست جیتی۔ 1952ء میں اس نے پہلی مرتبہ صدارتی انتخابات میں حصہ لیا مگر صدارتی مہم کے لیے کمیونسٹوں سے جو غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھے امداد لینے کے الزام میں کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔ 1970ء میں پہلی مرتبہ صدارتی انتخابات جیت گیا اور 3 نومبر 1970ء سے اس نے چلی معاشرے کی سوشلسٹ خطوط پر تنظیم نو کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں بالآخر 1973ء میں قتل کر دیا گیا۔

..........اگر چہ ابتدائی اطلاعات میں کہا گیا تھا کہ صدر الاندے نے خودکشی کر لی ہے مگر اس کی بیوی نے

بعد ازاں اصرار کیا کہ انہیں قتل کر دیا گیا تھا اس جماعت کے پیچھے امریکیوں کا ہاتھ ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ چونکہ صدر الاندے نے ملک میں موجود بیشتر امریکی کارپوریشنوں پر قبضہ کر لیا تھا جو چلی میں [illegible] رہی تھیں۔

تانبے کی سرزمین:

چلی کو تانبے کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ پرتگالی جہازران فرڈیننڈ میگلن پہلا سفید فام تھا جو 1520ء میں چلی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا سولھویں صدی میں اس سرزمین کے شمالی حصے میں پیرو کے انکا قبائل کا راج تھا۔ دوسرا گروہ جو یہاں آباد تھا وہ سرخ ہندیوں کے آرکانین قبائل ARAUCAON تھے۔ 1533ء میں ہسپانوی جنگ جوؤں نے انکا کو شکست دے کر ان کے سونے چاندی کے ذخائر پر قبضہ کرلیا۔ 1540ء تک مکمل چلی پر سپین کا قبضہ ہوگیا۔

سان تیاگو:

12 فروری 1541ء کو پیدرو ڈی والڈیویا نے اس علاقے میں سان تیاگو شہر کی بنیاد رکھی۔ جسے چھ ماہ بعد سرخ ہندیوں نے برباد کردیا۔ چنانچہ ہسپانویوں نے اسے از سرِنو تعمیر کیا اور کئی اور نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ ہسپانوی نوآبادی بننے کے بعد چلی کو سپین کی بڑی نوآبادی پیرو کا حصہ قرار دیا گیا اور تقریباً تین سو سال یہ ہسپانوی نوآبادی رہا۔

آزادی:

18 ستمبر 1810ء کو مقامی باشندوں سان جوز مارٹن کی قیادت میں اعلان آزادی کیا مگر اصل آزادی 1817ء میں جا کر حاصل ہوئی جس کا باضابطہ اعلان 12 فروری 1818ء کو کیا گیا۔

ملک کا پہلا صدر:

جنرل برنارڈو ہیگنز اس نئی مملکت کا پہلا صدر بنا اس نے ملک کو دو آئین دیئے پہلا 1818ء میں دوسرا 1822ء میں نافذ العمل ہوا۔

خانہ جنگی:

آزادی کے فوراً بعد چلی میں دو سیاسی جماعتیں ابھریں کنزرویٹو اور لبرل پارٹی دونوں کی سیاسی کشمکش نے 1823ء میں خانہ جنگی کی شکل اختیار کرلی۔ 1830ء میں کنزرویٹو باغیوں نے کئی سال خانہ جنگی کے بعد کنٹرول سنبھال لیا یہ پارٹی اگلے تیس سال تک برسر اقتدار رہی۔ 1861ء میں لبرل پارٹی کا دور شروع ہوا 1879ء میں چلی اور بولیویا میں جنگ چھڑ گئی جو 1886ء تک جاری رہی۔

پہلا انقلاب:

چلی کے صدر بالماسیڈا کی حکومت کے خلاف ملک کا پہلا انقلاب برپا ہوا اس صدر کا تعلق لبرل پارٹی سے تھا۔ اس انقلاب کی قیادت ایک بحری افسر کیپٹن جارج مونٹ نے کی لیکن اس انقلاب کے ساتھ ایک بار پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اگست 1891ء میں انقلابیوں نے حکومتی وفادار فوجوں کو شکست دی۔ بالماسیڈا نے خود کو گولی مار کر ہلاک کرلیا۔ اس خانہ

جنگی میں تقریباً دس ہزار افراد ہلاک ہو گئے۔ اب جارج مونٹ نے صدر کا عہدہ سنبھالا اور لبرل پارٹی کا دور ختم ہو گیا۔ خانہ جنگی کے بعد پارلیمنٹ کانگرس کے اختیارات میں اضافہ ہو گیا اور صدر کے اختیارات میں کمی کر دی گئی۔ کانگرس 1925ء تک ملکی سیاست میں ایک مضبوط اور طاقت ور سیاسی ادارہ بنی رہی۔ 1920ء میں لبرل پارٹی کے آرتورو پالما صدر منتخب ہوئے مگر 1924ء میں ملٹری جنتا نے انہیں برطرف کر دیا لیکن 1925ء کے شروع میں نوجوان فوجی افسروں نے میجر کارلوس ابیانز ڈل کیمپو کی قیادت میں ملٹری جنتا کو برطرف کر دیا۔ 20 مارچ 1925ء کو صدر پالما کو واپس بلا کر دوبارہ صدر منتخب کیا گیا۔ ستمبر 1925ء میں ریفرنڈم کے بعد نیا آئین نافذ ہوا اس آئین کے تحت کانگرس کے اختیارات محدود کر کے صدر کے اختیارات وسیع کر دیئے گئے۔ اسی آئین میں یہ بھی طے کیا گیا کہ صدر عوام کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہوگا۔

پہلی آمرانہ حکومت:

بادشاہ گری کرتے کرتے 1927ء میں میجر کارلوس ابیانیز ڈل کیمپو خود صدر منتخب ہو گیا اس نے آمرانہ حکمرانی کا آغاز کیا جس سے عوام اس کے خلاف ہو گئے۔ آخر یونیورسٹیوں کے طلباء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور 1931ء میں ڈل کیمپو کو ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں چلی غیر جانب دار رہا لیکن 1943ء میں اس نے جرمنی اور جاپان سے سفارتی تعلقات توڑ دیئے اور 1944 میں امریکہ کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گیا۔ 1949ء میں چلی میں خواتین کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا۔

نیشنل پارٹی:

1966ء میں سابقہ حریف جماعتوں لبرل اور کنزرویٹو نے نیشنل پارٹی کے نام سے اتحاد کر لیا۔ اکتوبر 1970ء صدارتی انتخابات میں ملک کا بین الاقوامی شاعر سلواڈور آلندے صدر منتخب ہوا۔ یہ سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور ملک کا پہلا مارکسٹ اور سوشلسٹ صدر تھا۔ اس نے ملک کی تمام صنعتیں، تانبے کی کانیں، بینک اور ذرائع مواصلات قومی تحویل میں لے لئے۔ ملک میں مارکسزم اور لینن ازم جاری کر دیا گیا۔ مگر صدر الاندے کی ان پالیسیوں سے ملک میں غربت بڑھی۔ افراط زر جو 1971ء میں 20 فی صد تھا۔ 1973ء میں 350 فی صد ہو گیا۔ چنانچہ ملک میں شدید ہڑتالوں، مظاہروں اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی ماہ کے انتشار اور بے چینی کے بعد 11 ستمبر کو فوجی لیڈروں نے صدر آلاندے کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور چار رکنی انقلابی کونسل یا فوجی جنتا تشکیل دی۔ مسلح افواج کے سربراہ جنرل آگسٹے پنوشے نے اقتدار سنبھال لیا۔ فوجی جنتا نے کانگرس اور آئین کو توڑ دیا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ ان شدید پابندیوں سے فوجی جنتا اور مخالفین میں لڑائی شروع ہو گئی جس میں ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے۔ جنرل پنوشے کے اگلے سولہ سال ملک میں فوجی آمریت قائم رکھی۔ کہیں جا کر دسمبر 1989ء میں ملک کے آئندہ انتخابات ہوئے جن میں جنرل پنوشے کو عوام نے مسترد کر دیا۔........

جنرل آگسٹو پنوشے۔ ایک آمر

جنرل آگسٹو پنوشے، AUGUSTO PINOCHET ستمبر 1973ء سے 10 مارچ 1990ء تک برسر اقتدار رہنے والے اس لاطینی امریکہ کے اس آمر کے عہد میں انسانی حقوق کی تنظیم کی ایک رپورٹ کے مطابق اس فوجی حکمران نے اپنے 22 ہزار سیاسی مخالفین کو قتل کر دیا۔ دیگر فوجی افسروں کی طرح ستمبر 1982ء میں پنوشے نے بھی ملک میں جمہوریت بحال کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اگست 1988ء میں ملٹری جنتا نے ملک میں ایمرجنسی ختم کر دی اور جنرل پنوشے کو دوبارہ صدارتی امیدوار نامزد کیا۔ 5 اکتوبر 1988ء کو جنرل پنوشے نے آئندہ دس سال کے لئے صدر رہنے کے لئے ریفرنڈم کرایا جس میں اسے عوام نے مسترد کر دیا۔

☆

1974ء۔ شہنشاہ ہیل سلاسی کی معزولی

انقلاب انقلاب:

12 ستمبر 1974ء کو شہنشاہ حبشہ (ایتھوپیا) ہیل سلاسی HAILE-SELASSIE کے خلاف انقلاب برپا کر کے مسلح افواج نے اسے معزول کر کے محل سے نکال دیا۔ شہنشاہ ہیل سلاسی نے ایتھوپیا پر 58 سال بڑے طمطراق سے حکومت کی۔ حبشہ میں آنے والے اس انقلاب کا سربراہ جنرل تفیری بانٹی تھا۔ یہ انقلاب کے بعد ملک کا چیف آف دی سٹیٹ بنا۔ شہنشاہ کو معزول اور قید کرنے کے بعد فوج نے آئین معطل کر کے پارلیمنٹ توڑ دی اور شہنشاہیت کے خاتمے کا باضابطہ اعلان کر کے ملک کو سوشلسٹ جمہوریہ قرار دے دیا۔ پارلیمنٹ کی بجائے 120 رکنی عبوری ملٹری انتظامی کونسل نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ معزول کرنے والے فوجی راہنماؤں نے شہنشاہ ہیل سلاسی پر الزام لگایا کہ وہ بدعنوانی اور کرپشن کے ذمہ دار ہیں جس کی وجہ سے ملک میں بدحالی اور غربت پھیل گئی ہے۔

ایتھوپیا افریقہ کا سب سے قدیم ملک اور جدید شہنشاہیت کی بنیاد:

ایتھوپیا افریقہ کا سب سے قدیم اور اس ملک میں براعظم افریقہ سے تعلق رکھنے والی بیس لاکھ سال پہلے کی انسانی باقیات دریافت ہو چکی ہیں۔ ایتھوپیا کا پہلا شہنشاہ مینلک اول MENELIK 1 ایک روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیٹا تھا۔ بعد کے تمام بادشاہ اور حکمران حضرت سلیمان ملکہ سبا کی اولاد ہونے کے دعوے دار رہے ہیں۔ سولہویں صدی کے بعد سے حبشہ چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں میں بٹا ہوا تھا۔ 1855ء میں راس کاسا کے ایک راہزن ڈاکو نے اعلیٰ عیسائی حکام کی مدد سے مختلف حکمرانوں کو اپنا تابع فرمان بنا کر شہنشاہ کا لقب اپنایا اور تھیوڈور دوم اپنا نام رکھ لیا اس طرح اس نے ملک کو متحد کیا اور جدید ایتھوپیا کی بنیاد رکھی اور خود ایتھوپیا کا شہنشاہ بن گیا۔ اسکے شہنشاہ بننے کے بعد اس کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں انہیں فرد کرنے میں انگریزوں نے اس کی مدد کی۔ اکتوبر 1862ء میں اس نے یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ ترکوں کے خلاف ایتھوپیا سے اتحاد کرے۔

برطانوی قونصل کی گرفتاری:

اس کی اس تجویز کا جب انگریزوں نے کوئی جواب نہ دیا تو شہنشاہ نے برطانوی قونصل جنرل، چند دوسرے اعلیٰ افسروں اور یورپی شہریوں کو گرفتار کر کے یرغمال بنا دیا اس پر برطانیہ نے اسے الٹی میٹم بھیجا مگر اس نے نظر انداز کر دیا۔ اس پر

برطانیہ نے سر رابرٹ نیپئر کی قیادت میں ایک مہم اس کے خلاف بھیجی برطانوی فوج نے دارالحکومت مگدالا پر حملہ کر کے اپنے یرغمالی چھڑا لئے ادھر شہنشاہ نے شکست کے بعد خودکشی کر لی۔ اس کے بعد ملک میں افراتفری پھیل گئی اور ٹگرے کا ... شہنشاہ بنا۔ اس دوران اطالویوں نے بحیرہ احمر کی ایک بندرگاہ خرید لی۔ چار سال کی خانہ جنگی کے بعد 1872ء میں صوبہ ٹگرے کا گورنر جوہانس چہارم کے نام سے ایتھوپیا کا شہنشاہ بنا۔ اسی اثناء میں مصر نے بحر قلزم کے ساتھ ساحل پر اس کے ساحلی علاقوں تک قبضہ کر لیا۔ جہاں سے مشرقی افریقہ شروع ہوتا تھا۔

مینلیک دوم:

1882ء میں ایک اور مقامی بادشاہ مینلیک دوم نے جوہانس کو شکست دے کر اسے مجبور کر دیا کہ وہ اسے اپنا جانشین تسلیم کرلے ادھر اطالویوں نے مصوع پر قبضہ کر کے اپنا تسلط بڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اطالوی ایک بہت بڑے علاقے پر قابض ہو گئے۔ جس کا نام انہوں نے اریٹیریا رکھا اسی وجہ سے اطالویوں اور شہنشاہ حبشہ میں جنگ شروع ہو گئی۔ پہلے حبشہ نے یکایک مسوع پر حملہ کر کے اطالویوں کی فوج برباد کر دی اسی موقع پر سوڈان کے مہدی درویشوں نے حبشہ میں مداخلت شروع کر دی اور جوہانس کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور طالوی اس کے ہاتھ سے بچ گئے۔ 1889ء میں شہنشاہ سوڈانیوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا اور مینلیک دوم شہنشاہ بنا۔ چنانچہ منالک کو شہنشاہ بننے میں اطالویوں نے مدد کی تھی اس وجہ سے نئے شہنشاہ نے اطالویوں سے دوستی اور تعاون کا معاہدہ کر لیا اور کچھ علاقے بھی انہیں دے دیئے۔ اطالوی اس خیال میں تھے کہ اس طرح اس علاقے میں ان کی سیادت قائم ہو جائے گی۔ معاہدے کے باوجود اٹلی نے تمام ایتھوپیا پر اپنے حق کا دعویٰ کر دیا، نتیجہ جنگ کی صورت میں نکلا اور 1895ء میں ایتھوپیا اور اٹلی میں ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ یکم مارچ 1896ء کو اطالویوں کو عدوا کے مقام پر فیصلہ کن شکست ہوئی اور انہیں ایتھوپیا کی آزادی تسلیم کرنا پڑی۔ اس کے بعد مینلک نے چھوٹی بادشاہتوں پر کنٹرول کر کے شہنشاہیت کا اتحاد دوبارہ قائم کیا اور ملک کی موجودہ سرحدیں ترتیب دیں۔ ایتھوپیا اور فرانس میں صلح ہو گئی۔..........

مینلیک دوم اور عدلیس ابابا

مینلیک دوم MENELIC II (1844ء۔1913ء) ایتھوپیا کا شہنشاہ۔ نوآبادیاتی حملہ آوروں کے خلاف افریقی راہنماؤں میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔ 1865ء میں شیوا کا اور 1889ء میں ایتھوپیا کا بادشاہ بنا۔ شہنشاہ بننے کے بعد اس نے جنوبی ایتھوپیا کے بہت سے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ نیز غیر ملکی حملوں کا دفاع کرنے کے لئے اپنی فوج کو جدید اسلحے سے لیس کیا۔ 1896ء میں اس نے عدوا کی جنگ میں اٹلی کو فیصلہ کن شکست دی جس کی وجہ سے ایتھوپیا یورپی نوآبادی بننے سے محفوظ ہو گیا۔ عدلیس ابابا کی بنیاد بھی اسی بادشاہ نے رکھی تھی، یہ شہر ملک کا دارالحکومت قرار پایا اور ملک کا ایک بڑا صنعتی مرکز بن گیا۔

شہنشاہ ہیل سلاسی (1911ء-1975)

ہیل سلاسی ایتھوپیا کے سابق بادشاہ ہعاری کا کین کا بیٹا اور شاہ مینلک دوم کا بھتیجا تھا۔ یہ خاندان بھی اپنے آپ کو حضرت سلیمان کی اولاد سے بتاتا ہے۔ 1928ء میں شہنشاہیت کے اختیارات اس کے ہاتھ میں آ گئے مگر شہنشاہیت کا اعلان 1930ء میں ہوا۔ اس نے ایتھوپیا پر اطالوی حریت کے خلاف لیگ آف نیشن میں آواز اٹھائی اور 1941ء میں ملک آزاد ہوگیا۔ اتنے عرصے میں وہ لندن میں مقیم رہا۔ 1962ء میں اریٹیریا کو صوبہ کی حیثیت دی۔ اریٹیریا کے علیحدگی پسندوں نے خانہ جنگی شروع کر دی۔ ہیل سلاسی کے پاس ایک نامہ رسول ﷺ محفوظ تھا۔ جو جدید زمانے میں ایک اعزاز ہے۔

انگریزوں نے صومالی ساحل کے ساتھ جو صومالی لینڈ قائم کر رکھا تھا۔ انہوں نے بھی خاصا علاقہ چھوڑ دیا۔ 1906ء میں برطانیہ فرانس اور اٹلی نے ایتھوپیا کی آزادی کے عہد نامے پر دستخط کیے۔ 1907 میں مینلیک دوم پر فالج کا حملہ ہوا اور اس نے اپنے پوتے لیج ایاسو LIJ IYSU کو جس کی عمر صرف بارہ سال تھی اپنا جانشین بنا دیا۔ 1911ء میں اس کے پوتے کی بادشاہی کا اعلان ہوا لیج ایاسو اسلام سے بڑی رغبت اور دلچسپی رکھتا تھا اس لئے اس نے 1916ء میں اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور جیما JIMA میں مسلم حکمران کی بیٹی سے شادی کر لی اور اسلامی رسومات بھی اپنا لیں اور خلافت عثمان کی سیادت قبول کرنے کا اعلان کیا ساتھ ہی شریف کا لقب اختیار کر لیا۔ ایاسو نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی رعایا کو دعوت جہاد دی۔ کیونکہ وہ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کا حامی تھا ان حالات میں یورپی طاقتوں نے اس کے مسیحی خاندان کو اس کے خلاف ابھارا۔ مقامی امراء نے ملک میں بد امنی پیدا کر دی وہ کہتے تھے کہ لیج ایاسو جرمنوں کا آلہ کار ہے۔ آخر 1960ء میں اسے معزول کر کے مینیلک دوم کی ایک بیٹی زودیتو ZAUDITO فروری 1970ء کو تخت نشین ہوئی۔ اس نے اپنے ایک عزیز راس طوفاری کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ یہ راس طوفاری شہنشاہ ہیل سلاسی بنا۔

شہنشاہ ہیل سلاسی:

ستمبر 1928ء میں راس طوفاری شہنشاہ نامزد کر دیا گیا 2 اپریل 1930ء کو ملکہ زودیتو کا انتقال ہوگیا۔ 3 اپریل کو راس طوفاری نے شہنشاہیت کے تمام اختیارات سنبھال لیے۔ 2 نومبر 1930ء کو عدیس ابابا راس طوفاری کی رسم تاج پوشی سر انجام پائی۔ رسم تاج پوشی کے موقع پر راس طوفاری نے شہنشاہ ہیل سلاسی کا لقب اختیار کیا جس کے معنی تثلیث کی قوت کے تھے۔ 16 جولائی 1931ء کو ہیل سلاسی نے ملک کو پہلا آئین عطا کیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے بیٹے شہزادہ اسفا ووسن سلاسی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

غلامی کا خاتمہ:

17 اپریل 1932ء کو سلاسی نے ملک میں غلامی کا خاتمہ کر دیا شہنشاہ بننے کے بعد اس کے خلاف جا بجا بغاوتیں

ہو گئی۔ نئے آئین کے تحت اس نے ملک میں پارلیمنٹ قائم کی، جس کے ارکان کا انتخاب ... کرتی تھی۔
1934ء میں اٹلی کی فوجوں سے ایک مقام پر جھڑپ ہو گئی۔ اٹلی میں اس وقت فاشسٹ (مسولینی کی) حکومت ...
اس جھڑپ کے بعد اٹلی نے مشرقی افریقہ میں زیادہ سے زیادہ فوج اکٹھی کر لی اور 3 اکتوبر 1935ء کو بغیر کسی اعلان جنگ
کے ایتھوپیا پر حملہ کر دیا۔ لیگ آف دی نیشن نے اٹلی کو جابر اور جارحیت کا مرتکب قرار دیا اور اس کے خلاف پابندیاں بھی
عائد کیں، مگر اٹلی ان پابندیوں کو خاطر میں نہ لایا۔ ایتھوپیا نے اٹلی کے خلاف سات ماہ مزاحمت کی اور وہ جدید ہتھیاروں کا
مقابلہ نہ کر سکا۔ 5 مئی 1936ء کو اٹلی نے دارالحکومت ادیس ابابا پر قبضہ کر لیا اور اسی روز ... اٹلی نے ایتھوپیا
کو اپنی بادشاہت کا حصہ قرار دے دیا۔ ہیل سلاسی فرار ہو کر برطانیہ چلا گیا۔ اطالوی فوجوں نے اہل حبشہ پر وحشیانہ مظالم
توڑے اور لوٹ مار کی۔

ابی سینیا سے ایتھوپیا:

1937ء میں ملک کا نام بدل کر ایتھوپیا رکھا گیا۔ دوسری جنگ عظیم میں اٹلی کو افریقی محاذ پر بھی شکست ہوئی تو 1941ء میں برطانوی فوج نے ایتھوپیا کو آزاد کرا دیا۔ 5 مئی کو ہیل سلاسی نے وطن واپس آ کر تاج و تخت دوبارہ سنبھال لیا۔ ستمبر 1952ء میں اقوام متحدہ نے اریٹیریا کو ایتھوپیا کا حصہ تسلیم کر لیا۔ نومبر 1955ء میں ہیل سلاسی نے ملک میں نیا آئین نافذ کیا جس کے تحت اسے لامحدود اختیارات حاصل ہو گئے۔ 1957ء میں ملک کے پہلے انتخابات منعقد ہوئے۔

ناکام انقلاب:

دسمبر 1960ء میں شاہی گارڈز نے شہنشاہ کا تختہ الٹانے کی ناکام کوشش کی۔ اس ناکام بغاوت کے بعد شہنشاہ نے ملک میں اقتصادی ترقی اور سماجی اصلاحات کی حکومتی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ 1961ء میں سلاسی نے جارحیت سے کام لیتے ہوئے اریٹیریا کو ایتھوپیا کا حصہ بنا دیا۔ اس الحاق کے خلاف اریٹیریا کے حریت پسندوں نے آزادی کے لئے مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ 25 مئی 1963ء کو عدیس ابابا میں افریقی اتحاد کی تنظیم وجود میں آئی۔ 1964ء میں صومالیہ کے ساتھ شدید سرحدی تنازعہ کھڑا ہوا، جس کے نتیجے میں دونوں ممالک میں جنگ چھڑ گئی۔ 1955ء میں سوڈان سے کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ایتھوپیا نے الزام لگایا تھا کہ سوڈان اریٹیریا کی علیحدگی پسندوں کی مدد کر رہا تھا۔ دسمبر 1970ء میں حکومت نے اریٹیریا کے مختلف علاقوں کا محاصرہ کر لیا، مگر علیحدگی پسند تحریک دبائی نہ جا سکی۔ ان تنازعوں کی وجہ سے حکومت نے داخلی مسائل کی طرف توجہ نہ دی جس سے ملک میں سیاسی بے چینی نے جنم لیا۔ انہیں دنوں ایک بڑے قحط کی لپیٹ میں آ گیا اور تقریباً ایک لاکھ افراد فاقہ زدگی سے ہلاک ہو گئے۔ 1973ء میں شہنشاہ ہیل سلاسی نے بیماری کے باوجود اپنے اختیارات اپنے ولی عہد شہزادے کو دینے سے انکار کر دیا۔ فروری اور مئی 1974ء میں ملک میں شدید ہنگامے پھوٹ پڑے۔ طلباء اور فوج بھی حکومت کے خلاف مظاہروں میں شامل ہو گئے بالآخر 12 ستمبر 1974ء کو مسلح افواج نے حکومت کے خلاف انقلاب برپا کر دیا۔ انقلاب کے بعد 21 مارچ 1975ء کو ایتھوپیا کو سوشلسٹ جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ 27 اگست 1975ء کو شہنشاہ ہیل سلاسی کا تراسی سال کی عمر میں جیل میں انتقال ہو گیا۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ شاہ کو جیل میں گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ یکم اکتوبر 1975ء کو ملک میں مارشل لا نافذ کیا گیا۔ 3 فروری 1977ء کو جنرل تفری بانٹی کو اس کے قریبی ساتھیوں نے

ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد کرنل منگیستو ماریام MENGISTU MARIAM انقلابی کونسل کا سربراہ مقرر ہوا۔ کرنل منگیستو نے کونسل کے کئی اعلیٰ عہدہ داروں کا قتل کروا دیا۔ 1976ء سے 1978ء تک حکومت نے ریڈ ٹرر RED TERROR نام سے اپنے مخالفوں کو کچلنے کا پروگرام جاری رکھا جس کے دوران تقریباً ایک لاکھ لوگ یا تو لاپتہ ہو گئے یا قتل کر دیے گئے۔ 10 ستمبر 1984ء کو ایتھوپیا کمیونسٹ سٹیٹ قرار پایا ملک میں ایک ہی سیاسی جماعت ورکرز پارٹی آف ایتھوپیا رہ گئی اور کرنل مینگستو کو اس کا سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔ 1987ء میں ایک اور نیا آئین نافذ کیا گیا اسی کے تحت قائم ہونے والی نئی اسمبلی نے کرنل مینگستو کو ملک کا پہلا صدر منتخب کر لیا۔ 1988ء میں شہنشاہ ہیل سلاسی کے بیٹے اسفا سلاسی نے برطانیہ میں ایتھوپیا کی جلاوطن حکومت قائم کی اور شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔

ناکام بغاوت، کامیاب انقلاب:

16 مئی 1989ء کو ملک میں ایک ناکام فوجی بغاوت ہوئی جس میں آرمی چیف آف سٹاف اور فضائیہ کے کمانڈر ہلاک ہو گئے 27 مئی 1990ء کو حکومت نے بغاوت کے الزام میں گرفتار شدہ 12 جرنیلوں کو سزائے موت دی۔ 1990ء ہی میں دو اتحادی باغی تنظیموں ایتھوپین عوامی انقلابی محاذ اور اریٹرین پیپلز فرنٹ لبریشن نے ملک کے شمالی صوبوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ فروری 1991ء میں باغیوں نے حکومت کے ٹھکانوں پر حملہ کیا۔ مئی میں اریٹرن لبرشن فرنٹ نے عدیس ابابا پر قبضہ کر لیا۔ 21 مئی 1991ء ایتھوپیا کے آمر مطلق کرنل مینگستو کا تختہ الٹ دیا گیا۔ مینگستو زمبابوے فرار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جمہوری محاذ کے دستے دارالحکومت میں داخل ہو گئے اور ایتھوپیا میں کمیونسٹ آمریت کا محل زمین بوس کر دیا گیا۔

یہودیوں کی جلاوطنی:

باغی فوجوں کے عدیس ابابا داخل ہوتے ہی 14 ہزار ایتھوپین یہودی (فالاشاس) ہوائی جہازوں کے ذریعے اسرائیل روانہ ہو گئے۔ 28 مئی 1991ء کو جمہوری محاذ نے عبوری حکومت قائم کر دی۔ فرنٹ لیڈر میلس زیناوی MELES ZENAWI اس حکومت کے صدر مقرر ہوئے۔ اریٹریا کے علیحدگی پسندوں کو بھی نمائندگی دی گئی۔ 6 جون 1991ء کو تمیارات لائنی ITAMERAT LAYNE ایتھوپیا کے وزیر اعظم بنے۔ 21 جولائی میلیس زیناوی ملک کے صدر منتخب ہوئے۔

اریٹریا کا اعلان آزادی:

24 مئی 1993ء کو عوامی ریفرنڈم کے بعد اریٹریا کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا ایتھوپیا نے فوری طور پر نئی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ 5 جون 1994ء کو انتخابات منعقد ہوئے جن میں جمہوری محاذ نے 547 میں سے 404 نشستیں حاصل کیں۔ 8 دسمبر 1994ء کو ملک میں ایک اور نیا آئین نافذ کیا گیا اس کے تحت ملک کو نو ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسکے علاوہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے الزام میں صدر مینگستو اور ان کے ساتھیوں کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ 1994ء میں ملک میں حکومت کا وفاقی نظام متعارف کرایا گیا۔ اگست 1991ء میں ملکی تاریخ کے پہلے پارلیمانی الیکشن منعقد ہوئے جن میں

جمہوری محاذ نے ایک بار پھر کامیابی حاصل کی۔ 22 اگست کو نئی پارلیمنٹ میں نگاسو گڈاڈا کو نیا صدر منتخب کر لیا اور صدر میلس زیناوی نے وزارت عظمیٰ سنبھال لی۔ مارچ 1997ء میں اسفا سلاسی 81 سال کی عمر میں امریکہ میں انتقال کر گئے جس کے ساتھ ہی حبشہ کی بادشاہت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔

......☆......

1979ء اسلامی انقلاب ایران

16 جنوری 1979ء کو شاہ ایران اپنے 37 سالہ دور اقتدار کے بعد اجنبیوں کی طرح اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے مدتوں سے سلگنے والی انقلابی آگ اندر ہی اندر لاوے کی طرح پگھلتی رہی۔ آج اسی آگ کی تیز آنچ نے شاہ کو قوم سے الوداعی خطاب کرنے پر مجبور کر دیا۔ شاہ کی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے بھر آئیں جب دو شاہی گارڈ ان کے جوتے چومنے کے لئے جھکے۔ اگرچہ شاہ نے اپنی اس روانگی کو ایک دورہ کا نام دیا مگر تاریخ شاہد ہے کہ انہیں پھر سرزمین ایران پر واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

پانچ بڑے بحران:

ایران بیسویں صدی میں پانچ بڑے بحرانوں سے گزرا۔ یہ پانچ بحران ہی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے ان بحرانوں نے ایران کی جدید تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ پہلا بحران جو آئینی انقلاب بھی کہلاتا ہے 1906 سے لے کر 1911ء تک رہا علماء اور دانشوروں نے مل جل کر بادشاہ سے آئینی حقوق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کی جو رائیگاں گئی البتہ شاہ اپنی بادشاہت بچانے میں کامیاب رہا۔

دوسرا بحران اس وقت پیش آیا جب پہلی جنگ عظیم میں ایران پر ترکی اور برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ ایران کے بادشاہ کو برطرف کر دیا گیا۔ 1921ء میں ایران کے فوجی سربراہ رضا خان نے رضا شاہ کا لقب اختیار کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا او رپہلوی خاندان کی بنیاد رکھی۔

تیسرا بحران دوسری جنگ عظیم کے وقت پیش آیا جب اتحادیوں نے روس کو کمک پہنچانے کے لئے ایران کا راستہ منتخب کیا۔ رضا شاہ کی مخالفت پر ایران پر امریکہ اور برطانیہ نے قبضہ کر لیا اور رضا شاہ کو جلاوطن کر دیا۔ اسکے بیٹے محمد رضا شاہ کو تخت نشیں کر دیا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر امریکہ اور برطانیہ نے اپنی فوجیں ایران سے ہٹا لیں مگر اس کے ایک ہی سال بعد ایک اور بحران نے سر اٹھایا۔ دوسری جنگ عظیم میں ایران کے بعض شمالی حصوں پر روس نے قبضہ کر لیا اور تیل کے حقوق حاصل کرنا چاہے۔ برطانیہ نے بھی تیل کے کنوؤں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ایرانی قوم میں اس کے خلاف جذبات پروان چڑھے انہوں نے تیل کی قومی ملکیت میں لینے کی تحریک چلائی اس تحریک سربراہ ڈاکٹر محمد مصدق تھے ڈاکٹر مصدق بعد ازاں وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہو گئے اور انہوں نے تیل کے کنویں قومی ملکیت میں لے لئے اس پر بیرونی قوتوں

اقتدار آیا اور 1953ء میں امریکی سی آئی اے نے ان کا تختہ الٹ دیا۔ شاہ ایران جو اس سے پہلے ایران سے فرار ہو چکا تھا واپس آ گیا اور ڈاکٹر مصدق کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور ان کے حواریوں کو سزائے موت دی گئی۔ شاہ کی حکومت مضبوط ہو گئی۔

پانچواں بحران اس وقت پیش آیا جب شاہ نے اپنے خلاف تمام مزاحمتوں کو سختی سے کچل دینے کا فیصلہ کیا اور سات سال تک شاہ مخالفوں کا قتل عام کیا گیا۔ یوں تو عوام کی آواز گولیوں سے دبا دی گئی اور حقیقت میں عوام کے اندر ہی اندر نفرت کا ایک لاوا جمع ہوتا گیا۔ جو بالآخر 1979ء میں ایک انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا

امام خمینی کی جلاوطنی:

1965ء میں عوامی راہنما امام خمینی کو ملک دشمن سرگرمیوں کا الزام لگا کر جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اس سے عوام میں حد درجہ اشتعال پھیلا۔ امام خمینی پر غیر ملکی طاقتوں کا ایجنٹ ہونے اور عرب ملکوں سے رقمیں وصول کرنے کا الزام تھا۔ امام خمینی پہلے ترکی گئے، پھر عراق آ کر نجف اشرف میں مقیم ہو گئے۔ 1978ء میں جب شاہ کے خلاف تحریک نے زور پکڑا تو شاہ نے عراق پر دباؤ ڈالا جس کے نتیجے میں امام خمینی کو عراق چھوڑنا پڑا اور انہوں نے اپنی ہی جلاوطنی کے آخری ایام پیرس کے مضافات میں بسر کیے۔

انقلاب کا پہلا پتھر:

دسمبر 1977ء میں ایران کے ایک روزنامے "اطلاعات" نے سرکاری طور پر بھیجا ہوا ایک مقالہ شائع کیا جس میں امام خمینی پر مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے تھے۔ ان دنوں امام صاحب نجف میں مقیم تھے۔ قم میں اس مضمون کا شدید ردعمل ہوا اطلاعات کی ہزاروں کاپیاں نذر آتش کر دی گئیں۔ 20 دسمبر کو اس مقالہ کے خلاف احتجاج میں جلوس نکالا۔ اس پر امنیہ نے گولی چلا دی جس سے دو سو کے قریب آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کے بعد دوسرے شہروں میں بھی ایسے ہی جلوس نکالے گئے امنیہ نے ان پر بھی بار بار گولی چلائی۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہی واقعہ انقلاب کا آغاز ثابت ہوا۔ اگر اطلاعات نے آیت اللہ خمینی کے خلاف یہ مضمون نہ چھاپا ہوتا تو کشت و خون کی نوبت نہ آتی اور نہ شاہ کو تخت چھوڑنا پڑتا۔ لیکن محققین کی نظر میں یہ حادثہ درحقیقت شاہ کی سیاسی موت کا فقط ایک بہانہ تھا۔ نفرت کا مادہ تو ایک عرصے سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔

شہدائے قم کا چہلم:

8 جنوری 1978ء کو قم نے امنیہ کے ہاتھوں مارے جانے والے شہداء کا چہلم ایران کے گوشے گوشے میں منایا گیا۔ اگرچہ لوگ ہر جگہ پرامن تھے مگر امنیہ کو اپنی طاقت کا بہر حال مظاہرہ تو کرنا ہی تھا۔ لہٰذا قم ہی میں سوگ منانے والوں کے جلوس پر فائرنگ کی گئی۔ اس میں کئی افراد ہلاک ہو گئے۔ 18 فروری کو ان شہدا کا چہلم کہیں بڑے پیمانے پر منایا گیا۔ اس کا سب سے بڑا مظاہرہ تبریز میں ہوا جہاں سارا شہر سڑکوں پہ نکل آیا۔ البتہ مظاہرین بالکل پر امن تھے۔ مگر پھر بھی ان پر ٹینکوں اور بجلی کا پٹروں سے گولہ باری کی گئی۔ اس دن اہل تبریز نے ایک نیا منظر دیکھا۔ سپاہیوں کے ایک گروہ پر فوج کی

ان سفاکانہ حرکات کا الٹا اثر ہوا کہ انہوں نے بھی وردیاں پھاڑ پھینکیں اور جلوس میں شامل ہو گئے ایک اندازے کے مطابق اس دن ہونے والے قتل عام میں تقریباً 1500 افراد شہید اور 2000 سے زیادہ زخمی ہوئے۔

انقلابی کارروائیاں تیز تر:

اہل ایران گولیوں اور بموں کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے جیسے ہی یہ ظلم ہوا انہوں نے عہد کر لیا کہ اس ظالم بادشاہ سے نجات کے بغیر آرام سے نہ بیٹھیں گے۔ امام آیت اللہ خمینی کی انقلاب افروز تقریروں کے ٹیپ عراق سے آنے والے زائرین کے ذریعے ایران پہنچے اور پھر گھروں مسجدوں اور محفلوں میں سنے جاتے ان انقلابی تقریروں میں شاہ کے خلاف جدوجہد کو تیز تر کرنے کی تلقین کی جاتی۔ اسی اثنا میں ایک دس نکاتی منشور تیار کیا گیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ۔ ساواک کے سربراہ جنرل محمد نصیری کو جو شاہ کا ہم مکتب بھی تھا اس کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ امریکی مشیروں اور ماہرین کو واپس بھیج دیا جائے۔ شہری آزادیوں کو بحال کیا جائے۔ سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے اور خائن اور سود خور وزراء پر مقدمہ چلایا جائے۔ بلاسود بینک کاری شروع کی جائے اور شراب اور جوئے پر پابندی لگائی جائے۔

مظاہروں کا آغاز:

اب ہر شہر میں حکومت کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تہران سمیت تیس شہروں میں لوگ سرکاری احکامات کی پرواہ کیے بغیر کھلے بندوں مظاہرے کرنے لگے۔ بعض مقامات پر سینما گھروں بینکوں اور سرکاری دفاتر پر حملے بھی ہوئے اور جب پولیس حالات پر قابو نہ پا سکی تو فوج طلب کر لی گی۔ رفتہ رفتہ شاہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ تحریک محض تشدد سے دبنے والی نہیں بلکہ لوگوں کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حکومتی نظام میں تبدیلی ضروری ہے۔ چنانچہ امیر عباس ہویدا کو برطرف کر کے جمشید آموزگار کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا جنرل نصیری کو بھی ساواک کی سربراہی سے ہٹا دیا گیا اور جنرل ناصر مقدم کو نیا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ شاہ نے اعلان کیا کی مجلس کے انتخابات معمول کے مطابق جون 1979ء میں ہوں گے۔ ان انتخابات میں حزب تودہ کے علاوہ سب سیاسی جماعتوں کو شرکت کی اجازت ہوگی۔ اگرچہ اس سے پہلے بادشاہ ملک میں کثیر تعداد میں سیاسی جماعتوں کا نامناسب قرار دے چکے تھے۔ لیکن ان یقین دہانیوں کا عوام پر کوئی اثر نہ ہوا ادھر امام خمینی نے اپنے ریکارڈ شدہ ٹیپوں میں عوام کو کہا کہ شاہ تم کو دھوکہ دے رہا ہے اس کی باتوں میں نہ آؤ اور اسے تخت سے ہٹائے بغیر دم نہ لو۔

سینما گھر میں آتش زدگی:

19 اگست 1978ء کو آبادان کے ایک سینما گھر میں آگ لگ گئی جس میں چار سو تماشائی جل کر مارے گئے۔ اس حادثے میں ساواک کا ہاتھ تھا اس بات کا سراغ نکلنے کے بعد عوام کا غصہ بے قابو ہو گیا اور آبادان جیسے شہر میں جو تیل کی صنعت کا مرکز ہے تیل پیدا کرنے والی مشینوں کے پہیے رک گئے۔ ابادان کے مزدوروں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی۔ وزیر اعظم جمشید آموزگار مستعفی ہو گئے اور جعفر شریف امامی کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ جعفر شریف امامی ایک مذہبی آدمی تھے۔ انہوں نے لوگوں کے مذہبی جذبات کی تسکین کی خاطر ہجری کیلنڈر کا بحال کر دیا۔ شبینہ کلب بند کروا دیئے اور پولیس کو بھی تھوڑی

سے آزادی دی۔ مگر ان اصلاحات کے باوجود شورش بڑھتی چلی گئی۔

آریہ مہر محمد رضا شاہ پہلوی (تعارف)

محمد رضا شاہ پہلوی، رضا شاہ پہلوی کے بیٹے، تعلیم انگلستان اور سوئٹزرلینڈ میں پائی 1941ء میں اپنے والد کی معزولی کے بعد تخت نشین ہوئے۔ پہلی شادی مصر کے شاہ فاروق کی بہن فوزیہ سے کی۔ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے طلاق دے کر ملکہ ثریا سے نکاح کیا۔ جب یہ بیوی بھی لاولد رہی تو فرح دیبا کو عقد میں لائے۔ 1951ء میں قوم پرست وزیر اعظم محمد مصدق نے تیل کی صنعت کو قومی تحویل میں لے لیا، جس سے شاہ کے تعلقات اس سے خراب ہو گئے اور نوبت شاہ کے ملک چھوڑنے تک پہنچی۔ 1953ء میں شاہ مخالف مظاہروں کی بنا پر محمد رضا شاہ پہلوی مجبور ہو کر ملک چھوڑ گئے لیکن چند ہی دن بعد امریکی سی آئی اے نے وزیر اعظم مصدق کا تختہ الٹ دیا اور شاہ واپس تہران آ گئے۔ اس دوران ایرانی فوج نے ہزاروں محبِ وطن لوگوں کو تہ تیغ کر دیا۔ 1961-62 میں شاہ نے سبز انقلاب کے نام پر زرعی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ 1963ء میں ایران میں پہلی بار خواتین کو حق رائے دہی دیا گیا۔ 1974ء میں شاہ کو قتل کرنے کی سازش بے نقاب ہو جانے کے بعد سینکڑوں لوگ شک کی بنیاد پر موت کی گھاٹ اتار دیئے گئے۔ شاہ کی جابرانہ اور متشدد پالیسیاں ہر حال رنگ لائیں اور عوام ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجبوراً جنوری 1979ء میں انہیں ایران چھوڑنا پڑا۔

عید کے دن ہنگامے:

26 اگست 1978ء کو ایران میں عید الفطر سے دس دن قبل اصفہان میں جو ایک بہت بڑا صنعتی شہر ہے زبردست ہنگامے شروع ہو گئے سینکڑوں مظاہرین مارے گئے اور لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات پیش آئے۔ چنانچہ شہر میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ چند دنوں میں اور خربوزوں نے بھی رنگ پکڑا اور ایران کے گیارہ شہروں میں مارشل لاء لگا دیا گیا لیکن فوج جتنا تشدد کرتی گئی لوگوں کی برہمی بڑھتی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ قوم نے اپنا دس نکاتی منشور پس پشت ڈال دیا اور اب صرف ایک مطالبہ کہ شاہ تخت سے دست بردار ہو جائے اور مرگ بر شاہ مظاہرین کا واحد انقلابی نعرہ بن گیا۔ عید کا دن 5 ستمبر کو قیامت خیز تھا تہران کے شہریوں نے اس شان سے عید منائی کہ کئی لاکھ مظاہرین کا ایک جلوس مارشل لاء کی خلاف ورزی میں نکالا گیا۔ فوج نے جلوس پر ہیلی کاپٹروں سے فائرنگ کی اس فائرنگ سے عید کے دن کئی سو افراد ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کے بعد آیت اللہ شریعتمداری نے عوام کو تلقین کی وہ مظاہروں سے بعض آئیں مگر لوگوں نے ان کی پرواہ نہ کی اور جمعہ 8 ستمبر کو عوام نے عید سے بڑا جلوس نکالا اس جلوس پر مشین گنوں سے گولیاں برسائی گئیں۔ غیر جانب دار پریس نے اس جلوس میں مرنے والوں کی تعداد تین ہزار سے چھ ہزار تک بتائی۔ شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا اور ہزاروں افراد گرفتار کر لیے گئے۔

طوفان آمد:

بظاہر تہران میں جلد ہی مظاہروں کا سلسلہ رک گیا اور فضا پر امن ہو گئی لیکن یہ سکون آنے والے بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ چنانچہ اکتوبر میں صحافیوں نے سنسر کے خلاف احتجاجاً 72 گھنٹے کی ہڑتال کی۔ اس ہڑتال میں کیہان اور اطلاعات جیسے سرکاری اخبارات سے منسلک صحافی بھی ہڑتال میں شامل ہو گئے اور تین دن تک ملک میں ایک اخبار بھی شائع نہ ہو سکا۔ آخر جعفر امامی کو پریس پر سے تمام پابندیاں ہٹانی پڑیں۔ 1953ء میں ڈاکٹر مصدق کی برطرفی کے بعد ایران میں پہلی بار پریس کو یہ آزادی ملی تھی۔

طلباء کا مظاہرہ:

ملک میں تعلیمی ادارے سال بھر سے بند پڑے تھے کیونکہ غیر جمہوری حکومتوں کو طلبہ سے خطرہ تھا کہ وہ ان کے خلاف اٹھ نہ کھڑے ہوں۔ 5 نومبر کو تہران یونیورسٹی کے طلبا و طالبات نے یونیورسٹی کے کھیل کے میدان میں مظاہرہ کیا اور جلوس کی شکل میں یونیورسٹی کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے طلباء کا بس ایک ہی نعرہ تھا کہ امریکی شاہ کو پھانسی دو۔ کیمپس کے دروازے کے دوسری طرف 500 سپاہی رائفلیں اور آنسو گیس شیلوں سے مسلح کھڑے تھے۔ حملے کا حکم ملتے ہی انہوں نے پہلے آنسو گیس پھینکی اور پھر گولیاں برسانے لگے اس حادثے میں 69 طلبا شہید اور بے شمار زخمی ہوئے۔

حالات قابو سے باہر ہو گئے:

طلباء کے اس قتل عام سے حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ 6 نومبر کو یوم انتقام منایا گیا تو لوگوں کے جذبات قابو سے باہر ہو گئے توڑ پھوڑ بڑے پیمانے پر شروع ہو گئیں۔ بینکوں اور سرکاری دفاتر کو آگ لگا دی گئی۔ شاہ نے جعفر امامی کی جگہ جنرل رضا ازہری کو وزیر اعظم مقرر کیا اور پورے ملک میں فوجی حکومت نافذ کر دی گئی۔ شاہ اور اس کے حواریوں کا خیال تھا کہ یہ امامی کی نرم پالیسی کا نتیجہ ہے۔ لہذا اب فوجی جرنیلوں کی سخت پالیسیوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا گیا۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ اخباروں پر دوبارہ سنسر عائد کر دیا گیا اور چند صحافیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر اخباروں نے پھر ہڑتال کر دی جو 62 روز تک جاری رہی۔

تیل کی صنعت میں ہڑتال:

طلباء اور مزدوروں سے کہیں زیادہ تشویشناک تیل کی صنعت سے وابستہ پچاس ہزار مزدوروں کی غیر معینہ مدت کے لئے ہڑتال تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ایران ایئر لائنز کے پائلٹوں اور تکنیکی عملے نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا جس سے ایرانی ہوائی اڈے مفلوج ہو گئے۔ سرکاری دفاتر حتیٰ کہ وزارتوں کے ملازم بھی گھر بیٹھ گئے۔ دفاتر میں آتے جاتے بھی تو کام نہ کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ فوج ہمیں دفتر آنے پر تو مجبور کر سکتی ہے مگر کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

فوج بھی شریک ہو گئی:

بہشت زہرا کے قبرستان کے پاس ایک جلوس جب فوجیوں کی طرف بڑھنے لگا تو ایک نوجوان میجر نے لاؤڈ سپیکر پر کہا کہ آپ ہمارے بھائی ہیں ہم آپ پر گولیاں نہیں چلانا چاہتے۔ یہ کہ کر اس نے اپنا پستول کھولا اور عوام کی طرف اچھال دیا

ہو کہا کہ اگر تمہارا جی چاہے تو تم مجھے گولی مار دو۔ میجر کا یہ اعلان عوام کی بے پناہ خوشی کا باعث بن گیا اور عوام نے ان پر پھولوں کی بارش کردی۔ دنیا کے اہم انقلابات میں ہمیشہ فوج نے عوام کا ساتھ دیا ہے ایرانی فوج بھی اس اسلامی انقلاب میں عوام کے شانہ بشانہ رہی۔

محرم الحرام کی آمد:۔

دسمبر کے پہلے ہفتے میں محرم آیا یہ وقت شاہ پر بڑا کٹھن تھا۔ مغربی مبصرین کا خیال تھا کہ اگر محرم کا پہلا عشرہ خیریت سے گزر گیا تو سمجھو شاہ کا تاج بچ گیا لیکن اب اس کا کیا علاج کیا جائے کہ شاہ خود خودکشی کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس نے محرم کے جلوس پر پابندی عائد کردی جس کی وجہ سے عوام مشتعل ہوگئی اور محرم کی مجلسیں سیاسی جلسوں میں بدل گئیں۔ جو واعظ بھی فوج کو یزیدی لشکر کہہ کر لعنت ملامت کرتا۔ عاشورے کے دن حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تہران میں جلوس نکالا گیا۔ جس میں دس لاکھ مظاہرین شریک ہوئے۔ یہ جلوس بے حد منظم اور پرامن تھا۔ البتہ تمام راستے شاہ کے خلاف نعرے لگتے رہے۔

شاہ کا اعلان تلافی:

اب شاہ نے اعلان کیا کہ میں اپنی پچھلی غلطیوں کی تلافی کا وعدہ کرتا ہوں، میں نے آپ لوگوں کا انقلابی پیغام سن لیا ہے۔ مگر شاہ اپنا اعتبار کھو چکا تھا چنانچہ کسی نے اس کے اس اعلان کا یقین نہ کیا اور نہ اس کے اقدامات کو سراہا۔ ادھر تہران میں تو محرم خیریت سے گذر گیا مگر مشہد مقدس، تبریز اور اصفہان میں زبردست ہنگامے ہوئے اور فوج سے تصادم ہو گیا۔ کئی سو افراد مارے گئے۔

نیا جوش و خروش:

دسمبر کے آخر میں مظاہروں کا سلسلہ نئے جوش و خروش سے شروع ہو گیا اور پانچ روز تک جاری رہا۔ بینک، دوکانیں، بازار، دفتر، فیکٹریاں، ریل گاڑیاں، بسیں، ہوائی سروس۔ تار گھر، ڈاک خانے، تمام محکمے سب بند ہو گئے۔ ساواک کے کئی دفتر جلا دیے گئے اور کئی غیر ملکی بینک لوٹ لئے گئے۔

شاہ کی نئی چال:

شاہ نے اب ایک نئی چال چلی اور کرائے کے گوریلے لے کر انہیں خوب نوازا اور اپنے حق میں جلوس نکلوائے، تاکہ غیر ملکی نامہ نگاروں کا پتہ چل جائے کہ ابھی عوام میں شاہ پسند بھی موجود ہیں۔ مگر بدقسمتی سے کرائے کے ان گوریلوں نے لوٹ مار شروع کردی اور فقط اصفہان میں پچاس آدمی ان کے تشدد سے ہلاک ہو گئے۔ آخر حکومت کو وقت کی نزاکت پر یہ مصنوعی جلوس بازی روکنا پڑی۔ یوں شاہ کی یہ آخری چال بھی ناکام ہو گئی۔

آخری ایکٹ:

جنوری 1979ء میں صبح طلوع ہوئی تو آریہ مہر کا گہن لگا سورج ڈوبنے لگا۔ نیوز ویک کے نامہ نگار نے جنوری 1979ء کے پہلے ہفتے کی روئیداد قلم بند کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔ ڈرامے کا آخری ایکٹ شروع ہو چکا ہے۔ ایران کے کونے

کونے سے بلوؤں کی خبریں آ رہی ہیں ہجوموں پر جو شاہ کے تخت سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کر رہے تھے، قابو پانے میں ناکام ہو چکی تھیں۔ ہڑتالوں کی وجہ سے ملک کی معیشت مفلوج ہو چکی تھی۔ تیل کی پیداوار ختم ہو چکی تھی۔ واشنگٹن میں کارٹر کی حکومت اب بھی شاہ کی ہمدرد تھی اور چاہتی تھی کہ شاہ آئینی بادشاہت قائم کرنے پر راضی ہو جائے۔

جب شاہ کا سفینہ ڈوبنے لگا تو چوہے گھبرا گھبرا کر بھاگنے لگے شاہ کی ماں تاج الملوک پوتے اور پوتیوں اور دوسرے اہل خانہ کے ساتھ اپنی بیٹی کے پاس کیلیفورنیا چلی دیں۔ شاہ کے منہ لگتے شراکتی سرمایہ دار پہلے ہی ملک چھوڑ چکے تھے۔ جو بچے تھے انہوں نے تہران کے بینکوں سے اپنے ڈالر نکلوا لئے تھے یہاں تک کہ تہران کے بینکوں میں ڈالر موجود نہ رہے۔ امریکہ نے بھی ایران سے اپنے شہریوں کے انخلا کا بندوبست کر لیا۔ ایران کے ہوائی اڈوں پر افراتفری کا عالم تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔ جن ایران چھوڑنے والوں کو ہوائی جہاز کے ٹکٹ نہ ملتے وہ موٹروں سے ایران چھوڑ کر جا رہے تھے۔ مگر شاہ آخر وقت تک اپنے تاج و تخت کو بچانے میں لگا رہا۔ اس نے جبہ ملی کے راہنما کریم سنجابی کو جیل سے بلوایا اور آیت اللہ خمینی سے مفاہمت کی بات چیت کرنے کے لئے پیرس بھیجا۔ خمینی کی شرطیں یہ تھیں کہ شاہ تخت سے دست بردار ہو جائے اس کے بعد استصواب رائے لوگوں سے معلوم کیا جائے کہ وہ بادشاہت پسند کریں یا جمہوریت؟ لیکن کریم سنجابی کو تہران واپسی پر گرفتار کر لیا گیا۔ غالباً شاہ کو خمینی کی شرطوں کا پتہ چل گیا تھا۔ شاہ نے پہلے 73 سالہ غلام حسین صادق کو اور پھر ڈاکٹر شاہ پور بختیار کو طلب کیا اور قومی حکومت بنانے کا کہا۔ ان کی وزارت میں کوئی سیاست دان شامل نہ کیا گیا۔ جب اس حکومت کی تقریب حلف برداری ہوئی تو شاہ نے پہلی بار عندیہ ظاہر کیا کہ آئندہ وہ فقط آئینی بادشاہ ہوں گے اور امور سلطنت میں کوئی دخل نہ دیں گے اور جیسے ہی یہ حکومت معمول کے مطابق کام کرنے لگے گی وہ ملک چھوڑ جائیں گے کیوں کہ وہ تھک گئے ہیں۔

لیکن حالات معمول پر نہ آنا تھے نہ آئے خمینی نے پیرس میں فتویٰ جاری کیا کہ شاہ پور کی حکومت شیطان کی حکومت ہے یہ حکومت عوام سے غداری کرنے والوں نے بنائی ہے لہٰذا اس سے تعاون گناہ ہے اس سے ملک دو گروہوں میں بٹ گیا ایک گروہ چاہتا تھا کہ ملک فوج کے حوالے کر دیا جائے دوسرا گروہ نرم اور گرم دونوں کا قائل تھا اس گروہ کا سرغنہ شاہ پور بختیار تھا۔ شاہ پور اعتماد کا ووٹ نہ لے سکا۔ ادھر شاہ کو امید تھی کہ اس کی حمایت میں امریکہ اپنی فوجیں ایران میں اتار دے گا مگر امریکہ کو اندازہ تھا کہ ایران میں فوجی مداخلت کا مطلب پورے مشرق وسطیٰ میں آگ لگ جائے گی۔ چنانچہ امریکہ نے شاہ کو مشورہ دیا کہ آپ کے حق میں یہ بہتر ہے کہ آپ ملک چھوڑ دیں۔

آخری منظر:

آخر وہ دن آ ہی گیا۔ 29 جنوری کی شام شاہ نے اپنے محل کے عملے کو مطلع کر دیا کہ وہ 30 جنوری کو قاہرہ روانہ ہو جائے گا۔ اس طرح پہلوی آمریت کا کاغذی محل زمین بوس ہو گیا۔ 30 جنوری کا تہران میں ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ریڈیو تہران نے اعلان کیا کہ شاہ اور شاہ بانو آج قاہرہ روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ اعلان سنتے ہی عوام سڑکوں پر نکل آئی۔ لوگ خوشی سے ناچ رہے تھے اور ایک دوسرے کو فتح کی مبارک باد دے رہے تھے۔ فوج نے آج اپنی توپوں اور گنوں پر گولوں کی بجائے پھول سجا لئے شہر میں جہاں بھی عوام کو شاہ یا اس کے والد کا مجسمہ نظر آیا یا تو گرا دیا گیا یا جوتوں کا ہار پہنا دیا گیا۔

شاہ پور بختیار کی تقریر اور آیت اللہ خمینی کی واپسی:

ادھر شاہ پور بختیار ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ لوگوں میری حکومت کا ساتھ دو، [illegible] دوسرے جابر کو لانا چاہتے ہو۔ امام خمینی قابل صد احترام ہیں وہ جب چاہیں وطن واپس آ [illegible] حکومت سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ ایک پادری وزیر اعظم کی جگہ نہیں لے سکتا۔ مگر موصوف [illegible] ملک میں ان کا اختیار اپنے دفتر یا کمرے تک محدود تھا۔ مگر اس پر بھی وہ حکومت چھوڑنے کے لئے [illegible] ان کی جرأت تو نہیں تھی کہ امام خمینی کو ایران آنے سے روکتا، البتہ اس نے بار بار یہ کوشش کی کہ آیت اللہ کی واپسی میں تاخیر ہو۔ شاہ پور نے تین دن کے لئے تہران ائیر پورٹ بند کر دیا، لیکن آخر اجازت دینا پڑی۔ آیت اللہ خمینی یکم فروری 1979ء کو تہران پہنچے۔ دس لاکھ ایرانیوں نے ان کا استقبال کیا۔ دو دن بعد فوجی جرنیلوں نے اعلان کیا کہ عوام اور حکومت کے تنازعہ میں وہ اور فوج غیر جانبدار رہیں گے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی شاہ پور کا آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا اور وہ بھاگ کر چھپ گیا۔ امام خمینی نے مہدی بازرگان کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ اس طرح اسلامی انقلاب ایران جس میں تقریباً [illegible] انسانوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور بے شمار مالی نقصان ملک کی معیشت کو پہنچا بالآخر وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اسلامی جمہوریہ ایران:

یکم اپریل کو عوامی ریفرنڈم ہوا۔ 98 فی صد ووٹ اسلامی جمہوریہ کے حق میں پڑے۔ ملک کا نام "کشور شہنشاہی ایران" سے "اسلامی جمہوریہ ایران" رکھا گیا۔

اثرات انقلاب:

7 اپریل 1979ء کو سابق وزیر اعظم امیر عباس ہویدا کو پھانسی دے دی گئی۔ اسلامی انقلاب کے بعد امریکہ کے خلاف نفرتوں کا لاوا پھٹ پڑا۔ 4 نومبر کو تہران میں ایرانی طلبا نے امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر کے، 62 امریکیوں کو جو سفارت خانے سے تعلق رکھتے تھے یرغمال بنا لیا اور شرط عائد کی کہ شاہ ایران کو واپس کیا جائے۔ جواب میں امریکہ نے ایران کا 12 ارب ڈالر کا اثاثہ منجمد کر دیا جو امریکی بینکوں میں جمع تھا۔ 6 نومبر کو مہدی بازرگان، وزیر اعظم نے اپنی کابینہ سمیت استعفیٰ دے دیا۔ 2 دسمبر 1979ء کو اسلامی جمہوری ایران کا پہلا آئین نافذ کیا گیا۔

پرچم کی تبدیلی:

31 جنوری 1980ء کو اسلامی انقلاب کی روشنی میں قومی پرچم میں تبدیلی کی گئی 4 فروری کو ابوالحسن بنی صدر نے ایران کے پہلے منتخب صدر کا عہدہ سنبھالا۔ یہ عہدہ فقیہہ کے ماتحت رکھا گیا جو امام خمینی تھے۔ 7 اپریل کو جمی کارٹر نے ایران کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات توڑ دیئے۔ 25 اپریل کو ایران میں امریکی فوجی مہم ناکام ہو گئی۔ اس مہم کے دوران امریکہ کے پانچ ہیلی کاپٹر اور دو مال بردار طیارے تباہ ہو گئے۔ امریکی ٹاسک فورس کے 8 افسر ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔ پارلیمنٹ کے انتخابات میں اسلامی جمہوریہ پارٹی کامیاب ہوئی اور پارٹی راہنما محمد علی رجائی وزیر اعظم بنے۔

ایران عراق جنگ:

اسی دوران عراق کے صدر صدام حسین نے شط العرب کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اور 22 ستمبر 1980ء کو ایران سے ایک طویل تباہ کن جنگ چھڑ گئی جو 1988ء میں کہیں جا کر ختم ہوئی۔ 21 جنوری 1981ء کو الجزائر کی کوششوں سے امریکی یرغمالیوں کو رہائی ملی بدلے میں امریکہ نے ایران کے منجمد اثاثے واگذار کر دیئے۔

عہد آفریں واقعہ:

انقلاب ایران دور حاضر کا عہد آفریں واقعہ ہے۔ اس انقلاب کی وجہ سے ایک جابر بادشاہ کا خاتمہ ہی نہیں ہوا بلکہ سامراجی طاقتوں کے اثر و اختیار کو بھی زبردست دھچکا پہنچا اور مشرق وسطیٰ میں طاقت کا توزن بدل گیا۔ بعض مبصرین ایرانی انقلاب کا موازنہ 1954ء کے مصری انقلاب سے کرتے ہیں، جس کی بدولت عرب اقوام ایک نئے فلسفہ زیست، نئی سیاسی فکر اور نئی تبدیلی اور نئی تہذیبی معنویت سے آشنا ہوئیں تھیں۔ عربوں نے خواہ وہ بحرین کے باشندے تھے یا حجاز و یمن کے، اپنے آزاد وجود سے آگاہی حاصل کی تھی اور جنرل ناصر ان کے قومی وقار اور خودمختاری کی علامت بن گئے تھے۔ مگر افسوس کہ صدر سادات نے صدر جمال عبدالناصر کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا اور آج مصر جہاں کھڑا ہے اپنی عرب قومیت کے لحاظ سے وہاں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مصر امریکہ کے ہاتھوں ایک کھلونا بن کر رہ گیا۔

مصر کے مقابلے میں فروری 1979ء میں جب انقلاب ایران کی تکمیل ہوئی تو ملک سخت بحرانوں کا شکار تھا۔ نظم و نسق کے تار پود بکھر چکے تھے۔ فیکٹریاں، کارخانے، دوکانیں اور دفاتر سب بند تھے۔ بے روزگاروں کی تعداد تمیں لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ شہروں میں اشیائے خورد و نوش کا قحط پڑا ہوا تھا۔ ایندھن ناپید ہو چکا تھا اور مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ مگر ان دشواریوں کے باوجود انقلاب کا سب سے بیش بہا سرمایہ یعنی قومی اتحاد صحیح سلامت تھا۔ سارے ایرانی جو شاہ کے جبر واستبداد کے خلاف متحدہ ہوئے تھے خوشی خوشی یہ تکلیفیں برداشت کر رہے تھے۔

مگر مورخین کے مطابق ایرانیوں کو انقلاب کی یہ سب صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد یہ توقع تھی کہ امام خمینی صاحب جو اس انقلاب کے تسلیم شدہ قائد تھے۔ پوری قوم کو اپنے ہمراہ ترقی کی راہ پر لے کر چلیں گے۔ مگر یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔ چونکہ اقتدار کا نشہ انسان میں خود بخود آمریت پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ امام خمینی نے تمام قومی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ایسا آمرانہ رویہ اختیار کیا کہ قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھر گیا۔ وہی عناصر جنہوں نے انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کیا تھا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ انقلابی جوش نے جذبہ انتقام کی شکل اختیار کر لی۔ شہری آزادیاں سلب ہو گئیں۔ بہت سے اخبارات و جرائد بند کر دیئے گئے۔ سیاسی پارٹیاں کالعدم قرار دے دی گئیں۔

☆

1979ء نکاراگوا کا جمہوری انقلاب

فروری 1979ء کے شاہ دشمن اور امریکہ دشمن انقلاب ایران کو فقط پانچ ماہ ہی گذرے تھے کہ امریکہ جیسی سپر طاقت کو ایک اور انقلابی صدمے سے دوچار ہونا پڑا یہ تھا 25 جولائی 1979ء کو ایک اور سامراج دشمن انقلاب جو وسطی امریکہ کے ایک اور چھوٹے سے ملک نکاراگوا میں آیا تھا دو برس پر محیط خانہ جنگی کے نتیجہ میں ملکی سطح پر انقلابی گوریلوں اور غیر ملکی سطح پر خود امریکہ کے دباؤ کے تحت نکاراگوا کے آمر صدر جنرل انستاسیو سموزا کو اقتدار چھوڑ کا ملک سے فرار ہونا پڑا اس کی جگہ سینڈا نسٹ SANDANIST قومی محاذ آزادی کی تنظیم برسر اقتدار آگئی۔ صدر سموزا کا خاندان نکاراگوا پر 1933ء سے برسر اقتدار تھا۔ سموزا نے اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑی ہے جو ملک میں لمبے عرصے سے جاری خانہ جنگی کی بدولت تباہ ہو چکی ہے۔ پچھلے مہینوں سے خانہ جنگی میں ہزاروں افراد مارے جا چکے تھے۔

نکاراگوا آزادی کے بعد:

اگرچہ 15 ستمبر 1821ء کو نکاراگوا نے سپین سے آزادی کا اعلان کیا تھا مگر حقیقی طور پر وہ آزاد جمہوریہ 1838ء میں بنا اس دوران ملک میں لبرل اور کنزرویٹو سیاسی جماعتیں ملکی سیاست میں آئیں۔ ان میں لبرل زیادہ طاقتور تھے۔ ان دونوں گروپوں میں اقتدار کے لئے جدوجہد شروع ہوئی تو نتیجتاً ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور دونوں گروپوں میں رسہ کشی ہونے کی وجہ سے ملک میں کوئی مستقل حکومت قائم نہ ہو سکی۔ اس عرصہ میں لبرل گروپ نے امریکی فوجی امداد طلب کی 1855ء میں امریکی فوجی مہم جو ولیم واکر نے حملہ کر کے گرینیڈا پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال واکر نے ماناگوا کو ملک کا دارالحکومت قرار دے کر خود نکاراگوا کا صدر بن گیا۔ 1857ء میں لبرل اور کنزرویٹو فوجوں نے اتحاد کر کے واکر کو ملک سے بھگا دیا۔

اس کے بعد 1857ء تا 1867ء کنزرویٹو صدر توماس مارٹینز کی حکومت رہی۔

1893ء میں ایک کامیاب بغاوت کے بعد لبرل لیڈر جوز سانتاس زیلایا حکمران بن گیا، اور اگلے سولہ سال تک آمرانہ حکومت کرتا رہا۔ 1909ء میں اسے جبری طور پر برطرف کر کے جوز میڈیز کو صدر بنایا گیا مگر امریکہ نے اس صدر کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ 1911ء میں کنزرویٹو ایڈولفو ڈیاز صدر بنا اس کے بعد امریکہ نے نکاراگوا میں دولت کے انبار لگا دیئے۔ 1912ء میں ڈیاز کی حکومت کے خلاف انقلاب برپا ہوا تو اس نے امریکہ سے فوجی امداد طلب کی۔ چنانچہ امریکہ اپنی بحری فوج یہاں لنگر انداز کر دی اور اپنا کنٹرول قائم کر لیا۔

نہر کی تعمیر کا منصوبہ:

1916ء میں ایک معاہدے بریان کا مورو کے تحت امریکہ نے نکاراگوا کو تین ملین ڈالر ادا کیے جس کے بدلے امریکہ نے بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک نہر کی تعمیر کے حقوق حاصل کر لئے جو ملک کے بیچ درمیان سے گذرتی تھی اس کے علاوہ امریکہ نے متعدد فوجی اڈے خلیج فونیکا وغیرہ میں تعمیر کر لئے۔ متعدد وسطی امریکی ملکوں نے اس منصوبے کی شدید مخالفت کی نتیجتاً نکاراگوا میں امریکیوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع ہوگئی۔ 1925ء میں امریکی فوجیں نکاراگوا سے نکل گئیں۔ امریکیوں کے جاتے ہی ملک میں پھر بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ چنانچہ 1926ء میں امریکی فوج پھر در آئی۔ 1928ء تک ملک میں کنزرویٹو گروپ کی حکومت رہی۔

امریکی نگرانی میں انتخابات:

1928ء میں امریکی نگرانی میں عام انتخابات منعقد کیے گئے۔ جن میں لبرل پارٹی جوز ماریا مونکاڈا کو صدر منتخب کیا گیا۔ 1930ء میں ایک ممتاز لبرل لیڈر اور عوامی ہیرو آگستو سیزر سینڈینو کی قیادت میں امریکی سامراج کے خلاف گوریلا جنگ شروع ہوگئی۔ 1927ء سے 1933ء تک ان باغیوں نے امریکی فوج پر بے شمار چھاپے مارے۔ امریکی نے نکاراگوا میں ایک نئی فوج نیشنل گارڈ تیار کی۔ اور اپنے خاص ایجنٹ انستا سیو سموزا گارشیا کو اس فوج کا سربراہ مقرر کیا۔ 1932ء میں ہونے والے انتخابات میں لبرل لیڈر جوان باتستا ساکاسا صدر منتخب ہوا یہ نیشنل گارڈ کے سربراہ سموزا کا چچا تھا۔ اس نے 1933ء میں صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا اور یوں سموزا کا خاندان ملکی حکومت کا سربراہ بن گیا۔ 1933ء میں امریکی فوجیں، فوج کا تمام کنٹرول جنرل سموزا کے ہاتھ میں دے کر نکاراگوا سے چلی گئیں۔ فروری 1934ء میں سموزا نیشنل گارڈ نے لبرل باغی راہنما آگستو سینڈینو کو گولی مار دی۔

سموزا صدر کے عہدے پر:

1936ء میں صدر ساکاسا کو بزور طاقت استعفٰی دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ سموزا نے صدارت کے علاوہ تمام اختیارات سنبھال لئے۔ یکم جنوری 1937ء کو اس نے صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ اس طرح صدر سموزا کی طویل ترین آمریت کا آغاز ہوا۔ اس ڈکٹیٹر خاندان کو امریکہ کی مکمل مالی، اقتصادی، فوجی و اخلاقی اعانت حاصل تھی۔

30 مارچ 1939ء کو آئینی ترمیم کے بعد سموزا نے نئی آٹھ سالہ مدت کے لئے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اس آئینی ترمیم کے بعد صدر کے اختیارات میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ 9 دسمبر 1941ء کو نکاراگوا امریکہ کے حلیف کی حیثیت سے جنگ عظیم دوم میں شریک ہوگیا۔ 1947ء کے انتخابات میں لیونارڈو آرگوئیلو صدر منتخب ہوئے۔ یکم مئی کو انہوں نے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ چند دن بعد ہی سموزا نے صدر پر اپنے خلاف سازش کرنے کا الزام لگا کر 25 مئی کو اسے برطرف کر دیا۔ معزول صدر امیکسیکو جلاوطن بھی کر دیا گیا۔ کانگریس نے بنجمن لاکائیوسا کاسا کو عبوری صدر مقرر کیا اور نیا آئین نافذ کر دیا۔ چند روز بعد کانگرس نے سموزا کے چچا وکٹر مینوئل ریمون ریاس کو صدر چن لیا۔ اس طرح نکاراگوا کی صدارت سموزا خاندان میں ہی رہی۔

سموزا دوبارہ عہدہ صدارت پر:

مئی 1950ء میں صدر روکنر کے انتقال پر سموزا نے پھر صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ 6 نومبر 1950ء کو ملک میں ایک نیا آئین نافذ کیا گیا۔ جس کے تحت ہونے والے صدارتی انتخابات میں صدر سموزا نے کامیابی حاصل کی۔ 1951ء میں سموزا نے اگلے چھ سال کے لئے صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس دوران سموزا نے نیشنل گارڈ کے ذریعے اپنے مخالفین کو کچلنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ 1954ء میں سموزا پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں اس کی جان بچ گئی۔ 1956ء میں لبرل پارٹی نے سموزا کو آئندہ چھ برس کے لئے صدر نامزد کر دیا لیکن اب مزید زندگی باقی نہیں تھی۔ اس لئے ایک شخص نے صدر سموزا کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ملک میں سموزا خاندان کی آمریت جاری رہی اور صدر سموزا کا ایک بیٹا لوئیس سموزا صدارت پر فائز ہوگیا اور دوسرا انستاسیو سموزا ڈیبائیل نیشنل گارڈ کا سربراہ مقرر ہوگیا۔ فروری 1957ء میں لوئیس سموزا نے منتخب صدر کی حیثیت سے اگلے چھ سال کے لئے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اس نے اپنے باپ کی پالیسیوں کو جاری رکھا۔

انستاسیو سموزا عہدہ صدارت پر:

1967ء میں ہونے والے انتخابات میں لوئیس سموزا کا بھائی انستاسیو سموزا نیشنل گارڈ کا سربراہ تھا صدر منتخب ہوگیا۔ یکم مئی 1967ء کو اس نے پانچ سال کے لئے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اس نے بھی اپنے باپ کی طرح نیشنل گارڈ سے کام لیتے ہوئے اپنے مخالفین کو بری طرح کچل دیا۔ 1970ء میں بریان کامورو معاہدہ منسوخ ہوگیا۔ 13 اپریل 1967ء کو لوئیس سموزا کا اچانک انتقال ہوگیا۔ اگست 1971ء میں آئین منسوخ کر دیا گیا اور اسمبلی توڑ دی گئی۔ 1972ء میں ہونے والے انتخابات میں انستاسیو سموزا نے پھر اکثریت حاصل کر لی مگر مارچ 1973ء میں وقتی طور پر اقتدار [illegible] کے حوالے کر دیا۔ مارچ 1974ء میں جب ملک کا نیا آئین نافذ ہوا تو اس کے تحت سموزا دوبارہ صدر منتخب ہوسکتا تھا۔ لہذا یکم دسمبر 1974ء کو سموزا ڈیبائیل نے ایک بار پھر صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ 1976ء میں سینڈنستا کے بانی فونسیکا اور دوسرے راہنما حکومتی فوج سے لڑائی میں مارے گئے۔ اسی دوران صدر سموزا کی آمریت کے خلاف عوام میں زبردست نفرت پھیل چکی تھی۔ دوسری طرف صدر سموزا ہر حکومت مخالف کو بے دردی سے کچل رہے تھے۔

خانہ جنگی کا آغاز:

10 جون 1978ء کو اخبار LA PRENSA کا ایڈیٹر و پبلشر پیڈرو جوکین کامورو جو کہ سموزا کا شدید ترین مخالف تھا، قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کا الزام صدر سموزا پر لگا۔ جس کے نتیجے میں ملک میں شدید ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سموزا نے اپنے خاندان کی آمرانہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جمہوری قوتوں کو کچلنے کے لئے پوری ریاستی طاقت سے کام لیا اور 1978ء میں نیشنل گارڈ کے ذریعے اپنے پچاس ہزار سیاسی مخالفین کو موت کی گھاٹ اتروا دیا۔ مگر مخالفین کا یہ خون ناحق رائیگاں نہ گیا اور ملک میں جاری شدید ہنگاموں نے ایک شدید خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔

صدارتی محل پر قبضہ:

22 اگست 1978ء کو سینڈنستا کے گوریلے نے اپنے راہنما ایڈن پیٹورا گامز کی قیادت میں ماناگوا کے صدارتی محل پر

قبضہ کرکے ایک ہزار افراد کو یرغمال بنالیا۔ باغیوں کو کوسٹاریکا کی حمایت حاصل تھی۔ ان باغیوں نے اپنے کئی مطالبات تسلیم کروالیے۔ اپریل 1979ء تک ملک میں سخت افراتفری پھیل چکی تھی۔ 29 مئی کو سینڈنسٹ باغیوں نے حکومتی فوج پر فتح حاصل کرلی۔ چنانچہ چھ جون کو صدر سموزا نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی لیکن باغیوں نے اپنے کارروائیوں میں اضافہ کر دیا۔

انقلاب:

ملک کی حالت خانہ جنگی سے ابتر ہو جانے کے بعد 17 جولائی 1979ء کو صدر سموزا نے استعفیٰ دے دیا اور وہ میامی (امریکہ) فرار ہو گیا۔ اس طرح ایک طویل عوامی جدوجہد کے بعد سموزا خاندان کی بیسویں صدی کی طویل ترین آمریت کا خاتمہ ہو گیا۔ سموزا خاندان تقریباً 45 سال سے نکاراگوا پر آمریت قائم کیے ہوئے تھا۔ یہ خاندان لاطینی امریکہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سب سے بڑا دوست اور ہمدرد خاندان تھا۔ ظاہر ہے امریکہ کو اپنے دوست خاندان کے خلاف آنے والا انقلاب کیسے پسند آسکتا تھا۔ سیڈانسٹ کامیابی سے جہاں امریکہ کی انا کو ٹھیس پہنچی وہیں علاقے میں موجود امریکی مفادات کو بھی نقصان پہنچا۔ اس لئے شروع دن ہی سے امریکہ نے انقلاب دشمن رویہ اختیار کیا۔ علاقے میں موجود اپنے اتحادی ممالک کے ذریعے امریکہ نے اپنے مفادات کا تحفظ شروع کردیا جس کے نتیجے میں علاقے کے امن و استحکام کو شدید خطرات لاحق ہوگئے لیکن ان تمام کارروائیوں کے باوجود امریکہ انقلاب کو ناکام بنانے میں کامیاب نہ ہوسکا اور انقلاب روز بروز مستحکم اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔

انقلاب کے بعد:

نئی انقلابی حکومت نے تخمینہ لگایا گیا تو پتہ چلا کہ گذشتہ خانہ جنگی میں پچاس ہزار افراد ہلاک۔ پانچ لاکھ بے گھر اور 1.3 بلین ڈالر کی املاک کو نقصان پہنچا۔ 1980ء میں انقلابی حکومت نے سموزا خاندان اور اس کے حکومتی ارکان اور حمائیتیوں کی جائدادیں اور املاک ضبط کرلیں۔ ملکی بینک، انشورنش کمپنیاں، معدنی وسائل، اور جنگلات قومی تحویل میں لے لئے۔ 17 ستمبر 1980ء کو آخری ڈکٹیٹر سمورا کو پیراگوئے میں قتل کر دیا گیا۔ صدر اورٹیگا نئی انقلابی حکومت کا سربراہ بنا 1984ء میں ہونے والے انتخابات میں صدر اورٹیگا نے کامیابی حاصل کی، مگر اپنے انتخابی عہدہ صدارت کی معیاد ختم ہوتے ہی صدر اورٹیگا نے 25 فروری 1990ء کو عالمی مبصرین کی نگرانی میں ایک بار پھر انتخابات کرائے جن میں سینڈ انسٹ حکومت ہونے کے باوجود کامیابی حاصل نہ کرسکے اور امریکی حمایت یافتہ جماعت نیشنل اپوزیشن یونین NOU نے کامیابی حاصل کی NOU کی مسز وائلیٹا بریوس ڈی کامورو ملک کی صدر بن گئیں جب کہ انتخابات کا یہ سلسلہ اور جمہوری عمل اس کے بعد بھی جاری رہا۔

یوں نکاراگوا دنیا کا ایک ایسا ملک بن گیا جہاں انقلاب روس اور انقلاب ایرن کے کے نتیجے کی طرح ڈکٹیٹر شپ قائم نہ ہوئی بلکہ انقلابی حکومت نے بھی زبردستی اقتدار پر قبضہ جمائے رکھنے کی کوشش نہیں کی اور جمہوری طور پر اقتدار منتخب جماعتوں کے حوالے کردیا۔ جو تاریخ جمہوریت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھنے والا اقدام ہے۔

☆

1986ء فلپائن میں بیس سالہ آمریت کا خاتمہ

27 فروری 1986ء کو انتخابات میں شکست اور امریکہ کی قطع تعلقی کے بعد فرڈیننڈ مارکوس فلپائن میں اپنے بیس سالہ آمرانہ اقتدار پر قبضے کے بعد ملک چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہو گئے اور ان کی جگہ مسز کوری اکینو برسر اقتدار آ گئیں۔ مارکوس قوم کو خانہ جنگی کے دھانے پر لے آئے لیکن بالآخر امریکہ کے دباؤ کے سامنے مجبور ہو کر اقتدار سے دست بردار ہو گئے اس سے پہلے 68 سالہ ہٹ دھرم مارکوس نے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے اور گوری اکینو کی کامیابی کو ماننے سے انکار کر دیا حزب اختلاف کے راہنما اور مقتول لیڈر بینیو اکینو کی بیوہ ہیں۔ بینیو اکینو کو 22 اگست 1983ء کو منیلا ایئر پورٹ پر وطن واپس آتے ہوئے طیارے سے اترتے ہوئے قتل کر دیا گیا تھا۔

فلپائن کی فروخت:

10 دسمبر 1898ء کو معاہدہ پیرس کی رو سے فلپائن پورٹریکو اور گوام کو 2 کروڑ ڈالر کے عوض اسپین نے امریکہ کو فروخت کر دیا تھا۔ 1521ء میں فلپائن کی یورپی دریافت کے بعد سے فلپائن تقریباً 4 سو سال سپین کی نو آبادی بنا رہا انیسویں صدی کے آخری عشروں میں یہاں آزادی کے لئے جنگ شروع ہوئی جو 1898ء میں امریکی مداخلت کی وجہ سے ہسپانوی امریکی جنگ میں بدل گئی اس جنگ کے نتیجہ میں ہونے والے معاہدہ پیرس میں یہ علاقہ امریکہ کو فروخت کر دیا گیا۔

فلپائن کی آزادی:

اگلے 48 سال فلپائن امریکہ کی ذیلی ریاست بنا رہا۔ اس دوران جنگ عظیم دوم کے دنوں میں 1942ء میں جاپانی فلپائن پر قابض ہو گئے۔ 5 جولائی 1945ء کو امریکی جاپان سے فلپائن کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر 4 جولائی 1946ء کو امریکہ نے فلپائن کو اس شرط پر آزادی دی کہ امریکی فوجی اڈے فلپائن میں برقرار رہیں گے۔ 15 اپریل 1948 پہلے فلپائنی صدر روکساس کا انتقال ہو گیا۔ 1949ء میں کوئزینو باقاعدہ طور پر صدر منتخب ہوئے۔

فرڈیننڈ مارکوس:

1965ء کے صدارتی انتخابات میں قوم پرست راہنما فرڈیننڈ مارکوس صدر منتخب ہوئے۔ مارکوس اپنے پیشرو صدر کے برعکس آمرانہ ذہن کے آدمی تھے۔ انہوں نے امریکی کی کمیونسٹ دشمن پالیسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ کی امداد کو حمایت

پر 1969ء میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں بڑی آسانی سے کامیابی حاصل کرلی۔ اپنی صدارت کی دوسری مدت کے دوران مارکوس کو داخلی انتشار کا سامنا کرنا پڑا۔ 1970ء کے شروع میں دو انتہا پسند گروہوں نے حکومت کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کیا۔ کمیونسٹ تخریب کاری کے خطرے کا ڈھونگ رچا کر مارکوس نے 21 ستمبر 1972ء کو ملک میں مارشل لا نافذ کردیا۔ کانگریس توڑ دی۔ تمام اپوزیشن راہنماؤں اور اخبار نویسوں کو قید کردیا گیا اور اخبارات پر سنسر عائد کردیا۔

نئے آئین کا نفاذ:

17 جنوری 1973ء کو ملک میں نیا آئین نافذ کردیا گیا جس سے مارکوس کو بحیثیت صدر بے پناہ اختیارات حاصل ہو گئے اور صدر مارکوس نے ان اضافی اختیارات سے کام لیتے ہوئے آئندہ انتخابات ملتوی کردیے۔ 1978ء میں مارکوس کی بیوی امیلڈا مارکوس نے سیاسی طاقت حاصل کرلی اور اپنے زیرِ نگرانی حکومتی فیصلے کرنے لگی جو براہِ راست حکومتی معاملات میں مداخلت تھی۔ 1980ء میں متعدد حزب اختلاف کی جماعتوں نے اتحاد کر کے مارشل لا کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ اور گوریلوں نے منیلا پر بم برسائے۔ 9 سال بعد 17 جنوری 1981ء کو مارشل لا کے خاتمے کا اعلان کیا گیا اور صدر نے اپنے بے پناہ اختیارات پارلیمنٹ کو واپس کردیئے۔ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا گیا۔ جون 1981ء میں صدارتی انتخابات ہوئے اور مارکوس مزید چھ سال کے لیے صدر منتخب ہو گئے ادھر حزب اختلاف بھی اپنے آپ کو مضبوط بنانے میں مصروف رہی۔ 2 اگست 1983ء کو اپوزیشن لیڈر بنگینو اکینو امریکہ سے وطن واپس آئے تو انہیں منیلا ائیر پورٹ پر ہی گولی مار کر ہلاک کردیا گیا اس قتل کا الزام مارکوس کی حکومتی ایجنسیوں پر لگا۔

نئے انتخابات کا انعقاد:

فروری 1986ء میں مارکوس نے انتخابات کرانے کا اعلان کیا اس اعلان کے ساتھ ہی مقتول اکینو کی بیوہ مسز کوری اکینو نے بھی ان انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کردیا۔ مارکوس کے لیے مسز اکینو کچھ بڑی حیثیت کی حامل نہ تھی۔ اس لئے حسب وعدہ 7 فروری 1986ء کو انتخابات منعقد ہوئے جن میں زبردست دھاندلی کی گئی اور 16 فروری کو مکمل طور پر صدر مارکوس کو صدر قرار دے دیا گیا۔ مخالف امیدوار مسز اکینو نے ان سرکاری نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا جس کے نتیجے میں عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ فوج نے بھی مسز اکینو کا ساتھ دیا۔ فوج کے سربراہ جنرل راموس نے اور وزیر دفاع نے صدر مارکوس کے خلاف بغاوت کردی جس کے نتیجے میں صدر ماکوس بے بس ہو گئے۔

عوام کی جیت:

اور بالآخر عوام کی جیت ہوئی۔ مارکوس ملک سے فرار ہو کر جزائر ہوائی چلا گیا۔ مارکوس اور اس کی بیوی امیلڈا ملک سے جاتے وقت 86 کروڑ 8 لاکھ ڈالر کی سرکاری رقوم بھی ساتھ لے گئے۔ 26 فروری کو مسز اکینو نے اقتدار سنبھال لیا۔ 1987ء کے شروع میں مارکوس کی حامی فوج نے بغاوت کرنے کی کوشش کی۔ 3 فروری 1987ء کو ایک ریفرنڈم میں عوام نے بھاری اکثریت سے نئے آئین کی منظوری دی۔ 11 فروری کو نیا آئین نافذ ہو گیا جس کی رو سے مسز اکینو اگلے 6 سال کے لئے ملک کی حکمران بن گئی۔ مئی میں اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن میں مسز اکینو نے اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا۔

صدر کوری اکینو کے خلاف بغاوت:

یکم اگست 1989ء کو صدر کوری اکینو نے مسلم اقلیت کو محدود خودمختاری دینے کا اعلان کیا۔ یکم دسمبر 1989ء کو بغاوت کی ناکام کوشش کی گئی۔ باغیوں نے فوجی اڈوں، ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشنوں اور صدارتی محل پر بمباری کی۔ 3 دسمبر کو امریکی فضائیہ کے طیاروں کی مدد سے حکومتی فوجوں نے بغاوت کچل دی۔ 6 دسمبر کو ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی۔ 11 مئی 1992ء کو ہونے والے انتخابات میں سابقہ وزیر دفاع کے سیکرٹری فیڈل رموس صدر منتخب ہو گئے۔ انہوں نے صدر مارکوس کی بیوہ کو شکست دی جسے نومبر 1991 ملک واپس آنے کی اجازت دے دی گئی تھی، جبکہ صدر مارکوس 1989 میں انتقال کر گئے تھے۔

صدر کوری اکینو

ماریا کورازون اکینو MARIA CORAZON AQUINO منیلا میں پیدائش 1933ء میں ہوئی۔ نیویارک میں تعلیم مکمل کی۔ 1955ء میں بینگنیو اکینو سے شادی ہوئی۔ اپنے خاوند کی وفات 1983ء تک وہ سیاست سے دور رہیں پھر جب غیر متوقع طور پر مارکوس نے فروری 1986ء میں صدارتی انتخابات کا اعلان کیا تو مسز اکینو نے ان انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

صدر مارکوس (1917ء۔1989ء)

فلپائنی ماہر قانون اور سیاست دان۔ 1946ء تا 1947ء فلپائنی صدر روکساس کے نائب رہے۔ 1949ء میں ایوان نمائندگان کے رکن منتخب ہوئے۔ 1965ء کے صدارتی انتخابات میں ملک کے صدر منتخب ہوئے۔ 1969ء میں دوبارہ صدر چنے گئے۔ 1973ء میں ملک میں مارشل لا نافذ کیا۔ اور نئے آئین کے تحت وزیر اعظم کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ 1986ء تک ملک کے صدر رہے 1986ء کے شروع میں کورازون اکینو نے عوام کی مدد سے ان کا تختہ الٹ دیا وفات جلاوطنی میں ہوئی۔

☆

1989ء۔ پولینڈ جمہوریت کی راہ پر

4 جون 1989ء کو 40 سال بعد پولینڈ میں پہلے آزادانہ انتخابات منعقد ہوئے جن میں سالیڈرٹی نے فیصلہ کن کامیابی حاصل کی۔ پارلیمنٹ میں جنرل جیروزسکی WOJCIECH JARUZELSKI کو ملک کا پہلا باقاعدہ صدر منتخب کیا گیا۔ جیروزسکی کی زیرقیادت پولینڈ میں صدر کا عہدہ ایک اہم عہدہ بن گیا 24 اگست 1989ء کو پارلیمنٹ نے تادیوز میزوکی TADEUSZ MAZOWIECK کو وزیراعظم منتخب کیا۔ یہ 40 برس سے قائم شدہ کمیونسٹ حکومت کا خاتمہ تھا اور پولینڈ میں دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلا غیر کمیونسٹ وزیراعظم۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد:

28 جون 1919ء کو معاہدہ ورسلز کے تحت دوسرے ممالک نے پولینڈ کی آزادی تسلیم کرلی۔ اس کے علاوہ پولینڈ نے ایک وسیع علاقہ جرمنی سے حاصل کرلیا۔ بحیرہ بالٹک کے ساتھ پومیرانا کا علاقہ بھی پولینڈ کو دے دیا گیا تاکہ پولینڈ کو سمندر تک رسائی حاصل ہوجائے۔ 1919ء میں پولینڈ کا قومی پرچم رائج ہوا۔ مشرق میں پولینڈ نے کوشش کی کہ روس کے ساتھ اس کی سرحد قائم ہوجائے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1920ء میں روس سے جنگ ہوگئی اور اس کا بہت سا مشرقی علاقہ چھن گیا۔ نئے پولینڈ کو کافی مشکلات کا سامنا تھا۔ اس کے راہنماؤں جو سب سے بڑا چیلنج درپیش تھا وہ تینوں علاقوں کو متحد کرنا تھا، جو تقریباً ایک سو سال سے علیحدہ ہوچکے تھے۔ ملک کی ٹوٹ پھوٹ اور جنگ کے نتیجے میں ملک کی اقتصادی حالت تباہ ہوچکی تھی۔ 1920ء سے 1930ء کی دہائی میں پولینڈ کی اقتصادی حالت رفتہ رفتہ بحال ہوئی۔ اس کے علاوہ حکومتی نظام اور مواصلات اور تعلیمی نظام میں بہتری ہوئی۔

پولینڈ میں پہلا آئین 1921ء میں نافذ ہوا۔ یہ ایک فرانسیسی طرز کا آئین تھا، جس کے تحت پولینڈ کو ڈیموکریٹک حکومت میسر آئی، لیکن یہ مخلوط حکومت ہرگز مضبوط نہ تھی۔ جنوری 1922ء میں جبرائیل ناروٹو ویز صدر منتخب ہوئے۔ مگر اسی سال کے آخر میں 16 دسمبر کو قتل کردیئے گئے۔

پلسوڈسکی کی آمریت:

26 مارچ 1926ء کو رومانیہ اور پولینڈ متحد ہوئے۔ اس وقت ملک میں صدر چودسکی کی حکومت تھی۔ مئی 1926ء میں

سابق ملٹری چیف مارشل پلیوڈسکی نے فوج کی مدد سے چوڈ گی حکومت کو نکال باہر کیا اور خود پولینڈ کا آمر مطلق بن گیا۔ اگرچہ پلیوڈسکی نے جون میں اگنا موسکی کو صدر مقرر کیا مگر اصل اقتدار پلیوڈسکی کے ہاتھ میں رہا۔ 1933ء میں موسکی دوبارہ صدر منتخب ہوا۔ 1935ء میں نیا آئین نافذ کیا گیا۔ جس میں پلیوڈسکی کے آمرانہ اختیارات کی توثیق ہوگئی، مگر وہ اپنے آئینی اختیارات سے فائدہ نہ اٹھا سکا اور چند روز بعد 12 مئی 1935ء کو انتقال کر گیا۔ پلیوڈسکی کا جانشین ایڈورڈ سمگلی رز تھا جو اس کی پالیسیوں پر گامزن رہا۔ 1930ء کی دہائی میں پولینڈ کو روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ 1939ء میں ہٹلر نے مطالبہ کیا کہ گڈانسک کا شہر جرمنی کے حوالے کر دیا جائے۔ پولینڈ نے ہٹلر کے مطالبات کے خلاف مزاحمت کرنے کی بنیاد پر برطانیہ سے اتحاد کر لیا۔ اس سے پہلے فرانس اور برطانیہ پولینڈ سے 1921ء میں معاہدہ کر چکے تھے کہ اگر پولینڈ کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوا تو وہ اس کا دفاع کریں گے۔

دوسری جنگ عظیم:

یکم ستمبر 1939ء کو بغیر کسی انتباہ کے جرمن نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ اس حملے سے دنیا میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 17 ستمبر کو جرمنی کے اتحادی روس نے بھی پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ پولینڈ کے لوگوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر انہیں شکست ہوئی۔ 27 ستمبر کو جرمنی اور روس نے پولینڈ کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ 1941ء میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو پورے پولینڈ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ پولینڈ کی شکست کے بعد پیرس میں ایک جلاوطن حکومت قائم کر دی گئی۔ جو بعد ازاں لندن منتقل ہو گئی۔ پولینڈ میں خفیہ مزاحمتی فوج نے جرمنوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ روس پر جرمنی کے حملے کے بعد پولش کمیونسٹوں نے روس کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ پولینڈ کے باشندوں نے مشرقی محاذ پر روسیوں کے زیر کمان جرمنوں کے خلاف جنگ لڑی۔ 1942ء میں کمیونسٹوں نے PZPR پولش ورکر پارٹی قائم کی۔ نومبر 1943 میں ولاڈی سلاف گوموکا اس پارٹی کا پہلا سربراہ بنا۔

1944ء میں سوویت فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کر کے جرمنی کو نکال دیا۔ اس کے علاوہ مقامی فوج نے بھی وارسا میں جرمنوں کے خلاف بغاوت کر دی، لیکن دو ماہ کی لڑائی کے بعد انہیں ہتھیار پھینکنا پڑے اسی سال LUBLIN میں "پولش کمیٹی آف نیشنل لبریشن" بنائی گئی۔ USSR نے اس کمیٹی کو فوراً تسلیم کر لیا جو تمام کمیونسٹوں پر مبنی پولینڈ کی ایک عبوری حکومت تھی۔ 1945ء میں یالٹا کانفرنس YALTA. C کے تحت اتحادیوں نے بھی کچھ شرائط پر اسے تسلیم کر لیا۔ ان شرائط کے تحت لندن کی جلاوطن حکومت کے نمائندوں اور غیر کمیونسٹ گروپ کو بھی اس حکومت میں شامل کرنا تھا۔

اعلان آزادی:

22 جولائی 1944ء کو پولینڈ کی آزادی کا اعلان کر کے لندن میں جلاوطن حکومت قائم ہوگئی، جس کے صدر ولاڈی سلاف رز کیو اور وزیر اعظم ولاڈی سلاف سیکورسکی تھے۔ امریکہ اور برطانیہ نے اس حکومت کو تسلیم کر لیا، مگر روس نے مسترد کر دیا۔ پولینڈ میں روس کے حامی سوشلسٹ مزاحمتی گروپ نے کافی طاقت حاصل کر لی تھی چنانچہ اس گروپ کے دباؤ کی وجہ سے لندن میں قائم شدہ حکومت جلاوطن ہی رہی اور پولینڈ میں یکم جنوری 1945ء کو پہلی سوشلسٹ حکومت قائم ہوگئی۔ پولش عوام کی حکومت نے کمیونسٹ حکومت کی مخالفت کی لیکن ان کی آواز کو طاقت سے دبا دیا گیا۔

پہلے عام انتخابات:

جنگ کے مسائل سے نمٹنے کے بعد 19 جنوری 1947ء کو ملک میں پہلے عام انتخابات ہوئے جن میں پولش ورکرز پارٹی، پولش سوشلسٹ پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی نے حصہ لیا۔ پولش ورکرز پارٹی کے کمیونسٹوں نے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرلی۔ اب اس پارٹی کو ''پولش یونائیٹڈ ورکرز'' کا نام دیا گیا اور اس نے حکومت پر اپنا کنٹرول مضبوط کرلیا۔ 1948ء میں ملک میں مکمل طور پر کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی، جس کے تحت وسیع تر سوشلسٹ اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا۔ روس کا اثر ونفوذ اتنا بڑھا کہ کمیونسٹوں نے روس کی مخالفت کرنے والے اہم افراد کو اہم عہدوں سے برطرف کردیا۔ پارٹی کا فرسٹ سیکرٹری ولاڈی سلاف گومولکا جو کئی اہم حکومتی عہدوں پر فائز تھا۔ اسے 1948ء میں روس سے وفاداری نہ رکھنے کے جرم میں برطرف کردیا گیا۔

کمیونسٹ آئین کا نفاذ:

جولائی 1952ء میں پارلیمنٹ نے روسی طرز کا نیا آئین ملک میں نافذ کیا جس کے تحت تمام ادارے حکومت کے قبضے میں چلے گئے۔ کسانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی زمینیں اور آمدن حکومت کے حوالے کردیں۔ مذہب کے خلاف چلائی جانے والی کمیونسٹ مہم میں رومن کیتھولک چرچ کے سربراہ سٹیفن کارڈینال ویزنسکی کو نظر بند کردیا گیا۔ یہ 1948ء تا 1981ء، چرچ کا سربراہ رہا۔ 29 جون 1959ء کو کمیونسٹ حکومت نے تمام بینکوں مالیاتی اداروں اور انڈسٹری کو قومی تحویل میں لے لیا۔ تمام زمینداریاں منسوخ کرکے رومن کیتھولک مذہب کے پیروکاروں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا، چنانچہ کئی شہروں میں اس ریاستی جبر کے خلاف مظاہرے شروع ہوگئے۔ اس دوران گومولکا کو آزاد کردیا گیا۔ اکتوبر 1956ء میں دوبارہ پارٹی کا سربراہ بنا دیا گیا۔ گومولکا نے فوراً زمینیں کسانوں کو واپس کردیں اور مذہب کش مہم کا خاتمہ کردیا۔ چرچ کا سربراہ کارڈینال رہا کردیا گیا اور وزیر دفاع روکوسکی جو ایک روس نواز تھا، برطرف کردیا گیا۔ 1960ء کی دہائی میں حکومت اور کیتھولک چرچ کے درمیان ایک جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ 1970ء میں مغربی جرمنی نے پولینڈ کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت مغربی سرحدوں کو تسلیم کرلیا۔

مزدوروں کی ہڑتال:

1970ء کے آخر میں اشیائے صرف کی قیمتوں میں بے پناہ اضافے کے خلاف گڈانسک اور دوسرے شہروں میں مزدوروں نے ہڑتال کردی اور مظاہرے شروع ہوگئے۔ لوگوں نے ملک میں سیاسی واقتصادی اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ کئی روز کے ہنگاموں کے بعد 20 دسمبر کو گومولکا نے استعفیٰ دے دیا اور ایڈورڈ گیرک نیا پارٹی لیڈر بن گیا۔ گیرک کی قیادت کے دوران حکومت اور چرچ میں تعلقات بہتر ہوئے اور پولینڈ کے روس نواز ہونے کے باوجود حکومت نے غیر کمیونسٹوں سے بھی تعلقات بہتر بنائے۔ 28 مارچ 1972ء کو ہینرک جبونسکی صدر بنا۔ 1978ء میں پولینڈ کے رومن کیتھولک کے سربراہ کارول کارڈینال، دنیائے مسیحیت کا سربراہ یعنی پوپ منتخب ہوگیا۔ اور اس نے ''جان پال دوم'' کا لقب اختیار کیا۔ یہ تاریخ مسیحیت کا پہلا پوپ تھا جس کا تعلق پولینڈ سے تھا۔ یہ 1943ء کے بعد پہلا غیر اطالوی پوپ بھی تھا۔ 1979ء میں ملک

کے اقتصادی حالات مزید خراب ہو جانے کے وجہ سے گڈانسک اور دیگر شہروں میں ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ کارکن تنخواہ میں اضافہ اور ٹریڈ یونینوں کی بحالی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہڑتال کے نتیجے میں پارٹی لیڈروں نے مطالبات پورے کرنے کا وعدہ کیا۔

سالیڈرٹی کا قیام:

30 اگست 1980ء کو کارکنوں نے ایک آزاد ٹریڈ یونین سالیڈرٹی SALIDERITY قائم کر لی اور اپنے حقوق تسلیم کرانے کے لئے ملک بھر میں مظاہرے شروع کر دیئے۔ ستمبر میں سنٹرل کمیٹی نے گیرک سے استعفیٰ لے لیا۔ستانسلاف کانیا کو سربراہ مقرر کیا۔ نومبر میں حکومت نے آزاد ٹریڈ یونین سالیڈرٹی کو تسلیم کر لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب انقلاب روس کے بعد کسی کمیونسٹ ملک میں کسی آزاد مزدور تنظیم کو تسلیم کیا گیا تھا۔ صرف ایک سال میں 95لاکھ مزدور اس تنظیم کے رکن بن گئے۔

مارشل لا کا نفاذ:

اکتوبر 1981ء میں سنٹرل کمیٹی نے کانیا سے استعفیٰ لے کر ایک آرمی چیف جنرل ووچ چیک جیروزلسکی کو کمیونسٹ پارٹی کا سربراہ مقرر کیا۔ اس دوران ملک کو بدستور اقتصادی مشکلات کا سامنا تھا۔ عوام اب وسیع تر سیاسی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے جو آہنی پردے کے پیچھے کمیونسٹ ممالک میں مفقود تھی۔ عوام کے ان مطالبات اور ہنگاموں کے خلاف جیروزلسکی نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا اور کانیا کو صدر مقرر کیا۔ سالیڈرٹی پر پابندی لگا کر اس کے سربراہ لیچ ویلسا اور دیگر سیاسی لیڈروں کا رہا کر دیا اور مارشل لا معطل کر دیا گیا۔۔ 1983ء میں مارشل لا کو باضابطہ طور پر ختم کر دیا گیا۔۔ 1983 اور 1984ء میں پولینڈ انتشار کا شکار رہا اور سالیڈریٹی پر پابندی برقرار رہی۔ 7 نومبر 1985ء کو آرمی چیف جیروزلسکی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ 5 اپریل 1989ء کو حکومت مذاکرات کے بعد سالیڈرٹی پر لگائی گئی پابندی ختم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ایک معاہدے کے تحت سینٹ کو پارلیمنٹ میں ضم کر دیا گیا۔ اور بااختیار صدر کا عہدہ وضع ہوا۔ 4 جون 1989ء کو ملک کی 40 سالہ تاریخ میں کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ امیدواروں نے عام انتخابات میں حصہ لیا۔ سالیڈرٹی نے فیصلہ کن کامیابی حاصل کی۔ پارلیمنٹ نے جیروزلسکی کو ملک کا باقاعدہ اور پہلا صدر منتخب کیا۔ اور میکزی سلاف راکوسکی کو کمیونسٹ پارٹی کا سربراہ بنایا گیا۔

کمیونسٹ پارٹی کا خاتمہ:

27 جنوری 1990ء کو پولینڈ میں کمیونسٹ پارٹی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ 16 نومبر اور 9 دسمبر کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں لیچ ویلسا نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ 22 دسمبر کو لیچ ویلسا نے صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ 27 اکتوبر 1991ء میں پولینڈ میں عام انتخابات ہوئے جن میں ملک کی تاریخ میں پہلی بار سو سے زائد سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔ دسمبر 1992ء میں ملک میں نیا آئین نافذ کیا گیا جس کے تحت 1993ء میں ہونے والے عام انتخابات میں سابقہ کمیونسٹوں نے اکثریت حاصل کی، ہانا سوچ وزیر اعظم بنے۔ 1917ء کے کمیونسٹ انقلاب کے بعد مشرقی یورپ کے ملکوں پر جو آہنی پردہ گرا دیا گیا تھا وہ اب آہستہ آہستہ اٹھنے لگا تھا۔ پولینڈ میں رائے دہندگان نے سالیڈرٹی کے حق میں

ووٹ دے کر کمیونسٹوں کو تلخ سبق سکھایا جو تاریخ میں مشرقی یورپ کی کمیونزم سے آزادی کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ار ایک ایسا انقلاب ہے جو کمیونزم کی رد کے لئے اٹھا اور کامیاب رہا۔

......☆......

1989ء اور چین میں جمہوریت کی آواز دبا دی گئی......

20 مئی 1989ء کو جب روس کے صدر گورباچوف چین کے سرکاری دورے پر تھے تو دارالحکومت بیجنگ میں تقریباً 20 لاکھ طلبا اور دیگر افراد نے حکومت کے مارشل لاء لگا دینے کی دھمکیوں کے باوجود جمہوریت کے حق میں مظاہرہ شروع کیا۔ روسی اور چینی راہنماؤں کی یہ ملاقات بڑی مدت کے بعد ہو رہی تھی، ایسے میں یہ مظاہرے چینی حکومت کے لئے بڑی تشویش کا باعث تھے کیونکہ اس ملاقات میں دونوں ملکوں کے تیس سالہ اختلافات کے خاتمے کا اعلان کیا جانا تھا۔ شنگھائی میں مظاہرے کے بعد بیجنگ میں بھی حکومت چین نے ان مظاہروں کو روکنے کے لئے سختی سے کام لیا اور فوجی دستے تعینات کر دیئے۔ بعدازاں جب حالات مزید قابو سے باہر ہوئے تو ٹینکوں کے دستے شہر بھر میں گشت کرنے لگے۔ 5 جون کو ان مظاہروں کا سلسلہ زیادہ شدت اختیار کر گیا۔ شہر بھر سے آتشیں ہتھیار چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہزاروں چینی فوجیوں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے منٹوں میں سینکڑوں افراد ہلاک کر دیئے۔ مظاہروں میں پھر بھی کمی نہ آئی تو مظاہرین پر خونی ٹینکوں سے چڑھائی کر دی گئی اس سلسلے کا سب سے لرزہ خیز واقعہ تیانن من سکوائر میں پیش آیا۔

تیانن من سکوائر کا قتل عام:

5 جون 1989ء کو بیجنگ کا تیانن من چوک اور اس کی ملحقہ سڑکیں انسانی بے کراں خون سے لت پت ہو گئیں۔ تیانن من چوک میں ٹینکوں کے نیچے آ کر مارے جانے والے افراد کی تعداد مورخین نے دس ہزار سے زائد بتائی۔ ان تمام افراد کی لاشیں خون ناحق کا نشان مٹانے کے لئے جلا دی گئیں۔ اتنا تشدد کیا گیا کہ مظاہرین مظاہرہ ختم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بہت سے مظاہرین کو ان کے راہنماؤں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ 21 جون کو ان راہنماؤں کے تین سرکردہ افراد کو پھانسی دی گئی۔ جبکہ 145 افراد کو سزائے قید سخت دی گئی۔ 15 سو سے زائد گرفتاری کے بعد لاپتہ ہو گئے۔

پس منظر:

تیانن من چوک کے ان ہنگاموں کی ابتدا 15 اپریل 1989ء کو اس وقت ہوئی جب برسر اقتدار کیمونسٹ پارٹی کے برطرف شدہ سربراہ ہیو یاؤ بنگ کا انتقال ہوا اور چینی طلبا اس کی یاد میں تیانن سکوائر میں جمع اکٹھے ہوئے۔ اس روز ان کی تعداد بہت معمولی تھی۔ محض ایک ہزار طلباء نے چوک میں جمع ہو کر ہیو یاؤ کو خراج تحسین پیش کیا، خراج تحسین پیش کرنے کے

ساتھ ہی وہ آزادی اور جمہوریت کے حق میں نعرے بھی لگا رہے تھے۔ پھر آزادی اور جمہوریت کے یہ نعرے مطالبات کی شکل اختیار کر گئے۔ دوسری بار جب طلباء اس چوک میں جمع ہوئے تو ان کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ پھر جب ہو یا کی یاد میں سرکاری تقریب منعقد ہوئی تو اس روز طلبا کی تعداد دو لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ اس روز بھی آزادی جمہور اور جمہوریت کے مطالبات کیے گئے۔ پھر 4 مئی 1989ء کا دن آیا اور طلباء ایک بار پھر تیانن من چوک میں جمع ہو گئے لیکن پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں اس کے بعد تیانن من چوک طلبا کا ٹھکانہ بن گیا۔ حکومت کے خلاف نعرے ڈینگ اور لی فنگ کی مذمت۔ جمہوریت اور آزادی کی مانگ آہستہ آہستہ بغاوت میں بدلنے لگی۔ اس بغاوت پر قابو پانے کے لیے چین کی اعلیٰ قیادت تک میں صلح مشورے ہونے لگے۔ فوج کے استعمال کا فیصلہ ہوا جس کی ژاؤ ژیانگ کی طرف سے مخالفت ہوئی۔

مارشل لا کا نفاذ:

آخر جب یہ مظاہرے حد سے بڑھے تو بیجنگ میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ژاؤ ژیانگ مستعفی ہو گئے اور انہیں گھر پر نظر بند کر دیا گیا فوج تیانن من چوک کی طرف بڑھی تو شہریوں نے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں آخر مظاہرہ کرنے والے طلباء کوئی غیر ملکی تو تھے نہیں چینی عوام کے ہی لختِ جگر تھے ساتھ ہی چینی فوج کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے عوام نے فوج کے حق میں بھی نعرے لگائے۔ ان نعروں کا خاطر خواہ اثر ہوا فوج چوک کے اندر داخل نہ ہوئی نہ اس نے طلباء کے خلاف طاقت کا استعمال کیا، مگر کیا کیجئے کہ یہ تو صرف ابتدا تھی۔ ادھر چینی قیادت اندر ہی اندر اس بغاوت سے نپٹنے کے لئے لائحہ عمل تیار کرتی رہی۔

بھوک ہڑتال:

اس دوران طلباء کے اپنے کاز نے لئے بھوک ہڑتال کر دی اب طلباء کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ طلباء کا یوں اکٹھا ہونا بھی قدیم چین کی جمہوری رسم کا احیاء تھا۔ ماضی میں جب کسی عالم کو بادشاہ کے کسی ظالمانہ اقدام کے خلاف احتجاج کرنا ہوتا تو وہ لڑنے کا یارانہ رکھنے کے سبب اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا تھا کہ طلباء ظالم حکمرانوں کے خلاف لڑنے کی سکت تو نہیں رکھتے مگر عالموں کے وارث ہونے کی بنا پر اپنی جان کا نذرانہ تو پیش کر سکتے تھے بعد ازاں زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اس احتجاج میں شامل ہوتے چلے گئے۔ مگر صرف شہری کیونکہ چین کے دہقان چین کے شہریوں سے زیادہ خوشحال ہیں اور ان میں سیاسی بے چینی اور اضطراب بھی نہیں پایا جاتا تھا۔

افواہیں:

پھر متضاد خبریں آنے لگیں۔ فوج نے گولی چلانے سے انکار کر دیا اور لگتا تھا کہ چین ایک بار پھر خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔ اسی دوران خبر آئی کی بغاوت کا خطرہ ٹل گیا، اور طلبا نے چوک خالی کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران گورباچوف کے آنے سے طلباء ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

تیانن مین چوک خون سے نہا گیا:

پھر 3 جون کی صبح طلوع ہوئی اور بیجنگ میں ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا۔ دو پہر دو بجے مظاہرین کو منتشر کرنے کے

لے آنسو گیس کے شیل برسائے جانے لگے۔ لیکن چوک میں جانے والے طلبا کے سیلاب کو نہ روکا جا سکا۔ ایک گھنٹہ کے بعد بلٹ پہنے ہوئے فوجیوں نے عوام اور طلبا سے اپنی ساری ہمدردیاں موقوف کر دیں اور اپنی کمروں سے بیلٹس اتار کر لوگوں کو مارنا شروع کر دیا۔ اس اچانک سختی سے لوگ منتشر ہو گئے مگر دوبارہ جمع ہو گئے۔ دراصل یہ اس بے رحمانہ کاروائی کا آغاز تھا جوان جمہوریت پسند چینی طلبا کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

رات دو بجے فوجیوں سے بھرے ہوئے ٹرک اور ٹینک چوک میں نمودار ہونے لگے اور پھر ہر سمت فوجی ہی فوجی جلوہ نما ہو گئے دوسرے لفظوں میں قاتل بھیڑیوں نے ہر سمت سے مظلوم بھیڑوں کو گھیر لیا۔ انہوں نے گریشہ ہال کی چھت اور دوسری جگہوں پر مورچے سنبھال لیے۔ پھر طلباء پر اعلیٰ قیادت کے حکم کے مطابق ہر طرف سے فائرنگ شروع کر دی گئی۔ نئے طلبا جو چین کی قدیم رسم کے مطابق خود جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے اور جن کی آنکھیں کئی رات تک جاگنے کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھیں اس اچانک کاروائی سے خون میں نہا گئے۔ خوف وحشت اور موت ہر طرف رقص کناں ہونے بھگدڑ مچ گئی۔ ادھر بے رحم رائفلیں گولیوں کا مینہ برسانے لگیں اور نوجوان طلبا و طالبات کے جواں سال لاشے تڑپتے ہوئے زمیں پر گرنے لگے۔ آج ان مظلوموں کو جمہوریت سے پیار کرنے کی قیمت اپنے لہو سے چکانا تھی۔ کچھ بہادر لوگوں نے آگے بڑھ کر سینے پر گولیاں کھا کر قاتلوں کو ان کے بزدلانہ فعل سے روکنے کی کوشش کی مگر بات اور بڑھ گئی ظالم ہمیشہ بزدل ہوا کرتے ہیں۔ جب فوجیوں کو عوام اپنی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے اور انہیں اپنی جانیں خطرے میں پڑتی نظر آئیں تو انہوں نے بے دریغ ٹینکوں کو انسانوں پر چڑھا دیا۔ یہ چین کی حکومت کا آپریشن کلین اپ تھا جو تیانن من چوک کے باغی طلبا کے وجود ہٹانے کے لیے کیا گیا تھا۔ رات کے پر سکون لمحات مقتولوں کی چیخ و پکار سے کہرام میں تبدیل ہو گئے۔ یہ ظالمانہ کھیل پورے تین گھنٹے جاری رہا۔ صبح پانچ بجے تک چوک خالی ہو چکا تھا البتہ چوک میں دس ہزار تڑپتے ہوئے انسانی لاشے ضرور پڑے تھے۔ آپریشن کلین اپ کے ذریعے بغاوت کا ایک مرحلہ اپنے اختتام کو پہنچا تھا لیکن ابھی بغاوت کے اسباب اور بے چینی باقی تھی۔ عوام کے مطالبات جمہوریت اور آزادی ضرور تھے مگر ان کے پس پردہ اقتصادی وجوہات بھی تھیں جب لوگوں کی زندگیاں مہنگائی افراط زر اور غذا کی قلت کے ہاتھوں اجیرن ہو چکی تھیں۔ کچھ لوگ سرمایہ دارانہ طور پر کروڑوں میں کھیل رہے تھے اور دوسرے اپنی غربت کی وجہ سے فاقوں مر رہے ہوں تو لوگ حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی ہٹانے کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ یہی سبب تیانن من اسکوائر کی بغاوت کا تھا۔ قیادت کی تبدیلی کا بہترین ذریعہ جمہوریت میں پنہاں ہے۔..............................

ژیاؤ ژیانگ ZHAOZIANG (تعارف)

چینی کمیونسٹ راہنما 1918ء میں پیدا ہوا۔ جاپان کے خلاف جنگ کے دوران ضلعی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری رہا 1971ء میں چین کے خود مختار علاقے اندرونی منگولیا کی کمیونسٹ پارٹی کمیٹی کا سیکرٹری مقرر ہوا۔ ستمبر 1980ء میں پانچویں عوامی کانگرس میں نائب وزیر اعظم منتخب ہوا۔ پھر 1987ء تا 1989ء چینی کمیونسٹ پارٹی میں جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہا۔

......سو احتجاج کرنے والوں کے نعرے، جمہوریت اور آزادی کا مطالبہ بن گئے۔ چینی راہنما ڈیانگ اور کے ساتھیوں پر جو الزامات لگائے گئے۔ ان میں اقربا پروری طبقات کی حوصلہ افزائی اور مارکسزم سے انحراف کے الزامات شامل تھے۔ لوگ سوال کرتے تھے کہ کیا اس کا نام مارکسزم ہے کہ معاشرے میں ایک طرف تو کروڑ پتی موجود ہوں اور دوسری طرف آٹھ کروڑ سے زائد آبادی خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ مارکسزم کا راستہ چھوڑنے کے باعث ملک معاشی بدحالی کا شکار ہو گیا لیکن کچھ تجزیہ نگار اس بے چینی اور بدامنی کا سبب کے جاننے کے لئے یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس بے چینی کو ہوا دینے کے لئے چین اور سوویت تعلقات کی بحالی کے عمل کو سبوتاژ کرنا ہو؟ اور اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اٹھتا تھا کہ کہیں ان تمام واقعات کے پس منظر میں امریکی دماغ کارفرما تو نہیں؟ کیونکہ چین سوویت تعلقات کی بحالی سے سب سے زیادہ نقصان امریکہ کو پہنچنے کی توقع تھی۔ صدر گورباچوف کے دورہ چین کے موقع پر طلبا نے جو بینرز اٹھا رکھے تھے ان پر ''جمہوریت کا سفیر'' اور ''گلاز نوسٹ کا علمبردار'' اس سے واضح ہوتا ہے کہ مظاہرین امریکہ کے اشارے پر کام نہیں کر رہے تھے، مگر یہ سب کیمونسٹ انقلاب کے تاریک پہلوؤں کی پیداوار ضرور تھا۔

کیمونزم چینی معاشرے میں اقتصادی مساوات قائم کرنے میں ناکام رہا تھا اور یہ انقلاب تو اسی وجہ سے برپا ہوا تھا۔ ادھر چینی راہنما ڈیانگ کی پالیسیوں کی وجہ سے چینی سماج میں طبقات پھر سے پیدا ہو گئے تھے۔ خود ڈیانگ نے دولت کی غیر مساوی تقسیم کی حمایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں کچھ لوگوں کو موقع دینا ہوگا کہ وہ کچھ لوگوں سے زائد دولت کے مالک بن جائیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آخر کار پوری قوم خوشحال ہو جائے گی (ٹرکل ڈاؤن پالیسی)۔ اس کے ساتھ ڈیانگ کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ وہ کیمونسٹ ہیں لیکن اگر کیمونزم اسی کا نام ہے تو پھر سرمایہ داری کیا ہے۔ 9 ستمبر 1976ء کو ماؤزے تنگ کے انتقال کے بعد سے ہوا کوفنگ کیمونسٹ پارٹی کے چیئر میں مقرر ہوئے۔ مارچ 1978ء میں ڈینگ زی پانگ صدر بنے اور چار نکاتی اصلاحی پروگرام متعارف کرایا۔

ہوا کوفنگ وزارت عظمیٰ پر:

28 فروری 1978ء کو ہوا کوفنگ وزیر اعظم بنے۔ یکم اپریل 1979ء کو جنگ تھنگ کی گرفتاری کے بعد چین میں ڈیمو کریسی والی تحریک کا آغاز ہوا۔ یکم جنوری 1980ء کو عوامی جمہوریہ چین کا تیسرا آئین نافذ کیا گیا۔ ستمبر میں ملک میں ''ایک بچہ خوشحال گھرانہ'' پروگرام متعارف کرایا گیا۔ یکم جولائی 1980ء کو ملک کی پہلی مردم شماری ہوئی جس سے پتہ چلا کہ ملک کی آبادی ایک بلین سے تجاوز کر گئی ہے۔

احتجاجی جلوس:

جون 1983ء کو پارلیمنٹ نے مسٹر لی شین ین کو ملک کا صدر منتخب کیا۔ دسمبر 1986ء میں ہزاروں افراد نے شنگھائی اور بیجنگ میں جمہوریت کے حق میں احتجاجی جلوس نکالے۔ 29 اکتوبر 1987ء کو وزیر اعظم ژیاؤ ژیانگ وزیر اعظم کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ 9 اپریل 1988ء کو مسٹر لی پنگ وزیر اعظم اور یانگ شانگ کن صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ملک میں مارشل لا:

20 مئی کو بیجنگ میں طلبا کے مظاہروں کے بعد مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا مئی اور جون کے ان مظاہروں میں ہزاروں افراد مارے گئے، مگر جمہوریت کی آواز دبا دی گئی۔ اپریل 1998ء میں جیانگ زی من کو چین کی قیادت میں نمایاں راہنما کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ 27 اگست 1993ء کو جیانگ زی من چین کے منتخب صدر ہو گئے۔ 16 مارچ 1998ء کو جیانگ زی من کو دوبارہ صدر منتخب کر لیا گیا۔

جیانگ زی من (تعارف)

چینی سیاستدان لی سیانین کا بیٹا۔ 1987ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو میں شمولیت اختیار کی۔ ماسکو میں سفارت کار اور شنگھائی میں میئر کی خدمات انجام دیں۔ تنانمن قتل عام کے بعد ژاؤ کا جانشین منتخب ہوا۔ مارچ 1993ء میں صدر کا عہد سنبھالا۔

......☆......

1989ء رومانیہ میں انقلاب

17 اکتوبر 1989ء کو رمانیہ میں انقلاب اس وقت شروع ہوا جب شہر تمی سورا کے حکام نے ریورنڈ لازلو ٹوکس نامی شخص کے خلاف قدم اٹھایا ٹوکس ایک نسل پرست ہنگرین تھا۔ وہ رومانیہ میں مقیم 20 لاکھ ہنگرین طبقے کی نمائندگی کا دعویدار تھا۔ اس کے خلاف پولیس کی کاروائی کے بعد دس ہزار لوگوں نے مظاہرہ کیا۔ مظاہرے کے دوران مظاہرین کے خلاف رومانیہ کی فوج ٹینکوں کے ساتھ سڑکوں پر نکل آئی اور اس کا سامنا براہ راست مظاہرین سے ہوگیا۔ رومانیہ کی فوج نے نہتے مظاہرین کو جن میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے، جدید اسلحے سے بھون کر رکھ دیا۔ جب کہ اگلے دن رومانیہ کے مشہور زمانہ ڈکٹیٹر چاؤ سشکو نے اس واقعہ کا ذمہ دار ہنگرین مظاہرین اور فاشسٹ عناصر کو ٹھہرایا۔

نکولائی چاؤ سشکو NICOLAE CEAUSESCU :

26 جنوری 1918ء کو مغربی رومانیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا، اگر چہ مناسب تعلیم نہ حاصل کر سکا مگر 1932ء میں اس نے کمیونسٹ یوتھ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد پر ایک کانفرنس میں اینٹی فاشسٹ گروپ کا نمائندہ منتخب ہوا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں۔ ہڑتال کے لئے اکسانے اور حکومتی پالیسیوں کے خلاف پمفلٹ تقسیم کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ پھر جب پولیس کا ریکارڈ یہ ظاہر کرنے لگا کہ وہ ایک خطرناک کمیونسٹ شورشی ہے تو اسے جلاوطن کر کے اس کے آبائی دیہات واپس بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد وہ زیر زمین چلا گیا۔ 1941ء میں وہ جیل میں تھا کہ جیل پر آئرن گارڈوں نے حملہ کر کے 64 قیدیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس حملے میں چاؤ سشکو بال بال بچا۔ سکے بعد اسے اس کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں دیگر بڑے کمیونسٹ رہنما قید تھے۔

عروج کا زمانہ:

رہائی کے بعد وہ یونین آف کمیونسٹ یوتھ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ پھر اس کا ستارہ چمکا اور 1947ء میں کمیونسٹ بام عروج پر آئے تو 1952ء میں اسے وزارت زراعت کا ڈپٹی سربراہ بنا دیا گیا۔ تھوڑے عرصے میں وہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا رکن بن چکا تھا۔ پھر جب 1965ء میں ملک کا وزیر اعظم موت سے ہمکنار ہوا تو چاؤ سشکو ملک کا فرسٹ سیکرٹری بن گیا۔

نئے قوانین:

1966ء میں نئے قوانین پاس کیے گئے جن کے تحت ملک میں استقاط حمل پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بظاہر یہ تدابیر ملک کی آبادی بڑھانے کے لیے اختیار کی گئی تھی مگر حقیقت میں یہ شہریوں کو ہراساں کرنے کی تدابیر تھیں جن کے تحت دو کروڑ خواتین کو ہر ماہ معائنہ کروانا لازم ٹھہرا۔......

نکولائی چاؤشسکو NICOLAE CEAUSESCU

(تعارف)

نکولائی چاؤشسکو (1918ء-1989ء) اکیڈمی آف اکنامک سٹڈیز بخارسٹ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1933ء میں یونین آف کمیونسٹ یوتھ کے رکن بنے۔ 1933ء میں ہی کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی فسطائیت مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے 1940ء تا 1944ء قید رہے۔ 1965ء میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ پھر 1974ء میں جمہوریہ رومانیہ کے صدر بنے۔ 15 سال تک آمرانہ حکومت کی 1989ء میں رومانیہ میں ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی تحریک چلی، فوج بھی عوام کے ساتھ مل گئی۔ چنانچہ انہیں گرفتار کر کے ان پر عوام کے حقوق غصب کرنے کا مقدمہ چلا، جس میں انہیں سزائے موت دی گئی۔

......چالیس برس کی عمر تک کی خواتین پر لازم ٹھہرا کہ وہ 4 بچوں کو جنم دیں۔ اب بے اولاد خواتین کی نشاندہی کی جانے لگی اور ان پر بھاری جرمانے عائد کیے جانے لگے۔ بد قسمتی سے استقاط حمل کا یہ قانون ملک میں اس وقت رائج کیا گیا جب ملک خوراک کی قلت کا شکار تھا۔

چاؤشسکو کا اگلا قدم:

چاؤشسکو نے ملک میں بہتری کے لئے جو اگلا قدم اٹھایا اس نے لوگوں کو فاقہ کشی سے ہمکنار کر دیا۔ 1971ء میں چاؤشسکو نے چین اور جنوبی کوریا کا دورہ کیا وہ ان ملکوں کی صنعتی ترقی سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے رومانیہ کو ایک صنعتی ملک بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لئے مغربی ملکوں کے مالیاتی اداروں سے بڑی بڑی رقوم بطور قرضہ لی گئیں مگر ان رقوم کو دیہاتی آبادی کو شہروں میں منتقل کرنے اور سامان تعیش کی تیاری پر خرچ کر دیا گیا جس کو برآمد کرنا ناممکن تھا۔ نتیجتاً ملک ان بلین ڈالر قرضے کے بوجھ کے نیچے دب گیا۔ اس کے بعد ایک اور غلط فیصلہ کرتے ہوئے ملک کی ضرورت کی اشیا بھی برآمد کرنا شروع کر دیں جن میں خوراک بھی شامل تھی، لہٰذا رومانیہ پہلے ہی خوراک کی قلت کا شکار تھا۔ 1980ء کے عشرے تک ملک میں روٹی بھی راشن کارڈوں پر دستیاب ہونے لگی۔ لوگ گھنٹوں قطاروں میں کھڑے ہوتے جب ان کا نمبر آتا تو روٹی ختم ہو چکی ہوتی۔ ملک میں بجلی کی پیداوار میں اتنی کمی ہو گئی کہ رات کے وقت گھروں میں صرف 40 واٹ کا ایک بلب

جلانے کی سرکاری اجازت تھی۔ تین گلیوں میں صرف ایک بلب سٹریٹ لائٹ کے لئے جلایا جاتا ادھر پٹرول کی قلت تھی۔ لہذا حکومت نے حکم دیا کہ ستر سالہ مریضوں کو ایمبولینس کی سہولت نہ دی جائے۔

چاؤشسکو کی پرتعیش زندگی:

چاؤشسکو کی آمریت کے دوران اگرچہ رومانیہ کی عوام مصائب کا شکار تھے مگر چاؤشسکو اور اس کے اہل خانہ پرتعیش زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ملک میں چار پرتعیش محلوں کے مالک تھے۔ یہ محل بیش قیمت قالینوں اور دیگر قیمتی ساز و سامان سے بھرے پڑے تھے۔ لاتعداد گاڑیوں کے ساتھ ان محلات میں پرتعیش بجرے بھی تھے اور کئی ایک کشتیاں بھی تھیں۔ نومبر 1984ء میں تیرھویں پارٹی کانگرس کا انعقاد ہوا۔ اگرچہ اس وقت رومانیہ کی معیشت مکمل طور پر بدحالی کا شکار تھی اور عوام فاقہ کشی پر مجبور ہو چکے تھے مگر اس کے باجود نکولائی چاؤشسکو کی پوزیشن مستحکم تھی اس نے اعلان کیا کہ اس نے ملک کے لئے جبری ترقی کی جو پالیسی اپنائی ہوئی ہے اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ اس نے پیشن گوئی کی کہ ملک 1995ء تک توانائی کے شعبے میں خودکفیل ہو جائے گا۔ تاہم 1989ء تک ایسا کوئی معجزہ رونما نہ ہوا اور ملک تباہی کے دھانے پر کھڑا رہا جس پر آخر عوام کے صبر کے پیمانہ چھلک پڑا اور عوام نے ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔

ہنگامہ آرائی کا آغاز:

آغاز میں عوام کے یہ ہنگامے پرامن تھے لیکن بعدازاں یہ ہنگامے حکومت کے خلاف ہونے والے بڑے اور پرتشدد مظاہروں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ پولیس نے عوام کو منتشر کرنے کے لئے سخت گیر کاروائیاں شروع کر دیں۔ اس کے بعد فوج بھی پولیس کی مدد کرنے کے لئے میدان میں اتر آئی پولیس کے مقابلے میں فوج نے ہجوم کو گولیوں کا نشانہ بنایا، کئی شہری ہلاک ہو گئے اور ہلاکتوں کے بعد عوام نے چاؤشسکو کو اپنے غصے کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ عوام کا خیال تھا کہ فوج نے چاؤ کے حکم پر فائرنگ کی تھی۔

رومانیہ کی تاریخ کا بڑا مظاہرہ:

اگلے اقدام کے طور پر پچاس ہزار شہری سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئے یہ پہلا موقع تھا جب مظاہرین حکومت کے خلاف کھلم کھلا تنقید کر رہے تھے بالخصوص چاؤشسکو کے اقدامات پر کڑی نکتہ چینی کی گئی۔ ادھر ان مظاہروں سے گھبرا کر اور اپنی بیوی الینا کے مشورے پر چاؤشسکو نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی ایک عوامی ریلی کی قیادت کرے گا۔ جو اس کے اقدامات کی تائید میں نکالی جائے۔ لہذا 21 دسمبر کو اس کے احکامات پر بیوکرسٹ سنٹرل اسکوائر میں ایک جم غفیر کا اہتمام کیا گیا جس کو دیکھنے کے لے 80 ہزار شہری بھی اس مقام پر آ گئے وہ سننا چاہتے تھے کہ آخر چاؤشسکو کیا کہنا چاہتا ہے۔ مگر جب اس نے پارٹی کی تعریف اور اپنے اصلاحی پروگراموں کو ذکر شروع کیا تو عوام میں بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے وہ سنٹرل کمیٹی بلڈنگ کی بالکونی میں کھڑا تھا اچانک لوگوں نے اس کے خلاف نعرہ بازی شروع کر دی اور نعرے لگانے لگے۔ ''ڈکٹیٹروں کو گولی سے اڑا دو'' اب چاؤشسکو حیرانی سے بت بن گیا اس کے لئے سب سے بڑی تشویش یہ تھی کہ اس جلسے کی کاروائی میڈیا پر براہ راست نشر کی جا رہی تھی۔ بہرحال کاروائی کو براہ راست نشر کرنے کا سلسلہ تھوڑی دیر بعد منقطع کر دیا مگر اس

وقت تک بڑی دیر ہو چکی تھی، نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک میں بھی [illegible]

ایک اور غلطی:

چند لمحوں بعد چاؤشسکو اور اس کی بیوی ایلینا سنٹرل کمیٹی بلڈنگ [illegible] ہوئی کہ رات کے اندھیرے میں اس شہر سے نکل جانے کی بجائے انہوں نے [illegible] جو بعد ازاں دونوں کو بھگتنا پڑا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ عوامی ہنگامہ آرائی ہے جو خود بخود ختم ہو جائے گی [illegible] لیے ابھی آغاز تھا۔

طوفان کا آغاز:

ساری رات مظاہرین سنٹرل کمیٹی کی بلڈنگ کے سامنے اپنا مظاہرہ کرتے رہے۔ صبح تک بہت سے مظاہرین اس بلڈنگ میں گھسنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اپنے شکار کی تلاش میں تھے۔ چاؤ اور ایلینا نے خود کو انتہائی خطرے میں گھرا ہوا محسوس کیا تو انہوں نے ہیلی کاپٹر کا بندوبست کیا اور ہیلی کاپٹر انہیں چھت سے اٹھا کر لے گیا مگر جلد ہی ہیلی کاپٹر زمین پر اترا ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں ایک فوجی اڈے کی طرف لے جایا گیا۔ اس فوجی اڈے میں انہیں ایک فوجی عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا جو تین شہریوں پانچ ججوں دو سرکاری وکیلوں اور دو دفاع کے وکیلوں پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ عدالت میں ایک کیمرہ مین بھی موجود تھا جس نے عدالت کی کاروائی ویڈیو ریکارڈ کر لی تھی۔

مقدمے کا آغاز:

مقدمے کے آغاز میں ایک سرکاری وکیل نے ان پر عائد الزامات پڑھ کر سنائے ان الزامات میں عوام کے خلاف جرائم اور وہ کرتوت بھی شامل تھے جو انسانی وقار کے منافی تھے لیکن شروع ہی میں چاؤشسکو نے عدالت سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ صرف گرینڈ نیشنل اسمبلی کے سامنے جواب دے گا اور صرف اسمبلی ہی کے سامنے زبان کھولے گا۔ لیکن اسکے عدم تعاون کے باوجود عدالت کی کاروائی جاری رہی چاؤ کو عدالت نے بار بار تاکید کی کہ وہ اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہے، لیکن اسکا جواب ہر مرتبہ یہ تھی کہ وہ صرف اسمبلی کے سامنے جواب دے۔ آخر پراسیکیوٹر نے اسے بتایا کہ وہ جس اسمبلی کی بات کر رہا ہے وہ توڑ دی گئی ہے تو اس نے جواب دیا کہ کوئی اس کی اسمبلی کو توڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پراسیکیوٹر نے بتایا کہ اسمبلی کی جگہ نیشنل سلیوشن فرنٹ لے چکا ہے مگر اس نے یہ تسلیم نہ کیا لہذا مقدمے کی کاروائی جاری رہی۔ اس پر فرد جرم عائد کر دی گئی جس میں شہریوں کی ہلاکتوں کے علاوہ سینکڑوں دیہات نیست و نابود کرنے کا الزام لگایا گیا۔ ساتھ ہی لوگوں کو فاقہ زدگی پر مجبور کرنے کا الزام شامل کیا گیا۔ آخر سرکاری وکیل نے کہا کہ اگرچہ وہ سزائے موت کے خلاف ہے مگر اس مقدمہ کے دونوں ملزمان کو سزائے موت دی جانی چاہیے لہذا عدالت نے دونوں مجرمان کو سزائے موت سنائی جس کے بعد اس سزا پر فوراً عمل درآمد کو بھی ممکن بنایا گیا۔ دونوں ملزمان کو باہر برآمدے میں لایا گیا جہاں سپاہیوں کا ایک گروپ رائفلیں لیے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد چاؤشسکو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا گیا۔ پھر یہی کچھ ایلینا کے ساتھ ہوا۔ یہ 25 دسمبر 1989ء کا دن تھا اہل رومانیہ کو اس سے بہتر کرسمس کا تحفہ کیا ہو سکتا تھا کہ

ان پر ظلم و جبر کرنے والے حکمران کو سزائے موت دے دی گئی۔ اور ایک ظالم اور جابر حکمران سے انہیں نجات مل گئی۔

نکولائی چاؤشسکو کا عہد:

نکولائی چاؤشسکو نے تقریباً 24 برس حکومت کی اگرچہ اس نے اپنی حکومت کا آغاز نیک خواہشات کے ساتھ کیا تھا مگر اس نے اپنے دور حکومت میں اپنے طرز حکومت سے تمام ملک کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور ہزاروں بے گناہوں کو ہلاک کر دینے کے احکامات صادر کیے اس نے عوام کی زندگی کو قابل رحم بنا کر رکھ دیا اور بنیادی انسانی حقوق بھی پامال کر دیئے مثلاً لوگوں کو خوراک ادویات، طبی سہولتیں اور تعلیم جیسی بنیادی ضرورتوں سے محروم کیا کر دیا۔ اہل رومانیہ بیسویں صدی میں بھی ایک تاریک دور میں رہ رہے تھے جب غیر ملکی نامہ نگاروں کو ملکی حالات کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی گئی تو ان نامہ نگاروں کو سب سے زیادہ رومانیہ کے یتیم خانوں کی حالت زار دیکھ کر ہوا جس سے انہیں اندازہ ہوا کہ چاؤشسکو کا دور کتنا خطرناک دور تھا۔

نیشنل سالویشن فرنٹ کی حکومت:

26 دسمبر کو بخارسٹ میں نیشنل سالویشن فرنٹ کی حکومت قائم ہوئی۔ آیون لیسکو IONLIESCU نے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ امریکہ اور روس نے فوراً ہی رومانیہ کی نئی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ نئے لیڈر نے چاؤشسکو کی پالیسیاں منسوخ کرتے ہوئے اس کے حکومتی ارکان کو بھی گرفتار کر لیا۔ 29 دسمبر 1989ء کو ملک میں تقریباً 45 سال بعد کثیر الجماعتی انتخابات اور نظام کا اعلان کیا گیا اور کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی جس کے ساتھ ہی ملک میں اشتراکیت کا خاتمہ ہو گیا۔ (13 جون 1990) نیشنل سالویشن فرنٹ NSF جو کہ بیشتر سابقہ کمیونسٹوں پر مشتمل تھا اس فرنٹ نے 20 مئی 1990ء کو ہونے والے کثیر الجماعتی اور پارلیمانی الیکشن جیت لیے۔ آیون لیسکو باقاعدہ منتخب صدر بنے۔ مئی 1990ء میں ہونے والے انتخابات 1943ء کے انتخابات کے بعد پہلے آزادانہ الیکشن تھے 8 دسمبر 1991ء کو نیا آئین نافذ کر دیا گیا۔ اکتوبر 1992ء میں آئیون لسکو دوبارہ صدر بنے۔ 26 نومبر 2000ء کو ایک بار صدارتی و پارلیمانی انتخابات ہوئے جن میں آئیون لسکو نے ایک بار پھر اکثریت حاصل کی۔

......☆......

1990ء بالٹک ریاستوں کی آزادی

1989ء میں جب مشرقی یورپ اور سوویت یونین میں سیاسی بے داری کی لہر اٹھی تو بحر بالٹک کے مشرقی ساحل پر
ئی بالٹک ریاستیں۔ لتھوانیا۔ لیٹویا اور اسٹونیا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان ریاستوں میں بھی قوم پرستی نے
فا۔ لتھوانیا ان ریاستوں میں پہلی تھی جہاں 21 دسمبر 1989ء کو کمیونسٹ پارٹی آف لتھوانیا نے سوویت یونین سے
زادی کے حق میں ووٹ دیا۔ پھر 11 مارچ 1990ء کو لیتھوانیا کی پارلیمنٹ نے از خود ملک کے آزادی کا اعلان کر دیا اپنے
ے ساتھ لگا ہوا لاحقہ سوویت سوشلسٹ خارج کر دیا اور اپنے علیحدہ قومی جھنڈے کو لہرایا۔ پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر
193ء کے آئین کی بحالی کی منظوری دی اور ایک نئے راہنما لانڈزبرگ کو منتخب کر لیا۔ پارلیمنٹ کی عمارت سے روسی کمیونزم کا
نن ہتھوڑا اور درانتی کو اتار دیا گیا۔

تھوانیا پر فوج کشی:

یہ سب مندرجہ بالا اقدام آزاد سوویٹ لیڈر گورباچوف کے لئے ایک نیا چیلنج تھے سوویت راہنما نے لیھوانیا کو یونین
ے اندر رکھنے کے لئے زبردست اقتصادی سیاسی اور فوجی دباؤ بڑھایا۔ 18 مارچ کو سوویت فوجوں نے بڑے پیمانے پر
تھوانیا پر فوج کشی کر دی۔ 21 مارچ کو لیتھوانیا کے ساتھ سرحد بند کر دی گئی۔ 19 اپریل کو اس کی تیل اور گیس کی سپلائی کاٹ
دی گئی تا کہ اس کا معاشرہ مفلوج ہو کر رہ جائے۔

سوویت حمایتی انقلاب:

12 جنوری 1991ء کو سوویت چھاپہ ماروں نے لیتھوانیا پر اپنی کاروائیاں دوبارہ شروع کر دیں۔ 13 جنوری کو
سوویت فوجوں نے لیتھوانیا کے 15 اہم عیسائی راہنما ہلاک کر دیئے۔ 14 جنوری کو ایک سوویت حمایتی انقلاب کے ذریعے
یک ماسکو نواز گروپ نے اقتدار سنبھال لیا۔ لیکن جلد ہی لیتھوانیا کے قوم پرست فتح یاب ہو گئے اور انہوں نے سوویت
کمیونسٹوں کو مار بھگایا۔ سوویت یونین آزادی تسلیم کرتا ہے۔ اگست 1991ء میں کمیونزم کے خاتمے پر سوویت یونین نے
آخر لیتھوانیا کو آزادی دینے کا اعلان کیا پھر 6 ستمبر 1991ء کو تینوں بالٹک ریاستوں، لیتھوانیا، اسٹوانیا اور لیٹویا کی آزادی
کو سوویت یونین نے باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا۔ روسی وزیر خارجہ نے ایک پریس کانفرنس میں ان ریاستوں کی آزادی کو تسلیم

کیا۔ اس کے بعد دیگر یورپی ملکوں نے بھی لیتھوانیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔

آزادی کا پس منظر:

لیتھوانیا بالٹک ریاستوں میں سے سب سے بڑی اور جنوبی ریاست ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ [illegible] میں انسانوں نے 2500 ق م میں بود و باش اختیار کی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں جرمنی کے نوابوں نے لیتھوانیا فتح کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ 1260ء میں لیتھوانیا کی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جرمنی نے لیتھوانیا پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1918ء میں جنگِ عظیم اول کے خاتمے پر لیتھوانیا کے قوم پرستوں نے اعلانِ آزادی کیا۔ 1919ء میں [illegible] ورسلز کے تحت اس کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا۔ مئی 1920ء میں لیتھوانیا کی پہلی آئینی اسمبلی قائم ہوئی۔ اگست 1922ء میں آئین ساز اسمبلی نے ملک کا آئین منظور کیا جس کے تحت اسے ڈیموکریٹک ری پبلک آف لیتھوانیا قرار دے دیا گیا۔

پولینڈ کا ولینس پر قبضہ:

1920ء میں پولینڈ نے لیتھوانیا کے دارالحکومت ولینس پر قبضہ اور 1923ء میں علاقہ میمل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد لیتھوانیا طویل اور پیچیدہ بین الاقوامی تنازعات میں الجھ گیا۔ کنزرویٹو اور لبرل جماعتیں ملک میں برسرِ اقتدار رہے۔ 17 دسمبر 1926ء کو فوج اور قوم پرستوں نے کنزرویٹو سیاست دان انٹاناس سمیٹونا ANTAS SMETONA کی قیادت میں انقلاب برپا کر کے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ تمام لبرل افراد کو حکومت سے نکال دیا گیا۔ انٹاناس صدر کا اور آگسٹینس الڈیمارس AUGUSTINAS VOLDEMARS نے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا۔

جرمنی سے کشیدگی اور سوویت یونین سے الحاق:

1930ء کی دہائی میں جب جرمنی میں ایڈولف ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو میمل شہر کے معاملے پر جرمن لیتھوانیا تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ جنگِ عظیم دوم کے آغاز میں جب جرمنی اور سوویت یونین نے پولینڈ کو تقسیم کیا تو اکتوبر 1939ء میں لیتھوانیا اور سوویت یونین کے مابین ایک سمجھوتا طے پایا۔ انٹاناس کو حکومت سے علیحدہ ہونا پڑا اور جون 1940ء میں نئی سوویت نواز حکومت برسرِ اقتدار آ گئی۔ اسی دوران 12 ستمبر 1934ء کو لیتھوانیا، اسٹونیا اور لٹویا کے درمیان ایک اتحاد عمل میں آیا۔ 1940ء میں نئی حکومت نے صرف ایک جماعت کمیونسٹ ورکنگ پارٹی کو قانونی حیثیت دی جس نے لیتھوانیا کو سوویت یونین میں ضم کرنے کی بڑی بھرپور مہم چلائی۔ جولائی 1940ء میں ایک ایک ایوانی پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے۔ نئی منتخب شدہ پارلیمنٹ نے ملک کو سوویت یونین میں ضم کرنے کے لئے باقاعدہ ایک قانون کی منظوری دی۔ چنانچہ 13 اگست 1940ء کو لیتھوانیا باضابطہ طور پر USSR میں ضم ہو گئی اور اسے لیتھوانین سوویت سوشلسٹ ری پبلک کا نام دیا گیا۔

امریکہ اور دوسری یورپی طاقتوں نے اس انضمام کو مسترد کرتے ہوئے محض ڈرامہ قرار دیا۔ 1940ء میں ولینس کی بازیابی تک کاؤناس ملک کا دارالحکومت رہا۔ دوسری جنگِ عظیم میں 22 جون 1941ء کو جرمنی نے لیتھوانیا پر قبضہ کر لیا جس کے بعد سوویت حکومت کے خلاف بڑے پیمانے پر بغاوت پھوٹ پڑی چنانچہ قومی مزاحمت کی تحریک نے جنم لیا۔ دوسری طرف جرمنوں نے بھی لیتھوانیا کے وسائل کو خوب لوٹا۔ جنگ کے دوران تقریباً دو لاکھ لیتھوانین باشندے ہلاک ہو گئے۔

سوویت یونین کا دوبارہ قبضہ:

1944ء میں جب جنگ میں سوویت یونین کی پوزیشن مستحکم ہوئی تو اس نے لتھوانیا پر بھی دوبارہ قبضہ کرلیا اور دوبارہ اسے سوویت سوشلسٹ جمہوریہ قرار دے دیا۔ جنگ کے بعد سوویت یونین نے لتھوانیا کے ساڑھے تین لاکھ باشندوں کو سوویت یونین کے خلاف بغاوت کے جرم میں سائبیریا کے لیبر کیمپوں میں بھیج دیا۔ 1949ء میں سوویت یونین کی دیگر سوویتوں کی طرح لتھوانیا میں بھی چرچ بند کر دیئے گئے اور کئی مذہبی راہنماؤں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ لتھوانیا کے عوام میں رفتہ رفتہ اس سوویت جمہوریہ کو قبول کرلیا۔ اگلے 45 برس تک لتھوانیا مکمل طور پر سوویت یونین کے شکنجے میں جکڑا رہا۔ 24 فروری 1990ء کو ملک میں پہلے پارلیمانی الیکشن ہوئے جن میں تقریباً 45 سال بعد غیر کمیونسٹ پارٹیوں نے کامیابی حاصل کی۔

آزادی کے بعد:

1993ء میں لتھوانیا بالٹک ریاستوں میں پہلی تھی جس نے سوویت فوجوں کو ملک سے نکال دیا۔ روسی فوج کا آخری یونٹ 31 اگست 1993ء کو ملک سے چلا گیا اسی سال لتھوانیا نے نئی کرنسی لتاس جاری کی۔ فروری 1994ء میں لتھوانیا NATO کے امن پروگرام میں شریک ہوگیا۔ جنوری 1995ء میں لتھوانیا کی پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے لتھوانین کو ملک کی سرکاری زبان قرار دے دیا جس کی ملک کے پولش اور روسی باشندوں نے مخالفت کی مگر لتھوانیا کی اصل زبان کو اس کی جائز حیثیت دی گئی۔

لیٹویا

RUPBLIC OF LATVIA

انقلاب آزادی:

1980ء کی دہائی میں آہنی پردے کے پیچھے سوویت راہنما گورباچوف نے سیاسی پابندیاں نرم کیں تو لٹوین قوم پرستی پھر سے زندہ ہوگئی۔ 1988ء میں لیٹوین پاپولر فرنٹ نامی سیاسی جماعت قائم ہوئی جس نے آزادی کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اسی ماہ سپریم سوویت کونسل نے جنگ عظیم دوم سے پہلے والا پرچم اور قومی ترانہ بحال کر دیا۔ پاپولر فرنٹ لیٹویا کی سوویت انضمام کے بعد پہلی غیر کمیونسٹ جماعت تھی۔ جنوری 1990ء میں لٹوین کمیونسٹ پارٹی نے ماسکو سے اپنے تمام روابط توڑ لئے۔ پارٹی کی آئینی اجارہ داری ختم کر دی گئی اور ملک میں کثیر الجماعتی سیاسی نظام رائج ہوا۔ مارچ اپریل 1990ء میں ملک میں پہلے پارلیمانی کثیر الجماعتی انتخابات ہوئے جس میں پاپولر فرنٹ نے فیصلہ کن کامیابی حاصل کی۔ 45 سال میں پہلی مرتبہ پریس اور مذہبی اداروں کو آزادی دے دی گئی روسی زبان کی جگہ لٹوین زبان کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ پاپولر فرنٹ کے ایوراس گوڈمانس وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

اعلان آزادی:

مئی 1990ء میں لیٹویا نے لتھوانیا کی تقلید میں اپنی آزادی کا اعلان کیا تو سوویت پیراملٹری دستوں نے دارالحکومت ریگا کے اہم مقامات پر قبضہ کرلیا اس پر شدید عالمی احتجاج ہوا جس کی وجہ سے روس کے پیراملٹری دستے لٹویا سے چلے گئے۔ 1991ء میں مارچ میں ہونے والے سوویت یونین سے الحاق کے ریفرنڈم کو لیٹویا نے مسترد کردیا۔ چنانچہ آزادی کے استصواب رائے کے لئے اہتمام کیا گیا جس میں 73.7 فی صد عوام نے آزادی کے حق میں ووٹ دیا۔ اس دوران جب کمیونسٹوں نے ماسکو میں گورباچوف کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تو سوویت فوجوں نے ریگا میں ٹی وی سٹیشن اور ریڈیو پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ لٹویا نے 21 اگست 1991ء کو فوری طور پر آزادی کا اعلان کردیا اور اناطولی گورہوف کو صدر اور ایوارس گوڈمانس کو وزیراعظم مقرر کردیا۔ 26 ستمبر 1991ء کو روس نے اس کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔ مارچ 1992ء میں روس نے اعلان کیا کہ وہ 1994ء تک اپنی فوج واپس بلالے گا۔

نئی کرنسی کا اجراء:

1992ء میں عارضی طور پر لیٹوین روبل عارضی کرنسی کے طور پر جاری کیا گیا تھا۔ مئی 1993ء میں نئی کرنسی لاٹ رائج کی گئی۔ 1993ء میں یہ ہی 1992ء کا آئین بحال کردیا گیا جس کے تحت لیٹویا میں 5 جون کو پارلیمانی انتخابات منعقد ہوئے۔

روسی انضمام کا پس منظر:

لٹویا پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں روسی قبضہ تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں لیٹویا کی عوام نے آزادی کی تحریک منظم کی اس دوران لٹویا کے لوگ سیاسی اور ثقافتی طور پر مضبوط ہوچکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مکمل آزادی کے لئے کام شروع کردیا اس تحریک آزادی کو بیسویں صدی کے آغاز میں استحکام حاصل ہوا چنانچہ روسی اور جرمن کنٹرول کمزور پڑنا شروع ہوا۔ 1905ء کے روسی انقلاب کے بعد لیٹویا کی آزادی کی راہ ہموار ہوگئی۔ لیٹوین نیشنل پولیٹیکل کانفرنس نے جولائی 1917ء میں ایگا میں ایک کنونشن منعقد کرایا جس کا مقصد مکمل سیاسی خودمختار حاصل کرنا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران 3 ستمبر 1917ء کو جرمن فوج نے ایگا کا کنٹرول سنبھالا۔ نومبر 1917ء میں جب روس میں بالشویک انقلاب آیا تو لیٹوین اسمبلی کا اجلاس والکا میں ہوا جس میں لیٹوین نیشنل کونسل قائم کی گئی۔ مارچ 1918ء میں جرمنی کے ساتھ معاہدہ بریسٹ لٹووسک میں روس نے بالٹک ریاستیں جرمنی کے حوالے کردیں۔ اپریل میں جرمنی کے زیر کنٹرول اسمبلی ایگا میں قائم ہوئی جس کے تحت لٹویا اسٹونیا پر مشتمل گرینڈ ڈیوکی قائم کردی گئی جس پر شاہ پرشیا کی حکومت تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر 18 نومبر 1918ء کو لیٹویا کو آزادی ملی۔ ملک کے پہلے صدر اور وزیراعظم منتخب کیے گئے۔

ریڈ آرمی کا قبضہ:

روس اور جرمنی نے اس نوزائدہ ملک کا کنٹرول سنبھالنے کی کوشش کی۔ چنانچہ 3 جون 1919ء کو روس کی ریڈ آرمی نے ریگا پر قبضہ کرلیا۔ لٹویا کی قومی حکومت لائی پاجا منتقل ہوگئی۔ لیٹوین صدر کی حفاظت برطانوی بحریہ نے کی۔ 3 فروری کو

جرمن ہائی کمانڈ کے حکم پر جنرل روڈیگر وون ڈر گولٹز لاٹویا جا پہنچا۔ جہاں جنرل نے ریڈ آرمی کو پسپا کیا اور اس شہر کا انتظام جرمنی نے سنبھال لیا۔ 22 مئی کو ریگا پر بھی جرمنی کا قبضہ ہو گیا۔ اس دوران اسٹونین فوج نے جس میں لیٹوین بھی شامل تھے جرمنوں کو شمال کی طرف دھکیل دیا۔ جون 1919ء میں اتحادیوں کا اجلاس ہوا تو اتحادی افواج نے جرمنوں کو لیٹویا چھوڑ دینے کا حکم دیا جس پر جرمن فوج واپس چلی گئی۔

18 اکتوبر کو روسیوں نے ریگا پر دوبارہ قبضہ کر لیا لیکن 10 نومبر کو لیٹوین فوج نے برطانیہ کی مدد سے روسیوں اور جرمنوں کو شکست دی۔ اب صرف لاٹ گیل کا شہر روسیوں کے قبضے میں رہ گیا جسے جلد ہی آزاد کرا لیا گیا۔ اپریل 1920ء میں لیٹوین آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ 11 اگست کو روس سے معاہدہ طے پا گیا جس کے تحت روس نے لیٹویا کے تمام علاقوں سے دست برداری اختیار کی۔ 12 ستمبر 1934ء کو لیٹویا نے دوسری بالٹک ریاستوں سے اتحاد کر لیا ایمرجنسی کے بعد تمام سیاسی جماعتیں توڑ دی گئیں

دوسری جنگ عظیم:

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر لیٹویا نے اپنی غیر جانب داری کا اعلان کیا۔ ستمبر 1939ء میں روس نے لیٹویا سے فوجی اڈے قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اگست 1939ء میں سوویت جرمن عدم جارحیت کے معاہدے کے بعد روس نے لیٹویا کو مجبور کر کے لیٹوین علاقے میں اپنے بحری اور فضائی اڈے قائم کیے۔

روس کا لیٹویا پر قبضہ:

1940ء میں سوویت یونین نے لیٹویا پر الزام لگایا کہ وہ اسٹونیا کے ساتھ مل کر سوویت یونین کے خلاف فوجی اتحاد بنا رہا ہے۔ اسی الزام کی آڑ میں 16 جون 1940ء کو روس نے لیٹویا پر اپنی فوجوں سے قبضہ کر لیا۔ لیٹوین کمیونسٹ حکومت پر قابض ہو گئے۔ 20 جون کو آگستا کرچن کی قیادت میں نئی حکومت تشکیل دی گئی۔ 15 جولائی کو سوویت فوج کی نگرانی میں نئے انتخابات ہوئے۔ 21 جولائی کو سابقہ صدر اور وزیر اعظم کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسی روز اسمبلی نے جس کو منتخب ہی انضمام کے لئے کیا گیا تھا روس سے انضمام کی منظوری دی۔ 15 اگست 1940ء کو لیٹویا سوویت یونین کا حصہ بن گیا اور اس کا نام لیٹوین سوویت سوشلسٹ جمہوریہ قرار پایا۔ روسی قبضے کے بعد 35 ہزار لیٹوین لوگ روس بھیج دیئے گئے جن میں ملک کے انتہائی ذہین لوگ شامل تھے۔ جولائی 1941ء سے اکتوبر 1944ء تک لیٹویا کا صوبہ لارج آسٹ لینڈ جرمنی کا صوبہ بنا رہا جس میں اسٹونیا، لتھوانیا اور بائلو رشیا بھی شامل تھے۔ 1944ء میں سوویت فوجوں نے اسے واپس لے لیا۔ چنانچہ کرچن سٹین پریم سوویت کے صدر بحال ہو گئے۔ سوویت فوجوں کی واپسی سے پہلے تقریباً 65 ہزار لیٹوین باشندے ملک چھوڑ کر جرمنی اور سویڈن فرار ہو گئے۔

سوویت کمیونسٹوں نے اپنی دوبارہ آمد کے بعد اپنے مخالفوں کو یا تو قتل کر دیا یا سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔ مارچ 1949ء میں تقریباً 70 ہزار لیٹوین باشندوں کا سائبیریا بھیج دیا گیا۔ لیٹوین عوام نے کچھ عرصہ سوویت یونین کے قبضے کے خلاف مزاحمت کی لیکن 1950ء میں یہاں مکمل روسی غلبہ ہو گیا اور عوامی مزاحمت ختم ہو گئی۔ 1969ء تک ملک میں لیٹوین کمیونسٹ پارٹی کے اراکین کی تعداد 111370ء تک جا پہنچی۔ جولائی 1970ء میں سوویت یونین نے لیٹویا کی سوویت یونین میں شمولیت کی

30ویں سالگرہ منائی گئی بکھر گئے اس سالوں میں لیتھوینین قوم پرستی کی بیداری سے بالآخر لیتھونیا روس سے آزاد ہو گیا۔

اسٹونیا

REPUBLIC OF ESTONIA

24 فروری 1918ء کو اسٹونیا دنیا کے نقشے پر ایک آزاد جمہوریہ کے طور پر ابھرا تھا۔ بالشویک انقلاب روس کے بعد 2 فروری 1920ء کو روس اور اسٹونیا میں ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے اسٹونیا پر روسی عملداری ختم کر دی گئی۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی نے نئی جمہوریہ اسٹونیا کو تسلیم کر لیا۔ 15 جون کو اس نے نوزائیدہ مملکت میں نیا آئین نافذ کیا گیا۔

اسٹونیا کی آزادی کا خاتمہ:

ستمبر 1934ء میں اسٹونیا اور دیگر بالٹک ریاستوں میں اتحاد عمل میں آیا تھا۔ 1939ء میں ہٹلر سٹالن سمجھوتے کے تحت اسٹونیا کی آزادی سلب کر لی گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران 1940ء میں سوویت فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ 6 اگست 1940ء کو اسٹونیا کو سوویت یونین کا حصہ بنا دیا گیا۔ اسے اسٹونین سوویت سوشلسٹ جمہوریہ ESSR کا نام دیا گیا۔

جرمنی کا قبضہ:

جون 1941ء میں جرمنی فوجوں نے اسٹونیا پر قبضہ کر لیا اور کہیں جا کر 30 ستمبر 1944ء کو جرمن یہاں سے نکالے گئے اور دوبارہ سوویت فوجیں واپس آ گئیں۔ اس عرصے میں اسٹونین باشندوں کی بڑی تعداد جرمنی اور سویڈن چلی گئی اگلے 45 سال تک اسٹونیا پر آہنی پردہ پڑا رہا اور روسی حاکمیت قائم رہی۔

دوبارہ آزادی:

30 مارچ 1990ء کو ہونے والے انتخابات میں روسی اعلیٰ قیادت نے سیاسی پابندیاں نرم کر دیں جس کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت نے دیگر بالٹک ریاستوں کی تقلید میں اسٹونیا کو بھی آزاد ملک قرار دیا۔ 20 اگست 1991ء کو اسٹونیا نے سوویت یونین سے اپنی آزادی کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ 6 ستمبر کو خود روس نے اس کے اعلان آزادی کو تسلیم کر لیا۔ اور اس طرح اسٹونیا ایک آزاد اور خودمختار ریاست بن گیا۔ 15 اکتوبر کو روس اور اسٹونیا میں ہونے والے ایک معاہدے کے تحت روس نے اکتوبر کے آخر تک اپنی افواج اسٹونیا سے نکال لیں۔ 1992ء میں آزاد جمہوریہ کا نیا آئین نافذ کیا گیا اور نئی کرنسی کرون رائج ہوئی۔ 20 ستمبر 1992ء کو 50 سال میں ملک کی تاریخ کے پہلے آزادانہ انتخابات ہوئے۔ 5 اکتوبر کو لینارٹ ماری LENART MAERI صدر منتخب ہوا اور 8 اکتوبر کو مارٹ لار MART LAR ملک کے وزیراعظم بنے۔ 1993ء میں دیگر ہمسایہ بالٹک ریاستوں سے تجارت اور دوستی کا معاہدہ ہوا۔

ناٹو میں شمولیت:

1994ء میں اسٹونیا نے ناٹو کے امن پروگرام میں شمولیت اختیار کی۔ 31 اگست کو تمام روسی افواج واپس چلی گئیں۔ ستمبر میں فادر لینڈ پارٹی کے راہنما وزیراعظم مارٹ لار کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور ہو گئی اور عبوری حکومت تشکیل دی گئی۔

1990ء مشرقی اور مغربی جرمنی کا متحد ہونا

13 اکتوبر 1990ء کو فرط مسرت سے جرمن عوام گلے مل رہے تھے اور خوشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ہر طرف سیاہ سرخ اور سبز رنگ والے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ سب خوشی جرمن قوم کے یکجا ہونے کی منائی جارہی تھی جو تقریباً 45 سال بعد ایک بار پھر متحد ہوگئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد 1945ء میں جرمنی دو حصوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ اس کا ایک حصہ مغربی جرمنی کہلاتا تھا جبکہ دوسرا جو روسی کمیونزم کے چنگل میں پھنس گیا تھا مشرقی جرمنی کہلاتا تھا۔ لیکن یہ تغیر و تبدیلی اتنی سرعت سے آئی کہ صرف گیارہ سال پہلے کی تاریخ اس صورت حال کی نشاندہی نہیں کرتی۔ نومبر 1989ء میں البتہ جرمنی کی تاریخ میں ایک موڑ یہ آیا تھا کہ برلن شہر کو دو حصوں میں منقسم کرنے والی بدنام زمانہ دیوار برلن گرادی گئی تھی جو جرمنی کے اتحاد کی طرف ایک واضح قدم تھا۔

تاریخ جرمنی کا اہم موڑ۔ 10 نومبر 1989ء کو دیوار برلن جو گذشتہ 28 سال سے کمیونزم کی علامت سمجھی جاتی تھی اور خوف کا نشان تھی گرادی گئی۔ رات 12 بجے مشرقی جرمنی کی حکومت نے اپنی سرحدیں کھول دیں اور پھر وہ دیوار جو آٹھ فٹ بلند اور شہری اور شخصی آزادی کا خاتمہ کر کے برلن شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی، اب سرد جنگ کے ساتھ ساتھ قصہ پارینہ بن گئی۔ اس رات صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر ہزاروں لوگ مشرقی جرمنی کی سرحد پر جمع ہوگئے، جبکہ ہزاروں دیوار پر چڑھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ کچھ نے ہتھوڑوں سے کنکریٹ کے اس بیریر کو توڑنا شروع کردیا اور کچھ نے ٹوٹی ہوئی دیوار کے ٹکڑوں کو برے وقت کی نشانی کے طور پر جمع کرنا شروع کردیا اور کچھ فرط جذبات سے رونے لگے تھے۔

مغربی جرمنی نے اپنے ہم وطنوں کے لئے دروازے کھول دیئے اور جرمن کے چانسلر ہلمٹ کوہل نے ایک خطاب میں مشرقی جرمنی سے آنے والوں کو خوش آمدید کہا تھا۔ صرف ایک سال کے اندر اندر دو لاکھ پچیس ہزار مشرقی جرمنی سے اور تین لاکھ افراد سوویت یونین اور پولینڈ سے مغربی جرمنی میں داخل ہوئے۔ صرف چند ماہ پہلے مشرقی جرمنی کے سربراہ اریک ہونیکر نے دیوار برلن کے سو سال تک کے قیام کا دعویٰ کیا تھا۔ اس میں شک بھی کوئی نہیں تھا کیونکہ مغرب کے تجزیہ نگاروں کے نزدیک مشرقی جرمنی میں کوئی انقلابی تبدیلی دور نزدیک تک متوقع نہیں تھی۔ مگر اچانک حالات نے پلٹا کھایا اور بنیادی تبدیلیوں کا وقت آگیا۔ مشرقی جرمنی کے حکام نے تاریخ میں پہلی بار آزادانہ انتخابات منعقد کرائے اور آزادی رائے کے لئے قوانین متعارف کرانے کا اعلان کیا۔ پھر 18 اکتوبر 1989ء کو ہونے والے مظاہروں اور لوگوں کے مغرب کی طرف

ہجرت کرنے کے ارادے کے سامنے مشرقی جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے مگر ملک کی افرادی قوت میں اس قدر کمی ہو گئی کہ حکومت کو بسیں اور ٹرینیں چلانے کے لئے فوج کی خدمات حاصل کرنا پڑیں مشرقی جرمنی کے نئے سربراہ ریگون کرینز نے سوویت صدر گورباچوف کے اشارے پر مغرب کی طرف نقل مکانی پر عائد تمام پابندیوں یکسر ختم کر دیا تھا۔ جو جرمنی کی تاریخ میں ایک اہم اور انقلابی موڑ ثابت ہوا۔

جدید جرمنی کے معمار:

آج کے جدید اور متحدہ جرمنی کے معمار آٹو وون بسمارک تھے جنہوں نے 1867ء میں جرمن کنفیڈریشن کی بنیاد رکھی تھی۔ 1870ء میں اس جرمنی نے فرانس کے خلاف اپنے تنازعات حل کرنے کے لئے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ اس جنگ میں فرانس کو شکست ہوئی اور بسمارک نے تمام جرمن علاقوں کو متحد کر کے جرمن سلطنت کی بنیاد رکھی۔

شاہ ولیم اول:

18 جنوری 1871ء کو شاہ ولیلم اول جرمنی کا شہنشاہ بنا۔ اور 1888ء تک وہ تمام جرمنی کا متحدہ بادشاہ بن گیا۔

پہلی جنگ عظیم:

1914ء سے پہلے جرمنی سلطنت اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جرمنی فرانس کے درمیان 1870ء کی جنگ کے بعد جو صلح نامہ ہوا تھا اسی کی شرائط کی وجہ سے یکم اگست 1914ء کو روس اور فرانس کے خلاف جرمنی نے اعلان جنگ کر دیا جس کے جواب میں 4 اگست کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

مشرقی جرمنی (تعارف)

جنگ عظیم دوم میں روس کے قبضے میں جرمنی کا جو حصہ تھا اس کو 7 اکتوبر 1949ء کو جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک GDR کا نام دیا گیا تھا۔ اس کا رقبہ 10178 مربع کلومیٹر یا 41768ء مربع میل تھا اور دارلحکومت برلن۔ 11 اکتوبر 1949ء کو ولیم پائیک پہلے صدر اور اوٹو گروٹ وہل پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے۔ روسی اثرات سے مکمل آزادی اگرچہ اسے کبھی نہ مل سکی مگر 1954ء میں یہ داخلی اور خارجی معاملات میں آزاد کر دیا گیا تھا لیکن سوویت فوج ملک کی حفاظت کے لئے موجود رہیں۔ ملک کے قیام کے بعد سوشلسٹ یونٹی پارٹی (کمیونسٹ پارٹی) برسر اقتدار آئی اور ملک کی واحد قانونی سیاسی جماعت قرار پائی۔ یہ پارٹی اگلے چالیس سال تک اقتدار پر قابض رہی۔ مشرقی جرمنی 1960ء کی دہائی تک شدید اقتصادی مشکلات کا شکار رہا اس کے بعد ایک نیا اقتصادی نظام متعارف کرایا گیا جس کے تحت تمام صنعتی وتجارتی ادارے حکومت کو فروخت کر دیئے گئے۔ مئی 1972ء میں باقی ماندہ نجی ادارے اور کمپنیاں بھی حکومت کے ہاتھ بیچ دی گئیں۔ 18 سال برسر اقتدار اریک ہونیکر 1989ء میں مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئے۔ 4 نومبر 1989ء کو چیکوسلواکیہ کے ساتھ سرحدیں کھول دی گئیں 23 اگست 1990ء کو مشرقی جرمنی کی پارلیمنٹ نے متحدہ جرمنی کی منظوری دے دی۔

مغربی جرمنی (تعارف)

امریکہ برطانیہ اور فرانس کے مفتوحہ حصوں کو یکجا کر کے 23 مئی 1949ء وفاقی جمہوریہ جرمنی F.R.G کا قیام عمل میں آیا اور بون اس کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ یہ گیارہ ریاستوں پر مشتمل وفاق تھا جس کا رقبہ 95976 مربع میل تھا۔ یکم جولائی 1949ء کو آئینی اسمبلی نے نیا آئین نافذ کیا۔ قابض طاقتوں یعنی اتحادی ممالک نے 21 ستمبر 1949ء کو اس کے تمام شہری حقوق بحال کر دیے۔ 2 جولائی 1951ء کو امریکہ نے وفاقی جرمنی کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کر دیے۔ 5 مئی 1955ء کو اسے مکمل آزادی مل گئی اور اتحادی افواج واپس بلا لی گئیں۔ کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی کے راہنما ڈاکٹر کونراڈ ، ڈینار 15 ستمبر 1949ء کو پہلے چانسلر بنے تھے۔ 1953,1975,1961 میں بھی چانسلر منتخب ہوئے۔ 1969ء میں سوشل ڈیموکریٹک اور فری ڈیموکریٹک کی مخلوط حکومت بنی جس کے سربراہ ولی برانٹ تھے۔ مئی 1974ء میں ان کے استعفیٰ کے بعد ہلمٹ شمٹ چانسلر بنے۔ 3 اکتوبر 1990ء کو مغربی جرمنی، متحدہ جرمنی کا حصہ قرار پایا۔

.... اور یوں چار سال تک جرمنی جنگ کی حالت میں رہا۔ جنگ عظیم اول میں جرمنی کو اتحادیوں کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی اور اپنی تمام نوآبادیوں، دو بندرگاہوں اور کافی بڑے حصے سے محروم ہونا پڑا، ساتھ ہی تاوان جنگ اور دیگر اقتصادی پابندیاں بھی اس پر عاید کر دی گئیں۔

جمہوریہ جرمنی:

جنوری 1919ء میں اور فریڈرک ایبرٹ اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ جمہوریہ کے قیام کے بعد جرمنی نے اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پا لیا۔ مگر یہ جرمنی کی تاریخ کا انتہائی پریشان کن دور تھا۔ اسی دور میں ایڈولف ہٹلر ایک بڑا قوم پرست راہنما بن کر ابھرا۔ 24 فروری 1920ء کو ہٹلر نے نیشنلسٹ سوشلسٹ جرمن ورکرز نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دی جو نازی پارٹی کہلاتی تھی۔

صدر ہنڈن برگ:

1925ء میں فریڈرک ایبرٹ انتقال کر گئے ان کی جگہ مشہور جرمن جرنیل مارشل پال ہنڈن برگ کو صدر منتخب کر لیا گیا ادھر 1929ء تک نازی پارٹی نے بھی اپنے مخالفین کی نسبت زیادہ طاقت حاصل کر لی 1932ء کے انتخابات میں ہنڈن برگ نے ہٹلر کو شکست دی مگر جنوری 1933ء میں خانہ جنگی سے بچنے کے لئے ہٹلر کو چانسلر بنا دیا گیا۔

ایڈولف ہٹلر:

جلد ہی ہٹلر نے ایک قانون کے ذریعے آمرانہ اختیارات حاصل کر لئے۔ 14 اکتوبر 1933ء کو ملک میں باقی تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ 14 اکتوبر کو ہٹلر نے جرمنی کو لیگ آف نیشن کی رکنیت سے علیحدہ کر لیا۔ 12 نومبر

کو ہونے والے استصواب رائے میں نازیوں کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی اور ہٹلر ایک عظیم قوم پرست راہنما بن گیا۔ 2 اگست 1934ء کو صدر ہنڈن برگ کے انتقال کے بعد ہٹلر جرمن کا صدر بھی بن گیا۔ ساتھ ہی اس نے جرمن فوج کے سپریم کمانڈر کا عہدہ بھی سنبھال لی اور صدر کا لقب ختم کر کے فیوہرر کہلانے لگا ہٹلر نے اقتدار حاصل کرتے ہی مغربی اقوام سے جرمنی کی جنگ عظیم اول کے بعد ہونے والی تذلیل کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اس نے اتحادی ممالک سے معاہدہ ختم کر دیا اور جرمنی ایک عظیم فوجی طاقت بن کر ابھرا۔ 15 اگست کو سواستیکا کا آریائی نشان جرمنی کا تیاری نشان قرار پایا۔ 4 فروری 1938ء کو ہٹلر نے وزیر جنگ کا عہدہ بھی سنبھال لی۔

جنگ عظیم دوم:

یکم ستمبر 1939ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر کے اس قبضہ کر لیا اسی سے جنگ عظیم دوم کا آغاز ہو گیا۔ جنگ عظیم دوم کے آغاز میں جرمنی، آسٹریا، چیکوسلواکیہ، روس اور یورپ کے بیشتر ممالک پر قابض ہو گیا لیکن بعد ازاں امریکہ کی شمولیت کے بعد اتحادیوں نے جرمنی کو شکست دی اور 13 اپریل 1945ء کو ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ 8 مئی 1945ء کو جرمنی نے شکست کو تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے۔ 5 جون 1945ء کو چار قومی اتحادی کونسل نے جرمنی کو اپنی تحویل میں لے لیا اور جرمنی کو چار حصوں میں منقسم کر دیا۔ 17 جولائی کو برلن کانفرنس میں امریکی صدر ٹرومین روسی راہنما سٹالن اور برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی نے اتحادی کونسل کے اصول متعین کیے روس کے حصے میں جرمنی کے مشرقی علاقے آئے۔ 1946ء میں امریکہ اور برطانیہ نے اپنے اپنے مقبوضہ علاقوں کو متحد کرنے کا فیصلہ کیا بعد ازاں فرانس نے بھی اپنا مقبوضہ علاقہ ساتھ ملا دیا۔ 20 مارچ 1948ء کو روس اتحادی کونسل سے الگ ہو گیا۔ 31 مئی کو امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے مغربی علاقوں پر مشتمل ایک جرمن ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کیا، تو روس نے مغربی علاقوں کی ناکہ بندی کر دی پھر 23...... 1949ء کو بون میں مغربی جرمنی وجود میں آیا۔ دوسری طرف مشرقی حصے میں روس نے انتخابات کا ڈھونگ رچا کر کمیونسٹ پارٹی کو اقتدار سونپ دیا اور 17 اکتوبر 1949ء کو مشرقی جرمنی وجود میں آ گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے قائد والٹر بریخت۔ 1971ء تک مشرقی جرمنی میں سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ 13 اگست 1961ء کو مشرقی جرمن نے برلن کی تقسیم کے لئے دیوار برلن تعمیر کی جو دونوں ملکوں کی عوام کے لئے مشکلات لے کر آئی۔

......☆......

1991ء صومالیہ کے ڈکٹیٹر کا فرار

صومالیہ کا سفاک ترین ڈکٹیٹر جنرل محمد سیاد بارے جس نے 21 سال تک صومالیہ کی بدحال عوام پر جابرانہ اور سفاکانہ ...ز میں حکومت کی۔ 26 جنوری 1991ء کو رات دارالحکومت موگادیشو سے فرار ہو کر ابوظہبی پہنچ گیا۔ جنرل محمد سیاد نے 198...ء میں اپنی ایئر فورس کو باغیوں کے ایک ٹھکانے پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں تقریباً 20 ہزار افراد ...رے گئے تھے اب بھی وہ اپنے پیچھے تباہ شدہ اور برباد شہر چھوڑ گیا۔ اس شہر میں سہولیات زندگی مفقود ہو چکی تھیں اور مسلح ...غیوں کے گروہ جو زیادہ تر نوجوانوں پر مشتمل ہیں بازاروں اور گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ لیکن یہ امر باعث حیرت ہے کہ آج جس ڈکٹیٹر کے خلاف یہ انقلاب برپا ہوا وہ خود بھی انقلاب کی پیداوار تھا۔

جنرل محمد سید بارے کے فوجی انقلاب تک:

26 جون 1960ء کو برطانوی صومالیہ لینڈ کو آزادی دی گئی جس کے چار روز بعد یکم جولائی کو برطانوی و اطالوی صومالی لینڈ کو باہم ضم کر کے جمہوری صومالیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آزادی کے بعد صومالیہ ایک پارلیمانی جمہوریہ قرار پایا۔ پہلی آزاد حکومت صومالی یوتھ لیگ DYL اور صومالیہ نیشنل لیگ SNL کے اتحاد سے بنی۔ جنوبی علاقے کے عبدی رشید علی شیرمارکے ملک کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ شمالی علاقے کے محمد ابراہیم ایگال نائب وزیر اعظم و وزیر تعلیم قرار پائے۔

پہلا آئین:

20 جون 1961ء کو ملک کا پہلا آئین نافذ کیا گیا جس کے تحت 6 جولائی 1961 کو عدن عبداللہ عثمان دار ملک کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ دسمبر 1961ء میں برطانیہ کے زیر تربیت افسروں نے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جو ناکام ہو گئی۔

پہلے انتخابات:

30 مارچ 1964ء کو آزادی کے بعد ملک کے پہلے انتخابات منعقد ہوئے جن میں SYL نے قومی اسمبلی میں 123 میں 69 سیٹیں جیت لیں، چنانچہ 6 ماہ سے جاری سیاسی بحران کے بعد شیرمارکے کی جگہ عبدالرزاق حاجی حسین وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ جون 1967ء میں ہونے والے انتخابات میں شیرمارکے نے صدر عثمان کو شکست دی اور شیرمارکے

صدر بن گئے۔

انقلاب کی آمد:

15 اکتوبر 1969ء کو صدر جمہوریہ شیر مارکے کو ایک خاندانی جھگڑے میں قتل کر دیا گیا اور وزیر اعظم ایگال نے عبوری حکومت سنبھال لی لیکن اس کے صرف چھ روز بعد 21 اکتوبر کو فوج کے سربراہ میجر جنرل محمد سیاد بارے نے فوجی انقلاب برپا کر کے ایگال کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ جنرل سیاد بارے نے پارلیمنٹ توڑ دی اور آئین منسوخ کر دیا۔ کابینہ کے تمام وزراء کو گرفتار کر لیا گیا۔ تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دیدیا گیا۔ جنرل بارے 25 ارکان پر مشتمل سپریم انقلابی کونسل کے سربراہ بن گئے ملک کا نام اب ڈیموکریٹک جمہوریہ صومالیہ قرار پایا۔ مئی 1970ء میں حکومت نے بہت سی غیر ملکی کمپنیوں کو تحویل میں لے لیا۔ فوجی حکومت سے سوویت یونین نے مضبوط تعلقات قائم کئے۔ جنوری 1972ء کو صومالیہ میں سوشلزم کو نافذ کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ تمام غیر سرکاری اور نجی ادارے قومی ملکیت میں لے لئے گئے۔ 22 فروری 1974ء کو جنرل سیاد بارے نے لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کی۔ 1974ء ہی میں صومالیہ میں قحط سالی سے بہت سا جانی نقصان ہوا اور چراگاہیں مویشیوں سے خالی ہو گئیں۔

نظام حکومت کی تبدیلی:

جولائی 1976ء میں جنرل بارے نے نظام حکومت میں تبدیلی کی اور سپریم انقلابی کونسل کی جگہ نئی سیاسی تنظیم صومالی انقلابی سوشلسٹ پارٹی TSRSP قائم کی۔ بعد میں یہی جماعت ملک کی واحد قانونی سیاسی جماعت قرار پائی۔ 1977ء کے آخر میں صومالیان ایتھوپیا کے علاقے اگادین پر قبضہ کر لیا۔ جس سے اگادین میں جنگ چھڑ گئی۔ شروع میں صومالی فوج نے حبشہ کے شہریوں کو تمام اہم مقامات سے بھگا دیا لیکن روس اور کیوبا نے ایتھوپیا کی مدد کی تو صومالیہ نے روس سے تعلقات ختم کر لئے۔ نومبر 1977ء میں روس کے فوجی اڈے بند کر دیئے گئے اور روسی مشیروں کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد صومالیہ نے امریکہ اور یورپی ممالک سے امداد طلب کی۔ ادھر حبشہ کی افواج نے روسی مدد سے صومالیہ کی افواج کو پسپا کر دیا۔ مارچ 1978ء میں صومالیہ نے ایتھوپیا سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ اپریل 1978ء میں جنرل بارے کا تختہ الٹنے کے لئے ایک ناکام فوجی انقلاب برپا ہوا جو ناکام ہو گیا۔ اگست 1979ء میں نئے آئین کے لئے استصواب رائے ہوا۔

نئے آئین کا نفاذ:

23 ستمبر 1979ء کو ملک میں نیا آئین نافذ کر دیا گیا اس آئین کی رو سے صومالیہ ایک اشتراکی جمہوریہ بن گیا۔ 30 ستمبر کو عام انتخابات منعقد ہوئے یکم جنوری 1980ء کو جنرل سیاد بارے صومالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ 1980ء ہی میں ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی اور قومی اسمبلی معطل کر دی گئی اور کئی فوجی افسر اور جید عالم گرفتار کر لئے گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ 1981ء کے آخر میں ایمرجنسی ختم کر دی گئی۔ 1982ء میں ایتھوپیا کے ساتھ اگادین کے مسئلے پر دوبارہ لڑائی ہوئی۔ جون 1986ء میں ہمسائیہ ممالک کے قحط زدگان کی بڑی تعداد صومالیا آئی اسی سال ایتھوپیا سے امن معاہدہ طے پایا مگر

شمالی علاقے میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ 14 جولائی 1989ء کو ملک میں فسادات بھڑک اٹھے۔اس عرصہ میں حکومت کا کنٹرول صرف موگادیشو اور دو دیگر شہروں پر رہ گیا۔صدر بارے نے ملک پر کنٹرول کرنے کے لئے اپنے بیٹے مصلح محمد بارے کو مسلح افواج کا سربراہ اپنے بھائی عبدالرحمن بارے کو وزیر خارجہ اور داماد احمد کو وزیر داخلہ مقرر کیا۔اس حکومت نے ایتھوپیا سے دوستانہ تعلقات کا آغاز کیا مگر ملک کی صورت حال بگڑتی گئی۔

متحدہ محاذ کی تشکیل:

1990ء میں ملک کے مختلف قبیلوں نے حکومت کے خلاف ایک متحدہ محاذ تشکیل دے دیا۔ 2 جنوری 1992ء کو ملک میں شدید خانہ جنگی شروع ہوگئی فوجی حملوں میں بے شمار لوگ مارے گئے۔صدر بارے کے خلاف مظاہروں اور خانہ جنگی نے زور پکڑا۔حالات بے قابو ہونے لگے تو جنرل محمد سیاد بارے 26 جنوری کی رات موگادیشو سے فرار ہوگیا۔

خانہ جنگی:

اگلے روز گوریلا لیڈر جنرل محمد فرح عدید کی سربراہی میں حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا، مگر فرح عدید کے اس اقدام سے عدید اور بارے قبائل میں ایک گوریلا جنگ کا آغاز ہوگیا۔ 30 جنوری کو علی مہدی محمد نے خود کو صدر قرار دے دیا۔ چنانچہ اب عدید اور مہدی کے حامیوں میں بھی جنگ چھڑ گئی۔ مئی 1991ء میں سابق حکمران محمد ابراہیم ایگال نے متنازعہ صومالی لینڈ قائم کر لی محمد ابراہیم نے خود اس جمہوریہ کا صدر قرار دے دیا۔ عالمی طاقتوں نے صومالی نیشنل موومنٹ کی اس حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس صورت حال میں اقوام متحدہ نے جنگ بندی کروائی جو جلد ہی ٹوٹ گئی۔ اقوام متحدہ نے پاکستان اور امریکہ کی فوج امن بحال کرنے کے لئے صومالیہ بھجوائی۔ جولائی 1992ء میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے واضح کر دیا کہ صومالیہ میں کوئی حکومت نہیں ہے۔ 9 دسمبر کو امریکی میرین بحریہ موگادیشو کے قریب اتر گئی۔ جنرل عدید اس امریکی مداخلت کا سخت مخالف تھا اس نے حملہ کر کے کئی امریکی ہلاک کر دیئے۔

قحط زدگی:

اگست 1992ء میں صومالی شدید قحط کی زد میں آ گیا۔اس قحط میں 15 لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ عالمی اداروں نے خوراک کی ترسیل بحال کی۔ 18 جنوری 1994ء کو متحارب گروپوں میں نیروبی میں ایک معاہدہ طے پایا۔ ادھر اپنے 30 فوجی مروانے کے بعد امریکی فوج واپس چلی گئی۔ 5 جون 1993ء کو گوریلوں نے پاکستانی امن فوج کے 25 جوان شہید کر دیئے۔ مارچ 1995ء میں اقوام متحدہ کی فوج صومالیہ سے چلی گئی۔ ملک میں ابھی تک کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی اور دارالحکومت موگادیشو بدستور متحارب گروہوں میں تقسیم تھا۔

جنرل فرح عدید کی ہلاکت:

یکم اگست 1996ء کو صومالیہ کا جنگجو سردار جنرل محمد فرح عدید فائرنگ میں ہلاک ہوگیا، فرح عدید کے بیٹے حسین عدید نے اپنے گروپوں کی قیادت سنبھال لی۔ مارچ 1997 میں متحارب گروپوں میں ایک عبوری امن کا معاہدہ طے پایا دسمبر میں طے ہوا کہ عبوری حکومت تشکیل دی جائے جو 2003ء میں انتخاب کروائے۔ اگست 1998ء میں الاتحاد الاسلام

کے لیڈر عبداللہ یوسف احمد نے گولدوگوب کے نواح میں پنٹ لینڈ کی ریاست قائم کرلی 26 فروری 2000ء میں اقوام
متحدہ کی نگرانی میں 9 سال بعد اقوام متحدہ کی نگرانی میں مہاجرین کو واپسی شروع ہوئی۔

پارلیمنٹ کا اجلاس:

13 اگست 2000ء کو دس سال کے شدید سیاسی انتشار کے بعد پہلی پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد ہوا۔ 26 اگست میں جبوتی
عبوری پارلیمنٹ نے ہمسائیہ ملک جبوتی میں اپنے اجلاس میں عبدالقاسم صلات حسن کو صومالیہ کا نیا صدر منتخب کیا۔ 10 سال
کے بعد ملک میں صدر کا انتخاب ہوا اس عرصے میں نہ کوئی صدر تھا اور نہ ہی کوئی مرکزی حکومت۔ 18 اکتوبر کو صدر نے علی
خلیفہ گلائیڈ کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ 28 اکتوبر 2001ء میں وزیر اعظم خلیفہ گلائیڈ کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور کرلی۔ 12
نومبر 2000ء کو صدر صلات نے سابقہ وزیر آب حسن البشیر کو وزیر اعظم مقرر کیا۔

......☆......

1991ء سوویت یونین کے وفاق کا خاتمہ بالشویک انقلاب کی رد میں ایک خاموش انقلاب

گورباچوف کا آخری خطاب:

گورباچوف نے 25 دسمبر 1991ء کو کریملن میں اپنا آخری خطاب یوں شروع کیا۔ میں سوویت یونین کے صدر کی حیثیت سے اپنی سرگرمیاں ترک کر رہا ہوں اور یہ سوویت عوام سے خطاب کرنے کا میرا آخری موقع ہے پھر گورباچوف نے اعتراف کیا کہ بحیثیت صدر گذشتہ چھ سالوں میں مجھ سے بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں اس کے بعد گورباچوف نے فخریہ طور پر اپنے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا، انہیں کامیابیوں کی وجہ سے آج ہم ایک نئی دنیا میں جی رہے ہیں اگرچہ صدر گورباچوف مورخین کے مطابق یہ بات صحیح کہ رہا تھا کہ 1985ء کے سوویت یونین اور آج کے سوویت یونین میں بہت فرق آچکا تھا۔ مگر صدر گورباچوف کا استعفیٰ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ 1991ء کے آخر تک سوویت یونین مکمل طور پر زوال کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی 15 کی 15 سوویتوں نے اپنی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور ایسے میں گورباچوف بغیر مملکت کے اس کا سربراہ کیسے رہ سکتا تھا۔ اگلے دن بورس یلسن نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہوئے USSR کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔

پہلے آزادانہ انتخابات:۔

روس میں مارچ 1989ء میں روسی بالشویک انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ آزادانہ انتخابات ہوئے اور بیوروکریٹک نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ سوویت پارلیمنٹ جو سپریم سوویت پارلیمنٹ کہلاتی ہے دو ایوانوں پر مشتمل تھی، ان میں سے ایک کو قومیتوں کی مجلس اور دوسرے کو ایوان نمائندگان کہا جاتا ہے۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ آزادانہ پاپولر فرنٹ کے امیدواروں نے بھی انتخابات میں حصہ لیا۔ مختلف پارٹیوں کی موجودگی کی وجہ سے عوام میں پہلی بار جوش وخروش پیدا ہوا اور رائے دہندگان کی بڑی تعداد نے حصہ لیا یوں آہنی پردے کے پیچھے جمہوریت نے انگڑائی لی جو روس کی تاریخ میں ایک انقلابی موڑ تھا۔

یو ایس ایس آر کی تنسیخ:

سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے دیگر اشتراکی ممالک کے دساتیر میں یہ شق موجود تھی کہ اگر کوئی ریاست وفاق سے علیحدہ ہونا چاہے تو ایسا کر سکتی ہے۔ جس کا طریقہ یہ تھا کہ اس ریاست میں استصواب رائے سے معلوم کیا جائے کہ وہ ریاست وفاق کے ساتھ رہنا چاہتی ہے یا علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے اسی طریقہ کار کے مطابق بعد ازاں یوگوسلاویہ کی ریاستوں مقدونیہ، سلوونیہ، کروشیا اور بوسنیا ہرزگوینیا نے وفاق سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ سوویت یونین میں اسی طریق پر چلتے ہوئے تین بالٹک ریاستوں اور جارجیا نے علیحدگی کا اعلان کیا۔ 1991ء میں جب صدر گورباچوف ایک تفریحی مقام پر چھٹیاں گزار رہے تھے تو ان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نائب صدر گناڈی یانیف اور اس کے ساتھیوں نے اعلان بغاوت کرتے ہوئے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

میخائل گورباچوف

کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کے سیکرٹری جنرل (1985ء۔1991ء) اور سوویت یونین کے صدر۔ اس کی اپنے ملک میں جمہوریت کے قیام کے لئے کوششوں اور سوویت معیشت کے نظام میں تبدیلی کی وجہ سے کمیونزم کا خاتمہ اور سوویت یونین کی تنسیخ ہوئی۔ اسی نے دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت یونین کے مشرقی یورپ میں قائم کردہ کمیونسٹ بلاک کو توڑا۔ اس کے انہیں کارناموں پر اسے 1990ء میں امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ مورخین اس کے ان کارناموں کی وجہ سے اسے امریکی ایجنٹ بھی قرار دیتے ہیں۔ گورباچوف ایک معمولی روسی دہقان کا بیٹا تھا۔ ماسکو یونیورسٹی میں تعلیم کے بعد وہ 1952ء میں کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنا۔ 1955ء میں اس نے قانون میں ڈگری حاصل کی۔ بہت سے علاقائی عہدے پر فائز رہنے کے بعد 1971ء میں اسے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے عہدہ داروں میں شامل کر لیا گیا۔ 1978ء میں وہ پارٹی کا زرعی سیکرٹری مقرر ہوا۔ 1980ء میں وہ سوویت پولٹ بیورو کا رکن بنا۔ چرننکو کی وفات کے بعد پولٹ بیورو نے گورباچوف کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری چن لیا۔ 54 سالہ گورباچوف، اسٹالن کے بعد سوویت یونین کا سب کم عمر سربراہ تھا۔ اپنے تقرر کے فوراً بعد ہی گورباچوف نے روسی نظام میں فوری تبدیلیوں کی ضرورت اور انقلابی معاشی ترقی پر زور دیا۔ گورباچوف ہی تھا جس نے اپریل 1987ء میں یورپ کو میزائلوں سے پاک علاقہ قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ پھر دسمبر 1987ء میں اس نے امریکہ کے ساتھ تخفیف اسلحہ کے معاہدے پر دستخط کئے۔ چین سے سوویت تعلقات ایک عرصہ سے خراب چلے آ رہے تھے۔ 1989ء میں گورباچوف نے چین کا دورہ کر کے دونوں ممالک کے تعلقات کو بہتر بنایا۔ پھر 1990 اور 1991ء میں سوویت یونین کی پالیسیوں میں تبدیلی اور بالآخر کمیونزم کا خاتمہ۔ بالشویک سوویت انقلاب کے بعد یقیناً ایک بڑا خاموش انقلاب ہے۔

جعلی بغاوت یا جعلی انقلاب:

لیکن حقیقتاً یہ ایک مصنوعی بغاوت یا جعلی انقلاب تھا۔ اس کے جعلی اور مصنوعی ہونے کا اندازہ پہلے دن ہی ہونے لگا تھا چنانچہ بغاوت ہوئی اور انقلاب آیا، لیکن انقلابیوں نے اسے کامیاب بنانے اور ناکامی سے بچانے کے لئے معمولی اقدامات بھی نہیں کئے جو دیگر ممالک میں انقلابی کیا کرتے ہیں مثلاً سڑکوں پر فوج اور ٹینک تو بھیج دیئے گئے لیکن انہیں گولی چلانے کا حکم نہیں تھا چنانچہ ماسکو کی ایک شاہراہ کے عین وسط میں ایک شہری نے ٹینک کے اندر داخل ہو کر اس میں موجود فوجی کو باہر نکالا اور اسے تھپڑ رسید کیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو اس انقلاب دشمن شہری کو پکڑا گیا اور نہ ہی اسے کوئی سزا دی گئی۔ اس حیرت انگیز منظر کو دنیا بھر میں میڈیا نے ٹیلی ویژن پر نشر کیا۔

ع حیران ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی۔

........ادھر بورس یلسن اور اس کے حامیوں کو پارلیمنٹ کے باہر جمع ہونے دیا گیا اور انقلابیوں نے انہیں روکنے کی کوشش تک نہ کی، بعد میں انہیں لوگوں نے انقلاب کو ناکام بنا دیا۔ انقلاب ضرور آیا مگر ملک میں کسی قسم کی ایمرجنسی کا نفاذ نہیں ہوا۔ اسی دوران سوویت یونین کا نیا پرچم تیار ہو کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچ گیا جو اسے پارلیمنٹ کی عمارت کے باہر اور شاہراہوں پر لہراتے پھرے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک نئے قومی پرچم کو ڈیزائن کرنے اور پھر لاکھوں کی تعداد میں تیار کرنے میں کم از کم مہینے تو نہیں ہفتے تو ضرور درکار ہیں۔ لیکن سوویت یونین کا نیا پرچم صرف گھنٹوں میں تیار ہو کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ ایک طرف باغی اور انقلابی تھے جن کے بارے میں یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ شاید انہوں نے انقلاب کی تیاری میں مہینے صرف کئے ہوں گے۔ لیکن ان کے مخالفین کو تو تیاری کا وقت مل ہی نہیں سکا تھا مگر وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ بہر حال ایسی کئی دلیلوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ انقلاب جعلی تھا۔ اس کا مقصد بورس یلسن اور اسکے ساتھیوں کو وہ فضا قائم کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا جس میں وہ ایسے اقدامات کر سکیں جو سوویت یونین کی تحلیل کی بنیاد بن سکیں۔

کمیونسٹ پارٹی کا خاتمہ:

پھر بورس یلسن نے بغاوت کو ناکام بنانے کا اعلان کرتے ہوئے ساتھ ہی ملک کی واحد بڑی سیاسی جماعت کمیونسٹ پارٹی کے خاتمے اور کے جی بی کے ختم کئے جانے کا اعلان بھی کیا۔ اگرچہ کمیونسٹ پارٹی ایک عدالتی فیصلے کے مطابق 1993ء میں پھر بحال ہو گئی تھی۔ یانیف اور دیگر باغی گرفتار کر لئے گئے۔ آٹھ میں سے ایک باغی نے خودکشی کر لی مگر باقی سات کے انجام کا پتہ نہ چل سکا۔ یاد رہے کہ دنیا کے کسی ملک میں بھی باغیوں کو اگر وہ بغاوت کی کوشش میں ناکام ہو جائیں تو زندہ مشکل ہی چھوڑا جاتا ہے مگر یہ باغی زندہ چھوڑ دیئے گئے۔

گورباچوف کو کافی وقت نظر بند رہنے کے بعد دوبارہ بحال کر دیا گیا مگر ان کی طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ 14 دسمبر 1991ء کو گورباچوف نے سوویت صدر کی حیثیت سے کام کرنا چھوڑ دیا۔ 21 دسمبر کو انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور اگلے روز سوویت یونین کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اور بورس یلسن روس کے صدر بن گئے۔ چونکہ سوویت وفاق کا خاتمہ محض ایک اعلان کے ذریعے نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ضروری تھا کہ تمام سوویتوں میں ریفرنڈم ہو یا ان سوویتوں کے اراکین پارلیمان

کو ووٹ دیں۔ اگر یہ سوویتیں علیحدگی کے حق میں ووٹ دیں تو اس صورت میں سوویت یونین کا خاتمہ ہو نا تھا۔ 4 سوویتیں تو پہلے ہی علیحدگی کا اعلان کر چکی تھیں باقی 11 میں ریفرنڈم ہوا جس میں وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں نے علیحدگی کے خلاف ووٹ دیا۔ یہ مسلم ریاستیں علیحدگی کے حق میں نہیں تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ سوویت وفاق میں شامل یہ ریاستیں اپنے وسائل سے زیادہ مفاد حاصل کر رہی تھیں اور یوں فائدے میں تھیں اس لئے وہ علیحدگی کیوں چاہتیں؟ مگر مسلم ریاستوں کے انکار کے باوجود سوویت یونین کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا مگر ان مسلم ریاستوں کی خوشنودگی کے لئے آزاد سوویت ریاستوں کی دولت مشترکہ قائم کر دی گئی۔

صدر گورباچوف کا کردار:

صدر گورباچوف کو آج بھی کئی مورخین سی آئی اے کا امریکی ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ 13 مارچ 1985ء کو اس نے روس کا اقتدار سنبھالا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ملک کی شناخت کو ختم کر ڈالا۔ اس کی اصلاحات کی پالیسیاں پرائسٹرائیکا اور گلوزنا سٹ جو بظاہر کمیونسٹ خرابیوں کو دور کرنے کے لئے شروع کی گئیں تھیں۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہی پالیسیاں کمیونسٹ روس کے خاتمے پر منتج ہوں گی مگر بعض حلقے آج بھی گورباچوف کو روس کا ہیرو مانتے ہیں کہ ان کی ان کی ان ہی اصلاحات سے روس میں جمہوریت پسندوں کو سامنے آنے کا موقع ملا تاہم روس کے اندر پکے نظریاتی اور کٹر کمیونسٹوں کی ایک بڑی تعداد اپنے نظریات پر قائم رہی۔ ان کٹر کمیونسٹوں کے پاس فوج اور انتظامیہ میں کلیدی عہدے موجود تھے۔ 1990ء میں جب سوویت یونین انتشار کے دہانے پر کھڑا تھا، ان کمیونسٹوں نے گورباچوف کے ارادوں کو بھانپ کر انہیں اقتدار سے الگ کرنے کی باتیں شروع کر دیں، پھر 19 اگست 1991ء میں ڈرامائی طور پر گورباچوف کے خلاف نائب صدر ریانیف نے مندرجہ بالا ذکر کی گئی بغاوت کی جس میں سوویت فضائیہ اور بحری افواج کی ڈویژنیں شامل تھیں۔ باغیوں نے کچھ دنوں تک کے لئے اقتدار پر قبضہ بھی کر لیا اس دوران بورس یلسن قومی ہیرو بن کر ابھرے اور انہوں نے بغاوت ناکام بنا کر گورباچوف کو بحال کر دیا مگر ساتھ ہی USSR پر خط تنسیخ بھی کھینچ ڈالا۔ سوویت یونین کی تحلیل سے حکومتوں کا رول اور اختیار بھی بہت محدود ہو گیا کیوں کہ اب سرمایہ داروں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہی تھی۔

☆

1991ء وسطی ایشیائی ریاستوں کی صبح آزادی
ایک وسطی ایشیائی انقلاب

سقوط سمرقند و بخارا:

روسیوں کے ہاتھوں اسلامی ترکستان کی فتح کے ساتھ اسلامی تاریخ کا وہ عظیم گیارہ سو سالہ عہد ختم ہو گیا جس کا آغاز پہلی صدی ہجری میں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکستان پر روس کا قبضہ تاریخ اسلامی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ ترکستان اسلام اور مسلمانوں کا ایک ہزار سال سے وطن تھا اور یہاں وہ اکثریت میں تھے لیکن ان کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا گیا، نیز ان پر وہ مظالم ڈھائے گئے جن کی مثال دنیا کی تین ہزار سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہاں سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ خالق اور مخلوق میں جو رشتہ اور تعلق بانی اسلام ﷺ اور ان کی تعلیمات نے پیدا کیا تھا اسے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ الحاد یا کمیونزم کا چرچا عام کیا گیا لیکن مسلم قوم الحاد کی اس آگ سے حضرت ابراہیمؑ کی مانند صحیح و سالم نکلی اور آج ترکستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے اور اشتراکیت اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ انیسوی صدی کی آخر دہائیوں میں روسیوں نے وسطی ایشیا کی ریاستوں قوقند، خیوا وغیرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ لے دے کر صرف بخارا کی ریاست بچی تھی جسے عالم اسلام میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس کے امیر کو امیر المومنین کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا اس لئے یہ امیر کسی حد تک پابند شریعت تھے اس مذہبی اعتقاد کی بنیاد پر مسلمان ان کی عزت کرتے تھے۔

امیر عبداللہ (1885ء-1910ء):

امیر مظفر الدین کی وفات کے بعد امیر عبداللہ تخت بخارا پر بیٹھا، لیکن اس وقت تک بخارا کی اسلامی سلطنت کو گھن لگ چکا تھا۔ وسط ایشیا میں روسی یلغار کے آخری مرحلہ مرو کی فتح 1884ء سے شروع ہوا اور 1894ء میں پامیر کی فتح پر تمام ہوا۔ روسی مسلم ترکستان کے بہت بڑے حصے پر 1866ء کے بعد کے چند برسوں میں قبضہ کر چکے تھے۔ اگلے سال یا آئندہ آنے والے دن مسلمانوں اور روسیوں دونوں کے لئے انقلابی اہمیت کے سال تھے۔ مسلمانوں میں جدید تعلیمی تحریک کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ سیکولر اور لبرل ذہن رکھنے والا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کی قدامت پسند طبقے سے آویزش تھی۔ روسی حکومت کو ایک

دوسرے کی خبریں یا کمزوریاں فراہم کرنا ان میں عام تھا۔اس وجہ سے ایسا انتشار پھیلا کہ مسلمان قوم آخر دم تک ایک مرکزی قیادت کے نیچے جمع نہ ہو سکی۔ جب روس میں سیاسی جماعتیں بنانے کی آزادی ملی اور 1905ء میں پارلیمنٹ (ڈوما) کے انتخابات ہوئے تو حالات مزید خراب ہو گئے اور اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ پھر ان افکار پر مختلف سوشلسٹ گروپ وجود میں آ گئے۔ان ہی حالات میں امیر عبداللہ کا عہد ختم ہو گیا۔(1910) اور میر عالم بخارا کا آخری حکمران تخت نشین ہوا۔

میر عالم آخری امیر بخارا (1910ء۔1920ء):۔ میر عالم سلطنت بخارا کا آخری حکمران تھا وہ اپنے والد امیر عبداللہ کے بعد تخت نشین ہوا اس کے عہد 1910ء سے 1917ء کے سات سال بڑے انقلابی سال تھے۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔مختلف گروہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔اسی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر بالشویکوں (کمیونسٹوں) نے شاہ روس زار کا تختہ الٹ دیا۔اگر مسلمانوں میں اب بھی اتحاد کا جذبہ پیدا ہو جاتا تو وہ روس کی اس اندرونی شورش کا فائدہ اٹھا کر روسی استبداد سے جان چھڑا سکتے تھے۔لیکن مسلمانوں میں ایسا شعور مفقود ہو چکا تھا۔ خیوا اور بخارا کی ریاستیں برائے نام باقی تھیں جو محدود داخلی خود مختاری کی حامل ہونے کے باوجود زاروں کے عہد کے روس میں مسلمانوں کی امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز تھیں اور ایسی پناہ گاہیں تھیں جہاں سے مسلمان آزادی اور بقا کی گوریلا جنگ لڑ سکتے تھے۔

سقوط خیوہ:

خیوہ کی مقامی آبادی ازبک تھی۔جنید خاں ترکمانوں کی طاقت پر یہاں قابض ہو گیا تھا اور اس نے خیوہ کے خان کو کٹھ پتلی بنا دیا۔روسیوں نے ازبکوں کو اس کے خلاف بھڑکایا آخر نومبر 1919ء میں جب روس نے حملہ کیا تو ازبک اسے نجات دہندہ سمجھنے لگے اور جنید خان کو بھاگتے بنی۔خوارزم میں برائے نام عوامی جمہوریہ قائم کر دی گئی ایسے میں مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے ایک گروہ جدیدی تھا اور دوسرا قدیمی۔جدید بالشویکوں کے سبز باغ دکھانے سے متاثر تھے دوسری طرف قدیمی یا مذہب پسند مسلمان جدیدیوں کے خلاف تھے مگر یہ جدیدیوں کے زبردست پروپیگنڈے کا کوئی مثبت جواب نہ دے سکے۔آخر جدیدیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ لوگ امیر کے پٹھو ہیں اور اس کے ظلم و استبداد کا دور واپس لانا چاہتے ہیں۔اس سے عوام مخمصے میں پھنس گئے کہ کس کا ساتھ دیں۔

مسلم ممالک سے مدد نہ ملنا:

ایران ترکی اور افغانستان کی سرحد میں وسطی ایشیا کی آخری مسلم ریاست بخارا سے ملتی تھیں مگر ایران و ترکی جدید انقلاب کے داعی تھے اور خود اسلامی روایات سے بغاوت کر چکے تھے اسلئے ان سے مدد کی توقع نہیں تھی۔افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان کے توسط سے امیر بخارا نے انگریزوں سے مدد مانگی تھی بات چیت جاری تھی کہ امیر حبیب اللہ خان قتل ہو گیا اور اس کا بیٹا امیر امان اللہ تخت پر بیٹھا۔امان اللہ روس نواز تھا اس لیے مدد کا یہ راستہ بھی بند ہو گیا۔

سقوط بخارا:

کمیونسٹ بڑے چالاک تھے انہوں نے فوج سے پہلے بخارا میں اپنے پروپیگنڈہ کرنے والے لوگ بھیجے جن کے

پروپیگنڈہ سے عوام کا دل مسحور کر دیا اور سرخ فوج جیسے جیسے سرزمین بخارا پر قبضہ کرتی جاتی تھی ویسے ویسے ہی مسلمانوں میں کیمونسٹ یا مارکسیوں کے گروہ سرخ فوج کے منتظر تھے۔ جوں ہی سرخ فوج نمودار ہوتی یہ غدار کیمونسٹوں سے جا ملتے۔ تقریباً 15 شہر بغیر کسی مزاحمت کے سرخ فوج نے فتح کئے۔ ایسی خبریں سن کر امیر بخارا بہت پریشان ہوا امیر نے برطانوی سفیر کو مدد کی درخواست کی لیکن انگریز خود افغانستان میں مات کھا چکے تھے اس لئے برطانوی سفیر بھی کچھ نہ کر سکا۔ آخر 20 اگست 1920ء کو سرخ فوج بخارا کے فصیلوں کے سائے میں پہنچ گئی اور اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا مسلمانوں نے بھی ان حالات کا مقابلہ کرنے کا انتظام کیا تھا۔ فصیل کے چاروں طرف خندقیں کھودی گئیں تھیں اور ریلوے لائین کی حفاظت کے لئے فوج متعین کر دی گئی تھی۔ مسلمانوں کو مقابلے کے لئے تیار دیکھ کر روسیوں نے امیر کو ایک بار پھر چکمہ دیا۔ پیرانوف وزیر خارجہ کو تاشقند بھیجا اس نے امیر کو چکنی چپڑی باتوں سے شیشے میں اتار لیا۔ ریلوے لائن سے فوجیں ہٹانے کے لئے کہا کہ کہیں کوئی نادان وحشی روسی سپاہی گولی نہ چلا دے اور روسیوں کو شرمسار ہونا پڑے۔ امیر نے فوجیں ہٹا لیں روسیوں کو جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا انہوں نے اسی سمت سے بخارا پر چڑھائی کر دی۔ 30 اگست 1920ء بمطابق 15 ذوالحجہ 1339ھ کو روسی افواج آدھی رات کو بخارا کے نواح میں پہنچ گئی۔ ٹھیک 4 بجے صبح انہوں نے توپ کا پہلا گولا پھینکا۔ مسلمان اس وقت صبح کی نماز کی تیاری کر رہے تھے جلد ہی گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ امیر کی فوجیں روسیوں کے جدید اسلحہ کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے قدیم بخارا کی طرف پسپا ہو گئیں۔ دوپہر تک روسی مضافات بخارا میں پہنچ گئے۔ اہل بخارا نے بے سر سامانی کے باوجود شدید مزاحمت کی انہیں آج سات سو سال بعد پھر چنگیزی فوجوں کا سامنا تھا۔ روسیوں کے پاس 11 طیارے اور پلائی موتھ کی توپیں تھیں جن کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کے پاس کچھ سامان حرب نہیں تھا۔ لہٰذا ان طیاروں اور توپوں کی گولہ باری سے بقول امیر بخارا آدھا شہر تباہ ہو گیا، پھر بھی مجاہدین اسلام چار دن تک مقابلہ کرتے رہے ۔روس کی طاقت تازہ دم فوجیں بھیجتی رہی اس آتش و آہن کی بارش کو روکنا اہل بخارا کے بس میں نہیں تھا۔ ادھر مار اشتیوں نے پروپیگنڈہ کر کے مسلمانوں کی ہمت ختم کر دی مگر پھر بھی روسیوں کو بخارا میں ایک ایک گھر سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر ان حالات میں بخارا سرنگوں ہو گیا۔ امیر بخارا اور ساتھیوں نے جب دیکھا کہ کھیل ختم ہو گیا، ہجرت کرنے کے لئے شہر سے نکل گئے تاکہ شہریوں کو امان حاصل ہو جائے۔ 8 دن کے سفر کے بعد امیر اور اس کے ساتھ خورقان پہنچے جو بخارا کا ایک صوبہ تھا۔ وہاں قیام کر کے جب دریائے خجدوان عبور کرنے لگے تو سامنے دشمن کو بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں سے راستہ روکے ہوئے پایا۔ امیر نے دربند کا رخ کیا اور کچھ فوج روسیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پیچھے چھوڑی شاید کابل سے مدد آجائے، مگر کابل سے کوئی مدد نہ پہنچ سکی۔ صرف امیر امان اللہ نے امیر بخارا کی رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کابل میں کر دیا۔ روس نے ستمبر 1920ء تک بخارا کی مملکت پر مکمل قبضہ کر لیا اس کے ساتھ ہی وسط ایشیا کی تمام ریاستیں روس کے قبضے میں چلی گئیں اور مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ دور اختتام کو پہنچا۔ مگر یاد رہے بنگال اور سپین کی طرح سقوط بخارا بھی مسلمان غداروں کا زیادہ مرہون تھا۔

بخارا کی اہمیت:

بخارا کو وسط ایشیا کی اسلامی ریاستوں میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی تھی۔ سامانی خاندان سے کرمنگت خاندان کے آخر

ی حکمران میر عالم تک یہ شہر اسلامی تہذیب اور تمدن کا مرکز چلا آرہا تھا اور اسے دارالحکومت کا درجہ حاصل تھا۔ (874ء۔ 1920ء)

آہنی پردے کے پیچھے:
متحدہ ترکستان کو روسیوں نے چھ سوویت جمہوریاؤں میں بدل دیا۔ 1924ء میں نئی حد بندی کی گئی جس کے مطابق ازبکستان اشتراکی جمہوریہ، ترکمانستان، تاجکستان، قازقستان، ازربائیجان، کرغیزستان وجود میں آگئیں۔ شروع شروع میں اشتراکیوں نے اہل ترکستان کو بڑے سبز باغ دکھائے۔ ہر طرح کی آزادی دینے کے وعدے کئے گئے، جن میں مذہبی آزادی بھی شامل تھی مگر آہستہ آہستہ یہ وعدے ایک حسین سراب بن گئے اور جوں جوں کمیونسٹوں کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا، ان وسطی ایشائی علاقوں پر بھی سوویت شکنجہ سخت سے سخت ہوتا گیا اور حالات زارشاہی سے بھی بدتر ہوگئے، یہاں یاد رہے کہ یہ ساری سختیاں صرف مذہب کی وجہ سے مسلمانوں پر ہوئیں۔ ان کے مقابلے میں سوویت یونین میں شامل بالٹک اور دوسری عیسائی ریاستوں کے لئے دہرا معیار اختیار کیا گیا۔ زار حکومت اور اشتراکی حکومت دونوں ہی اسلام کے خلاف تھیں اس لئے آہنی پردے کے پیچھے ان ستر برسوں میں باقی اسلامی دنیا سے ان کا رشتہ کاٹ دیا گیا۔ روس نے اسلامی تشخص مٹانے کے لئے بھی کئی حربے استعمال کئے مگر ان تمام سختیوں سے ترکستان کے مسلمان ستر سال بعد کندن بن کر نکلے۔

آزادی کی جدو جہد:
25 ستمبر 1989ء کو آذربائیجان نے سپریم سوویت اور روسی یونین میں رہتے ہوئے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ اس اعلان میں کہا گیا کہ جمہوریہ اپنے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور انتظامی امور میں آزاد ہوگی۔ مگر روس نے آذربائیجان کے یہ اختیارات تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ 10 نومبر 1989ء کو سپریم سوویت کی پریزیڈیم نے اس اعلان آزادی کی کئی دفعات منسوخ کردیں اس کے بعد آذربائیجان میں شدید بے چینی پھیل گئی سوویت پریزیڈیم کا موقف یہ تھا کہ یہ دفعات روسی آئین سے متصادم تھیں۔

آرمینیا اور آذربائیجان میں کشیدگی:
1990ء کے آغاز میں آذربائیجان اور آرمینیا میں کشیدگی شدت اختیار کرگئی۔ آذربائیجانی جمہوریت پسندوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں آزادنہ طور پر ایران جانے کی اجازت دی جائے اس مقصد کے لئے انہوں نے سرحد پر واقع روسی چوکیوں پر بھی حملہ کیا۔ بعض افراد سرحدی مزاحمت اور دریائے اراکس ARAKS پار کر کے ایران پہنچ گئے۔ جنوری 1990ء کے دوسرے ہفتے میں قوم پرست آذربائیجانیوں نے لن کیورن LENKORAN کے ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کرلیا اور شہر کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ مزاحمت کرنے پر ایک روسی افسر کو گولی ماردی گئی۔ آذریوں نے آرمینیاؤں کی ایک بستی مناشد MANNA SHID پر حملہ کردیا۔ دارالحکومت باکو میں بھی مسلح تصادم کی خبریں آئیں اس کے بعد آذریوں نے متنازع علاقے نگورنو قراباغ کے متنازع علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ 15 جنوری کو کریملن نے آذربائی جان میں اپنے فوجی دستے اتار دئے اور باکو میں کرفیو نافذ کردیا گیا۔ پھر 19۔20 جنوری 1990ء کی درمیانی شب 20 ہزار فوجی ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں میں

سوار ہو کر تمام مزاحمتوں کو روندتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے۔ ادھر آذری فوج کے سپاہی بھی اپنے ہم وطنوں سے مل گئے اور گلی گلی میں لڑائی چھڑ گئی فوج نے آذریوں کے ٹھکانوں پر زبردست گولہ باری کی ادھر آذریوں نے بھی خودکار ہتھیاروں سے اس کا جواب دیا۔ جلد ہی شہر کے گلی کوچے انسانی لاشوں سے بھر گئے۔ فوجیوں نے کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر اور ٹیلی ویژن اسٹیشن پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ادھر ماسکو میں قوم پرستوں نے ایک پریس کانفرنس میں فوج پر الزام لگایا کہ فوج آزادی کی تحریک دبانے کے لئے وحشیانہ طاقت استعمال کر رہی ہے۔ ماسکو نے سرکاری طور پر اس کی تردید کی اور بتایا کہ باکو میں صرف 48 افراد ہلاک ہوئے ہیں جن میں 8 فوجی بھی شامل ہیں لیکن آزاد میڈیا نے خبر دی کہ اس ایکشن میں سینکڑوں آدمی مارے گئے۔ 24 جنوری کو امریکہ نے بیان دیا کہ سوویت یونین کی علاقائی وحدت مقدم ہے اس لئے امریکہ آذر بائیجان کی علیحدگی پسندی کی حمایت نہیں کرتا۔ بہرحال اگست تک آرمینیا اور آذر بائی جان میں کشیدگی کے واقعات بڑھتے چلے گئے۔ مئی 1989ء میں ازبکستان میں تحریک اتحاد BIRLIK وجود میں آئی۔ ایک سال کے اندر اندر دس لاکھ ازبک اس کے رکن بن گئے۔ ازبکستان میں 16 فروری کو آرمینیائی باشندوں کے خلاف خون ریز مظاہرے شروع ہو گئے۔ ان میں پانچ افراد ہلاک ہوئے۔ تاجکستان کی سرحد کے ساتھ ازبک شہریوں نے اشتہار بانٹے۔ روسیو وسط ایشیا چھوڑ دو۔ بہرحال وسط ایشیا میں حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔

ازبکستان کی آزادی کا اعلان:

20 جون 1990ء کو ازبکستان کی پارلیمنٹ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور کہا کہ آئندہ جمہوریہ اپنے داخلی معاملات میں خود مختار ہو گی مگر ساتھ ہی کہا گیا کہ اس کا مطلب روسی یونین سے علیحدگی نہیں ہے۔ 31 اگست 1991ء کو ازبکستان نے اپنی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ 14 ستمبر کا دارالحکومت تاشقند میں کمیونسٹ پارٹی کا نام تبدیل کر کے عوامی جمہوری پارٹی رکھ دیا گیا۔ ستمبر کے وسط ہی میں خبر رساں ایجنسی تاس نے ازبکستان کے صدر کریموف سے منسوب ایک بیان جاری کیا کہ وہ ازبکستان میں چین کے طرز کی اصلاحات نافذ کریں گے۔

آذربائیجان:

6 فروری 1991ء کو مقامی اسمبلی نے جمہوریہ کے ساتھ سوشلسٹ کا لاحقہ ختم کر دیا اور درانتی اور ہتھوڑے والے کمیونسٹ پرچم کی بجائے ایک نئے اسلامی پرچم کی منظوری دی گئی۔ سوویت انقلاب 1917ء کے بعد جولائی 1991ء میں پہلی بار عاشور محرم منایا گیا۔ 30 اگست 1991ء کو مقامی پارلیمنٹ نے اعلان آزادی کی منظوری دے دی 15 ستمبر کو ایک ہنگامی اجلاس کے بعد کمیونسٹ پارٹی تحلیل کر دی گئی۔ 18 اکتوبر کو پالیمنٹ نے مکمل اتفاق رائے سے سوویت یونین کے ساتھ الحاق کا وہ معاہدہ ختم کرنے کا اعلان کیا جس کا اعلان دسمبر 1922ء میں کیا گیا تھا۔ پھر 29 دسمبر 1991ء کو ٹھیک 69 سال بعد اگست کے اعلان آزادی پر ریفریڈیم ہوا۔ عوام نے بھاری اکثریت کے ساتھ پارلیمنٹ کے فیصلے کی توثیق کر دی۔

تاجکستان، اعلان آزادی:

جنوری فروری 1990ء میں سیاسی بے چینی اور مظاہروں کے نتیجے میں کم از کم 37 افراد ہلاک ہوئے تھے اس کے بعد

پوری ریاست میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ عوام اس ایمرجنسی کی مخالفت کر رہے تھے۔ 29 جون 1991ء کو تاجکستان کی پارلیمنٹ نے ایمرجنسی اٹھالی۔ اگست 1991ء کی ناکام بغاوت کے بعد جب سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے لگا تو 9 ستمبر 1991ء کو تاجکستان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ واضح رہے کہ 24 اگست 1990ء کو ریاست نے محدود خود اختیاری کا اعلان کیا تھا اور اس کے بعد سے یہاں سوویت یونین کے خلاف نفرت کے شدید مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے پھر 23 ستمبر کو کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگادی گئی۔ پھر شہری انتظامیہ کے حکم پر پارلیمنٹ کے سامنے نصب لینن کے مجسمے کو اکھاڑ دیا گیا۔

ترکمانستان:

ستمبر 1991ء کے پہلے ہفتے کے بعد ریاست کی صدارتی کونسل نے اقوام متحدہ کو اپیل کی کہ ترکمانستان کو ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ کونسل کے فیصلے پر ریاست کا سرکاری نشان پرچم اور قومی ترانہ تبدیل کر دیا گیا۔ 26 اکتوبر کو سوویت یونین سے علیحدگی ریفرنڈم ہوا جس میں عوام نے آزادی کے حق میں ووٹ دیئے کمیونسٹ پارٹی کو ختم کر کے اس کی جگہ ڈیموکریٹک پارٹی بنادی گئی۔

قازقستان:

1990ء میں نورسلطان نذربیف کے سامنے دو عہدے تھے وہ قازقستان کے صدر بن چکے تھے اور گورباچوف انہیں اپنا نائب صدر بنانا چاہتے تھے مگر نذربیف نے سوویت یونین کا نائب صدر بننے پر قازقستان کا صدر رہنے کو زیادہ ترجیح دی اس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ ماسکو میں 1991ء کی ناکام بغاوت کے بعد انہوں نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ قازقستان کے صدر نذربیف ماسکو سے یک طرفہ تعلقات توڑنے کے حق میں نہیں تھے وہ سوویت جمہوریتوں کے لئے ایک طرح کا نیم وفاق چاہتے تھے پھر اکتوبر 1991ء میں ان کے خیالات میں تبدیلی آئی نومبر میں انہوں نے صدارتی ریفرنڈم کرالیا اور وہ دوبارہ صدر منتخب ہو گئے۔ 16 دسمبر 1991ء کو قازقستان کی پارلیمنٹ نے باقاعدہ طور پر اعلان آزادی کیا۔ روس نے دوسرے دن قازقستان کو ایک آزاد ملک تسلیم کر لیا۔ واضح رہے کہ قازقستان وسط ایشیا کی وہ واحد ریاست تھی جس نے سب سے آخر میں اعلان آزادی کیا۔

کرغیزستان:

12 دسمبر 1990ء کو کرغیزستان نے اپنی محدود خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔ 19 اگست 1991ء کو جب وقت نے نئی کروٹ بدلی تو 31 اگست 1991ء کو کرغیزستان بھی آزاد ہو گیا۔ اکتوبر 1991ء میں یہاں پہلا عام صدارتی الیکشن ہوا صدر آکف واحد صدارتی امیدوار تھے وہ 95 فی صد ووٹوں سے منتخب ہوئے۔ صدر عسکر اکیف بھی چین کی اصلاحات سے متاثر تھے۔ یہ اس لئے بھی کہ کرغیزستان کی سرحد چینی ترکستان سے ملتی ہے ساتھ ہی ساتھ وہ نجکاری کے قائل بھی تھے اور دیگر ہمسائیہ ممالک کے اشتراک سے ترقیاتی منصوبے شروع کرنا چاہتے تھے۔

چینی ترکستان:

مشرقی ترکستان پر چینی تسلط 1876ء سے شروع ہوا۔ اقتدار سے محروم ہو جانے کے باوجود مسلمان حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے پھر حالات نے پلٹا کھایا اور 1934ء میں مشرقی ترکستان بھی روس کے قبضے میں آ گیا، تقریباً دس سال حکومت کرنے کے بعد روسیوں نے اگست 1944ء میں مشرقی ترکستان چین کے حوالے کر دیا اس کے ساتھ سن کیانگ کی قومی حکومت کا خاتمہ ہوگیا مگر 7 نومبر 1944ء کو روسیوں کے تعاون سے ایک نئی آزاد ریاست کی تشکیل ہوئی اس کے پس منظر میں روس کی گزشتہ چین دشمنی کارفرما تھی۔ تھوڑے عرصے میں جب دونوں ملکوں میں صلح ہوئی تو روسیوں نے مسلمانوں کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا تو 1946ء میں نومولود ترک ریاست منتشر ہوگئی۔ 1949ء میں جمہوریہ مشرقی ترکستان ETR کے نمائندے بات چیت کرنے پیکنگ جا رہے تھے ان کا جہاز پراسرار فضائی حادثے کا شکار ہوگیا اور سنکیانگ فسادات پھر شروع ہوگئے جو اگلے دو برس تک جاری رہے۔ چین کی عوامی فوج بڑی مشکل سے حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی مگر اس کے لئے بہت خون ریزی ہوئی۔ 1960ء کے عشرے میں مسلمانوں کے ماؤ کے ثقافتی انقلاب کے تشدد کا سامنا کرنا پڑا مساجد بند کر دی گئی، عید منانے پر پابندی لگا دی گئی، اسلامی رسم و رواج پر قدغن لگا دیئے گئے اور قرآن پاک کی تعلیم کو عمداً روک دیا گیا۔ 1974ء میں مسلمان ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ صوبہ یونان YUNNAN میں زبردست جھڑپیں ہوئیں جن میں تقریباً 1700 مسلمان شہید ہوگئے۔ 1978ء کے بعد حالات میں تبدیلی ہوئی اور کسی نہ کسی حد تک مذہبی آزادی بحال کر دی گئی اس طرح روسی وسط ایشیا سے بیداری کی تحریکیں اٹھی تو مشرقی ترکستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ 1988ء میں سن کیانگ کے علاقے ایغور میں مسلمانوں نے ہان چونیو کے خلاف مظاہرے کیے۔ فروری 1989ء میں جب سوویت تاجکستان میں ایمرجنسی نافذ کی گئی تو اس کے اثرات سن کیانگ میں بھی محسوس کیے گئے۔ فطری طور پر سن کیانگ وسط ایشیا سے وابستہ ہے اس کا سرحدی شہر YINING ایک تجارتی مرکز کے طور پر ابھرا ہے۔ روسی سرحد سے اس کا فاصلہ تیس میل ہے جبکہ پیکنگ یہاں سے 2500 میل دور ہے تیان شان کے بلند و بالا پہاڑوں نے پانگ کو چین سے بالکل الگ تھلگ کر رکھا ہے ماضی میں دریائے ایلی کے پار کا علاقہ روس میں شامل تھا جو بعد ازاں چین کے حوالے کر دیا گیا۔ 1962ء میں یہاں سرحدیں جھڑپیں ہوئیں تو کاشغر میں روسی کونسل خانہ بند کر دیا گیا۔ روسی اس علاقے میں چینیوں کو سونے کی تلاش میں مدد دے رہے تھے۔ جاتے ہوئے انہوں نے سونے کی کان کا راستہ ڈائنامیٹ سے اڑا دیا۔ کاشغر میں 1981ء اور 1988ء میں بھی فسادات ہو چکے ہیں۔ 1990ء میں کرغیز اسلامی اقتدار بحال کرنے کے لئے اٹھے تو مارچ میں کمیونسٹوں نے دینی ادارے قائم کرنے پر پابند لگا دی اس سے کرغیزیوں کی قومی

حمیت جاگ اٹھی اور وہ ہتھیار بند ہو کر میدان میں آ گئے۔ 1986ء میں بیجنگ اور ماسکو نے ایک مشترکہ سمجھوتا کیا تھا جس کے تحت سن کیانگ اور قازقستان کے درمیان سرحدی تجارت دوبارہ کھول دی گئی۔ اس سے چینی مسلمانوں کے وسط ایشیا سے دوبارہ رابطہ ہو گیا۔ آزادی کے بعد بھی قازقستان اور چین کے درمیان ایک تجارتی سمجھوتہ ہوا واضح رہے کہ قازقستان، تاجکستان اور کرغیزستان کی سرحدیں چینی ترکستان سے ملتی ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق چین میں دو کروڑ سے زائد مسلمان آباد ہیں۔

وسط ایشیا آزادی کے بعد:

1991ء کے بعد اگر چہ بظاہر پورا وسط ایشیا آزاد ہو گیا ہے لیکن یہ ظاہری آزادی بھی بہت سے خدشات لئے ہوئے ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ نو آزاد ریاستیں دولت مشترکہ کے نام پر روس کے تابع تھیں۔

......☆......

1991ء یوگوسلاویہ میں انتشار

جب چیکوسلواکیہ میں چیک اور سلواک قومیتیں ایک دوسرے سے پرامن طور پر الگ ہو رہی تھیں، عین اسی وقت مشرقی یورپ کا ایک اور ملک یوگوسلاویہ تلخ جنگوں سے گزر کر ٹوٹ رہا تھا۔ یوگوسلاویہ بھی پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کے نقشے پر ابھرا تھا اس ملک میں چھ قومیں آباد تھیں، سرب، قرویٹ، مسلم سلوویز، مقدونین اور مونٹیگرین، ان بڑی قوموں کے علاوہ کئی چھوٹی قومیں بھی تھیں۔ یوگوسلاویہ چھ ریاستوں پر مشتمل ایک وفاق تھا، یہ چھ ریاستیں سربیا، کروشیا، بوسنیا ہرزگوینا، مقدونیہ، سلوانیا، اور مانٹی نیگرو تھیں۔ 1974ء میں سربیا کے دو صوبوں کو خود مختاری دے دی گئی۔ یہ صوبے تھے کوسووKOSOVO اور ویڑوینا VOJVODIANA کوسوو البانوی نسل کے مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ ہے، جبکہ ہنگرین، بوسنیائی مسلمانوں کے ساتھ ویڑونیا سرب آبادی کا اکثریتی صوبہ تھا۔ وفاق میں ان دونوں صوبوں کو بھی باقی چھ ریاستوں کے مطابق حقوق حاصل تھے۔ 1974ء ہی کے آئین میں مسلمانوں کو بھی سربوں اور کروئیٹو وغیرہ کی طرح الگ قوم تسلیم کر لیا گیا تھا۔

مارشل ٹیٹو 1943ء کے بعد یوگوسلاویہ کے قائد کے طور پر ابھرا اسی کی پالیسیوں کی وجہ سے ملک میں موجود درجن بھر سے زائد قومیتیں تین مذاہب اور نو زبانیں امن سکون سے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ مارشل ٹیٹو نے 37 برس تک کامیابی سے حکومت کی اور ملک میں اداروں کی مضبوطی کے لیے کچھ نہ کیا دنیا میں جہاں بھی ایک ملک کا نظام ایک شخصیت کے گرد قائم ہو وہ اس شخصیت کے بعد نہیں چلتا۔ یہی کچھ یوگوسلاویہ کے ساتھ بھی ہوا۔ مارشل ٹیٹو کی وفات کے صرف دس سال کے اندر اندر نہ صرف یوگوسلاویہ انتشار کا شکار ہو کر ٹوٹ گیا بلکہ اس کی بیشتر ریاستوں میں زبردست خانہ جنگی اور کشت و خون ہوا۔ لاکھوں لوگ مارے گئے اور ان سے بھی زائد تعداد میں لوگ مہاجرین (بے گھر) ہونے پر مجبور ہو گئے۔

یوگوسلاویہ کی تحلیل:

یوگوسلاویہ کی تحلیل میں مندرجہ ذیل اسباب کارفرما تھے۔ مارشل ٹیٹو کی وفات سوویت یونین کا خاتمہ اور مشرقی یورپ میں کمیونزم کی شکست۔ سرب و کروٹ، تاریخی دشمنی، معاشی عوامل، سربوں میں بے چینی کی لہر اور ریاستوں میں تفاوت بعض ریاستیں اپنے قدرتی وسائل اور دیگر ذرائع کی وجہ سے امیر تھیں اور بعض جیسے سربیا غریب تھیں امیر ریاستوں کو اپنے مالی وسائل غریب ریاستوں میں خرچ کئے جانا پسند نہیں تھے۔ 1990ء تک یوگوسلاویہ کا قومی خزانہ خالی ہو جانے کے بعد

ملک شدید معاشی بحران کا شکار ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ 1991ء کے آغاز میں صنعتی کارکنوں کی تنخواہوں کی ادائیگی بھی روک دی گئی۔ 1991ء میں گیس و بجلی کے جو بل جاری کئے گئے ان پر لکھا تھا کہ اگر آپ کو تنخواہ نہیں ملی تو آپ بل ادا نہ کیجئے۔ سرب ملک کی قومیتوں میں اگرچہ غریب تھے مگر ان میں آزادی کی خواہش اور جمہوریت کی آرزو سب سے زیادہ تھی۔ ملک میں مرکزی نظام کے کمزور پڑ جانے کے بعد سرب سڑکوں پر آگئے اور انہوں نے جیل میں بند سرب لیڈر ڈراسکوویچ کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے پہلے تو ان مظاہروں کو طاقت سے دبانا چاہا اور مظاہرین کے خلاف آنسو گیس سے ٹینکوں تک کو استعمال کیا مگر جب مظاہرین پھر بھی نہیں دبے تو حکومت کو جھک جانا پڑا۔ ڈراسکوویچ کو رہا کر دیا گیا۔ سربین ٹیلی کاسٹنگ کے چیف کو برطرف کر دیا گیا اور وزیر داخلہ کو مستعفی ہونے کا کہا گیا۔ تاہم بے چینی کے اصل اسباب دور نہ ہونے کی وجہ سے بے چینی بڑھتی گئی اور قوم پرستی کا جن بوتل سے نکل آیا۔ یوگوسلاویہ کی تمام قومیتیں علیحدگی کا مطالبہ کرنے لگیں اور آزادی کی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ 5 مارچ 1991ء کو کروشیا اور سلوانیا نے وفاق سے علیحدگی کا اعلان کر دیا اور آزاد ہو گئیں۔ یوگوسلاویہ کی دیگر قومیتوں میں کروٹ اور بوسینیائی مسلمان بھی ایک ایسے یوگوسلاویہ میں رہنا نہیں چاہتے تھے جس سے سلوانیا اور کروشیا نکل رہے ہوں اور یہ ملک اب ایسی ریاست بن رہا ہو جس میں سرب اکثریت میں ہوں اور پورے ملک پر ان کا تسلط قائم ہو جائے۔ ادھر بوسینیا میں آباد سرب اس کے لئے نہیں تھے کہ بوسینیا ایک ایسی مسلم ریاست بن جائے جہاں وہ ہمیشہ کے لئے اقلیت میں ہوں یوں بوسینیا سمیت یوگوسلاویہ کی دیگر ریاستوں میں بھی وفاق سے علیحدگی کی تحریکیں شروع ہو گئیں۔

علیحدگی کا طریقہ کار یہ تھا کہ ریفرنڈم کرایا جائے۔ چنانچہ مقدونیہ کی علیحدگی پرامن طور پر عمل میں آگئی۔ سلوانیا میں داخلی طور پر جھگڑے شروع ہو گئے۔ مگر چند ہفتوں میں ختم ہو گئے۔ کروشیا میں کروٹیس اور نسلی سربوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں ملک کے ایک تہائی حصے پر سربوں کا قبضہ ہو گیا۔ لڑائی جاری تھی کہ بوسینیا میں بھی علیحدگی کے لئے ریفرنڈم ہوا۔ 29 فروری اور یکم مارچ ہونے والے اس ریفرنڈم کا مڈنکس نے بائیکاٹ کیا تاہم آزاد خیال سربوں نے اس میں حصہ لیا۔ رجسٹرڈ ووٹروں میں سے 65 فی صد نے ووٹ ڈالے ان میں سے 64.7 فی صد علیحدگی کے حق میں تھے۔ چینکس نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کر دی جس کے ساتھ ہی بوسینیا میں خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا اس خانہ جنگی میں سربوں کی فوجی مہارت کام آئی، جبکہ مسلمان صرف وائٹ کالر پیشہ تھے اور دوسرے بوسینیا کی ذاتی فوج ابھی تشکیل نہیں پائی تھی اس وجہ سے سربوں کا پلہ بھاری رہا جلد ہی انہوں نے ریاست کے 70 فی صد حصے پر قبضہ کر لیا جس کے نتیجے میں 1995ء میں امریکہ کے شہر ڈے ٹن میں امن معاہدہ ہونے تک لاکھوں مسلمان تشدد کا نشانہ بنے اور مارے گئے، بے گھر ہوئے، یوگوسلاویہ کی وفاقی حکومت بھی امن قائم کرنے میں ناکام رہ گئی۔ 5 دسمبر کو صدر سٹیپ ملیسک STIPE MESIC نے استعفیٰ دے دیا اور اعلان کیا کہ یوگوسلاویہ کے وفاق کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اپریل 1992ء میں بوسینیا ہرزگووینا اور مقدونیہ وفاق سے الگ ہو گئے اور یوگوسلاویہ ٹوٹ گیا۔ 17 اپریل کو سربیا اور مونٹی نیگرو کے وفاق سے ایک نیا

کی وفاقی جمہوریہ یوگوسلاویہ وجود میں آیا جو صرف دو ریاستوں پر مشتمل تھا اس نئے وفاق نے بوسینیا کی سرب اقلیت کو مسلمانوں کے قتل عام کے لئے سب سے زیادہ اسلحہ فراہم کیا۔

بوسینیا کا بحران:

یکم مارچ 1992ء کو آزادی کے ریفرنڈم کے بعد بوسینیا نے 73 سالہ اتحاد کے بعد آخر یوگوسلاویہ سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ یوگوسلاویہ کی دیگر ریاستوں کے برعکس بوسینیا کی صورت حال کافی مختلف تھی یہاں مسلمانوں کی آبادی 50 فی صد تھی جبکہ سرب 30 فی صد اور کرویٹ 17 فی صد تھے۔ بوسینیا کی حزب اختلاف یعنی سربوں نے جیسا کہ پہلے ذکر آیا ریفرنڈم کو ماننے سے اور حصہ لینے سے انکار کر دیا جس پر خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ ایک طرف تو مسلمانوں نے اعلان آزادی کر دیا دوسری طرف سربیا اور کروشیا کے صدروں نے باہم یہ منصوبہ بنا رکھا تھا کہ یوگوسلاویہ کے خاتمے کے بعد وہ بوسینیا کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لیں گے۔ 17 اپریل 1992ء کو امریکہ اور دوسری یورپی اقوام نے بوسینیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا چنانچہ 16 اپریل کو باقاعدہ طور پر آزاد مملکت بوسینا ہرزگوینیا کا قیام عمل میں آ گیا۔ عالی جاہ عزت بیگوچ اس کے پہلے صدر بنے مگر آسانی سے حاصل ہو جانے والی اس آزادی کی قیمت مسلمانوں کو بعد ازاں اپنے خون سے چکانا پڑی سربوں نے یوگوسلاویہ کی سرب فوج سے مل کر بوسینیا کی مسلم اکثریت کے خلاف جارحانہ کاروائیاں اور ان کا قتل عام شروع کر دیا۔ ہزاروں مسلمان اس خانہ جنگی میں محض اس وجہ سے مارے گئے کہ انکے مقابلے میں سرب باقاعدہ فوجی تعلیم و تربیت رکھتے تھے جبکہ مسلمان فوجی پیشہ سے دور تھے۔ اگست 1992ء تک بوسینیا کا 60 فیصد سربوں کے قبضے میں چلا گیا۔ 5 اپریل 1992ء کو سربوں نے دارالحکومت سراجیو کا محاصرہ کر لیا تھا جس کے نتیجے میں اس طویل خانہ جنگی کا آغاز ہوا تھا۔

سلامتی کونسل کی پابندیاں:

30 مئی 1992ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے سربیا اور مونٹی نیگرو پر بوسینیا میں سربوں کے اسلحہ فراہم کرنے کے خلاف تجارتی پابندیاں عائد کر دیں۔ 17 اگست کو بوسینیا نے یوگوسلاویہ کی جگہ اپنی کرنسی جاری کی 15 ستمبر کو اقوام متحدہ نے مزید امن فوج بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یکم مارچ 1994ء کو کروئیٹوں اور مسلمانوں نے ایک فیڈریشن کے منصوبے پر واشنگٹن میں دستخط کئے۔ 21 نومبر کو ڈے ٹن میں امن معاہدہ ہوا۔

مارچ 1996ء کو انقرہ میں انٹرنیشنل کانفرنس میں مسلم فیڈریشن کو فوجی ٹریننگ دینے اور 800 ملین ڈالر کے ہتھیار دینے کا فیصلہ ہوا۔ 9 جولائی بوسینیا کی وفاقی پارلیمنٹ نے مسلمانوں اور کروئیٹوں کی مشترکہ کمان قائم کرنے کا اعلان کیا گیا مگر جب تک ہزاروں مسلمانوں کا اجتماعی طور پر قتل کیا جا چکا تھا مغرب نے اگرچہ تاخیر سے اس معاملے میں مسلمانوں کا

ساتھ دیا مگر یادر ہے کہ اس کی وجہ مغرب کی اسلام دوستی یا مسلمانوں سے محبت نہیں بلکہ یہ تھی کہ بلقان کے تمام علاقے میں ان کے مفادات مسلمانوں کے ساتھ وابستہ تھے، جس کی بنا پر وہ دوسری قومیتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے۔ اس کے برعکس فلسطینیوں کا معاملہ ہے جو اسی طرح مظلوم ہیں ان کا خون بھی بہایا جا رہا ہے لیکن وہ کبھی امریکہ اور اہل مغرب کی حمایت حاصل نہیں کر سکے۔ یا دور کیوں جائیے، 50 لاکھ کشمیریوں کا معاملہ تو ہمارا نزدیکی معاملہ بھی ہے مگر کسی مغربی قوم نے ان مظلوموں کی مدد و حمایت کا اعلان نہیں کیا۔ یعنی مغربی تہذیب کے علمبردار کبھی بھی بغیر مفاد کے کسی کی حمایت نہیں کرتے۔ مگر دعویٰ ہمیشہ سے انسان دوستی کا کرتے ہیں۔

......☆......

1993ء مخملین انقلاب اور چیکوسلواکیہ کا دولخت ہونا

41 سال تک آہنی پردے کے پیچھے رہنے کے بعد 1989ء میں کمیونسٹ حکومت کے خلاف زبردست مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 17 نومبر کو پراگ کی شاہراہیں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے انسانی سروں کے سمندر سے بھر گئیں۔ لاکھوں مظاہرین اس وقت حکومت کے خلاف مظاہرے میں شریک تھے یہ مظاہرین کا سمندر چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ حکومت کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ چنانچہ چیک اور سلواک کے راہنماؤں نے کمیونسٹ حکومت کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ 24 نومبر کو کمیونسٹ پارٹی کی لیڈرشپ مستعفی ہو گئی اور دسمبر 1948ء سے جاری کمیونسٹ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ مشرقی یورپ کی دیگر اقوام کی طرح چیکوسلواکیہ میں بھی کمیونسٹ حکومت کے خاتمے پر جشن منایا گیا۔ چیکوسلواکیہ کی تاریخ میں یہ واقعہ مخملین انقلاب VELVET REVOLTION کہلاتا ہے۔ 10 دسمبر 1989ء کو 41 سال بعد ملک میں غیر کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی۔ سلواک لیڈر ماریان کالفا نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ 29 دسمبر کو الیگزینڈر ڈوب چیک وفاقی اسمبلی کے چیئرمین منتخب ہوئے انہوں نے ایک مصنف وکلاو ہاول کو چیکوسلواکیہ کا صدر منتخب کر لیا یہ ملک کے پہلے غیر کمیونسٹ صدر تھے۔ اپریل 1990ء میں وفاقی اسمبلی نے ملک کا نام تبدیل کر کے چیک اینڈ سلواک فیڈرل ری پبلک رکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی یہ نام رکھنے کے لیے سلواک زیادہ سرگرم تھے۔ جون 1990ء میں ملک میں پہلے انتخابات منعقد ہوئے۔ ہاول کو مزید دو سال کے لیے صدر منتخب کر لیا گیا انہوں نے وزیراعظم کالفا کو مخلوط حکومت بنانے کی دعوت دی۔

کشیدگی کی ابتدا:

نئی حکومت نے اصلاحات کا جو پروگرام تیار کیا انہیں اصلاحات کا فرق اور فکر دونوں حصوں کے راہنماؤں کے درمیان کشیدگی کا باعث بنی وفاقی اسمبلی کی مفاہمت کی کوششیں بھی ناکام ہو گئیں۔ سلواکیہ کی عوام اپنی علیحدہ ریاست قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ جون 1992ء میں ہونے والے انتخابات کے بعد ملک تقسیم ہونے کی صورت واضح طور پر نظر آنے لگی۔ انتخابات میں سلواک لیڈر ولادی میر مکیار کی قوم پرستانہ جماعت "موومنٹ فار ڈیموکریٹک سلواکیہ" نے علیحدگی کے نظریات کی حامل جماعت ہونے کی وجہ سے واضح اکثریت حاصل کی جس سے سلواکیہ کی آزادی کو ترجیح دینے والی

پالیسی واضح ہوگئی۔ سلواک نمائندوں نے صدر ہاول کو دوسری مرتبہ صدر چننے کی شدید مخالفت کی۔ چنانچہ 3 جولائی کو ہاول مستعفی ہو گئے۔

سلواکیہ کا اعلان آزادی:

17 جولائی کو پارلیمنٹ نے ایک اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے سلواکیہ کی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ سلواک پارلیمنٹ میں 113 ارکان نے آزادی کے حق میں اور 24 ارکان نے علیحدگی کے خلاف ووٹ دیا۔ 23 جولائی کو چیک اور سلواک راہنما اس بات پر متفق ہو گئے کہ جلد ہی چیکوسلواکیہ کو دو آزاد جمہوریاؤں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ نومبر 1992ء میں اسمبلی نے قرارداد پاس کی کہ 31 دسمبر 1992ء چیکوسلواکیہ کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ دیگر مشرقی یورپ کے ممالک میں جہاں خون ریز جنگوں اور تشدد پسندی سے ملک کی تقسیم ہوئی وہیں چیکوسلواکیہ میں یہی عمل نہایت پرامن انداز میں پارلیمانی طریقے سے انجام پایا۔ اسی نرمی اور ملائمت کی وجہ سے اسے مخملین انقلاب VELVET REVOLTION کہتے ہیں۔

چیکوسلواکیہ کا خاتمہ:

یکم جنوری 1993ء کو جمہوریہ چیک اور جمہوریہ سلواکیہ کا قیام عمل میں آ گیا اور چیکوسلواکیہ کا وجود ختم ہو گیا۔ اسی دن جمہوریہ سلواکیہ کا آئین نافذ ہوا۔ ولادی میر میکیار وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ سلواکیوں نے اپنی نئی مملکت کا جشن دارالحکومت براٹسلاوا میں منایا جبکہ چیک جمہوریہ میں نیا آئین دسمبر 1992ء میں ہی نافذ ہو گیا تھا۔ 15 فروری 1993ء کو چیک اسمبلی نے وکلا ہاول کو جمہوریہ چیک کا صدر منتخب کیا اور وکلاو کلاز وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

ماضی میں 1968ء کا روسی حملہ:

چیکوسلواکیہ ماضی میں روسی کیمپ میں شامل رہا اور 1946ء میں ہونے والے انتخابات میں کمیونسٹ پارٹی 38 فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہو گئی تھی جس کے بعد اس وقت کے غیر کمیونسٹ صدر بینس نے کمیونسٹ وزیر اعظم کلیمنٹ گوٹو والڈ کو حکومت کا سربراہ قبول کر لیا تھا۔ فروری 1948ء میں کمیونسٹ ایک بار پھر الیکشن جیت کر برسر اقتدار آ گئے تھے۔ انہوں نے لوگوں کی زمینوں اور جائدادوں پر قبضہ کر لیا اور کسانوں کو روس کی طرح کی اجتماعی کاشت کاری پر مجبور کیا گیا۔ 7 جون 1948ء کو صدر بینس BENES نے استعفیٰ دے دیا اور کلیمنٹ گوٹو والڈ پہلے کمیونسٹ صدر بنے۔ 1950ء کے بعد غیر کمیونسٹ لیڈروں کو یا تو جیل میں ڈال دیا گیا یا پھر پھانسی دے دی گئی مگر ان آزادی پسند راہنماؤں کو ختم کر کے بھی ملک میں جمہوریت اور آزادی کے خیالات ختم نہیں کی جا سکتے۔ 30 مارچ 1968ء کو صدر الیگزنڈر ڈوبچیک نے کمیونسٹ پارٹی کا عہدہ سنبھالا یہ صدر عوام کی مرضی کے مطابق اپنے ملک کو آزادانہ خطوط پر چلانا چاہتا تھا۔ جولائی 1968ء میں صدر ڈوبچیک نے ملک میں لبرل اصلاحات کا پروگرام بنایا اور کمیونسٹ پالیسیوں کو ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا دوسرے لفظوں میں جو کام آگے دو دہائیوں بعد انجام پایا وہ الیگزنڈر ڈوبچیک 60 کی دہائیوں میں کرنا چاہتا تھا۔ روس اسوقت چیکوسلواکیہ کی اس آزادانہ پالیسی کو برداشت نہ کر سکتا تھا اور الیگزنڈر ڈوبچیک کی حکومت کو غیر عوامی اور غداری کا مرتکب ٹھہرا کر پراگ پر حملہ آور ہو گیا۔

ہزاروں روسی فوجی جدید ٹینکوں میں سوار ہو کر پراگ میں داخل ہو گئے۔اس سے پہلے روس نے ہوائی جہازوں کے ذریعے ہزاروں چھاپہ بردار روسی فوجی بھی چیکوسلواکیہ میں اتارے تھے۔روسی فوجوں کی کمان روسی جرنیل آئیوان پاؤلوسکی کر رہا تھا۔ادھر ردِعمل کے طور پر چیک فوج تو میدان میں نہیں آئی مگر غصے میں بھرے چیک عوام نہتے ہونے کے باوجود روسی جارحیت کا جواب اپنے ڈنڈوں لاٹھیوں اور خالی ہاتھوں سے دے رہے تھے۔انہوں نے کچھ روسی ٹینکوں اور گولہ بارود سے بھرے ٹرکوں کو آگ لگا دی۔طرفین میں جنگ اس وقت شروع ہوئی جب روسیوں نے پراگ ریڈیو پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اس جھڑپ میں تیس شہری مارے گئے اور بڑی تعداد میں زخمی ہوئے۔یہ جذبہ حریت 1989ء میں کام آیا اور بالآخر چیک عوام اپنے ملک سے کمیونزم کا خاتمہ کر کے رہے مگر 1968ء کا روسی حملہ جو محض کمیونزم کو قائم کرنے کے لئے کیا گیا تھا معمولی مزاحمت کے بعد کامیاب رہا۔الیگزنڈر وبکیک اور اس کی کابینہ کے دیگر افراد ایک بکتر بند گاڑی میں نامعلوم مقام کی طرف فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔روس نے چیکوسلواکیہ میں دوبارہ اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کر لی اور اس طرح 1968ء کا یہ چیک کمیونزم مخالف انقلاب ناکام ہو گیا مگر اسی کی بنیادوں سے عوام نے تقریباً 20 برس پھر سڑکوں پر نکل کر کمیونسٹ حکومت کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا اور اس طرح 1968ء میں ناکام رہ جانے والا انقلاب 1989ء میں کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔

☆

1998ء انقلاب انڈونیشیا

اپنی آزادی کے تقریباً پچاس سال بعد 1998ء تک انڈونیشیا شدید معاشی، اقتصادی بحران کا شکار ہو چکا تھا، کئی بینک دیوالیہ ہو چکے تھے۔ کرنسی کی قیمت ریکارڈ حد تک گر گئی تھی۔ ان حالات میں حکومت کے خلاف عوامی تحریک چلی جس کا آغاز یونیورسٹی کے طلبا کی طرف سے ہوا۔ اس کے بعد یہ ملک انقلاب کی لپیٹ میں آ گیا۔

طلبا مظاہرے:

مئی 1998ء میں جکارتہ کی یونیورسٹی کے طلبا نے حکومت کے خلاف پر امن مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جس نے بعد ازاں پر تشدد شکل اختیار کر لی۔ ملک کی معاشی اقتصادی اور سیاسی حالات کی وجہ سے طلبا کا مطالبہ تھا کہ صدر سوہارتو استعفیٰ دے دیں۔ 12 مئی کو طلباء نے جن میں طبقہ امراء سے تعلق رکھنے والے بہت سے طلباء بھی شامل تھے، پارلیمنٹ کا گھیراؤ کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی طرف مارچ کا آغاز کیا مگر پولیس نے طلباء کا راستہ روک لیا۔ اسی دن تقریباً شام کو جب طلباء یونیورسٹی کے نزدیک جکارتہ کی شاہراہوں پر پارلیمنٹ کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے، کچھ لوگ وردی میں ملبوس یونیورسٹی کے قریب واقع فلائی اوور پر نمودار ہوئے جس کے ارد گرد ہزاروں طلبا سڑکوں پر موجود تھے ان وردی میں ملبوس فوجیوں نے اچانک نہتے طلبا پر فائر کھول دیا جس سے چار طلبا موقع پر ہلاک ہو گئے اور نو ہسپتال میں دم توڑ گئے۔

13-14 مئی کو طلبا کے بہیمانہ قتل کے خلاف شدید خون ریز ہنگامے شروع ہو گئے۔ سوہارتو اس وقت مصر میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے ادھر ملک شدید خون ریز ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا ان ہنگاموں میں انڈونیشیا میں موجود چینی نسل کے لوگوں کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا گیا۔ اہم بات یہ تھی کہ ان پر تشدد ہنگاموں کے دوران پولیس اور فوج کا کہیں پتہ نہ تھا۔ حکومت کے ایک ترجمان کے مطابق ان ہنگاموں میں 2479 ایسے مکانات جن کے ساتھ دوکانیں تھیں، بے شمار مارکیٹیں، پلازے 1020 عام گھر اور 65 بینک لوٹ لئے گئے۔ امریکی مبصرین کے مطابق پولیس اور فوج ان ہنگاموں کے دوران عوام سے ملی بھگت کئے ہوئے تھی۔ ادھر فوج دو دھڑوں میں بٹ گئی ایک دھڑے کی قیادت فوج کے چیف آف سٹاف جنرل وائرنتو اور دوسرے دھڑے کی قیادت جنرل پرابوو کر رہا تھا۔ اگر چہ دونوں دھڑوں نے حکومت سے وفاداری ظاہر کی مگر فوج کا اس طرح دھڑوں میں بٹ جانا خانہ جنگی کا خطرہ لئے ہوئے تھا۔ جنرل وائرنتو نے طلبا کو جو پارلیمنٹ کا گھیراؤ کئے ہوئے تھے، پارلیمنٹ پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔ 20 مئی کو جنرل وائرنتو نے صدر سوہارتو کو

رپورٹ پیش کی کہ فوج اب مزید حکومت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ آخر فوج کا ساتھ نہ دینے کے دباؤ میں آکر صدر سوہارتو نے
استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح صدر سوہارتو کا 32 سالہ آمرانہ دور ختم ہوگیا۔ ان کے بعد نائب صدر حبیبی نے صدر کا عہدہ سنبھالا
20 اکتوبر 1999ء کو پارلیمنٹ نے اسلامی پارٹی کے راہنما عبدالرحمن واحد کو صدر منتخب کیا۔ انہوں نے 373 اور مسز میگا
وتی نے 313 ووٹ حاصل کیے تھے۔ مسز میگاوتی کو نائب صدر بنا دیا گیا۔ 22 جولائی 2001ء کو صدر عبدالرحمن واحد نے
پارلیمنٹ توڑ کر ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی لیکن آرمی چیف اور سپریم کورٹ نے صدر کے اس اقدام کو غیر آئینی قرار دیا۔
23 جولائی 2001ء کو پارلیمنٹ نے صدر کے مواخذے کی تحریک منظور کرتے ہوئے صدر واحد کو برطرف کر دیا اور نائب
صدر مسز میگاوتی نے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔

آزدی سے انقلاب تک:

انڈونیشیا میں اسلام عرب تاجروں نے پھیلا 15 ویں صدی کے آغاز میں یہاں پہلی اسلامی سلطنت قائم ہوئی تھی۔
پرتگالی پہلے یورپی تھے جو 1510ء میں گرم مصالحوں کی تلاش میں یہاں پہنچے۔ 1511ء میں پرتگالیوں نے مالاکہ پر حملہ کر
کے وہاں پرتگالی حکومت قائم کر لی۔ مگر ....

صدر سوئیکارنو (تعارف)

انڈونیشیا کے بابائے قوم اور پہلے صدر 1910ء میں پیدا ہوئے۔ بنڈونگ ٹیکنکل کالج میں تعلیم پائی زمانہ طالب علمی ہی سے ولندیزی سامراج کے خلاف آزادی کی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ 1927ء میں انڈونیشی نیشنل پارٹی تشکیل دی۔ ولندیزیوں کے خلاف آزادی کی تحریک منظم کی اس سلسلے میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انڈونیشیا پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا اور جاپانیوں کے خلاف گوریلا جنگ کی قیادت کی۔ جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد انڈونیشیا کی یک طرفہ آزادی کا اعلان کر دیا اور آزادی تک مختصر جنگ لڑی۔

.... 1527ء میں بنتام کے سلطان نے پرتگیزوں کو جکارتہ میں شکست دے کر نکال دیا 1595ء
میں ولندیزی تاجر یہاں پہنچے اور آہستہ آہستہ دوسری یورپی قوموں کو خصوصاً پرتگیزیوں کے ساتھ ملک کو تقسیم کر کے ملک پر
حکومت کرنے لگے۔ 1795ء تک انڈونیشیا مکمل طور پر براہ راست ہالینڈ کی حکومت کے ماتحت ہوگیا۔ اگلے ڈیڑھ سو سال
تک ڈچ ہالینڈ نے اسے اپنی نوآبادی بنائے رکھا اس دوران 1811ء میں جب یورپ میں نپولین کے ساتھ جنگیں ہو رہی
تھیں تو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ منٹو نے ایک بحری بیڑے کے ذریعے ملایا پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور چھ سال تک یہ
انگریزوں کے قبضے میں رہا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں آزادی کی تحریک بیدار ہوئی۔ 1912ء میں عمر سعید نے تنظیم
اسلامی کی بنیاد رکھی جو انڈونیشی قومیت کی طرف پہلا قدم تھا عمر سعید کی یہ تنظیم اسلامی شراکت اسلام اپنے وقت کی سب سے
بڑی تحریک تھی 1915ء میں گورنر نے اپنی مشاورت کونسل ترتیب دی جس میں پندرہ ارکان مقامی آبادی سے لیے گئے۔ پہلی

جنگ عظیم کے بعد بہت سی قوم پرست جماعتیں قائم ہو چکی تھیں۔ 1920ء میں اشتراکی عناصر نے شرکت رعیت نامی پارٹی قائم کی جس نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ جس کی پاداش میں حکومت نے تمام جماعتوں کو توڑ دیا اور 1922ء میں انڈونیشیا کو ہالینڈ کا حصہ قرار دے دیا۔ 1924ء میں مجلس انڈونیشیا قائم ہوئی جس کے صدر محمد حتا تھے۔ 1926ء میں جاوا 1927ء میں مغربی سماٹرا میں ایک بار پھر کمیونسٹوں نے بغاوت کر دی۔ ولندیزی حکومت نے اس بغاوت کو اتنی سختی سے دبایا کہ پھر اشتراکی عناصر سر نہ اٹھا سکے۔ 1927ء میں ایک نوجوان گریجویٹ انجینئر سوئی کارنو نے انڈونیشی نیشنلسٹ پارٹی PNI قائم کی۔ 1928ء میں اس پارٹی نے ایک قوم ایک ملک ایک زبان انڈونیشیا کا نعرہ لگایا۔ دسمبر 1929ء میں سوئیکارنو کو گرفتار کر لیا گیا، جس سے ان کی پارٹی دو دھڑوں میں منقسم ہو گئی۔ کئی اور لیڈروں کی گرفتاری کے بعد تمام جماعتوں میں مایوسی پھیل گئی، چنانچہ ایک راہنما حسنی تمرون نے تمام جماعتوں کو متحد کر کے ایک جماعت وفاقی احزاب سیاسی انڈونیشیا کے نام سے قائم کی مگر یہ جماعت اپنے منشور پر عمل نہ کر سکی تو عوام اور سیاسی جماعتوں نے دل برداشتہ ہو کر مجلس رعیت انڈونیشیا قائم کر لی۔

جنرل سوہارتو (تعارف)

1921ء میں وسطی جاوا کے ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سوہارتو ایڈن پورا نام ہے۔ 1943ء میں ولندیزی فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ 20 سال کے بعد ترقی کر کے جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کا نام انڈونیشیا کی تاریخ میں پہلی بار 1962ء میں منظر عام پر آیا جب انڈونیشیا نے نیوگنی کو ہالینڈ سے آزاد کرانے کے لئے مہم کا آغاز کیا۔ ان کی قیادت میں انڈونیشی فوج نیوگنی بھیجی گئی تھی۔ 1960ء تا 1965ء ڈپٹی چیف آف سٹاف آرمی رہے، پھر 1965ء میں چیف آف آرمی سٹاف بنا دیئے گئے۔ اکتوبر 1965ء میں صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور کمیونسٹ انقلاب کی تطہیر کی مہم شروع کی جو خانہ جنگی کی شکل اختیار کر گئی۔ لاکھوں کمیونسٹ قتل ہوئے اور لاکھوں قید کر دیئے گئے۔ 1966ء تا 1968ء تک قائم مقام صدر رہے۔ پھر 1968ء، 1973ء، 1983ء، 1988ء، اور 1993ء میں 5 بار صدر منتخب ہوئے۔ مئی 1997ء میں بھی وہ صدارتی پارٹی گولکر کے انتخابات جیتنے کا سبب بنے جس سے ان کے خلاف تحریک چلی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان نے 1942ء میں انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا جس سے ولندیزی اقتدار کے خاتمے کے لئے راہ ہموار کر دی۔ ستمبر 1944ء میں جاپان نے اعلان کیا کہ وہ انڈونیشیا کو خودمختاری دینے کا ارادہ رکھتا ہے، اسی دوران مارچ 1945ء میں انڈونیشی مجلس برائے اہتمام آزادی BPKI قائم ہوئی جس کی تجویز پر پنچ شیلد یا پانچ صوبوں کو اساس آزادی قرار دیا۔ 14 اگست 1945ء کو جاپان کو شکست ہوئی تو انڈونیشیا اتحادیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ 17 اگست 1945ء کو انڈونیشیا کے راہنماؤں نے ملک کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اگلے روز سوئی کارنو صدر اور محمد حتا نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ادھر ہالینڈ نے نئی جمہوریہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ولندیزیوں نے بدلتی ہوئی صورت حال دیکھی تو

اتحادیوں کی طرف لپکے اور 29 ستمبر 1945ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی قیادت میں انگریز فوج نے انڈونیشیا پر حملہ کر دیا۔ سوریا کے مقام پر انگریزوں کو زبردست شکست کا سامنا ہوا اور روس نے انڈونیشیا کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ ہالینڈ نے نیم خودمختار ریاست کی تجویز پیش کی جسے حریت پسندوں نے مسترد کر دیا۔ بالآخر اگست 1946ء میں ولندیزی کمیشن نے آزاد حکومت کو تسلیم کر لیا مگر ساتھ ہی مذاکرات میں یہ طے پایا کہ جاوا اور سماٹرا کے علاوہ دیگر علاقوں میں ولندیزی حکومت قائم رہے گی، اور اگر یہ تجویز بھی انڈونیشیوں کو قبول نہیں تو یکم جنوری 1949ء سے پہلے ولندیزیوں کو یوں نکالا گیا تو پھر جنگ ہو گی اور 20 جولائی کو ولندیزیوں نے حملہ کر دیا پھر اقوام متحدہ کی ایما پر 17 جنوری 1948ء میں جاوا اور سماٹرا کے علاوہ علاقوں پر ولندیزی حکومت تسلیم کر لی گئی۔ نومبر 1948ء میں ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر بھرپور طاقت سے حملہ کر دیا اور جاوا اور سماٹرا پر بھی قابض ہو گئے۔ پھر سلامتی کونسل کی اپیل پر جنگ بندی ہوئی اور مذاکرات کے بعد 27 دسمبر 1949ء کو انڈونیشیا کو آزادی مل گئی۔ صدر سوئیکارنو 1949ء سے 1966ء تک صدر رہے۔ ستمبر 1965ء میں ایک ناکام کمیونسٹ انقلاب کے بعد جو ایک بدترین خانہ جنگی کی شکل اختیار کر گیا تھا مارچ میں صدر سوہارتو صدر بن گئے۔

☆

1999ء چیچنیا اور داغستان کا جہاد آزادی

ایک انقلاب جو دبا دیا گیا

چیچنیا CHECHENYA یہ شمالی قفقاز کے مشرقی حصے میں واقع ہے چیچنیا کے مسلمانوں کی جدو جہد آزادی دو سو سال پر محیط ہے۔ 1817ء سے 1864ء تک روس نے اسے اپنے قلمرو میں رکھا، شامل کرنے کے لئے چالیس سال تک قتل وغارت کا بازار گرم کئے رکھا۔ انقلاب روس 1917ء کے انقلاب سے 1920ء کے عرصہ میں چیچنیا کبھی شاہ پسندوں کا ساتھ دیتا اور کبھی انقلاب پسندوں کا۔ 1924ء میں اسے سوویت یونین میں شامل کرلیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن فوجیں اس کے دارالحکومت گروزنی تک پہنچ گئیں تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیچنیا کے مجاہدوں نے روس کے آمر جوزف سٹالن کے خلاف بغاوت کردی سٹالن نے چیچنیائی باشندوں کے لئے بغاوت دبانے کے لئے بڑی تعداد میں انہیں سائبیریا جلاوطن کردیا گیا۔ سٹالن کے زیر عتاب آنے کے بعد امن مکمل ریاست کو ہی تحلیل کردیا گیا جس کے نتیجے میں لاکھوں مسلمان مارے گئے۔ خوردشیف نے جب روسی وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا تو 9 جنوری 1957ء کو اس ریاست کی حیثیت بحال کردی گئی اور چیچنیائی مسلمانوں کو وطن واپس آنے کی اجازت دے دی گئی۔

آزادی کی دوبارہ تحریک:۔

1991ء میں جہاں دیگر وسطی ایشیائی ریاستوں اور بالٹک ریاستوں نے روسی چنگل سے آزادی کا اعلان کیا وہیں چیچنیا کی عوام نے بھی یک طرفہ طور پر اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ ستمبر میں یہاں کمیونسٹ پارٹی کے راہنما کو برطرف کردیا گیا۔ 27 اکتوبر 1991ء کو ششیان قومی تحریک کے ایما پر ایک ریٹائرڈ مسلمان جنرل ذاکر دادیف کو ماسکو سے منظوری لئے بغیر صدر منتخب کرلیا گیا۔ جنرل ذاکر دادیف نے حلف برداری کی تقریب میں قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ وہ ہر قیمت پر جمہوریہ کی آزادی کا دفاع کریں گے۔

روسی حملہ:

تاہم روس کی حکومت نے اس یک طرف اعلان آزادی کو تسلیم نہ کیا اور روس کے صدر بورس یلسن نے ششیان انگش کے آزادی پسند عوام کے خلاف طاقت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ 8 نومبر 1991ء کو بورس یلسن نے جمہوریہ میں ہنگامی

حالات نافذ کردیے۔ باغی صدر ذاکر داؤدیف کو گرفتار کرنے کے لئے ہزاروں فوجی شیشان انگش بھیج دیئے گئے۔ قبل اس کے کہ روسی فوجی کوئی کاروائی کرتے انہیں مسلح چیچنیوں نے گھیرے میں لے لیا اور انہیں دارالحکومت گروزنی کے ہوائی اڈے سے باہر نکلنے نہ دیا۔ 8 نومبر کو ہی روسی حملہ آور دستوں سے نمٹنے کے لئے صدر داؤدیف نے جمہوریہ میں مارشل لاء لگا دیا۔

روسی افواج کی واپسی:

روسی یونین اس وقت خود بھی موت وحیات کی کشمکش سے گذر رہی تھی۔ نت نئے مسائل اس کے لئے پھندہ بنتے جارہے تھے شیشان انگش کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ 11 نومبر روسی پارلیمنٹ نے صدر یلسن کے نافذ کردہ ہنگامی حالات کے اعلان کو غیر آئینی قرار دے دیا اس کے ساتھ ہی روسی فوجیں دارالحکومت گروزنی سے واپس بلالی گئیں۔ صدر داؤدیف اپنی عزیمت سے حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے محمد یف کو وزیراعظم مقرر کیا۔ 21 نومبر کو جمہوریہ سے مارشل لا اٹھانے کا اعلان ہوا۔ لیکن ادھر روس نے جب اس کے حالات قابو میں آگئے تو چیچنیا پر بھی بھرپور حملہ کردیا اور دارالحکومت گروزنی تقریباً تباہ کرکے رکھ دیا۔ اس کے بعد اپنے مطلب کی انتظامیہ بنائی گئی لیکن حالات جوں کے توں رہے اور چیچن ابھی تک ہار ماننے کو تیار نہیں تھے ادھر یلسن تیل سے مالا مال جمہوریہ کو کسی قیمت پر آزادی دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسلئے وقفے وقفے سے دونوں فریقوں میں جھڑپیں جاری رہیں اس دوران دنیا کے کسی مسلمان ملک نے چیچنیا کے مسلمانوں کی مدد وحمایت نہیں کی جمہوریہ کے صدر دیف بھی شہید ہوگئے۔

ایک اور بڑا حملہ:

دسمبر 1994ء میں روسی فوج نے ہمسائیہ ریاست داغستان میں داخل ہو کر چیچنیا پر ایک بڑا حملہ شروع کردیا۔ روسی صدر کا خیال تھا اس مرتبہ وہ صرف چوبیس گھنٹے میں دوسو روسی بکتر بند گاڑیوں تین سوٹینکوں اور سینکڑوں روسی طیاروں کی مدد سے چیچنیا کی آزادی کا دعویٰ ختم کردیں گے مگر ایک ماہ تک شدید لڑائی کے بعد بھی اس مرتبہ روسی افواج دارالحکومت گروزنی پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ 1995 اور 1996ء میں جھڑپیں جاری رہیں۔ تاہم 29 اگست 1996ء میں جھڑپیں جاری رہیں تاہم 29 اگست 1996ء کو روس اور گروزنی میں ہونے والے ایک معاہدے کے تحت روسی فوجوں کا انخلا شروع ہوگیا اور چیچن حریت پسندوں اور روسی فوجیوں کا شہر میں مشترکہ گشت ہونے لگا۔ 11 جنوری 1999ء کو چیچنیا کی حکومت نے قرآن پاک کو ملک کا اعلیٰ ترین آئین قرار دیا۔ فروری 1999ء میں ملک میں فوری طور پر اسلامی شریعت نافذ کردی گئی مگر ستمبر 1999ء میں روس نے پھر چیچنیا کو جارحیت کا نشانہ بنایا اور دسمبر 1999ء تک اس کے دستے ایک بار پھر دارالحکومت گروزنی میں داخل ہو چکے تھے۔

امریکہ اور دنیا کے دیگر ممالک نے روس پر چیچنیا میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے کا الزام لگایا اور اس پر زور دیا کہ وہ جنگی کاروائیوں سے باز آکر کوئی سیاسی تصفیہ کرے۔

داغستان اور اس کی جدوجہد:

بحیرہ کیسپین کے ساتھ واقع جمہوری داغستان ایک کثیر نسلی جمہوریہ ہے۔ جس کا دارالحکومت مخاچ قلعہ کہلاتا ہے۔ پندرھویں

صدی میں روسی یہاں آنا شروع ہوئے تھے۔ 1813ء میں روسیوں نے ایران سے علاقہ لے لیا۔ 1830ء تک اس علاقے کے عظیم راہنما امام شامل نے روسیوں کے خلاف جہاد شروع کیا جو 1850ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد انہیں گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ داغستان کو انقلاب روس کے بعد 1921ء میں جمہوریہ کا درجہ دیا گیا 1944ء میں جنگ عظیم دوم کے دوران سٹالن کے حکم پر یہاں کے لاکھوں باشندے جلاوطن کر دیئے گئے۔ داغستان کے بڑے علاقے کو اس سے علیحدہ کر کے ایک نئی جمہوریہ گروزنی اوبلاست GROZNY OBLAST بنا دی گئی اور ریاست داغستان تحلیل کر دی گئی۔ 1957ء میں خروشیف کے زمانے میں یہاں کے باشندوں کو واپس آنے کی اجازت دی گئی اور جمہوریہ کو دوبارہ بحال کیا گیا۔

1991ء میں جب تاریخ کے دھارے میں تبدیلی آئی تو جہاں سوویت یونین کی کئی اور ریاستوں نے اعلان آزادی کیا وہیں داغستان نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ مگر اس اعلان آزادی کو روسی فیڈریشن نے مسترد کر دیا۔ اگست 1999ء میں داغستان کے مسلمان راہنماؤں نے روسی آمریت سے چھٹکارا پانے کے لئے چیچن گوریلوں کی مدد سے روس کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے داغستان کی آزادی کا اعلان بھی کر دیا چیچن مجاہدین نے اپنے راہنما شامل بسائیف اور خطاب کے قیادت میں داغستان کے درجنوں مقامات پر قبضہ کر لیا اور ایک طرح سے آزاد کرانے کے مترادف تھا۔

☆

2001ء نائن الیون کا ناقابل یقین انقلابی حادثہ۔۔۔ جو دنیا میں بڑے تغیرات کا باعث بنا

11 ستمبر 2001ء کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ مین ایک ناقابل یقین اور ناقابل تصور اور انقلابی حادثہ رونما ہوا جس نے امریکہ اور ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور دنیا اس واقعے کے بارے میں انگشت بدنداں رہ گئی۔

دو پوری طرح ایندھن سے بھرے ہوئے جیٹ ایئر لائنز کو ہوسٹن سے اغوا کیا گیا پھر ان جہازوں کو شعوری طور پر نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دو جڑواں ٹاوروں سے ٹکرا دیا گیا۔ دونوں ایئر لائنز مین موجود ہر ذی روح مر گیا، ان میں خودکش، دہشت گرد بھی شامل تھے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں جہازوں کے ٹکرانے سے وسیع پیمانے پر آگ لگ گئی اور شکستگی کا شکار ہوتی چلی گئی۔ دونوں بلڈنگوں میں تقریباً 2673 افراد پھنس گئے جو کسی طرح بھی فرار نہیں ہو سکے اور اندر ہی ہلاک ہو گئے۔ مرنے والوں میں وہ فائر فائٹرز اور پولیس افسر بھی شامل تھے جو حادثے کے فوراً بعد عمارت میں داخل ہو گئے تھے اور عمارتوں کے منہدم ہونے تک بالائی منزلوں میں پھنس گئے تھے۔

ان دونوں عمارتوں کے انہدام ہونے سے تباہی زیریں مین ہٹن کے 16 ایکٹر علاقے میں پھیلی، صفائی اور بحالی کا کام پورے اگلے سال یعنی 2002ء میں جاری رہا۔ عمارت کے مالکوں نے اسے اسی جگہ دوبارہ تعمیر کرنے کا عزم کیا۔ اٹھائے جانے والے عمارتی ملبے سے روزانہ انسانی لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوتے تھے۔ ماہرین کی رائے تھی کہ عمارت میں مقیم بہت سے لوگ جہازوں کے جلتے ہوئے تیل سے بھسم ہو گئے تھے یا ٹنوں وزنی کنکریٹ اور سٹیل کے نیچے دب کر مارے گئے تھے سینکڑوں مرنے والوں کی باقیات تک نہ مل سکیں۔ اس مبینہ حملے کے بعد اس عمارت میں شیشوں دفتری آلات، پینٹ اور انسولیشن سمیت کیمکل سے بننے والی اشیا کے جلنے سے زیریں مین ہٹن کی فضا آلودہ ہو گئی۔ یہاں کام کرنے والے اکثر کارکنوں کو مشکلات کا سامنا تھا یا وہ سانس سے متعلق دوسرے مسائل کا شکار ہو گئے تھے۔ اس حملے کا فوری اثر اتنا شدید تھا کہ دنیا بھر کے کیبل ٹیلی ویژن نیٹ ورک نے اپنی معمول کے مطابق نشر کی جانے والی نشریات کو روک کر یا تو حادثے پر غم کے اظہار کے پیغامات نشر کرنا شروع کر دیئے یا پھر وہ لائیو نشریات دکھانے والے ٹی وی نیٹ کی نشریات شروع کرنے لگے۔

امریکہ حالت جنگ میں:

یہ سرزمین امریکہ کی تاریخ میں بدترین دہشت گردانہ حملہ تھا۔ صدر جارج ڈبلیو بش نے فوراً مجرموں کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو حالت جنگ میں قرار دے دیا اور عہد کیا کہ اس حادثے کے مجرموں کو کیفرکردار تک ضرور پہنچایا جائے گا۔

پینٹاگون کا حادثہ:

ٹھیک اسی وقت جب یہ جہاز نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت سے ٹکرا رہے تھے، عین اسی وقت ایسا ہی ایک ہوائی جہاز پینٹاگون کی عمارت سے ٹکرایا۔ چوتھے جہاز کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ اسے وائٹ ہاؤس کی عمارت سے ٹکرایا جانا تھا، وہ پنسلوانیا کے ایک کھیت میں گر کر اپنے مسافروں سمیت تباہ ہو گیا۔

انتقامی کارروائیاں:

فوراً ہی ان دہشت گردانہ حملے کا ذمہ دار جلاوطن سعودی شہری اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم القاعدہ کو ٹھہرا دیا گیا۔ 7اگست 1998ء کو دارالسلام، تنزانیہ اور نیروبی، کینیا میں امریکی سفارت خانوں پر دہشت گردانہ حملوں کی وجہ سے اسامہ بن لادن پہلے ہی سے FBI کو انتہائی مطلوب مجرموں میں سرفہرست تھا اس کے علاوہ اس پر ساری دنیا میں ہونے والے دہشت گردانہ حملوں میں شامل ہونے کا الزام بھی تھا۔ 11 ستمبر کے حملوں کے بعد امریکی حکومت نے اسامہ بن لادن کی گرفتاری اور سزا دلانے کے لئے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے والے شخص کو ڈھائی کروڑ ڈالر انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔ قیاس تھا کہ القاعدہ کا ہیڈکوارٹر طالبان کے زیر قیادت افغانستان میں تھا۔ امریکہ نے بغیر کسی ثبوت کے طالبان اور القاعدہ کے خلاف فوجی مہم شروع کر دی۔ اطلاعات کے مطابق القاعدہ نے افغانستان میں پہاڑی غاروں میں اپنے خفیہ مرکز بنائے ہوئے تھے۔ نومبر 2001ء تک شدید کارروائی کر کے امریکہ نے افغانستان سے طالبان کی حکومت کو ختم کر دیا۔

انتھراکس کا حملہ:

14 اکتوبر 2001ء کو جب امریکہ 9الیون کے حملوں سے جذباتی معاشی اور فوجی اعتبار سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ فلوریڈا میں ایک امریکی شہری کے بارے میں ڈاکٹرز نے پتہ چلایا کہ سانس کے ذریعے انتھراکس پاؤڈر اس کے جسم میں چلا گیا ہے۔ فلوریڈا کے گورنر فرینک بروگن نے فوراً میڈیا پر اعلان کیا کہ اگرچہ کچھ ملک انتھراکس کو حیاتیاتی ہتھیار کے طور پر تیار کر رہے ہیں، تاہم یہ گیس حیاتیاتی دہشت گرد حملہ نہیں ہے مگر جب فلوریڈا کے دوراور شہری اور نیویارک کی ایک خاتون انتھراکس سے متاثر پائی گئی تو امریکی حکام نے یہ تسلیم کر لیا کہ امریکہ دہشت گردی کے دوسرے حملے کا شکار ہو چکا ہے۔ انتھراکس پاؤڈر چھڑکے ہوئے خطوط مختلف امریکی شہریوں کو بھجوائے گئے تھے۔ ان انتھراکس خطوط کے ذریعے ان میں سے پانچ افراد کی موت تو واقع ہو گئی۔ امریکی محکمہ ڈاک نے انتھراکس آلود خط بھیجنے والوں کے بارے میں اطلاع دینے پر بیس لاکھ ڈالر انعام دینے کا اعلان کیا۔

نتائج:

بہر حال امریکہ میں ان دہشت گردانہ حملوں کے بعد امریکہ نے انتقامی طور پر افغانستان اور عراق کو خاک وخون میں غلطاں کر دیا لیکن نا تو افغانستان ہی سے اسامہ بن لادن کو برآمد کر سکا نہ ہی عراق سے حیاتیاتی ہتھیار یا ان کو تیار کرنے والی لیبارٹریوں کا کوئی سراغ تا حال مل سکا۔ ان دونوں دونوں ملکوں کے ہزاروں بلکہ لاکھوں نہتے عوام خود امریکہ کی ریاستی دہشت گردی کا شکار ہو گئے۔ اور نائن الیون کے واقعہ نے دو اسلامی ملکوں کو تہہ وبالا کروادیا ان کی حکومتیں بھی نائن الیون کے واقعہ کی پاداش میں ختم کر دی گئیں اور دونوں ملکوں میں امریکہ کی کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی گئی غرض نائن الیون کے حادثے کے انقلابی اثرات نے پوری دنیا کو عمومی اور افغانستان اور عراق کو خصوصی طور پر متاثر کیا اور دنیا میں ان اثرات سے بہت سے تغیرات رونما ہوئے جو اس واقعے کو پوری حیثیت بھی دیتے ہیں۔ بعض محققین نے شبہ ظاہر کیا ہے یہ حادثہ دراصل خود امریکہ کی اپنی منصوبہ بندی تھا۔ بہر حال ابھی اس کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا آئندہ کے مورخین شاید اس صورت حال کا صحیح فیصلہ کر سکیں؟

☆

2000ء انقلاب بلڈوزر

17 اپریل 1992ء کو سربیا اور مونٹی نیگرو کے وفاق سے ایک نیا ملک وفاقی جمہوری یہ یوگوسلاویہ وجود میں آیا۔ 27 اپریل 1992ء کو جمہوریہ کا نیا آئین نافذ ہوا۔ ڈوبریکا کاسک اس وفاقی جمہوریہ کے پہلے صدر بنے۔ دسمبر میں میلاسوچ MILOSOVIC دوسری بار سربیا کا صدر منتخب ہوا۔ وفاقی جمہوریہ یوگوسلاویہ میں 24 ستمبر 2000ء کو عام انتخابات ہوئے جن میں سرب لیڈر میلا سوچ 1997ء کے بعد دوبارہ وفاقی جمہوریہ کا صدر منتخب ہوا، مگر انتخابات میں بے قاعدگیاں پائے جانے کی وجہ سے جلد ہی یہ انتخابات غیر شفاف قرار دے دیئے گئے۔ سربین لیڈر رسولوبوڈان میلاسوچ مسلمانوں کے قصاب کے نام سے مشہور تھے اور اس نے بے شمار مسلمانوں کا اجتماعی قتل عام کرایا تھا۔ کوسوو میں بربریت اور درندگی کی شرمناک مثال قائم کی تھی۔ انتخابات کے غیر شفاف ثابت ہونے پر حزب اختلاف کی پارٹی، ڈیموکریٹک پارٹی آف سوشلسٹ آف مونٹی نیگرو نے ان کے خلاف عوام کو مظاہروں کی کال دی۔

مظاہروں کا آغاز:

5 اکتوبر 2000ء کو یہ احتجاجی مظاہرے اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور تقریباً پانچ لاکھ افراد کے ہجوم نے صدر میلاسوچ کے خلاف بغاوت کر کے پارلیمنٹ ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن پر قبضہ کر لیا۔ پارلیمنٹ کے کچھ حصے کو آگ لگا دی گئی۔ اگلے روز عوامی بغاوت اور انقلاب کے نتیجے میں صدر میلاسوچ ملک سے فرار ہو گیا۔ حزب اختلاف کے راہنما وجسلاف کوسٹونیکا نے عارضی طور پر ملک کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ یکم اپریل 2001ء کو سابق صدر میلاسوچ کو گرفتار کر لیا گیا۔ مسلمانوں کے قتل عام کے جرم میں ہیگ کی عالمی عدالت انصاف میں پیش کیا، جہاں اس کے خلاف مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ مندرجہ بالا عوامی انقلاب تاریخ عالم میں انقلاب بلڈوزر کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس انقلاب کے دوران تشدد کے واقعات پیش نہیں آئے اور نہ یہ انقلاب خونی تھا مگر اس کے دران دو افراد ہلاک وہو گئے۔ جن میں ایک خاتون جامین جونوف ایک ٹرک کے نیچے آ کر ہلاک ہوئی اور دوسرا شخص دل کا شدید دورا پڑنے سے ہلاک ہوا۔ 14 مارچ 2002ء کو یوگوسلاویہ کے راہنما فیڈریشن کا ڈھانچہ تبدیل کرنے پر رضامند ہو گئے اور اس بات پر متفق ہوئے کہ فیڈریشن کا نام تبدیل کر کے یوگوسلاویہ کی بجائے سربیا اینڈ مونٹی نیگرو رکھ دیا جائے۔ 21 مئی 2002ء کو یوگوسلاویہ پارلیمنٹ نے فیڈریشن کے خاتمے کا معاہدہ منسوخ کرتے ہوئے ریاست سٹیٹ آف سربیا اینڈ مونٹی نیگرو کا نام دے دیا ایک وفاقی صدر وفاقی پارلیمنٹ اور کونسل آف منسٹرز کا قیام عمل میں لایا گیا۔

2001ء انقلاب ایڈیسا

EDISA REVOLUTION

انقلاب ایڈیسہ فلپائن کی سرزمین پر جنوری 2001ء میں برپا ہوا۔ مقامی میڈیا اسے ایڈیسا دوم بھی کہتا ہے اس انقلاب میں صرف چار دن کے اندر اندر فلپائن کے صدر جوزف ایسٹراڈا (جو 1998ء کے انتخابات میں صدر منتخب ہوئے تھے اور ایک سابق اداکار تھے) کو پرامن طور پر اقتدار سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ انقلاب 17 جنوری سے 20 جنوری تک تکمیل پذیر ہوا اور منیلا کی ایک عیسائی درگاہ کے نام پر ایڈیسا EDISA کہلاتا ہے۔

کرپشن اور رشوت ستانی کا دور:

صدر جوزف ایسٹرادا کے دور حکومت میں رشوت ستانی اور کرپشن میں اضافہ ہوا تھا جس سے عوام صدر ایسٹراڈا سے متنفر ہو گئے تھے اور اکتوبر 2000ء کو صدر کے ایک نزدیکی دوست اور صوبائی گورنر لوئس شاوٹ سنگسن LUISCHAVITSUNGSON نے ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے عوام میں اعلانیہ طور پر صدر جوزف ایسٹراڈا پر الزام لگایا کہ اس نے چار کروڑ ڈالر ایک غیر قانونی جیوئنگ نام گیم سے حاصل کئے ہیں عوام پہلے ہی صدر سے متنفر کرنے والی تھی شاوٹ نے جلتی پر تیل چھڑک دیا جس سے صدر کے خلاف عوام میں غم و غصہ کے شعلے بھڑکنے لگے اس سے اگلے روز سینٹ میں اقلیتی راہنمائی فسٹوجنگونا TEAFISTOGUNGOWNA نے اپنے شعلہ بار خطاب میں انکشاف کیا کہ صدر ایسٹراڈا نے یہ 220 ملین پیسو بطور رشوت اپنے دوست لوئس شاوٹ سنگسن سے نومبر 1998ء تا اگست 2000ء وصول کئے تھے۔ اس کے علاوہ سات کروڑ پیسوز PISOES سگریٹوں پر لگائے جانے والے ایکسائز ٹیکس سے بھی خرد برد کئے گئے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد سینٹ کے چیئرمین نے صدر کے خلاف یہ افشائے راز اور ریفرنس انصاف کمیٹی کے پاس تفتیش کے لئے بھجوا دیا۔

صدر کے استعفیٰ کا مطالبہ:

ان انکشافات کے بعد منیلا میں اب ہر طرف سے صدر کے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ ہونے لگا جس پر صدر کی کابینہ سے کئی ایک وزراء نے استعفیٰ دے دیا مگر صدر نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔ 13 نومبر 2000ء کو سینٹ میں صدر کے

مواخذہ کے لئے ایک سو چودہ ارکین جماعت نے تحریک پیش کی جس کے بعد صدر کے مواخذہ کی عدالتی کارروائی 7 دسمبر 2000ء کو باقاعدہ طور پر شروع ہوگئی یہ عدالتی کارروائی فلپائن کیلئے ٹیلی ویژن نے براہ راست دکھانے کا اہتمام کیا تھا فلپائن کی عوام نے بڑی تعداد میں دیکھا۔ صدر کے خلاف مواخذہ کے اس کیس میں گواہی دینے والوں میں ایکوئٹی بینک EQUITABLE BANK کی سینئر وائس پریذیڈنٹ مسز کلاریسا اوکیمپو CLARISSA OCAMPO MRS بھی شامل تھیں انہوں نے صدر کے خلاف بڑی شفاف گواہی دی اور بتایا کہ صدر ایسٹراڈا نے اس کے بینک کے ساتھ پانچ کروڑ ڈالر کی انوسٹمنٹ کا سمجھوتہ کیا تھا۔

جنوری 2001ء کے انقلابی چار دن:

17 جنوری کو عدالتی کارروائی کے دوران صدر کے خلاف ثبوت مہیا کئے گئے اس کارروائی کو بھی فلپائن ٹیلی ویژن نے عدالت سے براہ راست دکھایا۔ مقدمے کی کارروائی کے تیسرے دن آرمی چیف انجلو ریئس اور فلپائن کی نیشنل پولیس نے بھی صدر کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ عدالتی کارروائی کے دوران منیلا کے عیسائی درگاہ EDISA میں فلپائن کی عوام لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر صدر کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔ 19 جنوری 2001ء کو صدر ایسٹراڈا کے خلاف EDAISA کی درگاہ میں عوامی مظاہرے عروج پر پہنچ گئے اور لاکھوں عوام نے ان میں شرکت کی عوام صدر سے استعفیٰ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ 19 جنوری کو تقریباً دو پہر دو بجے صدر جوزف ایسٹراڈا ٹیلی ویژن کی سکرین پر ان ہنگاموں کے دوران پہلی مرتبہ نظر آئے انہوں نے بیان دیا کہ ان کے مواخذے کی کارروائی جاری رہنا چاہیے۔ کیونکہ اگر وہ جرم وار ثابت ہوئے تو صدر کے عہدے سے برطرف ہو جائیں گے بصورت دیگر نہیں۔ پھر اسی روز شام چھ بجے صدر ایسٹراڈا نے ٹیلی ویژن پر عوام کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ 14 مئی 2001ء کو ملک میں صدارتی اور عام انتخابات منعقد ہوں گے اور وہ خود ان میں حصہ نہیں لیں گے۔

20 جنوری کو صدر ایسٹراڈا نے صدارتی محل چھوڑ دیا اسی دن نائب صدر گلوریا آرویا GLORIA OROYA نے منیلا کی ایڈیسا درگاہ میں موجود لاکھوں عوام کے سامنے نئے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ گلوریا ملک کی چودھویں صدر تھی۔ تقریباً دو پہر دو بجے صدر ایسٹراڈا کا ایک خط جاری کیا گیا جس میں انہوں نے خدشات جاری کئے تھے صدر کا اس طرح صدر کے عہدے سے برطرف کیا جانا غیر آئینی اور غیر قانونی ہے اور خود قوم کی بھلائی کے لئے اپنے عہدے کو چھوڑ رہے ہیں۔ نائب صدر کا اس طرح ایک درگاہ میں حلف اٹھانا بھی غیر قانونی ہے پھر اس کے بعد سابق صدر کو ان کی رہائش گاہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ 18 جنوری 2008ء کو سابق صدر جوزف ایسٹراڈا نے فلپائن کے قومی اخبارات میں ایک مکمل صفحے پر ایک اشتہار شائع کرایا جس میں الزام لگایا گیا تھا کہ ایک ایڈیسا دوم نامی انقلاب فلپائن کی جمہوریت پر ایک بدنما داغ ہے ساتھ ہی اس انقلاب کی آئینی اور قانونی حیثیت کا چیلنج کیا گیا تھا۔ اس اشتہار کے بعد فلپائن کی سپریم کورٹ کے ایک جج نے بیان دیا اور کہا کہ ایڈیسا دوم نے واقعی 1987ء کے آئین کو پامال کیا تھا۔ پھر 13 مارچ 2008ء کو جوزف ایسٹراڈا نے اپنے خلاف ہونے والی اس سازش میں ملوث تین افراد کے نام دیئے۔

2003ء جارجیا کا انقلاب گلاب

ROSE REVELUTION روسی نوآزاد ریاست جارجیا RUEPUBLIC OF GEORGIA میں 2 نومبر 2003ء کو پارلیمانی انتخابات ہوئے جو 235 پارلیمانی نشستوں کے لیے لڑے گئے تھے۔ ان انتخابات میں صدر شیورناڈزے SHEVARD NADZE کی جماعت یونین آف جارجیا پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ انتخابات کے بعد بین الاقوامی اور ملکی مبصرین نے ان انتخابات کو غیر شفاف اور جانب دارانہ قرار دیا جس پر حزب اختلاف کی جماعتوں نے احتجاجی مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔

نقطۂ عروج پر:

22 نومبر 2003ء کو حزب اختلاف کے احتجاجی مظاہرے اس وقت اپنی انتہا پر پہنچ گئے جب صدر شیورناڈزے نے نو منتخب شدہ پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کیا۔ نو منتخب شدہ پارلیمنٹ کے اجلاس کو حزب اختلاف کی جماعتوں نے غیر آئینی قرار دے دیا۔ حزب اختلاف کی دو پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے راہنما اس اجلاس میں ہاتھوں میں گلاب کے پھول لئے شریک ہوئے جو انہوں نے حکومتی ارکان پر اچھالے۔ اسی وجہ سے یہ انقلاب، انقلاب گلاب کہلایا۔ بعدازاں صدر شیورناڈزے کے افتتاحی خطاب میں حزب اختلاف نے اتنی شدید مداخلت کی کہ صدر افتتاحی اجلاس چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے اس واقعہ کے بعد صدر نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی اور طبلیسی TBLISI شہر کی سڑکوں پر پولیس اور مسلح افواج کے دستے گشت کرنے لگے مگر جب احتجاجی مظاہرے بڑھے تو فوج کے بہت سے یونٹوں نے حکومت کا ساتھ نہ دینے کا اعلان کیا 23 نومبر کو جارجیا میں سینٹ جارج کا دن منایا جاتا ہے اسی دن روس کے وزیر خارجہ ایگور آئیونف IGORJVANOV نے صدر شیورناڈزے اور حزب اختلاف کی جماعتوں کو گفت وشنید سے مسائل حل کرنے کی دعوت دی اور باہمی ملاقات کا اہتمام کیا۔ اس میٹنگ کے بعد صدر شیورڈناڈزے نے استعفیٰ دینے کا اعلان کر دیا۔ صدر کے مستعفی ہونے کے اعلان پر دارالحکومت طبلیسی کی گلیوں میں خوشی منائی گئی تقریباً ایک لاکھ لوگوں نے اس رات بہت سی تقریبات کا اہتمام کیا جن میں آتش بازی کا مظاہرہ بھی شامل تھا۔

نئے انتخابات کا اعلان:

جارجیا کی پارلیمنٹ کے سپیکر منیو ایلور جناڈیز NANO ELUR JANADZE نے قائمقام صدر کا عہدہ سنبھال لیا اور ملک میں نئے انتخابات منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی سپریم کورٹ نے گذشتہ الیکشن کے نتائج کو کالعدم قرار دے دیا اور 4 جنوری 2004ء کو نئے صدارتی انتخابات کرائے گئے جن میں میخائل ساک ٹیولی نے بھاری اکثریت حاصل کی اور 25 جنوری 2004ء کو نئے صدر کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ 28 مارچ کو جارجیا میں نئے پارلیمانی انتخابات منعقد ہوئے جن میں صدر کی حمائتی پارٹی نیشنل موومنٹ ڈیموکریٹک نے اکثریت حاصل کی مگر 2004ء میں برائے نام انقلاب گلاب دوم رونما ہوا۔

......☆......

2004ء یوکرائین کا انقلاب اورنج

یوکرائین UKRAYIN روس کے بعد یورپ کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ یکم دسمبر 1991ء کو سوویت یونین سے علیحدگی یا آزادی کے لئے ریفرنڈم کے بعد 5 دسمبر کو اسے مکمل آزادی حاصل ہوگئی تھی اگرچہ اعلان آزادی 24 دسمبر 1991ء ہی کو کر دیا گیا تھا۔

2004ء انقلاب اورنج یا نارنجی انقلاب:

یوکرائن میں 2004ء میں رونما ہونے والے احتجاجی مظاہروں اور واقعات کو اصطلاحاً انقلاب اورنج کا نام دیا گیا ہے۔ احتجاجی مظاہروں کا یہ سلسلہ نومبر 2004ء میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں نتائج غیر شفاف ہونے کی وجہ سے جنوری 2005ء تک ظہور پذیر ہوا، جس کے نتیجے میں پرامن طور پر حکومت تبدیل ہوگئی۔ انقلاب اورنج 26 دسمبر 2004ء میں اس وقت کامیاب ہوگیا جب ملک کی عدالت عظمیٰ سپریم کورٹ نے نومبر 2004ء کے انتخابات کے نتائج کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ یوکرائین میں منعقد ہونے والے نومبر 2004ء کے صدارتی انتخابات میں دو امیدوار سامنے آئے تھے جن میں ایک پہلے سے موجود ملک کے وزیر اعظم وکٹر یانکووچ جنہیں صدر مملکت کی اعانت حاصل تھی اور دوسرے حزب اختلاف کے متفقہ امیدوار وکٹر یش چنکو تھے جو پہلے 1999ء میں یوکرائن کے وزیر اعظم رہ چکے تھے۔

انتخابات کا پہلا مرحلہ:

نومبر 2004ء کے صدارتی انتخابات پہلے سے تبدیل شدہ فضا میں منعقد ہوئے جن میں حکومتی امیدوار کا جتانے کے لئے حکومت کی پوری مشنری حرکت میں آ گئی۔ انتخابات سے ذرا پہلے حزب اختلاف کے امیدوار زہر خورنی کا شکار ہو گئے جو شاید حادثہ تھا یا سوچی سمجھی سازش۔ دنوں امیدورار کا انتخابات کے پہلے مرحلے میں جو اکتوبر میں منعقد ہوا 39 فی صد 39 فی صد ووٹ ملے اور اس مرحلے میں دونوں برابر رہے۔ انتخابات کے پہلے مرحلے کے بعد ہی انتخابات میں حکومت کی بے قاعدگیوں کی شکایات آنے لگیں مگر ان پر توجہ نہیں دی گئی اور حزب اختلاف بھی دوسرے مرحلے کی طرف متوجہ رہے۔

نارنجی رنگ:

انتخابی مہم کے دوران اورنج یا نارنجی رنگ کو حزب اختلاف کے امیدوار وکٹر یش چینکو نے اپنے انتخابی رنگ کے طور پر

اپنایا تھا۔ بعد ازاں اسی انتخابی رنگ کی مناسبت سے یہ تمام سیاسی کاروائیاں انقلاب اورنج کہلائیں۔ یاد رہے کہ دوسرے اور حکومتی گروہ نے نیلا رنگ اپنے انتخابی رنگ کے طور پر اپنایا تھا۔

انتخابات غیر شفاف اور احتجاجی مظاہرے:

21 نومبر دوسرے مرحلے کے بعد انتخابات کے غیر شفاف ہونے اور حکومت کے فراڈ کا پتہ چل گیا جس کے بعد یش چینکو نے عوام کو احتجاج کرنے اور سڑکوں پر نکل آنے کی دعوت دی۔ 22 نومبر 2004ء کو عوام سڑکوں پر نکل آئی اور پورے یوکرائن میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ 23 نومبر کو تقریباً 5 لاکھ عوام نے یوکرائن کی پارلیمنٹ کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا مظاہرین نے اکثر اورنج رنگ کے جھنڈے اٹھا رکھے تھے اور بہت سے مظاہرین اورنج رنگ کے لباس میں ملبوس تھے۔ ان احتجاجی مظاہروں کے دوران جنوبی اور مشرقی یوکرائین میں جو حکومتی امیدوار وکٹر یانکووچ کا گڑھ سمجھے جاتے تھے۔ حزب اختلاف نے ایسے اقدامات کئے جو آئندہ یوکرائین کی فیڈریشن کے ٹوٹنے کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ باوجود یوکرائن کے ٹھٹھرا دینے والے موسم سرما کے لاکھوں افراد نے ان مظاہروں میں حصہ لیا، مگر 24 نومبر کو یانکووچ کو سرکاری طور پر کامیاب قرار دے دیا گیا۔ یکم دسمبر 2004ء کو پارلیمنٹ نے ملکی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے وزراء کی کابینہ کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ کاسٹ کیا جسے وزیر اعظم وکٹر یانکووچ نے غیر آئینی قرار دے دیا۔ 3 دسمبر کو سپریم کورٹ نے سیاسی جمود کو توڑا اور صدارتی انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا۔ 26 دسمبر کو نئے انتخابات منعقد ہوئے جو بین الاقوامی اور ملکی مبصرین کی کڑی نگرانی میں تھے۔ 28 دسمبر کو ابتدائی نتائج جاری کئے گئے جن کے مطابق یش چنکو نے اکثریت حاصل کی۔ یانکووچ اور اس کے ساتھیوں نے نئے الیکشن کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انکے خلاف الیکشن کمیشن کی شکایت سل اور شکایت درج کرائی ساتھ ہی ملک کی مختلف عدالتوں میں الیکشن کو چیلنج کیا گیا جو بے سود ثابت ہوا اور ان کے ریفرنس خارج کر دیئے گئے۔ 10 جنوری 2005ء کو باقاعدہ طور پر الیکشن کے سرکاری نتائج کا اعلان کیا گیا کہ یش چنکو اور اس کی پارٹی جیت گئی اس کے ساتھ ہی اس کے صدر بننے کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ 23 جنوری کو پارلیمنٹ کی عمارت میں صدر کی حلف برداری کی تقریب منعقد ہوئی جس میں یش چنکو نے صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس کے ساتھ انقلاب اورنج تکمیل کو پہنچا۔ بہت سے تجزیہ نگاروں کے نزدیک یوکرائن میں آنے والے انقلاب اورنج، جارجیا کے انقلاب گلاب اور سربیا کے انقلاب بلڈوزر کی تقلید میں برپا ہوا تھا۔

......☆......

2005ء کرغیزستان کا انقلاب گل لالہ

رنگدار انقلاب COLOUR REVOLUATION وہ اصطلاح ہے جو شرق یورپ اور اس کی وسطی ایشیا کی ریاستوں میں کمیونزم کے خاتمے کے بعد ابھرنے والی انقلابی تحریکوں کو بیان کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ انقلاب بلڈوزر، انقلاب گلاب۔ انقلاب اورنج سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ کرغیزستان میں 2005ء میں رونما ہونے والی حکومتی تبدیلی بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے انقلاب گل لالہ TULIP REVOULITION یا انقلاب گلابی PINK REVOLITION بھی کہتے ہیں۔ یہ انقلاب کرغیزستان کے صدر عسکر اکایوف ASKAR AKAYEV کی معزولی پر منتج ہوا۔

پس منظر:

31 مارچ 1991ء کو کرغیزستان نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا۔ 26 دسمبر 1991ء کو یہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد دیگر وسطی ایشیائی ریاستوں کی طرح آزاد جمہوریہ بن گیا۔ 5 مئی 1993ء کو جمہوریہ کا آئین نافذ ہوا جس میں صدر مملکت اور وزیر اعظم کے الگ الگ عہدے رکھے گئے۔ مگر حکومت کا نظام صدارتی اختیار کیا گیا صدر براہ راست عوام کے ووٹوں سے 5 سال تک کے لئے منتخب کیا جاتا ہے جبکہ وزیر اعظم کو صدر نامزد کرتا ہے۔
انتخاب کا سلسلہ 1995ء سے شروع ہوا اکتوبر 2000ء میں دوسرے انتخابات منعقد ہوئے جن عسکر اکایوف تیسری مرتبہ ملک کے صدر منتخب ہوئے۔ مارچ 2005ء میں چوتھے صدارتی انتخابات منعقد ہوئے۔ جن میں ایک بار پھر عسکر اکایوف ہی صدر منتخب کئے گئے۔ مگر اس مرتبہ مبصرین نے الیکشن کو غیر شفاف قرار دیا اور صدر پر حکومتی اختیارات کا انتخابات میں ناجائز استعمال کرنے کا الزام لگایا گیا۔

احتجاجی مظاہرے:

18 مارچ سے حزب اختلاف نے ان غیر شفاف انتخابات کے خلاف احتجاجی مظاہروں کا آغاز کیا اور 23 مارچ تک یہ ایک احتجاجی تحریک کی شکل اختیار کر گئے جو پورے ملک میں پھیل گئے۔ خاص طور پر ملک کے جنوبی شہروں میں جہاں ازبک اکثریت آباد ہے 24 مارچ کو گورنمنٹ ہیڈ کوارٹر بشکیک BISHKEK کے سامنے لاکھوں افراد مظاہرے کے لئے

جمع ہو گئے۔ اگرچہ پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں مظاہرین کو منتشر کرنے کی کوششیں کر رہی تھیں مگر مظاہرین بے قابو ہو آخر گورنمنٹ ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہو گئے۔

صدر کایوف کا فرار:

مظاہرین کے گورنمنٹ ہیڈ کوارٹر کی عمارت پر قبضے کے بعد صدر عسکر اکایوف بذریعہ ہیلی کاپٹر ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مگر انہوں نے صدر کے عہدے سے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ ادھر احتجاجی مظاہرین نے دیگر سرکاری اداروں بشمول ٹیلی ویژن اسٹیشن پر قبضہ کر لیا جس کے بعد پولیس مظاہرین کے ساتھ مل گئی اور وزیر اعظم نے استعفیٰ دے دیا۔ حزب اختلاف کے مقید راہنماؤں کو قید سے چھڑوا لیا گیا۔ ان راہنماؤں میں فیلکس کولوف FELIX KULOV بھی شامل تھے۔

انقلابیوں کی کامیابیوں کے بعد کرغیزستان سپریم کورٹ نے 2005ء کو ہو الی صدارتی انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا۔ فیلکس کولوف کو قائم مقام صدر بنا لیا گیا، جس نے نیا وزیر اعظم بھی منتخب کر لیا۔ مگر حکومت میں اس تبدیلی کے بعد ملک میں لاقانونیت کے باعث لوٹ مار شروع ہو گئی اور انقلاب گل لالہ نے ایک پر امن انقلاب سے ایک پر تشدد انقلاب کی شکل اختیار کر لی۔ 25 مارچ کا گورنمنٹ ہیڈ کوارٹر کی عمارت بشکیک میں مفرور سابقہ صدر اکایوف کے مسلح حمائتیوں نے گھسنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ انہیں دارالحکومت میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

جنوبی شہر جلال آباد میں مظاہروں کے دوران پر تشدد واقعات پیش آئے جس کے مطابق کم از کم تین افراد ہلاک ہو گئے۔ 28 مارچ تک ملک کے سیاسی حالات بہتر ہونے لگے پرانی پارلیمنٹ نے خود کو تحلیل کر لیا نئی منتخب شدہ پارلیمنٹ کو اگرچہ قانونی قرار دے دیا گیا مگر کچھ نشستوں پر اختلاف موجود رہا جس کا فیصلہ قومی عدالتوں پر چھوڑ دیا گیا۔ 2 اپریل کو صدر عسکر اکایوف جواب قارستان سے بھی ماسکو چلا گیا تھا، مستعفی ہونے پر رضامند ہو گیا۔ 5 اپریل کو ماسکو میں اس نے کرغیزستان نمائندوں کے سامنے استعفیٰ دے دیا جس کے ساتھ ہی انقلاب گل لالہ تکمیل پذیر ہو گیا۔ اپریل میں کرغیزستان میں ایک اور انقلاب آیا جو انقلاب گل لالہ دوم کے نام سے یاد کیا گیا۔ اس میں بھی حزب اختلاف حکومت کو توبر خاست کرنے میں کامیاب رہی۔

.......☆.......

2005ء لبنان کا انقلاب صنوبر

2005ء میں لبنان میں آنے والے انقلاب صنوبر CEDAR REVOLUTION لبنان میں ہونے والے ان مظاہروں کا سلسلہ ہے جو 14 فروری 2005ء کو ایک سابقہ وزیر اعظم رفیق الحریری کے قتل کے بعد شروع ہوئے تھے۔ ان مظاہروں کا اولین مقصد شامی افواج کا لبنان سے انخلا تھا اس کے بعد مظاہرین لبنان کی شام نواز حکومت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ سابقہ وزیر اعظم کے قتل کی تفتیش بھی آزادانہ ماحول میں کرائے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ صنوبر CEDAR کا درخت لبنان کا قومی نشان ہے اور یہ اس ملک کے جھنڈے پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے عالمی سیاست میں لبنان کے معاملات کے لئے دیودار کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اسے پہلے پہل امریکہ کے عالمی مسائل کے سیکریٹری نے لبنان کے لئے استعمال کیا تھا CEDAR SPRING انہیں اصطلاحوں میں سے ایک ہے جو احتجاجی مظاہروں کے پھیلنے کے موسم کے لئے مستعمل ہے۔ انہیں اصطلاحوں سے انقلاب صنوبر کی اصطلاح نکلی ہے۔

رفیق الحریری کا قتل:

4 فروری 2005ء کو لبنان کا دوبارہ منتخب ہونے والا (1981-1992ء اور 2000ء) والا سابقہ وزیر اعظم رفیق الحریری کو بیروت کے ایک چوک میں ایک سڑک پر بم حملے میں اڑا دیا گیا۔ اس حملے میں اس کے ساتھ مزید 21 افراد ہلاک ہوئے اور 100 سے زائد افراد زخمی ہوئے تھے۔ اس واردات کے صرف چند گھنٹے بعد لبنان پولیس نے 16 آسٹریلوی شہریوں کے گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے، مگر وہ بیروت سے سڈنی کے لئے پرواز کر چکے تھے۔ بم دھماکے کے صرف تین گھنٹے بعد پتہ چلا تھا کہ وہ آسٹریلوی بغیر کسی سفری سامان کے سفر کر رہے تھے۔ بہر حال لبنان پولیس کا آسٹریلوی پولیس سے رابطے کے باوجود ان آسٹریلوی شہریوں کو گرفتار نہ کیا جا سکا۔ فروری میں لبنان حزب اختلاف کے راہنما ولید جنبلاط نے شام کے صدر بشیر الاسد پر الزام لگایا کہ انہوں نے رفیق الحریری کو اگست 2004ء میں قتل کی دھمکی دی تھی۔ مغربی ممالک اور اقوام متحدہ نے اس الزام تراشی پر کوئی توجہ نہ دی وہ شامی فوج کے انخلا کا انتظار کر رہے تھے۔

احتجاجی جلوس:

21 فروری 2005ء لاکھوں لبنانیوں نے سابق وزیر اعظم کے قتل کی واردات کے مقام پر سے جلوس نکالا جس میں

شامی فوج کے انخلا کے ساتھ ساتھ لبنان کے شام نواز وزیراعظم ایمائیل لاہود پر اس قتل کا لگایا گیا۔ اس احتجاجی مظاہرے کے بعد تقریباً ہر ہفتہ پیر کے دن بیروت کے شہداء سکوائر سے احتجاجی مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ مظاہرین نے اس چوک کا نام "لبرٹی سکوائر" رکھ دیا۔ اس کے علاوہ بیرنی ممالک میں بھی احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کیا گیا۔ لنڈن، سڈنی، سان فرانسسکو، مانٹریال، اور ڈسل ڈارف میں لبنانیوں نے مظاہرے کیے، تاکہ بین الاقوامی رائے عامہ کو ہموار کیا جا سکے۔

شام نواز حکومت اور خود شام کے خلاف ہونے والے مظاہرے 1990ء میں ہونے والے شام مخالف مظاہروں سے مختلف تھے۔ وہ مظاہرے صرف عیسائی فرقے نے کئے تھے، جبکہ موجود احتجاجی مظاہروں میں پوری قوم متحد تھی۔ ایک سابقہ وزیر مروان حمادہ خود بھی ایک کار بم حملے سے بڑی مشکل سے بچا۔ اس نے حکومت پر غفلت اور ناکارہ ہونے کا الزام لگایا۔ 2 مارچ 2005ء کو شام کے صدر بشیر الاسد نے اعلان کیا کہ شامی افواج چند ماہ تک لبنان سے بلالی جائیں گی مگر اس بیان کا کچھ اثر نہ ہوا اور 14 مارچ کو تقریباً دس لاکھ سے زائد مظاہرین نے شام سے مطالبہ کیا کہ وہ لبنان سے اپنا ناجائز قبضہ ختم کردے، یہ احتجاجی مظاہرہ بیرت کے شہدا سکوائر اور رفیق الحریری کی قبر پر کیا گیا تھا۔ مارچ میں ہونے والے ان شام مخالف مظاہروں کے ساتھ ہی لبنان میں دہشت گردی کی ایک لہر اٹھی جس میں بہت سے شام مخالف حزب اختلاف کے راہنماؤں کو قتل کردیا گیا۔ یہ زیادہ تر کار دھماکوں اور بموں کے حملوں میں قتل کیے گئے۔ بیروت میں عیسائی اکثریت کے علاقے خصوصی طور پر دہشت گردی کا نشانہ بنائے گئے۔

لبنان کا یہ انقلاب اگرچہ مشرقی یورپ اور وسطی ایشیائی ممالک کی طرح انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف ہونے والے مظاہروں سے شروع نہیں ہوا تھا۔ اس انقلاب کا سب سے بڑا مقصد لبنان سے شامی افواج انخلا تھا۔ اس انقلاب میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو مشرقی یورپ اور وسطی ایشیائی ممالک COLOUR REVOLUTION میں استعمال کیا گیا تھا۔ یعنی غیر متشدد مظاہرے۔ اگرچہ ابتدا میں یہ انقلاب بھی کامیاب رہا، مگر جولائی میں ہونے والی جنگ نے اسے دبا دیا اور یہ انقلاب تحلیل ہوگیا۔

......☆......

2010ء انقلاب

گل لالہ دوم

7 اپریل صبح 9:20 A.M پر وسطی ایشیائی ملک کرغیزستان کے دارالحکومت بشکیک میں حکومت مخالف پر تشدد مظاہروں کا آغاز ہو چکا تھا۔ مختلف مقامات پر سیکیورٹی اہلکاروں اور مظاہرین کے درمیان جھڑپیں لڑی جانے کے بعد حکومت نے ملک میں ایمرجنسی اور کرفیو نافذ کرنے کا اعلان کر دیا ادھر پر تشدد واقعات میں وزیر داخلہ سمیت 100 افراد ہلاک اور 180 سے زائد افراد زخمی ہو چکے تھے۔ مہنگائی اور بدعنوانی کے خلاف ہونے والے ان مظاہروں نے بہر حال ایک پر تشدد، خونیں انقلاب کی شکل اختیار کر لی۔ جب حکومت نے اپوزیشن کے تین اہم راہنماؤں کو سنگین الزامات کے تحت گرفتار کیا تو اسوقت تک پانی سر سے بلند ہو چکا تھا اور حزب اختلاف کی حمایت میں مظاہرہ کرنے والے لوگ سرکاری ٹیلی ویژن کی عمارت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ عین اسی وقت ٹیلی ویژن پر وزیر اعظم کا ایمرجنسی نافذ کرنے کا اعلان براڈ کاسٹ کیا جا رہا تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے اعلان سے چند لمحے پہلے ہزاروں مظاہرین دارالحکومت میں ملک کے صدر کرمان بیگ بکائیون کے دفاتر کا گھیراؤ کر رہے تھے جس کے بعد سیکیورٹی فورسز اور مظاہرین جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مظاہرین نے متعدد سرکاری گاڑیوں کو آگ لگا دی اور پولیس کی کئی گاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔

حزب اختلاف نے حکومت پر انسانی حقوق کی پامالی، جابرانہ طرز حکمرانی اور اقتصادی بدانتظامی کے الزامات عائد کیے تھے۔ جس کے بعد سرکاری وکیل یا پراسیکیوٹر جنرل کے مطابق جوابی کارروائی کے طور پر حکومت نے حزب اختلاف کے تین اہم راہنماؤں کو سنگین الزامات تحت گرفتار کر لیا۔ ان میں سابق وزیر اعظم اور صدارتی امیدوار الماس بیگ ALMA BAYEV، سپیکر پارلیمان (سابقہ) جناب عمر بیگ اور ان کے قریبی ساتھی شامل تھے۔ جس سے حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے مظاہرین بے قابو ہو گئے اور انہوں نے کرغیز ٹیلی ویژن پر قبضہ کر لیا اور تمام ٹی وی چینلز بند ہو گئے۔

جب ان پر تشدد مظاہروں نے انقلاب کی شکل اختیار کی تو صدر اپنے دفاتر سے فرار ہو گئے اور وزیر اعظم نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ادھر مظاہرین دارالحکومت بشکیک میں تمام اہم مقامات پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے چھ ماہ کے لیے ایک عبوری حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا۔ حزب اختلاف کے ایک راہنما اور سابق وزیر خارجہ

روضا اوتنا شوف نے بی بی سی ریڈیو کو بیان دیتے ہوئے بتایا کہ نئے وزیر دفاع اور وزیر داخلہ کو تعینات کر دیا گیا ہے اور عبوری حکومت قائم کر دی گئی ہے جو اس دوران ملک کا نیا آئین تیار کرے گی۔ کرغیزستان میں آنے والے اس انقلاب کے بعد مختلف بین الاقوامی شخصیتوں نے اس کے متعلق اظہار خیال کیا۔ امریکی مبصرین نے کرغیزستان کے پر تشدد واقعات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کرغیزستان کے عوام کو قانون کا احترام کرنا چاہیے۔ امریکہ نے مزید یہ بھی کہا کہ ہمیں امید ہے کہ کرغیزستان کی حکومت ابھی قائم ہے۔ روسی وزیر اعظم ولادی میر پوتن نے ان اطلاعات کی تردید کی جن میں کرغیزستان میں ہونے والی اس بدامنی اور انقلاب کے پیچھے روسی حکومت کا ہاتھ بتایا گیا تھا۔ روسی وزیر اعظم نے کہا کہ یہ کرغیزستان کا اندرونی معاملہ ہے اور فریقین کو صبر سے کام لینا چاہیے۔ البتہ روسی صدر دمتری میدودی ایدف نے کہا کہ کرغیزستان میں ہونے والے یہ مظاہرے اور انقلاب دراصل اہل اقتدار کے خلاف عوام کے غم و غصے کا اظہار ہیں۔ واضح رہے کہ ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی، بدعنوانی اور حزب اختلاف کے راہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف یہ مظاہرے شروع ہوئے اور انہوں نے جلد ہی ایک انقلاب کی شکل اختیار کر کے ملک کے تمام بڑے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ملک میں ایمرجنسی اور کرفیو کے نفاذ کے بعد اپوزیشن مظاہرین نے نائب وزیر اعظم کو یرغمال بنا کر سرکاری ٹیلی ویژن پر قبضہ کر لیا۔ جس کے فوراً بعد کرغیزستان کے وزیر اعظم نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے ایمرجنسی اور کرفیو کے نفاذ کا اعلان کیا تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے خلاف 5 ہزار سے زائد مشتعل مظاہرین نے اپوزیشن ہیڈ کوارٹر سے ایوان صدر کی جانب مارچ کیا اور صدر کرمان بیگ باکائیون کے دفاتر کا گھیراؤ کر لیا جس کے بعد حکومت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔

مورخین نے کرغیزستان میں آنے والے اس انقلاب کو انقلاب ٹیولپ ثانی THE SECOND TULIP REVOLUTION کا نام دیا ہے۔ یاد رہے کہ انقلاب ٹیولپ اول کرغیزستان میں 2005ء میں آیا تھا۔ لیکن وہ شدت میں اس دوسرے انقلاب سے کم تھا۔ کرغیزستان وسطی ایشیا کا ایک اہم ملک ہے 31 اگست 1991ء سے پہلے یہ سوویت یونین کا ایک حصہ تھا۔ اس کے شمال میں قازقستان، مشرق میں چین کا صوبہ سنکیانگ جنوب میں چین اور تاجکستان اور مغرب میں ازبکستان واقع ہیں کرغیزستان چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ایک بغیر سمندر کا ملک ہے۔ یہ دو عظیم وسطی ایشیائی پہاڑی سلسلوں تیان شان اور پامیرز کے ایک خاص مقام پر واقع ہے۔

1917ء میں آنے والے انقلاب روس تک یہ علاقہ ترکستان کرے TURKESTAN KRAY کا ایک حصہ تھا۔ انقلاب روس کے بعد کرغیزوں نے روسیوں کے خلاف مزاحمت کی تھی لیکن بالشویک سرخ فوج کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اپریل 1921ء میں یہ علاقہ ترکستان خود مختار سوویت سوشلسٹ جمہوریہ کا حصہ بنا۔ اس کے ساتھ قازقستان، تاجکستان اور ترکمانستان اور ازبکستان کو بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ مختلف سیاسی تجربات کے بعد روس نے اسے 1928ء میں کرغیزستان خود مختار جمہوریہ قرار دے دیا تھا۔ اسی دوران روسیوں نے اس کے دارالحکومت کا نام تبدیل کر کے اپنے جنرل فرونز کے اعزاز میں فرونز FRUNZE رکھ دیا تھا۔

دسمبر 1936ء میں یہ سوویت یونین کی ایک آئینی جمہوریہ بن گیا اور اگلی نصف صدی تک یہ روس کے آہنی پردے کے پیچھے سوویت حکمرانی میں رہا۔ 1991ء میں دوسری وسطی ایشیائی ریاستوں کی طرح یہاں بھی سوویت یونین سے علیحدگی

کی لہر پیدا ہوئی اور 31 اگست 1991ء کو کرغیزستان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ 26 دسمبر 1991ء کو یہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ایک آزاد جمہوریہ بن گیا۔

آزادی کے بعد دارالحکومت کا نام تبدیل کر کے فرونز سے بشکیک رکھ دیا گیا۔ جولائی 1993ء میں کرغیز زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔

کرغیزستان ایک آزاد جمہوریہ ہے جہاں صدارتی طرز کی حکومت قائم ہے۔ صدر ریاست کا سربراہ مملکت اور تمام انتظامی اختیارات کا مالک اور مسلح افواج کا سپریم کمانڈر ہوتا ہے۔ صدر کو عوام براہ راست 5 سال کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ مگر سیاسی طور سے گزشتہ سالوں میں یہاں سخت بے چینی پائی جاتی رہی ہے جس کے نتیجے میں 2005ء میں بھی یہاں انقلاب آیا تھا جبکہ اس کے پانچ سال بعد اپریل 2010ء میں یہ ملک اپنے مخصوص سیاسی حالات کی وجہ سے ایک بار پھر انقلاب سے دوچار ہوا ہے۔

انقلاب گل لالہ کی آمد کے کچھ ماہ بعد کرغیزستان شدید نسلی فسادات کا شکار ہو گیا جس سے سخت جانی و مالی نقصان پہنچا ہلاک ہونے والوں میں ایک پاکستانی طالب علم بھی شامل تھا۔

......☆☆☆......

کتابیات

☆ تاریخ تہذیب — از مولانا غلام رسول مہر

☆ انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم — از مولانا غلام رسول مہر

☆ تاریخ انقلابات عالم — از بوسعید بزمی

☆ تاریخ ایران — از سبط حسن

☆ انقلاب ایران — از سبط حسن

☆ قصص القرآن — از مولانا حافظ الرحمٰن وسیوہاروی

☆ تاریخ میں سفر — از عدنان طارق

☆ تاریخ عالم — از اخلاق احمد قادری

☆ جنگ عظیم اول — از سید محمد فضل اللہ بخاری

☆ جنگ عظیم دوم — از لوئیس ایل سنائیڈر ترجمہ مولانا غلام رسول مہر تلخیص صفدر رشید

☆ تاریخ وسط ایشیاء — از محمد حیات

☆ بیسویں صدی کے فوجی حکمران — از مرتضٰی انجم

☆ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے معمار — از علی رہنما

☆ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ — از ثروت حیات

☆ تاریخ کے بدترین ڈکٹیٹر — مترجم زاہد ملک

☆ جدید دنیا کی مختصر تاریخ — از راشد مراد

☆ تاریخ چین — ترجمہ احفاظ الرحمٰن

☆ جمہوریت بمقابلہ آمریت — از محمد یوسف خان

☆ تاریخ جمہوریت — از شاہد حسین رزاقی

☆ بیسویں صدی ایک نظر میں — از زاہد حسین انجم

☆ تاریخ اخلاق یورپ — از پول لیکی

☆ بیسویں صدی کی تحاریک آزادی

☆ اردو انسائیکلوپیڈیا۔ فیروز سنز

☆ موسیٰ سے مارکس تک — از سبط حسن

☆ ترکی اور ترک — از ثروت صولت

☆ بیسویں صدی کا انسائیکلوپیڈیا — از شیخ اعظم

☆ THE ART OF WAR IN WORLD HISTORY

☆ ALMANAC 1999,2000,2001-2005

☆ اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب

☆ ENCLOPEDIA OF DATE AND EVENTS

☆ انقلاب فرانس جے ایم تھامس

☆ انقلاب روس

☆ جدید مسلم دنیا

☆ CONFLICTS IN SOUTH ASIA

☆ بین الاقوامی واقعات — از ازھر منیر

☆ پاکستان کے سربراہ مملکت — محمد اسلم لودھی

☆ انسائیکلوپیڈیا اقوام عالم — از عبدالوحید

☆ CHUONICLE OF THE 20TH. C

☆ تاریخ اور مذہبی تحریکیں — از مبارک علی

☆ بہادر شاہ ظفر اور جنگ آزادی کے مجاہدین

☆ 1857ء — از غلام رسول مہر

☆ WORD HISTORY , GLENCE

☆ THE MUSLIM WORLD TO DAY

☆ 366 دن عقیل عباس

☆ THE THURTH ABOUT HISTORY

☆ TODAY IN HISTORY

☆ 1000 GREAT EVENTS

☆ THROUGH THE CORIDOR OF TIME

☆ ENCLOPEDIA BRITANNICA

☆ INTERNET ...WIKIPEDIA. COM.

☆ تاریخ ترکیہ — از نصیر احمد ناصر

- ☆ تاریخ عالم کے اہم سنگ میل — اخلاق احمد قادری
- ☆ تاریخ عالم کے اہم موڑ — اخلاق احمد قادری
- ☆ جدید تاریخ عالم — اخلاق احمد قادری
- ☆ تاریخ عالم عصر حاضر (1) — اخلاق احمد قادری
- ☆ تاریخ عالم عصر حاضر (2) — اخلاق احمد قادری
- ☆ دنیا کو جھنجھوڑ دینے والے 172 انقلابات — اخلاق احمد قادری
- ☆ انقلابات ایران — اخلاق احمد قادری
- ☆ خونیں تحریکیں — اخلاق احمد قادری
- ☆ تاریخ نجد وحجاز — مفتی محمد عبد القیوم قادری
- ☆ اتحاد جزیرۃ العرب وابن سعود کی شخصیت اور کارنامے — محمد المانع
- ☆ فیدل کاسترو — نرمین فاطمہ
- ☆ عظیم انقلابی راہنما — مرتضیٰ انجم

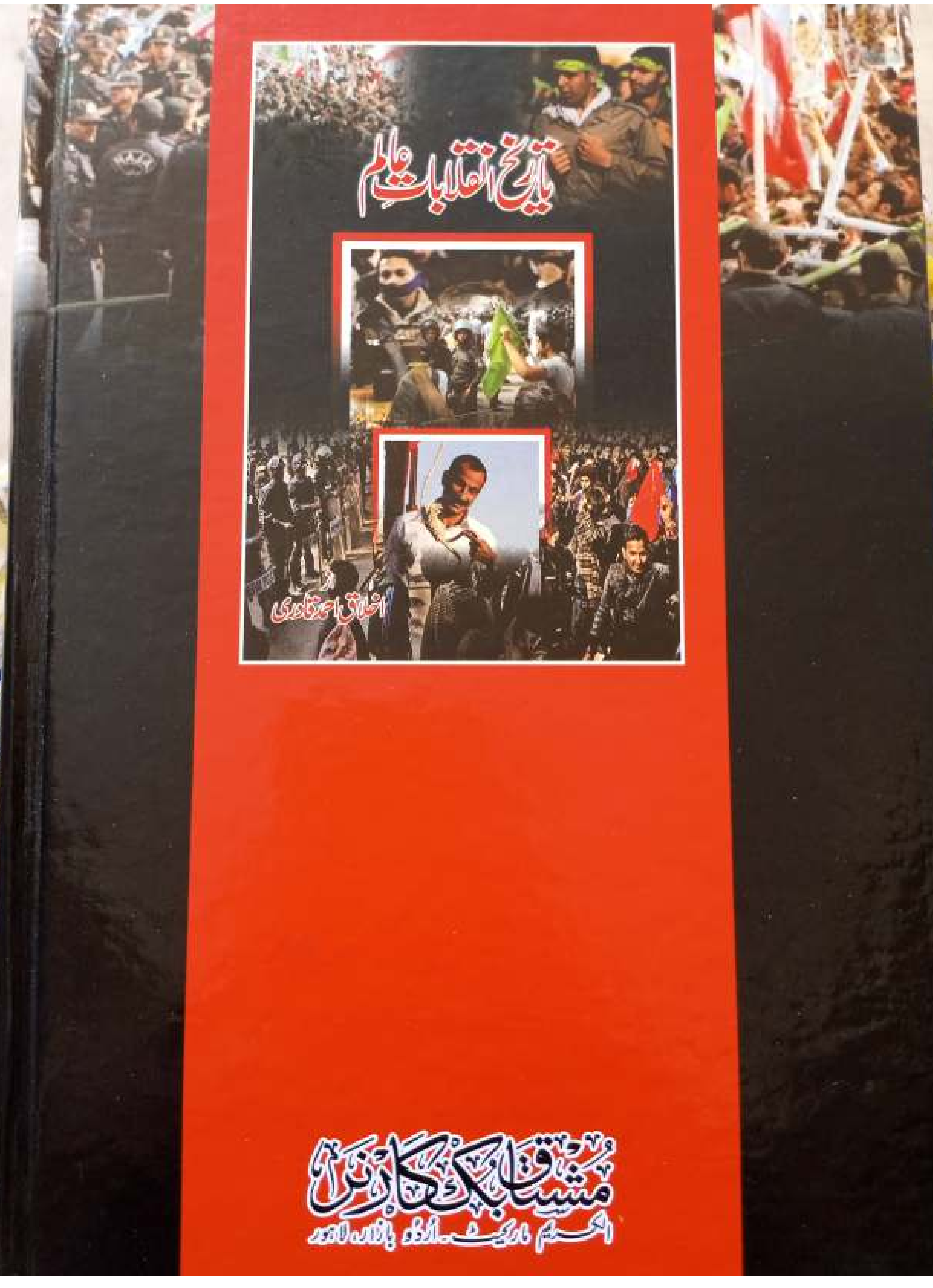

تاریخ انقلاباتِ عالم
اخلاق احمد قادری
مشتاق بک کارنر
الکریم مارکیٹ۔ اردو بازار، لاہور